کراچی

اپریل ۱۹۵۶

مہر نیمروز

ترتیب دینے والے

حسن مثنیٰ ندوی

ابوالخیر کشفی

علی اکبر قاصد

فی پرچہ
آٹھ آنے

ہاؤسنگ یونین ایریا۔ کراچی
فون ۴۱۶۶۶

چندہ سالانہ
چھ روپے

اس شمارے میں

پہلی کرن

عہد جدید کو اپنے علم و فضل اور سائنس کی بے مثال ترقیوں پر بڑا ناز ہے، فخر ہے، اور واقعی شبہ نہیں کہ اس کا یہ فخر و ناز حق بجانب ہے زمان و مکان کے سارے تعینات روز بروز ختم ہوتے جاتے ہیں۔ فطرت کے اسرار و رموز کو بے نقاب کرنے اور عناصر فطرت کو اپنا مطیع و مسخر کرنے میں انسان نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن ان تمام ترقیوں کے باوجود استعمار و استبداد کا دامن آج بھی چار سو پھیلا ہوا ہے، جمہوریت، وطنیت، اشتراکیت، فسطائیت، خدا جانے کتنی اور کیسی کیسی نقابیں اور ہیں جو اس کے چہرے پر پڑی ہوئی ہیں، اور ان نقاب پوشوں کے ہاتھوں روح آزادی و وقار انسانی اس بری طرح پامال ہو رہا ہے کہ انسانی تاریخ کا تاریک ترین زمانہ بھی اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ حکمرانی اور قیادتِ انسانی کا منصب جلیل جن نام نہاد متمدن کے سپرد ہوا وہ خونخواری و تباہی اور ظلم و استبداد ہی کے عنصریت ثابت ہوئے۔ ان حکمرانوں کا فریضہ تو یہ تھا کہ انسانیت کو سربلند کرتے انسان کو انسان کے ظلم و جور سے محفوظ رکھتے بنی نوع انسان کی ذہنی اور اخلاقی سطح کو اونچا کرتے مگر انھوں نے اپنے اقتدار و اختیار، آمرانہ تسلط اور ملک گیری کے جنون میں نہ جانے کتنے انسانوں کا خون بہا اور کتنے انسانوں کو محکومی و غلامی کے قعر ذلت میں پہنچا دیا۔ صرف اپنی جماعتوں اور گروہوں کی ہوس پوری کرنے کے لیے، .... صرف اپنے حرص و آز کی تسکین کی خاطر —— پھر ان لٹیرے والے کمزور قوموں پر اپنا تسلط جمانے اور ان کو غلام بنا لینے کے بعد ان کی ہر متاع عزیز لوٹ لی، ان کے دین و مذہب کو تباہ کیا، ان کے اخلاق کو بگاڑا، ان کے تہذیبی روایات کو برباد کیا اور ان کے علم و ادب کا خاتمہ کر کے رکھ دیا۔ اتنا ہی نہیں ان کے اندر تشتت و افتراق کے بیج بوئے تاکہ وہ آپس میں ہمیشہ لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کا خون بہاتے رہیں اور غلامی کی نیند ان کو کبھی بیدار نہ ہونے دے اور اس طرح امریت و استعمار کی جونک کو پورے اطمینان کے ساتھ ان کا خون چوستے رہنے کا موقع ملے۔

میں پلٹ کر گزرے ہوئے سال کی طرف دیکھتا ہوں تو سال نو کی مسرت و سرخوشی کے ہجوم میں، مجھے وہ دنیا بھی دکھائی دیتی ہے —— جی چاہے اُسے حبشہ کہہ لیجئے، چاہے فلسطین، اسپین کے نام سے پکار لیجئے چاہے چین کے نام سے —— جہاں انسان کے وطن ارضی کے ہر گوشے میں غربت و افلاس اور مصائب و آلام کی گھٹا بدستور چھائی ہوئی ہے اور لاکھوں انسان بے دردی کے ساتھ ذبح ہو رہے ہیں، سائنس نے تخریب کے انجن مہیا کر دیئے ہیں اور یہ انجن انسان کے تہذیبی کارناموں کے عظیم الشان منازل و مقامات کو بے دریغ روندنے اور نیست و نابود کرنے کے عمل میں مصروف ہیں، وہ حکومتیں جو خون اور آگ کی اس ہولی میں براہ راست شریک نہیں ہیں وہ معاشی اور اقتصادی طور پر کمزور قوموں کا خون چوس رہی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کرۂ ارضی پر قیامت آگئی ہے نفسا نفسی کا عالم طاری ہے اور ہر شخص اپنے تحفظ و بقا کی فکر میں سرگرداں ہے، انسانی ہمدردی و مواسات کی کوئی بھولی بھٹکی آواز تک کہیں سنائی نہیں دیتی۔ مفکرین عالم دم بخود ہیں —— وہ حیران ہیں کہ کیا تمدن اور اس کی تمام رعنائی و شباب کا خاتمہ قریب آگیا؟ کیا یہی حشر ہونا ہے کہ باہمی منافرت کی چھری سے انسان، انسان کو ذبح کر ڈالے؟ کرۂ ارض پر کسی انسان کا باقی رہنا ناممکن ہو گیا؟ —— یاد رکھیئے کہ اس کرۂ ارض پر آدمی صرف اسی صورت میں باقی رہ سکتا ہے کہ انسانیت کا احترام کیا جائے۔ اگر آدمی کے دل میں انسانیت کا احترام پیدا کرنے کی طرف ساری دنیا کی تعلیمی قوتیں مبذول ہو گئیں تو یہ دنیا اسی طرح خونخوار بھیڑیوں اور درندوں کا عرصۂ جنگ بنی رہے گی۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ اہل اسپین، اس کے باوجود کہ ان کی نسل ایک، قومیت

ایک، زبان ایک، اور مذہب بھی ایک، مگر انھوں نے ایک دوسرے کو بے دریغ ذبح کیا۔ اپنی تہذیب و تمدن کے گلے پر خود اپنے ہاتھوں سے چھری پھیری ـــــ اور صرف اس بنیاد پر کہ معاشی و اقتصادی نصب العین میں اختلاف تھا۔ یہی ایک حادثہ اس حقیقت کو واضح کرنے کیلئے کافی ہے کہ قومی وحدت بھی کوئی بہت پائدار قوت نہیں ہے ـــ وحدت تو بس ایک ہی ہے جو قابل اعتماد و انحصار ہے، اور وہ ہے اخوت انسانی کی وحدت، جو نسل، وطن، رنگ اور زبان سب سے بلند و برتر ہے، لہٰذا جبتک اس نام نہاد جمہوریت، اس ملعون وطنیت اور اس رسوائے زمانہ آمریت و استعمار کے پرخچے نہ اڑا دیئے جائیں، جب تک انسان اپنے اعمال و افعال سے اس امر کا مظاہرہ نہ کرے کہ واقعی وہ ساری دنیا کو ایک خانوادۂ الٰہی تصور کرتا ہے، اور جبتک نسلی، اور جغرافی قومیتوں کی تمامتر تفریقیں کلیتہً نیست و نابود نہ کردی جائیں، انسان مسرت و سرخوشی اور اطمینان و سکون کی زندگی بسر کرنے کے قابل تو ہرگز ہرگز نہ ہوسکیگا۔ آزادی، مساوات، اور اخوت و برادری کے خوبصورت تصورات کبھی عالم مثال میں وجود نہ پاسکیں گے۔

پس آیئے، آج ہم نئے سال کا آغاز کرتے ہوئے قادر مطلق سے یہ دعا کریں کہ وہ ان لوگوں کو آدمیت و انسانیت عطا کرے جو حکومت و اقتدار کے مناصب پر فائز ہیں، اور بنی نوع انسان کی محبت سے ان کے دلوں کو معمور کردے ـــ"

یہ پیغام ۱۹۳۸ء میں یعنی آج سے اٹھارہ سال پہلے حکیم مشرق اقبال نے قوم کو اور قوم کے توسط سے ساری دنیا کے انسانوں کو دیا تھا۔ یہ پیغام لاہور ریڈیو سے نشر ہوا تھا۔ اُس وقت حبشہ، فلسطین، اسپین اور چین میں انسانیت زخموں سے چور چور تھی اور حادثہ تازہ تھا، دوسری طرف اہل یورپ دوسری عالمگیر جنگ کے جہنم زار میں یورپ ہی کو نہیں ساری دنیا کو جھونک دینے کی تیاریوں میں غرق تھے۔ یہ خواب غلط ثابت ہوچکا تھا کہ جنگ کے بعد واقعی امن و سکون حاصل ہوجاتا ہے۔ آخر ساری دنیا دوسری بڑی جنگ کا ایندھن بننے کے لیے سمٹ گئی اور حکیم مشرق کے اس پیغام کے سال ہی بھر کے بعد۔ پھر جو کچھ ہوا اُس سے ہم سب آگاہ ہیں۔

آج ۱۹۵۶ء میں حالات کیا ۱۹۳۸ء سے کچھ زیادہ مختلف ہیں؟ ـــ ظاہر ہے کہ جبتک روح پاک نہ ہوگی۔ اندرون و بطون میں تبدیلی نہ ہوگی، فکر و نگاہ میں انقلاب نہ برپا ہوگا، مظاہر کیسے مختلف ہوں گے، یہ تو "خشت اول" کا معاملہ ہے، پہلی ہی اینٹ اگر ٹیڑھی رکھی گئی ہو تو دیوار آپ چاہے اوج ثریا تک اٹھاتے چلے جائیں وہ تو ٹیڑھی ہی رہیگی۔ فکر و نظر اگر مسموم ہو اور دل و دماغ میں جراثیم ہی پرورش پارہے ہوں تو پھر صحت و سلامتی کی توقع ناممکن ہی نہیں مضحکہ انگیز بھی ہے۔ اقبال نے ساری عمر اسی حقیقت کی تبلیغ کی اور یہ پیغام اُس کا آخری پیغام تھا، یوں تو کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا کہ روزمرہ کی زندگی میں چھوٹے سے چھوٹے یا بڑے سے بڑے موقع پر اقبال کی یاد تازہ نہ ہوجاتی ہو حتیٰ کہ جو لوگ اس کو فراموش کردینا چاہتے ہیں اُن کو بھی اُس کی روح کسی نہ کسی بہانے اپنی یاد پر مجبور کئے بغیر نہیں رہتی لیکن اپریل کا مہینہ اس لیئے یادگار ہے کہ اسی مہینے میں وہ اس دنیا کو اپنی ساری زندگی کا سرمایہ سونپ کر، اپنا آخری پیغام سنا کر اُٹھ گیا۔ "سرآمد روزگارے ایں فقیرے۔"

وہ مفکر تھا، فلسفی تھا، شاعر تھا، علوم مغربی کا فاضل تھا۔ علوم مشرقی کا عالم تھا۔ خواجہ غلام السیدین کی زبان میں اس دور میں سب سے بڑا انسان دوست تھا" اور قائداعظم کی زبان میں "اوّل مسلمان اور آخر مسلمان"۔ وہ انسانیت کی سربلندی کا تمنائی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یورپ سے بڑی چوک ہوئی کہ نادانستہ اس نے مجوسی ثنویت کا تصور قبول کرلیا اور اب دنیا کو مادّہ و روح کی الگ الگ خدائیوں میں بانٹ دینے کے درپئے ہے حالانکہ انسان کی تخلیق اور عناصر ترکیبی میں نہ تنہا "مادّہ" ہے، نہ تنہا "روح" ـــ بلکہ ان دونوں کی ہم آہنگ آمیزش و امتزاج کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ اسلیئے انسان نہ تو خالص مادیت کو اپنا مقصود بنا کر انسانیت کو باقی رکھ سکتا ہے نہ خالص روحانیت کو مقصود بنا کر۔ پھر انسانیت کی بقا کے لئے وحدت ضروری ہے اور وحدت انسانی کے لیئے "وحدانیت" لازمی۔ جو یہ نہیں تو پھر بنی نوع انسان کی سلامتی معلوم ـــ لازماً خون خرابہ ہوگا۔ لازماً ہنگامے اور فساد ہوں گے، استعمار بھی باقی رہیگا اور استبداد بھی، نام تو بے شک بدلتے رہیں گے مگر احوال کبھی نہ بدلیں گے۔

اقبال نے ۱۹۳۰ء میں پاکستان کا خواب دیکھا۔ ۱۹۳۲ء میں برعظیم کے ارباب فکر و نظر کو ہموار کیا، ۱۹۳۷ء میں قائداعظم نے سرگوشیاں

کیں، نئی قیادت پر انھیں آمادہ کیا۔ ۱۹۴۰ء میں اس خواب نے تجویزِ لاہور کی صورت اختیار کی۔ ۱۹۴۷ء میں زنجیرِ غلامی کی کڑیاں ٹوٹیں اور پاکستان نے رقبہ، حدود اور مملکت کا قالب پایا ——— اور آج ۱۹۵۶ء اس خواب کا ایک تکمیلی قدم ہے۔

زندگی نام ہے ارتقا کا، مسلسل ارتقا کا، ہم نے ارتقا کے مراحل پر مراحل طے کئے، جن میں ایک مرحلہ ۲۳ مارچ کو سامنے آیا مگر یہ مرحلہ بھی آخری نہیں، ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں، اور ہمیں آگے بڑھنا ہے۔

۲۳ مارچ کو پاکستان "جمہوریہ" بن گیا۔ ظاہری غلامی کی آخری زنجیر بھی کٹ کے گر گئی، جمہوریہ کے معنے ہیں، وہ مملکت جس میں جمہور، نمائندگان جمہور کا اقتدار باقاعدہ تسلیم کیا جاتا ہو۔ وہ سوسائٹی جہاں تمام افراد ایک دوسرے کے مساوی تصور کئے جائیں ——— بلاشبہ یہ ایک نہایت ہی مبارک قدم ہے اور ایک خوش آیند عہدِ نو کا آغاز ——— تہذیبی و تمدنی، اور قومی و انسانی نقطۂ نظر سے موجودہ دستور بہت اچھا اور آئیڈیل نہ سہی لیکن اجتماعی زندگی کی ایک شیرازہ بندی تو یقیناً ہو گئی۔ ایک رُخ تو ضرور متعین ہو گیا۔ ساتھ ہی سیاستدانوں اور قومی رہنماؤں کے سر نئی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریاں بھی عائد ہو گئیں۔ لیکن جتنی ذمہ داریاں ان کے سر عائد ہوئیں ان سے کچھ ذمہ داریاں نہیں جو ملک کے شاعر، ادیبوں اور فنکاروں کے سر عائد ہوتی ہیں، اقبال نے کہا تھا: "لٹیرے کمزور قوموں پر اپنا تسلط ہی نہیں جماتے ان کو غلام بنا لینے کے بعد ان کی ہر متاعِ عزیز کو لوٹ لیتے ہیں۔ دین و مذہب، اخلاق و کردار، تہذیب و روایات، علم و ادب کسی چیز کو بھی باقی نہیں چھوڑتے" ——— غلامی کے ان کٹھن اور ہولناک مصائب سے ہماری قوم بھی گذری ہے۔ اور اب دیکھنا یہ ہے کہ اس دور میں ہماری کس کس متاعِ عزیز پر ڈاکے پڑے اور کس کس طرح پڑے۔ ہماری کون کون سی دولتیں اور نعمتیں کہاں کہاں لوٹی گئیں، کچھ نہ کچھ دولت و نعمت تو آخر ہم بھی رکھتے ہوں گے ——— ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کے بعد ہمیں ازسرِنو اپنا جائزہ لینا ہے۔

ہماری تہذیب و ثقافت، تاریخ و روایات اور قومی دلی اور انسانی کارناموں کے ذخیرے طول و عرض میں اسی طرح بکھرے پڑے ہیں۔ جس طرح سرزمین پاکستان کا چپہ چپہ قدرتی وسائل و معدنیات کا بے پایاں ذخیرہ اپنے دامن میں لئے انتظار کی راہ دیکھ رہا ہے۔ حریت و آزادی، زندگی اور زندہ دلی آواز پر آواز دے رہی ہے کہ۔

دل از تاب بلا بگداز و خوں کن ز دانش کار نکشاید جنوں کن

انتظار ———

تو عادلِ مطلق ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

(اقبالؒ)

پروفیسر کلیم الدین احمد

"تنقید ہماری زندگی کیلئے اتنی ہی ناگزیر ہے جتنی سانس"۔

یہ جملہ ایلیٹ کا ہی، اور میری نظر میں بڑا عمق اور بڑی گہرائی اپنے اندر رکھتا ہی۔ گرچہ شواہد ایسے موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہی کہ خود ایلیٹ کے نزدیک کوئی عمق اور کوئی گہرائی اس جملے میں نہ تھی، یہ بات "اتفاق" کسی اضطراری جذبے کے ماتحت اس کے قلم سے نکل گئی تھی اُسے محسوس تک نہ ہوا کہ وہ کیا کہہ گیا حالانکہ اس سیدھے سادے جملے نے واقعتاً سب سے بڑی اور بیش بہا صداقت کا سرا تھام لیا ہی، اس جملے کو ایک مرتبہ پھر پڑھئے وہ کہتا ہی "تنقید ہماری زندگی کیلئے اتنی ہی ناگزیر ہے جتنی سانس" ۔۔ اور یہ واقعہ ہی کہ تنقید ایک فطری نعمت اور بیش بہا ودیعت ہی، اتنی ہی فطری اور بیش بہا جتنی کہ "بینائی" یا "گویائی" کی نعمت ہی بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ ۔۔ لیکن بینائی یا گویائی ہی کی قدر و قیمت کو ہم پوری طرح کب پہچانتے ہیں؟ عام طور پر تو لوگوں نے بس فرض سا کر لیا ہی کہ ہاں یہ چیزیں بھی ہیں حالانکہ یہ چیزیں بھی اتنی ہی ناگزیر ہیں جتنی کہ نفس کی آمد و شد ہمارے لیے ناگزیر ہی، اصل یہ ہی کہ ان نعمتوں کی "فطرتیت" اور "ناگزیزی" نے ان کی حقیقی قدر و قیمت اور حیثیت اور منزلت کو ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا ہی، بچہ اپنی آنکھوں کو استعمال کرتا ہی اور ان کا استعمال خود بخود ہی سیکھتا ہی، اس کی قوت گویائی نشو و نما پاتی ہی تو اس کی نشو و نما بھی تقریباً آپ ہی آپ ہوتی ہی۔ اس میں ایک بات یہاں اور جوڑ لیجیے کہ بچے کی تنقیدی صلاحیت و استعداد بھی اسی طرح بالکل فطری اور طبعی انداز سے خود بخود بڑھتی اور ابھرتی ہی۔ یہ صلاحیت بڑی دھیمی رفتار سے ابھرتی ہی اور بالکل غیر مرئی ہوتی ہی۔ گرچہ ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہی جہاں ہم اسے دیکھ بھی سکتے ہیں کہ فرق و تمیز کی صلاحیت بچے کے اندر صاف نمایاں ہی۔ مثلاً دو کھلونے اس کے سامنے رکھ دیجئے پھر دیکھئے۔ ان میں سے ایک کو وہ پسند کرے گا اور دوسرے کو صاف رد کر دے گا۔

فرق و تمیز کی اس صلاحیت کا ظہور ہوتا تو آغاز ہی سے ہی مگر ابتدا میں وہ "طبعی جبلت" کا انداز لیے ہوتی ہی، بچہ تمیز تو کرتا ہی، مگر اس معاملۂ تمیز میں وہ کسی ناقابلِ فہم جبلت کے زیر اثر ہوتا ہی۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہی سوچ سمجھ کے نہیں کرتا اسے مطلق خبر نہیں ہوتی کہ اس نے جو فلاں حرکت کی تو اس کا اصلی سبب اور محرک کیا تھا، وہ کون سی چیز تھی جو اس عمل کی موجب ہوئی یا اگر کچھ آگہی اس کو ہوتی بھی ہو تو بہت ہی دھندلی اور گول مول سی ہوتی ہوگی۔ وہ اپنے کسی عمل کے "سبب" سے نہ تو پوری طرح خود آگاہ ہوتا ہی نہ اپنی اس "معقولیت" سے کسی دوسرے کو آگاہ کر سکتا ہی۔ قوت نقد و انتقاد تو بیشک موجود ہوتی ہی، مگر ناصاف اور غیر مربوط، وہ مختلف چیزوں میں تقابل بھی کرتا ہی، امتیاز بھی برتتا ہی، آنکتا بھی ہی اور تخمینہ بھی کرتا ہی لیکن اس کا یہ آنکنا اور تخمینہ کرنا انتہائی بچی اور شخصی نوعیت کی چیز ہوتی ہی اور اتنی ہی ڈانواں ڈول بھی، یعنی اس میں استقلال بالکل نہیں ہوتا، اور جیسا کہ ابھی میں نے کہا، اس کی یہ کیفیت نہایت مبہم سی اور بے ربط ہوتی ہی۔

نقد و انتقاد اور فرق و امتیاز کی واضح اور مربوط صلاحیت کی کمی جس طرح بچوں میں ہوتی ہے اسی طرح جوانوں میں بھی ہوتی ہے۔ اس معاملے میں دونوں ملتے جلتے سے ہیں۔ عام طور پر ایک جوان آدمی بھی ان اسباب و وجوہ کی کوئی معقول توجیہہ نہیں کر پاتا جن کی بنا پر اس کی پسند اور ناپسند کا جذبہ حرکت میں آتا ہے، اور وہ ایک چیز کو تو قبول کر لیتا ہے اور دوسری کو مسترد کر دیتا ہے۔ بعض خاص چیزوں کو دوسری چیزوں پر ترجیح دیتا ہے، ان میں باہم مقابلہ کرتا ہے، ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتا ہے اور ایک خاص احساس کی سی کیفیت اس کے اندر پائی جاتی ہے۔ مگر پوچھیئے کہ وجہ ترجیح کیا ہے؟ تو عموماً وہ یہی کہے گا کہ بس "مجھے پسند" ہے۔ یہ انداز بیان اور یہ طرز اظہار بظاہر خوش نما تو بیحد معلوم ہوتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس بیان کے اندر کوئی عقلیت نہیں ہوتی۔ آج تنقید کے نام سے بھی جتنی چیزیں گزر رہی ہیں ان میں بھی آپ یہی نقص پائیے گا۔ ان میں بڑی طلاقت اور بڑا طنطنہ ہوگا۔ الفاظ و عبارات کی بھی خوب ہی بہتات ہوگی، دلائل بھی بڑے شان دار ہوں گے اور زاویۂ نظر بھی بڑے شعور اور تمیز داریوں کا حامل معلوم ہوگا، لیکن غور کیجیے تو ان کی حیثیت بھی بنیادی طور پر اس جملے سے بہت زیادہ مختلف نہ ہوگی جو عام طور پر لوگ اپنی روزمرہ کی پسند اور ناپسند کے معاملے میں ظاہر کرتے رہتے ہیں، یعنی وہی بے خبری، عناصر و اصول کی؛ وہی بے شعوری، خود اپنے صادر کردہ فیصلوں کی نوعیت کی طرف سے؛ وہی ریلا من موجی پن کا، اور وہی فقدان نظم و ترتیب کی اُس لطافت و نزاکت کا جو تسلی بخش کیفیات و نتائج کی واحد ضمانت تھی۔

یہ ممکن ہے کہ ایک نقاد "ہوڈ" کی نظم ODE TO AUTUMN کو نہایت ہی لطیف و نفیس نظم تصور کرے، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ "ملٹن" کو "ڈون" پر ترجیح دے، بلکہ یہ بھی ناممکن نہیں کہ اپنی وجہ ترجیح کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے ہمہ قسم کے بظاہر نہایت ہی مستحکم اور دقیقہ رس دلائل بھی پیش کر دے۔ لیکن آخری تجزیہ و تحلیل کی میزان پر پہنچ کر تو یہ سارے دلائل عامیوں کے اس بے بصرانہ جملے سے نہ تو بہتر ہی نظر آئیں گے نہ مفید ہی، جو کہہ اُٹھتے ہیں کہ "مجھے تو یہی پسند ہے"۔

یہ سہی کہ تنقید اتنی ہی ناگزیر شے ہے جتنی نفس کی آمد و شد، اور اس کی نشو و نما بھی فطری طور پر خود بہ خود ہی ہوتی ہے، پھر بھی زندگی اور ادب میں اس کی نشو و نما کا جو حال ہے اُسے مشکل ہی سے تسلی بخش کہا جا سکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہم لوگ اس کی طرف سے بڑی سخت بیگانہ وشی اور بے اعتنائی برتتے چلے آئے ہیں، اور ہماری بے حسی اور مردہ دلی کی یہ انتہائی حیرت ناک مثال ہے۔ تنقید کے بغیر زندگی ناممکن ہے۔ اسی طرح ناممکن، جیسے ہم سانس لینا چھوڑ دیں تو اسی لمحے مر جائیں۔ تنقید ہمارے دم کے ساتھ ہے۔ یہ ہماری معین و مددگار ہے۔ ہمیں رستہ دکھاتی ہے اور سنبھالے رکھتی ہے۔ زندگی کا ایک ایک شعبہ اس کی قوت و اثر کو محسوس کرتا ہے، اس کا ممنونِ کرم ہے، اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ زندگی کا شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزرتا ہو جس میں ہم "تنقیدی فیصلے" نہ کرتے ہوں، معاملہ چاہے "نائنوں" کے انتخاب کا ہو یا پیشے یا کاروبار کا، یا آمریت کے مقابلے میں جمہوریت کا "فلارنس نائٹنگیل" کی تحسین ہو یا "لکزیریا بورگیا" کی تنقیص ــــــ مادی آسائش و آرام پر سکین روحانی کی برتری واضح کرنی ہو یا شیکسپیئر کو ایڈگر بولیس سے زیادہ اہم ثابت کرنا ـــ ہر جگہ ہر چیز، ہر بات میں تنقیدی صلاحیت ہی ہماری راہ نما ہوتی ہے۔ کوئی جج ہو یا چودھری، کوئی عامی ہو یا تاجر، سائنس داں ہو یا عطائی، وکیل ہو یا ڈاکٹر، سپہ سالار ہو یا فلسفی، حتیٰ کہ طوائف تک ـــــ سب کے سب نقد و انتقاد میں غرق ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کی کامیابی منحصر اس بات پر ہے کہ وہ اپنی تنقیدی قابلیت و صلاحیت کا استعمال صحیح طور پر کرتا ہے یا نہیں۔

یہاں ممکن ہے یہ اعتراض کیا جائے کہ میں نے اس لفظ تنقید کو ضرورت سے زیادہ ہمہ گیری بخش دی، لیکن اک ذرا ٹھیریے اور غور کیجیے، آپ پر خود واضح ہو جائے گا کہ تنقید کے اس مفہوم میں نہ تو کوئی کمی کی گئی ہے نہ زیادتی۔ اصل یہ ہے کہ تنقید کا استعمال ایک ثبت دلاذ

سے بہت ہی محدود اور مخصوص معنوں میں ہوتا رہا ہے، ابتک اسے فقط "ادبی تنقید" کے دائرے میں بند رکھا گیا ہے، اس لیے ہمہ گیر صورت میں جب بھی اسے پیش کیا جائیگا ایک اچنبھا سا ضرور محسوس ہوگا۔ ورنہ ادبی تنقید تو نقد و انتقاد کی بے شمار شکلوں میں سے بس ایک شکل ہے اور غالباً بلند ترین بھی، مگر صرف اسی ایک شکل تک اس کو محدود و محصور رکھا گیا جس کی وجہ سے اس کی اہمیت اور قدر و منزلت بہت کم ہوگئی۔ گرچہ خالص ادبی تنقید بھی بڑی گرانقدر چیز ہے اور اتنی بلند کہ احمقانہ تمسخر یا بے مغزانہ تحقیر کا ہاتھ اس کے دامن کو چھو بھی نہیں سکتا تاہم اگر تنقید کو اس کے عمومی و ہمہ گیر مفہوم میں لیجیے تو پھر یہ اتنی ضروری اور ناگزیر شے ہے جتنی ضروری اور ناگزیر شے "ہوا" ہے جس کی بدولت ہم سانس لے رہے ہیں، اور اتنی ہی بیش بہا بھی — تقابل، تجزیہ، فرق و امتیاز، اور تعیین قدر و مقام تنقید کے "چار پہیے" (یا عناصر اربعہ) ہیں۔ انتہائی کودن سے کودن اور لاابالی قسم کا آدمی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ شعوری یا تحت الشعوری طور پر ہم میں سے ایک ایک فرد، تقابل، تجزیئے، فرق و امتیاز اور تعیین قدر و مقام کے عمل میں ہمہ دم مصروف ہے، یعنی ہم اگر چاہیں بھی تو اس "عمل" کو روک نہیں سکتے جس میں ہم مستقل ڈوبے ہوئے ہیں، نہ کسی ہوش مند آدمی کے خواب و خیال میں کبھی یہ بات آ سکتی ہے کہ اس عمل کو روک دیا جائے۔ اس کا روکنا تو خودکشی کے مرادف ہے۔

اگر آپ کو اپنا تحفظ و بقا مطلوب ہے تو اس کا راستہ یہی ہے کہ تنقید کو سمجھیے، اس کی حقیقی قدر و قیمت کو پہچانیئے، اس کے صحیح استعمال کا طریقہ سیکھیے، لیکن یہ راستہ اتنا آسان بھی نہیں، کیونکہ تنقید بلا مبالغہ ایک بہروپیہ ہے، ایسی ایسی شکلیں بدلتی ہے اور اتنی صورتیں اختیار کرتی ہے کہ اس پر قابو پانا بے حد دشوار ہے، لیکن قابو پانا بہرحال ضروری ہے۔ ہم اس کے اسرار و رموز سے ضرور واقف ہو سکتے ہیں۔ بلکہ صاف لفظوں میں اسے یوں کہیے کہ تنقید کو ہمیں اپنا اصل موضوع اور مقصود بنانا چاہیے۔ تنقید ایک چمن ہے اور اپنے اس چمن کو ہمیں خود ہی سینچنا اور تیار کرنا پڑے گا۔ ہماری بے مغزانہ بلکہ مجرمانہ غفلت کی وجہ سے تنقیدی صلاحیت و استعداد کی جیسی کچھ نشو و نما ہونی چاہیئے، ہو نہیں رہی ہے، ضرورت اس لگن کی ہے کہ ٹھیک سے اس کی نشو و نما ہو، مگر اس کی پوری پوری نشو و نما کا واحد ذریعہ محتاط اور صحیح تربیت ہے، اور اس تربیت کا آغاز بھی شروع ہی سے ضروری ہے، اور جس قدر باقاعدگی بھی اس میں ممکن ہو برتی جانی چاہیئے، بالخصوص تعلیم ہی کے زمانے سے۔ کیوں کہ اس عمر میں آدمی کا دل و دماغ انتہائی اثر پذیر ہوتا ہے اور آسانی سے مڑنے اور ڈھلنے کی پوری صلاحیت ان میں رہتی ہے، ہاں یہ کہا تو جا سکتا ہے کہ تعلیم کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی، تربیت تو ہم پاتے ہی ہیں لیکن تعلیم گاہوں میں وہ تربیت ہمیں کہاں ملتی ہے جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں۔ تعلیم کے زمانے میں ہماری قوت تنقید پراگندہ رہتی ہے اور اس کا ظہور اتفاقاً ہی ہوتا ہے اور کوئی معقول رہنمائی ہمیں مطلق نصیب نہیں ہوتی، وہاں تو ہم یونہی تیر تکے چلاتے رہتے ہیں، اور جب وہاں سے نکلتے ہیں تب بھی زندگی بھر تیر تکے ہی چلا چلا کر کام نکالتے رہتے ہیں۔

اس تیر تکے والی کیفیت کو کیسے روکا جائے۔ اصل سوال یہ ہے۔ حیوانات کو دیکھیے، اس معاملے میں ان کے مظاہرے ہم سے کہیں بہتر ہیں، تنقید کی یہ نعمت ان کو "جبلت" کی شکل میں ودیعت ہوئی ہے اور بڑی حد تک ان کے تحفظ و بقا کا دار و مدار ان کی اسی جبلی قوتِ تمیز پر ہوتا ہے۔ ماقبل تاریخ انسانی کا آدمی بھی پہلے اسی قسم کی جبلت کا حامل تھا اور بچہ آج بھی اسی جبلت کا حامل ہوتا ہے مگر جب بڑا ہو جاتا ہے تو اس کی یہ جبلت عقل و دانش بن جاتی ہے، یا بن جانا چاہیے۔ ماقبل تاریخ انسانی کا آدمی اپنے اندر بہت ساری اور بھی جبلتیں تقریباً اسی قسم کی رکھتا تھا جیسی جانوروں کے اندر ہوتی ہیں، مگر عقل و تعقل کی نشو و نما اور تمدن کی طرف اس کے تدریجی ارتقاء نے ان جبلتوں کو پژمردہ کر دیا پھر رفتہ رفتہ وہ غیر ضروری ہو کر رہ گئیں، آخر ختم ہو گئیں، اور اب آدمی آہستہ آہستہ اپنی عقل و فہم پر اعتماد کرنے لگا اور یہ کیفیت بڑھتی چلی گئی۔ عقل و فہم کو جبلتوں پر فوقیت اور برتری حاصل ہے۔ کیونکہ جبلتیں آنکھ بند کر کے یکسر میکانیکی انداز سے

عمل کرتی ہیں اور ان کو اپنے اجزائے ترکیبی یا نظامِ عمل کا مطلق شعور نہیں ہوتا لیکن عقل اس کے برخلاف آنکھ بند کرکے میکانکی [illegible] سے عمل نہیں کرتی یہ جبلتوں سے بلند و برتر اس لیے بھی ہے کہ اُسے اپنے وجود کی پوری طرح خبر ہوتی ہے۔ جبلتیں بقائے ہستی میں ہماری معاون و مددگار تو ہو سکتی ہیں لیکن عقل ہماری ترقیوں کے امکانات پیدا کرتی ہے، دروازے کھولتی ہے۔

پس تنقید ایک عقلی صلاحیت و استعداد ہے، اسے ڈھیلے ڈھالے الفاظ میں یوں کہیئے کہ یہ ارتقا یافتہ اور مہذب شائستہ شکل ہے جانوروں والی جبلتِ امتیاز کی۔ اور اسی کی مہربانیوں سے تمدن وجود میں آیا ہے۔ لہٰذا بہتر سے بہتر نتائج و ثمرات کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ اس کی پرورش و پرداخت نہایت ہی احتیاط کے ساتھ کی جائے اور جسمانی صلاحیتوں کی طرح اس کو بھی ایک سخت اور مرتب قسم کے ضابطے کے ماتحت رکھا جائے۔ یوں تو ہم لوگ اچھل کود بھی سکتے ہیں، دوڑ بھاگ بھی سکتے ہیں اور خوب چھلانگیں بھی لگا سکتے ہیں، لیکن سلیقے سے ناچنا اور ڈانس کرنا ہو تو اس میں حسن پیدا کرنے کے لیے یہ بڑا ضروری ہے کہ آدمی سخت سے سخت ریاضت و تربیت کی منزلوں سے گزرے، جسم پر اور جسم کے اعصاب پر پورا پورا قابو اس کو حاصل ہو، اور جسم کی ساری حرکتیں اور جنبشیں ایک بلند تر مقصد کے ماتحت اور مطیع ہوں، ٹھیک اسی طرح عقل و فہم کی صلاحیت و استعداد کو بھی باقاعدہ تربیت دینا، اس پر قابو پانا اور ایک بلند تر مقصد کے ماتحت رکھنا ضروری ہے۔

بجز اس فوری ضرورت و احتیاج کے جو بقائے وجود سے تعلق رکھتی ہے۔ جانوروں کو اور کسی بلند تر مقصد کا شعور نہیں ہے، مگر مہذب اور متمدن آدمی کی نظر اس فوری اور بیّن یا افتادہ ضرورت و احتیاج سے پرے بھی پڑتی ہے، اور ظاہر ہے کہ پڑنی چاہیئے، اس کی نظر میں فقط زندہ رہنا کافی نہیں، وہ اس ہستی کو اس لائق بھی بنانا چاہتا ہے کہ یہ ہستی قابلِ تمنا ثابت ہو، وہ بلند تر زندگانی اور رفیع المرتبت طرزِ حیات کا تصور بھی کر سکتا ہے اور اس کا طلبگار رہتا ہے۔ اس بلند تر زندگانی اور رفیع المرتبت طرزِ حیات کی صحیح نوعیت کی بحث اس وقت میرے موضوع سے متعلق نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں صرف اتنا تسلیم کر لینا بھی کافی ہے کہ فقط زندہ رہنا نہیں بلکہ اس سے بھی کچھ بلند اور بہتر صورتِ حیات کی طلب اس کی مراد ہے، مگر یہ طلب پوری صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ تنقید کا صحیح استعمال کیا جائے کیونکہ ہمارے برتر اور اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا۔ منحصر ہی اس بات پر ہے کہ بقائے ہستی کی فوری اور بیّن یا افتادہ طلب و احتیاج سے پرے نظر رکھنے کی صلاحیت ہمارے اندر کتنی موجود ہے۔ ہم اس بات پر قانع نہیں ہو سکتے کہ ہمیں جو چیز جس حالت میں بھی مل جائے اسی حالت میں اس کو قبول کر لینے پر اکتفا کر لیں اور احوال و ظروف کے سامنے ہتھیار ڈال کر خود انھیں کے سانچے میں ڈھل جائیں۔ جی نہیں ہم تو مسلسل غور و تامل سے کام لیتے ہیں، چیزوں کو خوب جانچتے اور پرکھتے ہیں، تب انھیں قبول کرتے ہیں یا مسترد کرتے ہیں، حیات کی مثال اس جوار (مد) کی سی ہے جو اپنی حرکت میں معلوم تو خاموش و مستِ خواب ہوتی ہے لیکن ہر زندہ چیز کو دمبدم آگے ہی بہائے لیے چلی جاتی ہے۔ ہر زندہ چیز ابھرتی اور بڑھتی ہوئی مد کے ساتھ پے بہ پے ابھرتی، بہتی اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ بجز انسان کے۔ ایک انسان ہی ہے جو حیات کا تفحص کرتا ہے۔ اس کے اسرار و رموز پر قابو پانے کی جد و جہد کرتا ہے اور پھر ان کی قدر و قیمت اور حقیقت کو جانچتا پرکھتا اور تولتا ہے۔

لہٰذا یہ واضح ہوا کہ تنقید کی قدر و قیمت کا انکار در اصل زندگانی کی قدر و قیمت کا انکار ہے اور اپنی ایک بیش بہا میراث کو قبول کرنے سے انکار ہے۔ تنقید تو ایک صحیح تربیت پائے ہوئے شائستہ اور مہذب دماغ کا عمومی جوہر و وصف ہی ہے اور اس کی بے انتہا متنوع رنگا رنگ خصوصی شکلیں بھی ہوتی ہیں۔ بہر صورت ناگزیر ہے، ماہرِ دینیات ہوں یا فلسفی، ڈاکٹر ہوں یا وکیل، یا کوئی سائنس داں، تنقید کے تو سبھی دست نگر ہیں، اور ان کو چاہے کوئی علم اس کا ہو یا نہ ہو تنقید کی کسی نہ کسی خاص شکل پر ان کا انحصار ہوتا ہے

ساری تحقیق و تفتیش، ساری تلاش و جستجو اور ساری قیاس آرائیاں، چاہے وہ فکر و خیال کی ہوں چاہے مادیات کی، چاہے روح کی، اگر ان سب کی ہدایت و انصرام کے لیے خصوصی اشکال و صُوَر کے مرتب نقشے بھی موجود نہ ہوں تو ان میں بڑا انتشار پھیل جائے گا۔ اور وہ قطعی بے ثمر ثابت ہوں گی۔ پھر وہ آلات جو بحفاظت تمام ان کو ساحل مراد تک پہنچانے کے لیے خاص طور پر بنائے گئے ہیں، اگر نہ ہوں تو یہ ساری چیزیں ترادِھر سے اُدھر بھٹکتی بہکتی اور گھسٹتی پھریں گی —— یہ آلات کیا ہیں؟ — آلاتِ تنقید! جو اسی مقصد کے لیے وجود میں آئے ہیں کہ وہ حاصل ہونے والے تمام اعداد و شمار کی چھان بین کریں ان کو جوڑیں اور مرتب کریں، سنواریں اور درست کریں، جانچیں اور پرکھیں لہٰذا وہ ماہر دینیات جو واقعات کو سند پر قبول کرتا ہو اور وہ سائنس داں جو کسی معقول سائنٹفک ثبوت کے بغیر کوئی چیز قبول نہیں کرتا، دونوں کو اپنے اپنے آلات پر یکساں اعتماد کرنا پڑتا ہے، یہ آلات بہت سے مواقع پر مادی صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں، مثلاً نظامِ قانونی، جج، وکلا، عدالتیں، قید خانے، پولیس اور قیدی۔ یہ سب کے سب انھیں کی ایک مادی صورت تو ہیں۔ اس پیچیدہ اور بے ڈھنگے نظام کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ چھان بین کی جائے، جانچا پرکھا جائے اور فیصلے کیے جائیں، جالینوس کی قرابادین بھی یہی خدمت انجام دیتی ہے اور قرابادین ہی کی طرح، عہد جدید کے علم الطب کا مقصد بھی وہی ہے جس کے ذرائع و وسائل لاتعداد ہیں۔ ماڈرن فرمیتو آزمائشی نلکیاں اور دیگر آلات اور پھر ساز و سامان سے آراستہ عمل گاہیں سب اسی کی مثالیں ہیں۔

یہ ساری چیزیں اور بالخصوص مادی آلات بے انتہا مفید ہیں پھر بھی ان کی افادیت محدود ہے اور یہ کسی خاص قسم کے معروف حلقۂ عمل ہی میں کام دیتے ہیں، کسی مریض کی نسبت معلوم کرنا ہو کہ وہ بخار کی وجہ سے جاں بحق تسلیم ہوا یا کینسر کی وجہ سے تو اس معاملے میں سارے کا سارا نظام قانون بیکار ہے، اسی طرح بغاوت یا مداخلت بے جا کا فرق دریافت کرنا ہو تو قرابادین اس کی "تشخیص" میں قطعاً کوئی مدد ہمیں نہیں پہنچا سکتی، پھر اس قسم کے بیشتر آلات امراض ہی کا پتہ لگا سکتے ہیں یا جرائم کا مثلاً قانون کسی ملزم کے جرم کا یا کسی خاص جرم میں اس کی بے گناہی کا فیصلہ تو کر سکتا ہے لیکن یہ فیصلہ ہرگز نہیں کر سکتا کہ وہ شخص طبعاً معصوم ہے۔ کسی قانون پسند شہری پر قانون بالواسطہ ہی اثر انداز ہوتا ہے۔ وہ اس کی بے گناہی کا فیصلہ تو کر سکتا ہے لیکن یہ فیصلہ ہرگز نہیں کر سکتا وہ شخص طبعاً معصوم ہے کسی قانون پسند شہری پر قانون بالواسطہ ہی اثر انداز ہوتا ہے، وہ اس کی بے شمار ایجابی خوبیوں اور نیکیوں پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا۔ قانون کا اصلاً تعلق سماجی خطاکاروں سے ہے۔ قانون پسند شہریوں سے نہیں، جیسے علم طب کا تعلق بیمار جسموں سے ہوتا ہے مگر طبعی طور پر جو آدمی صحت مند ہے اس کے حق میں ماڈرن سائنس کے جملہ اسباب و وسائل بالکل بے محل معلوم ہوں گے۔

بہر کیف روحِ تنقید کے خصوصی مظاہر کو بہت زیادہ سختی کے ساتھ صرف اُن ہی متعلقہ حلقوں تک محدود نہ رہنا چاہیئے زندگانی بڑی پیچ در پیچ تنظیم ہے، اس کے مختلف شعبے ایک دوسرے سے جداگانہ تو ہیں مگر سب کے سب اسی لیے ناقابلِ تقسیم انداز سے باہم مربوط ہیں بعض لحاظ سے کسی خاص شعبے کی مہارت خصوصی بڑی اچھی چیز ہوتی ہے، بلکہ زندگی کی پیچیدگی اور آدمی کی عمر کے اختصار کی وجہ سے یہ کچھ ضروری بھی ہے کیونکہ کوئی فرد واحد اطمینان بخش طور پر علم و دانش کے تمام شعبوں پر قدرت حاصل نہیں کر سکتا وہ زیادہ عرصہ تک زندہ بھی نہیں رہتا اس لیے کسی ایک شعبے میں مہارت خصوصی پیدا کر لینا اس کے لیے ضروری ہے مگر اس کو ایک "لازمی برائی" (اور مجبوری) تصور کرنا چاہیئے۔ ایک ماہر خصوصی (اسپیشلسٹ) اپنے آپ کو کسی خاص حلقے میں محصور کر لیتا ہے اور یہ حلقہ بڑا تنگ اور محدود ہوتا ہے۔ اس کی فکر و نظر محدود ہو کے رہ جاتی ہے، اس کا احساس تناسب ضائع ہو جاتا ہے پھر وہ اشیا پر نگاہ صحیح تناسب سے ڈال ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا اسے یاد رکھیے کہ زندگانی کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں کاٹ کر تقسیم نہیں کیا جا سکتا علم و دانش کی مختلف شاخیں باہم پیوستہ اور مربوط ہیں اور ایک دوسرے کا سہارا ہیں۔

ایک وکیل کو اگر علم طب میں

حاصل ہو تو وہ بہتر وکیل ہو سکتا ہے، ایک ڈاکٹر اگر علم النفس بھی حاصل کر لے تو اس کی افادیت میں اضافہ ہو جائیگا اور بقول ایلیٹ اگر شاعر نقاد بھی ہو تو وہ بہتر شاعر ہوگا۔

تنقید کی بہت سی اور خصوصی شکلیں تو سامنے آئی نہیں، بس ایک ہی شکل "ادبی تنقید" کے نام سے سامنے آئی تو اس خوب خوب سب و شتم ہوئی، سخت لے دے ہوئی۔ "ادبی تنقید اپنی ذات سے الگ کسی دوسری چیز سے متعلق ہوتی ہے اور یہ دوسری چیز ادب ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ ادب کے بغیر خود اس کا کوئی وجود نہیں، تو پھر یہ ایک "طفیلی" ہوا۔ حالاں کہ طفیلی کا اس کے لیے کسی طرح صحیح نہیں۔ تنقید اپنے عمومی اور ہمہ گیر مفہوم میں ــ جہاں فیصلوں کی قدر و قیمت کا تعین ہوتا ہے، عقل و فہم کے آزادانہ عمل اور فرق و امتیاز کے احساس و شعور کا معاملہ ہو ــ صرف ادب ہی سے متعلق نہیں ہوتی (اگر واقعی کسی چیز سے متعلق ہونا ہی اس کے لیے ضروری ہو) بلکہ حیات سے متعلق ہوتی ہے، تنقید تو ختم ہی اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ خود حیات ختم ہو جائے۔ تنقید کو وجود میں لانے والی تو حیات ہی ہے، کہ وجود میں اس کو لاتی بھی ہے اور پھر اپنے تسلسل و ارتقا میں اسی پہ انحصار بھی کر لیتی

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
صدر شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی

حضرت مذاق میاں صاحب

آج سے کوئی پچیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ جب علی گڑھ یونیورسٹی پہنچا تھا، جن لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوا اُن میں مرحوم ڈاکٹر ایم۔ کے۔ حیدر بھی تھے۔ شہرت سنا تھا کہ [illegible] چاہا کہ ان کی بھی زیارت کروں، میرے ایک بزرگ نے تعارف کرایا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی عادت کے مطابق شعبہ اقتصادیات کے دفتر میں بیٹھنے کی بجائے شعبہ کے سامنے سڑک پر کرسی ڈالے بیٹھے تھے، تعارف ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے دریافت فرمایا۔ آپ کا وطن کہاں ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے بدایوں کا نام لیا۔ کیونکہ علی گڑھ کے طالب علموں کے حلقے میں بدایوں کی صرف دو ہی چیزیں مشہور تھیں، بدایوں کے ممتن کے پیڑے جو ہر نیا آنے والا طالب علم اپنے ساتھ ضرور لاتا تھا اور دوسرے "للّو" اور ان دونوں کی شہرت کے نتیجہ کے طور پر جن منازل اور مراحل سے گزرنا پڑتا تھا وہ نو وارد طلبہ کے لئے زیادہ خوشگوار نہیں تھے۔ بہرحال بدایوں کا نام سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کے ہونٹوں پر وہ خوش مزاجی کی مسکراہٹ رقص کرنے لگی جو میں نے صاحب لوگوں میں کبھی نہیں دیکھی۔ فوراً فرمایا "اوہ۔ خطۂ یونان۔ خطۂ یونان" میں سمجھا شاید ڈاکٹر صاحب نے کچھ طنز کیا، لیکن بعد میں وہ بڑی سنجیدگی سے بدایوں کے بعض اکابر علماؤ، ادیب اور شاعروں کا ذکر کرنے لگے جن کے نام تو میں نے پہلے بھی سنے تھے لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ اُن کی شہرت اور عظمت اس چھوٹی سی قدیم شرفا کی بستی سے نکل کر دور تک پہنچی ہے۔ مُلّا عبدالقادر بدایونی کے نام اور کام سے میں واقف تھا، فانی بدایونی کی غزلیں بھی لوگوں کو پڑھتے اور گلیوں میں گاتے سنی تھیں، میر محفوظ علی صاحب مرحوم بقید حیات تھے اور میں ایک دو مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر بھی ہوا تھا لیکن سچ یہ ہے کہ اس وقت میں میر صاحب کی عظمت، اردو طنز و مزاح کی تاریخ میں اُن کے مرتبہ، اُن کے وسیع علم اور بصیرت کا پوری طرح احساس نہ کر سکا تھا۔ لیکن ڈاکٹر ایم۔ کے۔ حیدر کے اس دن کے فقرے کے بعد اور پھر جب کچھ شعور میں پختگی آئی کچھ مطالعہ بڑھا تو خطۂ یونان کی حقیقت کسی قدر واضح ہوئی۔

بدایوں مدینۃ الاولیا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیا کے والد ماجد حضرت سید احمد صاحب اور اُن کے خاندان کے دوسرے اکابر اسی خاک پاک میں آسودہ ہیں اور یہیں امیر خسرو کے استاد اور پیر و مرشد نے سلوک اور تصوف کی منازل طے کیں، صرف احمد کے نام کے سات اکابر صوفی یہاں آسودہ ہیں اور یہ طویل سلسلہ شہاب الدین محمد غوری کے عہد سے شروع ہو کر آج تک جاری رہا۔ انہی بزرگوں میں سید محمد دلدار علی صاحب مذاق میاں بھی شامل ہیں۔

مذاق میاں کا روحانی فیض آج تک جاری ہے لیکن اُن کا کلام نظم و نثر جو مختلف مجموعوں کی صورت میں شائع ہوا تھا اب نایاب ہے۔ خود میرے پاس ان کی کلیات کا ایک قلمی نسخہ موجود تھا لیکن کہیں ضائع ہو گیا۔ ابرار علی صاحب نے جو اسی خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں اب بڑی سعی و تلاش سے ان کا سارا نثر و نظم اردو و فارسی کلام مرتب کیا ہے اور مجھے اس کا تعارف لکھنے کی سعادت حاصل

ملتا ہے۔ شاہ صاحب سے تیسری پشت پر قاضی محمد ابواللیث کا نام بھی ملتا ہے جو میرے اجداد میں ہیں اور اس طرح اس سعادت میں شرکت برابر ہم سے اللہ فرض بھی۔

شاہ صاحب قبلہ کے حالات اور واقعات تو تفصیل سے ابرار صاحب نے اپنے مقدمہ میں تحریر کئے ہیں اس لئے میں تفصیلات سے گریز کرتا ہوں۔ آپ کا سلسلۂ نسب آپ کے والد حافظ نثار علی صاحب قبلہ کی طرف سے حضرت امیر المومنین سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک اور والدہ کی طرف سے حضرت امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ ولادت بدایوں میں ۱۲۳۵ھ / ۱۸۱۹ء میں ہوئی۔ آٹھ سال کی عمر تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا اور آپ کی پرورش آپ کے نانا میاں مولوی سید شاہ عبد العلی نقوی نے فرمائی جو اپنے زمانہ کے جید عالم اور سلسلہ قادریہ رزاقیہ کے مرید و خلیفہ تھے۔ مذاق میاں نے انہیں سے عربی، فارسی اور خوشنویسی کی تکمیل کی پھر رامپور پہنچ کر ملا محمد غفران آخون فقیہ محدث رامپوری سے شرح وقایہ اور آخر ہدایہ پڑھی، دہلی اور لکھنؤ کی بھی سیر کی، آتش و ناسخ اور غالب و مومن کی محفلوں میں شریک ہوئے۔ پہلی مرتبہ ۱۲۵۲ھ میں دہلی تشریف لے گئے اور خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق کے شاگرد ہوئے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب اپنے ایک خط (بنام مفتی سید احمد خاں مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۸۵۰ء) میں لکھتے ہیں :-

"مشفقی مولوی دلدار علی صاحب کہ بدانست بندہ در معنی آفرینی با سلطان الشعراء شیخ محمد ابراہیم ذوق برابر بہ اعتقاد خویش شاگرد آں دیرینہ سخنور اند آخر نہ ہمدم و ہم نشین آں ہا الا اگر اند چہ با ایشاں در سخن مشورت نہ کردند ــــ"

دہلی اردو اخبار نے اپنی اشاعت (۱۵ دسمبر ۱۸۴۲ء نمبر ۴۹ جلد ۷) میں آپ کے دہلی تشریف لانے پر لکھا ہے۔

"ان دنوں ایک شاعر مسافر ہمارے ایک دوست شفیق کے یہاں وارد ہوئے، ہم سے بھی انکی ملاقات ہوئی۔ نہایت طباع اور ذہین ہیں فن شعر میں دستگاہ لائق رکھتے ہیں، ناسخ و آتش وغیرہ اکثر شعراء لکھنؤ کو دیکھا اور سنا، اس شہر کے شعراء کی ملاقات کا بہت اشتیاق تھا خود بھی شعر خوب لکھتے ہیں اور زبان بہت فصیح جیسی کہ چاہیئے، طرز میر و مرزا و درد نہایت مرغوب ہے لیکن ابھی تک تلمذ کسی سے نہیں تھا۔ خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق کے رنگ ڈھنگ کی طبیعت اس شخص کو مبدء فیاض نے عطا کی ہے، شعراء حال میں طرز و روش شیخ ممدوح کی نہایت مرغوب ہے۔ اس شہر میں آکر نسبت تلمذ شیخ موصوف سے حاصل کی، بہت محظوظ ہوئے۔ ابتدا میں تخلص کچھ اور تھا جو ہم کو یاد نہیں لیکن جب سے ارادہ اور شوق تلمذ ذوق کا ہوا تب سے تخلص مذاق کیا اکثر اشعار جو سننے گئے تو واضح ہوا کہ طبیعت اس شخص کی نہایت مناسب فن شعر کے ہے، نام اُن کا مولوی دلدار علی صاحب اور وطن شہر بدایوں ہے جو کہ مولد حضرت سلطان جی صاحب قدس سرہٗ کا ہے حقیقت میں وہاں کی خاک آدم خیز ہے۔ اکثر اہل دل وہاں کے سُنے گئے ہیں۔ . . . .

اے مردم نے طبع چشم فلک نے کم دیکھے ہونگے۔ روپیہ و جواہر ٹھیکری و کنکر اس شخص کے نزدیک یکساں ہیں مرد صاحب درد و اہل دل معلوم ہوتے ہیں۔ دو خمسہ ان کے جو شہیدی کی غزلوں پر ہیں مہتمم صاحب اخبار مظہر الحق نے لے لئے اور چھاپے ہیں وہ دونوں بہت پر تاثیر اور مقبول ہیں ـــ بعض اشعار حسب فرمائش حضار صحبت مطلع احباب میں کہے اور سنائے، غرض اتنا تیز طبع ذہن سلیم کم دیکھنے میں آیا ـــ"

اگرچہ مذاق میاں درویش گوشہ نشین تھے لیکن اس عہد کے اکابر علماء اور فضلاء سے ان کے تعلقات کا اندازہ ان مکتوبات سے ہوتا ہے جو ابرار صاحب نے جمع کئے ہیں۔ ان مکتوبات کے لکھنے والوں میں مرزا غالب کے اس خط کے علاوہ جس کا اقتباس اوپر نقل ہوا مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مفتی صدر الدین آزردہ - مولوی محمد باقر صاحب اور اُن کے صاحبزادے مولانا محمد حسین آزاد، مولانا عبد الحق خیرآبادی وغیرہ بھی شامل ہیں، ان میں سے بعض مکتوبات سے حضرت دلدار علی کے اپنے صوفیانہ مسلک کی توضیح

[illegible] کے محمد یوسف علی خاں کے نام ایک خط میں تاریخ تصوف کے ذکر میں حضرت نظام الدین اولیا کے ایک رقعہ کا ذکر آپ نے [illegible] الدین کرانی کو لکھا تھا، فرماتے ہیں :-

"سبب حصول فقر قناعت است، و حصول قناعت الذکر دوام باطن است، مشکل ترین چیز افقر است۔ چنانچہ حضرت خواجہ حسن بصریؒ و بایزید بسطامی و شیخ فریدالدین عطار و اکثر عارفان کامل فرمودہ اند کہ روزہ نفل بسیار داشتن کار ریمان است و کم خوردن کار بخیلان است، و نماز نفل بسیار گزاردن کار عاصیان است، و حج رفتن کار مسافران است، و گرسنہ را طعام دادن کار طباخان است، و درم گرفتن کار جوگیان است، و خلافت و مثال دادن کار سلطانان است، و علم بسیار یاد کردن کار بادفروشان است و زہد کردن کار بیوہ زنان است، و مسجد و خانقاہ ساختن کار دوکانداران است، و باغ و حوض بنا کردن کار باغبانان است و تقوی کردن کار جائے ماندگان است و نفی و اثبات بہم رسانیدن کار آہنگران است، و از صحبت زنان باز ماندن کار مخنثان است، و حکایت از ہیش یاد کردن کار منجمان است، و کرامت ظاہر کردن کار بازیگران و ساحران است، و دیگرے را نفع رسانیدن کار عہدہ داران و رشوت خواران است، و خود را مشہور ساختن کار شیطان است و خود را بہ پیری گرفتن کار دنیا داران است و خلق را رجوع بخود کردن کار اہل دیوان است، و خدا شدن کار خود پرستان و خود نمایان است لیے بر اولاد و رفتن و بے خود شدن کار مردان و کامگاران است"

بعض نام نہاد صوفیا نے شریعت اور طریقت کے راستے الگ الگ بتائے ہیں بلکہ بعض اس شدت میں راہ شریعت سے تجاوز کرنا ہی اپنا مسلک سمجھتے ہیں، لیکن حضرت دلدار علی فرماتے ہیں ۔

"طریقہ تمیز خطرات رحمانی و شیطانی و نفسانی ہمیں است کہ اگر خطرہ مخالف شرع شریف باشد شیطانی و نفسانی بود و اگر موافق شرع است رحمانی است"

اسی خط میں بڑے مزے کے انداز میں فرماتے ہیں :-

"شنیدہ ام کہ در طلب مردن مطلوب طالبانست، سعدی علیہ الرحمہ می فرماید۔

خرم آں روز کہ اندر طلبت جاں بدہم | تا بیابند عزیزاں بمبارک بادم

ایک خط امیر مینائی کا بھی ہے جو رامپور سے یکم اپریل ۱۸۸۸ء کو لکھا گیا ہے۔

"کریم الاخلاق عمیم الاشفاق زاد مجدکم، سلام سنت الاسلام قبول ہو اور عذر کوتہ قلمی بھی مقبول ہو کہ فقیر امیر اس زمانہ میں بیمار رہا ورنہ بمجرد ورود عنایت نامہ جواب لکھتا آپ نے جو چند شعر اردو اور قطعہ پارسی اس ہیچمرز کا سن کر پسند فرمایا در حقیقت اعزاز ہیچمداں کا بڑھایا اور جن بزرگوں نے میرے صفات حمیدہ آپ سے بیان کئے در حقیقت ان سب نے اپنے حسن ظن کا جلوہ دکھایا ورنہ میں ابجد خوان لوح نادانی سر آمد مکتب ہیچمدانی ہوں اور اپنے سب احباب اور اعزہ سے دعائے حسن خاتمہ کا خواستگار ہوں، آپ کے مولد جلیل سے مشتاق جمال بالکمال رہتا تھا۔ آپ نے منت پذیر یاد فرمائی کیا شتاق تر ہوا۔ جامع المتفرقین بجمعیت خاطر آرزومے یکجائی بجا لا۔ زیادہ کیا عرض کروں، امید ہے کہ اپنے اس کلام سے جو نعت و منقبت میں ہو سرفراز فرمایئے، اور آپ نے کچھ پتہ اپنا نہیں لکھا، یہ نیاز نامہ صرف بتحریر نام شہر بھیجتا ہوں، جو آئے تو اپنے مؤلفات نعتیہ بہ نیت ارسال خدمت کروں ۔ [illegible] ہجان سخن گر بسخنداں [illegible] امیر احمد عفی عنہ ۔ یکم اپریل ۱۸۸۸ء"

اسی سلسلے میں مولانا محمد حسین آزاد کا ایک تاریخی خط بھی دیکھئے ۔

"مخدوم مکرم ادام اللہ برکاتہم ،

تسلیم - آپ کو معلوم ہے کہ استاد مرحوم کا کلام اگر ان کے پاس سے باہر نکلتا تو ہمارے ہاں آتا تھا، اور کہاں کہہ دیتے تھے اور ان سے نکلے وقت پروردگار نے توفیق دی اور تائید الٰہی نے یاوری کی کہ ایک کتاب اور اکثر مسودے متفرق اُن کے ہاتھ کے میرے نکلا، یہ کتاب مری ہے جس میں کہ آپ بھی اپنے ہاتھ سے کچھ کچھ اشعار اپنے لکھ آئے ہیں - آپ کے بعد اس میں بہت کچھ اور لکھا گیا - خدا کا شکر ہے کہ اس فرض کے ادا کا وقت پہنچا اور اب صرف دس پندرہ دن کا کام رہ گیا ہے - اس ہفتہ پٹنہ سے کبھی خدا ترس بندہ کی تحریر پہنچی اس نے آپ کا نام مبارک لکھا ہے کہ بدایوں میں اُن کے پاس دو قصیدے استاد مرحوم کے ایسے ہیں کہ دیوان مطبوعہ میں نہیں ہیں - میں نے غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ عجب نہیں جن دنوں آپ دلی میں تشریف رکھتے تھے - والد مرحوم کی چھوٹی بیاضوں میں سے یا استاد مرحوم کے مسودات خاص میں سے آپ نے دو قصیدے نقل کئے ہوں، آپ وہ دونوں قصیدے عنایت فرمائیں تو اس مجموعے میں داخل کئے جائیں تا کہ اگر دیوان مطبوعہ میں نہیں مشتہر ہوئے تو اب مشتہر ہو جائیں اُنہیں اللہ مغفرت کرے وہ اب کچھ نہیں کر سکتے ہم لوگوں کو اللہ نے دسترس دے رکھی ہے - واجب ہے کہ اُن کی آرزوؤں کو پورا کرنے میں سعادت حاصل کریں وہ آج کچھ نہیں کر سکتے ہم کر سکتے ہیں قریب ہے وہ دن کہ ہم بھی نہ کر سکیں گے آج اگر ہم اُن کی آرزوئیں پوری کریں گے تو خدا ہماری آرزوئیں پوری کرے گا - ان کا فرزند نہ رہا - اللہ اسے مغفرت کرے - یہ فرزندان معنوی ہیں اللہ آپ کے اور میرے ہاتھوں عمر دیتا ہے آپ کا تعلق تلمذ قدیمانہ کا اُن کے ساتھ اور شفقت و محبت جو بندہ آزاد کے ساتھ ہے اس کا لحاظ کر کے امید قوی ہے کہ آپ دونوں قصیدے وہ اور جو اشعار اور آپ خیال میں ہوں کہ دیوان مطبوعہ میں نہیں جلد مرحمت فرمائیں گے اور بندہ آزاد کو اوقات مخصوصہ دعائے خیر سے یاد فرمائیں گے - والتسلیم بالاف التکریم

محمد حسین آزاد عفا عنہ - گورنمنٹ کالج لاہور

یکم فروری ۱۸۸۸ء

مذاق میاں صاحب کے تعلقات آزاد کے والد مولانا محمد باقر صاحب اور اُس عہد کے دوسرے اکابر علم و فضل سے بھی تھے - ان تعلقات پر مزید روشنی میں اگلے شمارے میں ڈالوں گا - اور مذاق میاں صاحب کے نمونہ کلام کو بھی پیش کروں گا -

---

اردو ادب اور عشق

اردو شاعری میں عشق کے تصور پر آزاد و حالی کے وقت سے برابر اعتراضات کئے گئے ہیں - ان میں سے بہت سے اعتراضات صحیح ہیں، مگر معترضوں نے اس عشق کے سارے اسرار و رموز کو نہیں سمجھا - اس عشق کی بدولت اردو شاعر و ادیب کچھ رومانی کچھ حقیقت پسند، کچھ جاندار اور جیالا رہا - اس عشق نے اُسے کبھی کبھی آلام روزگار کو آسان بنانا سکھایا، کبھی سپید و سیاہ کی سیر میں ایک جلوہ گاہ کی تصویر کھینچنی سکھائی، یہ عشق اُسے دیر و حرم سے پرے لے گیا - اس نے اُسے زخم کھا کر مسکرانا اور مر مر کر جئے جانا بتایا، اس نے اس کے تخیل کو ہوا دی، اس نے بساط اور حوصلے کے مطابق جلنا اور تڑپنا، دکھ جھیلنا اور زہر حیات کو انگبین بنانا سکھایا۔

آل احمد سرور

محمد حسن عسکری

ڈرامہ کا فن

کہانی کے عنصر کی ڈرامے میں کیا جگہ ہے ؟ کہانی ڈرامے میں کس طرح استعمال ہوتی ہے اور کیا شکل اختیار کرتی ہے ؟ اس پر ڈرامے کی فنی خصوصیات اور امکانات کا کیا اثر پڑتا ہے ؟ ان سوالوں پر غور کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھ لینا چاہیے کہ کہانی بذاتِ خود کیا چیز ہے کیونکہ ایک دوسرا لفظ بھی ہے جو ہم روزمرہ کی گفتگو میں نہایت اطمینان کے ساتھ کہانی کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں یعنی پلاٹ، ان دو لفظوں کا فرق سمجھے بغیر ہم ڈرامے میں کہانی کی جگہ متعین نہیں کر سکتے یوں تو پلاٹ کا لفظ اب اُردو کا ہی لفظ بن چکا ہے لیکن اس کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔ اور بعض لوگ پلاٹ کی جگہ "ماجرا" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس ترجمے سے ہی ظاہر ہے کہ عام طور سے لوگوں کے ذہن میں کہانی اور پلاٹ کا فرق واضح نہیں ہوتا۔ ماجرا سے مراد صرف وہ واقعات ہیں جو پیش آئے لیکن یہ چیز کہانی ہے، پلاٹ نہیں۔ کہانی کا مطلب ہے واقعات کا ایک سلسلہ۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ کہانی کہنے کی خوبی یہ ہے کہ ہر واقعہ بجائے خود اتنا دلچسپ ہو کہ ہم اس بیان سے اُکتانے کی بجائے آگے اور سُننا چاہیں۔ کہانی کے فن کی بنیاد ہے تجسس کے جذبے پر۔ واقعات کا بیان اگر ہمارے اندر تجسس پیدا کرتا ہے تو یہ اچھی کہانی ہوئی لیکن اگر تجسس بیدار نہیں ہوا تو کہانی اچھی نہیں ہو سکتی۔ کہانی کی خوبی یہ ہے کہ ہم ہر واقعہ سُننے کے بعد پوچھیں کہ پھر کیا ہوا۔

پلاٹ بھی واقعات کا سلسلہ ہوتا ہے یعنی پلاٹ کے اندر بھی کہانی ہوتی ہے۔ مگر کہانی کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز ہونی چاہیئے جب جاکے پلاٹ بنتا ہے یہ چیز ہے منطقی رشتہ یا اسباب و نتائج کا علاقہ۔ اگر چند دلچسپ واقعات ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں تو کہانی تو بن جائے گی۔ لیکن پلاٹ نہیں بنے گا پلاٹ کے لئے ضروری ہے کہ ہر واقعہ کسی اور واقعے کا نتیجہ ہو اور اُس سے کوئی نیا واقعہ نکلے۔ پلاٹ کے یہ اجزا یعنی واقعات منتشر یا ایک دوسرے سے آزاد نہیں رہ سکتے۔ اُن کے درمیان منطقی ربط ہونا چاہیئے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیئے کہ مختلف واقعات کو مل کر ایک نقش مرتّب کرنا چاہیئے۔ چنانچہ پلاٹ میں اس نقش کی اہمیت انفرادی واقعات سے زیادہ ہوتی ہے، بلکہ واقعات اس نقش سے ہی اپنے معنی حاصل کرتے ہیں۔ فرداً فرداً اُن کی اہمیت۔ یہاں وہ نہیں ہوتی جو کہانی میں ہوتی ہے۔ پلاٹ کی خوبی یہ ہے کہ واقعات ایک نقش میں بندھ جائیں ایک دوسرے سے متعلق ہوں، ایک دوسرے پر اثر ڈالیں اور کوئی واقعہ اس نقش سے باہر نہ رہنے پائے۔ ترتیب، نظم اور انضباط سے پلاٹ پیدا ہوتا ہے۔ اگر میں کہانی اور پلاٹ کے فرق کو ایک مثال سے واضح کردوں تو بہتر ہوگا۔ اگر میں کہوں کہ ایک آدمی مر گیا، اور دو دن بعد اُس کی بیوی مر گئی تو یہ کہانی ہوئی، کیونکہ یہاں دو واقعات ایک جگہ جمع کر دیئے گئے ہیں جن میں کوئی لازمی ربط نہیں، بیوی کی موت شوہر کی موت کا نتیجہ نہیں، بلکہ ایک الگ واقعہ ہے لیکن اگر میں کہوں کہ ایک آدمی مر گیا اس رنج میں اُس کی بیوی نے زہر کھا لیا اور وہ بھی مر گئی تو یہ پلاٹ ہو گیا، کیونکہ اب یہ دونوں واقعات ایک دوسرے سے غیر متعلق نہیں رہے بلکہ ان میں ایک ربط پیدا ہو گیا۔ شوہر کی موت سبب ہے اور بیوی کی موت نتیجہ ہے اب یہ بکھرے ہوئے واقعات نہیں رہے بلکہ ایک نقش بن گیا۔

یہ تو ہوئی کہانی کی بات۔ ہمارے موضوع کا دوسرا عنصر ہے ڈراما۔ اب اسے دیکھئے۔ ڈراما کہانی پر ایک بہت بڑی پابندی عائد کرتا ہے۔ داستان

یا ناول تو پڑھنے کی چیز ہوتی ہے اور پڑھنے کا انحصار آدمی کی مرضی پر ہوتا ہے۔ یہاں آدمی خود مختار ہے، جب چاہے کتاب پڑھے۔ پڑھنے والے کی یہ آزادی لکھنے والے کو بھی آزادی دے دیتی ہے۔ وہ اپنی کہانی کو جتنا چاہے طویل کرتا چلا جائے۔ جب تک اُس کا ذہن نئے واقعات ایجاد کرتا ہے اُس کی کہانی جاری رہ سکتی ہے چنانچہ ہمارے ادب میں "طلسم ہوش رُبا" دس ہزار صفحے کی ہے۔ اگر اس کے ساتھ کی داستانیں بھی ملا لی جائیں تو اچھے خاصے پچاس ہزار صفحے تک اور مل سکتی ہے۔ غرض داستان گو یا ناول نگار پر وقت کی کوئی پابندی نہیں۔ اس معاملے میں وہ اپنا مالک ہے کیونکہ پڑھنے والا بھی اس معاملے میں اپنا مالک ہے۔ مگر ڈرامے کا معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ ڈراما فی الاصل پڑھنے کی نہیں، دیکھنے اور سُننے کی چیز ہے۔ اور دیکھنے والا صرف اتنی ہی دیر تک دیکھ سکتا ہے جتنی دیر تماشہ دکھانے والے اُسے اجازت دیں، اس لیے یہاں دیکھنے والا خود مختار نہیں ہو سکتا۔ پھر تماشہ دکھانے والے بھی پوری طرح آزاد نہیں ہیں۔ انہیں بھی یہ بات پیش نظر رکھنی پڑتی ہے کہ دیکھنے والے کتنی دیر تک دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ تماشہ دکھانے اور دیکھنے والے دونوں ایک دوسرے کے پابند بن کے رہ جاتے ہیں اور دونوں کو وقت کی غلامی کرنی پڑتی ہے۔ ڈراما تین چار گھنٹے سے زیادہ نہیں چل سکتا۔ ڈرامے کی نوعیت کہانی پر یہ پہلی پابندی عائد کرتی ہے یعنی ڈرامے میں کہانی کا مختصر ہونا لازمی ہے۔ یہاں کہانی لا انتہا نہیں بن سکتی۔

پھر داستان گو اور ناول نویس کو ایک اور آسانی حاصل ہے۔ ناول نویس پڑھنے والے کا تجسّس بیدار کرنے کے بعد اسے غیر متعین وقفے تک زندہ رکھ سکتا ہے۔ پڑھنے والا دن بھر ناول پڑھنے کے بعد اسے ایک ایسی جگہ بھی چھوڑ سکتا ہے جہاں وہ یہ جاننا چاہتا ہو کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ اس بات کو وہ اگلے دن تک ملتوی کر سکتا ہے۔ مگر ڈرامے میں "کل" کبھی نہیں آتی۔ یہاں التوا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ڈرامہ نگار کو جو کچھ کہنا ہے سب ایک ہی نشست میں کہنا پڑے گا۔ پھر وہ یہ بھی نہیں کر سکتا کہ تماشہ دیکھنے والوں کے تجسّس کو غیر آسودہ چھوڑ دے اور تماشائی یہ سوچتے ہوئے گھر واپس جائیں کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ چنانچہ ڈرامہ نگار کے لیے لازمی ہے کہ وہ دیکھنے والے کے تجسّس کو بیدار کرے اور ایک معیّن وقفے کے اندر اس تجسّس کو ختم بھی کر دے تاکہ تماشائی مطمئن ہو کر اُٹھیں۔ ڈرامہ نگار کی اس مجبوری کے سبب ڈرامے کے لئے پلاٹ ضروری بن جاتا ہے۔ ناول میں تو یہ بات ممکن ہے کہ واقعات سلسلہ در سلسلہ ایک لڑی میں پرو دیے جائیں۔ خواہ اُن میں کوئی منطقی رشتہ ہو یا نہ ہو۔ مگر ڈرامے میں منطقی رشتہ، واقعات کی ترتیب، تنظیم اور انضباط لازمی چیز ہے۔ کیونکہ ڈرامہ نگار کے لئے تجسّس کو بیدار کرنے کے بعد اسے تین چار گھنٹے کے اندر ہی اندر ختم کرنا بھی ضروری ہے۔ ڈرامے کے لئے محض کہانی کافی نہیں۔ اسے پلاٹ بنانا پڑتا ہے۔ مگر جو شرائط کہانی لکھنے والے پر عائد ہوتی ہیں وہ ڈرامہ نگار پر اور بھی سختی کے ساتھ عائد ہوتی ہیں۔ اگر کسی ناول میں چند واقعات ایسے آ گئے ہیں جو دلچسپ نہیں تو آپ انہیں چھوڑ سکتے ہیں یا سرسری طور سے نظر ڈال کے آگے بڑھ سکتے ہیں لیکن ڈرامہ دیکھتے ہوئے آپ بیچ کا کوئی حصّہ نہیں چھوڑ سکتے جب تک آپ تھیٹر میں بیٹھے ہیں۔ سارا ڈرامہ نگار کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ واقعات فرداً فرداً بھی دلچسپ ہوں۔ جو شرائط کہانی کے لئے ضروری ہیں پھر ڈرامے کی مخصوص شرائط الگ رہیں یعنی۔ پہلے ڈراما نگار کے اوپر دُہری پابندیاں ہوتی ہیں۔ یوں تو آپ انسان کی ہر سرگرمی کو ہی کاروباری چیز کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ ناول کو بھی۔ لیکن ڈراما تو کھلم کھلا کاروباری چیز ہے جس سے طرح طرح کے لوگوں کی روزی وابستہ ہوتی ہے۔ ڈرامے کی کامیابی یا ناکامیابی کا تعلق صرف لکھنے والے سے ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ بیسیوں قسم کے آدمیوں کی روٹی تھیٹر کے ذریعہ چلتی ہے۔ ڈرامے کی زندگی کے لئے ضروری ہے کہ لوگ اسے دیکھنے بھی آئیں۔ ڈرامے کو تھیٹر سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ تھیٹر کے بغیر ڈرامے کا وجود ہی نہیں ہو سکتا مگر تماشا دیکھنے والے بھی طرح طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ پڑھے لکھے، بے پڑھے، مہذب، غیر مہذب۔ لیکن چونکہ یہ سب لوگ پیسے دیتے ہیں اس لئے تماشا دکھانے والوں کو سب کی دلچسپی کا سامان مہیا کرنا پڑتا ہے۔ ناول نویس تو ایک خاص طبقے کے لئے لکھ سکتا ہے۔ ایک خاص ذہنی معیار کے لوگوں کے لئے لکھ سکتا ہے۔ مگر ڈرامہ نگار کے ذہن میں اپنے سامعین کا تصور اتنا اونچا نہیں ہوتا۔ اس کا کام تو ہر آدمی کے لئے لکھنا ہے۔ یوں تو ڈرامے کی نوعیت چاہے کتنی ہی ہو لیکن سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ ہر قسم کے لوگ اور ہر ذہنی معیار کے آدمی اسے دلچسپی سے دیکھ سکیں لہٰذا ڈرامے کی کہانی کو ضرور دلچسپ ہونا

بلکہ ہر آدمی کو کسی نہ کسی طرح دلچسپ ہونا چاہیئے۔ یہ پابندی ادیبوں کو گراں گزرتی ہے لیکن دنیا کے عظیم ترین ڈرامہ نگاروں نے اسے بڑی خوشی سے قبول کیا ہے۔

پھر ایک بات دیکھنے کی یہ بھی ہے کہ ڈراما خالص اور بے میل فن نہیں ہے۔ یہ تو کئی فنون کا مجموعہ ہے۔ ناول کے فن میں تو دو طرح کے آدمی برسرکار آتے ہیں۔ ایک تو لکھنے والا اور دوسرا آدمی پڑھنے والا۔ لکھنے والا براہ راست پڑھنے والے سے متعلق ہوتا ہے۔ اور اپنی بات براہ راست کہہ سکتا ہے۔ لیکن ڈرامہ میں لکھنے والے اور دیکھنے والے کے درمیان بیسیوں قسم کے آدمی آتے ہیں۔ ڈرامہ نگار اپنے ناظرین سے براہ راست کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ اوروں کی وساطت سے بولتا ہے۔ اس کی بات جن لوگوں کے ذریعہ ناظرین تک پہنچتی ہے ان میں پروڈیوسر، ایکٹر، موسیقار، یہاں تک کہ پردہ کھینچنے والے تک شامل ہیں اور یہ سب لوگ اہم ہیں۔ پردہ کھینچنے والا اگر پردہ گرانے میں دیر یا جلدی کر دے تو سارا ڈراما غارت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہاں تو ڈرامہ نگار ان درجن بھر آدمیوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے اسی لیے ڈرامہ میں کہانی کہنے کے طریقے ناول سے مختلف ہیں یہاں تشریح و تفسیر کی کوئی گنجائش نہیں ڈرامہ نگار کو یاد رکھنا پڑتا ہے کہ "میں براہ راست اپنے ناظرین سے نہیں بول سکتا۔ میری ترجمانی تو ایکٹر وغیرہ قسم کے لوگ کریں گے اور وہ اپنے جسم کی حرکات سے اپنی آواز کے اُتار چڑھاؤ سے" چنانچہ کہانی کہتے وقت اُسے اپنے فن کی یہ لازمی شرط ذہن میں رکھنی پڑتی ہے۔ کیونکہ وہ صرف الفاظ کے ذریعہ نہیں بلکہ کئی اور چیزوں کے ذریعہ بھی بولتا ہے۔ ناول نویس کا ذریعۂ اظہار صرف الفاظ ہیں ڈرامہ نگار کا ذریعۂ اظہار متعدد چیزیں ہیں! اسی لئے اُس کا کام ناول نویس کے کام سے زیادہ پیچیدہ اور مشکل ہے۔

اس وجہ سے اور بھی کہ ڈرامہ، کہانی بیان نہیں کرتا۔ بلکہ واقعات کو زندہ شکل میں پیش کرتا ہے۔ یوں تو ناول پڑھتے ہوئے بھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم حقیقت اور تخیل کے فرق کو بھول جاتے ہیں۔ لیکن ڈرامے کی تو زندگی ہی اس بات پر قائم ہے کہ ہم سامنے کو اصلیت سمجھ لیں۔ اسی لئے ڈرامے میں عمل ہر دوسری چیز سے زیادہ اہم ہے۔ یہاں کہانی کہنے والے دراصل ایکٹر ہوتے ہیں۔ اور وہ کہانی بیان نہیں کرتے بلکہ خود کہانی یا واقعہ بن جاتے ہیں۔ ڈرامے میں کہانی سنائی نہیں جاتی بلکہ کہانی وجود میں آتی ہے۔ جو چیز ہم اسٹیج پر دیکھتے ہیں وہ مکمل اور وقوع پائے ہوئے واقعات نہیں ہوتے بلکہ واقعات خود وقوع پاتے ہیں۔ یہاں کہانی کہنے والا نہیں بولتا۔ بلکہ کہانی خود بولتی ہے۔ یہ ناول اور ڈرامے کا بنیادی فرق ہے اسی لئے ارسطو نے ٹریجیڈی میں عمل کو کردار سے زیادہ اہم بتایا ہے کہانی زندگی سے نکلتی ہے۔ لیکن ڈرامے میں کہانی پھر زندگی بن جاتی ہے یا کم سے کم زندگی کا روپ دھارنے کی کوشش کرتی ہے چنانچہ یہاں اسکی نوعیت ہی بدل جاتی ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ناول میں تو بعض اوقات کہانی اور کردار الگ ہو سکتے ہیں لیکن ڈرامے میں واقعات اور کردار کا تعلق جسم اور جان کا سا ہے۔ واقعات کردار کے ذریعے وجود میں آتے ہیں۔ اور کردار واقعات کے ذریعے انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈرامے میں مختلف عناصر جس طرح ایک دوسرے میں پیوست ہوتے ہیں۔ ویسے ناول میں نہیں ہوتے۔ اتنا شدید انضباط پیدا کرنا چونکہ ہر آدمی کے بس کا روگ نہیں۔ اس لئے ڈرامے کا فن ناول کے فن سے زیادہ مشکل ہے۔ ورنہ یوں تو کہانی دونوں میں ہی ہوتی ہے۔

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان۔ کراچی)

ڈاکٹر سید عبداللہ۔ سلیم اللہ فہمی
صادق الخیری۔ میرزا ادیب
پروفیسر حنیف فوق۔ نثار احمد فاروقی

یارانِ نکتہ داں!

سلیم اللہ فہمی:-

"مہر نیمروز" اللہ کرے ہمیشہ سوا نیزے پر رہے۔ میری خدمات اراوتاً وقف رہیں گی۔ تعمیلاً کیا ہوگا، یہ بتانا واقعی کٹھن ہے۔
سرورق نہایت لاجواب ہے۔ جس کی نظر پڑی بے ساختہ سبحان اللہ کہہ اٹھا۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔ ایک عرض البتہ ہے۔ سائز وہی رکھا ہے جو عام طور پر ہوتا ہے۔ نئی چیز نکالی ہے، نئی داغ بیل ڈالنے کے حوصلے ہیں تو اس کی صورت شکل میں بھی کچھ نیاپن پیدا کیجئے۔ سائز گھٹا بڑھا کر غیر معمولی بنا ڈالئے۔
"ماتم یک شہر آرزو" بڑی کلاسیکل چیز ہو گئی ہے۔ شدتِ احساس تو اپنی جگہ، اسلوب میں اعجاز ہے۔ بڑا جامع اور بلیغ مضمون ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ اپنا ایک شعر یاد آگیا ؎

قصۂ غم کا بیاں اجمالاً — آپ کے جور کی تفصیل نہ ہو

"پہلی کرن" میں دریا کوزہ میں بند ہے۔ ادبی اندازِ بیان ٹھیٹھ قسم کا ہے۔ کلیم الدین صاحب کا مضمون مستغنی عن التعریف ہے، خوب لکھتے ہیں۔
جابجا چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اقوالِ زریں کی قسم کے خوب ہیں۔ بہت پسند آئے۔
"ایک خط" پرانا ہے۔ اور بس اسی قدر۔ غالباً اس کے چھاپنے میں کوئی خاص مقصد پیشِ نظر ہے۔ ؎

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

احمد علی کی جان کو عرصہ ہوگیا رو چکا ہوں۔ کیا جمود ہے۔ اصل میں وہ جس مقام پر جا پہنچے ہیں، تنہائی کا احساس انھیں ستاتا ہے وہ اب پیچھے دیکھنے کو بھی راضی نہیں۔ اس شخص کو اگر ادبی موت سے بچانا ہے تو جگائے رہیئے۔ خفتہ شعور پھر بیدار ہو سکتا ہے۔ احمد علی کے پاس ابھی تو سینکڑوں نامکمل چیزیں ہوں گی۔ جن کو اب پورا ہو جانا چاہیئے۔
"دریائے نیل" ذرا دور کا ڈھول ہے لیکن سہاونا بھی نہیں۔ بڑا پھیکا پھیکا ہے۔
عبدالقدوس ہاشمی کا مضمون اچھا ہے۔ جمیل مظہری فطرۃً شاعر تھا لیکن زبردستی اس نے اپنے اوپر فلسفہ طاری کر لیا ہے۔ کیا کیا رومانی چیزیں ظالم نے لکھی ہیں۔
افسانوں کا معیار اتنا بلند نہیں۔ علی اکبر قاصد میں صلاحیتیں موجود ہیں لیکن قلم ذرا اکھڑا ہوتا جا رہا ہے۔ یہ بڑے بڑے نام ناول اور افسانوں کے لئے تو جائز رکھتے ہیں۔ مثلاً "جو موج ڈبو دے" یا یہی افسانہ "اپنے کے جلائے ہیں دیئے" مگر اپنا نام چھوٹے سے چھوٹا بنانے چلے جا رہے ہیں۔ سید علی اکبر قاصد، سے صرف اکبر قاصد (عجیب ترکیب ہے) تک آگئے ہیں۔

اس شخص سے کہیئے کہ جی لگا کر لکھا کرے اور بہت لکھا کرے۔
حضرت آثر لکھنوی اور سید حسن امام وارثی، دونوں حضرات سے مجھے بڑی عقیدت ہے۔ ان کو شریک بزم دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ حسن امام صاحب سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ محشر بدایونی بہت پسند آئے۔
آپ کے ادبی سراغرساں صاحب تو بڑے بے ڈھب ہیں۔ میرے خیال میں یہ عنوان مستقل ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔ ادب پر احسان ہوگا۔

صادق الخیری:-

آپ بڑا اچھا کیا کہ پیشہ ور رسالہ والوں کی طرح اپنا اداریہ محض بلند بانگ دعووں اور لمبے چوڑے مقاصد کی تشہیر کیلئے وقف نہیں کیا۔ آپ نے جس نوع کے مضامین نظم و نثر جمع کئے ہیں اُن سے آپ کا نصب العین ایک حد تک ظاہر ہو ہی جاتا ہے۔ اس کی ترتیب و تہذیب دیکھ کر میں نے اس سے خوش آئند توقعات وابستہ کی ہیں۔
زیر نظر شمارے میں مجھے سب سے ممتاز اور سب سے طوفانی مضمون "چہ دلاور است" معلوم ہوا۔ ادبی سراغرساں کا وجود ہمارے ادب کے لئے نیک فال ثابت ہو سکتا ہے۔ اور اگر وہ ادبی جرائم کا انکشاف خلوص سے کرتے رہیں تو ہر وہ شخص جسے ادب سے لگاؤ ہے، اُن کی محنت کی داد دے گا۔ مگر ــــ (اور یہ "مگر" ذرا ٹھنڈے دل سے سنئے!) اس مضمون میں جو زاویۂ نگاہ، جو لب و لہجہ اور جو انداز نگارش اختیار کیا گیا ہے وہ حد درجہ متاذی اور مذموم ہے۔ شروع سے آخر تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ادبی سراغرساں کو انتصار صاحب سے زبردست کد ہے اور موقع ہاتھ آجانے سے وہ خوشی سے ناچنے لگے ہیں۔ بُرے سے بُرے اور خوفناک خطابات دے کر انہوں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ میں انتصار صاحب کا طرفدار یا پرستار نہیں ہوں۔ ذاتی طور پر بھی میں اُن سے زیادہ واقف نہیں۔ اس لئے آپ کو یہ گمان نہ ہو کہ مجھے اُن کی حمایت منظور ہے۔ بلکہ میں تو آپ کی توجہ اس لغزش کی طرف مبذول کرانی چاہتا ہوں جو آپ کے نگارندۂ خصوصی سے سرزد ہوئی ہے، آپ اس مضمون کو ایک دفعہ پھر پڑھیئے، مجھے یقین ہے کہ بطور مدیر مسئول آپ خود محسوس کریں گے کہ اُن جملوں کو شریکِ اشاعت نہیں ہونا چاہیئے تھا۔
اگر آپ کے فاضل مضمون نگار کا مقصود صرف ایک بڑی چوری کا انکشاف کرنا تھا تو یہ بہتر ہوتا کہ وہ اپنے تاثرات (جو ناول سے متعلق ہیں، مصنف کی شخصیت سے نہیں) مصنف کی ذات کو ملوث کئے بغیر بیان کر دیتے۔ اقتباسات اتنے واضح ہیں کہ خود ان کو رائے زنی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ چہ جائیکہ پڑھنے والوں کو اشتعال دلایا! یہ زیادہ وقیع ہوتا کہ فاضل سراغرساں اپنے آپ کو اس "تحقیق" سے علیحدہ رکھتے اور ادبی عدالتوں میں استغاثہ دائر کرنے کی بجائے اقتباسات دے کر خود انتصار صاحب سے مخاطب ہوتے۔ کیا عجب ہے کہ انتصار صاحب کے پاس اس کا کوئی جواب ہو!

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا، میں انتصار صاحب سے اچھی طرح واقف بھی نہیں ہوں۔ اس لئے براہ مہربانی آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں، میں تو اس امر کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا تھا کہ معرکہ سخت ہونے کے باوجود اگر شرافت اور وقار کو برقرار رکھا جائے تو کوئی ہرج نہیں ہوتا۔ بلکہ مضمون نگار کی وقعت اور بڑھ جاتی ہے۔ شاید آپ کو یاد ہو کہ دلّی سے جو "چمنستان" نکلتا تھا اُس میں ایک صاحب نے کرشن چندر کے ناول "شکست" کے بارے

میں ایک عجیب و غریب مضمون لکھا تھا۔ انہوں نے بھی دلائل و شواہد دے کر ثابت کیا تھا کہ کرشن چندر نے خیالات اور الفاظ کہاں کہاں سے لئے ہیں۔ مجھے اس کی تفصیل یاد نہیں۔ لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ اس نے دل پر کوئی ناخوشگوار اثر نہیں چھوڑا تھا۔

ادبی سراغرساں کی "مہمات" بڑا اچھا، بڑا انوکھا اور بڑا مفید باب ہو سکتا ہے۔ لیکن بات کہنے کہنے میں بھی فرق ہونا چاہیئے۔

آپ نے مجھے یاد کیا، اس کا ایک دفعہ اور شکریہ ادا کرتا ہوں۔

صادق الخیری

پروفیسر حنیف فوق :۔

"مہر نیمروز" پسند آیا۔ اور اس سے زیادہ اس کا نام۔ غالب کی مخالفت میں آج ایک نئی صورت اختیار کی ہے۔ پہلے تو اس کے آرٹ کو کم مایہ بتانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن جب ان کوششوں میں کامیابی نہ ہوئی ہو تو اب اس کی شخصیت کو گرانے اور اس کی شاعری کی انسانی عظمت پر پردہ ڈالنے کی دیدہ و دانستہ کوشش ہو رہی ہے۔ غالب کی کمزوریوں سے کون واقف نہیں ؟ اگر آج قاضی عبدالودود یہ ثابت کر دیں کہ وہ جُوا کھیلتا تھا تو کونسی نئی بات ہوگی ؟ غالب کی عظمت یہ ہے کہ اس نے اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ غالب انسان تھا فرشتہ نہیں۔ روپے کی اُسے بھی ضرورت تھی۔ جس کے لئے اسے جھوٹ بھی بولنا پڑا اور دریوزہ گری بھی کرنی پڑی۔ لیکن جس ماحول میں غالب سانس لے رہا تھا اس میں ان کمزوریوں سے مفر ناممکن تھا۔ اس کی شخصیت اپنے ماحول کے تضاد کا شکار ہونے کے باوجود ایک عظیم شخصیت تھی۔ اس کی شاعری کے آئینہ میں اس کی انسانیت مہر نیمروز کی مانند روشن نظر آتی ہے اور اس کے خطوط میں اس کی شخصیت کی دل آویزی ماہ نیم ماہ کی طرح تسکین بخشتی ہے۔ اگر "غالبیات" کا ایک مستقل عنوان رکھا جائے تو یہ اس ماہنامہ کی خصوصیت بھی ہو گی اور ایک بطلِ جلیل کے کارناموں کا اعتراف بھی۔

"مہر نیمروز" کا علمی یا اکیڈیمک انداز بھی پسند آیا۔ اگر پہلے شمارے سے مستقبل کا اندازہ ہو سکتا ہے تو اس پرچہ کا مستقبل بہت روشن نظر آ رہا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اسے اسی انہماک سے جاری رکھا جائے۔ "چہ دلاور است" کا عنوان خوب ہے۔ اور ہمارے ادب میں احتساب کی بنیادی ضرورت کو پُورا کرتا ہے، شاید لہجہ ضرورت سے زیادہ سخت ہو گیا ہے۔ لیکن واقعات کی سنگینی کے پیشِ نظر اسے بھی گوارا کیا جا سکتا ہے۔ صرف انتظار حسین ہی نہیں اور بھی بڑے بڑے ادیب اس کمزوری کا شکار رہیں۔ ضرورت ہے کہ مناسب لہجہ میں اگر اُن کی نہیں تو ادب کے قارئین کی توجہ اس طرف منتقل کی جائے۔

پہلے ہی شمارے میں کلیم الدین احمد۔ جمیل مظہری۔ ثاقب کانپوری۔ اختر لکھنوی اور ڈاکٹر احسن فاروقی کی تخلیقات پیش کی ہیں اور یہ "مہر نیمروز" کیلئے فال نیک ہے۔ البتہ کچھ جدید رجحانات کی آمیزش بھی ہو تو اچھا ہے تاکہ اپنے ارادوں کے مطابق "مہر نیمروز" قدیم و جدید کا خوشگوار سنگم بن سکے۔

حنیف فوق

مرزا ادیب (لاہور)

اگر تمہیں معلوم نہیں کہ میں تم سے خفا ہوں۔ تو اب سمجھ لو کہ میں واقعی خفا ہوں۔ وجہ صرف یہ کہ تم نے وعدہ کے باوجود "اُردو نمبر" کے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔ میں نے آخر کن لوگوں کے پُرخلوص اور مخلصانہ تعاون پر اعتماد کر کے اُردو نمبر کی اشاعت کا اعلان کیا تھا۔ تم نہیں جانتے۔ بہرحال اب قصہ یہ ہو کہ مہر نیمروز کا دوسرا شمارہ مل گیا ہو۔ اتنا خوبصورت، کامیاب اور بلند معیار پرچہ نکالا ہے کہ میری خفگی دُور ہو گئی ہو۔ واقعی بہت اچھا نمبر ہے یہ۔ پہلا شمارہ بھی بہت کامیاب تھا۔ مجھے توقع ہو کہ تم اپنے "ہمراہان قومی عناصر" کے ساتھ مہر نیمروز کو آسمانِ ادب کا مہر نیم روز بنا دو گے۔ میں بڑی مسرت سے اس پرچہ کا خیر مقدم کرتا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ اس کا ہر نمبر پہلے نمبر سے بازی لے جائے گا۔

"چہار درویش" کا سلسلہ خاص طور پر قابل قدر اور قابلِ ذکر ہو۔ ادارہ نے بڑا جرأت مندانہ اقدام کیا ہے۔ اس چیز کی سخت ضرورت تھی۔ جب تک ممکن ہو اس "قندیل" کو روشن رکھو۔ "دردانِ چراغ بکف" کی پروا نہ کرو۔ میری طرف سے اپنے ساتھیوں کو سلام پہنچا دو۔

مرزا ادیب

اظہر قادری۔

ماہنامہ "مہر نیمروز" کراچی کا پہلا شمارہ میری نظر سے گزرا۔ نیا رسالہ نکالنا کوئی بڑی بات نہیں اور شاید یہی وجہ ہو کہ ہندو پاکستان میں آئے دن نئے رسالوں کا اجراء ہوتا رہتا ہو لیکن اچھا اور معیاری ہونا صرف اچھے ادیبوں کے تعاون ہی پر منحصر نہیں بلکہ اس کے لئے ایڈیٹر کا بھی قابل اور باشعور ہونا نہایت ضروری ہو۔ یہ دونوں باتیں جس رسالہ کو بھی میسر ہوں اس کا اچھا ہونا ایک لازمی امر ہے اور حسن اتفاق سے یہ دونوں باتیں "مہر نیمروز" کو میسر ہیں۔ اس لئے کہ اس کے ادارے میں سید ابوالخیر کشفی سید حسن مثنیٰ ندوی وغیرہ ہیں اور لکھنے والوں میں اثر لکھنوی۔ ڈاکٹر احسن فاروقی۔ جمیل مظہری۔ غلام عباس۔ کلیم الدین احمد اسے حمید، ثاقب کانپوری وغیرہ جیسے شاعر و ادیب کا تعاون اسے حاصل ہو۔ ان میں کوئی ایک نام بھی کسی رسالہ کی زینت بن سکتا ہے۔ لیکن جہاں اتنے ستارے بیک وقت ضیا پاشیاں کر رہے ہوں وہاں اگر آنکھیں چکا چوند ہوں تو کیا تعجب ہو۔ رسالہ کی چھپائی اور گیٹ اپ نہایت معقول ہو۔ ان ساری باتوں کی وجہ سے اس کے پہلے شمارہ ہی سے اس کے روشن مستقبل کا اندازہ ہوتا ہے۔

اظہر قادری

ڈاکٹر سید عبد اللہ (لاہور)

"مہر نیمروز" کا اوّلین شمارہ مجھے موصول ہو گیا تھا۔ لیکن بوجہ مصروفیات مجھے اپنی رائے آپ کی خدمت میں ارسال کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ مختصراً عرض ہو کہ پرچہ اسم بامسمیٰ ہے۔ آپ جیسے قابل، اہل علم اور اہل قلم کی ادارت اس پرچہ کو میسر رہی تو آپ کے کشف و کرامات سے یہ "مہر" یقیناً ہمیشہ مہر نیمروز ہی رہیگا۔ بہر صورت خدمت کیلئے حاضر ہوں۔

مخلص۔ سید عبد اللہ

غلام احمد:-

"مہر نیمروز" کے دو شمارے نظر سے گزرے۔ کراچی سے ایک اچھے علمی اور ادبی ماہنامہ کی ضرورت تھی۔ "مہر نیمروز" کے تیور بتا رہے ہیں کہ یہ رسالہ اس کمی کو یقیناً پورا کرے گا۔

افسانوں کی طرف اور توجہ کیجئے۔ نام بڑے اور درشن چھوٹے والی بات نہ ہونے پائے۔ احمد علی کا مضمون پہلے شمارہ میں خوب ہے۔ "زمانہ" کے بعد انہوں نے کچھ لکھا ہے۔ "ہماری گلی" اور "قید خانہ" والے احمد علی کو، جو نہ جانے کس قسم کی نیند سو گئے ہیں، جگائیے۔ ان سے اگر آپ نے افسانے لکھوائے تو مانوں۔

ادبی سراغرساں کے مضامین بہت پسند آئے۔ اُن کو بے نقاب کرنا بہت بڑی ادبی خدمت ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ادبی سراغرساں صاحب کی نظر ان سطروں پر کیوں نہیں پڑی۔ جو آپ ہی کے رسالے میں ہیں:-

"نیا دور" صمد شاہین اور ممتاز شیریں کی ادارت میں بنگلور اور کراچی سے شائع ہوتا رہا ہے
اس سہ ماہی رسالہ کا اجرا پاکستان کلچرل سوسائٹی نے کیا ہے"

یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ مدیران "نیا دور" نے، جہاں تک مجھے علم ہے، ممتاز شیریں صاحبہ سے زبانی اجازت تک نہ طلب کی۔ لہٰذا اس "نیا دور" سے شاہین و شیریں کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ کلچرل سوسائٹی والوں نے "نیا دور" کے نام سے فائدہ اٹھایا تو خیر اچھا کیا لیکن اس سے آپ بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ یہ بُرا ہوا۔

کیا یہ حادثہ ادبی سراغرساں کی زد میں نہیں آتا؟ (غلام احمد)

نثار احمد فاروقی:-

سبحان اللہ! کیا مہر نیمروز طلوع ہوا ہے کہ آنکھیں چکا چوند کر دی ہیں۔ ایسا آئیڈیل رسالہ بڑی مدت کے بعد دیکھا ہے۔ طلوع کا سمت مغرب سے تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کہیں یہ قربِ قیامت ہی کی علامت تو نہیں۔

حق یہ ہے کہ آپ نے اُردو رسالوں کے معیار میں کچھ اور اضافہ کر کے ایک نئی نرالی راہ تراشی ہے۔ لیکن یہ مہر جہانتاب ابھی ہم تک نہیں پہنچا۔ مکرمی ڈاکٹر مسعود حسین کے ہاں علی گڑھ میں نظارہ ہوا۔ اور مجھے خیال آیا کہ آپ یقیناً میرا پتہ بھول گئے ہوں گے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ مہر نیمروز کی کرنیں مجھ تک نہ پہنچیں۔ میرا پتہ نوٹ کر لیجئے اور ازراہ نوازش دونوں اشاعتیں ارسال فرما دیجئے تاکہ اس کا فائل رکھ سکوں۔ مضمون کا وعدہ ہے جو ضرور ایفا ہو گا۔

(نثار احمد فاروقی)

اختر ماہ پوری:-

مکرمی و معظمی جناب سلیم فہمی صاحب اب کے کراچی سے واپس آئے تو "مہر نیمروز" کا تحفہ ساتھ لائے۔ اور اس سے کمترین کو بھی محروم نہ رکھا۔ "مہر نیمروز" صوری اور معنوی دونوں اعتبارات سے اسم بامسمّیٰ ہے۔ اگر اس کا ظاہر "کفِ گلفروش" ہے تو اس کا باطن "دامانِ باغباں" کی حیثیت رکھتا ہے۔ دل و نگاہ کی شادابی کا اتنا وافر سامان شاید ہی کسی اُردو مجلے میں بیک وقت میسر آئے۔ یقیناً مہر نیمروز کا یہ پہلا نقش سنگِ میل ہے منزل نہیں ہے۔ لیکن منزل تک پہنچتے پہنچتے اس کے جلوہ میں رنگ و بو کا جو کارواں مرتب ہونے والا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ادارۂ مہر نیمروز اس حسین و جمیل ادبی پیشکش پر لائق صد تبریک و تحسین ہے۔

اختر ماہ پوری

او۔ ہنری

دردِ مشترک

چور نقب زنی کے لیے جلدی سے کھڑکی میں سے اندر کود گیا اور ٹھٹک گیا۔ مشاق نقب زن کوئی اور چیز لینے سے پہلے تھوڑا آرام ضرور لیتے ہیں۔

گھر کی ہیئت سے اس کے مکینوں کا اندازہ ہو جاتا ہے چنانچہ چور نے اسے دیکھ کے سمجھ لیا کہ بی بی اس وقت کسی ہوٹل میں کسی ہمدرد کے پاس بیٹھی اس بات کا رونا رو رہی ہوگی کہ ابھی تک اس کے دل کو کسی نے نہیں سمجھا۔ کسی نے اس کا دکھ نہیں اپنایا چوتھی منزل کے سامنے کی کھڑکیوں میں اتنی رات گئے روشنیوں کا مطلب یہ تھا کہ صاحب خانہ گھر آ گئے ہیں اور جلد ہی بتی بجھا کر سو جائیں گے۔ ستمبر کا موسم ایسا ہی جبکہ لوگ ہوٹلوں، کیفوں اور لڑکیوں کی صحبت کو لہو و لعب خیال کرنے لگتے ہیں اور پہلے گھر پہنچ کر بی بی کے آنے کی راہ دیکھتے ہیں۔

یہ چور معمولی یعنی تیسرے درجے کا تھا۔ تیسرے درجے کا چور اوباش ہوتا ہے۔ پہلے اور دوسرے درجے کے چوروں کی طرح نہیں جو دن میں جنٹلمین بنے رہتے ہیں، عمدہ عمدہ لباس پہنتے ہیں، اچھے ہوٹلوں میں آمد و رفت رکھتے ہیں، دیواروں پر کاغذ منڈھنے اور فرنیچر وغیرہ مہیا کرنے کے بہانے گھروں کی کھوج لگاتے ہیں اور جھٹ پٹا ہوتے ہی اپنی آئی پر آ جاتے ہیں۔ اخباروں میں ایسے لوگوں کو خوب اچھالا جاتا ہے۔ ان کی، ان کی بیویوں کی، ان کی بیویوں کے فنا ساؤں کی تصویریں چھاپی جاتی ہیں۔ ان کی حیثیت ہیرو کی سی ہوتی ہے۔ لیکن یہ چور ــــــ یہ نقب زن ویسا نہیں تھا۔ ادنیٰ درجے کا تھا۔ اس کا ٹھاٹ باٹ بھی بڑے چوروں کا سا نہ تھا۔ نہ لالٹین، نہ نقاب، نہ بے آواز تلے والے جوتے۔ بس سیدھا سادہ آدمی تھا۔ منہ میں پیپرمنٹ کا چیونگ گم رکھے جگالی کرتا ہوا۔

فرنیچر پر گرد پڑی ہوئی تھی۔ چور کو اس گھر سے بڑا خزانہ ملنے کی امید نہ تھی۔ اس کی منزل تھم روشنی والا وہ کمرہ تھا جس میں صاحب خانہ استراحت فرما رہے تھے، وہاں کسی گھڑی کا، کچھ کھلے پیسوں کا یا ایسی ہی کسی چیز کا نا خارج از امکان نہ تھا وہ کھڑکی کھلی دیکھ کر یونہی اندر گھس آیا تھا۔

چور نے آہستہ سے اس کمرے کا دروازہ کھولا۔ بتی نیچی کر دی گئی تھی اور صاحب خانہ سو رہے تھے۔ سنگار میز پر کئی چیزیں گڈمڈ پڑی تھیں۔ کچھ مڑے تڑے نوٹ، ایک گھڑی، چابیاں، بجھے ہوئے سگریٹ، بال باندھنے گلابی ریشمی فیتے اور ایک بوتل سوڈا واٹر کی۔ صبح نوش جان کرنے کے لیے۔

چور نے سنگار میز کی طرف قدم بڑھائے، لیکن یکایک وہ سویا ہوا شخص پہلو بدل کر جاگ اٹھا اور آنکھیں کھول دیں۔ اس کا داہنا ہاتھ تکیے کے نیچے گیا لیکن وہیں کا وہیں رہ گیا۔

چپ لیٹے رہو" چور نے سرگوشی کے لہجے میں کہا، اس شخص نے چور کے ہاتھ میں پستول کی نال دیکھی اور بے حس و حرکت پڑا رہا۔

"اب دونوں ہاتھ اوپر اٹھاؤ" چور نے تحکمانہ لہجے میں کہا

اس شخص کے چھوٹی سی نوک دار کھچڑی داڑھی تھی، جیسی بلا درد دانت نکالنے والے ڈاکٹروں کی ہوتی ہے۔ وہ جھنجلایا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اُٹھ کے بستر پر سیدھا بیٹھ گیا اور داہنا ہاتھ سر سے اوپر اٹھا دیا۔

دوسرا ہاتھ بھی اٹھاؤ تمھارا کیا اعتبار ہے، بائیں ہاتھ سے پستول داغ دو۔ میں دو تک گنتا ہوں جلدی کرو"۔

"یہ ہاتھ میں نہیں اٹھا سکتا" اس شخص نے کہا

"کیوں کیا بات ہے؟ چور نے پوچھا

"کندھے میں گٹھئے کا درد ہے"

"ورم کے ساتھ؟

"پہلے ورم تھا، اب نہیں ہے"

چور اسی طرح ایک دو لمحے ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔ پستول کی نال اسی طرح اس شخص کی طرف۔ اس نے سنگار میز کی چیزوں پہ نظر ڈالی اس کے بعد اس شخص پہ۔ اس کے چہرے پہ ایک تشنج سا طاری تھا۔

"کھڑے یوں منہ بناؤ"۔ اس شخص نے کہا۔ "اگر تمھیں چوری کرنا ہو تو کرو، یہ میز پہ چیزیں پڑی ہیں"۔

"اتفاق سے میں بھی اس موذی مرض گٹھیا کا پرانا مریض ہوں، میرے بھی یہ بائیں بازو میں ہے، کوئی اور ہوتا تو یقیناً تمھارا بایاں پنجہ اوپر اٹھتا نہ دیکھ کر ٹھائیں سے گولی داغ دیتا"۔

"تمھیں یہ درد کب سے ہے" اس شخص نے پوچھا

"چار سال سے، گٹھیا تو میں سمجھتا ہوں ایسی چیز ہے کہ ایک بار ہو جائے تو جان کے ساتھ جاتی ہے۔

"کبھی کوڑیالے سانپ کا تیل استعمال کیا؟"

"سیروں، بلکہ منوں۔ جتنے سانپوں کا تیل میں نے استعمال کیا ہے اگر ان کو باندھ کر رسی بنائی جائے تو آٹھ بار یہاں سے زحل تک اور زحل سے یہاں تک آسکتی ہے"۔

"بقراطی گولیاں استعمال کیں؟"

"پانچ مہینے متواتر"۔ چور نے جواب دیا۔ کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ایک سال حبوب کبیر، معجون فلاسفہ اور اطریفل جالینوس خاص الخاص استعمال کیے تھے۔ اس سے کچھ فائدہ ہوا۔ لیکن زیادہ افاقہ لعوق سپستاں سے ہوا، جو میں جیب میں رکھتا تھا"۔

"تمھارا درد صبح کو زیادہ ہوتا ہے یا رات کو" اس شخص نے دریافت کیا۔

"رات کو۔ اور رات ہی میرے کام دھندے کا وقت ہوتا ہے۔ اچھا اب یہ ہاتھ نیچا کر لو۔ ہاں ہاں کر لو۔ جم کر دو چار مہینے مار الحم دو آتشہ پیا کہ نہیں؟ چور نے پوچھا

نہیں وہ تو نہیں پیا۔ خیر یہ بتاؤ۔ اس کا دورہ پڑتا ہے یا ایک سا درد رہتا ہے"۔

چور آ کر اس شخص کی پائینتی بیٹھ گیا اور پستول کو اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا۔

ویسے بڑی سختی ہے کبھی کبھی تو میں سیڑھیاں بھی نہیں چڑھ سکتا ، سانس آدھے میں رہ جاتا ہے ۔ میں سوچتا ہوں کہ ڈاکٹروں کے پاس اس کا علاج ہی نہیں ۔ سب چور ہیں۔

"میرا بھی یہی خیال ہے ۔ سینکڑوں ہزاروں روپے خرچ کر چکا ہوں ، دھیلا بھر آرام نہیں ۔ تمہیں کچھ افاقہ ہوا"

"ہاں صبح کے وقت ٹھیک رہتا ہے لیکن اگر بارش ہو جائے تو خدا کی پناہ"

"یہی حال ادھر ہے ۔ ذرا سا بادل کا ٹکڑا بھی کہیں سے اٹھے ، اس کی ہلکی سی بھی ... ہوتے ہی دانت کے درد کی طرح سرایت کر جاتی ہے :"

چور نے پستول اٹھایا اور ذرا سی جھجک کے ساتھ جیب میں ڈال لیا اور تھوڑے تامل کے بعد کہا

"اچھا یہ بتاؤ کبھی فاسفورس کے تیل کی مالش بھی کرائی ہے ؟"

"بہت اس سے تو سرسوں کا تیل اچھا ہے"

ٹھیک ٹھیک کہتے ہو ۔ ٹھیک کہتے ہو ۔ بہت معمولی چیز ہے ۔ ہاتھ پاؤں پر معمولی خراش میں تو فائدہ ہوتا ہے اس سے آگے نہیں ۔ ہم دونوں کی حالت اس معاملے میں ایک ہے بس اس کی تو ایک ہی دوا ہے ۔ واہ ۔ واہ کیا موقع پر یاد آئی شراب کے دو گھونٹ جو کام کرتے ہیں وہ ان تیلوں اور مالشوں کے بس کی بات نہیں ۔ چلو ذرا کپڑے پہنو ۔ باہر کوئی شراب خانہ کھلا ہو تو دو گھونٹ پی آئیں :

"ایک ہفتہ سے تو یہ حالت ہے کہ میں کپڑے بھی خود نہیں پہن پاتا نوکر پہنا دیتا ہے اور وہ اس وقت سو رہا ہو گا ۔"

"اس کی فکر نہ کرو میں پہناتا ہوں کپڑے ذرا سی ہمت کر کے بستر سے نکل آؤ"

یکایک اس شخص کو کچھ خیال آیا اس نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا عجیب ماجرا ہے بات سمجھ میں نہیں آتی :

یہ لو اپنی قمیص ۔ ایک صاحب بتاتے تھے کہ اونچے پل کے قریب ایک ڈاکٹر کے پاس مجرب نسخہ ہے ۔ کوئی مرہم ہے ۔ دو ہفتے میں درد آدھا رہ جاتا ہے :

دروازے سے نکلتے ہوئے صاحب خانہ نے کہا " ارے میں پیسے تو بھول ہی گیا چلا تھا ، ذرا ٹھہرو ، میز پر سے لے آؤں "

" نہیں نہیں چور نے آستین پکڑ کر کہا " میرے پاس پیسے ہیں فکر مت کرو ۔ تمہیں میٹھے تیل میں لونگ ڈال کے بھی ذرا مالش کرانی تھی (ترجمہ)

عجائب خانہ

(ہنرک کا خطاب شہر کے لوگوں سے)

ہم میں سے ہر ایک اپنی ذات میں جھانک کر دیکھے اور اس بات کو واضح کر دکھائے کہ آج ملت سے ہم ایک نئے دور کا آغاز کر رہے ہیں ۔

پرانا دور اپنے جھوٹے نگوں ، اپنی مصلحت اندیشی ، اپنے منافقانہ اخلاق ، اپنے روایتی اور بے مقصد رسوم ، اپنے قابل افسوس اعمال اور اپنی ظاہری عزت کے ساتھ محض ایک عجائب خانہ بن جائیگا ۔ اور وہ عجائب خانہ ہمیں سچی عزت اور صداقت کی تعلیم دیتا رہیگا ۔ (البن)

آغا عادل ندیم

بند کھڑکی

بھیا نے جوں ہی گلی کے نکڑ پر قدم رکھا جلتے ہوئے بُرادے کی بُو اُس کی ناک میں سرایت کر گئی۔ اُس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ ابروؤں کو سکیڑ کر لکڑی کے بُرادے کا بھرا ہوا بورا داہنے شانے سے بائیں پر اور بسولہ - ریتی - آری کی پوٹلی بائیں شانے سے داہنے پر رکھتے ہوئے وہ جھنجھلاتی ہوئی سی آواز میں بڑبڑایا —— "قسم پنجتن پاک کی ——" اور باقی الفاظ اس کی دھونکنی کی طرح چلتی ہوئی سانسوں میں کھو گئے۔

اُسے معلوم تھا صغراں اس وقت دھوئیں سے گھٹی ہوئی کوٹھڑی میں انگیٹھی کے چولھے پر ہانڈی بھون رہی ہوگی۔ اُس کی آنکھوں سے پانی جھرنے کی طرح بہہ رہا ہوگا اور حلق میں بُری طرح گھٹتے ہوئے دھوئیں کی وجہ سے بار بار اُبکائی آ رہی ہوگی۔ کھانسی کی مسلسل ٹھسک سے دم گھٹ رہا ہوگا —— بھیا نے تذبذب کی سی حالت میں بُرادے کا منھ تک بھرا ہوا بورا بائیں شانے سے داہنے اور اوزاروں کی پوٹلی داہنے شانے سے بائیں پر رکھی اور زیرِ لب بڑبڑاتا تیز تیز قدموں سے لپک کر چلنے لگا۔

★

گلی کے نکڑ پر کوڑے کرکٹ کے گڑھے کے کنارے کنارے کمیٹی کی کوٹھریوں کی ایک لمبی سی قطار تھی۔ بھیا انہی کوٹھریوں کے پرلی طرف کی آخری کوٹھڑی میں رہتا تھا۔ کوٹھریوں کی پُشتی دیوار اور بڑی سڑک کے درمیان ایک خوبصورت سی کوٹھی تھی۔ کوٹھی کا پائیں باغیچہ کوٹھریوں کی اسی پُشتی دیوار کے ساتھ ساتھ ہوا تھا۔ اب دیوار میں ہر کوٹھڑی کی ایک چھوٹی سی کھڑکی کھلتی تھی۔ جو اب کمیٹی کے حکم سے پٹیوں کی چھٹیوں اور ٹاٹوں سے جکڑ کر بند کر دی گئی تھیں۔ سُنا تھا کہ اس خوبصورت کوٹھی کے بننے سے پہلے یہ تمام کھڑکیاں کُھلی رہتی تھیں اور ان میں سے جھانکتے بچے اور عورتیں اکثر کھڑکیوں میں کھڑے ہو کر سامنے میدان کے پار بڑی سڑک پر گزرتی ہوئی کاروں، گاڑیوں، تانگوں اور لوگوں کو دیکھ کر اپنا جی بہلا لیا کرتی تھیں لیکن کوٹھی کے بننے کے بعد ان بچوں اور عورتوں کی زندگی بڑی سڑک کی گہما گہمی سے کٹ کر رہ گئی تھی ——

بھیا کی بغل والی تین کوٹھریوں میں ایک لمبی لمبی مونچھوں والا تھانیدار رہتا تھا۔ تھانیدار نے کمیٹی سے اجازت لے کر سامنے کی آدھی گلی گھیر کر ان تینوں کوٹھریوں کے آگے ٹاٹ کے پردے کس دئیے تھے جہاں تھانیدار کی مرحومہ بیوی سردیوں میں بیٹھی دھوپ تاپا کرتی تھی اور گرمیوں میں رات کو تاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں سویا کرتی تھی —— لیکن بھیا اور صغراں کے مقدر میں گرمیوں سردیوں میں کوٹھری کی وہی کالی کلوٹی دھوئیں سے اٹی ہوئی چھت لکھی رہتی۔

گرمیوں میں بھیا اور صغراں کوٹھری کا دروازہ کھول کر ایک طرف دیا سلائی سا لٹکا کر سویا کرتے۔ کوٹھری کی تنگی سے اور نیچی چھت کے گھٹن کی تپش سے گھبرا کر صغراں نے اکثر بھیا سے کہا تھا کہ آدمی رات کے وقت گلی میں سونے کو نقصان ہو جاتا ہے۔ اگر وہ باہر جا پایا کرے تو کم از کم تازی ہوا سے پسینہ تو خشک ہو جایا کرے گا —— لیکن صغراں کی اس بات پر بھیا نے ہر دفعہ تُرشی اور غصے سے کہا تھا۔

"ہمارے خاندان کی بہو بیٹیوں کے پلّو کی جھلک تک کسی نے نہیں دیکھی ہے صغراں بی بی ـــــ قسم پاک پنجتن کی ـــــ چاہے کتنی ہی گرمی پڑے ہم باہر نہیں سوئیں گے ـــــ یہ بے غیرتی مجھ سے تو نہ ہوگی صغراں ـــــ"

مئی، جون کی گھمس راتیں انھوں نے اکثر جاگ کر کاٹی تھیں۔ بھیّا نے کوئی کھلی سی جگہ حاصل کرنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے تھے اور کئی ایک جگہ سستے داموں پر کرایہ کی کھلی کوٹھریاں اُسے ملی بھی تھیں لیکن شریفانہ ماحول نہ پاکر بھیّا نے اپنی اسی تنگ و تاریک کوٹھری میں رہنا پسند کیا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ محلہ پڑوس کی بہو بیٹیوں کی عزت برابر کی ہوتی ہے اور اس لحاظ سے اُس کے پڑوس کا وہ لمبی لمبی مونچھوں والا تھانیدار بُرا نہ تھا۔ اپنی بیوی کی زندگی میں اور مرنے کے بعد اُس نے آج تک کوئی ایسی غیر معقول حرکت نہ کی تھی جو بھیّا کو کھٹکتی اور جب محلّے کی بھنگن چھیمیا جو اپنی جوانی کی حدیں عبور کر چکی تھی تھانیدار کے گھر کا کام اس بات پر چھوڑ دیا کہ بیوی کے مرنے کے بعد وہ اسے گھورنے لگا ہے تو بھیّا نے اِس ہوائی پر یقین نہ کیا۔

صغراں کے روز روز کے اصرار پر آخر تنگ آکر وہ ایک روز کمیٹی کے دفتر گیا تاکہ کمیٹی سے اجازت لے کر اپنی کوٹھری کے آگے بھی ٹاٹ کا پردہ کس لے تاکہ انھیں گرمیوں میں باہر با پردہ سونے کا آرام مل جائے لیکن اُس کی اُمیدوں کے برعکس کمیٹی کے دفتر میں اُس کی بات کسی نے کان دھر کر نہ سنی بھیّا بہت دیر تک ایک ایک بابو کو اپنی بپتا سناتا رہا۔ ہر ایک کو اپنی تکلیف اور خاندانی غیرت کا احساس دلاتا رہا۔ لیکن تمسخر اور بے ربط باتوں کے علاوہ اُسے وہاں سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔

"قسم پاک پنجتن کی صغراں بیگم" اُس روز شام کو اُس نے شانوں سے لکڑی کے گٹھے اتارتے اور بازوؤں کے پھوڑے زمین پر پٹختے ہوئے کہا تھا۔ "چاہے سورج سوا نیزے پر آجائے۔ تو گرمی میں اُبل اُبل کر مر جائے لیکن میں اب آئندہ دفتر کے ان بالشتیے بابوؤں کی خوشامدیں نہیں کروں گا ـــــ کبھی ـــــ"

بھیّا کی یہ قسم ہمیشہ سے پتھر کی لکیر رہی تھی۔

اور پھر واقعی کئی گرمیاں آئیں اور اُسے اور صغراں کو کوٹھری میں اُبال اُبال کر چلی گئیں۔ لیکن بھیّا نے دوبارہ اُن بالشتیے بابوؤں کے دفتر کا رُخ بھی نہ کیا۔

بھیّا نے امرتسر کی سرزمین پر جنم لیا تھا ـــــ اُس سرزمین پر جس کی مٹی میں رومان بھی رچا ہوا ہے اور فولاد بھی۔ لیکن بھیّا کے حصے میں فولاد ہی زیادہ آیا تھا۔ اس کے تنے تنے گول گول بازو۔ چوڑے چکلے سینے اور چوڑی چوڑی بالوں بھری کلائیوں کو دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے اکثر کہا تھا۔

"بھیّا تو تو ہڈی اور گوشت کا بنا معلوم نہیں پڑتا۔"

اور بھیّا ہر بار زیر لب مسکراتا۔ اپنی مونچھوں کو بل دیتا اور فخر سے کہتا۔

"چپ رہو اے بالشتیو ـــــ"

اُس نے امرتسر کے اکھاڑوں میں ہمیشہ اپنے سے دوگنے نامی پہلوانوں کو ایسے پینترے دیئے تھے کہ اُس کی "فولادی" کا چرچا سارے امرتسر میں عام ہو گیا تھا اس کے متعلق یہ بات امرتسر کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ فرنگی کے راج میں ایک بار اُس نے ایک نامی افسر کی دو پسلیاں محض اس لئے توڑ دی تھیں کہ اُس نے شراب کے نشہ میں محلے کی کنواری تیلن کی کلائی پکڑ کر انگریزی میں کچھ گٹ پٹ کی تھی۔ اپنی اس دست درازی کی سزا پہلے پکڑ جہاں وہ نامی افسر ہسپتال کی پلنگ سے جا لگا وہاں خود بھیّا پورے سال بھر جیل کے اندر پڑا فخر سے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا رہا۔

اور جب بھیا پندرہ برس کی جیل سے باہر آیا تو تمام امرتسر کی گلی کوچوں سے غریب غربا مرد عورتیں۔ بچے پھولوں کے گجرے ہاتھوں میں لئے باہر اس کے منتظر کھڑے تھے۔ اور پھر وہ تمام کے تمام ہال بازار۔ کٹڑہ شیر سنگھ۔ اور شریف پورہ تک بھیا کے پیچھے پیچھے خوشی میں چیختے چلاتے چلتے رہے۔

اُس دن اُس نے فخر سے کہا تھا۔

قسم پاک پنجتن کی ـــــ بھیا اپنے ملک کی ہر بہو بیٹی کی خاطر ساری عمر جیل میں پڑے سڑتے رہنے کی سکت رکھتا ہے ـــ"

اور بھیا کی یہ بات سُنکر تیلن ہندو کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو چھلک پڑے تھے۔

اور کچھ دنوں بعد جب وہ اپنی سگی خالہ کی لڑکی صغراں کو بیاہ کر لایا تو اُس کا گھر قسم قسم کی مٹھائیوں اور تحفوں سے بھر گیا۔ محلہ کی کنواری لڑکیاں کئی ہفتہ تک اُس کے گھر میں ڈھولک پر سہاگ گیت گا گا کر بھیا سے لڑ لڑ کر اپنا نیگ وصول کرتی رہیں۔

بھیا نے اپنے خاندان کی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے تمام زندگی کشتیاں لڑی تھیں۔ اس کی کمر کے گرد ہمیشہ لنگر کسا رہا تھا۔ سر پر بندھی ہوئی تیز رنگ کی دستار ہمیشہ کلاہ سے اکڑی رہی تھی ـــــ لیکن ٹھوالئے کے بعد جب وہ امرتسر چھوڑ کر لاہور آیا تو اُس کی کمر کے گرد کسا ہوا لنگر آپ ہی آپ ڈھیلا پڑ گیا۔ سر پر کلف خوردہ اکڑی ہوئی دستار کی جگہ میلا کچیلا سا کپڑا لپٹا رہ گیا ـــــ اور وہ کشتیوں سے اکھاڑوں کی بجائے روزی کمانے کے لئے تمام تمام دن آرا چلانے لگا۔

پہلے پہل تو اُس کے ذہن میں امرتسر کے اکھاڑے اُبھرتے رہے۔ کانوں میں مردوں۔ عورتوں اور بچوں کے وہ نعرے گونجتے رہے جو وہ اُسے حریف پر غالب آتے دیکھ کر خوشی میں لگایا کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ سب کچھ موٹے موٹے درختوں کے تنوں میں چلتے ہوئے آرے کی سنسناہٹ میں ختم ہو گئے ـــ اور بھیا خود وہ سوکھا ہوا تنا بن کر رہ گیا جس کے گرد روز و شب غمِ دوراں کا تیز آرا چلتا رہتا۔

بھیا کی رہی سہی توتوں کو سلب کرنے کے لئے اُس پر ایک اور پہاڑ آن گرا۔ صغراں کو ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا۔ اور ایک روز جب وہ اُسے ڈاکٹر کو دکھانے بڑے اسپتال لے گیا تو بڑے ڈاکٹر نے اُسے بتایا کہ صغراں کو ایک موذی روگ چمٹ گیا ہے ـــــ وہی روگ جس میں یہ ہلکا ہلکا بخار انسان کا گوشت سُکھا کر کھال سے چپکا دیتا ہے جس میں کھانسی کی ذرا دھیمی دھیمی ٹھسک رفتہ رفتہ جسم کی ہڈیاں گھلا دیتی ہے۔

بڑے ڈاکٹر نے یہ تمام باتیں اُسے ایک طرف لیجا کر کہی تھیں اور اُس کی تسلی کے لئے یہ بھی کہا تھا کہ اگر پرہیز اور غذا کا خیال رکھ کر علاج کیا گیا تو صغراں کی جان بچ سکتی ہے اور ڈاکٹر نے اس بات پر زور دیا تھا کہ جس مکان میں صغراں رہتی ہے وہ کھلا اور ہوادار ہونا چاہیئے اُس کے کمرہ کی کھڑکیاں اور روشندان چوبیس گھنٹے کھلے رہنے چاہئیں۔

بھیا نے اُس روز سے پہلے آجتک کبھی روشندان اور کھڑکیوں کی اہمیت کے متعلق سوچا بھی نہ تھا۔ لیکن اُس دن بہت کچھ سوچنے کے بعد وہ پُشتی دیوار کی کھڑکی کھولنے کی اجازت لینے بجلی کوٹھی کے اُس دیسی فوجی افسر کے پاس گیا جسے وہ ہمیشہ باشتیا ہی کہتا رہا تھا۔ بھیا نے فوجی افسر کو اپنی تمام بپتا سُنا ڈالی اور کہا کہ کھڑکی کھول دینے سے کوٹھڑی میں یقیناً تازہ ہوا آئے گی اور صغراں اس روگ سے بچ جائے گی اور وہ پھر ساری عمر کے لئے اُس افسر کا غلام بنکر رہ جائے گا۔

افسر کچھ دیر تک نظریں نیچی کئے جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہونٹوں سے سگار چباتا رہا۔ پھر اُس نے کہا کہ وہ بیگم سے پوچھے بغیر کھڑکی کھولنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اور جب سرخی و غازہ سے لپی پُتی نیم عریاں لباس میں دیسی میم صاحبہ آئیں تو بھیا ایکبار شرم سے گونگا سا گیا کچھ دیر سکتہ کی سی حالت میں کھڑا وہ دل ہی دل میں یہ سوچتا رہا کہ گھروں میں بیٹھنے والی باحیا بی بیاں آخر کیوں یوں اپنی شرم و حیا گنوا کر مداریوں کی طرح بہروپ بدلے پھرتی ہیں ـــــ قسم پاک پنجتن کی ـــــ اُس نے دل ہی دل میں قسم کھائی ـــــ اگر یہ میری بیوی کا ہوتی تو اُس کی

چھیاں توڑ دیتا ـــــ اور دوسرے لمحہ اُس کی نظروں کے آگے اپنی بھولی بھالی سیدھی سادی صغراں آ گئی تو وہ یہ سب کچھ بھول کر میم صاحب کو پیغمبروں کے واسطے دیکر کھڑکی کھولنے کی اجازت مانگنے لگا۔

کھڑکی کھولنے سے ہماری بے پردگی ہوتی ہے ۔ میم صاحب نے اپنی اسکرٹ گھما کر اپنی سانپ جیسی کی نمائش کرتے ہوئے کہا "ہم اِن کوٹھریوں میں سے کسی کو بھی اپنی کھڑکی کھولنے کی اجازت نہیں دے سکتے ـــــ"

اور بھیا ناکام ہو کر بوجھل قدموں سے واپس لوٹ آیا۔

اُس کے بعد یہ غم بھیا کو دھیرے دھیرے کھاتا گیا۔ پچھلے کئی دنوں سے باشتہ دیسی افسر، اسکرٹ گھماتی ہوئی میم اور چٹخنیوں سے جکڑی ہوئی اندھی کھڑکی یکے بعد دیگرے اُس کے ذہن میں چکر لگاتے رہے۔ ویسے تو بھیا ایک دن میں تین تین درختوں کے تنے چیر ڈالتا تھا لیکن اِن پچھلے چند دنوں سے وہ دن بھر میں ایک تنا بھی ڈھنگ سے نہ چیر پاتا تھا ـــــ اور یہ خیال اُسے بُری طرح کھائے جا رہا تھا کہ اگر کوٹھری کی یہ کھڑکی چند دن تک نہ کھلی تو وہ موذی روگ صغراں کی بجائے خود بھیا کو ہی چاٹ جائیگا۔

★

اور آج جب وہ دن ڈھلے گلی کے نکڑ پر پہنچا تو حسبِ معمول لکڑی کے جلتے ہوئے برادے کی بُو اُس کے نتھنوں سے ہوتی ہوئی دماغ تک پہنچ گئی ـــــ اور بھیا کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے آجتک تو وہ بہت صبر کرتا رہا ہے۔ برداشت کرتا رہا ہے لیکن اب اگر اُس نے اپنی کوٹھری کی بند کھڑکی نہ کھولی تو یقیناً کوٹھری کا گھٹا ہوا دھواں اُس کے دماغ میں غبارے کی طرح پھٹ جائے گا۔

"قسم پاک پنجتن کی" وہ زیرِ لب بڑبڑایا "اگر آج میں نے یہ کھڑکی نہ کھولی تو چلّو بھر پانی میں ڈوب مروں گا ـــــ"

جوں ہی وہ کوٹھری میں گھسا صغراں کی کھانسی کے جھٹکے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ بنکر اُتر گئے۔ تمام کوٹھری دھوئیں سے اَٹی ہوئی تھی اور صغراں چہرے کو چادر سے ڈھانپے توے پر روٹیاں سینک رہی تھی۔

بھیا نے اپنے شانوں سے برادے کا منہ تک بھرا ہوا بورا اور اوزاروں کی وزنی پوٹلی جھٹک کر ایک طرف پٹخ دی اور بپھرے ہوئے شیر کی طرح کھڑکی کی طرف جھپٹا۔

"سالے بازار میں تو میم صاحب ماریوں کا سا روپ بھرے پھرتی ہے ـــــ" کھڑکی کی چٹخنیاں اور ٹاٹ نوچتا ہوا وہ زور سے چیخا "تو یہ کھڑکی کھلنے سے کونسی بے پردگی ہوتی ہے اس کی ـــــ کونسی باپردہ بی بی ہے ـــــ جو ـــــ"

دوسرے لمحہ تک وہ کھڑکی کی تمام چٹخنیاں اور ٹاٹ نوچ چکا تھا۔

پھر اُس نے کھڑکی کا پٹ کھولدیا۔

سویٹ پی، چمپا اور موتیے کی خوشبوؤں سے بوجھل ہوا کا ایک جھونکا یکلخت کھڑکی سے اندر آیا ـــــ بھیا چند لمحہ مبہوت بنا کھڑا رہا ـــــ پھر اچانک اُس کی نگاہ تھانیدار کی ساتھ والی کوٹھری کی کھڑکی پر پڑی ـــــ کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے تھے ـــــ حیرت اور تعجب سے اُس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں ـــــ پھر اُس کی نگاہیں تھانیدار کی کھلی ہوئی کھڑکی سے آہستہ آہستہ پھسلتی ہوئی کوٹھی کے برآمدہ میں بچھے ہوئے موٹے موٹے گدیلے صوفوں تک پہنچ گئیں۔

اور دوسرے لمحہ اُس نے دونوں ہاتھوں سے کھڑکی کے دونوں پٹ پھر تیزی سے بند کر دیئے۔ اُس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ چہرہ پر زردی چھا گئی تھی۔

"مردوں کی بہو بیٹیوں کی عزت اپنی ہی ہوتی ہے صغراں بیگم" وہ کھڑکی میں دوبارہ مضبوطی سے چٹخنیاں اور ٹاٹ ٹھونکتے ہوئے نہایت ہی سنجیدگی سے بولا ـــــ "قسم پاک پنجتن کی ـــــ میں آئندہ اِس کھڑکی کو ہاتھ تک نہ لگاؤں گا ـــــ کبھی ـــــ"

تھی۔ اصغر نے کوٹ اُتار کر شانے پر ڈال لیا۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر دی اور ایک جگہ رک کر ریلنگ کا سہارا لیا اور جھک کر جھلملاتے پانی میں ان تاریک پرچھائیوں کا عکس دیکھنے لگا جو اس چوڑی ماسٹک کی سڑک پر پھیلی ہوئی تھیں۔ اس سے کئی گز پرے ایک بینچ تھا اور اس پر ایک جوڑا بیٹھا تھا۔ لڑکی کی پشت اصغر کی طرف تھی لیکن مرد کا رخ اصغر کی طرف تھا۔ مرد سوٹ میں تھا اور اس کے منہ میں پائپ تھا۔ چونکہ یہ بینچ بجلی کے کھمبے سے کچھ دور تھا۔ اس لیے اصغر کو اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان سے قریب دو ننھے منے بچے کھیل رہے تھے اور ان کے عقب میں ایک بڑی سی کار کھڑی تھی۔ نہ جانے کیوں اصغر کو یہ خاندان کچھ عجیب سا لگنے لگا۔ اس وقت لڑکی باتیں کر رہی تھی اور نوجوان دانتوں میں پائپ دبائے اس کی باتیں بڑے انہماک سے سن رہا تھا۔ نوجوان نے جھک کر کچھ کہا تو لڑکی نے قہقہہ لگایا اور معاً اصغر کو یوں محسوس ہوا جیسے یکایک اس کا ماضی پلٹ کر لوٹ آیا ہو — وہی مانوس قہقہہ — ہنسنے کا بالکل ویسا ہی انداز جو اس کے کانوں میں اب تک بسا ہوا تھا۔

اصغر چوکنا ہو کر ان کی باتیں سننے لگا لیکن کچھ تو ہوا شور مچا رہی تھی اور کچھ وہ دونوں تھے ہی اتنے دور کہ باتیں سمجھ میں نہیں آئیں۔ اصغر آہستہ سے آگے بڑھا تو اسے لڑکی کی آواز سنائی دی۔

"— تمہیں اس پر رحم آنا چاہیے ممتاز — یہاں وہ کتنی بے بس اور بے یار و مددگار ہے۔"

اصغر کو یقین ہو گیا کہ یقیناً یہ کنول تھی۔ بولنے کا انداز وہی — وہی قہقہہ — وہی خوبصورت گہری آواز جس میں نینہ کا ہلکا سا خمار تھا۔

"میرا جی اس سے بھر گیا ہے۔" مرد بولا۔ "کئی بار اس سے کہا — مجھ سے پیسے لو اور چلی جاؤ — لیکن اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ میں بھکارن نہیں ہوں — ارے ٹوٹو کو پکڑو — وہ ریلنگ کی طرف جا رہا ہے — ٹوٹو!!"

مرد نے بچے کو آواز دی۔ بچہ اس کی آواز پر رکا نہیں۔ اس لئے لڑکی اٹھی اور تیزی سے آگے بڑھی اور اصغر نے سوچا — وہی قد و قامت — صرف ساڑی کی جگہ وہ آج شلوار قمیص میں تھی — یہ ممتاز کون تھا؟ — اس کا شوہر؟ کیا اس نے ایک مسلمان سے شادی کر لی تھی؟ — یہ بچے کیا ان کے تھے؟

شاید بچے انہیں ستانے لگے تھے۔ لڑکی نے ایک کو اور ممتاز نے دوسرے کو گود میں اٹھا لیا اور اب وہ کار کی طرف جا رہے تھے کہ اصغر کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اگر اس نے یہ سنہری موقع کھو دیا تو پتہ نہیں دوبارہ وہ انہیں ڈھونڈ سکے یا نہیں۔ اس کے ذہن میں تیزی سے ایک خیال آیا اور اس نے جیب سے سگریٹ نکالا اور تیزی سے کار کی طرف بڑھا۔ کوٹ اب بھی اس کے شانے پر پڑا تھا۔ انکی کار بجلی کے کھمبے سے قریب روشنی میں کھڑی تھی۔

"معاف کیجئے۔ ماچس ہو گا آپ کے پاس؟" اصغر نے قریب جا کر ممتاز سے پوچھا۔ وہ اتفاق سے کار کا دروازہ کھولے کھڑا پائپ سلگا رہا تھا۔ اصغر کی آواز پر لڑکی چونک گئی اور بچی کو کار میں بٹھاتے ہوئے وہ اس کی طرف مڑی اور اصغر کا دل دھڑکتے دھڑکتے ایک پل کے لئے رک گیا!! — وہ کنول ہی تھی — لیکن کتنا کتنی بدل گئی تھی وہ — سر کے بال شانوں تک کٹے ہوئے تھے۔ چہرہ پر گہرا میک اپ تھا۔ اس نے چونک کر اصغر کو یوں دیکھا تھا جیسے یکایک زمین پھٹ گئی ہو اور اس میں سے مردہ نکل آیا ہو۔ وہ عجیب سہمی سہمی نگاہوں سے اسے تک رہی تھی۔ ان میں حیرت تھی، استعجاب تھا، دہشت تھی۔ سب کچھ تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ایسی کوئی چمک پیدا نہیں ہوئی تھی جس سے اصغر کو یقین ہوتا کہ اس نے اسے پہچان لیا تھا۔ ممتاز نے پائپ سلگا کر لائٹر اصغر کے حوالے کیا۔ اصغر نے لائٹر جلایا اور اسے سگریٹ کے قریب لیجا کر سگریٹ کے سلگ جانے کے بعد بھی چند لمحے اسے اپنے قریب جلتا رکھا تاکہ اگر اس دھیمی سی روشنی میں کنول نے اسے پہچانا نہیں ہو تو اب لائٹر کی روشنی میں پہچان لے۔ لیکن اب کے بھی اسے مایوسی ہوئی۔ اس نے لائٹر بند کر دیا تو دیکھا وہ بچوں کو لئے کار میں بیٹھ چکی تھی۔ ممتاز نے لائٹر لے لیا اور دوسری طرف جا کر کنول کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اور کار اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور حیدرآباد کی طرف چلی گئی اور اصغر ایک بے جان بت کی طرح ساکن کھڑا سوچتا رہا — کیا یہ سب خواب تھا؟ کیا اس کی نظروں نے آج جو کچھ دیکھا یہ سب فریب تھا، دھوکہ تھا؟ کیا وہ واقعی کنول تھی؟ اگر تھی تو اس نے حسب عادت — ہیلو اصغر — کیوں نہیں کہا؟ کیا وہ اپنے شوہر سے اس قدر خائف تھی؟ اس نے اپنے اس عزیز دوست کو یکلخت بھلا دیا جس کی دن رات تیمارداری کر کے اس نے کبھی ایک نئی زندگی بخشی تھی؟ کیا کلکتے میں اس کے

ساتھ گزارے ہوئے حسین لمحے صرف دھوکہ تھے؟ کیا دوستی کا تقاضا یہی تھا کہ اتنی مدت کے بعد آج ملاقات ہوئی تو اس کے زبان سے "ہیلو اصغر" تک نہیں نکلا اور وہ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے کار میں جا بیٹھی اور جس طرح یکایک اسے ملی تھی اسی طرح غائب بھی ہوگئی اور وہ اس حد تک بت بنا کھڑا رہا کہ اس نے کار کا نمبر تک نہیں دیکھا۔ اسے صرف یہ یاد تھا کہ فیروزی رنگ کی نئی اسٹوڈی بیکر تھی۔ لیکن حیدرآباد میں اس نے اسی رنگ کی کئی اور کاریں دیکھی تھیں خود اس کے ناظم رائے بہادر کے پاس بھی ایسی ہی گاڑی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میری نظروں نے دھوکہ کھایا ہو؟ — اصغر نے سوچا۔ لیکن یہ ناممکن تھا اگر وہ کنول نہیں تھی تو اس کی آواز پر اس بری طرح چونکی کیوں تھی؟ اور جب اس نے مڑ کر اسے دیکھا تھا تو اس کی آنکھوں میں تعجب اور دہشت کا وہ سیلاب کیوں آگیا تھا؟ — یوں جیسے کسی نے اسے چوری کرتے پکڑ لیا ہو۔

اس نے سگریٹ مسل کر نیچے پانی میں پھینک دیا اور ایک طویل ٹھنڈا سانس لیا۔ نو بج رہے تھے لیکن اس کی بھوک غائب تھی۔ اس نے کوٹ پہنا اور واپس پیدل عابد روڈ کی طرف چل کھڑا ہوا۔ اس کا ذہن تنہائی چاہ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ بیکار اور بے مقصد باتیں — اب اصغر کو یقین ہوگیا تھا کہ کنول نے عمداً اس کے خطوط کا جواب نہیں دیا تھا۔ شاید اس کے کلکتے سے آنے کے فوراً بعد وہ لوگ حیدرآباد منتقل ہوگئے تھے اور یہاں اس کی شادی ہوگئی تھی اور اس نے ایک سمجھدار دوراندیش لڑکی کی طرح مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ ماضی کو اپنے ذہن کے پردوں سے مٹا دیگی — لیکن اس میں ایسا کیا تھا جسے مٹانے کی ضرورت محسوس ہوئی؟ ایسا کون سی بات تھی جس کی وجہ سے کنول نے اپنے ایک عزیز دوست کو پہچاننے میں بھی تکلف سے کام لیا تھا؟

وہ انہیں خیالوں غرق پیدل عابد روڈ پہنچ گیا۔ آج کنول کی بے رخی سے اسے سخت تکلیف ہوئی تھی۔ دو سال سے اس کی بے چینی، اس کی جستجو اور پھر یہاں آنے کے بعد دن رات اس کی تلاش سب کچھ شاید حماقت تھی۔ وہ اس سے ملنے کے لئے اب بھی بے چین تھا لیکن کنول بڑے میٹر آف فیکٹ انداز میں نئی کار میں اپنے شوہر کے پہلو میں بیٹھی زمین سے گذر گئی تھی اور اسے ایک لمحے کے لئے یہ محسوس نہیں ہوا تھا کہ اس کی یہ بے رخی، اس کا یہ انجان لوگوں کا سا رویہ اصغر کو کتنا دکھ دیگا۔

ساڑھے نو میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے لیکن عابد روڈ کی تقریباً تمام دکانیں بند ہوگئی تھیں اور سڑک بڑی تیزی سے سنسان ہو رہی تھی صرف سامنے گرینڈ ہوٹل میں رونق تھی اور کچھ لوگ پیلس سنیما کے باہر فٹ پاتھ پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ پکچر شاید شروع ہوچکی تھی۔ ہال کے باہر کچھ زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ اصغر کھڑا سگریٹ پیتا رہا اور سوچتا رہا — زندگی کتنی بے رحم ہے؟ اسے انسانوں کو کچوکے لگا کر یقیناً لطف آتا ہوگا۔ اگر یہ سچ نہ ہوتا تو اس کے ذہن کا وہ خوبصورت تصور، وہ حسین ہیولہ یوں منٹوں میں مسمار نہ ہوجاتا۔

ڈاکٹر صفدر اپنی پرانی فورڈ میں وقت پر پہنچ گئے اور دونوں عنایت ساگر کی طرف روانہ ہوگئے۔ ڈاکٹر صفدر کچھ دیر فلم کی تعریفیں کرتے رہے پھر وہ خاموش ہوگئے اور خاموشی ہی میں راستہ طے ہونے لگا۔ اب وہ پرانے پل سے بہت آگے نکل آئے تھے۔

"آج میں نے اپنے ایک پرانے دوست کو کار میں جاتے ہوئے دیکھا۔ بدقسمتی سے میں کار کا نمبر نہیں دیکھ سکا۔ آپ کے پاس کوئی ذریعہ ایسا ہے کہ اسے ڈھونڈ نکالا جاسکے؟" اصغر نے یکایک پوچھا۔

"ہاں ہے کیوں نہیں۔ کچھ اتا پتہ بتاؤ — کار کون سی تھی؟"

"اسٹوڈی بیکر کا نیا ماڈل تھا۔ وہی جس کی دُم آگے بھی ہوتی ہے اور پیچھے بھی — فیروزی کا رنگ تھا۔ یا شاید نیلا ہی ہو۔ بجلی کی روشنی میں دیکھی تھی" اصغر نے جواب دیا۔

"نیلا تو میں نے نہیں دیکھا۔ لیکن فیروزی کئی گاڑیاں دیکھی ہیں۔ کیا نام ہے تمہارے دوست کا؟"

"پورا نام تو یاد نہیں رہا۔ بچپن میں اگرامرا اسکول میں ساتھ پڑھتا تھا۔ ہم ممتاز کہتے تھے اسے"

"ممتاز؟ — اچھا — ڈاکٹر ممتاز حسین ہی تھا۔ کہاں رہتے ہیں ڈاکٹر ممتاز؟"

"جامعہ عثمانیہ میں پڑھاتے ہیں۔ اڈیکمیٹ میں ہے بنگلہ — ابھی پچھلے ہی سال تو وہ یورپ سے آیا ہے۔ انگریز بیوی کے ساتھ۔"

"انگریز بیوی؟" اصغر نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں ہاں تمہیں بھی چاہیے تو ان سے ٹیلیفون کرلینا — کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ میں ہیں۔"

گفتگو ختم ہوگئی۔ لیکن اصغر کی الجھنوں میں اضافہ ہوگیا — اگر ڈاکٹر ممتاز کی انگریز بیوی تھی تو پھر کنول کا ممتاز سے کیا رشتہ تھا؟ اس الجھن نے اس کا رات بھر ساتھ نہیں چھوڑا۔ دوسرے دن دفتر میں اس کا دل بھی نہ لگا۔ گیارہ بجے تک دو چار ضروری کام نمٹانے کے بعد اس سے صبر نہ ہوسکا — تو ڈائرکٹری نکالی اور اس میں ڈاکٹر ممتاز حسین کا نمبر دیکھنے لگا۔ اتفاق سے اس کے گھر پر بھی فون تھا۔ اس نے نمبر نوٹ کرلیا اور ریسیور اٹھایا تو اس کا دل بری طرح سے دھڑکنے لگا۔ اس نے آہستہ سے نمبر ملایا۔

چند لمحے گھنٹی بجتی رہی۔ پھر کسی نے ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو" دوسری طرف سے نسوانی آواز آئی۔ اصغر نے اس سے پیشتر کنول کو کبھی ٹیلیفون پر نہیں سنا تھا۔ لیکن اس "ہیلو" کا انداز بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ کنول بولتی۔

"میں مسز کنول سری واستو سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اصغر کو خود اپنی آواز اجنبی لگی۔ دل تھا کہ بے تحاشا دھڑکے جا رہا تھا۔ دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی تو اصغر نے ہیلو۔ ہیلو کہا۔ اس پر جواب مل گیا۔

"رانگ نمبر — یہاں اس نام کی کوئی خاتون نہیں رہتیں۔"

کھٹ سے سلسلہ منقطع ہوگیا۔ اب کے اصغر کو یقین ہوگیا کہ وہ یقیناً کنول ہی تھی۔ چند لمحے وہ خاموش سرنگوں بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور بڑے اعتماد سے پھر وہی نمبر ملایا۔ گھنٹی بجی اور اب کے فوراً ریسیور اٹھالیا گیا۔ "ہیلو" وہی مانوس آواز آئی۔

"دیکھو کنول — میں اصغر بول رہا ہوں — میں تم سے صرف تھوڑی دیر کے لئے ملنا چاہتا ہوں۔ میں صرف چند دنوں کے لئے یہاں آیا ہوں۔ کیا میں تم سے ملنے گھر آسکتا ہوں؟" اصغر نے پوچھا۔ وہ تیزی سے بولتا گیا اور اپنے قیام کے بارے میں اس نے صریحاً جھوٹ بولا۔ دوسری طرف خاموشی رہی۔ چند لمحوں کے بعد دھیمی آواز آئی۔ "نہیں۔"

"نہیں؟ — اچھا تو پھر میں آج شام کو چائنا کیفے کے باہر تمہارا انتظار کروں گا — ڈریم لینڈ کے عین سامنے — سات بجے — خدا حافظ۔"

اصغر نے اس انکار کا موقع ہی نہیں دیا اور کھٹ سے ریسیور رکھ دیا۔

اس نے عمداً اسے سکندرآباد بلایا تھا۔ شہر کا یہ علاقہ نسبتاً پرسکون تھا۔ اور عموماً سات بجے سڑک بھی خاصی سنسان ہوجاتی۔ ریسیور رکھکر اصغر نے سر میز پر ٹکا دیا اور سوچا — میں نے آخر تمہیں ڈھونڈ ہی لیا کنول!!

❋

عزیز مرزا مرحوم

توصیفِ حُسن

یہ مضمون عہد ماضی کے مشہور ادیب عزیز مرزا کا ہے اب سے پینتالیس سال پہلا۔ قوت نقد
انتقاد اور جذبۂ انتقاد، قدرت کی ایک فطری ودیعت ہے، یہ ہر زمانہ میں رہی ہے اور ہر زمانے میں رہیگی
"بادۂ شبانہ" کے ان صفحات میں اس طرح کوئی نہ کوئی قدیم مضمون برابر شائع ہوگا۔ تاکہ ہر جدید
ایک مرتبہ قدیم کی طرف بھی مڑ کے دیکھ لے۔

حسن کی توصیف کے لیے دو طریقے اختیار کئے گئے ہیں جن میں ایک کو داخلی اور دوسرے کو خارجی کہا جا سکتا ہے۔ داخلی تو یہ ہے کہ اس خاص اثر کی توضیح کی جائے۔ جب قلب انسانی پر حسن کے سایہ افگن ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ اور خارجی یہ ہے کہ حسن کی توصیف یا توصیفات ذاتی و عرضی کی تصریح کی جائے یا یہ ہو کہ مثال کے ذریعہ سے اس کا تصور ذہن انسانی میں قائم کیا جائے اس لحاظ سے خارجی کی دو قسمیں ہوئیں۔ ایک تشریحی دوسری تشبیہی لیکن ان دونوں طریقوں سے بھی حسن کی حقیقت تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کسی شے کی صفات ذاتی کا دریافت کرنا نہایت ہی دقت طلب کام ہے اور ظاہر ہے کہ خود صفات عرضی کی تصریح تعریف کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ اور یہی کیفیت مثال کی بھی ہے۔ لیکن جو لطافت اور جادو طریقہ داخلی میں ہے۔ وہ خارجی میں نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے سے کوئی خاص پیکر خیالی پہلے سے تیار کر کے ذہن کے سامنے نہیں لائی جاتی۔ بلکہ صرف ایک خیال بطور ہیولیٰ کے ذہن میں پیدا کر دیا جاتا ہے اور اس کے خدوخال کے قائم کرنے میں قوت متخیلہ کو پوری آزادی رہتی ہے اور اس سے ہر شخص کو اس میں پورا لطف آتا ہے کیونکہ وہ اسمیں خود اپنی ہی مثالیہ کی جھلک دیکھتا ہے۔ برخلاف اس کے طریقہ خارجی میں ایک خاص پیکر خیالی ذہن انسانی کے سامنے لائی جاتی ہے۔ اور اس سے قوت متخیلہ کو گلکاری کے لئے اتنا کھلا میدان نہیں ملتا اور اسی وجہ سے اس طریقہ میں کمال یہی ہے کہ صراحت کی بہ نسبت کنایہ سے زیادہ کام لیا جائے تاکہ ہر شخص کے تخیل کو پورا موقع ملے کہ اپنے مذاق کے مطابق رنگ آمیزی کر کے اس پیکر کو اپنی مثالیہ کے مطابق بنا لے۔

اہل یونان نے جو کمال فنون لطیفہ میں پیدا کیا وہ محتاج تصریح نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کو ابتدا ہی میں توصیف حسن کے طریقۂ داخلی تک رسائی پیدا کرنے میں کامیابی ہوئی۔ چنانچہ ان کے سب سے قدیم اور سب سے پرانے شاعر ہومر نے ہیلین کی تصویر کھینچنے میں جس کے حسن عالم سوز نے تمام دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا اور یورپ اور ایشیا کو دس سال تک جنگ میں مصروف رکھا اسی طریقہ سے کام لیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:—

"کچھ تعجب نہیں کہ اس حسن خداداد کی بدولت دنیا نو سال کی طویل مدت سے جنگ و جدل میں مصروف ہے کیسے دلربا انداز ہیں اور کیسی بلا کی آن بان ہے؛ اگر چال ڈھال میں یکتا ہے۔ تو شکل و شمائل میں دیوی؛"

تمام ایلیڈ میں ہیلن کے حسن و زیبائی کی صرف اسی قدر توصیف ہے لیکن اب دیکھنا چاہیئے کہ اُن مختصر سیدھے سادے الفاظ میں کس بلا کا جادو بھرا ہوا ہے۔ گو ہومر نے اپنی طرف سے ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ لیکن کیا کوئی تعریف اس سے بڑھکر ہو سکتی ہے۔ کتنا بڑا کمال ہے کہ اس نے تصویر تو کجا ایک لکیر بھی نہیں کھینچی۔ لیکن پھر بھی رگ وجان پر کچھ ایسا نشتر لگایا ہے کہ ہر شخص گردن جھکا کے اپنے آئینہ دل میں ایک ایسی پیاری صورت موہنی مورت دیکھ رہا ہے کہ کسی طرح سر اٹھانے کو جی نہیں چاہتا۔ کیا غضب ہے کہ ہندی ہو یا چینی یونانی ہو یا مصری، جاپانی ہو یا حبشی سب کا دل یکساں بیقرار ہوا جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ کیا ہے، وجہ یہ ہے کہ ہر شخص خواہ کسی قوم اور کسی خیال کا ہو، تخیل میں خود اپنی مثالیہ کی تصویر دیکھ رہا ہے۔

یہ لطافت بیان یہ نازک خیالی یونانیوں ہی کا حصّہ تھی، اور کسی قوم کو نصیب نہیں ہوئی، اور اس لئے دوسری قوموں نے زیادہ تر طریقہ خارجی ہی کو اختیار کیا، اردو شاعری کا نشو و نما چونکہ اس زمانے میں ہوا جبکہ فارسی شاعری ابتدائے سادگی سے ہٹ کر گرداب تصنع میں مبتلا ہو گئی تھی اس لئے جو امور کہ کئی صدیوں کی تلاش اور طبع آزمائی کی بدولت فارسی شعرا میں حسن کے صفات ذاتی و عرضی قرار پا چکے تھے، وہی بجنسہ اردو شاعری میں بھی آگئے اور اسی وجہ سے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ مطابقت فطرت کی بجائے زیادہ تر مبالغہ سے بھرے ہوتے ہیں گویا کہ اُردو شعرا کو خواہ مخواہ توصیف حسن کے لحاظ سے طریقہ خارجی اور اس کی ادنیٰ قسم تشریحی کا پابند ہونا پڑا۔ اسی وجہ سے جب اُردو شعرا محبوب کا سراپا بیان کرتے ہیں تو وہ ماہرین فن تشریح کیطرح ایک ایک عضو پر نظر ڈالتے ہیں۔ اور چونکہ صفات حسن اور الفاظ بھی وہی استعمال کئے جاتے ہیں جو آخری طبقہ کے شعرائے فارسی سے میراث میں ملے ہیں اور اس لئے مبالغہ کی وجہ سے ہر عضو کا ایسا عجیب تصور ذہن میں قائم ہوتا ہے کہ اگر ان سب کو جوڑ کے ایک پیکر خیالی بنائی جائے تو وہ بجائے حسن و جمال میں ممتاز ہونے کے بوالعجبی میں شہرہ آفاق ہو گی۔ مثلاً ابتدا میں چھوٹا دہانہ، اور بڑی آنکھیں داخل حسن سمجھی گئیں اور ان کو تشبیہ بھی دی گئی تو سیپی یا ہرن سے، لیکن بعد میں آنکھیں تو بڑھتے بڑھتے بیل کی [illegible] بسلیقت لے گئیں، اور دہانہ گھٹتے گھٹتے صرف لفظ موہوم رہ گیا۔ غرضکہ گو یہ صحیح نہیں ہے کہ اُردو شاعری خلاف فطرت ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ تصنع اور مبالغہ کی بدولت حقیقت سے اس قدر دور جا پڑی ہے کہ بالکل بیجان سی معلوم ہوتی ہے اور اگر کچھ لطف کبھی دیا ہے تو وہ ایک ہی خیالات کے پیہم اعادے نے اور بھی کھو دیا۔

برخلاف اس کے اگر شعرائے سنسکرت کا کلام دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ گو ان کی بھی طریقہ داخلی کے اعلیٰ منازل تک رسائی نہ ہو سکی لیکن انھوں نے پھر بھی زیادہ تر خارجی کی دوسری قسم تشبیہی کو اختیار کیا۔ جس میں فطرت انسانی کے اعتبار سے دلربائی کی زیادہ صلاحیت تھی کیونکہ وہ طریقہ اصلی کیطرح ہستی فانی کو بھلا کر عالم مثال میں پہونچا سکتی ہے۔ مہا کوی کالیداس کو اس اعتبار سے بھی تمام شعرائے سنسکرت پر ترجیح ہے اور سچ یہ ہے کہ جہاں کہیں اس کو موقع ملا ہے۔ اس نے حسن و جمال کی ایسی جیتی جاگتی تصویریں کھینچی ہیں کہ بھلائے نہیں بھول سکتیں۔ اس کی تصانیف میں سب سے زیادہ مقبول شکنتلا ہے اور اس لئے ہم سب سے پہلے یہی دیکھتے ہیں کہ اس نے شکنتلا کی تصویر کس طرح کھینچی ہے۔ ایک مقام پر وہ اس کے عاشق دشمنت کی زبان سے کہتا ہے:-

> حقیقت میں اس کے لب شیریں نوخیز کونپل کی سرخی لئے ہوئے ہیں اس کے بازو دو نرم لچکدار ٹہنیوں سے مشابہ ہیں۔ اور جوش شباب غنچۂ ناشگفتہ کی لطافت کے ساتھ اس کے عضو عضو سے نمایاں ہے!!

ذرا تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر کے دیکھو کہ ایک ایک لفظ نے تخیل کے لئے کتنا وسیع میدان کھول دیا ہے اور میدان بھی

وہ جو نہایت پرلطف نظاروں سے بھرا ہوا ہے۔ یہ تو اس وقت کی تصویر ہے جبکہ وہ جنت نظر تھی۔ اب دیکھو کہ نقاب کالیداس نے کیا سحر آفرینی ہے۔ وشمنت اپنے محرم راز ودوشک سے کچھ باتیں عالم تنہائی میں کررہا ہے چلو ہم بھی سنیں۔۔۔

ودوشک :۔ حقیقت میں شکنتلا بہت ہی حسین ہوگی کہ آپ جیسے شخص کا دل آگیا۔

دشمنت :۔ یہ سچ تو یہ ہے مگر طول کلام سے فائدہ
معلوم نہیں کہ خالق نے اس کو بنانے سے پہلے ہی پردہ عالم کی تمام رعنائیوں کو جمع کرکے نقش کھینچ لیا تھا یا صرف دماغ ہی میں حسن کامل کا تصور قائم کیا تھا جب میں اس کو شکل کے سماں میں حسین نسوں کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمونوں سے بھی مختلف پاتا ہوں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ خالق نے اس کو پیدا کرکے صرف اپنی قدرت کاملہ کا ثبوت دیا ہے۔

ودوشک :۔ اگر یہی بات ہے تو پھر سب حسینوں کی مٹی خراب ہوئی۔

دشمنت :۔ کیا کہوں، اس کا بے عیب حسن ایک غنچہ ہے ناشگفتہ یا ایک نرم شاخ ہے۔ جو ابھی خراش ناخن سے آشنا نہیں ہوئی، یا ایک گوہر ناسفتہ ہے یا تازہ تازہ شہد ہے۔ جو ابھی لذت دہ کام و زبان نہیں ہوا یا بڑے سے بڑے کام کا واجبی صلہ ہے۔ نہیں معلوم کس کی قسمت میں اس سے سیراب ہونا لکھا ہے۔

شکنتلا تو آدم زاد تھی مگر اب دیکھو کہ اس نے اردسی کی جو آسمانی پری ہے کیسی دلربا تصویر کھینچی ہے۔ کچھ تعجب نہیں کہ تمام آسمانی پریاں جو نارائن کا تپاس توڑنے کے لئے آئی تھیں اردسی کو اس کی ران سے نکلتے دیکھ کر مارے شرم کے عرق عرق ہوگئیں مگر نہیں ایک تاریک الدنیا کو لوس کی تخلیق سے کیا مناسبت، ہاں یہ ممکن ہے کہ سہانی روشنی والے چاند نے اس کی تولید میں حصہ لیا ہو یا عشق کے دیوتا مدن نے جس کا اصلی کام جذبات نفسانی کو ابھارنا ہے اس کو پیدا کیا ہو یا خود بسنت نے اس کی شکل میں جنم لیا ہو کیونکہ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ ایک فرسودہ رشی جو اپنے ہوش و حواس وید خوانی کی نذر کر چکا ہو اور جس کے دل سے لذائذ دنیوی کا احساس تو کیا ان کی خواہش بھی جاتی ہو چکی ہو ایسی موہنی مورت بنائے۔

اگر اس دلفریب نظارہ سے دل سیر نہ ہوا ہو تو لو اور بھی سنو، کالیداس ایک دوسرے مقام پر اس کی زبان سے جو کرم آ کا ہیرو ہے لکھتا ہے:۔

اس کا جسم زیوروں کا زیور اور سنگھاروں کا سنگھار ہے عرف عام میں جو چیزیں معیار حسین سمجھی جاتی ہیں، مگر اس کی رعنائی سے الٹا انکی زیبائی کا اندازہ کیا جائے تو بجا ہے۔"

الفاظ تو معدودے چند ہیں اور وہ بھی بالکل سیدھے سادے لیکن معنی پر جتنا بھی غور کیا جائے گا۔ اتنا ہی لطف آئیگا۔ کالیداس نے انسان اور پری کی تصویر تو جیسے پرکار قلم سے کھینچی ہے۔ وہ ظاہر ہے لیکن اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس نے دیوی پاربتی کے حسن عالم افروز کا جلوہ کس شان سے دکھایا ہے۔ وہ اپنی بے نظیر مثنوی کمار سنبھو میں لکھتا ہے:۔

ابھرتی جوانی اس کے اعضا کی تناسب بالیدگی کا باعث ہوئی جس کی وجہ سے وہ حسن مجسم بن گئی۔

جس طرح کہ کسی تصویر کو از سر نو رنگ و روغن چڑھا کر جلا دی گئی ہو، دم رفتار پاؤں کے اٹھتے ہوئے۔ انگوٹھوں اور انگلیوں کے ناخنوں سے سرخی ٹپکے پڑنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا گل لالہ چل رہے ہیں، راج ہنس نے لوکھڑا لوکھڑا کے چلنا سکھایا تھا تاکہ بعد میں خود بھی اس سے سبق لے اور اس کے چھلوں کی دلکش جھنکار سامعہ نوازی کرے، اس کی کمر کے تصور کے لئے یہ سمجھو کہ ایک ویدی پہ تین نور کی شعاعیں جمع ہیں، اور جس مرکز پہ وہ ملتی ہیں وہی اس کی کمر ہے۔ یہ نتیجہ میں نے اس وجہ سے نکالا ہے کہ اس کے دونوں ہاتھ جو ہار سنگھار کے پھولوں سے بھی نازک تھے کام دیو کے غلبہ سے جس کے نشان گھر کر ماہی تماہے۔ ہر کی گردن میں لپٹنے کے لئے رسیوں کی طرح لٹک رہے تھے، حسن اور خوش قسمتی کی دیوی جب چاند پر پہنچتی ہے تو کنول کے دلربا نظارہ سے محروم ہو جاتی ہے اور جب کنول پر توجہ کرتی ہے تو چاند کے نور سے سیراب نہیں ہو سکتی، لیکن جب وہ پاربتی کے چہرے پر پہنچتی تو اس کو ایک ساتھ چاند اور کنول دونوں کا نظارہ نصیب ہوا۔ اگر یہ ممکن نہ ہوتا کہ کوئی پھول نو خیز کونپل میں چھپا رہ جائے یا موتی کسی شفاف مونگے میں جاگزیں ہو تو اس کے دلربا تبسم سے، جس کا حسن لب شیریں کی سرخی نے اور بھی دوبالا کر دیا تھا تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ اس کی شریلی آواز جس سے امرت ٹپکتا ہے کچھ ایسی دلکش تھی کہ اس کے مقابلہ میں خوش گلو کوئل کے (جو اجنبی پرندوں میں پرورش پاتی ہو) نغمے میں بھی دلخراش اور کسی ساز کی بے سری گت معلوم ہوتے تھے۔ متلون نظر جو بیقراری میں اس نیلے کنول سے جو تیز ہواؤں کے تھپیڑے کھا رہا ہو کم نہ تھی، یا تو اس بڑی آنکھوں والی ہرنی سے ملتی تھی یا خود ہرنی نے اس سے اڑائی تھی، اس کی بھنوؤں کشیدہ ابروؤں کی (جو قلم اور سیاہی سے کھینچی ہوئی معلوم ہوتی تھیں) دلربائی اور لچک دیکھ کر کام دیو کے سر سے اپنی نوکیلی کمان کے حسن کا سودا نکل گیا۔ اگر ذی عقل حیوانوں میں ندامت سے متاثر ہونے کا مادہ ہوتا تو بلاشبہ سُرا گائے پربت کی بیٹی کے جوڑے کی پھبن دیکھ کر اپنے بالوں کا غرہ بھول جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو چیزیں عرف عام میں معیار حسن سمجھی جاتی ہیں ان کو گویا خالق کون و مکان نے اس غرض سے جمع کر دیا ہے کہ دنیا بھر کی حسن و زیبائی کو اکٹھا دیکھئے۔"

اب ذرا تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر کر سوچنا چاہئے کہ جس حسن دلفریب کی تصویر کالیداس نے ان الفاظ میں کھینچی ہے۔ اس کو اس عالم سے کچھ بھی مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ تخیل کے پر پرواز کھول دو اور جتنا اونچا اڑا جا سکے اڑو مگر پھر بھی رسائی مشکل ہے۔

اگر اس امر پہ غور کیا جائے کہ کالیداس نے انسان اور پری اور دیوی کے حسن کی توصیف کس کس طریقے سے کی ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ گو اپنے طور پر اور اپنے اپنے طبقے کے اعتبار سے ہر ایک بے نظیر ہے لیکن اگر ایک کا مقابلہ دوسرے سے کیا جائے تو ایک قسم کا خوشگوار اختلاف محسوس ہوتا ہے۔ اور در اصل یہی اس کا کمال ہے کیونکہ کس قدر مشکل امر ہے کہ باوجودیکہ ہر ایک کو بطور خود منتہائے حسن پر پہنچا دیا ہے۔ لیکن پھر بھی عورت عورت ہی معلوم ہوتی ہے۔ اور پری پری ہی اور دیوی دیوی ہی۔ اس کا دوسرا کمال یہ ہے کہ اس نے اجمال سے کام لیا ہے۔ خواہ تفصیل سے، خواہ تشریح سے خواہ تشبیہ سے، لیکن میں جو کچھ بھی حوالہ قلم کیا ہے۔ اس سے بہت زیادہ ناظرین کے تخیل کے لئے چھوڑا ہے۔ اور اس لئے بعینہٖ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

گویا کسی نے حسن مجسم کی تصویر عالم مثال سے لاکر عالم شہود میں رکھ دی ہے، یا یوں کہو کہ ہر شخص کو اس میں اپنی ہی کاشئیہ ذہنی یا مثالیہ حسن کا جلوہ نظر آتا ہے۔

اب اگر توصیف حسن کے لحاظ سے اردو شاعری کا مقابلہ سنسکرت شاعری سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شعرائے سنسکرت کی فکر بلند پروازنے تو ان کو اس عالم فانی سے عالم جاودانی میں پہونچا دیا۔ مگر اردو شاعری کو تقلید کی زنجیروں نے ایسا جکڑا کہ وہ باغ فطرت کی سیر سے بھی محروم ہے اور عمر بھر بکار کی طرح گردو پیش ہوتے رہے۔ کوئی واسوخت اور مثنوی ایسی نہیں ہے جس میں محبوب کا سراپا شاعر نے اپنے تر دیک نہایت زوردار اور بولتے ہوئے الفاظ میں نہ دکھایا ہو اور گو اس میں شک نہیں کہ بعض صورتوں میں باوجود اتنے قیود کے پابند ہونے کے طبع خداداد کچھ نہ کچھ رنگ دکھا کر رہی ہے اور دائرہ کی تنگی مضمون آفرینی کی بھی مانع نہیں ہو سکتی ہے۔ لیکن کیا کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ کسی اردو شاعر نے عالم مثال کی سیر ایسی بے تکلفی سے کی ہے جیسی کہ کالیداس نے یا بھاو بھوتی نے کی یا یہ کہ اس کے کلام میں حسن نسواں کی ایسی خوش رنگ تصویریں موجود ہیں جیسی کہ ان دونوں کے ڈراموں میں ہیں۔ اس کی ایک وجہ اور ہمارے خیال میں بڑی وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے شعراء نے کبھی حسن فطرت کے نظارہ میں اپنی بینائی سے کام نہیں لیا بلکہ جب دیکھا وہ رنگین عینک لگا کر دیکھا جو آخری طبقہ کے شعرائے فارسی کے دست صنعت کا نتیجہ تھی اور اسی لئے پھر بھارکے وہ انھیں کے خیالات اور انھیں کے الفاظ کا اعادہ کرتے ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ جب سراپا بیان کرنے بیٹھتے ہیں تو تفصیل کے انبار لگا دیتے ہیں اور جو باتیں اشارہ اور کنایہ سے چشم تصور کے سامنے لانے کے قابل تھیں ان میں بھی ایسی تصریح کرتے ہیں کہ تخیلہ کو پرمارنے کی بھی گنجائش نہیں رہتی۔ انھیں وجوہ سے حسن کی جو تصویر ہمارے شعراء نے کھینچی ہے وہ نہ تو کسی نمونہ فطرت ہی سے ملتی ہوئی ہے اور نہ ہمارے مثالیہ ہی سے مطابقت رکھتی ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے اٹھا کر لائی گئی ہے۔ فارسی شاعروں میں بھی قدما کے کلام میں بیشک وہ جادو موجود ہے جو شعرائے سنسکرت کے تیر اندازی کو اعلیٰ درجہ پر پہونچایا، اسی طرح اردو کے قدیم شاعر میر اور طبقہ اخیر کے بعض دہلی اور لکھنؤ کے ممتاز شاعروں میں بھی بے تکلفی جذبہ کا رنگ ایک حد تک پایا جاتا ہے اور یہ بھی تھوڑی دیر کے لئے دنیا و مافیہا کے بھلا دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ کیفیت بجلی کی طرح دیرپا نہیں ہوتی۔ کچھ لحظہ کے لئے بے شک اجالا ہو جاتا ہے۔ مگر پھر پہلے سے بھی بھیانک اندھیرا چھا جاتا ہے۔

فنی ارتقاء

ادیب اور فنکار اپنا کوئی شاہکار تیار کرکے یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ بس یہی حرف آخر ہے کیونکہ ارتقاء کے ہنگامے میں حرف آخر کوئی چیز ہی نہیں۔ تخریب اور تعمیر کے عمل سے ہر لحظہ ایک نئی صورت پیدا ہوتی ہے اور زمانہ کے پیہم تغیرات سے ادب و فن کی قدریں بھی ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ مگر جس طرح انسانوں کی زندگی کا ارتقاء پستی سے بلند اور بلند تر کی طرف ہے اسی طرح ادب اور آرٹ کی قدروں کا ارتقاء بھی جاری رہتا ہے۔

قاضی عبدالغفار مرحوم

مصطفیٰ زیدی

آسودگی

کرن سے دور، چراغوں کی شاہراہ سے دور
اداس ہونٹوں پہ جلتے سلگتے سینے سے
تمہارا نام کبھی اس طرح اُبھرتا ہے
فضا میں جیسے فرشتوں کے نرم پر کھل جائیں
دلوں سے جیسے پرانی کدورتیں دُھل جائیں
تمہارے نام میں صبحوں کی آہٹوں کا خرام
کسی کنول کو اشارہ، کسی کلی کو پیام
تمہارے نام کی یادوں سے کاروانوں میں
چمکتی جاگتی چاندی کی گھنٹیوں کی کھنک
کچھ آنسوؤں کی گھلاوٹ کچھ آرزو کی کسک

یہ بولتی ہوئی شب، یہ مہیب سناٹا
کہ جیسے تند گناہوں کے سینکڑوں عفریت
بس ایک رات کو دنیا کے حکمراں ہوجائیں
اجل کے غار سے نکلی ہوئی گراں روحیں

لہو سے پیاس بجھا کر کہیں مزاروں میں
نشے کے بوجھ سے چیخیں تو چیختی رہ جائیں

اسی جنوں میں، اسی آندھیوں کے میلے میں
تمہارا نام کہیں دور جگمگاتا ہے
سفید دودھ سے شفاف عکس سے نازک
اداس روح کی لہروں پہ نرم دیپ جلائے

دھوئیں کے گھر میں رہ کر حیات کیا کٹتی
یہ ایک دیپ نہ ہوتا تو رات کیا کٹتی
یہ ایک نام نہ ہوتا تو اس اندھیرے میں
جہاں سحر کا پتہ ہے نہ زندگی کا سراغ
نہ جانے کتنے عقیدے نہ جانے کتنے خیال
یونہی پکارتے تھوڑی سی روشنی کے لئے

میں سوچتا ہوں کہ تاریکیوں کے طوفاں میں
وہ کتنے لوگ ہیں جن کے نصیب ساحل ہیں
مرے سفر کو چراغوں کے نور کی کیا فکر
مرے سفر کو خود آگاہیاں تو حاصل ہیں
تمہارے پیار کی جلتی ہوئی تڑپ نہ سہی
تمہارے نام کی ہمدردیاں تو شامل ہیں

سید فیضی

"چاند نگر"[1] پڑھنے کے بعد

چاند نگر کا ایک پیامی

تاروں کی بارات سجائے دھرتی کے آنگن میں آیا

دُکھیاروں کا درد بٹایا کرنوں کا پیغام سُنایا

گلشن گلشن کلیاں چٹکیں صحرا صحرا ذرّے جاگے

سانجھ سمے کے سائے سمٹے بیری گھور اندھیرے بھاگے

لیکن اس ویران فضا میں

چاند کا چہرہ روگی روگی زرد ہے اب تک

رات پشیماں حیراں حیراں

پلکوں کی ہر نوک پہ اس کے بوجھل بوجھل درد ہے اب تک

دُنیا والے دیکھ رہے تھے

دیدۂ و دل نے اس دھرتی پر کتنے سُندر دیپ جلائے

کیسے ارماں کون امیدیں

تارِ رگِ جاں کی لرزش پر نغمے بن بن کر اُبھری ہیں

کیسی کیسی یادیں تھیں جو ذہن سے لہرا کر گزری ہیں

---

[1] چاند نگر ابن انشا کا مجموعہ کلام

دجلہ کی عظمت کا عنواں
عہدِ خلافت تھا کہ شبستاں
رنگ و نور کے افسانوں کا
آج بھی اس بغداد کی راتوں میں آئینے بکھرے ہوئے ہیں
دَورِ غلامی کے اشکوں سے زنگی چہرے نکھرے ہوئے ہیں
میں نے سُنا تھا افسانہ اک اُجلے دنوں کی زیبائی کا
میڈونا ہوٹل میں دیکھا رنگ نرالا شنگھائی کا
اے چینی افیونی تیرے زرد وطن کے راج دلارے
صدیوں سے برباد رہے ہیں ننگے بھوکے کال کے مارے
اب جیتے جگ جگ کے ہارے

بکھری بکھری سی زلفیں ہیں
بہکی بہکی سی نظریں ہیں
ایک خلش ہے ایک الم ہے
دل کی باتیں کون چھپائے اس دل کی دُنیا محرم ہے
چاند بھی تو افسانۂ غم ہے
پیت کرے تو دُنیا جانے اس میں کیا کچھ ہوتا ہوگا
پاگل من کیوں شام سویرے ہنستا ہوگا روتا ہوگا

پچھلے پہر کے سناٹے میں ایسی راتیں بھی گزری ہیں

جب کاتک کے چاند نے مجھ کو حیرانی کا عالم دے کر
چھینی صبر و سکوں کی دُنیا
ڈھلتی رات
صبا کا جھونکا
دبی دبی فریاد بنا ہے، ایک نئی اُفتاد بنا ہے

اوجِ تمدّن کے زینوں پر چڑھنے والے چڑھتے جائیں
جنگ کے رسیا موت کے پرچم لے کر آگے بڑھتے جائیں
کب تک یہ سب اور رہے گا
آگ، تباہی، بھوک، مصیبت، بیکاری کا دَور رہے گا
چاند نگر کے دیوانے کو
تم ہی بچا لو
اے متوالو فاقوں والو
اس دھرتی پر خون بہا ہے اس دھرتی پر خون بہے گا

ماضی کے موہوم دُھندلکوں میں اُکتا کر کیا جھانک رہے ہو
اپنے حال میں مست رہو تم
کیا غمِ جاناں کیا غمِ دوراں
جاگ اُٹھے گا آپ ہی انساں
مانا تم نے عشق کیا ہے، دل کو سنبھالو، پچھتاؤ گے
کب تک جی کو روگ لگا کر اس دُنیا کے مُنہ آؤ گے
اس دُنیا کے مُنہ آؤ گے

حسن مثنیٰ ندوی

ریختی

ریختہ اور ریختی دونوں کے معنی ایک ہیں اور فرق صرف اتنا ہی ہے جتنا شاعرے اور شاعری میں ہے، ریختہ فارسی کا لفظ ہے، فارسی میں اس معنے "موزوں" کے تھے جیسے

چوں شمع شغف ریختہ این کارم

پھر "کلام مخلوط بدو زبان" کے معنوں میں مستعمل ہوا. اس کا نمونہ امیر خسرو کی وہ غزل ہے جس کا شعر ہے ؎

چہ شمع سوزاں، چوں ذرہ حیراں، ز مہر آں مہہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں، نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

صاحب جلوۂ خضر حضرت صفیر بلگرامی لکھتے ہیں کہ ریختہ کے معنے "پختہ" کے ہیں، لہٰذا پختگی کے لحاظ سے اردو زبان کو ریختہ کہا گیا۔ پھر وہ دور یہ لفظ "عام شعر و سخن یا کلام منظوم" کے لئے رائج ہوگیا ؎

طرز بیدلؔ میں ریختہ کہنا　　　اسد اللہ خاں قیامت ہے

یا ؎

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ　　　کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

برعظیم ہند میں مسلمانوں کی آمد سے عربی، ترکی، فارسی اور دوسری مقامی زبانوں کے اختلاط نے جو نئی زبان پیدا کی وہ اپنے تسمیے کے مختلف مراحل گذر کر "اردو" یا "زبان اردو" کہلائی اور اب اس کا یہی نام ہے ؎

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ　　　ہندوستاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے

تاریخ السنہ اور اس کی فہرست میں آخری زبان یہی ہے، ساری زبانوں میں سب سے کم عمر مگر جب جمعیۃ اقوام (لیگ آف نیشنز) جب قائم ہوئی تو ایک بین الاقوامی زبان وضع کرنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا تھا حتیٰ کہ اس کا نام بھی پہلے ہی تجویز کر دیا گیا تھا یعنی اسپرانٹو (Esperanto)، یہ اسپرانٹو وجود میں نہ آسکی۔ اس لئے قرینہ یہی ہے کہ "اردو زبان" زبانوں کی ترتیب پیدائش کے لحاظ سے "خاتم الالسنہ" ثابت ہوگی۔

اس زبان کے وجود میں آنے کی جھلک غالباً سب سے پہلے حکیم سنائی غزنوی کے قصیدے میں نظر آتی تھی اس قصیدے کا ایک شعر ہے ؎

اسامی دین عالم است از نہ حاشا　　　چہ آب و چہ نان و چہ میدہ چہ پانی

اس کے بعد شیخ فرید الدین گنج شکر کے یہ اشعار ہمارے سامنے آتے ہیں ؎

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے | خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا | خُسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے

حکیم سنائی کا زمانہ ۴۶۴ھ تا ۵۴۵ھ ہے اور شیخ فریدالدین گنج شکر کا زمانہ ۶۶۴ھ ، حکیم سنائی کے یہاں مفرد الفاظ ہیں اور حضرت گنج شکر کے یہاں اسم کے ساتھ فعل بھی بلکہ پورا جملہ ۔ لہٰذا اسی سو سوا سو سال کے عرصے میں ، جو ان دونوں صوفی بزرگوں کے درمیان حائل ہے اس زبان نے اپنی صورت پذیری کے لئے زمین ہموار کی ۔ ان کے بعد حضرت امیر خسرو (۷۲۵ھ) آتے ہیں ، اور ان کے کلام میں یہ زبان ترقی یافتہ نظر آتی ہے ۔ ان کی غزل کے مصرعے نہ صرف یہ کہ سالم اور مکمل ہیں بلکہ نہایت ہی لطیف و بلیغ بھی ہیں جیسے

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

نہ نیند نیناں ، نہ انگ چیناں ، نہ آپ آویں ، نہ بھیجیں پتیاں

لیکن ریختہ " مخلوط بدو زبان " کم ہی لوگوں نے کہا ، مثلاً ولی اورنگ آبادی کے ہمعصر سعدی دکنی کی ایک غزل بھی اس قسم کے ریختہ کی ہمیں ملتی ہے ؎

قشقہ چو دیدم برخش گفتم کہ یہ کیا ریت ہے | گفتا کہ ڈر ہو باورے اس شہر کی یہ ریت ہے
ہمنا تمن کو دل دیا ، تم دل لیا اور دکھ دیا | ہم یہ کیا ، تم وہ کیا ، ایسی بھلی یہ پیت ہے

امیر خسرو اور سعدی دکنی کے درمیانی عہد میں اس زبان نے اپنی ایک شکل عزور متعین کر لی تھی ، خود امیر خسرو کی پہیلیوں کی زبان بہت صاف ہے ؎

ترور سے اک تریا اتری اس نے بہت رجھایا | باپ کا اس کے نام جو پوچھا آدھا نام بتایا
آدھا نام پتا پر پیارا ، بوجھ پہیلی موری | امیر خسرو یوں کہیں بوجھ پہیلی موری

یا ؎

بیسیوں کا سر کاٹ لیا | نا مارا نا خون کیا

سعدی دکنی کا دوسرا شعر بھی " مخلوط بدو زبان " نہیں ہے بلکہ امیر خسرو کی پہیلیوں والی زبان کی طرح یہ بھی سالم زبان کا نمونہ ہے ۔ اور غالباً یہی سبب تھا کہ ریختہ کے معنے " مخلوط بدو زبان " کی بجائے " عام شعر و سخن یا کلام منظوم " رائج ہو گئے ۔

امیر خسرو کے ریختے میں آپ دیکھیں گے کہ اظہار عشق عورت کی طرف سے ہے ، یعنی عورت عاشق ہے اور مرد معشوق ۔ " سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں " عورت ہی کی زبان ہے اور عورت ہی کے جذبات بھی ۔ برعظیم ہند کی ہندی شاعری میں عاشق عورت ہوتی تھی اور معشوق مرد ہوا کرتا تھا ۔ لیکن اردو شعراء نے اس کی تقلید نہیں کی ۔ سعدی دکنی کی غزل میں اظہار عشق عورت کی طرف سے نہیں بلکہ مرد کی طرف سے ہے ، " گفتا کہ ڈر ہو باورے اس شہر کی یہ ریت ہے " معشوق ہی کا قول ہے یعنی عورت کا ؛ اردو شعراء میں ہاشم دکنی کا تذکرہ لکھتے ہوئے لچھمی نرائن شفیق نے اپنی کتاب چمنستان شعراء میں لکھا ہے کہ " ہاشم اپنے اشعار میں بموجب ضابطہ ہندی اظہار عشق عورت کی طرف سے دکھاتے ہیں " اصول مسلمہ کے طور پر یہ بات گویا طے پا چکی تھی کہ اظہار عشق عورت کی طرف سے نہیں ہوگا ۔ اور ہاشم نے اس کے خلاف رستہ اختیار کیا تھا جبھی تذکرہ نگار نے خصوصیت کے ساتھ اس کی وضاحت ضروری سمجھی کہ " ہاشم اظہار عشق عورت کی طرف سے دکھاتے ہیں بموجب ضابطہ ہندی " ——— (یعنی برخلاف ضابطۂ فارسی وریختہ) وجہی کی غزلیں اور ولی کی غزلیں بھی کچھ ایسی ملتی ہیں ۔

دلی میں اس قسم کی شعر گوئی جس میں اظہار عشق عورت کی طرف سے ہو اور مرد معشوق قرار پائے، مرزا سعادت یار خاں رنگین دہلوی اور سید انشاء اللہ خاں انشاء مرشد آبادی نے کی ہے، مگر یہ لوگ بھی چونکہ اصول مسلمہ کے طور پر یہی مانتے تھے کہ اردو شعر گوئی میں اظہار عشق عورت کی طرف سے نہیں ہوتا۔ لہٰذا انھوں نے "شعر گوئی بموجب ضابطۂ ہندی" کو ایک علیحدہ اور خصوصی صنف قرار دے کر اس کا نام "ریختی" تجویز کیا، ریختی کی زبان دتی کی بیگماتی زبان ہے۔ اس طرح گویا اردو شاعری کی دو قسمیں ہو گئیں، ریختہ مردوں کی غزل، اور ریختی عورتوں کی غـــزل،

ریختی کے موجد سعادت یار خاں رنگین بتائے جاتے ہیں اور خود ان کا دعوےٰ بھی یہی ہے کہ ؎

ریختی کہنی اجی رنگیں کا یہ ایجاد ہے　　منہ چڑھاتا ہے مُوا انشا، جیا کس واسطے

حالانکہ ریختی اگر یہی ہے کہ عورت کی زبان سے اظہار عشق ہو تو پھر ہاشم دکنی کے بارے میں آپ ابھی پڑھ چکے ہیں، جو رنگین سے بہت پہلے گذرا ہے، البتہ یہ واقعہ ہے کہ رنگین کا پورا دیوان مرتب شدہ ہمارے سامنے ہے اور ہاشم کا دیوان ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا، انشا اصل میں ریختہ گو تھے اور اساتذۂ سخن میں ان کا شمار ہے، وہ نہایت ہی ذہین، صاحب علم، اور قادر الکلام شاعر تھے، شاعری کی کوئی صنف ایسی نہیں ہے جس پر طبع آزمائی انہوں نے نہ کی ہو، رنگین ان کے ہم عصر تھے، اس لئے اس صنف کو بھی انھوں نے خالی نہ جانے دیا بلکہ رنگین کے دیوان کی برابر ایک دیوان ریختی میں بھی مرتب کر کے رکھ دیا جس شاعرہ کا یہ شعر ہے کہ ؎

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی　　تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

یا ؎　آج ہے دھوم اسیران قفس میں کچھ اور　　جا کے دیکھو تو کوئی تازہ گرفتار نہ ہو

اس نے ایسے اشعار یقیناً تفریح طبع کی خاطر ہی کہے ہیں کہ ؎

چبھتی ہے یہ تو نگوڑی مجھے بھاری انگیا　　کوئی سادی سی مرے واسطے لا ری انگیا،

گیند اک میں نے جو پھینکی تو جھجک کر اُن نے　　کچھ عجب ڈول سے کل اپنی سنواری انگیا

مگر رنگین کے لئے ریختی تفریح نہیں بلکہ سرمایۂ حیات تھی، رنگین اور انشا کے علاوہ لکھنؤ میں جان صاحب نے بھی "ریختی گو" کی حیثیت سے کافی شہرت و مقبولیت حاصل کی اور انھوں نے بھی ایک اچھا خاصا دیوان چھوڑا ہے۔ ان شعراء کے علاوہ اور کوئی ریختی گو شاعر منظر عام پر صاحب دیوان کی حیثیت سے نہیں آیا۔

عرب کی شاعری میں عاشق مرد ہوتا تھا، اور معشوق عورت، ہندی شاعری میں عاشق عورت ہوتی تھی اور معشوق مرد۔ جہانتک حیاتیاتی جبلت کا تعلق ہے، چاہے مرد عورت سے محبت کرے چاہے عورت، مرد سے محبت کرے، مطلب ایک ہی ہے۔ اور ایک دوسرے کی کشش دونوں ہی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ بات صرف اتنی رہ جاتی ہے کہ اس جذبے کا اظہار اور اقدام کس کی طرف سے ہو، فطرت کا تجزیہ اور مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ آغاز سے انجام تک مرد طبعاً فعلی کیفیات کا حامل ہے، اور عورت طبعاً انفعالی کیفیات کی۔ اس لئے اظہار عشق کا وظیفہ بھی دراصل مرد ہی کی جبلت ہے، ہندی شاعری میں عورت کی طرف سے اظہار عشق یعنی فعلیت (　　　) غالباً "مٹریارکی" (Matriarchy) کے اثرات کی یادگار ہے۔

ایران نے شاعری شروع کی تو ابتداءً عربوں ہی کے نقش قدم پر چلا تھا اور شعرائے فارس عربی شاعری کو سامنے رکھ کر شعر کہتے تھے جیسے ؎

ہست ایں دیار یار گر شاید فرود آرم جمل
پرسم رُباب و دعد را حال از رسوم و از طلل

رباب اور دعد عربی عورتوں کے نام ہیں اور اسی طرح قصیدے میں درج ہیں جس طرح امرؤ القیس کے ہاں تسل والی "ام الرباب"

اور دارۃ، بلبل ماں ، عنیزہ ، کے تذکرے ہیں ۔ منوچہری بڑے فخر سے کہتا ہے کہ

من بسے دیوان شعر تازیاں دارم ز بر
تو ندانی خواند الا ھبی بصحنک فاصبحین

یعنی عربوں کے اشعار ہی نہیں دیوان کے دیوان میری نوک زبان پر ہیں، تم تو شاید ڈھکانے سے یہ مصرع بھی نہ پڑھ سکو کہ اَلاَ ھُبّی بصحنکِ فاصبحینا۔ (یہ مصرعہ ایام جاہلیت کے نوجوان اور مقبول و معروف شاعر عمرو بن کلثوم کے قصیدے کا پہلا مصرعہ ہے جس کے معنے ہیں " اٹھ بربط و صراحی و مینا لئے ہوئے ")

لیکن غزل کی ابتدا اور ترقی کی تاریخ مرہون منت ہے تصوف کی ، تصوف کا پُرشور آغاز تیسری صدی میں ہو چکا تھا اور پانچویں صدی اس کا عہد شباب ہے ، اس کے علاوہ ایران چونکہ عرصہ دراز تک جنگی مرکز رہا تھا ، اور جنگی جذبات کا بڑا زور شور تھا ، اس لئے دو چیزیں وہاں کی شاعری میں شدت کے ساتھ داخل ہوئیں ، ایک تو تصوف کا پیدا کردہ فلسفۂ کائنات اور فلسفۂ حیات (جس کی بدولت عشق "عشق حقیقی" ہو گیا تھا اور حسن "حسن مطلق" ، جو تذکیر و تانیث کے تعینات سے ماورا تھا) دوسرے فوجی اصطلاحات کیونکہ فوج ان کی محبوب ترین شے تھی ، عورت مرد دونوں آغوش رزم کے پروردہ تھے ، اور دونوں میں جنگ جویانہ بہادرانہ اور دلیرانہ شان پسندیدہ تھی ، پھر یہ بھی ہے کہ کانوں میں آویزے ، گلے میں طوق ، اور ہاتھوں میں کنگن مرد بھی اسی طرح پہنتے تھے جس طرح عورتیں پہنتی تھیں ، شاہنامے میں اس کا تذکرہ موجود ہے ۔

تصوف نے فکر و خیال کو وسعت پرواز ہی صرف نہیں بخشی بلکہ فارسی زبان کے عام الفاظ و محاورات کے مفہوم و معنے بھی یکسر بدل کے رکھ دیئے ، فراق وصال ، انتظار ، جام و مینا ، شاہد و ساقی ، میکدہ و خرابات ، وغیرہ الفاظ تو سب وہی برقرار رہے لیکن مفہوم کچھ سے کچھ ہو گیا ۔ اب تصوف ہی گویا ٹکسال تھا اور ہر طرف اسی کی وضع کردہ اصطلاحیں رائج تھیں ، تصوف کے فلسفۂ و افکار عام طور سے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے ۔ ان حالات میں اگر کسی شاعر نے اپنے محبوب کو مجسم کر کے دیکھنا چاہا تو جنگی جذبات اور ان کے اثرات نے اسے سپاہیانہ وضع میں پیش کیا ۔ عربی اور اردو زبانوں میں جس طرح تذکیر و تانیث کا فرق و امتیاز قدم قدم پر نمایاں ملتا ہے فارسی زبان میں نہیں ملتا ۔ ورنہ حسن ان کے نزدیک ان قیود سے بہت بلند تھا ، اور فارسی شاعری کے دامن میں زندگی کی تمام تر پہنائیاں سمٹ کر آگئی تھیں ، ظاہر ہے کہ اس لحاظ سے عربی کا سرمایۂ شعر اور ہندی کا سرمایۂ شعر سادگی اپنے اندر جتنی بھی رکھتا ہو ، وہ ہمہ گیری اپنے اندر نہیں رکھتا تھا جو فارسی شاعری کے اندر پیدا ہو گئی تھی ، اس کا اثر یہ ہوا کہ اردو جس کے اولین شعراء ، خود فارسی کے بھی اچھے شاعر تھے اور عربی یا ہندی سے بھی بے خبر نہیں تھے ۔ عربی یا ہندی کی تقلید نہیں کی بلکہ فارسی کی تقلید کی ، امتداد زمانہ کے ہاتھوں ، تصوف سے اس کے فلسفے سے اور اصطلاحوں سے بیگانگی بڑھتی گئی اور سخنوروں اور سخن فہموں کے ذہن و فکر میں انتشار پھیلا جنھوں نے حسن تمیز سے کام نہیں لیا اور ان کے خیالات بھٹکنے لگے ، تاآنکہ بعض پست خیالوں کو امرد پرستی تک اپنی طرف بہا لے گئی اور "ریختی" جب بحیثیت صنف وجود میں آئی تو اس پر بھی اسی قسم کا اثر پڑا ۔ حالانکہ اگر آپ دیکھیں تو امیر خسرو کا "ریختہ" جس کے چند مصرعے اوپر درج کئے گئے ہیں ، دراصل "ریختی" ہی تھا ، یعنی اس میں بھی اظہار عشق عورت ہی کی طرف سے ہے ، مگر ان آلائشوں سے یکسر پاک ہے ، جو رنگین اور انشا کے دور میں نظر آتی ہیں ، وجہ صاف ظاہر ہے کہ امیر خسرو صوفی تھے اور تصوف کے فلسفے زندہ تھے اور رنگین و انشا صوفی نہ تھے ، نہ تصوف کے فلسفے زندہ تھے ، امیر خسرو کی طبیعت میں شوخی اور رنگینی کی بڑی بہتات ہے اور ان کی مکرنیوں ، پہیلیوں اور دوسخنوں وغیرہ میں بعض فقرے تو "بیباکیوں" کی حدود تک کو توڑ دینے پر آمادہ نظر آتے ہیں ، مگر پستی کا شائبہ تک نہیں ہونے پایا ، رنگین و انشا کی طبیعتوں میں شوخی و رنگینی کی وہ بہتات بھی نظر نہیں آتی ، لیکن ماحول یقیناً پست تھا ، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شوخی بھی شوخی نہ رہی ، رنگینی کی رنگینی برقرار رہی ، دوگانہ ، زناخی ، اناچی ، گوئیاں وغیرہ اصطلاحیں ایسی وضع کی گئیں جو سکھیوں سہیلیوں سے الگ ، ان معنوں میں مستعمل ہیں جن میں جنسی جذبات کار فرما ہوں ، یہ سہی کہ اس قسم کے واقعات بھی کبھی کبھی ہو جاتے ہیں مگر ایسے نہیں ہیں کہ ان کو عام تہ الورود تصور کر لیا جائے یا اس

انداز سے اس کا ذکر کیا جائے کہ ماتھے اور حلوم بھدیا ہوجائیں، جیسے عصمت چغتائی کا "لحاف" جو ہو سکتا ہے کہ کوئی خیالی واقعہ ہو، شاہد ہو، مگر جس انداز سے انھوں نے یہ واقعہ بیان کیا ہے یا جس لہذا سے ان کے اس ادب یا طرح ادب کی تعریف کی جاتی ہے کہ ——— "اس (عصمت) کے تیز ناخن سوسائٹی کے زخموں کو کریدتے رہیں گے"...... اس سے تو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ سوسائٹی کا یہ زخم ایک آدھ جگہ پر کسی دانے پھنسی کی طرح نہیں بلکہ سر سے پاؤں تک اندھیوں کی طرح یا داد کی طرح چھایا ہوا ہے

بھر لذت و تکلیف کی ایک ملی جلی سی کیفیت ——— جس میں غالباً لذت ہی زیادہ غالب ہے ——— ،ان کی کتاب "چوٹیں" سی قسم کی کھجلیوں کا مجموعہ ہے، اور کچھ اسی قسم کا مجموعہ رنگین و انشا کی ریختی کے دیوان ہیں، پورا دیوان پڑھ لیجئے، حقیقی جذبات، سچے واردات اور بلندئ فکر کا جو بالعموم انسان کے اندر ہونے چاہئیں، یکسر فقدان نظر آئے گا۔ حالانکہ عورتوں کے دل لطافت جذبات سے عاری نہیں ہوتے بلکہ بھرپور ہوتے ہیں، ہندی شاعری کا بیشتر حصہ اگرچہ مردوں ہی کی کاوش و فکر کا مرہون منت ہے لیکن ان لوگوں نے عورت کے دل میں فطری اور لطیف جذبات کی بہتات پائی تھی اور اسی کی عکاسی کرتے تھے، ؎

ہاتھ چھڑائے جات ہو نربل جان کے موئے
ہردے میں سے جاؤگے تو مرد بدونگی توسے

سونا لینے پی گئے اور سونا کر گئے دیس — سونا ملا نہ پی ملے، روپا ہو گئے کیس

یا پھر یہ جو آپ اکثر سنتے ہیں ؎

جھن جھن باجے پائل موری
جاگے موری ساس نندیا، کیسے کر جاؤں سکھی پی کے ملن کو، کروں کون جتن،

یا پھر یہ کیفیت کہ ؎

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے — بدھنا ایسی کیجیو کہ بھور کبھی نا ہوئے

یہ شاعری تفریحاً اور مذاقاً نہیں ہوتی تھی، اس کے برخلاف ریختی تمام تر تفریحی چیز ہو کر رہ گئی، اس لئے وہ صنف نازک کے جذبات کی ترجمان نہیں ہے، بلکہ چند خاص قسم کی بگڑی ہوئی عورتوں کے خصوصی حالات کی ترجمان معلوم ہوتی ہے، افسوس اس کا ہے کہ خود عورتوں نے ریختی کی طرف مطلق توجہ نہ کی۔ اور غالباً اسی وجہ سے ذکی کہ یہ صنف سخن کچھ اور ہی ہو کر رہ گئی تھی،

عورتوں نے شاعری تو کی، مگر مردوں کی تقلید میں اپنا سارا انداز بیان بدل دیا حتیٰ کہ تصورات و جذبات تک خود اپنے باقی نہیں رکھے۔ سب مردوں ہی کے اختیار کر لئے۔ ایسے کہ اگر نام نہ بتایا جائے تو امتیاز کرنا دشوار ہو جائے گا کہ یہ کلام کسی عورت کا ہے کہ مرد کا، جیسے

صبر و ضبط کے کر بے شمار مذاق نے — تیری یاد آئی تھی آج مجھ کو ستانے
ہائے کیا مصیبت ہے ہائے کیا قیامت ہے — ہم ہی کھا گئے دھوکا، ہم چلے تھے بہلانے

یہ اشعار زہرہ نگاہ کے ہیں، تاہم اگر ظاہر نہ کیا جائے تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اشعار کسی عورت کے ہیں، یہ تو خیر پھر بھی ٹھیک ہیں، بعض شاعرات تو اپنے اشعار میں اپنے لئے مذکر کے صیغے تک استعمال کرتی رہی ہیں، ممکن ہے یہ بھی بہت بڑا کمال ہو، لیکن اس کمال نے ان کی اپنی زبان، اپنے تیور، اپنی ادا، اپنی اصطلاح، اپنے محاورات اور جذبات و واردات کو یکسر دبا دیا، ختم کر دیا، آج ہم ان کے دواوین میں صرف اسی عورت کو دیکھتے ہیں جس کے سینے میں مرد کا دل اور سر میں مرد کا دماغ ہے۔ لیکن وہ عورت ظاہر ہے کہ اصلی عورت نہیں ہے، اصلی عورت تو وہی ہے جس کے سینے میں عورت کا دل اور سر میں عورت کا دماغ ہو، ریختی اگر خود عورتوں نے کہی ہوتی تو وہ سچے اور صحیح اور لطیف تر جذبات کا آئینہ ہوتی، اور بڑی افضل

کا پتہ چلتا ہے۔ ریختی کے مجموعہ دیوان کی حیثیت ہماری نظر میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ تاریخ کا ایک ورق ہیں جن میں اس عہد کی بیگماتی زبان اور کچھ مخصوص اصطلاحیں ہیں جو اصل میں پاکباز شریف خواتین کی زبان اور اصطلاحیں نہ تھیں، محفوظ ہیں۔ تاہم کہیں کہیں رنگین کے ہاں ایسے شعر بھی مل جاتے ہیں ؎

رات باتوں میں یہاں تو نے گذاری انا
صدقے تیرے کسی ڈھب سے انہیں لا ری انا

نیند آتی نہیں کمبخت دوانی آجا
اپنی بیتی کوئی کہہ آج کہانی آجا

ایسے ظالم کو دل دیا ہم نے
آہ اللہ کیا کیا ہم نے

دوڑی پینے کو میں اسے کس دم
پاؤں میں میرے موچ آئی کب

پوچھے جو حال وہ میرا تو یہ ٹھہر کر کہنا
ہے بہت جان سے بیمن تری جان سے دور

یا پھر یہ رباعی ؎

شب تجھ سے جدا ہوئی تو معلوم ہوا
جب تجھ سے جدا ہوئی تو معلوم ہوا

دل تجھ کو بہت چاہتا ہے رنگیں
اب تجھ سے جدا ہوئی تو معلوم ہوا

کچھ نفسیاتی کچھ محاکاتی تیور کے ساتھ سچے جذبات کی کچھ جھلکیاں ان میں پائی جاتی ہیں مگر ایسے اشعار آپ کو اور نہیں ملیں گے، پھر بھی ان میں وہ کیف کہاں ہے جو خسرو کے ان مصرعوں میں پایا جاتا ہے کہ

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

کسے پڑی ہے جو جا سنا دے پیارے پی کو ہماری بتیاں

اُردو اور پاکستان

اُن لاکھوں مہاجروں میں جو پاکستان آئے ہیں اُردو زبان بھی شامل ہے اس کے چہرے پر درد غربت طاری ہے اور پیرگرد غربت سے اٹے ہوئے ہیں۔ "بابائے اُردو"

اُردو اور ہندوستان

اردو کو ہندوستان کے بازار مصر میں ہر وقت ہر یوسف کا سامنا رہا اس لئے کھوٹے کھرے کا پردہ چلن میں برابر اُٹھتا رہا، ستم ظریفی یہ ہے کہ اب اسی یوسف کو مصر سے نکال دینے کی فکر ہے جس کا کنعان اور مصر دونوں ہندوستان رہا ہے۔ رشید احمد صدیقی

دوراہے پر

جاؤں کدھر کو میں ؟

بی بانو

ڈاکٹر احمد بشیر ایم اے، پی ایچ ڈی (لندن)

دریائے ستلج

(۱)

اندر دیو! اندر دیو! فولاد کی کڑی کمان۔ چاندی کا بان۔ جوڑ کر نشانے پر چھوڑا۔ بادل گرجے۔ بجلی چمکی۔ چھاچھم، چھاچھم، چھاچھم
اندر دیو اپنے بل پر اتراتے بیچ دیکھے سے قدم اٹھاتے۔ آکاش سے دھرتی کی بہار دیکھنے آ رہے تھے۔
پھولوں میں کام دیو براجمان۔ ہاتھ میں کمان۔ کندھے پہ ترکش۔ سونے کے تیر، ہیرے کے سوفار عقاب کے پروں سے لیس، اور سیہہ کے کانٹوں کے تیر۔ ان میں چیلوں کے پر۔ کام دیو ہنس رہے تھے۔ کھیل رہے تھے۔
اندر دیو پاس سے گذرے تو مسکرائے۔ کام دیو کے تیروں پہ مسکرائے۔ بے اوقات بالشت بھر بھر کے
یہ تمسخر کی نیم نگاہی کام دیو کے عز و جاہ کو ٹھوکر لگا گئی
اک اڑان میں اندر سے آگے نکل آئے
کمان کھینچ کر کھڑے ہو گئے۔ سنہری تیر اوپر کی طرف اندر کے سینے میں پیوست۔ اور اک نفرت کا سیاہ تیر نیچے دھرتی کی طرف
ساون کی رم جھم۔ گنگا کا کنارا۔ نیم کے درخت میں جھولا۔ راجکماری جھولے۔ سکھیاں اس کو جھلائیں۔
رم جھم تیز ہوئی۔ گنگا جمنی چولی بھیگی۔ بھیگ کے چپٹی۔ بند بند گرفت سے اکتائے۔ پاس ہی پودوں کا گھنا جھنڈ تھا۔ درمیان میں چھوٹا سا تالاب۔ راجکماری کو نہانے کی سوجھی۔ سکھیوں کو چھٹی مل گئی۔
چولی اور لہنگا۔ مکٹ اور ہار۔ سونا موتی، ہیرے جواہر۔ اک اک کر کے سب اتار دیئے جس نے خالص پانی کو عزت بخشنے آیا۔
راجکماری نہا رہی تھی۔ چھینٹیں اڑا رہی تھی۔ جاگا جیون۔ نکھرا روپ۔ یونہی ٹھہر گئی۔ پھوار بھی تھم چکی تھی۔ پانی کی سطح پرسکون ہوئی تو کچھ دیکھ شرما گئی۔ لیکن اس "نقشِ بدیع" کو دیکھنے میں لذت تھی۔ اسے یہ آج بہت پیارا معلوم ہو رہا تھا۔ اسی سپنے میں تھی۔
اندر دیو جھنڈ کے قریب پہنچے، آگے بڑھے۔ دونوں ہاتھوں سے پودوں کو چیرا۔ معاً وہ کچھ دیکھا کہ جس سے آکاش خالی ہے
زلفوں میں چاند، آنکھوں میں رس۔ قامت میں بل۔ امرت مجسم، چاندی کی ساقیں۔ پھولوں سے پاؤں۔ اندر دیوتا کی شکتی ملیامیٹ
راجکماری کپڑے اٹھا دوڑ کر پودوں کے پیچھے جا چھپی
اندر دیو سیدھے سادھے کسان کے روپ میں تھے۔ یہ سامنا ہوا تو دائیں پاؤں کے انگوٹھے کو زمین پر دبایا اب پودوں میں کسان نہیں تو جو راجکمار کھڑا تھا۔ ایسا سندر کہ چندرماں شرمائے۔ مسیں بھیگیں۔ آنکھوں میں مدھ۔ بوٹا سا قد۔ سر پر تاج جس میں ہیرے اور لعل۔ تاج سے باہر دونوں شانوں پر لٹکتی۔ گلے میں کنٹھا اور موتیوں کی مالائیں ہاتھوں میں سونے کے کنگن۔ سڈول بازوؤں پر بازو بند۔
راجکماری نے پودوں کی اوٹ سے کہا
"کون ہو تم؟"
"شما کرو۔ راجکماری"

ہٹ جاؤ۔ راجکماری نے پودوں میں سے جھانکتے ہوئے کہا
اندردیو ٹھٹکے۔ سندر جوانی کے روپ کے مالک تھے
راجکماری کڑک کر بولی۔ ہٹ جاؤ۔
اندردیو ہٹ گئے

عورت چاہے تو تن من آن اور جان بھینٹ دے دے۔ نہ چاہے تو دیوتاؤں کے روپ کو بھی نیم نگاہی سے ٹھکرا دے۔ یہ دلوں کے سودے ہیں یہاں شکتی کا مان کیسا۔

اندردیو چاہتے تو اک نگاہ میں راجکماری کو بھسم کر سکتے تھے۔ لیکن اس سے ان کی ہار جیت نہیں ہو سکتی تھی
سینہ پھنک رہا تھا۔ پودوں سے پیچھے ہٹتے ہی چکر اگر بھونرے کا روپ بدلا اور درد و کرب سے چیختے اوپر کو اڑے
ہمالیہ پربت پر جھیل مانسرور میں کنول کھلے تھے۔ اڑتے اڑتے یہاں پہونچے۔ دھرتی آکاش اندھیر ہو رہے تھے۔ ایک کنول میں اتر کر پتیوں سے منہ چھپا لیا۔

پاس ہی ایک بند کنول کی پتیاں کھلنے لگیں۔ کام دیو نے پتیوں سے سر اٹھایا اور ہنسے۔ جی بھر کر ہنسے
اس ہنسی میں زہر تھا۔ شیو جی کے راج ناگ کے زہر سے زیادہ زہرناک۔ وہ زہر کہ جس کا دیوتاؤں کو بھی یارا نہ تھا۔ اندر کا کلیجہ پھٹ گیا۔ اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

کنول سے جھیل میں ٹپکے۔ دیوتا کے آنسو! طوفان آ گیا ساری جھیل ابلتے ہوئے پانی کی طرح کھولنے لگی۔ حشر بپا ہوا۔ پانی کناروں سے امنڈ امنڈ کر بہنے لگا۔

بہتے بہتے ندی بنا، دریا ہوا اور ستلج کہنے لگے
صدیاں گذر گئیں۔

اِندر کنول میں چھپے رہے اور ستلج بہتا رہا۔

(۲)

راون راکھشس مارا گیا۔ کنبھ کرن اور میگھ ناتھ بھی مٹی میں مل گئے۔ شری رامچندر جی سیتا جی کو ساتھ لئے ہر لکشمن کے ہمراہ اجودھیا کو واپس لوٹے جنتا نے خوشی کے جشن منائے۔ گھر گھر دیئے جلائے۔ دیپ مالا نے روپ دکھائے۔ مہاراج رامچندر جی تخت پر بیٹھے۔ لکشمن جی سیناپتی ہوئے۔ مہابیر بھی خدمت میں سرگرم بھرت جی نے راج کے دھندوں سے چھٹکارا پایا۔ برسوں کے بعد آرام کا سانس لیا تھا۔ لوہو جی اور کسو جی بھتیجوں کے ہمراہ شکار کو نکلے۔ چلتے چلتے اتر کی طرف ہو لئے۔ ہوتے ہوتے ستلج کے کنارے پہنچے۔ شام ہونے کو تھی۔ کنارے پر ایک ہی کشتی تھی اور موہانے چلنے کو تیار، وہ پار کے باسی تھے لہذا اسی طرح بغیر دم لئے کشتی میں بیٹھے اور پار اترے۔ اس پار بیریاں لگی تھیں۔ چاروں طرف دور دور تک چلی گئی تھیں۔ پکے ہوئے بیروں سے لدی ہوئی۔ تھکے ہارے مسافر شکاری ان کے نیچے آرام کو بیٹھے۔ بیروں کی میٹھی باس لذت کی آرزو کو تیز کر رہی تھی۔ سامنے ایک چھوکری جھکی ہوئی بیر چن رہی تھی دونوں ہاتھ بھر گئے تو سیدھی ہوتے ہوئے سر اٹھایا۔ گھٹاؤں سے چاند نکلا کہ خاموش بجلی گری۔ ان بیروں کے دن بھی پھل گئے۔ پاس آ کر بیروں سے بھری ہوئی اوک کسو جی کو پیش کی۔ حسن کی دین کون ٹھکرائے۔ عشق ذات نہیں پوچھتا۔ کسو جی نے بیر لئے اور کھانے لگے۔ ان میں مٹھاس تھی۔ بیروں کی مٹھاس جن ہاتھوں سے لئے تھے ان ہاتھوں کی مٹھاس۔ ان ہاتھوں کے بازوؤں کے نیچے پر مٹتے ہوئے مکھڑے کی مٹھاس۔

بھرت جی اور لوہو جی لڑکی کی ذات پوچھنے کے بکھیڑے میں الجھے تھے وہ مہان رہی تھی ۔ انسان کی ذات نہیں ہوتی ۔ بھرت جی اور لوہو جی آگے نکل گئے ۔ کسو جی یہیں کے ہو گئے ۔ شکاری نگاہ کا نشانہ ہوا ۔

بیریوں کے کنج اور جیون کے ساتھی ۔ سرگ کی ہوائیں ۔ یہیں بس گئے

بستے بستے نگری بسنے لگی ۔ کسو پور آباد ہو گیا

بھرت جی اور لوہو جی شکار کرتے کھیتے راوی اتر گئے ۔ اس پار شکار بے اندازہ تھا ۔ ہرن ، چکارے ، سیاہے ، سُرخے ، تیلے کئی دن شکار کھیلتے رہے آخر ایک دن جی اچاٹ ہوا ۔ تو اسی دن پلٹ آئے ۔ راوی کے کنارے کشتی بندھی تھی ۔ کشتی والا موجود نہ تھا ۔ یہ سوار ہو گئے خیال تھا کہ ابھی آجائے گا ۔ ایک لڑکی آتی دکھائی دی ، آتے ہی اس نے کشتی کھول دی ۔ کشتی میں قدم رکھا اور بیٹھتے ہوئے پتوار سنبھالی ۔ باپ کہیں کام کو گیا تھا ۔ مسافروں کو پار لے جا رہی تھی ۔ معلوم ہوتا تھا برہما جی نے کسی فرصت کے وقت بیٹھ کر اسے بنایا تھا ۔ انگ انگ پریت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ۔ نازک ہاتھوں میں پتوار ، زیر لب دبتے اور ابھرتے ہوئے گیت کے تقاضے ۔ ہوا سازگار تھی ۔ دریا کی سطح پر سکون ۔ کشتی کنارے سے چلی تو لیسے جیسے محل پر جا رہی ہے ۔ لوہو جی کی نظریں لڑکی پر جمی تھیں ۔ یکایک طوفان آ گیا ۔ ہوا تیز ہو گئی ۔ لہروں پر لہریں اٹھنے لگیں لڑکی پورا زور لگا رہی تھی لیکن کشتی بے قابو ہوئی جاتی تھی ۔ بھرت جی اٹھ کر مدد کے لئے دوسری پتوار اٹھانے لگے تھے کہ لوہو جی آگے بڑھے پتوار لے لڑکی کے برابر بیٹھ کشتی سنبھالنے لگے ۔ آندھی بے بس کئے دیتی تھی ۔ لیکن دونوں برابر زور لگا رہے تھے ۔ کشتی کے کھیون ہار ۔ دو نوجوانیا بھرت جی کی نظر ان ملاحوں پر تھی ۔ لوہو جی کی نظروں سے نظریں ملیں ۔ یہ مسکرا دیئے ۔ انہوں نے نظریں نیچی کر لیں ۔ لیکن ان کے بازو اور لڑکی کے بازو لگاتار پتوار چلا رہے تھے ۔ دل دھڑک رہے تھے بازوؤں کی حرکتوں اور دلوں کی دھڑکنوں سے گردمیں یک جان ہوتی جاتی تھیں خدا خدا کر کے آندھی تھمنے لگی ۔ آخر ناؤ کنارے لگی ۔ شام ہو چکی تھی اندھیرا ہونے لگا تھا ۔ لوہو جی آخر راجکمار تھے ۔ اس مشقت سے نڈھال ہو رہے تھے ۔ لڑکی نے مسافروں کی ہمدردی اور مدد کا شکریہ ادا کیا اور بولی یہ جنگل بیابان ۔ ہوا پھر تیز ہو رہی ہے آپ تھکے ہوئے ہیں دکنارے سے دور اس پار دھندلکے میں گاؤں کے مکان معلوم دے رہے تھے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ، وہ ہمارا گاؤں ہے ۔ اگر آپ غریبوں کی کٹیا میں رات گزارنی پسند کریں تو ہمارے بھاگ ، لوہو جی کے قدم اس طرف اٹھ گئے ۔ بھرت جی بھی ساتھ ہو لئے ۔ شکاریوں کے کندھوں پر شکار لٹکتے ہرن اور پرندے ۔ وہ میزبانوں کو پیش کئے ۔ ماں نے پکائے بیٹی نے لا کر سامنے رکھے ۔ بھوک لگ رہی تھی پیٹ بھر کر کھائے ۔ لیکن لوہو جی کو تپ چڑھ آیا ، سر میں درد ، جوڑ جوڑ میں تھکاوٹ ۔ یہ لیٹ گئے تو لڑکی نے آ کر ان کا سر دبانا شروع کیا ۔ ان کو نیند آ گئی ۔ اگلی صبح سورج نے جھانکا تو وہ بیدار ہوئے ۔ لڑکی اسی طرح سرہانے بیٹھی تھی آنکھیں نیند کی الکسائی ان کے بالوں میں ۔

شکاری کئی دن اس گاؤں میں رہے ، آخر ایک دن بھرت جی نے کہا " لوہو بیٹا تم یہاں سے چلنے کا نام نہیں لیتے اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہیئے ۔

" چاچا جی ..... لوہو جی نے بھرت جی کی طرف دیکھا آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو

دوسرے دن بھرت جی نے لڑکی کو بلایا ۔ ترکش سے تیر کھینچا اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے میں چبھویا اور شاہی خون سے لڑکی کے ماتھے پر تلک لگاتے ہوئے اشیرباد دی ۔ بیٹا تم آج سے راجکماری ہو ۔ تم اور لوہو جی پھولو پھلو ۔ ہمیں ٹھنڈا ہوا آتی رہے

لوہو جی کے دم قدم سے یہ گاؤں بڑا آباد ہوا شہر بن گیا اور لوہو پور کے نام سے مشہور ہوا

اگلے دن بھرت جی واپس پھرے ۔ لوہو جی اور راجکماری بدائی کو ساتھ آئے ۔ ستلج کے کنارے کسو جی نے چچا کے قدم لئے ۔ لوہو جی سے [illegible]

وہ بھی آگئی اور جھاڑی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال دیا دونوں میں مہندی رچ رہی تھی چند دن یہاں ٹھہر کر بھرت جی لے چلنے کی تیاری کی . پار کے تٹ تک سب ساتھ چلے.

ادھر کنارے پر قدم رکھا تو خوشی کے شادیانوں پر چوٹ پڑی راج سینا نے سلامی اتاری اور رعایا کی مبارکباد کے جیکاروں نے زمین آسمان پر اٹھالی بھرت جی کے سر پر مٹھیاں بھر بھر موتی نچھاور ہوئے اور راستہ پھولوں سے پٹ گیا.

اس پار کے راجہ نے وفات پائی تھی اور وصیت چھوڑی تھی کہ میرے بعد ایک ہفتے کے اندر اندر ملک میں فلاں صورت شکل کا ایک شکاری داخل ہوگا اسے میری جگہ راج گدی پر بٹھایا جائے.

بھرت جی تخت پر بیٹھے اور راجدھانی کا نام بھرت پور رکھا گیا

واپس لوٹ کر کسو جی اور لوہو جی نے بھی اپنے راج قائم کئے

شری رامچندر جی کو خبریں پہونچیں تو خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے

مہاراج دسرتھ کے بیٹے پوتے چاروں کھونٹ راج کرنے لگے . بھرت جی کی نیت کو پھل لگے . رانی کیکئی کے راجکمار بھی راجہ ہوئے

کوشلیا کی آل اولاد دودھوں نہائی پوتوں پھلی صدیاں گذر گئیں

بھرت پور اور کسو پور اور لوہو پور بستے رہے . بڑھتے رہے

اور ستلج اپنی موج میں بہتا رہا

نشور واحدی

شاید کہ نظر پہنچے تیری غمِ انساں تک
اے صبح چمن پرور چل شام غریباں تک

اک طرز تغافل سے عنواں بھی تھا دلکش
افسانہ بھی رنگیں ہے اشکِ پس مژگاں تک

ویرانیِ رنگیں ہے یا رنگ پہ ویرانہ
بس ایک حکایت ہے گلشن سے بیاباں تک

ٹوٹی ہوئی کشتی کا اس دور میں کیا شکوہ
ساحل پہ یہ رونق ہے اندازۂ طوفاں تک

کیوں دامنِ احساں کا گھبرا کے سہارا لوں
جب ہاتھ پہنچتا ہے ظالم کے گریباں تک

گلزار ترقی میں ہے قحطِ تبسم کا
یا بھول گئی دنیا اندازِ بہاراں تک

مٹی سے کرن تک ہے اس عشق کی تابانی
اک حسن کا جادو ہے شبنم سے شبستاں تک

ہندی بھی نشورؔ آخر اردو کے پجاری ہیں
بتخانے کے باسی ہیں کعبے کے نگہباں تک

محشر بدایونی

تُو اگر ہم سفر نہیں ہے — زندگی ہے مگر نہیں ہے

میری تاریک شب کی منزل — اور کچھ ہے سحر نہیں ہے

مجھ کو غم نے یقیں دلایا — زندگی مختصر نہیں ہے

دوست ہوتے ہیں جاں ستاں بھی — یہ گماں آپ پر نہیں ہے

یا ہمیں خود بہک گئے ہیں — یا کوئی راہبر نہیں ہے

کیف کیا ہے کم آگہی میں — آگہی کو خبر نہیں ہے

میرا دل اور مل کے پھر جائے — یہ تمہاری نظر نہیں ہے

میرے نزدیک سربلندی — در پہ ہے دار پر نہیں ہے

اُن کو میرا خیال محشر
تھا کبھی، اب مگر نہیں ہے

شمس عظیم آبادی

زندگانی کا وہ انداز کہاں سے لاؤں — التفاتِ نگۂ ناز کہاں سے لاؤں

جس کا انجام ہی یہ سوزِ نہاں اے غمِ یار — وہ ترا عہدِ خوش آغاز کہاں سے لاؤں

دل کی ویران اداسی کو مٹاؤں کیسے — میں تری انجمنِ ناز کہاں سے لاؤں

تیر بن کر جو رگ و پے میں اتر جاتی تھی — وہ نگاہِ غلط انداز کہاں سے لاؤں

اجنبی شہر میں وحشت مجھے لے آئی ہے — ہائے وہ ہمدم و دمساز کہاں سے لاؤں

مجھ کو بھی حسرتِ گلگشتِ چمن ہے لیکن — سوچتا ہوں پرِ پرواز کہاں سے لاؤں

میر کے رنگ میں کہنا تو ہے ممکن اے شمس
دل سے نکلی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں

ادبی سراغرساں

چہ دلاور است......

(کرشن چندر)

(۳)

ادب لطیف کے مدیر جناب میرزا ادیب اپنے خط میں ادبی سراغرساں کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"چہ دلاور است کا سلسلہ خاص طور پر قابل قدر اور قابل ذکر ہے، ادارے نے بڑا جرأت مندانہ اقدام کیا ہے۔ اس چیز کی سخت ضرورت تھی، جبتک ممکن ہو اس قندیل کو روشن رکھو، دزدان چراغ بکف کی پرواہ نہ کرو......"

خواجۂ خواجگان ادب خواجہ حسن نظامی کے صاحبزادے خواجہ حسن ثانی نظامی مدیر منادی لکھتے ہیں کہ اگر ادبی سراغرساں کی فتوحات کا یہی عالم رہا تو ممکن ہے کہ وہ اردو ادب کے شرلاک ہومز ہو جائیں۔

دوسرے ادیبوں نے بھی یہی لکھا ہے اور ان کے خطوط "یاران نکتہ داں" کے صفحات پر پیش ہو رہے ہیں، ادبی سراغرساں ان تمام بزرگوں اور دوستوں کی ہمت افزائی و قدردانی کا ممنون ہے۔ اسے اپنے حدود معلوم ہیں اس یہ ممکن ہے کہ کبھی وہ اپنی ذمہ داری کو بھول بھی جاتا ہو اور غالباً اسی لئے جناب صادق الخیری صاحب نے جہاں ادبی سراغرساں کی مہمات کو بڑا مفید باب بتایا ہے وہیں اس کے لب و لہجہ اور انداز نگارش پر لوکا بھی ہے، ادبی سراغرساں اس راہنمائی اور امداد کا بھی شکرگذار ہے۔

ایسی تحریروں سے ادبی سراغرساں کا مقصد کیا ہے؟ اس سلسلے میں پروفیسر کلیم الدین احمد کی نئی کتاب "سخنہائے گفتنی" کے صفحہ ۱۹ کی چند سطریں ملاحظہ فرمایئے :-

> اردو زبان و ادب پر آج برا وقت پڑا ہے، زبان و ادب مٹائے نہیں جا سکتے۔ لیکن مٹ جا سکتے ہیں ہاں اگر زبان و ادب اور ان کے برتنے والوں میں زندگی ہے، زندہ رہنے کی صلاحیت ہے تو وہ باد مخالف کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس وقت ٹھنڈے دل سے سوچنا ہے، سوچ سمجھ کر کام کرنا ہے۔ مہلک جراثیم کا مقابلہ کرنا ہے۔ صحت مند خیالات اور احساسات کو ابھارنا اور پھیلانا ہے۔ اسی طرح سے فضا کو سازگار بنایا جا سکتا ہے۔"

ادبی سراغرساں کی مہمات کا مقصد صرف یہ ہے کہ صحتمند اور بہتر ادب پیدا کرنے کے لئے فضا کو سازگار بنایا جائے، ادیبوں کو متوجہ اور ادبی صلاحیت رکھنے والے اہل قلم کو بیدار کیا جائے۔ اس کا مقصد سنسنی پیدا کرنا نہیں ہے، کسی کی مخالفت، بلکہ تخلیقی عمل کے لئے میدان ہموار کرنا ہے، اور اس سلسلے میں ادبی سراغرساں چاہتا ہے کہ حقائق و واقعات، ادبی چوریوں (جی چاہے اسے کوئی دوسرا نام دے لیجئے) کے نمونے آپ کے سامنے پیش کئے جائیں جن میں کہیں تو بڑی چابکدستی نظر آتی ہے کہیں نخت بھونڈا پن دکھائی دیتا ہے اس کے علاوہ دوسروں کی نقل اور ترجمہ :۔ اصل مصنف کے تذکرے اور حوالے سے عمداً چشم پوشی وغیرہ کو سامنے لایا جائے اور دیانتداری کے ساتھ ان کا تجزیہ کیا جائے۔ ہمارے اکثر ادیبوں اور فنکاروں میں بڑا ادب پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور انھوں نے بڑا ادب

پیدا بھی کیا ہے۔ مگر جہاں انھوں نے وہ صورت اختیار کی ہے جس کے لیے سرقہ اور چوری کے سوا دوسرا کوئی نام ہی نہیں ہے۔ یا دوسروں کے افکار کو حوالہ دیئے بغیر اپنے نام سے پیش کیا ہے وہ تو بڑی ہی سنگین بات اور بڑا ظلم ہے اور اس ظلم کی ذمہ داری ان کی نیت سے زیادہ ان کی ذہنی سہل انگاری پر عائد ہوتی ہے اور اس کا اثر نئے ابھرتے ہوئے ادیبوں اور مصنفوں پر بہت برا پڑ رہا ہے۔ اور اندیشہ ہے کہ ادب کو مہلک جراثیم پہونچ جائیں اور آج ادب جس دور سے گذر رہا ہے اس کا اندازہ کم و بیش ہر ایک کو ہے۔

ن۔م۔ راشد کی نظموں کا مجموعہ "ماورا" جب پہلی دفعہ شائع ہوا تو میں بی۔اے میں پڑھتا تھا۔ اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کرشن چندر کا تعارفی مقدمہ بہت پسند کیا گیا تھا کیونکہ اس میں صرف ن۔م۔ راشد کی شاعری ہی کے بارے میں نئے تنقیدی نقطۂ نظر سے بحث نہیں کی گئی تھی بلکہ شاعری، شاعرانہ تجربات اور ماضی و حال کے بارے میں بھی کتنی ہی اہم باتیں درج تھیں، مگر زیادہ عرصہ نہ گذرا کہ یہ بات سامنے آگئی کہ یہ تعارفی مقدمہ سی۔ ڈی۔ لیویس (C. D. Lewis) کی کتاب "اے ہوپ فار پوئٹری" کے مختلف حصوں کا ترجمہ ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کسی مضمون میں زوالی ادب پر لکھتے ہوئے رسالہ "معاصر" میں میں نے اس جسارت کا تذکرہ بھی کیا تھا، مگر تفصیلی مضمون لکھنے کی نوبت آج آئی۔

کرشن چندر کا نام جدید اردو ادب کے اہم ترین ناموں میں سے ہے، انھوں نے ہمارے افسانوی ادب کو کئی زندہ رہنے والی چیزیں یا دی ہیں ان کا خوبصورت اسلوب، ان کی متاع گراں مایہ ہے۔ مغرب کے افسانوی ادب کا انھوں نے وسیع مطالعہ کیا اور اس کی بناء پر اردو افسانے میں نئے رجحانات کی ترویج کی۔ بغیر پلاٹ کا افسانہ لکھا۔ طویل مختصر افسانے کی رسم آگے بڑھائی۔ اردو میں پہلا "رپورتاژ" لکھا۔ لیکن وہ بھی بار ہا سہل انگاری کا شکار ہوگئے اور انگریزی افسانوں کے چربے بغیر حوالے کے پیش کر دیئے — کرشن چندر ویسے بہت ذہین ہیں اس لیئے وہ ترجمے کی جگہ چربے کے قائل ہیں۔ "بالکونی" میں بھی انھوں نے نیم جسارت اور نیم احتیاط کو ملحوظ رکھا — ہمارے پچھلے شمارے میں امجد علی صاحب کے خط سے انکشاف ہوا کہ ان کا افسانہ "کالا سورج" بھی ترجمہ ہے۔ کاش وہ پڑھنے والوں کو مزید تفصیل سے آگاہ کریں۔ صادق الخیری صاحب نے لکھا کہ شکست کے متعلق چمنستان دہلی میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں مضمون نگار نے حوالوں سے یہ بات ثابت کی تھی کہ شکست ترجمہ اور نقالی ہے — ہم چمنستان کا وہ شمارہ تلاش کر رہے ہیں اور جلد ہی اس کے اقتباسات بھی پیش کریں گے۔

افسانوں کی حد تک تو کرشن چندر نے چابکدستی سے کام لیا لیکن ماورا کے تعارف میں یہ چابکدستی چوری کی حد تک پہنچ گئی۔ لیویس نے شاعری کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں مستقل کتاب لکھی ہے مگر کرشن چندر صاحب کو محض تعارف لکھنا تھا، اسی لئے وہ اردو میں پوری کتاب کو تو اپنے نام سے پیش نہ کر سکے لیکن اس کا خلاصہ انھوں نے ضرور کر دیا — اسپنڈر یا الیٹ کی جگہ راشد آگیا اور تعارف مکمل ہوگیا — اگر کہیں کرشن چندر شاعری پر کتاب لکھتے تو لیویس کی پوری کتاب اردو میں منتقل ہو جاتی اور اردو میں انگریزی کے ایک اہم تنقیدی مطالعہ کا بہت اچھا ترجمہ ہوتی۔

اس وقت ہمارے سامنے ماورا کی طبع سوم رکھی ہے جسے فروری ۱۹۵۳ء میں مکتبۂ اردو لاہور نے شائع کیا تھا۔ اور "اے ہوپ فار پوئٹری" کا ساتواں ایڈیشن رکھا ہے۔ جو ستمبر ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا تھا — لیوس کی یہ کتاب پہلی بار ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی تھی جب انگریزی شاعری میں نئے تجربوں کی لہر کافی ابھر آئی تھی نئے مغربی ادب اور تجربات اردو میں دس بارہ سال کے بعد اثر انداز ہوئے۔ اسی لئے راشد کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے کرشن چندر نے لیویس کو منتخب کیا۔

لیویس نے صفحہ ۔۔ پر لکھا ہے کہ :-

"شاعر دو قسموں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں، ایک قسم کے شاعر تو وہ ہیں جو بیشتر سے اثرات قبول کرتے ہیں اور ان سے اور زیادہ اسلوب و اظہار پیدا کرتے ہیں، دوسری قسم کے شاعر وہ ہیں جن کی آواز نئے آسمان اور افق سے

کرشن چندر اپنے تعارف کی ابتدا یوں کرتے ہیں۔

"تاریخی اعتبار سے شاعروں کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم کے شاعر تو وہ ہیں جو ماضی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تاثرات، الفاظ و معانی اخذ کرتے ہیں۔ اور اگر ہو سکے تو ہر ممکن کوشش سے اس حلقے کے اندر رہ کر

اُفق سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے — یہ آواز کسی ایسی چیز کی یاد نہیں دلاتی جو ہم اس سے پہلے سن چکے ہیں۔" (صـــ)

دوسری قسم کے شاعر وہ ہیں جن کی آواز گویا کسی نئے اُفق سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ... اظہار کی نئی پہنائیاں اور نئے اسلوب بیان تلاش کرتے

آزاد تسلسل کے بارے میں لیولیس کی رائے یہ ہے کہ ادب میں یہ تکنیک فلم کی تکنیک سے لی گئی ہے۔

کرشن چندر اسی کو یوں دہراتے ہیں:-

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تکنیک فلمی تکنیک کی ترقی کے ساتھ آگے بڑھی ہے جس طرح ایک فلم ڈائرکٹر ایک جذباتی کیفیت کے اظہار یا دماغ کو ایک ڈراماتی نقطے سے دوسرے ڈراماتی نقطے تک لیجانے کے لئے ایسے مناظر کو استعمال کرتا ہے جن کا بظاہر آپس میں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔" (صـ ۱۹)

لیولیس کے یہاں یہ عبارت ملتی ہے -

اعلیٰ درجے کی فلموں میں ایسے لمحاتی مناظر جن کا بظاہر آپس میں کوئی تعلق نہیں ہوتا ناظر کے سامنے پے در پے لائے جاتے ہیں۔ لیکن ان مناظر کے مجموعی اثر سے ایک واضح تصویر اور مکمل نقشہ ناظر کے دل و دماغ پر کھنچ جاتا ہے۔

اس طرح لیولیس لکھتا ہے:-

انسان کے ذہن لاشعور کو ناپنے اور اس کو معلوم کرنے کے لئے ماہر نفسیات کے طریقوں میں سے ایک طریقہ آزاد تسلسل ہے — کسی شخص سے مخاطب ہو کر الفاظ کی ایک فہرست بولی جاتی ہے جن میں سے ہر ایک کا جواب وہ اس پہلے لفظ سے دیتا ہے جو اس کے ذہن میں سب سے پہلے آئے — ایک حد تک ہمیشہ سے یہی شعر کہنے کی کیفیت بھی رہی ہے۔ شاعر کے ذہن میں ایک خیال ہوتا ہے اور اس کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ اس خیال سے متعلق دوسرے خیالات اور تصورات کو بھی اپنے ذہن لاشعور سے کھینچ لاتا ہے (صـ ۲۰)

کرشن چندر لکھتے ہیں

"جدید نفسیات کے ماہروں نے ذہن لاشعور کو ناپنے کے لئے آزاد تسلسل کا طریقہ ایجاد کیا ہے — کسی شخص سے مخاطب ہو کر ایک فہرست میں سے منتخب الفاظ یا فقرے بولے جاتے ہیں اور اس سے کہا جاتا ہے کہ وہ ہر سوال کا جواب اُن الفاظ یا الفاظ کے مجموعے سے دے جو سب سے پہلے اُس کے ذہن میں آئیں۔ ان جوابات سے اس فرد کی ذہنی کیفیت کے متعلق نتائج مرتب کئے جاتے ہیں۔ شعر کی بھی ایک حد تک یہی کیفیت ہے شاعر کے دل میں ایک خیال اٹھتا ہے پھر اس کا ذہن لاشعور اس خیال سے وابستہ دوسرے خیالوں اور تصویروں کو کھینچ لاتا ہے۔"

لیولیس کی انگریزی اصل دیکھئے

"ONE OF THE PSYCHOLOGISTS' METHODS OF EXPLORING THE DARK INTERIOR IS THAT OF FREE ASSOCIATION. A LIST OF WORDS IS SPOKEN TO THE SUBJECT, TO EACH OF WHICH HE ANSWERS THE FIRST WORD THAT COMES TO HIS HEAD. THIS HAS ALWAYS BEEN, UP TO A POINT, THE WAY POETRY COMES TO BE WRITTEN: THE POET HAS AN IDEA, AND IN THE COURSE OF CONT-EMPLATING IT HE DRAWS UP FROM HIS SUBCONSCIOUS A STRING OF ASSOCIATED IDEAS AND IMAGES."

لیولیس نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۵ اور ۲۶ پر جدید شاعری کے بارے میں کئی اہم باتیں پیش کی ہیں — اُس کے نزدیک عہد حاضر کی شاعری کے ابہام کی ذمہ داری شاعر پر نہیں بلکہ بدلتے ہوئے معاشرتی ماحول پر ہے — فلم، اخبارات، اشتہارات، اور غلط نظام تعلیم — یہ سب اسباب

شاعر کے اعصاب اور ذہن کو متاثر کرتے ہیں ۔ اسی لیے فرد اور معاشرہ کا توازن بگڑ گیا ہے ـــــ کرشن چندر نے یہی خیالات بالکل اسی طرح اپنے مقا
کے صفحہ ۹ پر نقل کر دیئے ہیں ۔

صفحہ ۳۶ اور ۳۷ پر لیوس نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ مربوط اور ہم آہنگ سماجی گروہ کا بھی شاعری پر روایات کی طرح گہرا اثر پڑتا
اس سلسلے میں اس نے یونان کی شہری ریاستوں اور انگلستان کے عہد الزبتھ کی مثالیں پیش کی ہیں ـــــ اخلاقی انحطاط کے ماحول اور دو
شاعر کا کام بہت مشکل ہو جاتا ہے اور بڑی شاعری کی تخلیق رک جاتی ہے ۔ ایک مختصر اقتباس پیش نظر رکھیے :۔

لیوس کی عبارت

OW A COMPACT, WORKING SOCIAL
ROUP HAS THE SAME ADVANTAGE
OR THE POET AS TRADITION... IT
NOTICEABLE THAT THE GREATEST
CHIEVEMENTS OF POETRY AND THE
OST PROLIFIC PERIODS OF POETRY
AVE ARISON IN SMALL, COMPACT,
OMOGENEOUS COMMUNITIES SUCH
THE GREEK CITY STATE OR
IZABETHAN ENGLND."

کرشن چندر کا ترجمہ

خارجی طور پر ایک مربوط، ہم آہنگ سماجی گروہ کا شاعری پر وہی
اثر ہوتا ہے جو داخلی طور پر شعری روایات کا ۔ شاعری کی تاریخ سے ظاہر
ہے کہ اس صنف نے انہی زمانوں میں اور انہی مقامات پر اپنی معراج حاصل
کی جہاں ادنیٰ مگر مضبوط اور سماجی گروہ موجود تھے جیسے یونان کی شہری
ریاستیں کالی داس کا ہندوستان اور الزبتھ کا انگلستان"

اگر یہ لفظی ترجمہ نہیں تو پھر لفظی ترجمہ اور کسے کہتے ہیں ؟ ـــــ اِن کالی داس کے ہندوستان" کا ذکر کرشن چندر نے ضرور بڑھا دیا ۔
بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ کرشن چندر کی ترجمہ کی صلاحیت بھی بحث کا موضوع بن جاتی ہے کیونکہ انھوں نے SMALL کا ترجمہ مختصر
چھوٹے کی جگہ "ادنیٰ" کیا ہے ۔

کہیں کہیں کرشن چندر نے بڑی دلچسپ حرکتیں کی ہیں ، انھوں نے لیوس کے بیانات کا ترجمہ تو کیا ۔ لیکن اس کے نتائج کی جگہ اپنے نت
پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ظاہر ہے کہ ناکام رہے ہیں ۔ مثلاً

لیوس کہتا ہے :۔

جہاں قوم یا گروہ زوال پذیر اور اخلاقی طور پر غیر مرتب اور
گم ہوا ہو وہاں شاعر کا کام بہت مشکل ہو جاتا ہے اور شاعری کا مواد
نہیں ملتا ۔ ان الجھنوں کی وجہ سے حساس فرد یعنی شاعر اپنی ذات کے
خول میں سمٹ جاتا ہے اور اپنے لیے ایک ذہنی دنیا بنا لیتا ہے ۔

کرشن چندر لکھتے ہیں :۔

جہاں اخلاق کا تنزل انتہائی صورت اختیار کر چکا ہو . . . . .
یہی شاعری کا مواد نہایت مشکل سے دستیاب ہوتا ہے اور اس
سچے شاعر کا کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے ۔ شاعران حالات میں لا
اس لیے مبہم ہو جاتا ہے کہ وہ اس انتشار میں اپنے آپ کو مدغم نہ
کرنا چاہتا ہے

لیوس نے واضح طور پر اپنی بات کہی ہے کہ شاعر اپنی دنیا آپ بنا لیتا ہے ، کرشن چندر نے محض اتنا ہی کہہ کر بات کو الجھا دیا ہے ا
اس انتشار میں اپنے آپ کو مدغم نہیں کرنا چاہتا ۔

یہ محض چند اقتباسات ہیں، ورنہ ادرا کا سارا تعارف ہی متاعِ غیر کا دوسرا نام ہے ـــ اگر کرشن چندر اس مضمون کو راشد کے تعارف کی جگہ ترجمہ کے طور پر پیش کر دیتے تو اردو ترجمے کے ذخیرے میں قیمتی اضافہ ہوتا ۔ مگر انہوں نے لیویس کا کہیں اشارۃً بھی حوالہ تک نہیں دیا اردو تنقید، مغربی تنقید سے بہت متاثر ہوئی ہے، کلیم الدین احمد، اور محمد حسن عسکری نے مغرب سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے مگر اپنی شخصیت بھی رکھتے ہیں اور اپنے نظریات و خیالات کی کسوٹی پر دوسروں کے خیالات کو جانچتے پرکھتے ہیں ـــ مغرب سے ہمارے نقادوں کو بہت کچھ سیکھنا ہے ۔ مگر سیکھنے کے بھی طریقے ہوتے ہیں ۔ اس طرح تو نہیں کہ ہم چربہ بن جائیں ۔ لفظاً بھی اور معناً بھی ـــ شاید اسی سے متاثر ہو کر اقبال نے کہا تھا کہ :۔

کس درجہ ہوئی عام یہاں مرگِ تخیل

رسالوں میں

(ماہ گذشتہ)

سالنامہ ساقی :- ماہنامہ ساقی نے چار سو صفحات پر اپنا سالنامہ شائع کیا ہے۔ حصۂ نظم میں جوش ملیح آبادی، عدم، قیوم نظر، حفیظ ہوشیارپوری، اثر لکھنوی اور فراق گورکھپوری وغیرہ کے افکار شامل ہیں۔ مقالوں کا حصہ سب سے اچھا ہے۔ اہم اور دلچسپ ادبی و تنقیدی موضوعات پر عبادت بریلوی، وقار عظیم، ممتاز حسین، ڈاکٹر غلام مصطفٰے، اختر اورنیوی، ڈاکٹر احسن فاروقی اور انتظار حسین کے مضامین شامل ہیں۔ وقار عظیم نے اُن افسانہ نگاروں کے فن کا جائزہ لیا ہے جنہوں نے تقسیم برصغیر کے بعد سے لکھنا شروع کیا ہے۔ ہمارے خیال میں شوکت صدیقی اور انور نے تقسیم سے پہلے ہی کافی شہرت حاصل کرلی تھی اسی لئے وہ انتظار حسین، اے حمید اور اشفاق احمد وغیرہ کے ساتھ شامل نہیں کئے جا سکتے ۔۔۔ اس کے علاوہ ابن الحسن اور ضمیر الدین صاحبان کے نام تو شامل ہیں۔ لیکن وقار صاحب نے جیلانی بانو اور جاوید جعفری کو لائق اعتنا نہ سمجھا۔ افسانوں کا حصہ سالنامہ کے شایان شان نہیں ہے۔

شاہد احمد دہلوی کی دو تحریریں سالنامہ میں شامل ہیں ایک ڈرامہ (ترجمہ) بازگشت اور ایک شخصی تاثرات کا مجموعہ "زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے"۔۔۔ دونوں چیزیں بہت اچھی ہیں ۔۔۔ شاہد صاحب کے خاکوں میں جو سادگی اور خلوص ہوتا ہے اُس سے کتنی ہی ادبی خوبیاں جنم لیتی ہیں۔

ماہِ نو :- ماہ نو کے اس شمارے میں غلام عباس کا افسانہ "آپ بیتی" بظاہر سپاٹ سا معلوم ہوتا ہے، لیکن افسانہ نگار کا مقصد ہی اسی حقیقت کو پیش کرنا ہے کہ واقعات و حالات کو اُسی طرح نقل کر دینا فن کے تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔ شکیلہ معظم علی کا افسانہ "تشنگی" ایک بہت اچھا نفسیاتی مطالعہ ہے اور انھوں نے آپا زادہ کے کردار کو بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔

برگِ گل :- برگِ گل اردو کالج کراچی کا ادبی و علمی مجلہ ہے اور ایک بلند ادبی معیار کا حامل۔ اس مرتبہ برگِ گل نے "سرسید نمبر" پیش کیا ہے۔ سرسید ہماری قوم اور ادب کے محسنِ اعظم ہیں، ایسے محسن "جس کی دانش و بینش نے قوم اور ادب کا رُخ موڑ دیا"۔۔۔ یہ نمبر سرسید کی شخصیت اور اُن کی خدمات کا آئینہ خانہ ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر غلام مصطفٰے۔ ڈاکٹر محمود حسین، شوکت سبزواری، قمر الدین خاں اور دوسرے مقالہ نگار حضرات نے اپنے موضوعات کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔ اگر ایسے اہم اور تاریخی نمبر میں "کوائف کالج" شامل نہ ہوتے تو بہتر تھا۔ مہر نیمروز اپنے پڑھنے والوں سے اس نمبر کے مطالعہ کی درخواست کرتا ہے۔

سالنامۂ تذکرہ :- سالنامۂ تذکرہ میں دو خاصے کے مضمون شائع ہوئے ہیں۔ حسن وارثی نے کہنے کی باتیں اپنے مضمون "ہم کو منظور نکونائی فرہاد نہیں" میں بڑے خوبصورت انداز میں کہی ہیں ۔۔۔ سید وصی احمد بلگرامی نے "گلِ داؤدی" میں تاریخ کو ادب کا دامن بنا دیا ہے۔

افکار :- افکار میں مصطفٰے زیدی کی نظم "بت جاگتے ہیں" شدتِ احساس سے عبارت ہے۔ شفیق الرحمٰن کا مضمون "سوال جواب" مزاح اور طنز کا کوئی اچھا معیار نہیں پیش کرتا۔

ہمایوں :- اس مرتبہ ہمایوں میں دو اچھے مضمون شامل ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ کا مضمون "ادب، اخلاق اور آزادی" ایک متوازن نقطۂ نظر

کو پیش کرتا ہے، یہ ایسا موضوع ہے جس پر دوسرے اہلِ علم حضرات کو لکھنا چاہیئے۔ میاں عبدالرحمٰن اعجاز کے مقالہ "ماڈرن آرٹ" کی دوسری قسط شائع ہوئی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ "مدیرِ ہمایوں" وقفہ کے بغیر اس مضمون کو شائع کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ "ہمایوں" کے صفحات میں مزید اضافہ کی ضرورت کا شدید احساس ہوتا ہے۔

ثقافت :۔ ماہنامہ ثقافت کے اس شمارہ میں دو قابلِ توجہ مضمون شائع ہوئے ہیں ایک "اسلام اور جنگ و امن" (خلیفہ عبدالحکیم) اور دوسرا "علوم اسلامیہ کی تشکیل جدید"۔ اس مضمون میں شاہ سلیمان پھلواروی کے خیالات کو پیش کیا گیا ہے ــــ ضرورت تھی کہ [illegible] کی یہ اہم تجویز پوری کی پوری پیش کی جاتی۔

ثقافت کا معیار یقیناً بلند ہے لیکن اس رسالہ کو اسلامی ثقافت کے عناصر اور اجزا پر مستقل طور پر تحقیقی و تخلیقی مضامین شائع کرنے چاہئیں۔ محض فقہ اور تاریخ تک اس رسالہ کو محدود نہیں رہنا چاہیئے۔

نقوش :۔ مدت کے بعد نقوش نے عام نمبر نکالا ہے۔ لیکن اس میں بھی جدت کا پہلو ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ادب کے مطالعے کے لئے ایک حصہ مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اس حصہ میں ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر عبداللہ اور شیخ اسماعیل پانی پتی کے مضامین شامل ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن کی ڈائری کے اوراق "مجاز" کی زندگی کے آخری سالوں کو جاننے کے سلسلہ میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ افسانوں کا حصہ اچھا ہے۔ خاص طور پر بلونت سنگھ کے ناول "رات، چور اور چاند" کی پہلی قسط، شوکت صدیقی اور آغا بابر کے افسانے۔ حصۂ نظم بڑے ناموں کے باوجود اچھا نہیں ہے۔ اگر محمد طفیل صاحب اپنے ہی رسالے میں اپنی کتاب پر "مطالعہ" نہ شائع کرتے تو بہتر تھا۔

جھلکیاں

تجلی :۔ تجلی کے اس شمارے میں عبدالحلیم شرر پر تمکین کاظمی کا مضمون اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کا وہ خطبۂ صدارت شائع ہوا ہے جو طلبائے قدیم جامعۂ عثمانیہ کی کراچی کانفرنس میں پڑھا گیا تھا۔

کردار :۔ اردو ادب اور طنز و مزاح پر عابدہ راشد کا مضمون طالب علمانہ ہے۔ افسانوی حصہ میں کوثر چاند پوری کا افسانہ بھی شامل ہے۔

سیارہ :۔ سیارہ میں اس بار دو مضمون بہت اچھے شائع ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ کا مضمون ادیب اور ممتاز شیریں کا مضمون رجحانات کے دائرے ــــ افسانوی حصہ کا بھرم ممتاز مفتی کے افسانہ اسکارلٹ روڈ نے رکھ لیا ہے ــــ ڈاکٹر اجمل کا مضمون اقبال کے نفسیاتی مطالعہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ مضمون ایک تعارف کی حیثیت رکھتا ہے اس پر ابھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر اجمل نے ابھی بحث کی ابتدا کی ہے۔

مطبوعہ: مشہور پریس۔ میکلوڈ روڈ۔ کراچی

پرنٹر و پبلشر: حسن مثنیٰ ندوی

جلد-۱
شمارہ-۹

اکتوبر سنہ ۱۹۵۶ء

مہر نیمروز

☆

ترتیب دینے والے

حسن مثنیٰ ندوی
ابوالخیر کشفی
علی اکبر قاصد

فی پرچہ
۸/

چندہ سالانہ
چھ روپے

ہاؤسنگ سوسائٹی ایریا کراچی

فون نمبر [illegible]

اس شمارے میں

پرنٹر و پبلشر حسن مثنیٰ ندوی نے انجمن پریس لارنس روڈ کراچی میں چھپوا کر ۲۶۳ ہاؤسنگ یونین ایریا کراچی سے شائع کیا۔

پہلی کرن

ماہ ربیع الاول میں انسانی عظمت، سربلندی اور تکمیل کا وہ مجسمہ آج سے چودہ صدیاں پہلے اس دُنیا میں تشریف لایا جس کی نبوت کے "تئیس سال کائنات کے گلے میں موتیوں کی لڑی کی طرح گوندھے ہوتے ہیں۔" محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کو کامل کیا اور یوں اتمام نعمت سے عہد نو کی ابتدا ہوئی۔ "قرون وسطیٰ" کے خاتمہ کے ساتھ انسانی تفکر کو آزادی نصیب ہوئی اور یوں تاریخ نے اپنا راستہ بدل دیا ـــــ خدائی فکر کی روشنی آج انسان کو راہ دکھا رہی ہے اور انسان اپنے لئے اس روشنی کے سہارے نئی راہیں تراشنے کا مختار ہے ۔

آج انسانیت کا کارواں بلند ترین اقدار کے لئے جد و جہد کر رہا ہے۔ "انسانی مساوات، معاشی خوشحالی" ذہنی سیاسی، معاشی اور معاشرتی آزادی" کا حصول انسانوں کا مطمع نظر ہے۔ خدا کے آخری نبی نے پہلی بار ان تصورات کو عمل کے سانچے میں ڈھالا تھا ـــ اُس نے جس دُنیا کی تشکیل کی تھی اُس میں ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، حیدرؓ، بلال حبشیؓ اور سلمان فارسیؓ کا درجہ ایک تھا۔ تمام نسلی اور ملکی امتیازات ختم ہو گئے تھے۔ عمل، کردار اور تقویٰ ہی عظمت کا پیمانہ تھا۔ رسول اکرمؐ نے جو نظام حکمرانی قائم کیا اُس میں ہر شہری اُتنا ہی معزز اور ذمہ دار تھا جتنا صدر مملکت ـــــ انسانی مساوات اس بلند ترین نظریہ پر قائم کی گئی کہ "خدا نے سارے انسانوں کو نفس واحدہ سے پیدا کیا"۔ انسانی زندگی کی قیمت اس درجہ بڑھ گئی کہ جس نے کسی ایک فرد کو قتل کیا سمجھو کہ اُس نے انسانی نسل کو قتل کر دیا ـــ عورت جسے مردوں کی ملک سمجھا جاتا تھا اُس کا مرتبہ یوں بڑھا کہ

ع شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی

جائداد میں حق دے کر عورت کی علیحدہ اور قائم بالذات شخصیت کو ثابت کیا گیا - مرد کو عورت کا اور عورت کو مرد کا لباس قرار دیا گیا اور واضح طور پر اعلان کیا کہ ہم نے "بعض کو بعض پر فضیلت دی"۔ اس فضیلت کے تصور میں مرد پر عورت کی فضیلت بھی واضح ہے - یہ دوسری بات کہ اب فقیہانِ حرم "قوامون" کا مفہوم "روزی کمانے والے" کی جگہ "حاکم" کریں ۔

رسول اکرمؐ اور اسلام نے ساری زندگی کا خاکہ اور جوہر بنچہ بدل دیا ـــ شہنشاہی اور جاگیرداری کے صدیوں پرانے نظام کو موت کی گود میں سلا دیا گیا ـــ جد و جہد معاشی زندگی کی بنیاد قرار دی گئی ۔ "انسان کے لئے کچھ بھی نہیں اس کے سوا جس کے لئے اُس نے جد و جہد کی" ۔ شہنشاہ جو زمین کا خدا بنا ہوا تھا اُس کا وجود ملت اسلامیہ کے لئے عملی شرک بن گیا ۔ ہر وہ شخص جو اسلام کے اصولوں سے واقف ہے وہ شہنشاہی کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتا ـــ ۵

"باطل دوئی پسند ہے حق" لا شریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول ..

زمین پر بسنے والے تمام غلاموں مظلوموں اور کچلے ہوئے انسانوں کے لئے اسلام اور محمد عربیؐ نے شخصیت کو مکمل، حسین، متوازن اور ہم آہنگ بنانے کے تمام امکانات

روشن کر دیئے — علم اور تعلیم کو انسانوں کی میراث کا درجہ مل گیا۔ نبی امی کے پیغام کی ابتدا ہی اس فرمان سے ہوئی کہ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ،
اور پھر رسول اکرمؐ نے اپنی ساری زندگی اس فرمان کی تکمیل کی۔ مسلمانوں کی اقامتی یونیورسٹی مسجد نبوی کے سائبان اور چبوترہ پر قائم کی گئی۔ بدر میں
رہائی کا فدیہ یہ مقرر کیا گیا کہ ”جو قیدی لکھنا پڑھنا جانتا ہو وہ دس دس مسلمانوں کو اس فن کی تعلیم دے۔“

یہ ایک جھلک ہے اس نئے نظام کی جس کے بانی اور اولین رہنما محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اور آج ہم اس نظام سے اتنے دور ہو گئے ہیں کہ اپنے دین کی تکذیب خود کر رہے ہیں۔ ہمارے سماج میں کتنے ہی تنہا اور بے سہارا یتیم ہیں۔ جو ہماری رفاقت و اعانت کے ایک لمحہ کو ترستے ہیں لیکن ہم ستاروں کی گزرگاہوں کی تلاش میں اس درجہ کھو گئے ہیں کہ ہماری نظریں آنسوؤں بھری آنکھوں پر پڑتی ہی نہیں۔ ہمارا معاشی نظام اس درجہ خود غرضی پر قائم ہے کہ ہم اُن کے بارے میں سوچتے بھی نہیں جن کی معاشی جدوجہد حالات کی بنا پر ختم ہو گئی (مساکین)۔ نسلی، ملکی اور صوبائی امتیازات اور اختلافات ہمارے معاشرہ کا ناسور بن گئے ہیں۔ اور بدبختی کی انتہا یہ کہ آج بھائی بھائی سے خائف ہے۔ عورت پھر مرد کی ملک بن گئی ہے۔ تعلیم اونچے طبقہ تک محدود ہوتی جاتی ہے اور اس قوم کے درمیان جس نے مغرب کی نشاۃ الثانیہ اور تحریک احیائے علوم کو جنم دیا۔ دوسرے ملکوں کو چھوڑ دیئے آج رسولؐ کی سرزمین، شہنشاہیت کے عذاب میں مبتلا ہے۔ پاکستان کے ہاری اور کسان، جاگیردار اور سرمایہ دار کا صیدِ زبوں ہیں — اور ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے بھی ہم محمد عربیؐ کے نام لیوا کہلاتے ہیں حالانکہ اس عظیم زندگی کا ہر نقش نظروں کے سامنے سے دانستہ ہٹاتے چلے جاتے ہیں۔ فروعات کو اصول اور شاخوں ٹہنیوں پتیوں کو جڑ کا مرتبہ دے کر انھیں سیراب کرنے میں مشغول ہیں اور جڑیں ہیں کہ سوکھتی چلی جاتی ہیں۔

ہر وہ شخص جو انسانی ذات، جوہر خودی اور انسانی عظمت پر یقین رکھتا ہے رسول اللہ کی زندگی اُس کے لئے ہمیشہ مینارۂ نور کی حیثیت رکھے گی —

معراج انسانی شخصیت کی انفرادیت کے سلسلہ میں انسانی تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ ہے۔ اقبال کے الفاظ میں ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اور ذرا اس سے آگے دیکھئے تو اندازہ ہوگا کہ عشرتِ قطرہ دریا میں فنا ہو جانا نہیں۔۔۔ اقبال نے لکھا ہے کہ پیغمبر ذاتِ باری میں گم ہونے کی جگہ خلّاقانہ طور پر لوٹ آتا ہے اور اُس کی واپسی کا مقصد تاریخ کی قوتوں پر قابو پانا ہوتا ہے اس طرح وہ افکار و تصورات، آدرش اور انسانی نصب العین کی ایک نئی دنیا تخلیق کرتا ہے۔ اسی دنیا کو ہم کسی قوم یا مذہب کا کلچر کہتے ہیں۔ رسول اللہ نے ہمیں جو کلچر دیا ہے ”روح القدس کے ذوقِ جمال، عرب کے سوزِ یقین اور عجم کی حسنِ طبیعت“ کا امتزاج ہے۔ اس میں زندگی کا ہر گوشہ بے کراں اور سب پر محیط — اس کلچر سے ہماری دوری کا یہ عالم ہے کہ ”باب النکاح“ کی لذتوں کو ہم نے اپنا کر تخلیق کی عظمتوں کو ٹھکرا دیا ہے — یہ محض ایک پہلو ہے۔ مجموعی لحاظ سے ہم ذہنی طور پر اتنے گر گئے ہیں کہ تمدن اور کلچر کے عناصر اور انسانی تمدن کے مزاج سے بے خبر ہیں —

اگر ہمیں ایک قوم و ملت کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے تو محمد صلعم کے تصورات سے اپنے آپ کو وابستہ کرنا ہوگا۔ انھیں تصورات سے کائنات کی نجات وابستہ ہے۔ اس نظریاتی عہد میں تصورات کی بڑی اہمیت ہے لیکن افراد کے بغیر تصورات محض تصورات رہتے ہیں اور اُن پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ رسول اللہ کے ذریعہ ہم نے صرف قرآن نہیں پایا بلکہ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، حیدرؓ، ابوذر غفاریؓ اور خالدؓ جیسے لوگ پائے جن کی زندگی میں ہمیں حدودِ بشریت کے اندر خدائے بلند و برتر کے اسماء الحسنیٰ کی عملی جھلک نظر آتی ہے —

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

نہر سویز

بات مصر کی ہو کہ مراکش کی، فلسطین کی ہو کہ قبرص کی، ایران کی یا کشمیر کی، نام ان میں سے کسی کا بھی زبان پر آجائے، ناممکن ہے کہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے ذہنوں میں ماضی قریب کی ماضی بعید تک کے اوراق مسلسل اُلٹنے شروع نہ ہو جائیں۔ ان اوراق کو اگر مرتب کر کے جامع تاریخ کی صورت دے دی جائے تو یہ حوادثِ عالم کی نہایت ہی بھیانک تصویر ہوگی۔ [illegible] انگلستان کی قیادت میں یورپی حکومتوں کا گٹھ جوڑ، صلاح الدین ایوبی پر تاخت، مسلم ممالک میں ریشہ دوانیاں، مسئلۂ مشرقِ قریب کا شاخسانہ،

نسلیت و وطنیت پرستی کا پروپیگنڈا، علوم و فنون کے بھیس میں حملے، سلطنت عثمانیہ (ترکی) کی عریض و وسیع مملکت کے حصے بخرے کرنے کی سازش، ترکی کے خلاف یونان کو اکسانا، مصر پر قبضہ، ہندوستان پر تسلط، بحرِیت کے خزائنِ ارضی کی لوٹ کے لئے شاطرانہ چالیں، فلسطین میں قدم جمانے کی فکر، ۱۹۱۱ء میں برطانیہ و فرانس کا باہمی معاہدۂ قرناتی (جس کی رو سے برطانیہ نے فرانس کو مراکش میں اور فرانس نے برطانیہ کو مصر میں لوٹ کھسوٹ کے لئے آزاد و بے لگام چھوڑا اور ایک دوسرے کو سہارا دیتے رہے) پھر ۱۹۰۷ء و ۱۹۰۸ء کی فضائے مشرقِ اوسط، بلقان کو ورغلانا، ۱۹۱۲ء کی جنگ میں عربوں کو ترکوں سے پھاڑنا، مشہور انگریز جاسوس ٹی لارنس کی سازشیں، ۱۹۱۷ء میں جنرل ایلنبی کا فلسطین میں فاتحانہ داخلہ اور برطانوی سلطنت کے وزراء کی طرف سے جنرل ایلنبی کو مبارکباد کا تار بھیجنا (تار یہ نہ تھا کہ فتح و کامرانی مبارک، بلکہ یہ تھا کہ "صلیبی جنگ کا خاتمہ آج ہوا") دورانِ جنگ (۱۹۱۴ء۔۱۹۱۸ء) میں بیک وقت تین تین معاہدے کرنا، ایک شریف حسین سے کہ جنگ کے بعد جزیرۃ العرب آزاد عرب اسٹیٹ ہوگا۔ دوسرا یہودیوں سے کہ فلسطین یہودیوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ تیسرا فرانس سے کہ جزیرۃ العرب کو مالِ غنیمت کی طرح آپس میں کس کس طرح تقسیم کیا جائے گا۔ اور پھر مجلس اقوام کا ڈھونگ رچا کر اپنے عیارانہ مقاصد کی تکمیل کرنا۔ وہ مجلسِ اقوام جس کی تعریف میں علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

یہ سارے واقعات، رفتارِ عالم کی صحیح سوجھ بوجھ حاصل کرنے کی خاطر ایک مورخ، ایک مفکر، ایک ہوش مند انسان کے لئے پیشِ نظر رکھنے بے حد ضروری ہیں۔ یہ مسئلہ صرف سیاسی ہی نہیں، اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور انسانی بھی ہے۔ اس میں حق و صداقت، انصاف و عدالت، افکار و تصورات و اقدارِ حیات بھی پامال ہو رہے ہیں۔

نہرِ سویز اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ ایک مصنوعی نہر ہے۔ بحرِ روم اور بحرِ احمر کو ایک دوسرے سے ملاتی ہے، اس کا وقوع ۳۰-۲۰ عرض البلد شمالی اور ۲۰-۳۰ طول البلد مشرقی پر ہے۔ جنوب میں بحرِ احمر ہے، شمال میں بحرِ روم، مغرب میں مصر اور مشرق میں حجاز و فلسطین۔ یہ نہر کوئی سو میل لمبی ہے، چار ہزار سال پہلے فرعونِ مصر نے کھدوائی تھی پھر بند ہو گئی۔ پھر کھودی گئی۔ اس طرح مسلمانوں کا دور آیا تو پھر پٹ چکی تھی۔ مصر کے گورنر عمرو بن العاص نے خلیفۂ دوم (حضرت عمر ابن الخطاب) سے اجازت چاہی کہ اسے کھود کر دونوں سمندروں کو ملا دیں، مگر خلیفہ نے جواب دیا کہ "خبردار اگر تم نے ایسا کیا تو رومی تمہیں کھا جائیں گے"۔ مگر اس نہر کو ایک دن کھُدنا تھا اور مسلمانوں کو اہلِ یورپ کا لقمۂ تر بننا تھا۔ ۱۸۶۹ء میں فرانسیسیوں نے خدیوِ مصر کو شیشے میں اتار کر یہ نہر تیار کر دی، اور جب سے یہ نہر سیاسی بازیگری کا اکھاڑہ بنی ہوئی ہے اور نہ جانے کب تک بنی رہے گی۔ یہ نہر دروازہ ہے ایشیا کا یورپ کا اور افریقہ کا۔ لیجئے برطانیہ کے مشہور وزیر مسٹر ایمری کی وہ تقریر پڑھیئے جو آج سے بیس سال پہلے بہ سلسلۂ فلسطین برطانوی پارلیمنٹ میں انہوں نے کی تھی، اس میں نہرِ سویز کی بیش قیمت کڑیوں کا تذکرہ موجود ہے، کہتے ہیں کہ

"ڈیفنس کے لحاظ سے فلسطین کا محلِ وقوع نہایت اہم ہے گویا کلیپنم جنکشن (لندن کا سب سے بڑا جنکشن) ہے یہ ایک ایسے مقام پر واقع ہے جو انگلستان اور افریقہ اور ایشیا کے ہوائی راستوں کا مرکز ہے، بحرِ روم کے جدید حالات میں اس کی بحری حیثیت بھی حد درجہ اہم ہے۔ قبرص، فلسطین اور مصر پر اگر مضبوطی کے ساتھ قبضہ رکھا جائے تو اس سے نہ صرف نہرِ سویز کو کھلا رکھنا ممکن ہوگا، بلکہ تمام مشرقی بحرِ روم پر بھی قبضہ رہ سکے گا۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ حکم برداری (انتداب) کی رو سے ہمیں فلسطین میں کوئی بحری مرکز قائم کرنے کی اجازت نہیں تاہم اگر حیفہ کو ترقی دے کر بحرِ روم کی ایک زبردست بندرگاہ اور تجارتی مرکز بنا دیا جائے نیز اسے تیل کی فراہمی کا ایک بڑا ذخیرہ قرار دیا جائے (جبکہ لڑائی کے زمانے میں کسی دوسری جگہ سے ہمیں تیل نہ مل سکے) تو اس کے نتائج و ثمرات نہایت اہم ہوں گے یہ بھی ممکن ہے کہ حیفہ اور عقبہ کے درمیان ریل کی آمدورفت جاری کی جائے جس سے نہرِ سویز کے لئے ایک راستہ اور کھل جائے گا۔۔۔"

کیا واقعی ان تقریروں اور ان منصوبوں کی روشنی میں، نہرِ سویز کا تنازعہ، فقط اس بات کا جھگڑا ہے کہ نہرِ سویز سے گزرنے والے جہازوں کی راہ بند نہ ہو؟ — تاریخِ ماضی سے استصواب کیجئے۔

یارانِ نکتہ داں

نگاہوں کے سامنے اگر کوئی منزل موجود ہو تو پھر راستے کی دشواریوں، پریشانیوں اور غیر متوقع حادثات کا تذکرہ کچھ اچھا نہیں لگتا وہ کونسا کام ہے جس کی تکمیل بغیر کسی جد و جہد، بغیر کسی عزم و حوصلہ، اور بغیر کسی لگن کے ہوتی ہو —— ایک اہم چیز یہ بھی تھی کہ پرچہ وقت پر ضرور نکلے اور نکلے تو اپنی مقصدیت سے خالی بھی نہ ہو —— سو شکر ہے کہ خالی نہ رہا —— تاہم اس مرتبہ لطیفہ عجیب ہوا۔ ہاں اب تو اسے لطیفہ ہی کہیئے۔

پچھلے دنوں کراچی کا موسم اچانک، بدل گیا۔ ڈیڑھ دو ماہ تک بارش کا ایک سلسلہ بندھا رہا اور بڑی گڑبڑ رہی۔ اہل کراچی اس کے لئے پہلے سے تیار نہ تھے۔ ادارۂ مہر نیمروز بھی اس کا شکار ہوا۔ کچھ لکھی ہوئی کاپیاں دھل گئیں، کچھ مضامین کاتب کے ہاں سے آخری وقت میں کتابت کے بغیر جوں کے توں واپس آگئے۔ بلکہ جا کر لانے پڑے بعض کی کتابت میں جلد بازی سے کام لینا پڑا کاپیاں جوڑی گئیں تو ساون کی جھڑی نے، بڑی نہیں اندر تک دخل اندازی کی۔ پریس کی چھت میر و غالب کے گھروں کی چھت ثابت ہوئی۔ جو ابر سے زیادہ برسنے کی قائل تھی۔ کاپیاں میز کے نیچے رکھ کر جوڑی گئیں پھر بھی ٹپکوں نے کاپیوں کا خاصہ مطالعہ کیا، "چہ دلاور است" میں "ادبی سراغرساں" کی پٹی سرنامہ سے غائب ہوگئی، دوسری سرخی "مولانا محمد حسین آزاد۔ ڈاکٹر جالنسن بھی" جو معمول کے مطابق چہ دلاور است کی سرخی کے نیچے درج ہونی تھی، اوقت پر داغ دے گئی۔ بعض صفحات پر "خاص نمبر" کی جگہ "اگست ۱۹۷۰ء" لکھا نظر آئیگا۔ بعض جلدی میں غلط جڑ گئے۔ اور جو حروف اُلٹے وہ اُڑ ہی گئے۔ بعض کاپیاں جو نہ جڑنے والی تھیں وہ جڑ گئیں، سادہ جوڑنا تھا۔ وہ دھری رہ گئیں، اور پھر پروف تک دیکھنے کی نوبت نہ آسکی آمد و رفت کے راستے بند اور مطبع ایک جزیرہ نما بنا ہوا تھا —— کتنے مراحل ٹیلی فون پر طے ہوئے۔ یارانِ نکتہ داں میں بھی جو سطریں لکھی ہوئی تھیں وہ کاٹی نہ جا سکیں، اور جو درج ہونی تھیں وہ درج نہ ہو سکیں۔ پھر بھی پرچہ بیٹھ نہ گیا اور وقت پر نکلا، اس کی خوشی ہے ساتھ ہی اسکا افسوس بھی کہ ایسی خامیاں اور غلطیاں رہ گئیں جن پر شرمندگی ہوتی ہے —— شکر ہے کہ ان خامیوں کے باوجود ارباب نظر نے بحیثیت مجموعی پرچے کو پسند کیا اور بہت پسند کیا۔

ادارۂ مہر نیمروز یہ چاہتا ہے کہ یارانِ نکتہ داں کے صفحات پر رسالہ کا یا کسی کی بھی تعریف یا مذمت کی بجائے وہ اہل قلم جو مستقل مضمون لکھنے کی فرصت تو نہ پاتے ہوں، مگر کسی مضمون کو پڑھ کر ان کی فکر جنبش میں ضرور آجاتی ہے۔ اور کوئی مفید لہر ان کے ذہن میں ضرور اٹھ پڑتی ہے، تو وہ اسے خط کی صورت میں قلمبند کر کے بھیج دیں۔ تاکہ وہ لہر کسی باقاعدہ مضمون کے اس ارادے کی نظر نہ ہو جائے جس کے تکمیل کی بمشکل ہی نوبت آتی ہے اور خط لکھنے میں زیادہ اہتمام نہیں کرنا پڑتا —— ان خطوط میں کوئی راہنمائی ہو، کوئی مشورہ ہو، تنقید ہو، کسی غلطی پر انتباہ ہو، کسی معقول بات کی تائید ہو، یا کوئی ادبی لطافت ہو، چاشنی ہو، —— یاران نکتہ داں کے ان صفحات کا اصلی مقصد تو یہی ہے، "یارانِ نکتہ داں" کی سرخی میں نکتہ کا لفظ بھی غالباً اپنا ترجمان آپ ہے۔ مہر نیمروز اپنی تعریف اور حوصلہ افزائی کو بھی اس دائرے سے خارج نہیں سمجھتا بشرطیکہ وہ تعریف اور حوصلہ افزائی بھی اپنے ساتھ کوئی نکتہ علمی و ادبی لئے ہوئے ہو، اور یاں تعریف اتنی بھی نہ ہو کہ ہمیں خاکساری برت کر ان کو حذف کرنا پڑے ابتدائی شمارہ کے خطوط کو چھوڑ کر اب تک جتنے خطوط آئے ہیں ان میں بیشتر یارانِ نکتہ داں نے محسوس کیا ہوگا کہ مہر نیمروز کی تعریف کی اکثر سطریں حذف ہوتی رہی ہیں

بعض حضرات سرسری خیال کے ماتحت بھی خط لکھ دیتے ہیں۔ اس لئے ان کے خط کے آغاز و انجام میں تضاد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے مثلاً ایک صاحب نے رسالے پر نکتہ چینی کی سخت بے دلی کا اظہار کیا اور پھر اسی خط میں دو مضامین کی بے انتہا تعریف بھی کی ۔۔۔۔ پروفیسر اختر اورینوی کے افسانے "مکان کی تلاش" پر ڈاکٹر نصیر نے لکھا کہ "اس میں لذت کم اور خشکی زیادہ ہے" ... ریحان صدیقی نے لکھا کہ "مکان کی تلاش پر بہت سارے خاکے یا اصلاحی افسانے لکھے جاچکے ہیں۔ پروفیسر اختر نے خواہ مخواہ زحمت کی ....." اسی شمارہ میں دوسرے یاران نکتہ داں کے علاوہ رشید جعفری نے لکھا کہ "پروفیسر اختر اورینوی کا افسانہ مکان کی تلاش ایک اچھوتی تخلیق ہے"۔ اور کراچی کے رسالہ نقش نے جو ہر مہینے منتخب افسانے پیش کرتا ہے "مکان کی تلاش" کو اس ماہ کے منتخب افسانوں میں شمار کرکے اپنے پرچے میں نقل کیا ۔۔۔۔ تنقید تو بہرحال اچھی چیز ہے مگر انداز تنقید سے فکر اور زاویہ فکر کی سطح بھی واشگاف ہوتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ یاران نکتہ داں کے صفحات پر جو خطوط آنے والے ہوں ان کو بہت سوچ سمجھ کر لکھا جائے ۔۔۔۔ یہ ایک گذارش ہے جو ادارہ اپنے قارئین سے کر رہا ہے۔ (ادارہ)

قاضی عبد الودود :-

قاعدہ یہ ہونا چاہیئے کہ صرف وہ خطوط شائع کئے جائیں جن میں کسی غلطی کی تصحیح کی گئی ہو یا جن سے پڑھنے والوں کی معلومات میں اضافہ ہو سکتا ہو۔ ایسی تحریریں جن میں صرف تعریف یا مذمت ہے اشاعت کے قابل نہیں،

یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ادارہ نیمروز صحت طباعت کا انتظام نہیں کر سکتا۔ کلیم الدین احمد صاحب نے کبھی ژاک کو جیکوئس اور راسین کو ریساٹن نہ لکھا ہوگا۔ میرے مضمون میں بھی بہت سے اغلاط ہیں بطور نمونہ ایک کا ذکر کرتا ہوں:۔ "دیوان جوشش اس سے خالی ہے اور تذکرۂ میر حسن کے علاوہ شمس البیان اور تذکرۂ شوق اس سے خالی ہے۔ اور تذکرۂ میر حسن کے علاوہ شمس البیان اور تذکرۂ شوق اور گلزار ابراہیم وغیرہ میں محمد عابد سے منسوب ہوا ہے"۔

نیمروز میں تذکرۂ ذکا کے جن نسخوں کا ذکر ہے۔ ان کے علاوہ بھی ایک نسخہ ہے جو میں نے [illegible] میں راجہ پیارے لال الفتی کے بعض اخلاف کے پاس دیکھا تھا مجھے اس کا موقع تو نہیں مل سکا تھا کہ اس کا مطالعہ کروں لیکن اتنا اچھی طرح یاد ہے کہ ضخامت میں نسخۂ لندن سے بہت چھوٹا تھا۔ کچھ دن قبل میں نے دریافت کرنے کی کوشش کی تھی۔ کہ اب کہاں ہے۔ لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ نسخۂ لندن سے متعلق ایک طویل یادداشت میں نے دوران قیام لندن میں قلمبند کی تھی جس کا پہلا ثلث جس میں دیباچۂ تذکرہ کے اقتباسات بھی تھے۔ ضائع ہوگیا لیکن دو ثلث ابتک میرے پاس ہیں، میرے حافظے میں یہ بات تھی کہ دیباچے میں یہ مرقوم ہے کہ تذکرہ [illegible] میں مکمل ہوا اور اس کی تکمیل میں چند سال صرف ہوئے تھے۔ نیمروز میں سال اختتام [illegible] نظر آیا تو میں نے جناب مالک رام کو جنہوں نے تذکرۂ ذکا کا عکس ابھی حال میں منگوایا ہے۔ قطعہ تاریخ کے لئے زحمت دی، اور میں ان کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے یہ قطعہ عنایت کیا :۔

اے ذکا ہو چکا جس روز یہ نسخہ طیار　　آگے ہاتف کے کیا پیر خرد نے مذکور
منتقی کرکے دہی اس نے یہ تاریخ کہی　　آفریں کہہ کہ کیا نام سبھوں کا مشہور

مصرعۂ آخری سے [illegible] نکلتا ہے۔ مگر نیمروز میں "نام" کی جگہ "اسم" ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں [illegible] مستخرج ہوگا مجھے جہاں تک یاد ہے نسخۂ لندن میں [illegible] کے بہت بعد تک کی باتیں مندرج ہیں، ہوا یہ کہ مصنف نے [illegible] میں کتاب تیار کرلی لیکن بعد کو وقتاً فوقتاً اضافے کرتا رہا۔ جو نسخہ لندن میں موجود ہیں۔ تذکرۂ ذکا سے متعلق جو مضمون نیمروز میں شائع ہوا ہے۔ اس میں کچھ اور باتیں محل نظر ہیں لیکن میں ان سے تعرض نہیں کرتا۔

"گمنام شاعر" کا جزو اعظم یہ ہے کہ اس میں حوالے برائے نام ہیں اگر کسی مضمون میں جدید یا افتادہ مطالب ہوں اور حوالے نہ دئے جائیں تو مضائقہ نہیں، لیکن جب یہ باتیں نہ ہوں اور ماخذ کا ذکر نہ ہو تو مضمون ہرگز قابل اشاعت نہیں۔ مضمون میں لکھا ہے کہ تذکرۂ مسرت افزا کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں ہے۔ یہ صحیح نہیں، اس کا مخطوطہ جو منحصر بفرد ہے۔ کتب خانۂ دانشگاہ آکسفورڈ میں ہے اور معاصر پٹنہ میں یہ باستثنائے چند اوراق (آخر) باقساط شائع ہو چکا

۴- ذیل میں ثروت کے تراجم اور اشعار جو تذکرہ مسرت افزا اور تذکرہ عشقی عظیم آبادی (ملک مرقم) میں ہیں پیش کئے جاتے ہیں :-

(۱) مفتی غلام مخدوم ثروت خلف مولوی جمال الدین مولوی (موسوی؟) عظیم آبادی - پدر بزرگوار مدتے در خدمت شاہ عالم .... بجمال ثروت وجاہ بسری برد و سرآمد علمائے حضور بود وقت حدیث خوانی ہمنشین آں قدوۃ السلاطین می شد - چوں بادشاہ از الہ آباد نہضت فرمود، وبسبب بیماری کہ از چندے عارض شدہ بود در الہ آباد متوقف شد آخر ہمونجا برحمت حق پیوست، در قدم رسول مدفون گشت، مفتی غلام مخدوم نیز در ایام قیام .... الہ آباد در خدمت پرشرف اندوز بود وتحصیل علوم درسی می نمود، چوں از حضور بخدمت افتائے عظیم آباد افتخار یافت، راہی آں ضلع شد، ودراں بلدہ بدرس واستخراج مسائل بسری برد، قضارا از دو سال بحسب انقلاب روزگار در..... کلکتہ در قید آب ودانہ گرفتار است - اصل وطن دے پھلواری است از متعلقات آں بلدہ (مراد عظیم آباد) در فن شعر وشاعری مہارت کلی دارد وگاہ گاہے طبع آزمائی می نماید

آتی ہے مجھے یاد تری زلف مسلسل — جب دیکھتا ہوں ابر کی تصویر ہوا پر
ہے آئنے میں عکس ترے خط کا یوں خود — پانی کے بیچ جوں نظر آدے گیاہ سبز
رونے سے میرے ہوگئی مژگاں تمام سبز — باراں سے جس طرح ہوئے بستاں تمام سبز"

(۲) ثروت تخلص، اسمش مفتی غلام مخدوم، خلف مولوی جمال الدین، شاگرد مولوی آیت اللہ جوہری تخلص مردے صاحب جوہر از مشاہیر فضلا واز کبائے قصبۂ پھلواری است، در بدو حال از نا مساعدی طالع العبرت دنا ملائی میگذرانید، آخر بمقدمہ دعوی بہادر بیگ خان بر متروکہ شہباز بیگ خان مرحوم بانعام چہل ہزار روپیہ از سرکار کمپنی انگریز بہادر سرفرازی یافتہ ثروت متمولے بہم رسانید، بالجملہ فاضل مرقوم در اکثرے از علوم، خاصہ در مسائل منطق دخل تمام داشت، از مدتے در شہر عظیم آباد طرح استقامت انداختہ بدرس وتدریس می پرداخت در آخر العمر بیادری طبع ذہانت پیشہ بفن شعر وشاعری رغبت نمودہ فارسی وریختہ ہر دو بطرز خود انجام می داد، ناگاہ باجل طبعی جہان فانی را پدرود نمود - این مطلع از وست :-

آستیں جو ہوگئی دریا ہے دامان اشک سے — چشم یہ کیوں تھی اے چشم گریاں اشک سے

مضمون نگار نے بہجت کو ناصر علی متوفی ۱۱۰۸ھ کا شاگرد بتایا ہے - خدا جانے ان کے نزدیک بہجت کا سال ولادت کیا ہے - ان کے زمانۂ وفات کے پیش نظر یہ تو ناصر علی کا تلمذ بالکل غلط معلوم ہوتا ہے ---- تذکرۂ مسرت افزا (= م) سے بہجت کا آگرہ جانا ثابت نہیں، یہ بات انہوں نے کہاں پائی اس کا پتہ نہیں - شاہ عالم کا استاد ہونا م کے حوالے سے لکھا ہے، لیکن م میں اس کی طرف مطلقاً اشارہ نہیں مضمون نگار نے پھلواری کے اولیائے کی بنا پر سال وفات ۱۲۱۸ھ بتایا ہے، مگر یہ نہیں لکھا کہ کن لوگوں کی تحریروں میں یہ سنہ مندرج ہے صاحب م کا یہ قول کہ شاہ عالم کی الہ آباد سے واپسی کے وقت یہ وہاں موجود تھے، صحیح ہے تو ۱۲۱۸ھ کے غلط ہونے میں شبہہ نہیں - اس لئے کہ شہر مذکور سے رخصت ہونے کا زمانہ ۱۱۸۵ھ ہے (دہلی کا آخری دور)

بہادر بیگ خان کے مقدمے کا مفصل حال م (ص ۱۲۵ تا ص ۱۳۱) میں موجود ہے - اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جھگڑا شہباز بیگ کی منکوحہ اور بہادر بیگ خان میں تھا، حکام پٹنہ نے قاضی محمد سعدی مفتی برکت اور مفتی غلام مخدوم کی رایوں کی بنا پر فیصلہ مؤخر الذکر کے حق میں صادر کیا - مقدم الذکر نے عدالت کلکتہ میں اپیل کی تو قاضی مذکور اور دونوں مفتی اور گواہوں کے ساتھ وہاں طلب کئے گئے - (واقعہ ۱۲۱۱ھ ص ۳۶) کلکتہ میں فیصلہ زوجۂ شہباز بیگ خان کے موافق ہوا اور بقول صاحب م "بہت زرے کہ بہادر بیگ در وقت خود خرچ نمودہ بود، اسباب واجناس وے را آنچہ در کلکتہ وعظیم آباد بود، ہمہ کنانیدہ بزنش بخشیدند وخانۂ مفتی برکت ومفتی غلام مخدوم را بمعہ (کذا) اثاث البیت آنچہ یافتند، فروختہ داخل ترکہ نمودند وبرائے اداے ما بقی زرے کہ از مجموع آمدہ ہر سہ را در زندانخانۂ کلکتہ نگاہ داشتہ ہر چند دوستان وے سعی رہائی نمودند بجائے نرسید - در ینولا شنیدم کہ سہ گذشتہ ایں قضایا بولایت رفتہ است وانتظار رسیدن حکم آنجا دارند وتا آمدن فرمان از سرکار کمپنی برائے ہر یک علوفہ مقرر نمودہ کہ بخاطر جمع باشند،

باید دید چہ حکم می رسد و چساں خلاصی در نصیب شاں میشود " عشقی نے حبسِ انعام کا ذکر کیا ہے اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اگر صحیح ہے تو ولایت کا فیصلہ بہادر بیگ کے حق میں ہوا ہوگا۔ اگر آئندہ کوئی بات اس کے متعلق نظر آئی تو لکھونگا۔

ثروت کا سال ولادت واقعی ۱۲۱۱ھ ہے، تو عشقی کا یہ قول صحیح نہیں کہ آخر عمر میں شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ صاحب م ۱۲۹۱ھ کے لگ بھگ ان کی شاعری کا ذکر کرتا ہے۔ سید حسن عسکری صاحب سے دیوان ثروت کا ذکر آیا تو انھوں نے یہ کہا کہ اس کا ایک نسخہ میرے پاس بھی ہے۔

مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ آزاد انگریزی جانتے تھے۔ کچھ الفاظ معلوم ہوں تو اور بات ہے میں اسے بھی تسلیم نہیں کرتا کہ انھوں نے آبِ حیات اور سخندانِ فارس کی تصنیف میں "مستشرقین یورپ کی علمی کاوشوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے"۔ میں اس وقت صرف اظہار رائے پر اکتفا کرتا ہوں دلائل پیش کرنے کو تیار ہوں

پروفیسر سید احتشام حسین

نیمروز برابر طلوع ہوتا رہا، آپ کے خط ملے، پھر آپ نے غریب خانہ پر آنے کا کرم کیا اور مضمون کے لئے تقاضا فرمایا۔ مضمون تو بڑی چیز ہے میری تساہلی دیکھئے کہ آج خط لکھنے بیٹھا ہوں۔ جب کوئی نیا نیا رسالہ نکلتا ہے تو دو چار نمبر تک مجھے کبھی یقین نہیں آتا کہ یہ چلے گا بھی، کیونکہ ان آنکھوں نے ستارے نکلتے اور ڈوبتے دیکھے ہیں۔ لیکن اب جو یہ دیکھتا ہوں کہ رسالہ وقت پر نکل رہا ہے، اس کا معیار قائم ہی نہیں ہے بلکہ بہتر ہوتا جا رہا ہے اس میں مدیروں کی محنت اور سلیقہ کی جھلک ہے تو یقین ہو چلا ہے کہ اس کے پیچھے ایک لگن کام کر رہی ہے۔ ادبی خدمت کا ایک جذبہ اور جوش ہے دعا ہے کہ رسالہ نکلتا رہے۔ اب کہتا ہوں کہ مجھے اس کا ہر نمبر پسند آیا اور خاص نمبر کا تو پوچھنا ہی کیا، یہ تو واقعی خاصے کی چیز ہے اس کے ہر نمبر میں مفید اور عالمانہ مضامین، دلکش نظمیں، غزلیں اور افسانے شائع ہوئے ہیں کلیم الدین احمد کے مضامین کا ترجمہ حاصل کر لینا آپ ہی لوگوں کا کام تھا، اس کے لئے تمام علم دوست آپ کے ممنون ہوں گے سید وصی احمد بلگرامی کے مضمون میں "مے کہنہ" کا لطف ہے۔ ان کے اور مضامین بھی تلاش کر کے چھاپیئے، نئی نسل بھی تو اس صاحب طرز ادیب سے واقف ہو جسے ہم سب نے بھلا رکھا ہے۔ ادبی سراغ رساں کی کاوشیں قابل تعریف ہیں، جوش کی زبان میں ان سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں ؎

ذرا آہستہ چل کاروانِ کیف و مستی کو کہ سطحِ ذہنِ عالم سخت نا ہموار ہے ساقی

توارد، سرقہ اور استفادہ کی بحث بڑی پیچیدہ ہے، لکھتے وقت اس کا خیال رکھنا ضروری ہے، کوئی مضمون بھی جلد ہی بھیجونگا۔

ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی

معیاری رسالوں کا عام طور پر جو حشر ہوا کرتا ہے۔ بدنفسی دیکھئے۔ اسی کا منتظر تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ دھڑکا اب نہیں رہا۔

پہلا شمارہ حسن احمد اشک نے تبصرے کے لئے مجھے دیا تھا۔ ان کی فرمائش اس لئے اب تک پوری نہ ہو سکی کہ خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہونا طبیعت نے گوارا نہ کیا۔

"یارانِ نکتہ داں" اور "چہ دلاور است" دلکش عنوانات ہیں ان کے ذیل میں اب تک جو کچھ پیش کیا گیا ہے۔ کسی کے "فکر شاعرانہ" کی یاد دلاتا ہے، مرضیاں مختلف، مقصد یکساں، آخر الذکر میں جو کام سراغ رساں کے سپرد ہے۔ اول الذکر میں خود ہم سے لے لیا جاتا ہے۔ اور ہمیں خبر نہیں ہوتی۔ پہلے جب کبھی کوئی رسوا ہونا چاہتا تھا۔ شعروں کے انتخاب پر اتر آتا تھا، اور بڑی کاوش، زحمت اور عرق ریزی کے بعد یہ سعادت نصیب ہوتی تھی۔ اب نیمروز نے یارانِ نکتہ داں کا مستقل عنوان قائم کر کے یہ مشکل آسان کر دی ہے ـــــ خدا اس دام سے محفوظ رکھے۔ آمین ثم آمین۔

ادبی سراغرساں سے میرا سلام کہئے اور ساتھ ساتھ یہ پیام بھی کہ

نوا را تلخ ترمی زن چوں ذوقِ نغمہ کم یابی

پر عمل نہ کریں، اس لئے کہ یاروں میں "ذوقِ نغمہ" کی کمی نہیں، فراوانی ہے۔

ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی

چو کفر از کعبہ

شمع سے شمع روشن ہوتی ہے ــــــ درست !

چراغ سے چراغ جلایا جاتا ہے ــــــ بجا !!

جلائیے، خوب جلائیے اور اچھی طرح جلائیے منع کون کرتا ہے۔ مگر ذرا صاحبِ چراغ کو

بے چراغ نہ کیجئے

غالباً یہ منت رہے مبادی النظر میں محض " دلچسپ " مگر درحقیقت ایک سوچی سمجھی عظیم الشان تحریک کا جو " نیم روز " کے صفحات سے اٹھی ہے اور اس عزم کے ساتھ اٹھی ہے کہ " ادب " میں چوری اور چور بازاری کی عالمگیر وبا کو عام نہ ہونے دے گی۔

شعر و شاعری میں سرقہ، توارد، اور استفادہ کی داستان بڑی پرانی ہے۔ نکتہ چینوں کا کہیں کب کی ان تک پہنچ چکی ہیں اس لئے اب انہیں وہ ندرت اور جاذبیت باقی نہیں رہی جو پہلے کبھی تھی۔ بڑی ضرورت تھی کہ اردو ادب کا نثری سرمایہ بھی اسی طرح کھنگالا جاتا جس طرح مختلف دور کے شعراء کے دواوین کو چھان بین کی گئی ہے۔ شکر ہے یہ ضرورت اب پوری ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

کسی کی متاع پر ہاتھ ڈالنا یقیناً بری بات ہے۔ لیکن حق کو باطل اور باطل کو حق کر دکھانے کی کوشش بھی کوئی مستحسن اقدام نہیں۔ موازنہ، مقابلہ یا تنقید کا مقصد فنکار کا درجہ متعین کرنا ہے، عیب جوئی یا عیب پوشی ہرگز نہیں۔ بے جا تنقیص یا بے محل تعریف، قدرتِ انتقاد کی توہین ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ لوگ کیسے قدرت کے اس عطیہ کی توہین کو گوارا کرتے ہیں۔ اور کیوں اس کا گلا گھونٹنے پر آمادہ ہیں۔

ہم نہاد ادیبوں، انشاء پردازوں اور تنقید نگاروں کو چھوڑیئے۔ اچھے اچھوں اور بڑے بڑوں پر نظر ڈالئے تو بھی بہ استثنائے چند سب ہی ایسی روش پر مصروف خرام نظر آتے ہیں۔ یہ ادب کی بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے کہ جس سے اس کی امیدیں وابستہ تھیں اور ہیں وہی آسیب اس اور مایوس کر رہے ہیں۔ یہ ہے کہ تنقید کا جو انبار آج ہمارے سامنے ہے اس کا زیادہ حصّہ گمراہ کن ہے۔ اس صحبت میں اسی قسم کے ایک تنقیدی نمونے کا تجزیہ مقصود ہے

مولوی عبدالحق صاحب، ڈاکٹر عبادت کی تالیف " اُردو تنقید کا ارتقاء " کے مقدمہ میں لکھتے ہیں :-

" ایک عجیب بات ہے کہ ہماری تعلیمی، علمی، ادبی اصلاح کی ابتداء ان لوگوں کے ہاتھوں ہوئی جو انگریزی زبان، مغربی خیالات و تمدن سے ناآشنا تھے۔ سرسید احمد خاں ان کے سالار اور محرک تھے . . . . . یہ انہیں (سرسید) کا فیض اثر تھا کہ فارسی زبان میں حالی، نذیر احمد، آزاد اور شبلی جیسے زبردست ادیب پیدا ہوئے جو اپنے اپنے رنگ میں باکمال استاد ہیں۔ یہ سب بعضہٖ صاحب سید احمد خاں اور حالی خود ساز و خود ساختہ تھے حالی کا مرتبہ ان سب میں بلند ہے۔ وہ جدید شاعری نیز نثر، جدید تنقید، جدید سوانح نویسی بلکہ جدید اُردو ادب کے بانی ہیں اور ہندسرے مقلد "

قطع نظر اس سے کہ یہ بیان متضاد خیالات کا مجموعہ ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے یہ کہنا بھی درست نہیں کہ سرسید، نذیر احمد، آزاد، حالی، اور شبلی۔ "مغربی خیالات" سے ناآشنا تھے۔ کیا ان بزرگوں کی تصنیفات کا رُخ اُس زمانہ کی عام روش اور انداز سے بالکل مختلف نہیں۔ اور کیا یہ انقلاب بلا کسی تحریک یا بلا کسی سبب اور بلا کسی خارجی اثر کے خود بخود معرضِ وجود میں آگیا۔ اگر ایسا نہیں ہے اور قطعاً نہیں ہے تو ماننا پڑے گا کہ یہ بزرگ انگریزی زبان سے واقف نہ ہوں لیکن یہ اگر براہ راست نہیں تو بالواسطہ ضرور مغربی خیالات سے آشنا تھے۔ اس استدلال کو چھوڑیئے ممکن ہے اس میں زیادہ وزن نہ ہو۔ آیئے دیکھیں کہ اس سلسلے میں مؤرخین اور ناقدینِ ادب متفقہ طور پر کیا کہتے ہیں۔ (طوالت کے خوف سے یہ بحث سرسید اور حالی تک محدود رہے گی)

پہلے سرسید کو لیجئے کیونکہ بقول مولوی عبدالحق صاحب وہی اس قافلے کے سالار اور محرک ہیں۔ اور دیکھئے کہ یہ دعویٰ (مغربی خیالات سے ناآشنا تھے)۔ کہاں تک صحیح ہے۔

الف:۔۔۔۔ وہ (سرسید) انگریزی تصورات اور نظریات سے مالا مال واپس آئے۔ وہ عقلیت کے مشعل بردار تھے۔

"He (Sir syed) came back rich with English ideas and conception. He was the torch bearer of Reason."[1]

ب:۔ وہ بیرونی اثرات کے پروردہ ہیں، جو تصورات وہ وکٹوریائی فکر سے مستعار لائے تھے انہیں کا ظہور انکی شاندار سرگرمیوں اور تحریروں میں ہوا۔

He (Sir syed) was a child of foreign influence The ideas which he borrowed from victorian thought manifested themselves in the stupendous activity which he displayed in his writings during this period"[2]

ج:۔

(سرسید) کے سفر (انگلستان) کا مقصد سید محمود کی تعلیم کے علاوہ، ولایت کے طریقہ تعلیم کا مطالعہ اور مشاہدہ تھا لندن میں .... مشاہیر اور عمائد ملک سے ملاقات کی .... بعض کلب کے ممبر بنائے گئے وہاں کی یونیورسٹیوں۔ کتب خانوں عجائب خانوں اور کارخانوں کو غور سے دیکھا۔[3]

د:۔

"۱۸۶۹ء میں (سرسید) اپنے بیٹے مسٹر محمود کے ساتھ ... ولایت گئے اور اہل یورپ کے طرز معاشرت اور اخلاق و عادات اور نیز اُن کے سیاسی اور تعلیمی انتظامات کا مطالعہ خوب کیا ...... اور نیز مسلمانوں کے واسطے ایک رہائشی کالج ولایت کے آکسفورڈ اور کیمبرج کالجوں کے انداز پر ہندوستان میں کھولنے کا خیال پیدا ہوا ..... یہاں (ہندوستان) آکر انہوں نے اپنا مشہور و معروف ماہوار رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا جس کے مطالعہ سے مسلمانان ہند کے

---

[1] Urdu prose under the influence of sir syed ص۱۲

[2] " " " " " " " ص۲۰

[3] داستان تاریخ اردو ص۲۶۹

خیالات میں ایک انقلاب عظیم رونما ہوا۔" [1]

مذکورہ بالا بیانات کے علاوہ سرسید کا تقریباً ڈیڑھ انگلینڈ میں قیام اور وہاں کی واپسی پر تہذیب الاخلاق کا اجرا صرف یہی ثابت نہیں کرتا کہ وہ نہ صرف مغربی خیالات سے پوری طرح واقف بلکہ مغربی تمدن اور معاشرت سے بھی نا آشنا نہیں رہے تھے۔

سرسید کے اجتہاد میں انگریزی انشاپردازی کو بہت دخل ہے۔ سرسید نے "تہذیب الاخلاق" میں بکثرت مضامین انگریزی سے ترجمہ یا اخذ کر کے لکھے خصوصاً انگریزی انشاپرداز ایڈیسن اور اسٹیل کے طرز سے وہ خاص طور پر متاثر ہوئے ایڈیسن اور اسٹیل کا انگریزی ادب میں جو درجہ ہے وہ سرسید کو اردو انشا میں حاصل ہوا یعنی قدیم اور تصنع آمیز انگریزی کو سدھا رنے میں ان دونوں انشاپردازوں نے جان توڑ کوشش کی اور ایڈیسن کے اخبار اسپکٹیٹر نے انگریزی زبان والوں پر جو احسان کیا جو "تہذیب الاخلاق" نے اردو پر کیا ہے۔ تہذیب الاخلاق کا سلجھا ہوا انداز بیان اور بے ساختگی ایڈیسن اور اسٹیل کے کارناموں کے مطالعے کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے سرسید نے خود اس کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے: ـ

"ہم نے نامی یورپ کے عالموں ایڈیسن اور اسٹیل کے مضامین کو بھی اپنی طرز اور اپنی زبان میں لکھا ہے۔ جہاں کہ ہم نے اپنے نام کے ساتھ A.D اور S.R کا اشارہ کیا ہے۔ اور اپنی قوم کو دکھایا ہے کہ مضمون لکھنے کا کیا طرز ہے اور ہماری زبان اردو میں اُن خیالات کو ادا کرنے کی کیا کچھ طاقت ہے اور اگر ہماری قوم اس پر متوجہ ہو تو کس قدر اور کیا دلچسپی اور صفائی اور سادگی اس میں پیدا ہو سکتی ہے۔"

"اردو ادب کے باقی" حالی نہیں ہیں: ـ

کیونکہ "حالی اِن کی (سرسید) شخصیت سے حد درجہ متاثر ہوئے زندگی اور ادب دونوں کو تنقیدی زاویۂ نظر سے دیکھنے کا خیال اُن کے اندر سب سے پہلے سرسید نے پیدا کیا" [2]

"اردو ادب کے بانی" سرسید ہیں: ـ

وہ سرسید جنھوں نے اپنی فراست سے اردو زبان کو صحیح راستہ پر ڈالا۔ اور اُسے اس قابل بنا دیا کہ وہ ہر قسم کے مضامین کی متحمل ہو گئی۔

وہ جس نے "سائنٹفک سوسائٹی" قائم کی تاکہ مختلف علوم و فنون کی کتابیں ترجمہ ہو کر اردو ادب کے ذخیرے کو وسعت دیں۔

وہ جس نے "تہذیب الاخلاق" جاری کیا جس کی بدولت ہمارے ادب و انشا کا رُخ بدل گیا تصنع کی جگہ سادگی اور اصلیت نے لی عبارت میں سنجیدگی اور پختگی آئی۔

وہ جس نے پہلی مرتبہ مختلف موضوعات پر قلم اٹھانے کی جرأت کی اور ہر ایک کا حق پورے طور پر ادا کر دیا۔

وہ جس کے فیض انہوں نے حالی کو حالی اور شبلی کو شبلی بنایا [3]

وہ جس کے شاندار اور گوناگوں ادبی کارناموں کا ذکر شبلی جیسا "وحید العصر اور یکتائے زمن مورخ [4] ان الفاظ میں کرتا ہے

الف: ـ "فارسی اور اردو میں بڑے بڑے شعرا اور نثار گزرے ہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا۔ جو تمام قسم کے مضامین کا حق ادا کر سکتا۔ فردوسی بزم میں رہ جاتا ہے۔ سعدی رزم کے مرد میدان نہیں۔ ظہوری صرف مدحیہ نثر لکھ سکتا ہے۔ برخلاف اس کے

---

[1] :ـ تاریخ ادب اردو (حصہ نثر) صفحہ ۴۵

[2] اردو تنقید کا ارتقاء ص ۱۴۳　　　[3] عبدالحق صاحب (اردو تنقید کا ارتقاء)

[4] دیکھئے حالی کی نظم "مسلمانوں کی تعلیم"

سرسید نے اخلاق، معاشرت، پالیٹکس، مناظرِ قدرت وغیرہ وغیرہ سب پر لکھا ہے۔ اور جو کچھ لکھا ہے لاجواب لکھا ہے[1]

ب: — جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ اُن کی (سرسید) اصلاح کی بدولت ذرے سے آفتاب بن گئیں انہیں ایک اردو لٹریچر بھی ہے . . . . ملک میں آج بڑے بڑے انشاپرداز موجود ہیں جو اپنے اپنے مخصوص دائرۂ مضمون کے حکمران ہیں لیکن انہیں سے ایک شخص بھی نہیں، جو سرسید کے بارِ احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو بعض بالکل اُن کے دامنِ تربیت میں پلے بعضوں نے دور سے فیض اٹھایا ہے بعض نے مدعیانہ اپنا راستہ الگ نکالا ہے تاہم سرسید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد ہو کر کیونکر رہ سکتے ہیں"[2]

وہ جس کے کمالات کا اعتراف اپنے وقت کے سب سے زیادہ رنگین قلم مصنف (جس کے لئے مسٹر عبدالماجد نہیں، مولانا عبدالماجد دریابادی جیسا ثقہ اور متشدد عالم "انشائے عریاں" کے جواز کا فتویٰ دیتا ہے) مہدی الافادی مرحوم نے وقتاً فوقتاً اس طرح کیا ہے : —

۱ — ". . . . آج ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نئے خیال والوں میں معزز مستثنیات کے سوا (اگر ہوں) کوئی اس لائق نہیں کہ سرسید تو بڑی چیز تھے حالی و شبلی کی طرح دو سطریں بھی لکھ سکے[3]

۲ — "سرسید کے بعد اردو لٹریچر کی جان کے لالے پڑ گئے اور میں نہیں جانتا کہ کانفرنس نے بالذات یا بالواسطہ کہاں تک اُن حریفانہ کوششوں کی مقاومت کی ہے جو اس معصوم زبان کو صفحۂ ہستی سے معدوم کرنا چاہتے ہیں"[4] ۔

۳ — سرسید نے ادب اور معقولات پر جس حد تک مجتہدانہ رنگ چڑھایا، دراصل اُن کی اولیات میں داخل ہونے کے لائق ہے۔ یہ انہیں کے قلم کی آواز بازگشت ہے جو ملک میں بڑے بڑے مصنف کے لئے دلیلِ راہ بنی آج جو خیالات بڑی آب و تاب اور عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ مختلف لباس میں جلوہ گر کئے جاتے ہیں، دراصل اسی زبردست اور مستقل شخصیت کے عوارض ہیں ورنہ پہلے یہ جنسِ گراں با وصف استطاعت اچھے اچھوں کے دسترس سے باہر تھی۔ سرسید کے کمالاتِ ادبی کا اعتراف ناشکری نہیں بلکہ تاریخی غلطی ہوگی[5]

یہ بڑے بڑے مصنف کون تھے؟ کیا حالی کا شمار ان بڑے مصنفوں میں نہیں ہوتا۔ اور کیا آزاد اور شبلی، نذیر احمد اور چراغ علی، محسن الملک اور وقار الملک وغیرہم کے نام اس فہرست سے خارج کئے جا سکتے ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے اور قطعاً نہیں ہے۔ تو صرف حالی کو "خودساز و خودآموز" جیسے معزز خطاب سے نواز کر سرسید کے پہلو میں بیٹھنے کا شرف بخشنا، بلکہ ایک طرح سے سرسید کا حریفِ مقابل بنا کر پیش کرنا ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی تکذیب خود حالی کی تحریروں خصوصاً حیاتِ جاوید سے ہوتی ہے۔ حالی کی نظروں میں سرسید کی جو اہمیت تھی۔ ان کے کارناموں کو وہ جس نظر سے دیکھتے تھے، ان کی بڑائی اور برتری کا جس جس طرح انہوں نے اعتراف کیا ہے۔ اس کا اندازہ "حیاتِ جاوید" پر شبلی کے اُن تنقیدی اشاروں سے بھی ہوتا ہے جو کہیں کہیں اُن کے مکاتیب میں جھلک پڑے ہیں۔ شبلی کا "حیاتِ جاوید" کو کتاب المناقب، یک رخی تصویر، مدلل مداحی اور بقول مولوی عبدالحق "کذب و افتراع کا آئینہ"[6] تک کہنا کیا حالی کی اُس عقیدت، محبت اور احترام کو متعین نہیں کر دیتا جو درحقیقت نتیجہ ہے سرسید کے کمالات کے اعتراف کا۔

حالی سرسید کے حلیف تھے۔ اور اس پر انہیں خود بھی ناز تھا۔ حریف ہوتے تو وہ راستہ ہی انہیں نہ ملا ہوتا جس پر چل کر انہیں "شہرتِ عام اور بقائے دوام" کے دربار میں جگہ ملی۔ حالی کے لئے یہی فخر کیا کم ہے کہ وہ سرسید کے اُن بے لوث اور مخلص رفیقوں میں سے ایک تھے جنہوں نے علی گڑھ تحریک کو آگے بڑھانے اور

[1] مقالاتِ شبلی جلد دوم (مطبع معارف) ص ۱۱۱ — [2] مقالاتِ شبلی جلد دوم ص ۵۰
[3] افاداتِ مہدی (پہلا ایڈیشن) ص ۶۴ — [4] افاداتِ مہدی ص ۹۵
[5] [illegible] ص ۱۵۰ — [6] [illegible] تاریخ ادبِ اردو ص ۵۱۶

ب بدلنے میں انکا ہاتھ بٹایا اور اس طرح اُردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی تقدیر بدلنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے ۔

سرسید کے ہوتے "اجتہاد" کا حق کسی کو بھی نہیں پہونچتا ۔ رہبر اور راہی ایک ہی سطح پر نہیں لائے جاسکتے مقتدی اور امام کے فاصلے کو مٹا دینا امام کی تذلیل ت ہوتی ہو، عدل و انصاف کی رسوائی کا موجب ضرور ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ "اُردو تنقید کے ارتقا" کے مقدمہ نگار نے بڑی خوبی اور خوبصورتی سے ام نکالا ہے ۔ اور حالی کو "خودساز و خود آموز" کہہ کر پہلے سرسید کے اور نقادوں پر جائز یا ناجائز طور پر اُن کی فضیلت ثابت کی ہے اور سرسید کا مدمقابل ٹھہرایا پھر انہیں "جدید شاعری نیز نثر ۔ جدید تنقید ۔ جدید سوانح نویسی" یہانتک کہ "جدید اردو ادب" کا بانی کہنے سے بھی دریغ نہیں کیا ہے

آخر میں صرف اسقدر اور عرض کرتا ہے کہ فاضل مقدمہ نگار کے مذکورہ بالا بیان میں جیسا کہ شروع میں عرض کرچکا ہے تضاد کی کیفیت بھی نظر آتی ہے

سرسید "سالار" "محرک" "سرچشمۂ فیض" بھی ہیں اور "مقلد" بھی ؟

العجب ثم العجب

رائی کو پہاڑ اور پہاڑ کو رائی بنانے کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہوسکتی ہے ۔

محمد امین زبیری

اقبال اور فقہ جدید

ملا، صوفی، عالم، فقیہ اور واعظ و ناصح قدیم الایام سے ہمارے شاعروں کے تیروں کا نشانہ رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی کچھ کم تیر نہیں برسائے اور ایک ادیب و فاضل بزرگ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے ان کو جمع کر کے ایک دلچسپ مقالہ "اقبال اور ملا" بھی تالیف فرما دیا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"حضرت اقبال دیکھتے تھے کہ ملا کے پاس اپنی دین داری کا فقط یہ ثبوت رہ گیا ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ پابندی سے نماز پڑھتا ہے۔ لیکن نماز کا بھی ایک مغز ہے۔ اور ایک اس کا چھلکا، ایک اس کی صورت ہے اور ایک اس کے معنی، ایک اس کا ظاہر اور ایک اس کا باطن، اقبال کا تجربہ کچھ عام لوگوں کے تجربہ سے اس بارے میں الگ نہ تھا کہ ملا کی نماز محض اعضاء و جوارح کی جنبش اور کچھ الفاظ کی تکرار رہ گئی ہے اس کا کوئی حیات افزا اثر اس کی زندگی پر نہیں ہوتا کیونکہ اس کی یہ میکانیکی حرکت زندگی سے بے تعلق ہو گئی ہے اور اب یہ از روئے قرآن ویلٌ للمصلّین کا مصداق ہے"

راقم کے نزدیک علامہ نے علما کی نسبت نظم میں جو کچھ لکھا وہ الہامی تو نہ تھا بلکہ دوسری کیفیتوں کا حامل تھا۔ اور قدیم اساتذہ کی تبعیت میں تھا علامہ تو ہ کے معتقد اور صوفی کے عقیدت مند علماء کے قدر دان تھے بلکہ ایک حد تک دین العجائز رکھتے تھے۔ یعنی پیری مریدی، زیارت مزارات، مجاذیب اور درویشوں سے عرض حاجات و حصول مراد حتیٰ کہ استخارہ کے بھی معتقد تھے۔ ایک خرقہ پوش ہندو امیر کی صحبت میں حاضری کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے۔ ملا جمال الدین افغانی کے ساتھ دو رکعتیں پڑھنا بھی اصل طاعت اور اس طاعت سے بہتر جانتے تھے جس کا اجر قرآن کریم نے جنت قرار دیا ہے۔

با چنیں مرداں دو رکعت طاعت است
نے کہ آں طاعت کہ مزدش جنت است

نماز کے مغز اور چھلکے کے بیان میں مقالہ نگار نے غالباً اس شعر سے چراغ جلایا ہے :

من ز قرآں مغز را بر داشتم
استخواں پیش سگاں انداختم

نماز کی میکانیکی حرکت تو خود قرآن مجید اور سنت نبوی کی تعلیم ہے۔ اب رہا حیات آفرین اثر تو اس کا واسطہ اس حرکت سے نہیں بے شبہ نماز کا حیات آفرین اثر یہ ہے کہ وہ فحشاء و منکر سے نہی کرتی ہے اقبال کی طرح ہر ملا کو نادر شاہ کا اقتدار حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ حیات آفریں اثر پیدا ہو کہ بقول ایک سوانح نگار کے کائنات اس کے گرد گردش کرے۔ مگر فرائض مخصوصہ کا بہر صورت ادا کرنا لازم ہے۔ کیا نماز کی طرح حج، جہاد اور زکوٰۃ کا بھی ایک مغز ہے۔ اور کیا جب تک وہ مغز حاصل نہ ہو، یہ سب معطل رہیں گے ؟ اب ضرور تھا کہ مغز کی تصریح و تشریح بھی کی جاتی مگر تاہم بھی نہیں کی گئی۔

غرض یہ پورا بیان زور طبع پر منحصر ہے اور خواہ مخواہ علامہ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔

"اقبال اور ملا" میں صفحات ۴۴، ۴۵ پر ایک ملا کا قصہ بھی درج ہے کہ ایک غیر مقلد کے مسجد میں آ جانے سے اس نے مسجد کو دھویا یعنی تطہیر کی
سلف یہاں آیت کے اس جز کا صحیح استعمال نہیں ہوا۔

بلاکہ تمام مسجد پلید ہو گئی ہے کوشش کرکے اس کو پاک کر رہا ہوں "۔ بلاشبہ یہ تشدد نہایت مکروہ ہے۔ لیکن عام نہیں ہے۔ اکثر مساجد میں مقلد و غیر مقلد دونوں نماز پڑھتے ہیں۔ اور علی گڑھ یونیورسٹی کی مسجد تو شیعہ سنی، مقلد، غیر مقلد، اسمٰعیلی، قادیانی، غرض ہر ایک کے لئے کشادہ ہے۔

ملا کے تشدد نے ممکن ہے فساد کرائے ہوں، لیکن اس سے انکار ناممکن ہے کہ مساجد کی رونق اور عوام میں پابندی نماز و روزہ انہی ملاؤں کا طفیل ہے۔

بالعموم پولیس بدنام ہے لیکن کوئی گوارا نہیں کریگا کہ جب تک نیک نام پولیس میسر نہ ہو اس کو تحلیل کر دیا جائے کیونکہ باایں ہمہ بدنامی اس کی ضرورت ہے۔ یہی حالت ملاؤں کے گروہوں کی سمجھ لینی چاہئے۔

دراصل وہ بڑی منحوس ساعتیں تھیں جب ہمارے شعراء نے تصوف کو اپنی سپر بناکر اسلامی معتقدات پر ہی حملے نہیں کئے بلکہ خدائے ذوالجلال کی شان میں بھی گستاخیاں کیں اور یہی بدعت و نحوست فارسی سے اردو میں داخل ہوئی۔ غالب اور خدا تو اقبال اور ملا کی طرح ایک مستقل موضوع مقالہ ہے مگر غالب محض شاعر اور علی الاعلان خیالات سے ہی نہیں بلکہ شراب سے سرمست تھا۔ اقبال تو حکیم الامت اور شاعر اسلام اور مذہب کے شیدائی ہیں تاہم وہ غالب سے بھی بازی لے گئے ہیں وہ کہتے ہیں :-

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے

یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

تقدیر کے قرآنی معانی بدل کر خود معانی پیدا کئے اور پھر خدا کو بھی بندے کے سامنے جھکا دیا۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اپنے مقالہ "اقبال اور ملا" (صفحات ۱۰ و ۱۱) میں لکھتے ہیں :-

"یورپ اور امریکہ کے پاگل خانوں اور امراض نفسی کے شفاخانوں میں بڑی کثرت سے اپنے آپ کو مسیح سمجھنے والے ملتے ہیں۔ یہ مجانین اگر مشرق میں ہوتے خصوصاً خطہ پنجاب میں تو ان میں سے کوئی ذہین دیوانہ بکار خویش ہشیار ضرور اچھی خاصی امت پیدا کر لیتا۔ علامہ اقبال پنجاب کے زندہ دل ہونے کے قائل تھے اور اس کے سادہ دل عوام کی خوبیوں کو تسلیم کرتے تھے۔ لیکن یہ حقیقت ان کو بڑی ناگوار معلوم ہوتی تھی کہ یہ لوگ جلد ہی کسی اقتدار پسند مدعی مذہب کے پیرو بن کر تن من دھن کی قربانی کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ ہندو ہو یا مسلمان اس کو پنجاب بھر میں سرفروش مرید ملتے ہیں۔ . . . . . .

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت	کر لے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد
تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا	ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد
تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے	یہ شاخِ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد
ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے	حریتِ افکار کی نعمت ہے خداداد
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر	چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد

لیکن بقول مصنف "ذکر اقبال" ایسے الہام کا جو وحی کے قریب قریب ہے، حضرت اقبال کو بھی دعویٰ تھا۔ دین میں قرآن کے سوا کسی چیز کو وہ ایسی چیز نہ سمجھتے تھے جس کے سامنے شدت تقلید میں سر تسلیم خم کر دیا جائے۔ گو یا حدیث و سیر اور اطیعوا الرسول پر سر تسلیم خم نہ تھا۔ اگر اقبال کچھ سال اور زندہ رہتے۔ تو اپنے اور گریز کے باوجود زندہ دلان پنجاب ان کو بھی مسیح موعود یا امام آخر زماں بنا لیتے۔

اسی مقالہ میں (صفحہ ۱۳ پر) اقبال کی رائے فقہ جدید کی تشکیل کے متعلق ظاہر کرتے ہوئے خلیفہ صاحب نے ایک فتوے کا بھی ذکر کیا ہے کہ ایک ہندو بیرسٹر

رئیس یحییٰ فروغ

منزل

وہ افق میں نظر آتا ہے فلک بوس نشاں!

یہ نشاں قبلۂ صاحب نظراں ہے کب سے
چشمِ انساں اسی جانب نگراں ہے کب سے
کتنی صدیوں سے اسی سمت میں جاری ہے سفر
گرمِ رفتار جہانِ گذراں ہے کب سے
اُٹھتے آتے ہیں قدم تیز کبھی سست کبھی
قافلہ عزم کے سایہ میں رواں ہے کب سے
ہاتھ آیا نہ کوئی قطعِ مسافت کا طلسم
مضطرب آدمِ بے تاب و تواں ہے کب سے

یہ فلک بوس نشاں، منزلِ یارانِ سفر
قبلۂ اہلِ جنوں، کعبۂ اربابِ خبر
سروِ آزاد کی مانند سرافراز رہا
نہ ہوا، پر نہ ہوا صیدِ تہہ دامِ بشر
روزِ اوّل سے یہی بُعد، یہی دوری ہے
آفرینش سے اسی فصل پہ آتا ہے نظر
فاصلہ کم کسی صورت نہیں ہونے دیتا
مرکبِ شوق کی تیزی سے روانہ ہے اُدھر

اُس فلک بوس نشاں تک نہ پہنچ پائیں گے ہات
آدمی جہدِ مسلسل سے نہ پائے گا نجات
دل کے آئینہ پہ ہوتی ہی رہے گی صیقل
وقت کے ساتھ بدلتے ہی رہیں گے حالات
پائے تحقیق میں زنجیر نہیں پڑ سکتی۔
آگ اگلتا ہوا دن ہو کہ برستی ہوئی رات
غیر محدود ہے جولاں گہہ تہذیب و عمل
متعین ہی نہیں حدِ تگاپوئے حیات

نہ رکا ہے نہ رُکے گا کہیں یہ سیلِ رواں

ذرّے کی موت

شہاب جعفری

چاند کتنا حسیں رات کتنی جواں
صبح کتنی سبک شام کتنی رواں

یہ جہاں وسعتِ بیکراں کا امیں — اس جہاں کا میں اک ذرۂ کمتریں
اپنے محور سے گردش میں چھوٹا ہوا — جیسے چھاگل سے گھنگھرو ہو ٹوٹا ہوا
اپنے سورج سے بچھڑا ہوا تارہ ہوں — اپنی فطرت سے بکھرا ہوا پارہ ہوں
چاند مانگا تو چھوٹا میں پیارے سے — نیند میں گر پڑا اپنے گہوارے سے
یہ زمیں، میری ماں دل سنبھالے ہوئے — مجھ کو بچے کی مانند اچھالے ہوئے
میری بے دست و پائی پہ مسرور ہے — اف مری دسترس سے بہت دور ہے
ان خلاؤں میں میں گر پڑا ہوں کہیں — آہ تنہائی اسے اپنے واقف نہیں
میں نظامِ کشش سے جدا ہو گیا — چاند سے کس قدر فاصلہ ہو گیا
جو افق دیکھتا ہوں لپکتا ہوں میں — خواب میں چل رہا ہوں بھٹکتا ہوں میں
اپنی پرواز پر مجھ کو قابو نہیں — میرے لائق مرے دست و بازو نہیں
ان فضاؤں کو بے وزن پاتا ہوں میں — ان خلاؤں میں دھنستا ہی جاتا ہوں میں
مجھ کو پھینکے ہوئے ہیں زمیں آسماں — مجھ کو ٹھکرا رہے ہیں زمان و مکاں
کوئی مرکز مجھے کھینچ پاتا نہیں — کوئی سیارہ مجھ کو بلاتا نہیں
کب تک آوارہ اور بے سہارا پھروں — کاش اپنی ہی دنیا سے پھر جا ملوں
کاش کوئی ستارہ ہی در کھول دے — کوئی دو بول ہی پیار کے بول دے
راہ میں روک لے، کوئی پا لے مجھے — اب تو کوئی بھی اپنا بنا لے مجھے
اے عتابِ سفر اے تلاشِ سکوں — بس چلے تو طنابِ فلک نوچ لوں
توڑ لوں مہر و مہ شاخِ ایام سے — آج ٹکرا ہی دوں صبح کو شام سے
وہ گھٹن ہے کہ اب دل تو بھر جائیگا — حسرتوں کا جہنم کدھر جائے گا
اپنے اندر کہاں تک سمٹ جاؤنگا — اور اوپر اٹھونگا تو پھٹ جاؤنگا
روح بجلی سی بن کر نکل جائے گی — آہ زنجیرِ لمحات گل جائے گی
آہ ہستی کی بنیاد ہل جائے گی — یہ زمیں جا کے سورج سے مل جائیگی
اک کرن کے سوا اور مری آس کیا — ایک ذرہ تھا میں ذرے کی پیاس کیا
اے مرے چاند اے میرے بختِ سیاہ — میری محرومیوں کا تو رہنا گواہ

نیچے دھرتی ہے اور اوپر آکاش ہے
میرے ہاتھوں پہ اک بے کفن لاش ہے

اک دن

باقر مہدی

خاموش سی حسرت نہ رہے گی اک دن ہر بات پہ حیرت نہ رہے گی اک دن
جاگو کہ یونہی دن نہ گزرنے پائیں یہ عشق کی رحمت نہ رہے گی اک دن
بے نام سی لذت نہ رہے گی اک دن
یہ درد کی راحت نہ رہے گی اک دن
جب شوق کی گرمی سے پگھل جاؤ گی
پھر عشق سے وحشت نہ رہے گی اک دن
اظہار کی جرأت نہ رہے گی اک دن بیزار طبیعت نہ رہے گی اک دن
ہاں خود سے الجھنے کے بھی معنی سمجھو خوابوں کی ضرورت نہ رہے گی اک دن
جذبات میں شدت نہ رہے گی اک دن
باتوں میں حلاوت نہ رہے گی اک دن
کچھ وقت ہے اقرار محبت کر لو
پھر یہ بھی حکایت نہ رہے گی اک دن
یہ حسن کی دولت نہ رہے گی اک دن ہم سے تمہیں نفرت نہ رہے گی اک دن
ہاں زیست کی بازی تو لگاؤ ورنہ پھر دل کی بھی قیمت نہ رہے گی اک دن
رونے کی بھی مہلت نہ رہے گی اک دن
اتنی بھی مسرت نہ رہے گی اک دن
پھر جوشِ جوانی کی نہ باتیں ہوں گی
یادوں میں صداقت نہ رہے گی اک دن
فریاد کی حاجت نہ رہے گی اک دن ہاں تم سے شکایت نہ رہے گی اک دن
یہ دن تو خموشی سے گذر جائیں گے پھر تم سے محبت نہ رہے گی اک دن
یہ روز کی آفت نہ رہے گی اک دن
راتوں کی مصیبت نہ رہے گی اک دن
ہم دونوں ہیں تنہا تو یہ سب باتیں ہیں
ہم دونوں کو فرصت نہ رہے گی اک دن

قاضی سلیم

یاد......

نور افشاں ہے تری یاد کا اک عکس جمیل
صاف و شفاف سے آئینۂ تنہائی پر
خندہ زن ہے جو مری تاب شکیبائی پر

پرفشاں طائرِ خوش رنگ کا لرزاں سایہ
سرِ امواجِ رواں رقص کناں ہو جیسے
اور ماحول کو احساس زیاں ہو جیسے

مطمئن زیست میں یکلخت کمی کا احساس
درد کی ایک کسک جیسے طلب جاگ اُٹھے
آنسوؤں آہوں کا درپردہ سبب جاگ اُٹھے

یہ دیئے جنمیں امیدوں کا لہو جلتا ہے
نور کے ساتھ جہاں سوز تپش دیتے ہیں
بہ ایں تسکینِ دل زار خلش دیتے ہیں

جانتا ہوں کہ بھرے زخم ہرے ہوتے ہیں
لذّت اندوز ہی موہوم فسوں کار بھی ہے
وحشت افروز، جنوں خیز، دل آزار بھی ہے

پھر بھی ایسے میں مگر جانِ سکوں روحِ فراق
چاہتا ہوں کہ یم زیست کی رو کچھ کم ہو
طائرِ وقت کی پرواز ذرا مدھم ہو

سلیم اللہ فہمی
مترجمہ: افسر ماہ پوری

بنگلہ ادب

جدید بنگلہ زبان سنسکرت کی سادہ صورت سے ارتقاء پذیر ہوئی ہے جو پراکرت کہلاتی تھی اور جس کے معنی ہوئے عوام کی۔ عرصہ دراز تک سنسکرت کو مقبول بنانے کی کوششیں جاری رہیں اور اس خصوص میں بہت سی اصلاحیں بھی بروئے کار لائی گئیں۔ نتیجتاً اس کی ہیئتی سختی بڑی حد تک آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔ بالآخر یہ مقامی بولیوں میں گھل مل گئی اور ایک نئی زبان "پراکرت" نے جنم لیا۔ آج ہم اس کے سلسلۂ ارتقاء کے مختلف مدارج بیک نظر آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ پہلے سنسکرت، پھر سنسکرت کی سادہ صورت، پھر سنسکرت اور مروجہ بولیوں کی آمیزش جس سے پراکرت نکلی اور اخیر میں بنگلہ زبان کی پیدائش۔ مگر پراکرت سے بنگلہ تک رجعت ہے۔ وہ اس قسم کی سادہ منطق کی گرفت میں نہیں آتی۔ ان کے باہمی رشتے کسی معینہ اصول کے پابند نہیں۔ قدرتی اثرات کے نئے نئے دھارے اسے اصل سنسکرت سے دور سے دور تر کرتے گئے۔ بنگلہ کے باب میں کسی پر اسرار اثر کے ماتحت یہ کڑیاں ٹوٹ ٹوٹ گئی ہیں۔ بہرحال ایک نئی زبان ہر منزل پر سستا کر تازہ دم ہوتی ہوئی صدیوں کی مسافت طے کرتی رہی۔

بنگال کی ابتدائی ادبی تخلیقات اس اجنبی زبان میں رونما ہوئی۔ جیسے دیو نے اپنے اشعار سنسکرت ہی میں لکھے۔ یہ اشعار کرشن کی عقیدت و پرستش کے مظہر تھے۔ ۔ ۔ ۔ ایک شاعرانہ ودیعت سے متصف پجاری کے موسیقی میں ڈوبے ہوئے بول۔ یہ گیت آنے والی نسل کے لئے ادبی روایت بن گئے۔ دسویں صدی سے تیرھویں صدی تک اس قسم کے گیت "کثرت سے سنسکرت رسالوں میں نظر آتے ہیں۔ اس عہد میں آسان بنگلہ میں لکھے ہوئے کچھ اشعار گوتم بدھ کی منقبت میں بھی ملتے ہیں۔

بنگال صوفیوں اور درویشوں کا ہمیشہ مرکز رہا ہے ان کے اثر سے ہمارے شعراء میں جذبۂ بندگی اور ان کی شاعری میں غنائیت پیدا ہو گئی تھی کیونکہ اشعار پڑھنے کے لئے نہیں لکھے جاتے تھے بلکہ مندر کی گھنٹیوں کی آواز پر گائے جانے کے لئے۔ دوسرے آلات موسیقی اس نغمگی کو اور ابھارتے اور نکھارتے جلتی ہوئی دھوپ کی گہری اور تیز خوشبوؤں میں ایک قسم کا ملکوتی رنگ بھرتے۔ بنگلہ میں اس وقت وقت تک جو کچھ لکھا جا چکا تھا۔ اس کی خود فراموشانہ عبودیت اور والہانہ غنائیت طرۂ امتیاز تھی۔ تیرھویں صدی میں ترکوں نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ بنگال بھی ان کی ترک تاز سے محفوظ نہ رہا۔ تقریباً دو صدیوں تک بنگال کی ثقافتی ترقی قطعی مسدود رہی۔ فرصت و فراغت فنی تخلیقات کے لئے لازمی شرط ہیں یہ صورت حال چودھویں صدی کے وسط میں پیش آئی جب شمس الدین الیاس شاہ بنگال کے تخت پر بیٹھا۔ اور ایک خود مختار حکومت کا اعلان کیا تو بنگال میں پھر امن و امان قائم ہو گیا۔ شاہی سرپرستی ملک کی ثقافت و صنعت کو پھر فروغ دینے لگی۔ کم سے کم پندرھویں صدی میں تین سلاطین اور سولھویں صدی میں ایک سلطان اور تین عمائدین دربار ایسے گذرے ہیں، جنہوں نے تمام درباری شعراء کی جی کھول کر سرپرستی کی۔ دربار کی اس دلچسپی اور سرپرستی کے مثبت پہلوؤں نے مجموعی طور پر بنگال کے شعر و ادب پر دور رس اثرات مرتسم کئے۔ دربار نے تو بعض موقعوں پر خود ہی موضوع تجویز کر دیئے اور ان پر شعراء کو طبع آزمائی کے لئے ابھارا اور ان کا دل بڑھایا۔

جب گوتم بدھ کا فلسفہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہندوستان کا دل موہنے لگا تو ہندو راجاؤں
مذہب شیو بھگتی ہمیشہ بڑی شاعری کے لئے وجہ تحریک رہی ہے
کو محسوس ہونے لگا کہ یہ ان کے مذہب کے حق میں ایک زبردست خطرہ ہے چنانچہ سین اور پال خاندان کا شاہی دربار اکثر ہندو شعراء کو انگیز کرنے لگا اس حقیقت سے قطع
نظر بعض ناگزیر تاریخی وجوہ کی بنا پر اپنی نوعیت و تحریک کے اعتبار سے مذہبی ہوتی ہیں، بنگال میں کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ دربار کو ایک خاص
مسلک کی سرپرستی اور شاعری کی پر زور تائید و سرپرستی کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ لہٰذا بدھ مت کی بڑھتی ہوئی قوت کو توڑنے کی غرض سے شاعری میں شیو بھگتی شدومد
سے ہونے لگی، پھر اس کے بعد تو یہ عالم ہوا کہ شاعروں کے گروہ کے گروہ آتے رہے اور شعر و نغمہ کے لامتناہی سلسلے چھیڑتے رہے، اس وجہ سے عرصہ تک وشنو بھگت ایک
تحریک کے مرادف رہے اور بنگلہ ادب کو متاثر کرتے رہے ایسے میں مسلمان فرمانرواؤں نے صرف یہ کیا کہ ہندوؤں کی اس مذہبی بیداری کو اسلامی حریت روح اور اس کی سطح
فکر کی سیاسی صداقت سے آشنا کر کے اور تیز کر دیا اور یہ خصوصیت اسلام کے سوا اور کہیں نظر نہیں آتی سلاطین اپنی قلمرو میں امن عامہ کو تمام چیزوں پر مقدم سمجھتے
تھے اس پر نہ تو کسی کو اعتراض ہو سکتا تھا نہ حکومت کرنے والوں کی مذہبی سختیوں کے خلاف کسی کو شکایت۔ کیوں کہ خود سلاطین نے شعوری طور پر اپنے درباری شاعروں کو ہندو
موضوعات کے انتخاب پر اکسایا، عوام کی اکثریت کے فائدے کی خاطر سلاطین نے بہت سے قابل و فاضل مترجم مقرر کئے تھے تاکہ ہندومت کی مقدس کتابیں (جو عموماً
سنسکرت میں تھیں) سادہ زبان میں منتقل کی جا سکیں اور انہیں عوام کی دسترس میں لایا جا سکے، یہی وہ تاریخی سبب ہے کہ ہم آج ابتدائی بنگلہ ادب کو ہندو مذہب کی
بڑی بڑی دینی و متبرک کتابوں کے تراجم سے بھرا پڑا پاتے ہیں، ہرچند بنارسی برہمنوں نے اعلان کر دیا تھا کہ وید اور پران کو بنگلہ زبان میں پڑھنے والوں کا ٹھکانا
نرک کے سوا اور کہیں نہیں، پھر بھی کارواں آگے ہی بڑھتا رہا۔

بنگال کے قدیم شاعروں میں ودیاپتی اور چنڈی داس بلاشبہ نابغے کی حیثیت رکھتے ہیں قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہماری زبان کے اولین شعراء
میں سے ہیں لیکن تاریخ میں ان سے پہلے کسی قابل ذکر شاعر کا سراغ نہیں ملتا، وہ دونوں وشنوی شاعر تھے اور ان کے نغمات زیادہ تر محبت ہی کی گہرائی سے پھوٹے
تھے، وہ بیک وقت دیندار بھی تھے اور دنیادار بھی، حقیقت پسند بھی تھے اور رمزیت پرست بھی ...... یہ ذاتی جذبات اور انسانی حدتوں سے لبریز ...
سنسکرت اور مذہب کی تنگنائے سے نجات حاصل کرنے کا زمانہ تھا، جس زبان میں یہ اشعار قلم بند ہوئے، وہ عجیب و غریب تھی ابتدائی بنگالی پراکرت اور سادہ
ہندی کا ایک شیریں امتزاج۔ ادبی روایتیں ملتی ہیں کہ یہ امتزاج کرشن اور رادھا کی دنیائے خواب کی ملکوتی زبان سے کلیتہً مشابہ تھا۔

دونوں میں ودیاپتی زیادہ پڑھا لکھا تھا، مگر چنڈی داس زیادہ چابکدست فنکار تھا ...... جذبات کا بادشاہ جو تراش خراش سے اپنے شعروں کو
سنوارنے اور سہل بنانے میں اپنی مثال نہ رکھتا تھا۔ چنڈی داس انسانی دل کی گہرائیوں میں زیادہ دور تک اترا ہوا تھا جس قدر سبک رفتار سلاست، روانی اس کے
شعروں میں جاری و ساری تھی، اسی قدر وہ انسانی جذبات سے مملو تھا۔

پندرہویں صدی کے ساتھ ہی کرتی باس ...... بنگلہ میں رامائن کا مصنف ...... منظر عام پر آتا ہے کرتی باس، ودیاپتی اور چنڈی داس کی روایات
کا آفریدہ ہونے کی بنا پر وہ ترقی پذیر بنگلہ شاعری میں ایک نئی گیرائی اور ایک نئی گہرائی لے کر آیا۔ اس سے پہلے دونوں بڑے وشنوی شاعروں کا جذباتی آہنگ محدود
ہو گیا تھا، مگر وہ انسانی محبت سے عشقیہ جذبات کی طرف اکثر بہک گئے ہیں، کرتی باس کی جذباتی خصوصیت زیادہ تعمق زیادہ توازن اور زیادہ تنوع رکھتی تھی۔
گور کے حکمراں راجہ گنیش کی سرپرستی میں کرتی باس نے رامائن کا ترجمہ شروع کیا۔ راجا گنیش کی موت کے بعد اس کا لڑکا جو مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا، جلال الدین
محمد شاہ کے نام سے سریرآرائے حکومت ہوا، اس زمانہ کے ہندو پنڈتوں نے بھی اسے فن و ادب کے سب سے بڑے مربیوں میں شمار کیا ہے، پندرہویں
صدی کے وسط میں با اثر درباری شعراء دربار کی دریا دلی سے سرپرستی کرتے تھے، رکن الدین باربک شاہ نے جو پندرہویں صدی کے اواخر میں برسر حکومت
آیا، مشہور شاعر مالادھر کو "گن راج خان" کا معزز خطاب عطا کیا، اس کے بعد حسین شاہ کے عہد تک گور برابر سیاسی شورشوں سے مضطرب رہا، لہٰذا
فنون لطیفہ کی صناعت و ثقافت پر ایک عارضی جمود طاری ہو گیا۔

اس طرح بنگلہ ادب کی تاریخ کی سب سے ابتدائی منزل اختتام پذیر ہوتی ہے اس وقت سے اٹھارہویں صدی کے وسط تک، جبکہ برطانوی

حکومت قائم ہوئی، ہم اسے اس داستان کا دوسرا دور سمجھتے ہیں۔

دوسرا دور

سید حسین ایک نوجوان درباری عہدہ دار تھا۔ مگر وہ محض اپنی ذہانت و مقبولیت کی وجہ سے گوڑ کے تخت پر متمکن ہو گیا۔ سلطان ہونے کے بعد اس نے ایک نیا نام اختیار کیا "سید علاء الدین حسین شاہ" تھا۔ بنگال پر جن عظیم و شریف سلاطین نے فرمانروائی کی ہے ان میں حسین شاہ کافی معروف ہے۔ رعایا کی آسودہ حالی و فارغ البالی ہی اس کا منتہائے نظر تھا۔ دربار ایک مرتبہ پھر مرکز شعر و ادب بن گیا۔ پندرھویں صدی کے اواخر سے سولہویں صدی کے وسط تک بنگلہ ادب کی ترویج و ادب نواز سلاطین اکابر کی داستان بھی ہے جنہوں نے ہندو شعرا کی فرداً فرداً خاطر خواہ ہمت افزائی، دوست گیری اور سرپرستی کی۔

سانپوں کی دیوی منسا کے گیت جو بیجے گپت کی تراوش فکر کا نتیجہ تھے، شاعری کے لحاظ سے آج بھی زندہ ہیں۔ وہ اور اس دور کا ہر شاعر حسین شاہ کی عدل گستری اور نیک دلی کا معترف ہے۔ جو شو راج خاں نے جو حسین شاہ کا ایک جوان افسر تھا سری کرشن کی مدح و ثنا میں بہت سے حسین و جمیل گیت لکھے۔ پراگل خاں حسین شاہ کا ایک عسکری عہدہ دار تھا۔ اس نے چاٹگام کو فتح کیا اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ "مہابھارت پنچالی" جو ایک قابل لحاظ ادبی کارنامہ ہے اور کوندر کے قصوں پر مشتمل ہے، پراگل خاں ہی کی خواہش و ہدایت کے مطابق لکھی گئی تھی۔ پراگل خاں کا لڑکا نصیر الدین نصرت شاہ بنگلہ شاعری کا رسیا تھا۔ کوی رنجن اس کے عہد کا مشہور شاعر گزرا ہے اس کا اسلوب و لہجہ ودیاپتی سے اس قدر ملتا جلتا تھا کہ لوگ اسے "ودیاپتی ثانی" کہا کرتے تھے۔ حسین شاہ کا پوتا علاء الدین فیروز شاہ بھی اپنے باپ دادا کی شاندار روایات سے غافل نہ تھا۔ کوی سری دھر کے "ودیا اور سندر کے معاشقے" پر اشعار فیروز شاہ ہی کی ادب پروری کی مرہون منت ہیں۔ سری چیتن جو مسلک محبت کا ایک مشہور مبلغ تھا حسین کے عہد کی شعر و شاعری پر نمایاں طور پر اثر انداز ہوا۔

سترھویں صدی کی ابتدا ایک سماجی و سیاسی شورش کے ساتھ ہوئی۔ تخت و تاج کا انتقال ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں نہایت تشدد کے ساتھ عمل میں آیا۔ مغل صرف حکومت ہی کرنے آئے تھے۔ پٹھان سلاطین نے گو مدافعت کی مگر پسپا ہو گئے۔ مکند رام کی خود نوشت منظوم سوانح عمری میں سولہویں صدی کے بنگال، اس ہنگامہ خیز دور کے بہت سے نقوش ملتے ہیں۔ مغل قابل حکمراں تھے۔ چنانچہ امن و آشتی کا عہد بھی دوبارہ زندہ ہو گیا۔ شعرا پورے جمال و جلال کے ساتھ دربار کی مدح میں پھر مصروف ہو گئے۔ وشنوی شعرا کا پھر ایک مرتبہ طوطی بولنے لگا۔

پندرھویں صدی میں ہندوستان پر ترکوں کے حملے سے اٹھارھویں صدی کے وسط میں برطانوی حکومت کے قیام تک بنگلہ شاعری بنیادی طور پر غنائی رہی۔ یہ شاعری نہ تو پڑھنے کے لئے تھی اور نہ سنانے کے لئے۔ اس وقت شعر صرف گائے جاتے تھے، چاہے دربار میں، چاہے مندر کی گھنٹیوں کے سر تال پر۔ ڈرامائی اثر پیدا کرنے کے خیال سے سوانگ تک میں موسیقی کا اہتمام ہوتا تھا۔ گویا ایک ناقابل تغیر "آہنگ" سارے شعری محسوسات کو محیط تھا۔ محبت کا جذبہ (بشمول پرستش و عقیدت) تمام شاعرانہ جذبات میں ایک متحرک عنصر کی طرح دائر و سائر تھا۔ موضوعات شاعری بھی شاذ ہی کار و بار دنیا سے تعلق رکھتے تھے۔ دیومالا یا کتب مقدسہ کی برگزیدہ شخصیتیں شعر کا زیادہ موضوع رہیں۔ اشعار کو اس وقت عام طور پر "پنچالی" کہا جاتا تھا کیوں کہ لوگ انہیں مل کر گاتے تھے۔ "پنچالی" ہمیشہ برگزیدہ شخصیتوں یا بعید از فہم اغراض سے متعلق ہوتی۔ مگر کوئی شعری کارنامہ دیوتاؤں یا دیویوں کی ستائش میں ہوتا تو وہ "منگل کوتیا" کی صنف میں شمار ہوتا۔ اگر وہ کسی خاص درجے کی مثالی انسانی ہستی سے وابستہ ہوتا تو اسے "وجے کوتیا" کہا جاتا۔

بنگلہ ادب کے بعض دلچسپ مسائل پر تاریخ کی زبان ...... پراسرار طور پر خاموش ہے۔ گو بنگلہ شعر و ادب کی نشو و نما علم دوست مسلمان فرمانرواؤں کی آغوش میں کافی عرصے تک ہوتی رہی مگر ان پر اسلام کے اثر و نفوذ کی صحیح نوعیت بے نقاب ہونے کو اب بھی باقی ہے۔ فارسی نے درباری زبان ہونے کی وجہ سے ادباب شعر و سخن پر یقیناً گہرے اثرات ثبت کئے ہوں گے۔ بعض قدیم مخطوطات اس حقیقت پر آج بھی شاہد ہیں۔ عوام کی جیتی جاگتی زبان اس سے بھی بڑی دلیل ہے۔ فلسفۂ اسلام کا اس ملک کے چپے چپے میں داخل ہونا سمجھ کر بھلا زری تعدا پاکستان کے مورخوں کو بنگلہ ادب کی تاریخ کے اس غیر مرقوم باب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ایک

بڑی اہم سرگرمی ہے۔

مسلم شعرا کی کہکشاں

سترھویں صدی میں پہنچ کر ہمیں دراصل مسلمان شعرا کی ایک کہکشاں دربار ارکان میں دکھائی دیتی ہے۔ دشنوی شاعری کی روایات کے زیر اثر پنپنے بڑھنے اور پروان چڑھنے کے سبب سے مسلمان شاعروں نے بھی ہندو مذہب کے موضوعات پر کثیر تعداد میں یادگار اشعار چھوڑے ہیں۔ مگر مسلمان شعرا نے بنگلہ ادب کی عمومی ترقی و وسعت کے خصوص میں جو خدمات انجام دی ہیں، وہ اپنی نظیر آپ ہیں۔ تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ وہ انقلابی عنصر تھا جو بنگلہ ادب کو آسمان سے زمین پر لے آیا۔ بنگلہ ادب کو دیوتاؤں کے منڈپ سے کشاں کشاں دنیا سے انسانیت میں آنا پڑا۔ روزمرہ کی زندگی اور اسی دنیا کے بسنے والوں کے موضوعات نے مافوق الفطرت ہستیوں کے افسانوں کی جگہ لے لی۔ غرض یہ کہ ادب کی جڑیں انسانی دل میں پیوست ہوگئیں۔ تاج محمود، سید سلطان، سید مرتضےٰ، علی رضا اور علاء ول اسی دور کے ناقابل فراموش نام ہیں۔ وہ عوامی شاعر تھے اور انھوں نے عوامی ہی اسلوب اظہار پہ بیتی کو اختیار کیا اور اسے عوام ہی کے لئے برتا۔ مذہب و زندگی کے امتزاج کا بہترین اظہار اس قسم کے کارناموں میں ہوا ہے۔ مثلاً سید سلطان کی "جیون (گیان) پردیپ" اور "تانو سادھن" کومی نراین کی "مونسر سوال"۔ محمد علی کی "مرشد بارہ ماسا"۔ محمد خان کی "ایمان گھوڑی" اور "مقتل حسین"۔ دولت قاضی اور علاء ول کی "لتا موین بتی" "لوٹنے چیندر بتی" "پدماوتی" "راگ نامہ" "تال نامہ" "شنسر کی بتی" اور "وخان مالا"۔ اٹھارھویں صدی میں نوابین بنگالہ کے دور اقبال میں بھی شعر و ادب کی ترقی بند نہ ہوئی۔ دربار اپنی پچھلی زریں روایات بھولا نہ تھا۔ اس وقت عیسائی اور پرتگالی مذہبی مبلغین عیسائیت اور بنگلہ زبان کی قواعدی ابتدائی کتابیں شائع کر چکے تھے۔ اسی دور میں نثری کارناموں کی اولین جھلکیاں نظر آتی ہیں اور اسی دور میں ایک مسلمان شاعر حیات محمود نے خاصی شہرت حاصل کی۔ اٹھارھویں صدی میں راج کمار سندر اور راج کماری ودیا کی عشقیہ داستان زیادہ تر شعرا کے لئے بے پناہ کشش رکھتی تھی۔ ورت چند اور رام پرشاد کے نام ان بہت سے طباع شعرا میں ممتاز ہیں، جنہوں نے اپنی طبع آزمائی کے لئے اسی موضوع کو منتخب کیا۔

عصر نو اپنے جلو میں چھاپہ خانے اور رسائل بھی لایا۔ شاعری جرأت سے کام لے کر غنائی نغمات کی نری رسم پرستی کے حدود سے باہر نکل آئی اور ایک زیادہ پیچیدہ اور وسیع ہیئت غنائیہ میں ظہور پذیر ہوئی جسے مطبوعہ صفحات پر پڑھ کر خاطر خواہ حد تک لطف اندوز ہوا جا سکتا تھا۔ ایشور چندر گپت جیسے ممتاز لکھنے والوں کو رسائل نے کافی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ بدیسی حکومت نے بھی اپنے وسیع ذخیرۂ ادب کی طرف بنگال کے نوجوانوں کو پرچایا۔ موجودہ ادبی تخلیقات میں نثر ادب کے زیادہ حصے پھلواری ہوئی سوتر یا ساگر اکوے کمار اس دور کے بڑے نثار ہیں۔ بدیسی ادب کے ارتباط نے بنگلہ ناول، انشائی اور ڈرامائی ادب کی گہرائی و وسعت میں کافی معاونت کی

ادب سے قطع نظر برطانوی اقتدار ملک کے لئے اور وسیع تر اہمیت کا حامل تھا۔ اسے اور واضح طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس نے بنگال کے مسلمانوں کا معاشرتی ڈھانچہ درہم برہم کر دیا۔

پلاسی کی شکست نے مسلمانوں کے مستقبل کو مایوس کن حد تک تاریک کر دیا۔ اس کے بعد قحط نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ مالی امداد کی عدم موجودگی میں دینی ثقافتی ادارے دم توڑنے لگے۔ مساجد سے متعلق اساتذہ و مدارس رفتہ رفتہ ناپید ہونے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے معاشرے کی پوری عمارت زمین بوس ہوگئی۔ انیسویں صدی کا نیا بنگال اس کے ملبے پر تعمیر کیا گیا۔ وہ لوگ جو کچھ پہلے اپنی قسمت کے آپ مالک تھے، بدیسی اقتدار کے سامنے جھکنے پر آمادہ نہ ہوتے۔ وہابی تحریک جو اوائل اول ایک شدید قسم کی مذہب پرستی کی پیداوار تھی بالآخر برطانیہ کے خلاف ایک خونیں جنگ آزادی کے روپ میں منتقل ہوگئی۔ بدیسی حکومت کے خلاف یہ غیظ و غضب شدت اختیار کرتا رہا اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی پر منتہی ہوا۔

نتیجہ ظاہر تھا۔ مسلمان برسر اقتدار طاقت کی ہمدردی سے محروم ہوگئے۔ اسی کے ساتھ ان کا ترقی پذیر اقتصادی و معاشرتی نظام بھی ان کے ہاتھ سے جاتا

رہا اور وہ ثقافتی وقار بھی جس سے ادب و فن کو فروغ تھا۔ انھوں نے دربار کی بدیسی زبان کو منھ لگانے کے لائق نہ سمجھا۔ مگر وہ فارسی و عربی سے اپنے تعلق کو بھی برقرار نہ رکھ سکے۔ جو کچھ وہ کھو چکے تھے اس سے وہ انتہائی سختی سے چمٹے ہوئے تھے۔ انھوں نے نئی صورت حال سے ہم آہنگ ہونے کی پروا نہ کی۔ ان کی روز بروز کمزور ہوتی ہوئی اقتصادی بنیاد، ماضی پہ بے سود غرّہ اور حال سے نہ مٹنے والی نفرت ان چیزوں نے مسلمانوں کو ان تمام ثقافتی سرگرمیوں سے بے تعلق کر دیا جو ان کے گرد ابھری تھیں۔ خود بنگلہ زبان کا ناتا بھی مسلمانوں سے ٹوٹ گیا۔ بنگال کا دار الحکومت کلکتہ قرار پایا۔ اس عالم میں کہ ہندوؤں کی ابھرتی ہوئی نسل حکومت وقت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر عمل پیرا تھی، قدرتی طور پر اب مرشد آباد کے بجائے کلکتہ ثقافتی مرکز ٹھہرا۔

انیسویں صدی کے اوائل سے ہندو احیائی میلان کا اظہار بنگلہ شعر و ادب میں نمایاں طور پر ہونے لگا۔ بہت سے راجاؤں نے اس مقصد کے حصول کے لیے کافی معاونت، حوصلہ افزائی اور سرپرستی سے کام لیا۔ ودیا ساگر سے لے کر بنکم چٹرجی تک یہ دھارا زور سے چلتا رہا۔ راجہ رام موہن رائے نے، جو تاریخی عوامل کی قابل لحاظ بصیرت رکھتے تھے، عوام کو کچھ اور ترقی پسندانہ رجحان اختیار کرنے کی تلقین کی۔ انھوں نے ہندو ثقافتی روایات اور روادارانہ جدیدیت کے مکمل امتزاج سے نوخیز بنگال کو اور مضبوط بنیادوں پر استوار کر دیا۔ نثر میں ودیا ساگر، اکھوئے کمار دت، راجہ رام موہن رائے اور بنکم چٹرجی اور نظم میں ایشر گپت اور مائکل مدھو سدن کے کارنامے ایک ایسے نئے عظیم ادب کے موجب ہوئے، جس کا مقابلہ سنسکرتی ادب عالیہ سے کیا جا سکتا تھا۔

انیسویں صدی میں مسلمان ہر چند قعر مذلت میں جا پڑے تھے، پھر بھی ان میں تخلیقی حس دھڑک رہی تھی۔ دربار و دار الحکومت سے یکساں محروم ہونے کے بعد وہ کلکتہ سے دور دور رہنے لگے۔ مگر عوام کے دل سے قریب ملک کی دیہی روایتوں میں رچی ہوئی شاعری شائستگی کی مدعی نہیں۔ اسلامی روایتوں اور مقامی اساطیری قصوں سے لبریز ہونے کی بنا پر ان کی شاعری میں ایک سادہ مگر دل موہنے والی خصوصیت ہے۔ ان کے قصے فارسی، عربی اور سنسکرت کی کتب مذہبی سے ماخوذ ہوتے۔ وحشت ناک بیچ بھاڑ سے دور سمندر سے ڈھلتے ہوئے چاٹگام اور سنہری فصلوں والے میمن سنگھ میں بیٹھ کر وہ عوام الناس کے لیے لکھتے رہے۔ پوتھی اب بھی ان کی سب سے زیادہ قابل رشک صنف سخن تھی۔ فصاحت نے ان کے ذخیرۂ الفاظ کو مجروح نہیں کیا تھا۔ بولیاں ان کے اسالیب بیان کی پرورش کرتی رہیں۔ جلسۂ عام میں وہ کئی کئی روز تک برجستہ شعر پڑھتے رہتے، اور اپنے حریف شاعروں کو نیچا دکھاتے۔ فطرت کا حسن اور عوام کے روزانہ کے جذبات بھاٹیالی اور زاری کے گیتوں کے حق میں جمال و جلال کا غیر مختتم سرچشمہ تھے۔ معرفتی، مرشدی اور باول کے نغمات سادہ مگر گہرے فلسفے کو اجاگر کرتے۔ ان اسالیب میں دیہی علاقوں کے مسلمان شعرا نے جس سادگی و پرکاری کا ثبوت دیا ہے وہ بے نظیر ہے۔ افسوس ہے کہ سید حمزہ، محمد ستا، عبد المجید اور درویش علی، شیخ مدن کے نام تا حال زیادہ معروف نہیں ہوئے۔

سنہ ۱۸۵۷ء سے انیسویں صدی کے اوائل تک کی مدت بنگلہ ادب کا دور زریں کہا جا سکتا ہے۔ اسٹیج، چھاپہ خانے، جدید تعلیمی ادارے اور کتب خانے ان چیزوں کا ادبی تابعوں سے اس پر عظمت عہد کی تشکیل میں بڑا ہاتھ ہے۔ اس خاکہ نما مقالے کی تنگ دامانی کے پیش نظر ان کی مصنف بہ مصنف قدر و قیمت کے تعین کی ترغیب شدید سے دامن کشاں گزر جانا ہی دانشمندی ہے۔ علاوہ ازیں معاشرتی مسائل پر لکھنے والا عظیم ناول نگار سرت چندر چٹرجی یا شعرا میں ٹیگور اور نذر الاسلام اس قدر مشہور و مانوس ہیں کہ انھیں کسی مزید تعارف کی احتیاج نہیں۔

دنیائے ادب میں کسی نابغے کا ظہور کم درجے کے فنکاروں کو کلیتہً پس پشت ڈال دیتا ہے۔ شیکسپیئر کے بڑے بڑے ہمعصر تقریباً گمنام ہی رہے، اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ بھی شیکسپیئر کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ چنانچہ یہ قدرتی امر تھا کہ ٹیگور سا قد آور نابغہ جس نے تن تنہا اپنے کارناموں سے بنگلہ ادب کو ادبیات عالم کے دوش بدوش لا کھڑا کیا تھا تمام ہمعصر شعرا پر جادو کی طرح چھا جاتا۔ ٹیگور کے افسانوں، انشائیوں، تمثیلوں اور نظموں میں بلکہ مصوری تک میں مواد و ہیئت کی جو جولانی و تخیل رچی ہوئی تھی اسے دیکھتے ہوئے سبھی اس کی پرستاری پر مجبور تھے۔ ٹیگور کے اثرات اس لحاظ سے مضرت رساں ثابت ہوئے کہ اکثریت انھیں اپنے تخلیقی مقاصد کے حصول کے لیے جذب کرنے کی بجائے ٹیگور کے مسلک کی غلام بن گئی۔ ٹیگوری اسلوب و طرز کی نقالی نے جذبات و محسوسات کی انفرادیت کو قطعی مفلوج کر دیا۔

نذرالاسلام

شعوری طور پر ٹیگوری روایات کا

نذرالاسلام ایک طاقتور تازہ کار نابغہ تھا جس میں تاریخ کے خشک دھاروں کو بھی روکنے اور موڑنے کا دم خم تھا۔ وہ
مخالف نہ تھا البتہ بغیر کسی ارادہ و کوشش کے اس کی ذات سے خود بخود ایک نئے مشرب کی داغ بیل پڑ گئی۔ کیقباد ان قابل دماغوں میں تھا جنہوں نے بنگلہ ادب
میں اسلامی تصورات کی تجدید کی تھی مگر اس کا استفادہ تاریخ اسلام کے بیانیہ عناصر تک محدود تھا۔ نذرالاسلام نے ان سے صرف اثر ہی قبول نہیں کیا بلکہ
انھیں اپنے دماغ کی بھٹی میں تپایا اور روح عصر کی آتش نفسی سے دوبارہ زندہ و تابندہ کر دیا۔ ٹیگوری روایات کی خواب آور شیرینی حسن مجرد کے ماورائی تصورات
میں مستغرق الفاظ کی موسیقی و حلاوت پر شیفتگی اور اسی قسم کی دوسری خصوصیات سے نذرالاسلام کی شاعری ایک نئی وسعت پہنائی سے آشنا ہوئی۔ فارسی و عربی کے
الفاظ و تشبیہات اس کے شعروں میں اس کثرت سے پائے جانے لگے جیسے پہلے کبھی پائے جاتے تھے۔ بے انصافی اور نابرابری کے خلاف بغاوت و بیزاری کی آتشیں
روح الفاظ و جذبات کے ایسے ہولناک تناسب میں اس قدر تکمیل کے ساتھ کبھی آشکارا نہ ہوئی تھی۔

اس زمانے سے سماجی بیداری و حقیقت پسندی اہل قلم کی اصل الاصول ٹھہری۔ البتہ کچھ آگے چل کر شعر و ادب جارحانہ حد تک اپنی ہیئت میں حقیقت
پسند، ہنگامہ پرور اور روایت شکن ہو گئے۔ تمثیل و شاعری کا زوال شروع ہو گیا۔ مگر جہاں تک نثری کارناموں کا تعلق ہے فسانہ نگاری و ناول نویسی
کے شعبے میں ہماری تازہ بتازہ ادبی تخلیقات اس مرتبے کی ہیں کہ وہ بلا کسی جھجک کے دنیا کے کسی بھی ملک کے ادب سے آنکھیں چار کر سکتی ہیں۔

جیسا کہ فطرت کا تقاضہ ہے ان کارناموں میں مسلم معاشرہ و خیال کی پرچھائیاں شاذ ہی کہیں دکھائی دیتی ہیں۔ معاشی سیاسی اور معاشرتی وجوہ
مسلمانوں کی راہ میں روڑے بنتے رہے۔ چنانچہ نذرالاسلام کو چھوڑ کر مسلم سماج سے کوئی اس پائے کا نابغہ نہ اٹھا جو بنگلہ ادب میں مسلمانوں کے حقیقی مقام
مرتبہ کو اجاگر کرتا۔ خود سرت چندر نے بھی یہ کمی بری طرح محسوس کی اور اس نے دکھ کے ساتھ اعتراف کیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے سے بے خبر فرقے سے متعلق ہونے
کی بنا پر اپنے دیس کے مسلمانوں کی حیات و جذبات کی صحیح عکاسی کرنے کی اہلیت سے محروم ہے۔ اس سے زیادہ الم ناک حقیقت یہ ہے کہ اس کمی کا احساس خود مسلمانو
میں کافی دیر سے پیدا ہوا۔ جب سید احمد خاں جیسے لوگ اس عزم کے ساتھ میدان میں آئے کہ وہ نیند سے ماتے عوام کو بیدار کر کے چھوڑیں گے تو برصغیر کی دنیا ئے
ثقافت میں ایک سمت سے دوسری سمت تک بیداری کی لہر دوڑ گئی۔ راجہ رام موہن رائے نے جو کچھ ہندوؤں کے لئے کیا تھا وہی سید احمد خاں نے مسلمانوں
کے لئے کیا۔

۴ ستمبر ۱۹۱۱ء کو بنگیہ مسلم ساہتیہ سمیتی بنگال میں قائم ہوئی۔ اس کے دستور میں یہ مقاصد واضح طور پر درج ہیں "...... بنگلہ ادب میں کل حصہ
لینے کے لئے مسلمانوں کو دوبارہ بیدار کرنا مادری زبان کے ذریعے عربی، فارسی اور اردو ...... زبان میں جو تاریخی و مذہبی کارنامے موجود ہیں انھیں ،
عوام الناس کے دل و دماغ کے قریب لانا۔ بنگال کے قدیم مسلمان شعراء کے اشعار کی فوری فراہمی، تدوین اور اشاعت" سمیتی کے دوسرے چند اور
مقاصد انھیں سوالوں کے گرد گھومتے ہیں۔ وہ نوجوان مسلم بنگال کے احساس بیدار کے مظہر تھے۔ وہ بیک وقت اعتراف بھی تھے اور عزم بھی۔ مسلمان بنگلہ
اپنی جہالت سے لمبی مدتوں تک اپنی مادری زبان سے تغافل برتتے رہے تھے اور اپنے وسیع و عظیم امکانات کو اپنے ہاتھوں برباد کر رہے تھے۔ وہ خود اپنے
گھر میں اجنبی تھے۔ لہٰذا کفارے کا وقت آ چکا تھا۔ یہی وہ عزم و جوش تھا جس کے زیر اثر جدید مسلمان اہل قلم نے خود اپنے گھر، مذہب اور جذبات
سے متعلق لکھنے کی جسارت کی۔ کیقباد کے شعری کارنامے ''میر مشرف حسین کی'' بشاد سندھو'' مولانا اکرم خاں کی ''مصطفیٰ چرتر'' ان تمام تخلیقوں سے نئی
روح جھلکتی ہے۔ بعض نے ناول اور افسانے بھی لکھنے کی کوشش کی۔ ابو المنصور کے بے پناہ طنز کی نشتریات ابھی فراموش نہیں ہوئی ہے۔ ان ادبی کارناموں کی
سب سے محکم خصوصیت خلوص و صداقت ہے۔ دراصل وہ میر کارواں تھے انھوں نے مسلمانوں کے جذبات خیالات مسائل اور زندگی کے
متعلق [illegible] قدر و قیمت زیادہ [illegible] تاریخ اور توانائی کے اعتبار سے جدید ادیبوں پر ان کے اثرات

غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ بعضوں نے ایک طرح قوالی اور نئے نئے میدان کھلتے گئے۔ نئی نئی تحریکیں پیدا ہوئیں جو بنگالی نے لکھیں۔ آج ایسے رسائل کم تعداد میں نکلتے ہیں جن کی
وسعت اشاعت اور نفاست ... کے ہاتھوں میں ہے ... خصوصیت و صلاحیت کی وجہ سے جو فن ...
ہماری نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہوتے ہیں ... پہلا قدم اٹھ چکا ہے ... کا موجب ہوگا۔

تقسیم اور اس کے بعد

تقسیم بنگال نے نئے مسائل بھی پیدا کئے ہیں اور نئی امید بھی۔ ساری قوم نئی نئی سرگرمیوں کے باعث ہنگامہ بکار ہے۔ جواں سال لکھنے والے اب اندھیرے میں ہاتھ پاؤں نہیں مارتے۔ وہ روایات کی مستحکم چٹان پر کھڑے ہیں۔ مشرقی بنگال کی دیہی ثقافت کی دولت لامحدود ہے یہیں جڑیں گہری اتری ہوئی ہیں۔ عوام کی زبان اپنے فطری اصول ارتقا سے ادب کی زبان کی بھی نشو ونما کرے گی۔ ایک زندہ اور عمل کوش قوم اور ایک پختہ دیہی ثقافت مستقل قدر و قیمت کا ادب پیدا کرنے میں ہرگز ناکام نہ ہوگی۔ مشرقی بنگال کے سر ابھاروں پر بہت سے نوجوان فنکار اپنے دستخط ثبت کر رہے ہیں۔ سید ولی اللہ کی "لال شالو" ناول کی ایک امید صاحب کا لرزہ خیز داستان ہے۔ معاشرتی تنقید کی آواز ایک مذہبی مبلغ کے دعوے کے ساتھ اندر اندر رواں دواں ہے۔ ابو الکلام شمس الدین کی "شہر بانو" بارسیاں کے سیدھے سادھے کسانوں کی پختہ کہانیوں کا گلدستہ ہے۔ شوکت عثمان زندگی پر اپنی بھرپور گرفت، اپنے رچے ہوئے اسلوب اور عمیق نظر کی بنا پر لازوال شہرت و عظمت سے ہم آغوش ہو چکا ہے۔ منیر چودھری اور بہت سے دوسرے نوجوان ادیب کافی ہونہار ہیں اور وہ دن دور نہیں جب وہ ہمارے ادب کو ہم دوش ثریا کر دیں گے۔ جسیم الدین، جسے بنگال کا برنس کہنا چاہئے آج بھی حد تک بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔

فرخ احمد، جواں سال و پر جوش، دنیا پسند و دیں پرست، جدید ممتاز شعرا میں سے ایک ہے۔ مشرقی نثراد قدیم بولیوں سے استفادہ کرتے ہوئے وہ جس حسن و خوبی سے اپنی زبان کو سانچے میں ڈھالتا ہے، وہ فنکار کی تخلیقی قدرت کا غماز ہے۔ ابو الحسین، غلام قدوس، احسن حبیب، غلام مصطفےٰ، سخاوت حسین، علی احسن وغیرہ زیادہ مشہور شعرا میں سے چند ہیں۔ ٹیگور نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ بنگال کی ثقافت کلکتہ کے گرد و پیش پروان چڑھی ہے۔ یہ اس لئے کہ کلکتہ صنعتی مرکز ہے۔ آج ڈھاکہ دار الحکومت ہے اور اس کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ ڈھاکہ کے چاروں طرف سولہ اضلاع پھیلے ہوتے ہیں، جو اپنے قدرتی وسائل، لہراتے ہوئے دریا، سر سبز و شاداب کھیتوں کے لحاظ سے ممتاز ہیں۔ ان اضلاع میں بسنے والوں کے دل اپنی صدیوں قدیم دیہی ثقافت سے جڑے ہوئے ہیں۔ انھیں کے صلب سے ہمارے جواں سال ادیب ابھرے ہیں۔ اسی خون و خاک نے انھیں جنم دیا ہے اور پروان چڑھایا ہے۔ مشرقی بنگال کا ادب کبھی نہیں مر سکتا۔ یہ اپنی انفرادی راہ خود نکال لے گا۔ پہاڑوں کے سینے چاک کر دے گا اور عوام کے پر جلال فن کے روپ میں پھلے گا پھولے گا۔

"چنگاری سے شعلہ تک"

"آج جب یہ کہا جاتا ہے کہ عوام آزادی کی گرمی کیوں محسوس نہیں کرتے تو لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ جب تک یہ آزادی اُن کے نظامِ زندگی، اُن کی روح کی بیتابی اُن کے ذہن کے بوجھ پر اثر نہیں ڈالتی، اس وقت تک یہ سطحی رہے گی۔ اور اس چنگاری کو شعلہ نہیں بنایا جائے گا۔"

(آل احمد سرور)

راجہ بہادر کنور سین ایم اے بیرسٹرایٹ لا

زبانوں کا باہمی اثر و تاثر

(یہ مضمون اصل میں راجہ بہادر کنور سین صاحب کی کتاب کے پندرھویں باب کی جوتی ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان و ایران کی زبانوں کا ایک دوسرے پر کس کس طرح اثر پڑا اور پھر الفاظ نے کس کس طرح اپنی صورت بدلی اور نئے مفہوم پیدا ہوئے۔ یہ مضمون دلچسپ ہونے کے علاوہ مفید اور اہم معلومات کا مجموعہ ہے)

ہندوستان میں ایرانی ترکی اور افغانستانی لوگوں کے تین چار سو سالہ ارتباط سیاسی و معاشرتی کا نتیجہ جانبین کی زبانوں پر یہ بھی ہوا کہ بے شمار الفاظ عربی۔ فارسی ترکی وغیرہ کے ہندی زبانوں میں اور سنسکرت اور ہندی زبانوں کے فارسی اور ترکی زبانوں میں داخل ہوگئے۔ اور ان کے تلفظ بھی کم و بیش تبدیل ہوگئے۔ گویا یہی الفاظ مفرس اور معرب ہو گئے اور اسی طرح کثیر التعداد فارسی عربی لفظوں نے ہندوستانی لباس پہن لیا اور ہندی بن گئے۔ مثال کے طور پر صرف چند ہندی الفاظ کا درج کر دینا کافی ہوگا۔ جو فارسی نظم و نثر میں استعمال ہونے لگے۔ یعنی۔ برہمن۔ راجا۔ جہار لنج۔ لونڈی۔ مندر بستی۔ بھی۔ کھانڈ۔ سوید (بھید) چونا۔ منڈل ڈھولک۔ اشنان وغیرہ ؎

شدہ گنگا و جمنا ہر دو چشم اشک بارمن

چکا فرنیائی بہر اشنان در کنار من

ان غیر ملکی لوگوں کے تہذیب و تمدن طریق معاشرت معبادت۔ خور و نوش۔ لباس پوشاک ہندو باشندگان ملک سے جداگانہ تھے۔ اس لئے ان کے متعلق الفاظ بھی ہندی زبانوں میں شامل ہوگئے۔ مثلاً سعدی۔ سوال۔ بھاجی کے مقابلہ میں نان۔ گوشت۔ کباب۔ کوفتہ۔ قلیہ قیمہ۔ بھات۔ چاول کھچڑی کے علاوہ طاہری۔ زردہ۔ پلاؤ۔ دھوتی۔ کرتہ۔ انگرکھا۔ ٹوپی کے اوپر کلاہ۔ چوغہ اور پائجامہ روزمرہ کی بول چال میں داخل ہوگئے۔ کئی وجوہات سے بعض لفظوں میں عروج اور بعضوں میں زوال رونما ہوگیا۔ مثال کے طور پر لفظ حضرت کو لے لیجئے۔ یہ لفظ فارسی زبان میں انبیا اولیا اور بادشاہوں کے متعلق بطور عزت و احترام استعمال ہوتا تھا۔ مگر اکثر جو فروش گندم نماؤں کی چیرہ دستیوں کے باعث اس کا مفہوم چالاک متفنی شخص کے لئے ہونے لگا۔ اور کثرت استعمال سے اور باہمی بول چال میں مخفف صورت میں حضت ہوگیا اسی طرح لفظ مہتر در اصل اعلیٰ تر اور بڑے معزز شخص کیلئے استعمال ہوتا تھا جیسا کہ اب تک چترال کا حاکم کہلاتا ہے۔ مگر اردو کی عام بول چال میں اب یہ لفظ خاکروب کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ برعکس اس کے لفظ خاک جس کے معنے مٹی کے ہیں کئی تحریروں میں بمعنی گوشت یا لحم ہوتا پایا جاتا۔ اس کی وجہ تسمیہ یوں بیان کی جاتی ہے کہ مغلیہ بادشاہان دہلی کے ایک ہندو خاص سے نے جو شاہی باورچی خانہ کا حساب کتاب لکھتا اور کتاکتا تھا طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ بجائے اس کے کہ اپنے اور قلم سے لفظ لحم لکھے (جس کو وہ اپنے و شنوی عقیدہ کے رو سے پاپ یعنی گناہ سمجھتا تھا) لفظ خاک لکھ دیا کرتا تھا کہ اتنے روپیہ کا خرید گیا۔ چونکہ آمدن و خرچ کی رقوم صحیح و درج ہوتی تھیں اور حساب درست ہوتا تھا کسی نے اس طرف دھیان نہ دیا کہ ایک مدت سے لحم کی بجائے لفظ خاک ہی مسلسل کہا جا رہا ہے۔ مگر جب کسی کی شکایت پر یا اتفاقاً کسی کی نظر اس تحریر پر پڑی تو منشی صاحب کو بطور ملزم بادشاہ سلامت کے روبرو پیش ہوکر جواب دہی کرنی پڑی کہتے ہیں کہ منشی ذہین اور حاضر جواب تھا۔ اقبال کرکے منشی نے کہا کہ جان بخشی ہو تو جو امر عرض کروں اجازت حاصل کرکے منشی نے عرض کی کہ اگر الٹے کو الٹا یا جائے تو اصل ہوجاتا ہے یا نہیں۔ جواب ملا کہ ہاں۔ تو پھر منشی نے پوچھا کہ خاک کو الٹیں تو کیا بنتا ہے؟ جواب ملا کاخ۔ منشی نے وضاحت کا خ کے معنے؟ جواب ملا کہ محل۔ منشی نے پھر سوال کیا کہ محل کو الٹا جائے تو کیا بنتا ہے؟ جواب ملا کہ لحم۔ منشی نے تب ہاتھ جوڑ کر داستان پوری کرکے عرض کی کہ بادشاہ

اس مسئلے کا حل کافی عرصہ بعد معلوم ہوا۔ جب شیخ جمالی دہلوی کو خراسان جانے اور مولانا جامی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ تب شیخ نے ہندوستانی مطلب بیان کیا
سے جو ہندوستان میں کشتیوں کے بنانے میں کام آتی ہے۔

امیر خسرو کی ایک پہیلی اور چیستان میں بھی یہی خوبی پائی جاتی ہے۔

(۱) زنگش چو رنگ زعفران۔ بریان چو جانِ عاشقان   پا دار دو بہ ہم پران۔ یارا بگو ایں چیستان (پاپڑ)

(۲) ترور سے اتری اک ناری۔ اس نے بہت اچھا   نام جو اسکے باپ کا پوچھا۔ آدھا نام بتایا

آدھا نام بتایا خسرو   آن دیس کی بولی   نام جو اس کا اپنا پوچھا   اپنا نام نہ بولی   (نبولی نیم)

علیٰ ہذا القیاس سنسکرت اور ہندی کے ہزاروں الفاظ جو روزمرہ کی بول چال میں آتے تھے فارسی نظم و نثر کے اندر کئی ترکیبوں اور طریقوں سے استعمال ہونے

رفتم بہ تماشائے کنارِ جوئے   دیدم بہ لبِ آب زنِ ہندوئے

گفتم صنما بہائے زلفت چہ بود   فریاد برآورد کہ دُر دُر موئے"

دُر دُر ہندو عورتیں کسی مرد کو حقارت کے طور پر دور رہنے کے لئے بولتی ہیں شیخ علی حزیں کا قطعہ ذیل بھی اسی قسم کی مثال ہے۔

در کشورِ ہند ہر چہ دیدم چپ و راست   از رام و کرشن ہر طرف صوت و صداست

گفتم کہ خدا چہ نام دارد ایں جا   گفتند دریں دیار ہر نام خداست

(بقیہ صفحہ ۱۶)

محض اپنے مطالعے سے اسلام قبول کیا تھا۔ وہ علامہ کے پاس آئے اور انھوں نے اپنی اس مشکل کا حل چاہا کہ میں بیوی بچوں والا ہوں۔ میری بیوی بہت ا[illegible] نیک ہے اس کا فوراً مسلمان ہو جانا دشوار ہے۔ اور میں ایسا تقاضہ بھی نہیں کر سکتا کیونکہ اس سے گھر کی پر امن فضا میں فساد پیدا ہو جائے گا۔ بچوں پر اس کا اثر پڑیگا۔ تمام مولوی صاحبان جن سے میں نے پوچھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب وہ تم پر حرام ہوگئی ہے، اس کو الگ کر دو۔ اقبال نے کہا دیکھو، ایسا نہ کرنا۔ وہ بیوی تمہارے لئے بالکل جائز اور حلال ہے۔ تم بدستور اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو بلکہ پچھلے سے بہتر سلوک کرو۔ تاکہ اس کو معلوم ہو کہ مسلمان ہونے سے آدمی زیادہ بہتر انسان ہو جاتا ہے۔ اب تم کسی مولوی سے مت پوچھنا میں نے جو کچھ تمہیں کہا ہے۔ وہ عین اسلام ہے۔ خواہ کسی فقہ کی کتاب میں درج نہ ہو۔" اس ضمن میں خود مقالہ نگار نے اپنے فتوے کا بھی ذکر کیا ہے کہ انھوں نے بھی ایک موقع پر ایک ہندو کو جو مسلمان ہونا چاہتا تھا، لیکن بیوی والا تھا، اقبال والا فتویٰ سنا کر مطمئن کر دیا اور اقبال سے مستزاد ہندوؤں کے اہلِ کتاب ہونے کے دلائل بھی پیش کئے۔"

اب دیکھئے کہ اقبال کی تعلیم میں حدیث و سیر کا کیا درجہ تھا؟

علامہ کو فقہ کی تشکیل جدید اور قرآن مجید کے تفسیری نوٹ لکھنے کا خیال تھا۔ مگر انھوں نے زبان عربی پر عبور حاصل کیا اور مطالعہ و فکر کے ذ[illegible] مذہبی مسائل سمجھنے کی کوشش کی لیکن فقہ کی تشکیل جدید کے لئے یہی کافی نہ تھا بلکہ وسیع مطالعے کے ساتھ ایک ذہنی ہم آہنگی بھی ضروری تھی۔ اور یہ امر خود ان خطوط سے واضح ہے جو اپنے استاذ الکل مولانا سید سلیمان ندوی کے نام لکھے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ اپریل [illegible] میں سرکشن پرشاد کے نام کے خط میں فقہ کی تشکیل جدید کے عزم کا قصد ہے اس کا بیس سال میں بھی پورا ہونا کیا معنی اقدام تک نہ ہوا اور بہترین زمانہ دوسری کتابوں پر صرف کرتے رہے۔ اسی طرح قرآن کی تفسیر کے لئے مذہبی علوم میں جس معیار کی دستگاہ و قابلیت ضروری ہے، وہ پوری نہ تھی۔ اور باوجودیکہ [illegible] میں ان کے حسب مراد انتظام ہو گیا تھا اقدام نہ کیا۔ اگر اس پر عرصے سے غور کر رہے تھے۔ اور بیس سال میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر کا ایک نمونہ بھی نہ لکھ سکے۔

کہو مجنوں سے کہ مرنے کی

دراصل آج کل زندگی میں مرجانے والے اس قدر ہو گئے ہیں کہ کسی کی جسمانی موت کوئی بہت بڑا سانحہ نہیں معلوم ہوتی۔ بہت سے جانے پہچانے مشہور لوگوں کی موت لمحہ بھر کی خاموشی ایک سرد آہ یا دو آنسوؤں سے زیادہ خراج نہیں لیتی اس عالم بے حسی میں اگر کسی کی موت کچھ لوگوں کے لئے ایک سناٹے کی کیفیت۔ کچھ کے لئے ایک زبردست دھچکہ کا احساس اور کچھ کے لئے ٹوٹ کر بہنے والے آنسو لے کر آئے تو یہ اس کی موت اور زندگی کی عظمت کا پہلا بڑا ثبوت ہے۔ ۱۸ر جنوری کو سعادت حسن منٹو نے زندگی بھر کی بے قدریوں کا بدلہ لیا جیسے مرتے مرتے بڑے ناز سے کہا ہو "اب دیکھیں تمہیں ایسا کون ملتا ہے"

منٹو اس نئے دور کے تمام انسانوں کے لئے ایک نفسیاتی سہارا بن گیا تھا۔ وہ اخلاقی جرأت اور خود اعتمادی کا ایک نشان تھا جس کے بل پر ریاکاری بناوٹ اور نام نہاد شرافت کے دعووں کا دلیری سے جواب دیا جا سکتا تھا۔ جب کوئی انسانی پستیوں کا ذکر کرتا۔ اخلاقی دیوالیہ پن کی باتیں سناتا سنڈوں اور طوائفوں کی برائیاں کرتا، سماج کی بری حالت کا ذمہ دار صرف چند بد اخلاق افراد کو ٹھہراتا تو بے اختیار ہم منٹو کے تخلیق شدہ کرداروں کا اس طرح حوالہ دیتے جیسے وہ سچ مچ کے مشہور اور زندہ انسان ہیں۔ ایسے ناقابل تردید کردار سے حقیقی وجود پر کون ایمان نہ لاتا۔ اس قسم کی بحثوں میں ہمارا انداز ان بچوں کا سا ہوتا۔ جو اپنی باتوں کی مخالفت سن کر کہتے ہیں "چلئے بھائی جان سے پچھوائیں" سماج کے (مطعون) تباہ شدہ طبقہ کی عظمت پر کسی کو شک کرتے دیکھ کر ہمارا ذہنی رویہ بالکل یہی ہوتا "چلئے منٹو سے پچھوائیں" اور کتنی ہی بار منٹو کے قلم کی نوک نے مخالف کو دل ہی دل میں قائل کر دیا۔ یہی وہ نفسیاتی سہارا تھا جو اس قسم کا اعتماد بخشنے کے لئے اب بھی اس کے افسانے اور کردار موجود ہیں مگر پڑھنے والے سوچتے ہیں کہ ممکن ہے آئندہ کوئی ایسا بظاہر ذلیل وجود نظر آ جائے جس کو دیکھ کر انسانیت پر سے ہمارا اعتبار ڈگمگانے لگے۔ اس وقت ہم کتنی آرزو سے پلٹ کر منٹو کو دیکھیں گے کہ اس کے سوا راکھ میں دبی چنگاریاں اور کون کرید سکتا ہے۔

منٹو کے مختلف کرداروں سے مل کر عام پڑھنے والے کو محسوس ہوتا جیسے وہ پل صراط پر سے گزر رہا ہے۔ جسے طے کرنے کے بعد اسے جنت کی جھلک دکھائی دیگی اس جھلک کی آرزو میں پل صراط پر چلنا بھی مشکل نہ ہوتا۔ سفید کنول جب کیچڑ بھرے تالاب میں بھی اپنی پاکیزگی ابھار لیتا ہے تو اسے حاصل کرنے کے لئے تالاب کے گندے پانی سے گزرنا ہمیں کیوں برا لگے؟ منٹو کے کردار خود بھی ایک پل صراط پر سے گزرتے نظر آتے۔ وہ پل صراط جس کی تیز دھار بھی ان انسانیت کا پاؤں نہ کاٹ سکی۔ منٹو کو شریف اوسط گھرانوں کے تہذیب یافتہ کردار بالکل پسند نہ تھے وہ تو جیسے ان سے کہتا "تمہاری پشت پر صدیوں کی شرافت، تعلیم، خوبصورت ماحول اور حسین روایات ہیں۔ تم اگر شریف ہو تو اس میں تمہارا کیا کمال ہے۔ وہ جن کی پشت پر جہالت، گندگی، خراب ماحول اور ذلیل روایات کا بوجھ ہے جب اس وزن کو سہار کر سر اٹھاتے ہیں اور اوپر دیکھتے ہیں تو انہیں دیکھو۔ چلو میں دکھلاؤں" منٹو کا کمال یہ تھا کہ یہ سب باتیں اس نے اپنے افسانوں میں جذباتی تقریروں یا رومانی جملوں کے سہارے کبھی نہ کہیں۔ وہ یوں لکھتا جیسے اس نے کبھی شرافت کا نام بھی نہیں سنا۔ اور نہ ہی اس کے کردار کہیں ڈراما کرتے ہوئے انسانیت کا نعرہ لگاتے ہوئے نظر آتے۔ پھر بھی تمام باتیں بغیر پڑھے ہی ہمارے دلوں میں اتر جاتیں تھیں۔ یہاں وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا ہمیں کس قدر خوشگوار معلوم ہوتی۔ اور یہی منٹو کا اعجاز تھا۔ منٹو بڑا افسانہ نگار تھا اسی لئے وہ کہیں اپنے کہے ہوئے جملے لیبل اور پھندنا نہ کرتا۔

کردار خود جو کچھ چاہتا کہہ جاتے۔ وہ تو علیحدہ کھڑا ان کی حرکات دیکھ رہا ہے۔ اور جو وہ بولتے ہیں ان میں ایک لفظ کا رد و بدل نہیں کرتا۔۔

منٹو نے صرف ادب پر ہی احسان نہیں کیا۔ اس نے ادیبوں پر بھی احسان کیا ہے۔ یہ ایک عجیب سا لیکن بے حد عظیم احسان ہے۔ اپنے تمام الہامی خلوص کے ساتھ اس نے تمام بدنام موضوعات کو اپنے لئے چن لیا تھا۔ باقی اچھی اچھی صاف ستھری باتیں دوسروں کے لئے چھوڑ دیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو بہت سے بدنام موضوعات دوسرے ادیبوں سے جا چپکتے اور ان ادیبوں میں منٹو جیسے فنی رکھ رکھاؤ کی کمی انہیں صرف بدنام ہی کر چھوڑتی۔ منٹو نے خود بدنام ہو کر ادب اور ادیب دونوں کو بدنام ہونے سے بچا لیا۔ آج بہت سے ادیب دور کھڑے اپنی سفید پوشی کی حفاظت کرتے ہوئے کہہ دیتے ہیں کہ اس نے بعض باتیں ایسی بھی کہہ دیں جو ناگفتنی تھیں۔ لیکن ایسا کہنے والے خوب جانتے ہیں کہ جو کچھ منٹو نے لکھا وہ سب کے دلوں میں تھا۔ البتہ اور لوگ اپنے قلم کو آلودہ کرنے سے ڈرتے تھے۔ ان میں اس کی ہمت نہ تھی۔ اسی بزدلی سے مشتعل ہو کر منٹو نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اس کی حالت ایک ایسے شخص کی سی تھی جو صبح سویرے اٹھ کر گھروں سے گندگی اور کوڑا کرکٹ صاف کر دے اور جب لوگوں کی معترض نگاہیں اس پر پڑیں تو ذرا نہ جھجکے۔ دوسرا کوئی اس کی جگہ ہوتا تو ان نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے فوراً ہاتھ سے جھاڑو رکھ دیتا اور شرمندہ و منفعل ہنسی ہنس کر کہتا "میں نے کہا آج ذرا یہ تجربہ بھی کر دیکھوں ویسے گھر میں نوکر موجود ہے"۔ جی ہاں یہ نوکر سعادت حسن منٹو ہی تھا۔ جو سماج کے گندے گھر سے کوڑا کرکٹ نکالتے نکالتے آخر متعفن جراثیم میں گھر کر ۱۸ جنوری کو ہاتھ سے جھاڑو رکھ کر ہمیشہ کے لئے سو گیا۔ اب سماج حیران ہے کہ گھر کا باقی کوڑا کرکٹ کون اٹھائے گا۔ دوسرے لوگ چھوٹی موٹی میلی چیزیں ہٹا لے جائیں گے لیکن اتنی گندی چیزیں۔ وہ تو کوئی بھی نہ چھوئے گا۔۔ تو اس طرح بدنام ہو کر منٹو نے دوسروں کی نیک نامی قائم رکھی۔

اور افسانہ نگاری — وہ تو اس بری طرح سے پچھاڑیں کھاتی بے حال ہو کر اور سر پیٹ کر رو رہی ہے کہ سب اپنا غم بھول کر اسے سمجھانے میں لگے ہیں لیکن جتنا سمجھائیے وہ اتنا ہی اور بے قرار ہوتی ہے۔ منٹو نے اس زمانے میں اس تیزی سے کہانیاں لکھی تھیں یا گھپ اندھیری رات میں وہ ساز بجا رہا ہے اور اندھیرے میں قطار در قطار سفید پریاں رقص کرتی آ رہی ہیں۔ یہ پریاں منٹو کی کہانیاں ہی تھیں جو اپنے بدصورت کرداروں کے باوجود بھی معصوم اور پاکیزہ تھیں۔ بجانے والا بعض وقت غلط ساز بجا دیتا۔ لیکن یہ پریاں ناچنے میں ایسی ماہر تھیں کہ اپنی تیزی میں ساز کی غلطی چھپا دیتی تھیں۔ رقص اپنے شباب پر تھا۔ باجے پورے زور پر — اچانک ساز خاموش ہو گیا۔ پریاں رک گئیں۔ معصوم حیران نظریں — پاؤں جنبش کے لئے بیتاب — اور وہ منہ میں انگلیاں دبائے منتظر کھڑی ہو گئیں۔ کوئی آئے اور ساز بجائے تاکہ وہ رقص جاری رکھ سکیں۔ ساز [illegible] کوئی نہ کوئی تو ضرور آئے گا۔ لیکن اتنے اندھیرے میں بھی سفید پریوں کا رقص جاری رکھ سکے گا؟ یہ تو نہیں معلوم ....!

منٹو کے افسانے ایسی تخلیق تھے جن کا ایک لفظ بھی تبدیل [illegible] معلوم ہوتا کہ وہ سب طوائفیں جن کی زندگی میں منٹو کے افسانوں کی طرح قابل فخر انسانی کام [illegible] تھے۔ [illegible] اپنی پوری شرافت [illegible] صلاحیت [illegible] سے آشنا ہو جاتی ہیں۔ حیرت سے سوچتی ہیں "کیا یہ ہم ہیں؟" اردو کے کسی اور افسانہ نگار نے بر [illegible] اور قسمتوں کو [illegible] طوائفوں [illegible] کو کسی نے ایک [illegible] کی جھلک نہیں دکھائی۔ کسی نے طوائفوں سے یہ نہیں کہا کہ مسّی کے لاکھے اور رخسار کے غازے کے باوجود تمہاری آغوش میں ماں کا سا انداز رہتا ہے۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ [illegible] باہوں میں خواہ [illegible] رفاقت کی صلاحیت بھی ابھی زندہ ہے۔ منٹو کے افسانے پڑھ کر ہی یہ سب طوائفیں بھی ایسا ہی محسوس ہوا۔ یہ [illegible] ہے اور فن کی [illegible] پھر کوئی ادب کے معجزوں سے انکار کیوں کرے۔

منٹو کی موت کے بعد یہاں یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اس کی جائے قیام کو تہذیبی لحاظ کی وجہ سے محفوظ رکھا جائے۔ یہاں یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اس کی بہترین کہانیوں کا بہت سی زبانوں میں ترجمہ کرایا جائے اور بیرون ملک کے سب سے بڑے افسانہ نگار کے لئے یہ بھی تو نہیں ہو سکتا کہ اس کی بیوی بچوں کو تمام اقتصادی پریشانیوں سے نجات دلائی جائے۔ لیکن کم از کم یہاں یہ تو ہو سکتا ہے کہ منٹو پر بے شمار رسالے اپنے خاص نمبر نکالیں۔ یہ بات کچھ طنز و تعریض کی نہیں۔ یہ بھی تو خراج عقیدت ہی ہے لیکن اسے کیا کیجئے کہ منٹو کی عظمت اور انفرادیت ان حقیر کوششوں کے ڈھیر کو دیکھ کر اپنے ہی تخلیق شدہ لافانی کردار موذیل کے لہجے میں کہتی ہے: "لے جاؤ اس کو۔" اس ادب [illegible] سب موذیل کے ترلوچن کی طرح اس کی لاش کے پاس مغموم اور بے چارے سے کھڑے ہیں۔

واجدہ تبسم

دُلہن

آج آپی یوں چپ چاپ ڈولی میں بیٹھ کر چلی گئی کہ ایک آنسو تک نہ بہایا —— ورنہ اس سے پہلے بھی وہ ڈولی میں بیٹھ چکی ہے اور ہمارا عام ہندوستانی دلہن کی طرح ہچکیاں لے لے کر روئی ہے —لیکن آج جب اُسے لال لال جوڑا پہنا کر ہمیشہ کی طرح ڈولی میں سوار کروایا گیا تو وہ منھ سے کچھ نہ بولی — آنکھ سے ایک قطرہ بھی نہ ٹپکایا —— البتہ اس کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ ضرور رہتی — یوں محسوس ہو رہا تھا گویا وہ بڑی خوش ہے — کیا ہر لڑکی ڈولی میں سوار ہوتے وقت یونہی چپ چاپ سی رہتی ہے؟ اور آج تو اسے خاموش دیکھ کر میں بھی سہم سی گئی تھی اب سے پہلے ہر بار میں نے اپنی مہین اور لوچدار آواز میں بابل گایا تھا — آپی ہی تو کہتی تھی "بلو —— تیری آواز میں اتنا لوچ ہے —— اتنا رس ہے کہ اندھیری رات میں تو باغ میں بیٹھ کر گائے تو ضرور ہی سانپ کھنچے چلے آئیں۔" لیکن آج —— یہ آج آپی نے ایسا بھی نہ کہا کہ —— "بلو —— تیری آواز میں کتنا رس ہے" —! وہ تو یوں چپ چاپ سی تھی گویا مجھ سے روٹھ گئی ہو۔

کتنے بار میں نے بابل گایا؟! مجھے اچھی طرح یاد ہے جب ڈولی دیکھ کر میں آواز اٹھاتی —

"سکھی ری ڈولی کھڑی ہے دوار" تو میری آواز کانپ کانپ جاتی — گیت کے بول میرے ہونٹوں پر سہم جاتے — اور میری آنکھیں چھم چھم آنسو بہانا شروع کر دیتیں۔ میں یہ گیت کبھی تو پورا نہ گا سکی —— ہر بار آنسوؤں نے اس گیت کو ادھورا رہ جانے پر مجبور کر دیا —— لیکن آج دوار پہ کھڑی ہوئی ڈولی دیکھ کر بھی میں وہ گیت نہ چھیڑ سکی تو مجھے اپنے آپ پر تعجب ہوا اس سے پہلے تو ہر بار میں نے ہنس ہنس کر، رو رو کر یہ گیت گایا ہے —— آپی کیا سوچے گی بھلا —— !میں آج خاموش کیوں ہو گئی ہوں —— ؟ اور پھر میرے ہونٹوں پر وہی بول ابھرے تو مجھے حیرت ہوئی کہ ایک بھی آنسو نہ ٹپکا —— !! البتہ گلے میں پھانس سی ضرور پڑ گئی —— مگر یہ کیفیت بہت دیر نہ رہی ہوگی کہ یکدم میری آنکھیں ابل پڑیں —— ڈولی آہستہ آہستہ چلنے لگی تو مجھے یاد آیا کہ ایک بار اسی طرح آپی کی ڈولی اٹھی تھی تو میں نے اُس کی ڈولی کا پردہ اٹھا کر کہا تھا —

"آپی! میں تجھ پر ایک کہانی لکھوں گی —!"

آپی دھیرے سے مسکرا دی تھی — دوسرے ہی لمحے سنجیدہ ہو کر بولی تھی ——

"مگر تو لکھے گی کیا —" ؟؟

آج میں قلم ہاتھوں میں تھامے بیٹھی ہوں تو خیال آتا ہے کہ آپی نے کتنی ٹھیک بات کہی تھی "مگر تو لکھے گی کیا —؟"

قلم میرے ہاتھوں میں ہے — مگر مجھے کوئی اور چھور نہیں سوجھتا۔ کیا لکھوں؟؟

مجھے نہیں معلوم ککڑی کی بیل کا لڑکی کے بڑھنے سے کیا رشتہ آتا ہے — مگر اتنا ضرور معلوم ہے کہ جب میں نے آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو اکیسواں سال اٹھارہ انیس سال کا پایا — ایک مفلس گھرانے کی سہمی سہمی فضاؤں میں میں نے آنکھ کھولی جہاں ستاروں کے چھلنے سے بھی اندھیرے پیدا ہوتے تھے۔ جہاں بہار کے موسم میں بھی پھول مرجھاتے تھے —— ان فضاؤں میں آپی بھی میری ساتھی تھی —— وہ تین سال کی چھوٹائی بڑائی ہم دونوں کے بیچ ایک خلیج کی طرح

تو خاص نہ تھی لیکن پھر بھی ہم دونوں دور دور تھے — کبھی کوئی بات ہم دونوں میں ایسے نہ ہوئی جسے دوستی کا نام دیا جا سکے! اس سبب ہوتے ماحول میں دن رات کچھ نہ کچھ پڑھتی لکھتی رہتی، لیکن آپی سدا مصروف رہتی — آنسو بہانے میں!! یہ میں کبھی نہ جان سکی کہ وہ یوں دن رات کیوں روتی رہتی ہے ... ؟

جن دنوں کی میں بات کر رہی ہوں، ان دنوں گھر میں تمام وقت کچھ نہ کچھ کھسر پھسر ہوتی رہتی — آپی کے متعلق میں نہیں کہہ سکتی مگر اپنی حد تک کہہ دوں کہ کم از کم میں تو بالکل لاعلم تھی کہ گھر میں کیا کیا باتیں ہوتی ہیں۔

ان دنوں آپی ایسی چپ چاپ سی نظر آتی جیسے دنیا جہاں کے غم اس کی جان ناتواں پر ٹوٹ پڑے ہوں! اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں میں نے اکثر و بیشتر آنسو چھلکتے دیکھے — کالی کالی پلکوں پر جھلملانے والے آنسوؤں کو اگر چراغوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے تو مجھے کہنا پڑے گا کہ آپی ہر روز دیوالی مناتی تھی۔ مگر اس کی زندگی کی کتنی بڑی ٹریجڈی تھی کہ ان چراغوں کے جگمگاتے بھی اس کی زندگی میں اجالا نہ ہو سکا!

میں کیسے بھولوں گی آپی کا اداس چہرہ! روکھے سوکھے بال منہ پر بکھرے رہتے — ہونٹ یوں پپڑائے رہتے گویا جنم جنم کی پیاسی ہو!! — اور وہ بیٹھی گھر میں بند چراغ جلانے اور بجھانے میں مشغول رہتی — یہ میں مانتی ہوں کہ انسان کو کبھی کبھی خلوت میں رونا بھی چاہیے کہ اس طرح رونے سے دل کا حسن نکھر آتا ہے — مگر آپی نے اپنے آنسوؤں سے اس حسن کو نکھارنے کی بجائے بہا کر ہی رکھ دیا — اب میں سوچتی ہوں کیا میرا وہ قدم غلط اٹھا تھا جب میں نے آپی کو زہر دینے کے بارے میں سوچا تھا۔

اور ایک دن پھوڑا پھوٹ بہا — چھوٹائی بڑائی کی خلیج آپی نے ایک ہی دم سے پاٹ ڈالی — اور یوں ہم دونوں دوست بن گئے —

اس دن میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھی، درخت سے گرنے والے پیلے پیلے خزاں رسیدہ پتوں کو گن رہی تھی — جانے کب آپی میرے پلنگ پر آ کر لیٹ گئی — میں نے پیٹھ پھیری تو وہ مجھی کو دیکھ رہی تھی —

"بلو —" وہ تھکی تھکی آواز میں بولی "جب سے میں پیدا ہوئی ہوں اس درخت پر بہار نہیں دیکھی — کبھی بہار نہیں دیکھی۔"

مجھے اس کی بات کا کوئی جواب نہ سوجھا — پھر تھوڑی دیر بعد وہ انتہائی کٹیلے لہجے میں بولنے لگی —

"بلو — سنا ہے وہ خلیل صاحب آگ میں کود گئے تھے تو آگ گلزار بن گئی تھی —"

"کون خلیل صاحب — ؟" میں حیرت سے بولی —

اس کے طنزیہ انداز سے مسکرانے پر میں سمجھ گئی کہ وہ حضرت خلیل علیہ السلام والے واقعے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

"وہ معجزوں کا زمانہ تھا آپی — اللہ کی قدرت کا چھوٹا سا معجزہ!"

اکدم وہ بپھر گئی "اب خدا کی قدرت کو کیا ہو گیا — ؟ اب معجزے کیوں نہیں جنم لیتے — ؟ میں جو دن رات آگ میں جل رہی ہوں تو یہ آگ کیوں گلزار نہیں بن جاتی — خدا وہی ہے بندے وہی ہیں، پھر اس کی قدرت کیا ہو گیا —"

"آپی" — میں سہم کر بولی "یوں نہیں کہا کرتے — آپی"

"یوں نہیں کہا کرتے تو پھر کیا کہا کرتے ہیں — ! یہ دیکھتی ہے میرے آس پاس انگارے ہی انگارے ہیں" وہ بستر سے اچھل کر یوں کھڑی ہو گئی گویا واقعی انگاروں میں بیٹھی ہوئی تھی "تجھے کچھ نظر نہیں آتا بلو میری —" آپی نے اتنے کرب سے مجھے پکارا کہ میں کانپ سی گئی!۔

وہ میرے بالکل قریب آ کر بیٹھ گئی —

"بلو — تجھے معلوم ہے یہ گھر والے کیا کیا باتیں کرتے ہیں —؟"

"نہیں تو" — میں حیران سی رہ گئی!

یہ لوگ میری شادی کے متعلق باتیں کرتے رہتے ہیں — ایک ایک کے متعلق — جو بغیر زر و جواہر کے انبار کے راضی نہیں ہوتا — وہ سادگی سے ہوئی —

مجھ پر جیسے بم گر پڑا ہو! آپی میری بڑی بہن تھی اور اس نے مجھے یوں مخاطب کیا تو بھونچکی سی رہ گئی۔

"مجھے معلوم ہے بلو تو میرے متعلق کیا سوچ رہی ہوگی — مگر میرا دل —؟" اس نے اپنا دبلا پتلا سا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ دیا — "مگر میرا دل پھوڑا بن چکا ہے — میں کسی ساتھی کی تلاش میں رہتی ہوں جو میری بات سن سکے — جو میرے دل کا بوجھ بانٹ لے تو میری بہن ہے نا — بہت پیاری سی بہنا دل کے ان داغوں کو کس کے سامنے عریاں کردوں —؟"

پلکوں پر چراغ جل اٹھے — میں نے اپنی ساری کا آنچل بڑھایا کہ ان موتیوں کو سنبھال لوں مگر وہ کہے گئی۔

"بلو — کیا غریب ہونا اتنا گناہ ہے کہ کسی کے کنوارے سپنے بھی پورے نہ ہو سکیں —؟ مجھ میں کیا بات نہیں ہے —؟ یہ رخسار پھول نہیں —؟ یہ آنکھیں نرگس نہیں —؟ یہ بال سنبل نہیں —؟ یہ قد سرو نہیں —؟ صرف پیسہ ہی تو نہیں ہے —" میں نے بات آگے بڑھائی

"صرف پیسہ ہی تو نہیں ہے خداوند ہے — آپی بغیر خدا کی مدد کے بھی کوئی کام ہوا ہے —؟"

اور مجھے بھی طرح یاد ہے کہ اس رات میں بستر پر سونے گئی تھی تو میری اپنی پلکوں پر بھی دیوالی کے دیئے جگمگا رہے تھے — جن سے روشنی نہیں اندھیرا پھوٹتا ہے —!!

گھر والوں کی کسر پھر کر بھید یہ کھلا کہ آپی کو دیکھنے کے لئے لوگ آ رہے تھے — اس سے اول کے پیام محض غربت کے مارے ہی پلٹ گئے تھے اس لئے اب کے یہ اہتمام بطور خاص کیا گیا کہ سسرالیوں کو کسی طرح مفلسی کا اندازہ نہ ہو جائے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا قیامت آ رہی ہے — ہر چیز کی اٹھا پٹخ ہو گئی — دیوان خانے کا سارا الم غلم کوڑا کرکٹ مودی خانے میں — مودی خانے کی دریاں دالان میں — دالان کا سلفچی آفتابہ باورچی خانے میں — یہ دھوکہ رہتا تو الگ رہی — جہیز کے نام کی جو بالیاں پڑی گل رہی تھیں انھیں بیچ دیا گیا — آخر سسرالی آ رہے تھے — کچھ نہ کچھ برابری تو کرنی ہی تھی — کرائے پر سستے داموں میز کرسیاں، قالین، پردے لائے گئے — ڈنر سٹ، ٹی سٹ لایا گیا — اور بس وہ وہ اٹھا پٹخ ہوئی کہ سارے گھر کا نقشہ ہی بدل کر رہ گیا — ہر طرف جھما جھم پردے ٹنگے ہوئے — دبیز قالین بچھے ہوئے — دیوان خانے میں کرسیاں صوفے بجے ہوئے — مجھے تو ہر لمحہ یہ محسوس ہوتا کہ میں اپنے گھر میں نہیں بلکہ کسی ماورائی مکان میں گھوم پھر رہی ہوں — روایتی شہزادے شہزادیوں کے محلوں کا نام ہی نام تو سنا تھا — ایسا لگتا تھا محل کچھ ایسے ہی سجے سجائے ہوتے ہوں گے۔

سسرالی آ کر اترے او گھر میں وہ چہل پہل مچی گویا عید آگئی ہو — ٹھسے ٹھاٹ سے کھانا پکتا — میز کرسیوں پر چنا جاتا — سنا شتے پکتے جاتے — اہتمام کھلائے جاتے — اور ایک دن آپی کو سجا بنا کر دولہے والوں کے سامنے بٹھایا گیا — ہونے والی ساس نے گھونگھٹ اٹھایا اور بس دیکھتی ہی رہ گئیں — آپی کے جسم پر ساڑی تھی — سلیقے سے بال گوندھے گئے تھے — اور پھر آپی کا وہ دل کی دھڑکن روک دینے والا حسن — جس میں سب سے نمایاں وہ بند اور جھکی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں جن کے نیچے میں نے افشاں چن دی تھی۔۔

"لڑکی تو ہیرا ہے —" چھوٹتے ہی ان کے منہ سے نکلا۔

سسرالیوں کی روانگی کے بعد — تقریباً دو چار ہفتے بعد ایک لفافہ ملا — میری تو مارے خوشی کے مسکراہٹ چھلکی پڑتی تھی انگ انگ سے — اور آپی کی بڑی بڑی آنکھوں میں سنہری خوابوں کی سنہری تعبیر تیر گئی — جیسے سارے چراغ بجھتے سے دکھائی دیتے — صبح تو ہونے جا رہی تھی!!!

لفافہ چاک کیا گیا —

لڑکی پسند آئی تھی — صورت شکل کی بات تو الگ رہی تو یہ سلیقہ بھی پسند آیا جو ماشاءاللہ ہزاروں جیسا تھا — مگر بڑے معذرت کے ساتھ،

حالات نے ہمیں گھر لینے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ کیونکہ وہ لوگ بھی معمولی حیثیت کے تھے۔ سنتے تھے کہ گھر والوں کی بیٹی کا نباہ ان لوگوں میں تقریباً ناممکن تھا ۔۔۔!!

"آپی محل بنتے بنتے ہم نے بے وقوفی سے پانی میں ریت ہی ریت بھر دی تھی"

آپی کچھ نہ بولی۔ بولتی بھی کیا؟ ! خود میرے حلق میں آواز پھنس رہی تھی ۔۔۔ میں بظاہر مسکرا کر بولی

"آپی۔ یہاں تو ہم نہ جی سکیں گے۔ بس میں نے ایک ترکیب سوچی ہے"۔

آپی کی آنکھوں میں امید کے سائے کانپے اور وہ بے تابی سے بولی۔

"کیا سوچا ہے"۔

مجھے خواہ مخواہ ہنسنا پڑا ۔۔۔" دوسرے دیش کو چل دیں گے اور کیا !"

اکدم آپی کھڑی ہو گئی ۔۔۔" میں تیرا مطلب سمجھ گئی۔ میں ہیں ...... وہ جلدی جلدی بولنے کی کوشش میں ہکلانے لگی۔

"میں مرنا نہیں چاہتی ۔۔۔ میرے خوابوں میں میرا محبت کرنے والا شوہر ہے۔ جس کی آنکھیں محبت کے خمار سے بوجھل ہیں۔ جس کا بھاری بھر کم جسم ہے اور مضبوط بانہیں ہیں۔ اور وہ بانہیں میرا بوجھ اٹھانے کا عزم رکھتی ہیں ۔۔۔ اور پھر میرے بچے ہیں۔ تیرا مگر میرے بچے ۔۔۔ مجھے ان سب کی آس ہے میں کیوں مروں؟؟"

میں کچھ نہ کہہ سکی ۔۔۔ اور اس کے بعد کچھ سن بھی نہ سکی ۔۔۔

آپی کیسی بدنصیب ہیروئن تھی ۔۔۔؟ کسی المیہ ناول کی اس ہیروئن کی طرح بدنصیب جس کی آخری سانس تک اس کا ہیرو اس سے مل نہیں پاتا۔ جس کے ہونٹوں پر آتی ہوئی ہر مسکراہٹ، مسکراہٹ بننے سے پہلے ہی آنسو بن کر آنکھ سے ٹپک جایا کرتی تھی ۔۔۔ اور جس کی ڈولی کا پردہ اٹھا کر میں نے بڑے پیار کے ساتھ کہا تھا ۔۔۔

"آپی میں تجھ پر ایک کہانی لکھوں گی"۔ اور آپی نے پہلے تو مسکرا کر اور بعد میں سنجیدہ ہو کر کہا تھا۔۔۔

"مگر تو لکھے گی کیا ۔۔۔؟

واقعی میں لکھوں کیا۔ ؟

آپی کے گلابی گلابی رخسار جو گلابوں سے مشابہ تھے بڑی سرعت سے ترائی کے پھول بنتے جا رہے تھے ۔۔۔ پیلے پیلے اور بے جان ۔۔۔ جو کھلتے تو بہار میں ہیں مگر خزاں رسیدہ۔۔۔ دکھائی دیتے ہیں!

سوتی ہوئی فضائیں پھر جاگیں اور ساتھ ہی آپی کے نصیب بھی جاگے شاید ۔۔۔ شادی کی بات پکی ہو گئی ۔۔۔ لڑکا کیسا تھا؟ یہ مجھے معلوم نہ تھا آپی کو بھی معلوم نہ تھا ۔۔۔ بس اتنا ہم دونوں کو معلوم تھا کہ وہ ایک لڑکا ہے ۔۔۔ ایک آدم ۔۔۔ جس کے بغیر حوا کی زندگی نامکمل ہوتی ہے ۔۔۔ اور جس کے تصور ہی سے آپی کے گالوں پر گلابیاں دوڑ دوڑ جاتی تھیں ۔۔۔

راتوں کو ہم دونوں جاگ جاگ کر باتیں کرتے ۔۔۔ بڑی پیاری پیاری میٹھی میٹھی باتیں۔ ہنسی آتی تو رو کے نہ رکتی۔ ہاتھوں سے منہ دبانے کی نوبت آجاتی ۔۔۔

شادی ہو گئی ۔۔۔!!

"سکھی ری ڈولی کھڑی ہے دوار ۔۔۔" اپنی بہن کے جواب بن کر زیادہ سکھی بن گئی تھی ۔۔۔ میں نے ڈولی کے دوارے کھڑے ہونے کا ذکر کیا تو وہ پہلے تو مسکرائی پھر رو پڑی ۔۔۔ پیار کا یہ اٹوٹ بندھن ۔۔۔ جو بچپنے سے بندھا ہوتا ہے ۔۔۔ جوانی آتی ہے تو اسے توڑ دیتی ہے ۔۔۔ مگر یہ ٹوٹ کر بھی کہاں ٹوٹتا ہے ۔۔۔؟

[آ]نسوؤں سے اور مضبوطی تو ہو جاتا ہے ——! آواز میرے گلے ہی میں گھٹ کر رہ گئی —— اور آپی چلی گئی —— جاتے وقت وہ اس بری طرح روئی کر
[ا]بند ہو گئی۔ سانس رکتا ہوا اس کی ہچکی بندھی تو پھر کبھی نہ رکی —— تھوڑے دن گزار کر آپی واپس میکے لوٹ آئی —— لڑکا دق زدہ تھا —— جس نے پندرہ دن
[د]لہن کو دلہن بنے دیا اور بیوہ کر دیا —— خوابوں کی دنیا کتنی جلد لٹ جاتی ہے —— پھول بھی تو اتنی جلدی نہیں مرجھاتے ——!؟

آپی کیا کھوٹا سکہ تھی کہ ہر بار گاہک سے دوکان دار کی ہتھیلی میں' اور دوکان دار سے گاہک کی ہتھیلی میں گرتی رہی مگر پھر بھی ٹھکانے نہ لگ سکی
میں نے سنا ہے کہ آنکھیں دیکھنے کے لئے بنی ہیں مگر میں نے یقین اس بات پر کیا ہے کہ دراصل آنکھیں رونے کے لئے بنی ہیں —— آپی جس نے میرے اس
[د]ل کو زندگی دی —— آنکھوں سے دیکھتی کم تھی اور روتی زیادہ تھی ——!!

جیسے آپی مر کیوں نہیں جاتی —— اکثر میں نے سوچا —— مجھے اپنے آپ پر غصہ آیا —— یہ میں کیا سوچ رہی ہوں؟ لیکن جب میں نے آپی کی اداس
[آنکھ]وں، بکھرے روکھے سوکھے بالوں اور تیزی سے سوکھتے ہوئے بدن کا خیال کیا تو مجھے اپنے آپ پر فخر محسوس ہوا —— ایک بہن اس سے زیادہ اور کیا چاہے گی؟ اور
[کی]ا چاہ سکتی ہے ——؟؟

آپی دیکھتے ہی دیکھتے اتنی بیمار ہو گئی کہ چلنا پھرنا تو بڑی بات ہے اپنی طاقت سے اٹھ بھی نہ سکتی —— بیٹھے بیٹھے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر بکھر جاتی
[آ]خر ایک زندگی اپنے مستقر کی طرف رواں دواں ہے —— مگر اس راہ کی منزل بھی دور تھی —— اسے یوں گھلتا دیکھ کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ آپی کو اس مصیبت
سے تو نجات دلانا ہی ہے ——

آپی کے سرہانے بیٹھے بیٹھے میں اس کی سانسیں گنتی رہتی —— کبھی تو یہ آخری سانس لے گی ——! رات کے دو بجے کے قریب آپی نے کراہتے ہوئے پانی مانگا
[ت]و میں نے پانی میں گلوکوز ملانے کی بجائے زہر کی بوندیں ٹپکا لیں۔ جس کی دو ایک چسکیاں ہی میٹھی نیند کے لئے کافی ہوتیں —— گلاس سرہانے رکھ کر میں نے
[ا]سے سہارا دیا اور تکیہ سے ٹکا کر بٹھا دیا ——

میرے ہاتھ کانپ رہے تھے —— دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ خلاف توقع آپی نے بولنا شروع کیا۔

" بلو —— یہ زندگی کتنی کٹھن ہے ——؟"

" ہاں آپی ——" میں نے نہایت بھونڈا سا جواب دیا ——

" بلو —— کیا بات ہے —— پھر بھی مرنے کو دل نہیں چاہتا —— نا؟"

وہ کئی دنوں کے بعد مسکرائی —— مگر میں نہ مسکرا سکی ——

" —— تو یقین کر —— میری یہ جلتی آنکھیں کئی راتوں سے نیند سے محروم ہیں —— ہر رات میں ستاروں کو دفن کرتی ہوں —— چاند کو میں اپنے ہاتھوں
[اٹھ]اتی ہوں —— میرے دیکھتے ہی دیکھتے یہ اندھیرے اجالوں کا سفید کفن اوڑھتے ہیں —— میری صبحیں ویران ہیں بلو —— میری شامیں گھٹ گئی ہیں ——
[ب]ہتی ہواؤں میں مجھے سسکیاں سنائی دیتی ہیں —— ستاروں کو دیکھ۔ ستارے کب ہیں —— یہ تو آنسو ہیں —— رات کے آنسو —— آسمان کے آنسو ——
جو میرے لئے بہاتا ہے —— اور وہ رک گئی! پھر اس نے میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا ——

" بلو —— یہ سب کچھ سہی —— مگر پھر بھی مجھے یقین ہے کہ میرے خواب ضرور پورے ہوں گے —— کبھی تو یہ انگارے پھول بنیں گے جن میں آج میں جل بھن
رہی ہوں —— مر رہی ہوں —— کبھی تو یہ آگ گلزار بنے گی ——

اس کی سانس پھول رہی تھی ——

" زندگی کے اتنے دن میں نے یہ سوچ سوچ کر ہی تو گزارے ہیں اور ایسا بھی نہ سوچوں تو کیا کروں ——؟ تو ہی کہہ میری بلو محبت کرنے والے
شوہر —— چھوٹے سے گھر اور پیارے بچوں کی تمنا بری تمنا ہے ——؟

میں نے آہستہ سے اس کا سر تکیہ پر رکھ دیا ـ اور گلاس اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا ـــ

جلے پاؤں کی بلی کی طرح میں اگر گھر کے کونے کھدروں میں اپنے زخم چھپاتی پھری بھی تو میرے زخم کہاں مندمل ہو سکے؟

چاند کی تمنائیں گھٹتی رہیں ـــ ستارے دفن ہوتے رہے ـــ اندھیرے اجالوں کا کفن اوڑھتے رہے ـ چراغ جلتے ہی رہے مگر روشنی نہ ہو سکی ـ چراغ بجھتے رہے مگر مسکراہٹیں کہاں گئیں ؟؟

اماں باوا کے سینے پر پتھر کی سل رکھی ہوئی تھی ہٹانا تو ضرور تھا ـــ یوں بھی پکا ہوا انگور کب تک شاخ پر ٹکا رہتا ـ ؟؟

بادلوں کا سینہ چیر کے سورج جھانکنے لگا ـ اور اب کے ایسا بھرپور ایسا جگمگاتا اجالا ہوا کہ آنکھیں میچنے کی نوبت آ گئی ـــ

"لڑکا" اتنا سعادت مند ملا کر دمڑی بھی نہ مانگی ـــ بس لے لڑکی ہی چاہیئے تھی ـ ہمیں اور کیا چاہیئے تھا ـــ

گھر بھر میں وہی بد رونق دوڑ گئی ـــ اور اب کے تو میں نے بھی سوچ لیا کہ سالی ہونے کے ناطے کچھ تو مذاق کرنا ہی پڑے گا ـ سوچ کر طے کر لیا کہ جوتا چھپاؤں گی اور کچھ نہیں تو پچاس روپے تو اینٹھ ہی لوں گی دولہا بھائی سے ـــ کتنے امیر جو ہیں ـ

لال لال جوڑا پہنا کر جب آپی کو مسند پر بٹھایا گیا تو "دولہا آ گیا ـــ دولہا آ گیا" ـــ کا شور مچا ـ برات دیکھنے سبھی بھاگے تو میں بھی بھاگی ـ ـ

پہلے تو میں آنکھیں ہی پھاڑتی رہی ـ پھر تصویر سی دیر تک آنکھیں ملتی رہی ـ اور میں نے محسوس کیا کہ میرے آنکھوں کے آگے بے نام سے اندھیرے بل رہے ہیں ـ دھند چھا رہی ہے جسے میں کوئی نام نہیں دے پا رہی ہوں ـــ ہاتھوں پر ٹپکنے والے گرم گرم آنسوؤں نے مجھے سمجھایا ـــ

"پگلی ـــ اس دھند کا جو تیری آنکھوں کے آگے چھا رہی ہے' نام آنسو ہے"

آنسوؤں کی چادر سے میں نے بصد مشکل جھانک کر دیکھا ـــ

"دولہا بھائی" کی ایک بالشت سفید داڑھی ہوا کے ہلکورے سے کانپ رہی تھی ـــ وہ جوتا چھپانے کی رسماتی تمنا میرے ذہن اور دل سے یوں نکل گئی جیسے میری آنکھوں سے آنسو پھسل پڑے تھے ـــ آنکھیں صاف کر کے میں آپی کے پاس پہنچی اور بھرے دل سے بولی ـ

"آپی نئی زندگی کا نیا دور مبارک!" ـــ

"اپنے دولہے بھائی کو دیکھا تو نے ـــ؟" وہ بڑے شرمیلے انداز میں بولی ـــ اس سوال کے جواب میں میں نے سوچا کہ آپی پر ایک کہانی لکھوں گی ـ جب وہ ڈولی میں بیٹھ کر جانے لگی تو میں نے بصد مشکل کہا تھا ـ

"آپی میں تجھ پر ایک کہانی لکھوں گی ـــ"!

مگر اس وقت تک شاید آپی نے آرسی مصحف کے وقت اپنے دولہے کی داڑھی دیکھ لی تھی کہ وہ پہلے تو غم سے مسکرا دی تھی پھر سنجیدہ ہو کر بولی تھی ـــ

"مگر تو لکھے گی کیا ـــ؟"

لکھنے کے لئے اب کچھ بھی تو نہیں رہ گیا ہے ـــ آپی کی وہ اداس اداس سی مسکراہٹ مجھے یاد آتی ہے تو ایسا لگتا ہے کوئی زہر میں بجھا ہوا نشتر میرے سینہ میں چبھو رہا ہے ـــ اس نشتر نے میرے سدا ہی تو زخم لگائے ہیں مگر ان زخموں کے لئے آج تک کوئی مرہم نہ مل سکا ـ

آپی چلی گئی ـــ وہیں دیوار سے لگ کر کھڑے کھڑے میں نے بڑے دردناک انداز میں ہال چھیڑا تھا ـــ ہر لمحہ آپی کی ڈولی نگاہوں سے دور ہوتی جا رہی ـ اور میرا دل بھر آ رہا تھا ـــ بہرحال آپی کی زندگی کی وہ صبح آ ہی گئی تھی جس کے لئے اس نے اپنی آنکھوں پر نیندیں حرام کر دی تھیں ـ میں نے ہیں ٹھونس لیا تھا اور گیت مر گیا تھا ـ

آپی کئی دنوں بعد آئی ـــ مگر وہ وہیں تھی جہاں سے چلی تھی ـــ

میں کچھ ایسا سوچتی ہوں کہ جب تک عورت کی کوکھ سے کوئی تخلیق جنم نہیں لیتی ـــ جب تک عورت کے قدموں کے نیچے کیسی جنت کی تعمیر ہیں

ہی — جب تک اس کے سینے سے دودھ کی دھار نہیں پھوٹتی۔ اس کی شخصیت مکمل نہیں ہوتی ۔۔ عورت کی ہستی اس وقت مکمل ہے جب تک کہ اس کے گہوارہ نہ ہلیں —

آپی کی کوکھ سے کسی تخلیق نے جنم نہ لیا۔ اس کے قدموں کے نیچے ایسی کوئی جنت تعمیر نہ ہو سکی جس پر وہ غرور کر سکتی۔ اس کے سینے سے کبھی دودھ کی ایسی دھاریں نہ پھوٹ سکیں کہ اس کے دل کو بھی یہ ناز رہتا کہ وہ بھی ایک "خالق" ہے —— کسی کو زندگی بخشتی ہے —— آپی سدا نامکمل رہیں —— اس کی شخصیت ادھوری ہی رہی ——

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب آپی آخری بار آئی تھی تو اس کی آنکھوں نے دیپ جلانے چھوڑ دیئے تھے —— ایسے چراغ جلانے سے فائدہ بھی کیا تھا جن سے دل کا اندھیرا دور نہ ہوتا ہو —— ؟ ہر وقت وہ آنکھیں بند کئے پڑی رہتی —— خلیری، ممیری بہنیں اپنے گودوں میں بچے سنبھالے آ بیٹھتیں تو وہ بچوں کی طرف بڑی حسرت بھری نظروں سے دیکھتی۔ وہ تو زرخیز ہوتے ہوئے بھی بنجر زمین کی طرح تھی جہاں کوئی پودا نہیں اگتا ——

اولاد کی زندگی میں کچھ کیا اہمیت رکھتا ہے —؟؟ حضرت آدم پہلے اس دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ انھیں ہر طرف سونا سونا پن اور تنہائی نظر آئی۔ ان کی روح نے ایک ساتھی کو کھوجنا شروع کیا اور خداوند تعالیٰ نے ان کی پسلی سے حوّا کو پیدا کر دیا —۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اگر دنیا میں پہلے پہل حوّا بھیجی جاتیں تو اپنے سونے پن کو دور کرنے کے لئے وہ جس آبادی کو ڈھونڈتیں وہ ان کی پسلی سے نہیں بلکہ ان کی کوکھ سے جنم لیتی۔

مگر آپی بیچاری ایسی بدنصیب حوّا تھی جس کی پسلی سے کوئی آدم پیدا ہوا نہ کوکھ سے کوئی لال —— اس وسیع و عریض دنیا میں اس کے زخم کا مرہم کہیں نہ مل سکا۔

آپی کی کوسن پڑھتی گئی —— بستر پر پڑی ہوتی تو پتہ بھی نہ چلتا کہ کوئی متنفس پڑا ہے۔

"میری زندگی میں صبح آئی نہ کوئی سورج ہی چمکا" ایک دن اس نے بڑی حسرت سے کہا۔

"تو نے ٹھیک کہا تھا بلو میری جان — کہ پیسہ کیا نہیں —— ہمارا کوئی خدا تو نہ تھا" پھر وہ ایک سانس بھر کر رہ گئی تھی۔

"اگر دوسرا جنم مجھ کو ملے اور میری رائے پوچھی جائے تو میں صاف کہہ دوں گی کہ مجھے زر دو اور کالیے انبار بنا دو تاکہ اس دنیا میں کوئی سلمٰی میری طرح آگ میں نہ جلے —"

اس دنیا میں کوئی سلمٰی آگ میں جلے یا نہ جلے — مگر آپی جل گئی — بھسم ہو گئی — راکھ بن گئی —— وہ انگاروں سے توقع کرتی رہی کہ پھول بن جائیں گے مگر وہ آگ کبھی گلزار نہ بن سکی ——

آج آپی ڈولی میں بیٹھ کر چلی گئی ہے۔ جاتے سمے اس کی آنکھوں میں ایک آنسو بھی تو نہ تھا —۔ البتہ ہونٹوں پر ایک مدھر مسکراہٹ ضرور تھی۔

آج آپی کی ڈولی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اٹھ چکی ہے۔ اب کبھی اس دوار سے ڈولی نہیں اٹھے گی —— آپی کبھی دولہن نہیں بنے گی —— مگر جانے مجھے کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ یہاں ضرور ڈولی آئے گی —— آپی دلہن بن کر اس میں بیٹھے گی اور میں بابل چھوڑوں گی —— اس وقت میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہی مسکراہٹ ہوگی —— مگر اس لمحے تو میری آنکھوں میں آنسو جھل ملا رہے ہیں —— اور میں قلم پکڑے بیٹھی سوچ رہی ہوں کہ کیا لکھوں ——؟؟

سلطان جمیل نسیم

تلخ تجربے

نچلی منزل سے جب تیز تیز آوازیں شدت سے آنے لگیں تو باجی نے مجھ سے کہا۔

"بچارے برق صاحب پر برق گرنی شروع ہو گئی"

برق صاحب آج ان شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں جن پر اردو شاعری کو فخر ہونا چاہیے۔ اپنی زندگی کے چالیس پینتالیس سال اس شخص نے اپنے فن اور زبان کو نکھارنے اور سنوارنے میں گزار دئے ——— سارے ہندوستان میں جہاں جہاں برق صاحب کے جاننے والے ہیں ان کا نام بڑا ادب و احترام سے لیا جاتا ہے ملک کے تقریباً ہر شہر میں ان کا کوئی نہ کوئی شاگرد موجود ہے۔ حکومت ہند نے ان کا وظیفہ مقرر کر رکھا ہے لیکن اس عظیم شاعر کی اپنے گھر میں کوئی وقعت نہیں۔ بیوی، جی کا جنجال تصور کرتی ہیں۔ روز بیچ بچاؤ ہوتی ہے۔

"بھاڑ میں جائے تمہاری شاعری بھی"

"اے میں کہوں تمہیں اس شاعری کے علاوہ بھی دنیا جہان کا کوئی کام ہے یا نہیں"

"اللہ نے میرے مقدر میں یہ شاعر کیوں لکھ دیا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ میں زندگی بھر کنواری ہی رہتی"

"ناس جائے اس شاعری کا ——— اے میں کہتی ہوں تم میری کوئی بات ڈھنگ سے سنتے بھی ہو۔ یا ہر وقت شاعری کی پینک میں جھومتے ہی رہتے ہو"

اور اسی قسم کے لاتعداد جملے ان کی شان میں تقریباً روز برق ریز بن کر گرتے۔ ایسے وقت میرا صبر و تحمل دیکھنے کی چیز ہوتا۔ اس لئے کہ مجھے برق صاحب سے محبت ہی نہیں بلکہ بچاری کی طرح ان کا احترام بھی کرتا ہوں۔ ایسا مکمل انسان، ایسا عظیم شاعر، شاید ہمارا مستقبل ہمیں نہ دے سکے گا۔ چنانچہ جب برق صاحب اپنی زوجہ محترمہ کی زد میں آتے تو میں ہونٹ چبا چبا کے رہ جاتا۔ بار بار بالوں پر ہاتھ پھیرتا۔ بار بار زور زور سے مٹھیاں بھینچتا اور باجی مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرائی رہتیں ———

ملازمت کے سلسلے میں جب مجھے اس شہر میں آنا پڑا تو رہائش کی تکلیف زندگی کا ایک جز بن گئی۔ میں نے اپنے ہر جاننے والے سے مکان کے بارے میں کہہ رکھا تھا اور ہر جاننے والے نے اس بات کا وعدہ بھی کر لیا تھا کہ اگر کوئی مکان نظر سے گزرا تو وہ میرا خیال ضرور رکھے گا۔ اتفاق سے ایک مشاعرے میں مجھے برق صاحب سے خصوصی نیاز حاصل ہوا۔ ویسے تو میں برق صاحب سے کئی ہی مرتبہ مل چکا تھا لیکن اس مشاعرے میں برق صاحب نے مجھے قریب بیٹھنے کا شرف بخشا، خاص توجہ کی نظر رکھی، میرے بعض معمولی اشعار پر بھی دل کھول کر ایسی داد دی ——— کہ میری غزل حاصل مشاعرہ قرار پا گئی۔ چلتے وقت برق صاحب نے دوسرے دن مجھے اپنے گھر پر آنے کی دعوت دی، یہ ان کی نوازش تھی۔ کرم تھا میری توقع سے زیادہ۔ میں نے سر جھکا کر وعدہ کر لیا کہ وقت مقررہ پر ضرور حاضر ہوں گا۔

[illegible] جب میں برق صاحب کے ہاں پہنچا تو وہ میرے منتظر تھے۔ بہت خوش ہو کر ملے [illegible] ادبی مسائل

بشکو فرماتے رہے۔ میں دفور عقیدت میں بت بنا بیٹھا ان کی باتیں سنتا رہا۔ چلتے وقت اس بات کی بھی اجازت لے لی کہ اپنی غزلیں بغرض اصلاح دکھا لیا کروں۔ میری اس بات کو حضرت برقؔ نے شرف قبولیت بخشا اور فرمایا۔

"جی یہاں تو روز ہی شام کو ایک محفل سی ہو جاتی ہے تشریف لایا کیجئے۔"

میں نے مؤدبانہ طریقے سے عرض کیا۔

"بسر و چشم، ضرور حاضر ہوں گا۔ لیکن میں جہاں رہتا ہوں وہ جگہ یہاں سے ذرا فاصلے پر ہے"

"کہاں رہتے ہیں آپ؟"

میں نے اپنا پتہ بتایا اور یہ بھی عرض کیا کہ بغیر مکان کے زندگی خانوں کا بوجھ بن گئی ہے۔ دن بھر اٹھائے پھرتا ہوں اور رات کو جا کر ایک کرائے کے کمرے میں پھینک دیتا ہوں۔

"آپ کے ساتھ اور کون ہے؟"

"جی یہاں تو تنہا ہوں۔ آگرہ میں میری بڑی بہن ہیں۔ والدین پاکستان جا چکے ہیں"

"ارے حضرت آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ بھئی یہ دو منزلہ مکان ہے اوپر کا حصہ خالی ہے۔ نیچے ہم لوگ رہتے ہیں۔ اوپر کا راستہ بھی الگ ہے اور ہمارے منّن کی والدہ نے آج ہی مجھ سے اس بات کا تذکرہ کیا تھا کہ اوپر کی منزل کرایہ پر دے دی جائے۔ آپ اپنی ہمشیرہ کو یہاں بلا لیجئے"

یہ خبر میرے لئے مسرت جانفزا تھی۔ برقؔ صاحب نے ایک "آشیانہ" عطا فرمایا تھا۔ میں نے فوراً باجی کو تار دیا۔ اور وہ تیسرے ہی دن اپنے بچے جاوید کے ساتھ آگئیں۔

برقؔ صاحب کی صحبت میں میرا شعور نکھرنے لگا۔ میرے اشعار میں معنی آفرینی، دل آویزی اور زبان کی چاشنی بڑھنے لگی۔ میرے وجدان سے کثافت چھٹنے لگی۔ یہ سب برقؔ صاحب کی وجہ سے تھا۔ لیکن برقؔ صاحب رات کو نو بجے کے بعد ہماری محفل کو سونا کر دیتے اور مجھ جیسے بہت سے لوگ جو اس علم و دانش کے سمندر سے کچھ موتی چننے آتے تھے نو بجتے ہی اٹھ کھڑے ہوتے۔

پھر معلوم ہوا کہ برقؔ صاحب نو بجے کے بعد کچھ "شغل" کرتے تھے۔ اور وہ مجھ جیسے نووارد نوجوانوں کو اسی وجہ سے ٹال دیا کرتے تھے۔ پیتا تو میں بھی تھا۔ لیکن کبھی کبھی ــــ سوچا کہ برقؔ صاحب پر ظاہر کردوں تاکہ اس عالم میں بھی اس شاعر کو دیکھ سکوں۔ پھر یہ سوچ کر کہ برقؔ صاحب مجھ سے اپنے نوجوان لڑکے منّن کی طرح پیش آتے ہیں۔ یہ بات سن کر نہ جانے کیا خیال کریں۔ میں خاموش ہو گیا۔

برقؔ صاحب کے لڑکے حبیب سے جن کو سب گھر والے منّن میاں کے نام سے پکارتے تھے میرے خاصے مراسم ہو گئے تھے رات کو نو بجے کے بعد میں اکثر برقؔ صاحب کے پاس سے اٹھ کر یہاں حبیب کے پاس آ کے بیٹھ جاتا تھا۔ لیکن یہ نوجوان ادب سے بالکل بے بہرہ تھا کسی ادبی موضوع پر گفتگو نہ کر سکتا تھا۔ البتہ فلم دیکھنے کا بڑا شائق تھا تمام فلمی اداکاروں کی تصویریں اس کی الماری میں موجود تھیں ان کے اصلی اور فلمی نام اسے ازبر تھے۔ بلکہ بعض کے تو سن پیدائش تک بتا دیتا تھا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی۔ اردو کے لئے ایک استاد شاعر کا لڑکا اور یہ حال۔ اس لئے حبیب کی صحبت سے جلد ہی اکتا گیا۔

ایک رات میں ٹہلتا ہوا سے واپس آیا تو میرے کمرے میں، میری بھیری برباجی کے علاوہ ایک اور حسین سی لڑکی بیٹھی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو شرما گئی۔

"اے گھبرا ــــ ادھر پردہ ہے"

میں نے الٹے قدموں پلٹ گیا۔ لیکن وہ موہنی صورت نظروں میں کھب گئی۔ اسے ایک بار اور دیکھنے کی تمنا دل کے نہاں خانہ میں گھر کر گئی

میں دوسرے کمرے میں ہو گیا۔ اور وہ صاحبزادی نیچے چلی گئیں۔ باجی نے بتایا۔

"برق صاحب کی لڑکی ہے ممتن" جی۔ الف۔ اے میں پڑھتی ہے۔ بچاری اپنی اماں سے چھپ چھپ کر آزاد نظمیں کہتی ہے" — یہ سن کر میں ہنس دیا۔

"باجی۔ برق صاحب نے بھی اپنے دونوں بچوں کے نام خوب رکھے ہیں؟ ۔جگن اور ممتن"

"ارے یہ تو پیار کا نام ہے۔ ایسے ہی جیسے تم "دلارے میاں" ہو۔ جگن کا نام حبیب الرحمان ہے اور اس کا انجم تاب ۔"

"عجیب نام ہے۔ انجم تاب۔ ہونہہ ۔"

ہم دونوں بڑی دیر تک برق صاحب کے گھر کی باتیں کرتے رہے کہ ایسے شاعر کی گھر میں کیا حالت ہوتی ہے۔ برق صاحب کی بیگم انکا ہو گو شاعرہ ہیں کہ توبہ — روز معذ بجنگ بچ ہوتی ہے برق صاحب بڑے صبر و تحمل سے بیگم کی دس باتیں سننے کے بعد ایک بات کہہ جاتے ہیں اور پھر سارا گھر سر پر اٹھالیا جاتا ہے۔

اس وقت بھی یہی ہو رہا تھا۔

باجی ناشتہ تیار کر چکی تھیں — میں نے جلدی جلدی ناشتہ کیا۔ شیروانی کندھے پر ڈالی اور زینہ کی طرف بھاگا۔ آج دیر سے سو کر اٹھنے کے باعث شیونگ نہ کر سکا تھا۔ پہلی ہی سیڑھی پر زور کی ٹکر ہوئی اور پھر ایک نسوانی چیخ' وہ تو خیریت ہوئی کہ میں نے جلدی سے اسے تھام لیا۔ شیروانی میرے کندھے سے نیچے جا گری۔ باجی دوڑی ہوئی آئیں۔

" ارے کیا ہوا — کیا ہوا "

اور انجم کو میرے بازوؤں میں بدحواس دیکھ کر گھبرا گئیں۔ میں نے اپنے حواس مجتمع کئے انجم کو بھی کچھ ہوش سا آیا تو وہ فوراً دوپٹے سے منہ چھپا کر کمرے میں گھس گئی۔ باجی مجھے دیکھکر مسکرائیں اور میں شرم سے پانی پانی — نیچے کی طرف اتر گیا۔

پہلی بار میں نے انجم کو مکمل طور پر دیکھا۔ وہ تو جا چکی تھی مگر اس کا لمس اب تک میرے بازوؤں پر اب تک موجود تھا۔ میری جھلاہٹ سرشاری میں تبدیل ہونے لگی۔ میں بہت دیر تک انجم کے گدگدے جسم کی نرمی اور گھبرائی ہوئی سانس کی گرمی کو محسوس کرتا رہا۔

شام کو گھر پہونچا تو باجی نے کھانے کے بعد پہلی بات یہی کہی کہ

" صبح کی بات پر ممتن بچاری کتنی ہی مرتبہ پچھتاوا ظاہر کر چکی ہے۔ وہ دراصل آ اس مقصد سے رہی تھی کہ تم سے پڑھنے کے لئے بات چیت کرے — لیکن تم نے تو زینہ پر ہی تمام گفتگو کر ڈالی۔ انہوں نے ہنس کر مجھے چھیڑا۔

میں نے خجالت آمیز لہجے میں کہا۔ "کیا بتاؤں باجی دفتر کو ویسے ہی دیر ہو رہی تھی، میں ایک دم جلدی میں بھاگا تھا — وہ بھی شاید اتنی ہی جلدی میں تھی۔ میں اسے پکڑ نہ لیتا تو خدا جانے کیا ہوتا۔"

باجی نے مسکرا کر بات ٹالی۔ "لڑکی پسند ہے؟"

"جی"!! میں اس اچانک حملے سے گھبرا گیا۔

"صرف 'ہاں' یا 'نہیں' میں جواب دو" باجی ایک اسپیشل کے ممبر کی طرح بولیں۔ میں نے ان کی طرف ایک نظر دیکھا اور مسکرا کے خاموش ہو رہا۔

انہوں نے دوبارہ یہی سوال کیا — تو میں نے کہا،

"اب مجھے شبہ ہے، آپ کی باتوں سے بڑی امید ہے۔ اپنی شادی تو اب پاکستان ہی میں ہوگی۔"

"وہ لوگ بھی تو پاکستان جا رہے ہیں" وہ بولیں

اور جیسے خوشی سے میرا دل دھڑکنے لگا۔ مسرت کی ایک لہر سی جیسے تمام جسم میں دوڑ گئی۔ باجی نے پھر کہا۔

"میں یہ کہنے آئی تھی کہ اس کا امتحان قریب آگیا ہے۔ وہ انگریزی میں بہت کمزور ہے۔ تم سے پڑھنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ میں نے کہا وہ خود ہی آکر بتلائے گا۔ اب کہو ــــ راضی ہو یا انکار کر دوں، اپنی طرف سے۔"

"باجی، یہ پردہ کی پڑھائی ــــ مجھ سے تو نہ پڑھائی جا سکے گی"

"یہ تو میں پہلے ہی سے جانتی تھی ــــ" باجی نے ہنس کے چٹکی لی "خیر میں نے آمادہ کر لیا ہے کہ تم سے پردہ توڑ دے"

میرا دماغ خوشی سے باتیں کرنے لگا، ان باجی سے بھی خدا سمجھے، ہر خوبصورت اور حسین لڑکی کو بھاوج بنانے پر تیار ہو جاتی ہیں لاکھ سر مارا مگر ان کی ضد سے پیچھا چھڑایا۔ تو پھر اچانک بہن پسند آگئی تصویر ہی تصویر میں اس کو بھاوج بنا ڈالا۔ اور اب بقول باجی کے ان کی ضد اور اصرار کی بہن تو انجم کے پیر کی جوتی بھی نہیں۔ یہ ضرور مجھ سے منسوب ہوتی ــــ لیکن یہ انجم، ظالم سچ مچ قیامت ہے۔

میں نے باجی سے اقرار کر لیا اور دوسرے دن سے انجم پڑھنے آنے لگی۔ پہلے دن وہ شرما رہی تھی اور میں جھجک رہا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ میری جھجک تو ختم ہو گئی، اس کی شرم بدستور۔ انجم نے اس شرط پر پردہ توڑ کر مجھ سے پڑھنا شروع کیا تھا کہ باجی موجود رہا کریں گی مگر اس خدا کی بندی مشکل تھی پہلے ہی دن وہ "ارے چلو یہ دور رہا ہے "اسے شلا آؤں" کہہ کر جو گئیں تو گئیں۔ انجم پڑھنے کے بعد ان کے پاس خود پہنچ گئی۔ دوسرے دن چاء کا پانی ابلنے لگا۔ تو باجی کو اس کا دیکھنا ضروری ہو گیا۔ اور پھر تو انہوں نے ضرورت ہی نہ سمجھی۔ میں جانتا تھا کہ باجی جان بوجھ کے موقع دے رہی ہیں۔ انجم میرے تصور پر ہر وقت اور ہر لمحہ چھائی رہنے لگی۔ اور میں ایک غزل روز کہنے لگا۔ برقی صاحب غزلوں پر اصلاح دیتے دیتے گھبرا گئے۔ کہتے گئے۔

"آج کل آمد بڑے زور پہ ہے"

لیکن انجم ــــ وہ تو شاید میرے جذبات و خیالات سے لاپرواہ بنی، پڑھے جا رہی تھی۔ ایک دن میں نے ذرا ہمت کی اور کسی لفظ پر اسے ٹوک کر کہا۔

"منی ــــ دیکھو یہ لفظ اب متروک ہو چکا ہے۔ اس کے بجائے دوسرا استعمال کرو"

پہلے تو اس بات پر شرمائی پھر آہستہ سے کہا۔

"بہت اچھا دلارے میاں"

اُف ــــ پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ میرے اس پیار کے نام میں کتنا پیار بھرا ہے اور جب میں نے اسے گھور کے دیکھا تو وہ زیر لب مسکرا رہی تھی۔ اس رات مجھے فضا میں چاروں طرف منور پیکر رقص کرتی نظر آئیں اس رات چاند میں روشنی اور ستاروں میں چمک بڑھ گئی اس رات کی فضا میں انجم کی شرمیلی مسکراہٹ گھل گئی تھی۔ اس رات میں نے ہوا میں انجم کی زلفوں کی بھینی بھینی خوشبو محسوس کی اور اس رات میں بار بار بے اختیار مسکرایا مگر دوسرے دن رات کو دیر تک جاگنے کے باوجود جلدی اٹھ بیٹھا۔ کل کے تصور نے مجھے سرشار کر رکھا تھا۔

پھر وہ منی سے انجم ہو گئی اور میں دلارے سے جمیل ــــ ہم دونوں میں جو رابطہ پیدا ہو گیا تھا گہرا ہوتا گیا۔ بہت گہرا ــــ ہماری محبت استوار ہوتی گئی ــــ اور جب ایک دن انجم نے مجھ سے کہا کہ ہم لوگ جلدی پاکستان جا رہے ہیں تو میں نے اپنے اور باجی کے پاسپورٹ کے لئے کوشش شروع کر دی۔

اور ایک دن برقی صاحب اپنا پیدائشی مکان میری تحویل میں دے کر پاکستان روانہ ہو گئے۔ جاتے وقت میں نے رندھے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"جلدی آؤ ۔ گائیں بھی ۔"

انجم کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے ۔ میں نے باجی کو سلام کر کے رومال اور برق صاحب کو ان کا بستہ پورا خیال رکھنے کی تاکید کر کے گاڑی چلنے سے قبل ہی پلٹ آیا ۔

✱

اب انجم کا تصور تھا اور میں ۔۔ کسی ملازمت کو کوستا جس کی وجہ سے میں نہ جا سکا ۔ کبھی اپنے اوپر لعنت بھیجتا کہ ملازمت کی بات ما گیوں نہ سب کے ساتھ ہو لیا ۔ یہ ہیجانی کیفیت انجم کا خط ملنے کے بعد کچھ کم ہوئی ۔ یہ پہلا محبت نامہ تھا ۔ یہ خط بھی میرے لئے وہی کیف لایا تھا جو میں پہلی بار نادانستہ انجم کو اپنے بازوؤں میں پا کر محسوس کیا تھا ۔ یہ خط اس نے "ولاسہ" ہی کے القاب سے شروع کیا تھا ۔ اور پھر خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا ۔

ایک دن میں نے باجی کو لکھ ہی دیا ۔ " آپ امی اور پاپا سے انجم کا تذکرہ کریں ۔ اور بات پختہ کر لیں ۔ جیکسن کے منیجر سے بات ہو گئی ہے وہ میرا تبادلہ کرنے پر رضامند ہے میں چاہتا ہوں تمام امور میرے پاکستان آنے سے قبل طے ہو جائیں ۔ آپ امی اور خالہ جی کو لیکر برق صاحب کے ہاں جائیے ۔۔ میں ان کو بھی لکھتا ہوں ۔۔ "

باجی کا جواب آیا کہ انہوں نے امی اور پاپا کو رضامند کر لیا ۔ اور اب کسی دن وہ لوگ برق صاحب کے ہاں جائیں گے ۔

میں انجم کے متعلق جتنا سوچتا وہ اسی قدر میرے دل و دماغ پر چھائی چلی جاتی ۔ میں شدت سے انجم کو دیکھنے کی تمنا اپنے دل میں محسوس کرنے لگا ۔ میں نے انجم کو بھی لکھ دیا کہ باجی اور امی وغیرہ تمہارے ہاں آئیں گی ۔ انہیں مایوس نہ کرنا ۔۔ اور برق صاحب کو بھی ایک نیازمندانہ قسم کا خط تحریر کیا ۔ اور اپنی تازہ غزل اصلاح کے لئے بھیج دی ۔

باجی کا خط آیا ۔ لکھا تھا

" ۔۔۔ ہم لوگ برق صاحب کے ہاں گئے تھے ۔ سب بہت تپاک سے ملے ۔ انجم کمرے ہی میں سے نہیں نکلی ۔ تم نے لکھ دیا ہوگا ۔ بہت بے صبرو ۔ بات منظور ہو چکی ہے آ جاؤ تو منگنی تو ہو ہی جائے " ۔ میں نے جلدی جلدی اپنی روانگی کا انتظام شروع کر دیا ۔ اسپورٹ تیار تھا ہی ۔ تبادلہ کا آرڈر بھی لے لیا ۔ تمام سامان بک کرا دیا ۔ اور برق صاحب کا مکان ان کے دوست جگل پرشاد کی نگرانی میں دیکر دامن جھاڑ لیا اور پاکستان پہنچنے کے لئے بے چین ۔ لیکن جس شام میں وہاں سے چلنے والا تھا ۔ اسی دن مجھے باجی کا خط ملا ۔

" ۔۔ یہ بات میں تمہیں لکھنا نہیں چاہتی تھی ۔ لیکن اس وقت عجیب قسم کی کشمکش میں مبتلا ہوں ۔ قہقہہ لگا کر ہنسنا بھی چاہتی ہوں اور رونا بھی ۔ اور میں یہ اس غم کو مکمل کرنے کے بعد طے کروں گی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے ۔

کل انجم کی امی بڑی گھبرائی ہوئی آئیں ۔ برق صاحب بھی آئے تھے ۔ وہ پاپا سے گھبرا گھبرا کر کچھ کہہ رہے تھے ۔ ان کی بیوی امی کو بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھیں ۔ میں حیران تھی کہ آخر بات کیا ہے ۔ یہ ایسی کونسی بات کہنا چاہتی ہیں جو کوشش کے باوجود نہیں کہہ پا رہی ہیں ۔ پھر اچانک مجھے گمان گزرا کہ کہیں خدانخواستہ انجم کے دشمنوں کو تو کچھ نہیں ہو گیا ۔ اس خیال سے میں نے فوراً پوچھا ۔

" کیا بات ہے خالہ ۔۔ کچھ بتلائیے تو "

اور خالہ نے مجھے وحشت ناک نظروں سے دیکھ کر پوچھا ۔

" وہ تمہارا بھائی ۔۔ کیا وہ شاعر بھی ہے ؟ "

" جی ہاں ۔۔ بہت اچھا شاعر ہے "

(بقیہ صفحہ پر)

تو میں یہ رقعہ واپس کرنے آئی ہوں۔ مثّن زندگی بھر کنواری رہے گی۔ لیکن میں اسے کسی شاعر سے ہرگز نہیں بیاہوں گی۔ ان کا تجربہ ہو چکا۔ شاعروں کا کام کبھی نہیں ہوتا۔"

میں نے خالہ کی بات سن کر کہا۔ "مگر خالہ میرا بھائی تو ساڑھے پانچ سو کماتا ہے"

"اے میں کہتی ہوں ہٹو بھی — ان ساڑھے پانچ سو کو بیٹھ کر کیا اچار ڈالے گا۔ روپیہ کے علاوہ بھی عورت کچھ چاہتی ہے۔ جو شاعر نہیں دے سکتا۔ شاعری کرتا ہے اور بس . . . نہیں نہیں — میں اپنے ہاتھوں اپنی بچی کو جہنم میں نہیں دھکیل سکتی۔"

بڑی دیر تک امی نے اور میں نے انہیں سمجھایا کہ سب شاعر برقی نہیں ہوتے اور سب شاعروں کی بیویاں آپ جیسی نہیں ہوتیں لیکن وہ نہیں مانیں اور رقعہ واپس کر گئیں۔ بابا باہر سے آئے رقعہ لے جا کر انہوں نے برقی صاحب کو پھر دے دیا۔ اس واقعہ کا علم لطیف آپا ہی سے ہے۔ اب تمہارا اللہ ہی حافظ ہے۔ اگر قسمت زور لگا گئی اور برقی صاحب اپنا صحیح مصرف سمجھ گئے تو انجم تمہاری ہے ورنہ گئے۔ اللہ ہی اللہ

آپا بی کا یہ خط پڑھ کر میں نے سر تھام لیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نہ ہندوستان میں ہوں نہ پاکستان میں — درمیان میں معلق ہو کر رہ گیا ہوں —"

امر علی اسلم

بخدمت شریف.....

مولانا صاحب! صد احترام

میں گذشتہ کئی ماہ سے آپ کی خدمت میں کچھ عرض کرنا چاہتی تھی، لیکن آپ کبھی "عرس" میں تشریف نہیں لاتے۔ کبھی "نوچندی" میں شریک نہیں ہوتے کسی "مجلس" میں آپ کی زیارت نہیں ہوتی، کہ دعا ہی حاصل کرنے کے بہانے حاضر ہو سکوں — نہ آپ کبھی ریڈیو یا میٹروپول جیسے ہوٹلوں کی پارٹیوں اور جلسوں ہی میں نظر آتے ہیں کہ آٹو گراف کی کاپی ہی لیکر آپ کے قریب آؤں اور عرض حال کا موقع پاؤں — آپ کا دولتکدہ بھی اتنی دور ہے کہ میں نہ خود آ سکتی ہوں نہ کسی لڑکے کو خط لیکر بھیج سکتی ہوں، کیا معلوم کہ میرا خط آپ تک پہنچے بھی کہ نہ پہنچے اور پہنچے تو کیا ہو، کیا نہ ہو — کوئی راہ نہ نکلی تو مجبور ہو کر خط ہی لکھنے بیٹھ گئی کہ اب چاہے جو حشر بھی اس خط کا ہو، میری عرض آپ تک کسی صورت پہنچے تو سہی۔ مگر ہمیشہ کچھ نہ کچھ ایسی بات ہو جاتی کہ خط نہ لکھ سکتی۔ آج بھی دیر تک سوچتی رہی کہ آپ کو خطاب کس طرح کروں؟ اس کی وجہ یہ ہے مولانا صاحب! کہ میں اور میری جیسی دوسری لڑکیاں صرف ان ہی سے رسم و راہ رکھتی ہیں۔ اور خط و کتابت کرتی ہیں جو ہمارے ظلم و ستم اور ناز و ادا کے گھائل ہوتے ہیں جیسے مرزا رسوا جیسے نواب مرزا داغ وغیرہ۔ ان کو بہلانے، تڑپانے کے خطوط لکھنے میں تو میں بڑی ماہر ہوں، پوری مشق ہے، سرنامہ پر کوئی پھڑکتا ہوا شعر لکھ دیا اور مضمون خط خود بخود شروع ہو گیا۔ فراق یار کی تڑپ ہو یا وصل یار کی تمنا۔ میرا قلم دونوں راہوں سے بخوبی واقف ہے۔ اور حضرت عاشق کو تو میں چٹکیوں میں اڑاتی ہوں کسی معمولی سے سینٹ پاشی میں کاغذ اور لفافہ کو بسا کر۔ اپنے صمد کو دیدیتی ہوں۔ صمد میرا ہرکارہ ہے۔ ہم لوگ چھوٹے چھوٹے لڑکے قاصد کے کام کے لئے رکھتے ہیں، یہ ہمارے ہر اشارے کو سمجھتے ہیں۔ اور بڑے بڑے کام انجام دیتے ہیں — ان ہی میں سے ایک صمد بھی ہے۔ بڑا پیارا پیارا سا لڑکا ہے لیکن خبر بھی ویسا ہی ہے، کل ہی دیکھئے دو نمبری رشید سے عشق لڑا رہا تھا، ہم ہی سے تو وہ سب کچھ سیکھتا ہے، تو اب پتہ نہیں کہاں جائے۔

لیکن مولانا صاحب! آپ کو خط لکھنا میرے لئے بڑا کٹھن ہے۔ ایک ایسا نیا سبق جو نہ تو میرے استاد جی نے کبھی پڑھایا، نہ میری اماں نے — اور ہم ایسے بدنصیب ہیں کہ ہمارا کبھی کوئی باپ نہیں ہوتا ورنہ شاید وہ ہی کبھی سمجھا دیتے کہ آپ جیسے بزرگوں کو خطاب کرنے کا طریقہ سکھاتا — ہم آنکھ کھولتے ہیں تو صرف ماں کی گود ہوتی ہے — ذرا بڑے ہوئے تو استاد جی کی شفقت نے ہمارے پاؤں میں ننھے ننھے گھنگرو باندھ دیئے، پیار کے تیر کا دیا — ابھی جوانی کی پہلی انگڑائی بھی نہ لینے پائی کہ کتنے دلوں کی آڑی ترچھی نظریں ہم پر پڑنے لگیں۔ جیسے "دو چشمی" اور طبلے کا انتظار — یہ فضا بچپن سے شروع ہو جاتی ہے جب کہ ہم قیامت ہوتے — ہم جو ترس ہی سے شفقت پدری سے محروم ہوں تو پھر کس بزرگ سے ہم کلام ہوتے۔ پھر تو ہمارا حیرت کا عجب طرز بھی تو نہیں، ہم بھی یہ نہیں کہ کیا کہیں، کیا کہیں۔ دیکھئے کیا سمجھا جائے کون جملہ بڑا معلوم پڑ جائے اور کوئی بات بے موقع نکل جائے — اس لئے آپ سے ہمیشہ معافی کی درخواست اپنی نادانی اور آپ کا احترام کے پیش نظر یہی ہے کہ اگر کوئی بات کہیں خلاف ادب معلوم ہو تو معاف فرما کر میری ناداں کو ملحوظ رکھئے گا۔

یہ تمہیں یوں شکوے سے ہی لگ رہے ہیں جیسے با

آپ کی مہربانی سے تو مجھے ملاقات زندگی کی ہمیشہ نصیب ہے

مولانا صاحب! کراچی میں ہماری یہ بدنام بستی نپیئر روڈ کے نام سے پکاری جاتی ہے جس کے ایک سرے پر ہم واقع ہیں، اور دوسرے سرے پر ڈان اخبار —— یہاں ہمارا آسمان چھت ہی ہے۔ اور پھر ہم دونوں میں مشابہت بھی تو بڑی عجیب ہے آپ غور فرمائیں گے تو بڑی حیرت آپ کو ہوگی —— رت جگا ہم دونوں ہی کے یہاں یکساں طرح ہوتا ہے۔ میں ہر رات نئے نئے دولہوں کی دھڑکنیں سنتی ہوں تو اس کا ٹیلی پرنٹر بھی ہر رات اس کو نئی نئی خبروں کی داستانیں سناتا ہے۔ میں اپنے ناز و غمزوں کے [illegible] جاگتی ہوں تو وہ بھی جاگتا ہے۔ میں اپنی اک اک ادا سے سوتے جاگتی ہوں تو وہ بھی جگاتا ہے۔ میرے نغموں، میری تانوں اور میرے گھنگھروؤں کے بول پر بھی کتنے ہی دل بیتاب ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے نغموں، اس کی تانوں، اس کے گھنگھروؤں کے بول پر بھی بے شمار ذہنوں میں تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔ جی ہاں ایک طرح کے گھنگھرو اس کے پاؤں میں بھی ہیں۔ —— اگر غور سے دیکھا جائے —— میں اگر لوگوں کی بیتابیوں، بیقراریوں اور تیز تیز سانسوں کو اپنے نازک لمس سے سکون بخشتی ہوں تو وہ بھی بخشتا ہے۔ غرض یہ کہ رات میری بھی دوسروں ہی کی خدمت گزاری کے لئے ہے اور رات اس کی بھی دوسروں ہی کی خدمت گزاری کے لئے ہے۔ "ڈیلی" وہ بھی ہے، اور "ڈیلی" میں بھی ہوں۔ وہ لوہے کی جان بے حس مشینوں میں دبتا اور پستا ہے، میں سیم و زر کے بے کیف، بے درد شکنجوں میں دبتی اور کستی ہوں، خبروں، بیانوں، فریادوں، پیاموں، نوٹوں اور اشتہاروں کے انبار لیکر وہ بھی پچھلی رات کو مشینوں کی ناب سے نکلتا ہے اور خبروں، بیانوں، فریادوں، پیاموں، نوٹوں اور اشتہاروں کے ایک طوفان کے ساتھ میں بھی اپنے شکنجوں سے چھوٹ کر نکلتی ہوں —— صبح ہوتے ہی آپ "ڈان" تو ضرور دیکھتے ہوں گے۔ سبھی اس کو پڑھتے ہیں، مگر مجھے کوئی نہیں پڑھتا۔ لوگ بس دیکھتے ہیں۔ کاش کبھی آپ مجھے بھی پڑھ کر دیکھتے تو ہماری دنیا کا حال آپ کو معلوم ہو جاتا —— جی ہاں ایک سرے پر ڈان ہے اور دوسرے سرے پر میں ہوں —— اس کے مالک و مختار یوسف صاحب ہیں اور میری مالک و مختار میری اپنی اماں ہیں —— جو میری نائکہ ہیں۔

جی؟ یہ لفظ آپ کو کھٹکا! بے شک کھٹکا ہوگا مجھے اس کا پہلے ہی خطرہ تھا۔ آپ کا ماحول جو دوسرا ہے، آپ کے ماحول میں شرافت ہے، پاکیزگی ہے، آپ کے ساتھی مقدس ہیں، بزرگ ہیں، صالح ہیں —— اسی لئے تو خیال ہے کہ آپ کو اس ماحول کی شاید پوری خبر نہ ہو —— یا کیا معلوم، خبر تو ہو مگر ہماری طرف توجہ کرنا آپ مفاد عامہ کے خلاف تصور فرماتے ہوں —— ملک کے معاملات میں ایسا بھی تو ہوتا ہے حالانکہ میں قوم سے باہر نہیں ہوں، قوم ہی کا ایک حصہ ہوں۔ بہرحال میں خود ہی عرض کر رہی ہوں اپنا حال۔ اور اگرچہ ارادہ یہ تھا کہ اپنا وفد لیکر آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوں کہ آپ تک پہنچنے کی اب یہی صورت ہے مگر حاضر ہونے سے پہلے یہ عریضہ بھیج کر آپ کا عندیہ لینا چاہتی ہوں کہ آپ ہماری طرف بھی کچھ توجہ کریں گے یا نہیں۔

آپ کو اماں کے ساتھ نائکہ کا لفظ کھٹکا، مگر ہمارے اس بازار کی تو یہی ریت ہے یہاں ہر ماں نائکہ ہے اور ہر نائکہ ماں —— بیٹی اس کی اپنی ہو یا کسی دوسرے کی، کہیں اور سے لائی ہوئی، اپنائی ہوئی، وہ سب کو وقت آنے پر بڑے اہتمام سے دوسروں کے سامنے خود پیش کرتی ہے۔ بلکہ اسی لئے پالتی ہے کہ ایک دن دوسروں کے سامنے اس کو پیش کرنا ہے —— وہ اسے پال کر جب بڑا کر لیتی ہے، قیامت جب قد آدم ہو جاتی ہے تو سیٹھوں کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو جاتی ہیں، مجنونوں کے خزانوں اور تھیلیوں کے منہ کھلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ماں اپنی بیٹی کو خوب بناتی ہے، خوب سجاتی ہے، خوب چمکاتی ہے اور بولی اونچی کرتی جاتی ہے۔ اور پھر جو تھیلی سب سے بڑی اور سب سے وزنی ہوتی ہے وہ اس جوان لڑکی کو بے تکلف سمیٹ لیتی ہے، [illegible] دبا لیتی ہے —— یہ سیم و زر کی تھیلی تھیلی نئی نویلی کی آنکھوں سے کھیلتی رہتی ہے۔ مگر نہ ماں کو اپنی بیٹی کا کچھ خیال ہوتا ہے نہ تھیلی والے کو اپنی تھیلی کا

اور مولانا صاحب! اگر سچ پوچھئے تو آپ نے بھی تو ہماری جیسی عورتوں کے متعلق کچھ سوچنے کی تکلیف گوارا نہ کی۔ آپ نے تو شاید ہمارا خیال بھی ایک بار گناہ سمجھ [illegible] لیکن مولانا صاحب! عورت کا خیال آیا تو قوم کے دل سے کبھی نہ نکلا۔ جواب عنایت ہو تا کہ [illegible] انہیں جنت چھوڑنی پڑی —— درست ارشاد بھی صحیح مگر ان ہی آدم کے بچے جنہوں نے اسی دنیا کو جنت بنا دینے کی کوشش کی ہے —— مگر آپ جانتے ہیں کہ لوگوں نے عورت کو محض آلۂ عیش بنا کے رکھا، [illegible] اس کے تقدس کو پامال کیا۔ [illegible] کنیزوں کے ریوڑ کی طرح باندیوں میں رکھا گیا [illegible] کہ عورت کو وہ [illegible] منقولہ بنا کے اپنے قبضۂ قدرت میں رکھے، [illegible] اپنے خلفاء کے ہزاروں [illegible] میں بھی لذت جنس کا اہتمام تھا، سلاطین کے حرم [illegible]

کے اکھاڑے نہ تھے؟ یہ مرد تو عورت کو صرف اسی وقت تک دل سے لگائے رکھتا ہے جبتک خود اس کے اندر حرارت باقی ہو تشنگی باقی ہو مگر جب اس کے جذبات سیر ہو جاتے ہیں تو اسے ٹھکرا دیتا ہے اور در بدر بھٹکنے کو چھوڑ دیتا ہے اور کیا یہی خواہش حرم خانوں کے پس پردہ کارفرما نہیں ؟

مولانا صاحب! آپ سے زیادہ کون واقف ہوگا۔ آپ سے زیادہ کس پر یہ حال روشن ہے مگر ہمارے دل کو دیکھئے ہمارے دل کتنے کشادہ ہیں، ہم ان ٹھکرائی ہوئی عورتوں کو جو زندگی کے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر بھٹکتی پھرتی ہیں، اپنی پناہ میں لے لیتے ہیں، ان کو ایک نیا اطمینان بخشتے ہیں، ان کے گھناؤنے زخموں کو جھیلی ہوئی چوٹوں سے چھپاتے ہیں لیسے لیسے نادر غمزے سکھاتے ہیں! جو مرد اپنی بیوی میں نہیں پاتا ۔ بیوی تو بیچاری حکم کی باندی ہوتی ہے ۔ وہ اپنے مجازی خدا کے ایک ہلکے سے اشارے پر بھی جیب چاپ بچھ جاتی ہے فرش ہو جاتی ہے، مگر ہم یوں حکم مانا نہیں کرتے، ہم تو انھیں تڑپاتے ہیں، ترساتے ہیں، ان کے جذبات کو اکساتے رہتے ہیں ۔ اور پھر دور دور بھی رہتے ہیں ۔ اور مرد ہماری خوشنودی کے لئے اپنی ماؤں کے، بیویوں کے زیور سستے داموں بیچتے رہتے ہیں ۔ ادھر سے ادھر بدحواس مارے مارے پھرتے ہیں خوشامدیں کرتے ہیں ناک رگڑتے ہیں ــــــ اس وقت ہمیں مردوں کا وہ بتایا ہوا آتا ہے جو عورتوں کے ساتھ ان کا رہا ہے۔ اور پھر ہمارے اندر جذبہ انتقام ابھرتا ہے، اس لئے جب ان کی جیب خالی ہو جاتی ہے، اور چہرے ویران ہو جاتے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ اب ہماری باری ہے کہ ان کو دھتکاریں جھڑکیں اور اپنے دروازے ان کے منہ پر بند کر دیں ، ہم میں کتنی ہیں جو مردوں کے دکھ جھیلے ہوئے ہیں ۔ اس لئے ان کا انتقام شدید ہوتا ہے ۔ پھر ہم یہ بھی تو خوب جانتے ہیں کہ ہمارے یہاں آنے والے مستقل آنے والے نہیں وہ فقط اپنا دل بہلانے اور عارضی تفریح کے لئے آتے ہیں ، ہماری جوانی سے کھیلنے آتے ہیں، تو ہم بھی ایک اچھے دکاندار کی طرح کم عرصہ میں زیادہ قیمت وصول لینا چاہتے ہیں ، مولانا صاحب! آخر ہمارے دل میں بھی تو خوشگوار مستقبل کی تمنا کروٹ لیتی ہے، ہم کو اگر بھیڑ بکری سمجھ لیا جائے تو ہم اس سے سچ مچ بھیڑ بکری ہو تو نہیں جاتے ۔ ہم بھی تو آدمی ہیں اور ہم سوچتے ہیں کہ ہماری چلتی ہوئی دکان اگر کبھی بند ہو جائے تو فاقوں کی نوبت نہ آئے جیسی بھوک اور خوش رہنے کی خواہش جیسی شریف لوگوں کو ہوتی ہے آپ لوگوں کو ہوتی ہے ۔ ویسی ہی بھوک ہمیں بھی تو لگتی ہے ، ویسے ہی خوش رہنے کو ہمارا بھی تو دل چاہتا ہے ۔ اور یہی کمبخت دو چیزیں ایسی ہیں جو شرافت اور رذالت میں کوئی فرق نہیں کرتیں ، کوئی امتیاز نہیں برتتیں ۔

میرے مولانا ! ــــ ارے توبہ ، توبہ ، معاف کیجئے گا ، میں تو کفر بک گئی " آپ اور میرے " ؟ ــــ یہ میں نے کیا کہہ دیا ! مگر کیا کروں ، یہ لفظ " میرے " ہماری زبان سے بے ساختہ عادۃً نکل جاتا ہے ، کیونکہ ہم میں سے جس کسی کے پاس جو شخص بھی آتا ہے ، وقتی طور پر وہ " میرا " ہوتا ہے ، میں بھی ہر ایک سے یہی کہتی رہتی ہوں ، جھوٹی محبت کو سچی محبت کا رنگ دینے کے لئے ہم لوگ طرح طرح کے الفاظ تراشتے ہیں ، ہر بات اس طور پر کہتے ہیں کہ اس کو یقین آ جائے ۔ وہ ایسا سمجھنے لگے کہ اگر کبھی اس نے ہمارے یہاں کا آنا جانا چھوڑ دیا تو جیسے ہم سچ مچ زہر کھا لیں گے مر جائیں گے ــــ مگر مولانا صاحب ! نہ تو ہم ہی کبھی مرتے ہیں اور نہ وہ مرد ہی کبھی مرتا ہے ۔ یہ تو سب اس لئے ہے کہ جھوٹ سچ سے زیادہ حسین ہوتا ہے اور دھوکا حقیقت سے زیادہ خوش رنگ ہوتا ہے ــــ !!

تو ہاں مولانا صاحب آپ کو زناکہ کا لفظ بہت کھٹکا تھا ، میں نے اس کی وضاحت تو کر دی ہے لیکن ایک بات رہ گئی تھی ۔ میں اور میری جیسی دوسری نہیں جو کچھ کرتی ہیں اس کا حال تو میں نے عرض کیا لیکن یہ بتانا بھول گئی کہ میں اور میری جیسی دوسری نہیں ، اصل میں اپنی اپنی اماں اور نائکہ کی جاگیریں ہیں ، اور وہ اپنی جاگیروں کو اپنی منفعت کے لئے استعمال کرتی ہیں ، اور یہ جاگیریں بے تکلف استعمال ہوتی رہتی ہیں ، یہ ایسی جاگیریں ہیں جو نسلاً بعد نسل نہ جانے کب سے اسی طرح چلی آ رہی ہیں اور اب تک قائم ہیں ، سنا ہے کہ آپ جاگیرداری کے حق میں ہیں ۔ اگر یہ سچ ہے تو میں عرض کروں گی کہ ہم سے بڑھ کر قیمتی اور سود مند جاگیر اور کوئی نہیں ہو سکتی ، یہ دوسری جاگیروں سے بہت مختلف ہے ، یہاں کے " ہاری " کبھی کسی طرح کا کوئی مطالبہ نہیں کرتے ، کبھی کوئی ہنگامہ نہیں مچاتے ، یہ تو ایسی جاگیریں ہیں جو خود ہی محنت کرتی ہیں ، خود ہی روزی کماتی ہیں اور اپنی کمائی سے اپنے جاگیرداروں کی تجوریاں بھرتی رہتی ہیں ، نہ امریکہ سے کھاد منگوانے کی ضرورت پڑتی ہے ، نہ انگلستان سے ٹریکٹر خریدنے کی ، سب کچھ خود ہی ہو جاتا ہے ، ان جاگیروں کی مٹی بڑی ہی زرخیز ہے ، ہاں زندہ رکھنے کے لئے دو وقت کی غذا انہیں ضرور ملنی چاہیئے ، یہ تو سارے شہر کی گندگیوں کو سمیٹتی رہتی ہیں ــــ اور اس طرح شہر میں صفائی رہتی ہے ــــ ان ہرے بھرے درختوں کی طرح جو دھوپ کی تپش میں چھاؤں کا کام بھی دیتے ہیں ، اور دن بھر فضا میں پھیلی رہنے والی سمیت کو جذب بھی کرتے رہتے ہیں ، اس فضا میں شریف باپ کی بیٹی اور غیرت مند شوہر کی بیوی کی عزت سمیتوں سے محفوظ ہے تو ہماری وجہ سے ہے ، ورنہ یہ شریف زادے تو دن دہاڑے سڑک پر اپنی ہیبت ناک بھوک بجھانے والی بستیوں سے سب کو سموم کر

ہفت روزہ کراچی

شروع کر دیں، تبلہ! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ مرد فطرتاً یا عادتاً ہر نئی چیز کی طرف لپکتا ہے، خواہ وہ ڈاک سے میسر آئے یا لاکھوں سے ــــ مگر جو کم آمدنی والے ہیں وہ انہیں باسی پھولوں پہ ٹکٹ لگتے پھرتے ہیں، کم اور کم ہی آمدنی والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ویسے بھی مولانا صاحب! ہم سے زیادہ افادیت دوسری اور کسی جگہ میں کہاں؟ کیونکہ ہم پیداگیری کے ساتھ ساتھ مسرت "کم ہوتا ہے اور" پیدا " زیادہ ــــ کسی ماہر معاشیات سے آپ دریافت فرمالیں، جواب یہی ملے گا کہ یہ کاروبار ملک کیلئے نفع بخش ہے سودمند ہے، جس میں "صرف" کم ہو اور "پیدا" زیادہ ــــ اس لئے ہمیں توی امید ہے کہ آپ ہماری طرف ضرور توجہ فرمائیں گے۔

مولانا صاحب! لڑکیاں بچپن میں گڑیاں کھیلتی ہیں، گڑیوں کا بیاہ رچاتی ہیں، اور گڑیوں کا بیاہ رچاتے رچاتے خود بھی ایک نئی لذت سے آشنا ہو جاتی ہیں اور پھر جیتے جاگتے خواب دیکھنے لگتی ہیں، ان کے سوچنے کا انداز بدل جاتا ہے، سہیلیوں کے ساتھ کھیل کود ہنسی دل لگی کا طریقہ بدل جاتا ہے، اور وہ عموماً خلوت پسند ہو جاتی ہیں ــــ ہر لڑکی اپنے دل و دماغ میں اپنے کسی محبوب یا شوہر کے خیالی مجسمے کو سنوارتی نکھارتی رہتی ہے اور پھر اس کی پجارن بن جاتی ہے، اسی کو شاید محبت کہتے ہیں۔ وہ خواب دیکھتی ہے کہ اس کا اپنا ایک گھر ہے، وہ اس گھر کی مالک ہے، اس کا محبوب شوہر دن بھر کی محنت کے بعد آتا ہے تو اسے مسکرا مسکرا کر خوش آمدید کہتی ہے، اس کے بکھرے ہوئے بالوں میں انگلیاں دوڑاتی ہے، پیار سے ان کو باہر کرتی ہے، پھر دونوں ساتھ ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھتے ہیں، اور میز نہ ہوں تو فرش پر ہی بیٹھ جاتے ہیں، ایک ننھا سا بچہ ــــ ان کی اپنی محبت کا پہلا شاہکار ــــ شرارتیں کرتا پھرتا ہے، اچھلتا ہے کودتا ہے، کبھی اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے بسکٹ، پیسٹری، یا روٹی، جو کچھ بھی ہو، باپ کی پلیٹ سے اٹھا اٹھا کر کھانا اور کھلانا شروع کر دیتا ہے، ماں اور باپ دونوں خوش ہو ہو کر اسے دیکھتے ہیں چومتے ہیں، اور سینوں میں ان کے دل جھوم جھوم اٹھتے ہیں ــــ خوابوں کا ایک سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے۔ یہ خواب، یہ سپنے ــــ کسی خاص فرقے کسی خاص طبقے تک محدود نہیں ــــ یہ دوسری بات ہے کہ بہتوں کے یہ خواب حقیقت کا لباس پہن لیتے ہیں اور بہتوں کے صرف خواب و خیال ہی بن کر رہ جاتے ہیں، ہم بھی ایسے خواب دیکھتے ہیں، ہم بھی تو آدمی ہیں، ہم بھی تو لڑکیاں ہیں، مگر ہمارے خواب! ــــ مولانا صاحب، وہ تو صرف خواب و خیال ہی بنکر نہیں رہ جاتے، بلکہ صورتحال اپنا بھیانک چہرہ ہمارے سامنے کر دیتی ہے۔ اور ہمارا وجود ایک بڑا سوالیہ نشان بن کے رہ جاتا ہے، اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ عورت تو ازل ہی سے ایک سوالیہ نشان ہے۔ ایک ایسا سوالیہ نشان جس کا جواب مردوں کے پاس ہے جس کو یہ جواب مل گیا وہ بیوی بن جاتی ہے، بیگم کہلاتی ہے، میڈم ہو جاتی ہے، ــــ اور جس کو یہ جواب نہیں ملا وہ طوائف بن جاتی ہے، بیسوا کہلاتی ہے، فاحشہ پکاری جاتی ہے ــــ،

مگر مولانا صاحب! جب سے پاکستان بنا ہے، اس وقت سے ہمارے اندر وہ عورت جاگ اٹھی ہے جو سوئی ہوئی تھی، انگڑائیوں پہ انگڑائیاں لے رہی ہے، میں اسے بہت سمجھاتی ہوں، کہتی ہوں کہ پگلی تجھے تو نہ جانے کیا ہو گیا ہے، تو میرا سکون وقت بے وقت چھینے لے رہی ہے، تجھے پتہ بھی ہے کہ میں انسان نہیں، جسم ہر ایک کا الگ ہوتا ہے میں تو بستر ہوں ــــ گیسٹ روم کا بستر، بیچ لکڑی کا بستر ــــ جہاں لوگ آتے ہیں، آرام کرتے ہیں، پھر اٹھ کے چلے جاتے ہیں، بلا تفریق، بلا امتیاز، اپنے بھی بیگانے بھی، دوست بھی دشمن بھی حتیٰ کہ باپ بھی بیٹا بھی، ــــ اسی بستر پہ دھڑلے سے علی الاعلان ایک بدمست شرابی بھی آکے لوٹ جاتا ہے، اور کوئی روک نہیں سکتا، اسی بستر پہ چوری چھپے قہار بھائی جبار بھائی بھی آ کے خراٹے لیجاتے ہیں اور کوئی ٹوک نہیں سکتا ــــ مگر یہ عورت ــــ جو میرے اندر جاگ چکی ہے۔ ــــ میری ایک بات نہیں سنتی، بس اپنے ہی کہے چلی جاتی ہے کہ نہیں نہیں، تو بھی عورت ہے، تیری بھی ایک منزل ہے، تیری بھی ایک آرزو ہے ــــ فطری آرزو ــــ تو بھی ایک اور صرف ایک مرد کی طلب گار ہے، ــــ اور میں روز روا اٹھتی ہوں اس کی بات پر، اس کی بات، نشتر ہے، خنجر ہے، کٹاری ہے ــــ جو میرے کلیجے میں اتری چلی جاتی ہے ــــ۔

مولانا صاحب! یہ جو میں آپ کو مخاطب کر رہی ہوں، یہ عریضہ بھیج رہی ہوں، یہ اسی عورت کی تحریک ہے ــــ اسی عورت کی جو میرے اندر مچل رہی ہے اب میں اس کے ہاتھوں میں محض ایک کٹھ پتلی بن کے رہ گئی ہوں، اسی نے مجھ سے آپ کو خط لکھوایا ہے، ورنہ مجھ میں جرأت کہاں تھی، مجھ میں اتنی ہمت کب آئی تھی؟ ــــ وہ کہتی ہے کہ اسلامی جمہوریہ کے باشندے ہم بھی تو ہیں، ــــ یہ ملک ہمارا بھی تو ہے، اس ملک کا وجود ایک نئی روح کا حامل ہے۔ پھر ہم اس نئی روح کی لذت سے کیوں محروم رہیں؟ ــــ اس کی فضا میں آپ نے بھی تو ایک نئی روح پھونکی ہے، ہر شخص کی پر امید نظر آپ کی طرف اٹھتی ہے تو کیا ہر شخص "

کی فہرست میں میرا کوئی شمار نہیں ؟ ـــــ کیا آپ اپنے "ہر شخص" میں ہم لوگوں کو بھی گردانے کی نوازش نہیں فرمائیں گے ؟ ـــــ کیا آپ بھی ہمیں اسی خدمت پہ مامور رکھیں گے جس خدمت پہ اب تک زمانے نے رکھا ہے ؟ کیا ہم اسی طرح ہمیشہ بس گندگیاں ہی سمیٹنے کا کام دیتے رہیں گے ؟ اور کیا ہم آئندہ بھی سربراہ عورت کی تقدیس کا یونہی بیوپار کرتے رہیں ؟ ـــــ کب تک ؟ آخر کب تک اپنے قدموں کے نیچے جنت کی جگہ جہنم کی آگ کی تپش محسوس کرتے رہیں ! کیا ہمارا کبھی اپنا کوئی گھر نہ ہوگا ؟ کیا ہم کسی کو اپنا اور صرف اپنا کبھی نہ کہہ سکیں گے ـــــ ؟ مولانا آپ تو شخصی ملکیت کے حامی ہیں پھر کیا ہماری شخصی ملکیت اور اس کے حق کی حمایت نہیں کریں گے ! ـــ کچھ تو کہئے ہم بیحد قابل رحم ہیں ـ مجبور ہیں اور آپ کی دستگیری کے محتاج ہیں ، ـــــ آپ بھی اگر ہمارے سوال کا جواب نہ دیں گے تو پھر ہمیں کسی اور کی طرف رجوع ہونا پڑے گا ـــــ ہمارے اندر کی جاگی ہوئی عورت تو اب اپنے سوال کا جواب چاہتی ہے ـ خواہ اس کا جواب کوئی بھی دے ـــــ جو جواب دے گا ہم اسی کے ہو جائیں گے ـ ـــــ عورت دنیا کو جنت بھی بنا سکتی ہے ـــــ یہ آپ بھی کہتے ہیں' اگر اس کو سہارا ملے ـــــ اور جہنم بھی ـ عورت کمزور بھی ہے اور ایک عظیم طاقت بھی ـــــ اور یہ سب کچھ آپ کے جواب پر موقوف ہے کہ آپ مجھے کس راہ پر لگاتے ہیں کیا بتلاتے ہیں ـــــ !

ہاں مولانا صاحب ! ایک بار پھر آپ سے بصد ادب یہ عرض ہے کہ اس عریضہ میں کچھ بھی بے ادبی اگر مجھ سے نادانستہ آپ کی شان میں ہوگئی ہو یا آپ نے محسوس کی ہو تو مجھے آپ کی طرف سے معافی اور درگذر کی توقع ہے ـ

آپ کے جواب باصواب کی منتظر، آپ کے الطاف بزرگانہ کی امیدوار ـــــــــــ فقط ایک بدنصیب

زہرہ باجی

نیپیر روڈ ـــــ کراچی

ہادی مچھلی شہری

○

اب وہ غم اور وہ خوشی ہی نہیں
زندگی جیسے زندگی ہی نہیں

نالہ کش دل ہے اور لب خنداں
کیا یہ میری ہنسی ہنسی ہی نہیں

خود شناسی کی جس میں شان نہ ہو
بیخودی ایسی بیخودی ہی نہیں

غم میں بھی ایک کیف پاتا ہوں
کیسے کہدوں یہ زندگی ہی نہیں

اتنا تاریک منظر ہستی
میری دنیا میں روشنی ہی نہیں

صبح کی آرزو پہ کیا الزام
شب تاریک غم کٹی ہی نہیں

نہ ہوا ہوش سے میں بیگانہ
اس طرح پی کہ جیسے پی ہی نہیں

میں سکون خواہ دل اذیت دوست
دل سے میری کبھی بنی ہی نہیں

غم کا وہ لطف کیا اٹھائیگا
دل کی دولت جسے ملی ہی نہیں

عمر بھر سوز غم نے ساتھ دیا
لگ کے یہ آگ پھر بجھی ہی نہیں

مر چکا ہوں میں موت سے پہلے
اب تو مرنے کو زندگی ہی نہیں

زندگی کو قریب سے دیکھوں
اتنی مہلت قضا نے دی ہی نہیں

چارہ گر کی کمی نہ تھی ہادی
غم کی تدبیر میں نے کی ہی نہیں

یوسف جمال انصاری

○

ساغرِ چشم ہے لبریز خدا خیر کرے
موجِ صہبا ہے گہر بیز خدا خیر کرے

زلف برہم ہے ہوا تیز خدا خیر کرے
آج موسم ہے جنوں خیز خدا خیر کرے

شاخِ مرجاں سرِ مہتاب کہ رخسار پہ ہاتھ
اُف مرقع یہ دل آویز خدا خیر کرے

کس لئے مُہر بلب ہے وہ گلِ نیم شگفت
مسکرانے سے بھی پرہیز خدا خیر کرے

وا تھی آغوش مرے واسطے کل چشم براہ
آج اس درجہ کم آمیز خدا خیر کرے

جس جبیں کی گُل و مہتاب قسم کھاتے ہیں
وہ جبیں اور شرر ریز خدا خیر کرے

جو نہ ہو جائے وہ کم ہے کہ بھرے بیٹھے ہیں
شیشہ نازک ہے تو مے تیز خدا خیر کرے

بدگمانی یہ تری اور محبت میری
دل ہے اور خنجرِ خوں ریز خدا خیر کرے

آستیں اُلٹی ہوئی ہے تو گریبان ہے چاک
دل کی لے فتنۂ نوخیز خدا خیر کرے

جی میں ہے چھیڑ کے اتنا تو میں اُن سے پوچھوں
آتشِ حُسن ہے کیوں تیز خدا خیر کرے

حشرِ نظارہ ہے برہم زنِ بزمِ دل ہے
حُسن اور حُسنِ غم انگیز خدا خیر کرے

شعیب انصاری (بھوپال)

○

اُٹھاؤ مینا بڑھاؤ ساغر جلاؤ شمعیں اے ماہ پارو
میں آج تم پر کروں گا ماتم نئی ادا سے گئی بہارو

نگارِ صبحِ چمن کی خاطر فرازِ دار و رسن تک آیا
مری وفا کے گواہ رہنا مری محبت کے رازدارو

حسین تخیل کی وادیوں میں ہے آج محوِ خرام کوئی
تم اپنی پلکیں بچھا دو آکر بلندیوں سے سبک ستارو

غمِ جہاں کا سیاہ پرتو حیات زاروں پہ پڑ رہا ہے
ابھی نہ چھلکاؤ جامِ بادہ ابھی نہ زلفوں کے خم سنوارو

کٹھن منازل میں زندگی ہے تھکا ہوا ہوں مگر یقیں ہے
تمہیں بھی اک دن سجا ہی لوں گا کسی کی یادوں کی رہگذارو

غمِ جہاں سے ملی جو فرصت تو آملوں گا شعیب اک دن
اُداس جاگی ہوئی نگاہو! مجھے نہ رہ رہ کے یوں پکارو

مضطر اکبرآبادی

یوں دل میں جاگتی ہے ترے پیار کی لگن
جیسے ہجوم یاس میں امید کی کرن
دیکھے سے تجھ کو رقص میں آتی ہے زندگی
نغموں میں ڈوب جاتی ہے احساس کی تھکن
انگڑائی لے کے جاگ اٹھی ہے بہار نو
پھیلی ہے ناگہاں جو تری بوئے پیرہن
پیغمبر بہار ہے تیری نظر نظر
موج شراب ہے ترے گیسو کی ہر شکن
تیری نظر کے فیض سے ہے درد بھی لطیف
تیرے کرم سے دل کی خلش میں بھی بانکپن
تنہائیاں بھی تیری توجہ سے دلپذیر
تیری نوازشات سے خلوت بھی انجمن
امید شاد شاد تمنا ہے باغ باغ
ہے تیرے التفات سے مضطر مگن مگن

اطہر حسین نادر

ربط کچھ ہے تو غائبانہ ہے
ان کا آنا، نہ اپنا جانا ہے
ہم وہی مقصدِ حیات وہی
جذبۂ شوق آزمانا ہے
آؤ کچھ دیر غم غلط کر لیں
سامنے وہ شراب خانہ ہے
ہم سمجھتے ہیں شیخ کی باتیں
بےخودی تو فقط بہانہ ہے
قصہ ہر چند مختصر کیجیے!
ذکر میرا ضرور آنا ہے
دل کو ہم بے نیاز غم کر لیں
مشورہ اُن کا مخلصانہ ہے
اپنے نادر سے پھر ہوئے ناراض
کیا نیا گل کوئی کھلانا ہے

چہ دلاور است ...

ظفر عمر بی اے علیگ ——— موریس لیبلانک

(۸)

یہاں اس سے کوئی بحث نہیں کہ حیرت انگیز داستانیں، محیر العقول واقعات، ہولناک جرائم اور ان کی سراغرسانیوں کے کارنامے کیوں پڑھے جاتے ہیں اور کون سا جذبہ ہے کہ لوگ اس دلچسپی کے ساتھ ان کی طرف لپکتے ہیں، نہ یہی بحث یہاں مقصود ہے کہ جاسوسی افسانوں اور ناولوں کی ادبی حیثیت زیر غور لائی جائے۔ اس قسم کی چیزیں پہلے بھی عام رہی ہیں اور آج بھی عام ہیں، ڈیٹکٹیو، ٹرو ڈیٹکٹیو، اور پولیس، وغیرہ ناموں سے امریکن جاسوسی رسالے اور اسی قسم کے ناول بازار میں بھرے پڑے ہیں جن میں جرائم پیشگی، قتل و غارت، فریب و اغوا کی وارداتیں، ان کی سراغرسانیوں اور مقدمات کی ہولناک داستانوں اور حیرت انگیزیوں کے سوا شاذ و نادر کچھ اور ہوتا ہو، سر کانن ڈائل کی طرح پھر کوئی اہل قلم ایسا اٹھے گا یا نہیں جو اس قسم کے حیرت انگیز قصوں اور جاسوسی ناولوں میں شرلاک ہومز کے جیسا یا اس سے بھی بہتر کوئی کیرکٹر پیش کر کے مجرموں کے قلب میں انسانیت کی روشنی پیدا کرے ——— ابھی اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا

اب سے ربع صدی پہلے "آرسین لوپن کے کارناموں کے حیرت انگیز ناول" برعظیم ہند میں مزے لے لے کر پڑھے جاتے تھے۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ اہل ملک نے بھی اسی انداز پر خود اپنی زبان میں کچھ چیزیں پیش کیں، ظفر عمر بی اے علیگ کی تصنیفات نیلی چھتری اور لال کھجور کے نام آج بھی زندہ ہیں، بلکہ آج تو وہ پھر سے چھپ چھپ کر بازار میں آ رہی ہیں۔ ظفر عمر خود سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ پھر شاہان دہلی، ان کے قلعوں، مقبروں، تہہ خانوں اور کھنڈروں کے تذکرے، ابو الفضل، فیضی، مان سنگھ، بہادر شاہ، سر سید اور ان کی آثار الصنادید، مولانا محمد حسین آزاد اور ان کی دربار اکبری، مولانا شاہ سلیمان پھلواروی اور پروفیسر سعید وغیرہ کی زندہ و پائندہ شخصیتوں کے نام اور حوالوں نے نیلی چھتری کی خیالی داستان میں واقعات کی سی ایک کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اور وہ بہت مقبول ہوئی۔

ادبی حیثیت سے یہ بات یقیناً بڑی خوش آیند ہے کہ وہ لوگ جنھیں خدا نے صلاحیتیں عطا کی ہیں، مغربی یا مشرقی، قدیم یا جدید اہل قلم کی کاوشوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے دلوں میں ایک تحریک سی پائیں کہ ان کی قوت فکر جنبش میں آئے اور وہ خود بھی کوئی چیز پیش کریں، علمی اور ادبی ذخیروں میں اضافے اسی طرح ہوتے ہیں، مگر جب کبھی ایسا ہوا کہ کسی تصنیف کی بہت دھوم مچی، مقبولیت بڑھی، مصنف کو اس کے چاہنے والوں نے بڑھ بڑھ کے داد دی، زبان و ادب نے اچھی اچھی توقعات اس سے وابستہ کیں ——— پھر اچانک ہی جیسے کوئی حجاب تھا کہ اٹھ گیا، کوئی نقاب تھی کہ گر پڑی، اور اب جو مڑ کے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوا کہ وہ تصنیف؟ ارے نہیں، وہ تصنیف کہاں تھی؟ وہ تو چربہ تھی کسی اور مصنف کی کاوشوں کا ——— تو اس وقت بڑی سخت چوٹ لگتی ہے دل کو، اور صرف چوٹ ہی نہیں لگتی، اس کے اثرات دور دور تک جا پہنچتے ہیں،

"نیلی چھتری" کا بھی یہی حال ہوا ——— کہ وہ ظفر عمر بی اے کی تصنیف نہ نکلی، ان کا بہرام "آرسین لوپن" تھا اور شاہان دہلی کا خزانہ بھی دراصل "شاہان فرانس" کا خزانہ تھا۔ جس کا اصل مصنف موریس لیبلانک تھا جس نے آرسین لوپن کے حیرت انگیز کارناموں کا مشہور ناول "شاہی خزانہ" لکھا تھا اور نیلی چھتری اسی فرانسیسی خزانہ کا ترجمہ ہے ——— اور اب یہ "شاہی خزانہ" (تیرتھ رام فیروز پوری کا ترجمہ کردہ) بازار میں موجود ہے ——— تیرتھ رام فیروز پوری نے بے شمار کتابوں کا

ترجمہ کیا ہے، اور ان کے ترجمے اردو زبان کے ذخیرے میں مفید اضافہ ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ انھوں نے ترجمے کو ہمیشہ ترجمہ کہا ـــــ جب کبھو اردو زبان کی ایسی کوئی تاریخ لکھی جائیگی جس میں اردو کتابوں کی باقاعدہ اور اصولی تفصیل درج ہو، تو تراجم کے باب میں تیرتھ رام فیروزپوری کا نام بڑے احترام کے ساتھ اور بے تکلف لکھا جائیگا۔ مگر نیلی چھتری، ترغیبات جنسی، نیرنگ خیال، صندوق اور اس قسم کے دوسری اور کتابوں کے متعلق تو واقعی یہ سوچنا پڑے گا کہ ان کو آخر کس خانے میں رکھا جائے یا ان کے لئے کون سا نیا خانہ وضع کیا جائے ـــــ کیونکہ یہ ترجمے تو ہیں مگر ترجمے کے نام سے پیش نہیں کی گئیں ۔

نیلی چھتری کے کئی ایڈیشن چل چکے ہیں۔ اس کی ضخامت ۲۱۶ صفحے سے زیادہ نہیں ہے، اور شاہی خزانہ کے بھی کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں، اس کی ضخامت ۹۵ صفحہ ہے نیلی چھتری میں بیس ابواب ہیں، اور شاہی خزانہ دس ابواب پر مشتمل ہے، لیکن اس کے ہر باب میں متعدد فصلیں قائم ہیں۔ اقتباس دیکھئے : ـــ

ظفر عمر : ـــ

باب ۱ قاتل کی تلاش

"دو دیکھو نوارے کے پاس کوئی جا رہا ہے"

نوارے کے پاس ایک آدمی نظر آیا جو کوئی بوجھل اور لمبی چوڑی چیز بغل میں دبائے تیزی سے قدم بڑھائے پھاٹک کی طرف جا رہا تھا ۔

کچھ آہٹ ہونے کے بعد ایک اور دھماکہ ہوا۔ اور گرگراہٹ کی آواز آئی جیسے ذبح کے وقت جانوروں کے گلے سے نکلتی ہے

ایک آدمی تین چار قدم کے فاصلہ پر نظر آیا۔ جس نے برقی لیمپ کا بٹن دبا کر روشنی سے ان کی آنکھوں میں چکا چوند ڈال دی، دیر تک وحشت زدہ لڑکیوں کو بغور دیکھتا رہا پھر اطمینان سے ٹوپی ہاتھ میں لی، کاغذ کے دو ایک پرزے زمین سے چنے، ایک دو جگہ نقش قدم مٹایا اور بہت جھک کر اور مسکرا کر لڑکیوں کو سلام کیا اور غائب ہو گیا۔

موریس لیبلانک (زبان تیرتھ رام)

باب ۱ گولی

"دیکھو بہن وہ دیکھو ... ایک آدمی نوارے کے پاس جا رہا ہے"

واقعی ایک آدمی کوئی بوجھل چیز اٹھائے ۔ باہر کی طرف جاتا تھا ۔ اندھیرے میں ہر چند پہچاننا مشکل ہوا کہ کیا چیز ہے ۔

پھر ایسا معلوم ہوا کوئی کرسی یا اور بوجھل چیز گری ہے۔ غصہ اور جوش کے الفاظ بھی سنائی دیئے مگر ان کا خاتمہ ایک مدھم کراہٹ پر ہوا جو فوراً اس طرح کی گرگراہٹ میں بدل گئی جو بوقت ذبح پیدا ہوتی ہے ۔

سامنے تقریباً تین قدم کے فاصلے پر ایک دراز قد آدمی جلتی ہوئی لالٹین ہاتھ میں لئے کھڑا ہے، لالٹین کی روشنی ان لڑکیوں کی طرف پھیرنے سے ان کی آنکھیں چندھیا گئیں، وہ تھوڑی دیر ان کے اترے ہوئے زرد چہروں کو بغور دیکھتا رہا۔ پھر ٹوپی اٹھائی، ایک پرزہ کاغذ کا اٹھا لیا۔ دو چار تنکے جھاڑے، قالین پر بنے ہوئے پاؤں کے نشانات کو مٹایا پھر باہر کو چل دیا، بالکونی پر پہونچ کر وہ انھیں دیکھنے کو پھر ایک بار مڑا۔ اس کے بعد سلام کر کے رخصت ہو گیا ۔

عبارتیں آمنے سامنے ہیں یہاں شاہی خزانہ کی عبارت میں یہ جملہ کہ "بالکونی پر پہونچ کر وہ انھیں دیکھنے کو پھر ایک بار مڑا" بہت اہم تھا، کیونکہ آگے چل کر اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان دو لڑکیوں میں سے ایک (فیروزہ) نے چور کا دل چرا لیا ـــــ مگر ظفر عمر کے یہاں نیلی چھتری میں یہ جملہ غائب ہے۔ اس کے علاوہ ظفر عمر نے باب اول کا عنوان بھی بدل دیا ہے۔ اور "گولی" کی جگہ "قاتل کی لاش" رکھا ہے، حالانکہ باب کا اختتام ان کے یہاں بھی اسی جملہ پر ہے کہ ـــــ گولی جگر نہ چھوڑی مگر جہد کا پتہ ۔ پھر لڑکیاں زخمیوں کی طرف لپکتی ہیں تو باپ کہتا ہے : ـــ

"رتن گھبراؤ نہیں، میں اچھا ہوں، جہانگیر کا کیا حال ہے؟ مرا تو نہیں ... چاقو پھاڑ تو کہاں ہے! اتنے میں

سوزین، بیٹا ڈرو نہیں، میں فقط زخمی ہوا ہوں۔
... مگر [illegible]

باہمت اور زیادہ پرسحر آنکھوں والی تھی بڑی بے تکلفی سے سابقہ رات کے تمام واقعات اور اپنی کارگزاری کے حالات بیان کئے۔

مرزا رحیم بیگ۔ تو بائی جی آپ کے نزدیک مجرم کچھ چرا کے ضرور لے گئے؟

فیروزہ بائی۔ بیشک دو آدمی لان کی طرف سے کچھ لے جاتے تھے۔ میں نے اچھی طرح دیکھا ہے

اور تیسرا آدمی؟

وہ یہاں سے خالی ہاتھ گیا

کیا آپ اس کا حلیہ بتا سکتی ہیں؟

اس نے اپنے برقی لیمپ سے ہمیں چوندھیا دیا تھا صرف اتنا کہہ سکتی ہوں۔ کہ وہ لمبے قد اور دوہرے بدن کا آدمی تھا۔

کیوں رتن بائی کیا آپکو بھی وہ آدمی ایسا ہی نظر آیا؟

رتن بائی۔ (سوچکر) ہاں ... نہیں نہیں، میرے خیال میں وہ درمیانہ قد اور چھریرے بدن کا آدمی تھا۔

مرزا رحیم بیگ۔ (مسکرا کر) ایک ہی واقعہ کے متعلق دو چشم دید گواہ اکثر متضاد باتیں بیان کیا کرتے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں، لیکن اب ہمیں ایک ایسے آدمی کی تلاش ہے جو لمبا بھی ہے اور اوسط قد کا بھی، موٹا بھی ہے اور دوبلا بھی۔ اور وہ ایسے چور بھی ڈھونڈنا ہیں جو چوری کا مال بھی لیجاتے دیکھے گئے مگر کوئی چیز چرا کے بھی نہیں لے گئے۔

استقلال اس کی شربتی آنکھوں سے ظاہر تھا اس نے نہ صرف شب گذشتہ کے واقعات تفصیل کے ساتھ بیان کئے بلکہ جو کچھ خود اس موقع پر کیا تھا اس کا بھی حال کہا۔

اچھی طرح سوچ لیجئے آپ کو مغالطہ تو نہیں ہوا! صاحب مجسٹریٹ نے بیان کے آخر میں پوچھا۔

بالکل نہیں، میں نے اچھی طرح ان کو کوئی چیز لیجاتے ہوئے دیکھا تھا۔

اور تیسرا آدمی ... وہ جسکے ہاتھ میں لالٹین تھی؟

"وہ خالی گیا۔

آپ کو اس کا حلیہ یاد نہیں؟

چونکہ لالٹین اس نے آنکھوں کے سامنے کر رکھی تھی اس لئے میں اچھی طرح نہیں دیکھ سکی مگر میرا خیال ہے وہ لمبے قد کا گٹھیلا آدمی تھا۔

اور کیوں میڈموازل، آپ کیا کہتی ہیں؟ صاحب مجسٹریٹ نے سوزین کیطرف مڑکر پوچھا۔

وہ ... وہ میرے خیال میں اوسط قد اور چھریرے بدن کا آدمی تھا' اس نے جواب دیا۔

ایم فلیوں مسکرائے 'وہ ایک ہی واقعے کے متعلق گواہوں کے متضاد بیانات سننے کے عادی ہو چکے تھے' خوب! اس کے معنے یہ ہیں کہ ایک طرف بیٹھک میں ایک آدمی تھا لمبا بھی، متوسط بھی، گٹھیلا بھی اور چھریرا بھی، اور دوسری جانب باغ میں دو آدمی تھے جو بیٹھک سے کوئی بوجھل چیزیں اٹھا کر لیجاتے ہوئے دیکھے گئے ایسی چیزیں جو واقعی کم تھیں ہوتیں

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ظفر عمر کو خدا نے ترجمہ کی بڑی اچھی صلاحیت بخشی تھی، ترجمہ ہی کی نہیں بلکہ اخذ بھی ——— مگر اوروں کیطرح انھوں نے بھی اس [illegible] کی قدر نہ کی۔ نہ ترجمے کو ترجمہ کہنا پسند کیا۔ کوئی اشارہ تک نہیں کیا کہ یہ کسی دوسرے مصنف کی ملکیت ہے جس کو وہ یوں اپنا رہے ہیں۔

نیلی چھتری میں مسعود علیگڈھ کا طالب علم ہے، انٹر میں پڑھتا ہے اور اخبار ایس ہند دہلی کا نمائندہ ہے، شاہی خزانہ میں آرسین لوپن اور شرلاک ہومز جیسی جاسوسی ڈائجسٹ میں سکنڈ ایئر کا طالب علم ہے' اور ایک رپورٹر کا ساتھی بنکر اس کہانی میں داخل ہوا ہے، مصنوعی داڑھی دونوں لگاتے ہیں اور جاسوسی کے شوقین ہیں، کوتوال سے گفتگو بھی دونوں کی ایک ہی سی ہے، لیکن نہ میں کوتوال اسے حراست میں لے لیتا ہے اور ایک کوٹھری میں بند کر دیتا ہے مگر بہرام (پالوین) کے آدمی راتوں رات پولیس کو چکمہ دیکر اسے نکال لیجاتے ہیں۔ اور صبح کو کوٹھری خالی ملتی ہے البتہ پانی سکتا۔ کوڑے میں نیچے ایک سفید سی چیز جھی ہوئی پائی جاتی ہے جس سے پتہ چلتا [illegible]

...دالوں کو شاید کوئی خواب آور شے پلا دی گئی تھی' ـــــ "شاہی خزانہ" میں ایک خالی بوتل اور دو گلاس کا تذکرہ تھا جبکہ جس کوٹھری میں طالب علم بند ...میں بھی ایک ہی کھڑکی بدستور قائم ہے' اس میں بھی کوئی رد و بدل نہیں کیا گیا' اور پھر قیاس آرائی بھی دونوں کتابوں میں ایک ہی درج ہے کہ بے ہوش سپاہی ...یا کندھے پر پاؤں رکھ کے یہ طالب علم کھڑکی تک پہونچا ہوگا"

نیلی چھتری کا پانچواں باب ہے "نیا شگوفہ" ـــــ مگر دونوں کتابوں کا آغاز ملاحظہ کیجئے: ـ

تازہ خبر

ڈاکٹر شیرازی کا بھگا لیجانا

بدمعاشوں کی حیرت انگیز کاروائی

اخبار چھپ کر قریب قریب تیار تھا کہ ......"

تازہ ترین خبریں

نامی طبیب ڈاکٹر ڈیلاٹرے کا اغوا

مجرموں کی حیرت انگیز دیدہ دلیری

اخبار تقریباً مکمل ہوچکا تھا کہ ......"

...دونوں کی عبارت میں فرق صرف اتنا ہے کہ "ڈاکٹر ڈیلاٹرے" ناٹک دیکھ رہے تھے اور "ڈاکٹر شیرازی" کوٹھی نمبر دس کے ماہواری مشاعرے میں بیٹھے ...وہیں سے ان کا اغوا ہوا اور پھر صبح کو مطب کے وقت ایک کار اُن کو لاکر مطب پر چھوڑ کر تیزی سے روانہ ہو جاتی ہے ـ

اسی طرح سب انسپکٹر کنور شب سنگھ کے نام مسعود کا جو خط ہے وہ لفظ بہ لفظ وہی ہے جو "شاہی خزانہ" میں گینا رڈ کے نام آسیڈور باٹرلٹ کا ہے'

نیلی چھتری کا ساتواں باب ہے ـــــ "فیروزہ بائی کا قتل" ـ لیکن جہاں سے یہ باب شروع ہوتا ہے اصل کتاب (شاہی خزانہ) میں دوسرے باب کی آٹھویں ...کا آخری حصہ ہے' دیکھئے: ـ

امتحان کی وجہ سے مسعود کئی راتوں کا جاگا ہوا تھا درجہ میں بیٹھتے ہی سوگیا خورجہ اسٹیشن پر آنکھ کھلی تو سامنے کھڑکی کے پاس ایک ٹکڑا کاغذ کا پن سے آویزاں پایا اس پر موٹے حروف میں لکھا تھا: ـ

ہر شخص کو اپنے کام سے کام رکھنا چاہیئے ' اگر تم دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑاؤ گے تو اچھا نہ ہوگا

امتحان کی تیاری میں کئی راتیں جاگتے رہنے سے طبیعت چونکہ مضمحل تھی اس لئے لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی ... بیدار ہوا تو گاڑی قصبہ روآں کے پاس پہنچ چکی تھی وہ آنکھ ملتا اٹھا ڈبہ اب بھی خالی تھا مگر سامنے والی نشست کے بالکل بالمقابل بیٹھنے والے گدے پر یعنی اسیڈور باٹرلٹ کے عین بالمقابل بیٹھنے والے گدے پر یعنی ... سپید کاغذ کا ایک تختہ پن سے ٹنگا ہوا نظر آیا ـ اٹھ کر دیکھا تو کاغذ پر موٹے حرفوں میں یہ عبارت درج تھی "دانا وہ ہے جو کام سے کام رکھے' تم بھی اگر نادان نہیں ہو تو اس قول پر عمل کرو' ورنہ سوچ لو بے جا مداخلت کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا"۔

اسی باب میں کچھ اور آگے بڑھیئے: ـ

"نور محل کا تازہ قتل"

"نور محل سے بذریعہ ٹیلی فون معلوم ہوا کہ کل رات چند بدمعاش نور محل میں داخل ہوئے رتن بائی کے ہاتھ پاؤں باندھ اور منہ میں کپڑا ٹھونس کے ڈال گئے اور فیروزہ بائی کو لیکر غائب ہوگئے احاطے کے باہر .. ۵۰ قدم کے فاصلہ پر خون کے

"تازہ ترین خبر"

ڈیپ سے بذریعہ ٹیلی فون اطلاع موصول ہوتی ہے کہ کل رات چوروں کی ایک جماعت نے شاٹو ڈامبر ومیلس میں داخل ہوکر میڈ اموازل ڈاجسورس کے ہاتھ پیر باندھ دیئے اور منہ میں کپڑا ٹھونسنے کے بعد میڈ اموازل دی سینٹ ویرا...

نشانات پائے گئے۔ اور وہیں ایک ولائتی اور ایک ریشمی
رومال بھی ملا جو خون میں تربتر تھا۔ یقین کیا جاتا ہے۔ کہ
بیچاری فیروزہ بائی قتل کر دی گئی۔"

کو اشارہ کرتے گئے۔ مکان سے تقریباً پانسو گز کے فاصلہ پر خون کے
داغ دیکھے گئے اور وہیں ایک خون آلود رومال بھی ملا۔ اندیشہ
ہے کہ بدمعاشوں نے اس نوجوان لیڈی کو باہر لیجا کر قتل کر دیا"

غرض سلسلہ وار پڑھتے چلے جائیے ترجمہ تو ہے ہی، زیادہ سے زیادہ کہیں ایک آدھ لفظ بڑھا دیا ہے یا کہیں کوئی ٹکڑا نکال دیا ہے یا کہیں سرخی بدل دی ہے مثلاً اسی پیراگراف میں "خون آلود رومال" کے ساتھ لفظ "ریشمی" بڑھا دیا ہے اور ایک مدد ولائتی کا بھی اضافہ کر دیا ہے اور چوروں کی جگہ "بدمعاش" اور "اندیشہ" کی جگہ "یقین کیا جاتا ہے"۔ نیلی چھتری کا آٹھواں باب "بہرام کی لاش" ۔ شاہی خزانہ کا تیسرا باب "لاش" ہے۔ اسی طرح نیلی چھتری کے نویں باب اور شاہی خزانہ کے چوتھے باب کی سرخی تک ایک ہے یعنی "مقابلہ"۔ جس کا آغاز یوں ہے کہ

اس واقعہ کے دو مہینے بعد کا ذکر ہے (نیلی چھتری)
"مقدمۂ نورمحل"
"پوست کندہ حالات (از مسٹر مسعود حسن)"

واقعات مذکورہ کے پانچ ہفتے بعد۔۔ (شاہی خزانہ)
"اسرار امیر و ملیسی کا انکشاف"
"ایم آسیڈ دلر باٹرلٹ کے قلم سے"

دونوں کتابوں میں اخبارات "کل" شائع کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔

دسواں باب، افشائے راز
دوسرے روز صبح آٹھ بجے۔۔۔ اخبار ایس کا تازہ پرچہ۔۔۔۔

تیسری فصل، اسرار امیر و ملیسی کا انکشاف
سویرے آٹھ بجے۔۔۔۔ اخبار گرینڈ جرنل۔۔۔۔۔

اور پھر وہ تفصیلی بیان درج ہے جو اخباروں میں شائع ہوا تھا، نیلی چھتری میں یہ باب اس عبارت پر ختم ہوتا ہے کہ "اسی دن شام کو اخبارات میں یہ بھی چھپ گیا کہ مسعود حسن کے والد لاہور سے غائب ہو گئے"۔ شاہی خزانہ میں چند سطروں کی چوتھی فصل کا اختتام یوں ہوا ہے کہ "جس دن یہ مضمون شائع ہوا اسی شام اخباروں میں باٹرلٹ کے باپ کے گم ہو جانے کی خبر چھپ گئی"

گیارہواں باب، لاہور کا سفر (نیلی چھتری)
بارھواں باب، تلاش (")

پانچواں باب سراغ (شاہی خزانہ)
پانچویں باب کی چوتھی فصل (")

لطیفہ یہ ہے کہ بیٹا باپ کی تلاش میں پہونچا تو:۔
گھاٹ کے قریب پہونچ کر دو گوجرنیاں ملیں
جو دودھ بیچ کر لوٹ رہی تھیں ان سے پوچھا
اس جگہ کا کیا نام ہے؟
فیروزآباد۔
اس کا سننا تھا کہ مسعود کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی

پل کے پاس دو خوش ادا گوالنیں دودھ لیے جاتی تھیں
ان سے پوچھا۔۔۔۔
اس کو کیا کہتے ہیں؟۔۔
شالوڈی لاگو پل اس کا نام ہے،
اس جواب کو سن کر پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی۔

تیرھواں باب، قید سے رہائی
مسعود کو فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی۔۔۔۔

چھٹا باب گہرا راز
باٹرلٹ نے جلد ہی یہ بات طے کر لی۔۔۔۔

اس باب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ بیٹے نے فوجی کا بانی کے ساتھ باپ کو قید سے نکالا اور ساتھ ہی فیروزہ بائی بھی برآمد ہوئی۔ اور اس مہم کو سر کرنے میں دکو چیپت راستے سے بڑی مدد ملی۔ یہ چیپت رائے شاہی خزانہ میں ایک صاحب "والمیاس" ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں سے ایک ایسا خط بھی برآمد ہوا جس سے پتا تھا کہ بہرام فیروزہ کے عشق میں مبتلا ہے ۔ لہٰذا نیلی چھتری میں چودھواں باب "بہرام کی شکست" ہی ہونا چاہیئے تھا۔ اور اس شکست کو مزید تقویت

نے کی کوشش یوں کی گئی کہ چپت رائے اور فیروزہ (یعنی والیراس اور ریمنڈ) کی شادی کا اعلان کر دیا گیا۔ کیونکہ مسعود نے چپت رائے کی مدد سے جب اپنے باپ اور فیروزہ کو قید سے برآمد کیا تھا تو فیروزہ کو دیکھ کر چپت رائے بری طرح فریفتہ ہو گیا تھا۔ خود فیروزہ کا بھی یہی حال تھا ——— چنانچہ شادی کی تقریب غیر معمولی اہتمام اور دھوم دھام سے منائی گئی۔ اور سب کو یقین ہو گیا کہ اس شکست کے بعد تو ہرام کبھی سر نہ اٹھا سکیگا۔

اسی دن اخبار انیس ہند میں پروفیسر سعید کا ایک خط شائع ہوا جس میں چتر گڑھی پر تفصیل سے تاریخی بحث کی گئی تھی (شاہی خزانہ میں یہ خط ایک نامی مورخ ایم سین کے انگریزی چتری میں شاہان فرانس کے احوال کھپ سکتے تھے لہٰذا شاہان دہلی کے احوال یہاں جوڑے گئے) اس خط میں پروفیسر نے یہ بھی لکھا تھا کہ مسعود (بارٹلٹ) نے دھوکا کھایا ہام (لوبین) نے ان ہنگاموں میں لگا کر نیلی چھتری (پولی سوئی) کی طرف سے اس کو غافل کر دیا'... یہ خط مجمع کے اصرار پر مسعود نے کھڑے ہو کر سنایا مگر اس نکتہ کا اثر ناشدید ہوا کہ وہ مضمون ختم کرتے ہی زار و قطار رونے لگا ——— اور چپت رائے نے بڑھ کر اسے تسلی دی یعنی والیراس نے۔

پندرھواں باب' بادشاہ کا دیوان

ساتواں باب' پولی سوئی

اس باب میں تاریخ شاہی درج ہے' اور ہم نے ابھی عرض کیا ہے کہ شاہان فرانس کے احوال کو شاہان دہلی کے احوال میں ڈھالنے پر ظفر عمر نے خاصی ذہانت صرف کی ہے' آئیے اس ذہانت کا ایک نمونہ بھی دیکھتے چلئے: —

پروفیسر سعید کا خط مسعود کے نام: —

جناب من تسلیم! مولانا آزاد مرحوم کے دربار اکبری میں اصل قلمی نسخہ میری نظر سے گذرا ہے اس میں ذیل کی عبارت حاشیہ میں درج ہے مگر کسی مطبوعہ نسخے میں پتہ نہیں: —

"فیضی نے اپنے ایک دوست سے بیان کیا کہ جس وقت مان سنگھ کے قتل اور ہیرے کے برآمد ہونے کی خبر بادشاہ کو پہنچی میں دربار میں موجود تھا، بادشاہ بے انتہا متوحش ہوئے۔ اور بار بار کہتے تھے ——— افسوس' افسوس غضب ہو گیا۔

چند ماہ بعد مان سنگھ کی بہن جس کی شادی کنور دلیر سنگھ کے ساتھ ہوئی تھی دہلی سے جلاوطن کی گئی۔ اور اپنے شوہر دلیر سنگھ کی جاگیر واقع راجپوتانہ میں بھیجدی گئی۔

یہ ایک عجیب واقعہ ہے اور اس میں کوئی راز پوشیدہ ہے

فیضی ابوالفضل کا بھائی تھا اور اس میں شک نہیں کہ اپنے بھائی سے اسے نیلی چھتری کے حالات معلوم ہو چکے تھے اس کے حوالے سے اس روایت کا قلمبند ہونا صحت کی کافی دلیل ہے۔

مورخ ایم سین کا خط بارٹلٹ کے نام: —

جناب من' میں آپ کی توجہ دالٹاتر کی کتاب لاسیکل دی لوئیس ۱۴ (باب ۲۵) خاندان شاہی کی عجیب حکایات پہ دلاتا ہوں اس کتاب کے تمام مطبوعہ نسخوں میں یہ عبارت محذوف ہے: —

میں نے سابق وزیر مال ایم ڈی کو مارٹن کی زبانی جو وزیر کیمیلارڈ کے دوست تھے سنا ہے کہ ایک روز بادشاہ سلامت کو خبر پہنچی کہ ایم دی لاربری کو بعض شخصوں نے قتل کر دیا۔ اور نادر جواہرات جو اس کے پاس تھے چھین کر لے گئے۔ قبلۂ عالم یہ خبر پاتے ہی بے قرار ہو گئے اور گاڑی پر بیٹھ کر روانہ ہوئے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ مضطربانہ کہہ رہے تھے.... سب کچھ جاتا رہا..... افسوس سب کچھ جاتا رہا۔

اس کے اگلے برس لاربری کے بیٹے اور اس بیٹی کو جس نے مارکوئیس دی ونیر سے شادی کی تھی' جلاوطن کر کے ان کی آبائی ریاست پراونس اور نیز مٹنی میں بھیج دیا گیا۔ صاف ظاہر ہے اس میں کوئی بھید ہے۔

اس اقتباس پر میں اپنی طرف سے اتنا ہی اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ دالٹاتر کے بیان کے مطابق ایم ڈی کیمیلارڈ وہ آخری وزیر تھا جسکو مرد نقاب پوش کا راز معلوم ہوا۔ اس

اس اقتباس اور ان دو واقعات کے تقابل سے جو نتیجہ اخذ
کیا جا سکتا ہے وہ محتاج بیان نہیں ۔

سولہویں باب میں مسعود اور پروفیسر سعید کی ملاقات ہوتی ہے تو مسعود ہکا بکا رہ جاتا ہے کہ وہ جسے پروفیسر سعید سمجھ رہا تھا، وہ تو بہرام ہی ہے (مولیخ مسین کہاں، یہ تو آرسین لوپن ہے) مسعود گولی چلانا چاہتا ہے لیکن پھر وہ گھونسہ کھا کر بیہوش ہو گیا ——

سترہواں باب، راجہ یدم سٹر اور بہرام (نیلی چھتری) — آٹھواں باب، تیصرے لوپن تک (شاہی خزانہ)

یہاں بھی چونکہ ساری باتیں تاریخی انداز کی تھیں اس لئے ظفر عمر نے ملک کے ماحول کے مطابق مقامی تاریخ کی باتیں لیکر ان سے خانے بھرے ہیں : —

اٹھارہواں باب، حملہ کی تیاریاں

یہاں سے ظفر عمر نے بیشتر حصے بیچ بیچ سے چھوڑنے شروع کئے ہیں تاہم جو کچھ درج ہے وہ اصل ہی کا ہے ۔

انیسواں باب، حملہ

اس میں شاہی خزانہ کے نویں باب کی تیسری فصل کے کچھ حصے، اور پھر چوتھی فصل شامل ہے (جو چند سطروں کی ہے) آخری سطر ملاحظہ کیجئے : —

نیلی چھتری	شاہی خزانہ
مسعود کھانے کی میز کے قریب آیا، تینوں جگہ ایک ایک کارڈ جڑا اور سے نیپکن پر آویزاں تھا، اور قریب گیا اور پڑھا ۔	باٹرلٹ میز کے پاس پہونچا، تین کارڈ تین ناموں کے میز پوش کے ساتھ ٹنکے ہوئے تھے گویا یہ کرسیاں تین شخصوں کے لئے مخصوص تھیں، اس نے ایک ایک کر کے ان کو پڑھا
بہرام	آرسین لوپن
اس کے مقابل میں، مسٹر بہرام	اسکے مقابل، میڈم آرسین لوپن
پھر تیسرے کارڈ پر نظر ڈالی اور سخت متحیر ہوا کہ یہ خود اس کے نام کا کارڈ تھا ۔	تیسرا کارڈ سرے پر تھا، وہ سب سے آخر میں اس کے پاس گیا مگر اس کو پڑھ کر زور سے چونکا ۔ اس پر خود اس کا اپنا نام درج تھا ۔
مسٹر مسعود حسن	آسیڈور باٹرلٹ

اب ایک منظر آخری بھی دیکھ ہی لیجئے یہ کیوں باقی رہ جائے : —

نیلی چھتری	شاہی خزانہ
بیسواں باب، شاہان دہلی کا خزانہ (نیلی چھتری)	دسواں باب، شاہان فرانس کا خزانہ (شاہی خزانہ)
ایک پردہ ہٹا اور بہرام ہنستا ہوا برآمد ہوا ۔	ایک پردہ ہٹا ۔
خوش آمدید مسٹر مسعود! مزاج تو اچھا ہے ؟ آپ کس قدر دیر میں آئے، میں نے بارہ بجے کھانے کا وقت مقرر کیا تھا لیکن کچھ مضائقہ نہیں اب بارہ کے چند منٹ گذرے ہیں ۔	دوست، باٹرلٹ سلام، افسوس ہے تم نے دیر کر دی کھانے کا وقت بارہ بجے مقرر تھا . . . ۔ اور اب سوا بارہ ہیں خیر کچھ بات نہیں ۔
مسعود ششدر ہو کے رہ گیا، بجائے بہرام کے اپنے پرانے رفیق چیپٹ ناک والے کو سامنے کھڑا پایا، مسعود آج بہرام کی گرفتاری کے لئے چلا تھا لیکن اس وقت اسے معلوم ہوا کہ بہرام اور چیپٹ ناک والے دو شخص نہیں ہیں —— کون چیپٹ ناک والے؟ وہی جسے مسعود اپنا رفیق سمجھ کر نیلی چھتری کے حملے میں	حیرت نہیں، خوف بد حواسی اور سراسیمگی تھی جو اس پر طاری تھی ۔ کیونکہ وہ آدمی جو پردے سے نکل کے اس کے سامنے کھڑا تھا، وہ جو حالات کی رو سے آرسین لوپن کے سوا کوئی اور نہ ہو سکتا تھا ۔ کون نکلا ! ۔ والمیراس، والمیراس، شاتو ڈی لا گول کا مالک، وہ جس سے باٹرلٹ

سے ساتھ لے گیا تھا، وہی چیپت رائے جو جبر گڑھی کا مالک تھا، اور جس کی مدد سے اس کے والد اور فیروزہ باجی نے قید سے رہائی پائی تھی ۔

تم ۔ ۔ ۔ تم، کیا تم ہو؟

بہرام ۔ (بآوازِ بلند) اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ بہاری مولوی یا پروفیسر سعید کے علاوہ میں کوئی اور بھیس نہیں بدل سکتا؟ مسٹر مسعود ذرا غور کرو تو سمجھو گے کہ جو درجہ بہرام کو اس وقت ملک میں حاصل ہے اس کے لحاظ سے نت نیا روپ بدلنا پڑتا ہے۔ آج مولوی بن کے حضرت مولانا سلیمان صاحب سے بھی زیادہ موثر لہجے میں دہلی کی جامع مسجد میں وعظ کہتا ہے۔ کل پروفیسر سعید بن کر سوشلسٹ سوسائٹی کے سالانہ جلسے میں لکچر دیتا ہے ۔ ۔ ۔ "

"اگر تم واقعی چیپت رائے ہو تو ۔ ۔ ۔ فیروزہ؟"

"ایک لمحہ انتظار کرو،"

نے آرسین لوپن کے خلاف مدد حاصل کی تھی، جس کے ساتھ مل کر اس نے ریمنڈ اور اپنے باپ کو لوپن کی حراست سے نکالا تھا، وہ جس نے بعد ازاں ریمنڈ سے شادی کی تھی!

تم ۔ ۔ ۔ ۔ تم؟ باٹرلٹ نے رکتے ہوئے کہا

جی آپ کا دیرینہ خادم اور نیازمند، لوپن نے مسکرا کر جواب دیا، مرد آدمی تم کیا اس زعم میں تھے کہ ایک بار مجھ کو مسین کے بھیس میں جان کر اب ہر رنگ میں پہچان لوگے؟ نہیں بیٹا کچھ دن اور پڑھو، تھوڑا تجربہ اور حاصل کرو، پھر لوپن کے مقابلہ کا دم بھرنا۔ یہ بندہ اگر بھیس کی تبدیلی میں اتنا کمال بھی نہ رکھے تو پھر اس کی سلامتی کو سلام، اب آپ کا دوست لوپن اصلی صورت میں سامنے کھڑا ہے، غور سے دیکھ لو تاکہ پھر دھوکا نہ ہو۔

"تو کیا اس کا مطلب یہ ہے ۔ ۔ ۔ تم نے آخرکار ۔ ۔ میڈموازل سے؟"

"جی سرکار، وہ جس نے میڈموازل دی سینٹ ویراں سے شادی کی، آپ کا خادم آرسین لوپن ہی تھا،"

یہ کہہ کر اس نے پیچھے سے پردہ اٹھایا اور گردن سے اشارہ کیا، فیروزہ باجی اپنی پُرسحر آنکھوں، کالے بالوں، ماہتاب چہرے کی کل دولت لئے پردہ سے برآمد ہوئی ۔

اور جھک کے مسعود کو سلام کیا،

مسعود ۔ آہ فیروزہ باجی، واقعی آپ ہیں؟

بہرام ۔ مسعود! اب ان کا یہ نام نہیں ہے مسز چیپت رائے کہنا چاہیئے، تم جانتے ہو ان کی شادی میرے ساتھ حسب رواج برہمو سماج باضابطہ ہوئی ہے، یہ میری منکوحہ بیوی اور میرے دل کی مالک ہیں، یہ سب تمہاری عنایت ہی کی بدولت حاصل ہوا ۔

اس نے پردہ ہٹا کر پچھلی طرف اشارہ کیا ۔ ریمنڈ سامنے آکر کھڑی ہوگئی ۔

کون! میڈموازل دی سینٹ ویراں!

جی نہیں، میڈم آرسین لوپن، یا اگر قانونی لکیر پر چلیے تو میڈم لوئیس والمیراس، میری منکوحہ بیوی، جس کو پاتا باٹرلٹ فقط تمہاری کوشش سے نصیب ہوا،

[illegible] چلا جا رہا ہے، دیواریں ٹوٹ رہی ہیں، ادھر بہرام مسعود کو اپنے تہہ خانے کی سیر کراتا جاتا ہے: ۔

"راجہ یدھشٹر، بکرماجیت، سمندرپال، چنگیز، شیر سنگھ، رائے پتھورا، قطب الدین،

قیصر جولیس، شارلمین، رولو ولیم فاتح، رچرڈ شیر دل، لوئیس یازدہم، فرانسس اول،

رسالوں میں

(ماہ گزشتہ)

طلوعِ اسلام کراچی: اس شمارے میں پہلا طویل مضمون ہے " علماء کون ہیں " ؟ جس میں بتایا گیا ہے کہ علم اور علماء کے متعلق ہمارا موجودہ تصور درست نہیں۔ اس پرچہ میں ہر ماہ مجلس اقبال کے عنوان سے علامہ اقبال کے اشعار کی عالمانہ شرح بھی پیش ہوتی ہے۔ " قرآنی معاشرہ " علامہ محمود احمد عثمانی کا مضمون بسلسلہ اصلاح تمدن کی ہے جس میں قرآن کی روشنی میں فرد اور جماعتی ہستیوں کے روابط کے اصول بتلائے گئے ہیں۔ پلاننگ بورڈ کی مجوزہ زرعی اصلاحات پر بھی اس شمارہ میں عالمانہ بحث کی گئی ہے، پرویز صاحب کہتے ہیں کہ قرآن کی رو سے ہوا پانی روشنی کی طرح رزق و سامانِ زیست کے سرچشموں پر کسی کی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا زمین کا انتظام اس طرح ہونا چاہیے کہ کوئی متنفس بھوکا نہ رہنے پائے۔ اس ماہنامے کا خصوصی فیچر " حقائق و عبر " ہے جس میں پروفیسر ارنلڈ ٹوئن بی کا ایک مضمون " انسان کو صحیح آزادی کیسے مل سکتی ہے " درج ہے۔ ٹوئن بی نے لکھا ہے کہ " انسانی آزادی کی بنیادی شرط جو بظاہر متضاد سی نظر آتی ہے یہ ہے کہ انسان کبھی آزاد نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس حقیقت کو تسلیم نہ کرے کہ وہ اس کائنات کا صاحب اقتدار اور خود مختار حاکم مطلق نہیں ـــــ میں عیسائیت انسانی پرستش کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس نقطۂ نظر میں اسلام بھی عیسائیت کا ساتھی ہے اور اسلام و عیسائیت دونوں نے یہ سبق یہودیت سے سیکھا ہے۔ وہ عقیدہ کون سا ہے جو ان سب میں مشترک ہے؟ میں صاف لفظوں میں کہوں گا کہ لا الٰہ الا اللہ، اور خدا نے انسانوں کو آزاد پیدا کیا ہے، لہٰذا کسی فرد کا یہ سمجھنا کہ میں معاشرے کی خاطر نہیں بلکہ معاشرہ میری خاطر ہے، نری خود پرستی ہے " ـــــ اس پر طلوعِ اسلام نے لکھا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ (توحید) اور لقد کرمنا بنی آدم (احترامِ آدمیت) کا علمبردار تو اسلام ہے، یہودیت اور عیسائیت کہاں؟ اصل یہ ہے کہ یہ قرآنی تعلیم فضا میں پھیلی ہوئی ہے اور غیر شعوری طور پر زبانوں پر آ رہی ہے۔ ـــــ عائلی کمیشن رپورٹ پر جو تنقید مولانا عبدالماجد دریابادی نے کی تھی اس پر بھی تنقید کی گئی ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ اس مسئلہ میں طلوعِ اسلام قدامت پسند اور تجدد پسند دونوں سے اختلاف رکھتا ہے۔ ـــــ

فاران کراچی: ـــــ اس ماہ کے پرچہ میں مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی کا مضمون " چین اور مذہب " خاصا طویل معلوماتی اور مفید مضمون ہے۔ یہ ان کے حالیہ سفرِ چین کے تاثرات ہیں مگر مؤرخانہ اور محققانہ۔ وزیراعظم چین چو این لائی کے اس بیان پر کہ چین کی آبادی ساٹھ کروڑ ہے، مولانا کو اعداد و شمار اور اصول [illegible] اعتراض ہے کہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۷ء تک سات سال میں سینتالیس کروڑ سے آبادی یک لخت ساٹھ کروڑ کیسے ہو جائے گی؟ انہوں نے لکھا ہے کہ چین میں [illegible] میں ایک مزار حضرت سعد ابی وقاص کے نام سے ہے، لیکن کوئی چینی کتاب اس کی تائید میں نہیں ہے کہ یہ ابو وقاص صحابی تھے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ قدیم علم [illegible] مسلمانوں کی تعداد تقریباً سات کروڑ بتائی گئی تھی، انگریز ماہرین اپنی ڈائرکٹریوں میں ساڑھے پانچ کروڑ لکھتے ہیں، امریکی ماہرین پرنسٹن یونیورسٹی کے شائع کردہ [illegible] کروڑ کے درمیان بتلاتے ہیں، میرا اپنا خیال ہے کہ اگر مسلمانوں کی صحیح مردم شماری ہو سکے تو ان کی تعداد سات [illegible] کنفیوشس کے ماننے والے تقریباً چالیس کروڑ ہیں، بدھ مت کے پیرو تقریباً ڈھائی کروڑ ہیں، مسلمان تقریباً پونے سات کروڑ، عیسائی تقریباً پچاس لاکھ [illegible] چار کروڑ اور کمیونسٹ تین لاکھ " ـــــ مولانا لکھتے ہیں کہ کمیونزم خود ایک مذہب ہے [illegible]

حیات بعد الممات سے قطعی انکار پر قائم ہے۔ گو ریڈیو تعلیم کے ذریعے مسلمان اپنی تمدنی روایتوں کو زندہ رکھنے کی سعی کر رہے ہیں، مساجد کے مدرسوں میں اور محلوں میں بچوں کو ابتدائی مذہبی تعلیم دینے کی سعی بھی جاری ہے مگر سرکاری اسکولوں میں لامذہبی کی تعلیم بھی لازمی ہے۔

تذکرہ کراچی: —— اس ماہ سید حسن امام صاحب وارثی کے طویل مضمون "سن گنگیہ تے کی کم" کی تیسری قسط شائع ہوئی ہے یہ مضمون تاریخ انجی کا جرأت مندانہ جائزہ ہے۔ آخیر میں چند سوالات بھی صاحبانِ ذوق و نظر کے سامنے پیش کیے ہیں: "(۱) اکبر اید اورنگ زیب میں کون ذمہ دار ہے زوالِ مغلیہ کا؟ (۲) شاہجہان سے کیا چوک ہوگئی کہ اس نے اپنے بعد کا جو لائحہ عمل تیار کیا تھا وہ سراسر حرف غلط ثابت ہوا؟ (۳) محی الدین عالمگیر نے کہاں چوک کھائی کہ اس کی آنکھیں بند ہونے کی دیر تھی کہ سارا طلسم درہم برہم ہو کر رہ گیا؟ (۴) کیا وجہ تھی کہ انگریز "بونڈے" (بقول ملپ اوڈرٹ) دانایانِ فرنگ بن کر رعیہ ہوا گئے اور تالیِ جنگ عظیم تک سیکے از فاتحین لارڈ موسوٹ بیٹن آئے اور سلطنت گنوا گئے۔" اس شمارے میں مولانا مظہر علی کامل کا مضمون "فیلسوف العرب یعقوب کندی" سوانحی ہے اور خواجہ محمد شفیع دہلوی کا مضمون "یا دکہتی ہیں تمہیں" ایک ایسے جذبات سے بھرا ہوا مسلمان کی للکار ہے جو اپنی کھوئی ہوئی ہر چیز کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے بے چین ہے اور اپنی بے چینی دوسروں کے سینے میں بھی بھر دینی چاہتا ہو۔

ماہِ نو کراچی: —— فضل احمد کریم فضلی نے اپنے مضمون علامہ وحشت کلکتوی مرحوم — کی شخصیت، زندگی، نظریۂ فن اور کمالِ فن کی طرف بہت دلچسپ اور بسنا اچھے اشعار دیے گئے ہیں مگر یہ اشارات تفصیل کے طالب تھے۔ وزیر آغا کا مضمون "اردو شاعری میں فنا و بقا کے تصورات" ایک مفید مطالعہ ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ سارے شعرا وجودی یا وحدت الوجود کے اسی مفہوم کے قائل تھے جو ہم آج سمجھتے ہیں، اور نہ تصوف میں فنا کا تصور نروان کا مترادف ہے جیسا کہ غلطی سے لوگ سمجھا کرتے ہیں۔ میر کا یہ شعر — موت اک ماندگی کا وقفہ ہے ۔ یعنی آگے چلیں گے دم لے کر — فلسفیوں سے ہم آہنگ ہے نہ نروان سے — یہ فکر تو اقبال کی اس فکر سے مل رہی ہے جو ان کے اس مصرعے میں ہے کہ "موت تجدید مذاقِ زندگی کا نام ہے" کیونکہ اس فکر کا سرچشمہ ہر شد رومی ہیں جن کی نظر میں زندگی ایک ارتقا پذیر رفتارِ فطرت ہے۔ —— آغا بابر کا "جوتے نرم ہو گئے"، ابن الحسن کا "احسان منزل"، حمید کاشمیری کا "نو آموز" اور رحمان مذنب کا "ٹوٹا ہوا منی مون" بھی اس شمارے میں شامل ہے۔ اخیر میں قدیم ہیروں کے عنوان سے مولانا ابو الجلال ندوی کا مضمون "آثار قدیمہ" اور قدیم کتبات اور قدیم ترین اشارات، زبان و حروف کی صوت و صدا کی تعیین کے سلسلے میں محققانہ بحث ہے یہ دوسری قسط ہے اور ابھی ناتمام ہے۔

زینت کراچی: —— پہلا مضمون سید ابو الخیر کشفی کا ہے "ایک حسین بھی نہیں" اگرچہ مختصر ہے لیکن نقطۂ نظر اور اس کی صحت و عدم صحت کا جائزہ لینے کی ایک مفید اور تحریک انگیز کوشش ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ کربلا کا واقعہ محض المیہ یا ٹریجڈی نہیں ہے، ٹریجڈی کی دو بنیادیں ہیں —— "احساسِ تنہائی" یا یہ احساس کہ ہماری کا سیا بیاں ہمارے آئیڈیل سے چھوٹی ہیں — کربلا میں ان میں سے کوئی پہلو موجود نہیں۔ محمد نجیب نے منشی پریم چند پر اور ممتاز حیدر نے "قصہ کہانی" کے عنوان سے قدیم و جدید افسانہ نگاری پر مختصر مضامین لکھے ہیں، ان کے علاوہ اس شمارے میں "ایک خط اور اس کا جواب" بھی ایک چیز ہے — یہ خط کسی گمنام خاتون کا خط ہے جو پروفیسر ارشد کاکوی کو لکھا گیا تھا کہ فضلی صاحب کیا ویسے ہی ہیں جیسے ان کی تصویر ماہ نو میں چھپی ہے؟ اور کیا وہ باتیں سچ ہیں جو اپنی غزل گوئی اور شخصیت پر اپنے تاثرات انہوں نے ماہ نو میں لکھے ہیں! وغیرہ وغیرہ — پروفیسر موصوف نے اپنے طویل جواب میں لکھا ہے کہ "مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی اس شخصیت کو پیش نہیں کیا جو ان میں ہے بلکہ اس شخصیت کو پیش کیا ہے جسے وہ خود میں دیکھنا چاہتے ہیں"، اس مضمون میں فضلی کے ساتھ جگر کی ذات بھی کھینچا تانی ہے۔ اس شمارے میں قیس رامپوری، بشیر قریشی، روحی درانی اور خاتون کے افسانے اور راشد اللہ بیگم کا لکھا ہوا "شادی سے پہلے" [illegible]

تخلیق کراچی: —— یہ نیا ماہنامہ ہے اس کے مدیر شفیق خواجہ ہیں، اور ہند و پاک کے اچھے اچھے ادیبوں کی نگارشات اس اولین شمارے میں شامل ہیں۔ پہلا مضمون "خواجہ حسن نظامی بحیثیت انشا پرداز" ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ خواجہ صاحب اردو کے [illegible] ہیں، ان کے ہاں آزاد کا کچھ انداز تو ہے لیکن ان کا تصنع نہیں، ان کے اور غالب کے اسلوب میں مشابہت ہے۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ نے [illegible] میں خیال کی قدیم اور جدید تعریف پر بحث کرنے کے بعد دیکھا ہے کہ اگر غور کیا جائے تو صرف اصطلاحوں کا الٹ پھیر ہے [illegible]

... حسین کا مضمون ایک تجسس ہے کہ غزل میں سیاست کا اظہار ممکن ہے یا نہیں؟ یہ بحث مفید ہو سکتی ہے اگر اس عنوان پر جاہلانہ نہیں تحصیلی انتقادی بحث کی ...
... نے غالب کے فارسی تحقیق نامے کا اُردو منظوم ترجمہ بھی پیش کیا ہے اور شمعی نامے سے پیشتر غالب کے مزاج و انداز و کلام پر بحث بھی کی ہے ...
... دلچسپ ہے ــــ افسانے اور ڈرامے بھی اچھے ہیں

لوح و قلم کراچی : ــــــ یہ بھی ایک نیا ماہنامہ ہے چھوٹے سائز پر نکلا ہے، ماہنامے کا نام بڑی کیفیت کا حامل ہے۔ بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق ... کا پیغام بھی شامل ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ "ہمیں ایسے ادیبوں اور اہل علم کی ضرورت ہے جو مغربی علم و ادب میں ... حاصل کر کے ان اصولوں کا اطلاق ہمارے ادب پر اس خوش اسلوبی سے کریں کہ اس میں توانائی شگفتگی اور بلندی تو پیدا ہو مگر اس کی روح مردہ نہ ہونے ... اداریہ میں کہا گیا ہے کہ یہ پرچہ کالج کے طلبہ کے لئے ایک تربیت گاہ کا کام دیگا اور مستقبل کے لئے فنکار تیار کریگا۔ یہی سبب ہے کہ اس پرچے میں سارے مضامین ... کے ہیں اور نئی ہی جگہ سب اچھے ہیں۔ پرچے کی یہ خصوصیت یقیناً بہت اہم ہے۔ اور ادارے کے دل میں ایک لگن پائی جاتی ہے۔

منادی دہلی خواجہ نمبر ــــ خواجہ حسن ثانی نے اگست میں یہ خواجہ نمبر پیش کر کے ایک بڑی ضرورت پوری کر دی۔ یہ نمبر ۱۵۴ صفحات کا ہے، خواجہ حسن نظامی صاحب کی زندگی اور رحلت کی کئی تصویریں بھی درج ہیں اور خواجہ صاحب کے چند پرانے مضامین بھی، اس نمبر میں پاکستان اور ہندوستان کے تیس تیس اہل قلم نے حصہ لیا ہے مولانا شاہ غلام حسنین صاحب سجادہ نشین خانقاہ سلیمانیہ پھلواری شریف نے "تصوف کا خادم مشائخ کا محسن" کے عنوان سے لکھا ہے کہ "میرے علم میں کوئی شیخ طریقت ایسا نہیں جس نے تصوف کے دفاع میں اتنی سعی بلیغ اور ایسی منظم کوشش کی ہو ان کی جنگ بھی جو کمیاتی اور صلح بھی"۔ ملا واحدی صاحب نے لکھا ہے کہ "انہوں نے عرسوں کی اصلاح کی بجائے بند کرائے حلقہ المشائخ قائم کیا جس کے باقاعدہ ممبروں میں علامہ شبلی مولانا آزاد اکبر الہ آبادی علامہ اقبال، میاں محمد شفیع اور سید علی امام جیسے ہندوستان کے چوٹی کے لوگ تھے اور حضرت مولانا سید شاہ سلیمان پھلواری تو خواجہ صاحب کے ان اصلاحی پروگراموں کے سب سے بڑے حامی تھے"۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنے مضمون "خواجہ حسن نظامی بحیثیت انشاء پرداز" میں لکھا ہے کہ "ان کے ہاں آزاد کا کچھ انداز تو ہے لیکن ان کا تصنع نہیں، غالب اور خواجہ صاحب کے اسلوب میں خاص مناسبت ہے، غالب کے ہاں شوخی اور خواجہ صاحب کے ہاں سوز و گداز ہے خوش مذاقی دونوں میں مشترک تھی، اور مکالمے کا طرز بھی"۔ ڈاکٹر غلام یزدانی نے لکھا ہے کہ "ان کو دو ذہنی صنفیں معلوم ہوتی تھیں ایک "لیک" دوسرے "نوچ" گفتار میں بھی کردار میں بھی اور تحریروں میں بھی"۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے لکھا ہے کہ "وہ اُردو کے پہلے عوامی ادیب تھے، سرسید کے بعد ایسی کی شخصیت تھی جس نے جنگ آزادی میں زیادہ دلیری اور بیباکی سے قلم اٹھایا"۔ مولانا صلاح الدین مدیر ادبی دنیا نے لکھا کہ "فرنگی حاکم کی تعزیر کے خوف سے جو باتیں صاف صاف نہیں کہی جا سکتی تھیں ان کو حدیث دیگراں کے لباس میں خواجہ صاحب نے ایسی چابکدستی سے پیش کیا کہ فن اور احتساب دونوں انگشت بدنداں رہ گئے۔ غم کے مضامین بیان کرنے میں بھی راشد الخیری کے سوا کوئی ان کا حریف نہیں"۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے "اعلیٰ انشاء پرداز" میں لکھا کہ "قلم کے دھنی، اردو زبان کی دنیا کے فرد فرید، ادب و انشاء کے عالم میں صاحب طرز جدید، نہ کسی کے شاگرد نہ کسی کے مقلد، صحیح معنوں میں عوامی انشاء پرداز"۔ سید عزیز حسن بقائی مدیر پیشوا نے لکھا کہ "وہ دشمن بھی کامیاب تھے مگر دشمنوں کو احسان کی ضرب سے گھائل کرتے تھے ان کے مضامین میں "ترک سپاہی کا سگریٹ" کا پنجوری شہید کا کفن طرابلس عرب کے گھر میں ایک رات، "اللہ اکبر" وغیرہ ضبط ہو گئے تھے"۔ ان کے علاوہ سید ذوالفقار علی بخاری کنٹرولر ریڈیو پاکستان، حسن مثنیٰ ندوی مدیر نیرنگ خیال، سردار عبدالقیوم خاں، مولانا شاہ عون احمد پھلواروی، لاله کرم چند ایڈیٹر اخبار پارس، جناب جمیل مہدی، ضیاء الدین احمد برنی مدیر کتابی دنیا، حبیب اشعر دہلوی، مولانا محمد رضا فرنگی محلی، قاضی محمد حسن فاروقی سجادہ نشین خانقاہ کلیمی، سید حسن آرزو سہسرامی جناب تلسی رام پوری کے مضامین بھی ہیں۔ گھر والوں کے تاثرات میں سیدہ درنج با نو نظامی کا مضمون "ہنس کی کہانی روح کی زبانی" درد انگیز ہے۔ جناب نصیر الدین ہاشمی کا مضمون ہمہ گیر شخصیت بھی اس میں شامل ہے۔ اور سارے مضامین پڑھنے کے ہیں۔

ثقافت لاہور ــــ ستمبر کے شمارے میں پہلا مضمون ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا "ممالک متحدہ امریکہ میں مذہبی زندگی" ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ میں مذہبی فرقوں کی تعداد چار سو تک پہنچ گئی ہے جو ذرا ذرا سے اختلاف عقیدہ پر ایک الگ فرقہ بن جاتا ہے لیکن سر پھٹول کا شائبہ تک نہیں، صلاحیت تنظیم ان سب میں ... سلمان بھی جابجا منتشر موجود ہیں، تعداد ایک لاکھ ہوں گے، مسجدیں بھی ہیں، مگر تنظیم نہیں، واشنگٹن میں ایک ملین ڈالر کے خرچ سے عظیم الشان ...

اچھی عادت بڑی دولت ہے

کیا آپ وقت کے پابند ہیں ؟

وقت زندگی کے برابر عزیز ہے۔ ہم اسے بہتر سے بہتر طور پر کیوں نہ گزاریں؟ وقت تھوڑا بھی ہو تو وقت کی پابندی اسے دراز کر سکتی ہے۔ اوقات بندھے ہوئے ہوں اور انکا سختی سے لحاظ کیا جائے تو ہر شے سے پورا پورا فائدہ حاصل ہو اور آرام و تفریح کے لئے بھی زیادہ وقت بچ رہے۔

کیا آپ پابندی سے روپیہ بھی بچاتے ہیں ؟

وقت کی پابندی سے وقت کی بچت ہوتی ہے اور [illegible] کفایت سے روپے کی۔ آپ پابندی کے ساتھ روپیہ بچا کر بچت کے تمسکات خریدتے رہیں تو اپنے روپے پر بہترین منافع حاصل کر سکتے ہیں۔ بچت آپ کی آئندہ مسرتوں اور خوشحالی کی ضامن ہوگی اور آپ کے ملک کو پھلنے پھولنے میں مدد دے گی جس میں ہم سب کی بھلائی ہے

روپیہ بچانے کا یہی وقت ہے

[illegible]

پاکستان سیونگ سرٹیفکیٹ میں روپیہ لگائیے

[illegible] سے مل سکتے ہیں

واقعی اب تو میں
حسین نظر آتی ہوں
جلد کے تمام داغ دھبے
جاتے رہے۔
اور ایک نیا حسن نکھر آیا
اور یہ سب کچھ ہوا پام روز
صابن کی بدولت۔
اس صابن کا ملائم جھاگ نازک
سے نازک جلد کو صاف کرکے
نکھارتا ہے۔
TOILET SOAP
کیونکہ پام روز جلد کی ملائمت
کو برقرار رکھتا ہے۔
سو فی صدی
پاکستانی سرمایہ
اور کاریگر
پام روز
ٹائلٹ سوپ
کریسنٹ پاک سوپ اینڈ آئل ملز کراچی

جلد ۲ — شمارہ ۱۰
قیمت سالانہ چھ روپے
فی شمارہ چھ آنے
اکتوبر ۱۹۵۶ء

مہر نیمروز

حسن مثنیٰ ندوی
ابوالخیر کشفی
علی اکبر قاصد

مہتمم: شاہ محمد حسان
پبلشر: حسن مثنیٰ ندوی
کتابت: فیض الکتابت
طباعت: انجمن پریس

پہلی کرن

وسعتیں اور بھی ہیں

ایک حقیقت سو افسانے

کچھ غم جاناں، کچھ غم دوراں

شہر نگار

جائزے

پہلی کرن

چہ دلاور است

گزشتہ چھ سات برس میں ہندوستان اور پاکستان کے کئی ناشروں نے انسانی اور تجارتی اخلاق کے ہر ضابطہ کو توڑ کر بہت سی کتابیں بغیر اجازت کے چھاپ لی ہیں —— ہم سب اردو زبان سے اپنی محبت کا دعویٰ بار بار کرتے ہیں لیکن ادنیٰ مفادات کے تحت اردو دشمنی کے عملی ثبوت پیش کرتے رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان، یہ دونوں ملک کاپی رائٹ اور ایسے ہی دوسرے قوانین و معاہدات سے بالاتر ہیں —— جہاں بین الاقوامی قوانین و معاہدات کو یوں نظر انداز کیا جاتا ہو، وہاں ضمیر اور دین کی بات کس سے کی جائے۔

پاکستان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ اور دارالمصنفین کی کتابیں بغیر اجازت کے نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ شائع کی گئیں اسی طرح قاضی زین العابدین صاحب میرٹھی کی عربی لغت نام بدل کے قرآن محل کراچی کے محمد سعید صاحب نے شائع کر دی۔ قاضی صاحب موصوف کی ایک نہایت دردمندانہ تحریر معاصر "تحریک" دہلی میں شائع ہوئی ہے —— اس کے علاوہ ہند و پاک کے کئی ادبی جرائد نے اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے۔

قرآن محل کے محمد سعید صاحب نے چوری اور سینہ زوری کی عجیب و غریب مثال قائم کی ہے۔ انہوں نے قاضی صاحب کی عربی لغت کے علاوہ دین و دنیا بک ڈپو اور شوکت علی صاحب فہمی کی کئی کتابیں نام کی تبدیلی کے ساتھ چھاپی ہیں ستم یہ کہ مصنف کا نام بھی بدل دیا گیا۔ ھمر نیمروز نے شوکت علی صاحب فہمی سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنی مطبوعات ہمیں بھیجدیں تاکہ "چہ دلاور است" کے مستقل عنوان کے تحت ان کتابوں کا مفصل جائزہ پیش کیا جا سکے۔ افسوس کہ فہمی صاحب نے ہماری درخواست کو قابل اعتنا نہ سمجھا اور اسی لئے ہم آج تاخیر کے ساتھ اس مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔

یہ تو تصویر کا ایک رُخ ہوا۔ ہندوستان کے ناشر بھی اس میدان میں اپنے پاکستانی ہم پیشہ بھائیوں سے پیچھے نہیں —— وہاں سعادت حسن منٹو مرحوم کے کئی مجموعے شائع کئے گئے ہیں۔ اسی طرح غلام عباس صاحب کا ناول "گوندنی والا تکیہ" بھی نام بدل کر شائع کر دیا گیا۔ عباس صاحب کے الفاظ میں "گوندنی دوسرے کھا گئے اور تکیہ میرے پاس رہ گیا"۔ اشفاق احمد کا ناولٹ "مہمان بہار" دہلی کے ایک ناشر نے "پانچ لڑکیاں" کے نام سے چھاپ دیا۔ لارک پبلشرز کراچی کے ناول بھی ایک ہندوستانی ناشر بلا اجازت چھاپ رہا ہے۔ رخود لارک پبلشرز نے کرشن چندر کا ناول طوفان کی کلیاں شائع کیا ہے، حالانکہ اپنی کتابوں کے پاکستانی ایڈیشنوں کے حقوق کرشن چندر نے سلطان حسین صاحب اور صہبا لکھنوی کو دیئے ہیں، ہمیں خوشی ہوگی اگر لارک پبلشرز اس بات کی وضاحت کریں گے۔

اردو دوستی کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ سلسلہ فوراً ختم کیا جائے —— دیانتداری کے ساتھ یہ مسئلہ طے کیا جا سکتا ہے جیسے کہ

ہندوستانی ناشر، پاکستانی ناشر سے اس کی کسی کتاب کی اشاعت کا حق حاصل کرکے اُسے پاکستان میں اپنی کسی کتاب کی اشاعت کی اجازت دیدے۔ اس طرح اہم اور قابلِ ذکر کتابیں دونوں ملکوں میں شائع ہوسکیں گی۔

ہندوستان کے ناشروں تک شاید ہی ہماری آواز پہنچے مگر پاکستانی ناشروں سے ہم درخواست کرتے ہیں کہ پہلے وہ ایک اچھی مثال پیش کریں۔ اس بات کا پاکستان کے وقار اور عزت سے تعلق ہے۔ ہماری تمنا ہے کہ کوئی ہماری طرف اُنگلی نہ اُٹھا سکے۔ ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکیں کہ کشمیر کے مسئلہ سے لے کر تجارتی معاملات تک ہر جگہ پاکستانی قوم حق و انصاف کی طالب ہے، ہمارا ایک قومی کردار ہے اور اس قومی کردار کی جھلک ہماری زندگی کے ہر گوشہ میں نظر آسکتی ہے۔

جو پاکستانی ناشر ایسی ذلیل حرکتیں کر رہے ہیں، وہ پاکستان کے بدترین دشمن ہیں۔ وہ کتابوں کی نہیں بلکہ پاکستان کے ناموس کی تجارت کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ مروجہ قوانین کے مطابق اُن کے خلاف کارروائی نہ کی جاسکے لیکن ہر خود دار پاکستانی، ملک کی عزت کے لئے اپنے ذوق کی قربانی دے کر ان کی چھاپی ہوئی کتابیں نہیں پڑھے گا۔

ہم کھوکھلی جذباتیت کے قائل نہیں لیکن انسانی زندگی میں جذبات کی قدر و قیمت سے منکر بھی نہیں ہیں۔ جو کچھ عرض کیا گیا وہ ہمارے جذبات کی تصویر ہے —— محض ہمارے جذبات کی نہیں بلکہ ہر پاکستانی کے جذبات کی تصویر —— گالیاں دینا، ادب کی دنیا میں معیوب سمجھا جاتا ہے لیکن ایسے ناشر شاید اس قابل بھی نہیں کہ انہیں گالیاں بھی دی جاسکیں۔ اس سے گالیوں کی بے عزتی ہوگی۔

رہی یہ بات کہ ہندوستانی ناشر بھی پاکستانی مطبوعات شائع کر رہے ہیں —— تو اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں، ہم زیادہ سے زیادہ ان سے بھی درخواست کرسکتے ہیں کہ وہ ایسا نہ کریں —— مگر ہندوستانی ناشروں کی بددیانتی ہماری بددیانتی کا جواز نہیں بن سکتی۔ دو بُرائیاں جمع ہوکر ایک نیکی نہیں بن سکتیں، اور پھر ہم اپنی دیانت کو جنسِ تجارت یا سودا بازی کیوں قرار دیں؟ —— ہماری زندگی کا اصول یہ ہونا چاہیے کہ اچھائی جہاں سے بھی ملے لے لو اور بُرائی کو چھوڑ دو —— دین و دانش اور حکمت تو مومن کی گمشدہ میراث ہے —— اور یہ بددیانتی۔ ہمارے لئے خسارہ کا سودا ہے۔

دیانت اور ضمیر کوئی منفی چیز نہیں —— یہ تو زندگی کی اساس اور بنیاد ہے —— ایسی دیانت جو بدل نہ سکے۔ ایسا ضمیر جو اپنے آپ کو فریب نہ دے۔

یارانِ نکتہ داں

مولانا محمد امین زبیری

مہر نیمروز کا وحشت نمبر موصول ہوا شکریہ قبول فرمائیے۔ میں نے اس کو سرسری طور پر دیکھا، وجہ یہ ہے کہ مجھے شاعری سے کچھ مناسبت نہیں ہے تاہم میں آپ کی کوشش کو سراہتا ہوں، کہ اپنے مشاہیر ادب (نظم و نثر) کو آپ زندہ کرنے کی طرف متوجہ ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں کے متعلق ضرور لکھئے۔ میرے ان کے تعلقات ۱۹۰۵ء سے تھے لیکن افسوس ہے کہ میں ان کے متعلق کچھ نہیں لکھ سکتا اور اس کی وجہ محض معذوری دست و قلم اور علالت و ضعف ہے۔ مولوی عبدالحق بابائے اردو سے ان کے تعلقات زمانۂ طالب علمی کے ہیں، ان سے اصرار کیجئے کہ وہ ایک مختصر مضمون لکھ دیں۔ طالب علمی کے علاوہ قیام حیدرآباد کے دور میں بھی ساتھ رہا۔ مولانا حالی کے دیوان میں ایک نظم ہوگی جس کا عنوان ہے "شکریہ مساعی ظفر علی خاں" اس کو ضرور لیجئے۔ اگر نہ ہو تو مجھے مطلع کیجئے میں فراہم کر دونگا۔ وحشت نمبر کا ضمیمہ خاص طور پر قابل داد ہے میں نے اسے بڑی دلچسپی سے پڑھا ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ مرحوم شعراء میں دو حضرات آپ کی خاص توجہ کے قابل ہیں ایک محسن کاکوروی، جن کا مقصد زندگی نعت گوئی تھا ان کا مشہور قصیدہ ہے۔ "سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل" اسی قصیدہ سے گویا ابتدا ہے آخری قصیدہ بہت طولانی ہے مگر بڑا قابل داد ہے ؎

بہار آئی ہے شب بس کر دیار خلد و کوثر میں ابد تک اب خزاں سوتی رہے پھولوں کے دامن میں

ان کے حالات کچھ زیادہ اہم نہیں ہیں کاکوری کے کسی آدمی سے بھی معلوم ہو سکتے ہیں یہ مین پوری میں وکالت کرتے تھے۔

دوسرے منشی احمد علی شوق قدوائی ہیں یہ اپنے زمانے کے مشہور اساتذہ میں تھے ان کی مثنوی حسن نے ایک خاص شہرت پائی تھی تعلیمی کانفرنسوں میں بھی قطعات پڑھا کرتے تھے سرسید نے ان قطعات کو کہا تھا "شوق کے نیچے" سرسید خود بھی شاعر تھے۔ میں نے ان کے تذکرے میں ان کے ذوق سخن کا تذکرہ کیا ہے۔

پروفیسر سعد منیر

اگست کا مہر نیمروز مجھے نہیں ملا، دیکھنے کو مل گیا خوب ہے۔ صرف کتابت، طباعت اور صحت کی قدرے شکایت ہے، ان کی طرف بھی توجہ دیجئے اور ان کو بھی بے مثال بنا ڈالیے۔ حسنین شمیم صاحب کے مشورے پر شاید عمل پیرائی کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ اس لئے کہ جا مطالبہ کے کچھ نہ کچھ تشنہ ہی رہتا ہے۔ میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ پھر وہ خوش کن سے افسانہ نگار کا افسانہ حاصل ہو، اس لئے کبھی کبھی وقت زیادہ لگ جاتا ہے۔ آپ کا اسلوب بہت خوب ہے پڑھتے وقت [illegible] عام گرہ [illegible]

گرامی

[illegible] کر تے ہے شرمی اور
ہی حضرات کی رہین منت ہے ۔ فلاں کثیر حضرات کی خدمت میں بھی کورنش بجا لاے جو وطن کی قربانی اپنی ذات
حیاتی سے گوارا کر رہے ہیں اور اس طرح اپنی بھی بیخ کنی کئے جا رہے ہیں ۔ بھائی سلیم اللہ فہمی کی غزل کا تو انداز ہی بدل گیا ، شاید کہ یہ آپ کی
اکن نے یہ رنگ عطا فرمایا ہے ۔ چہ نامنہ بڑی بات ہے مگر کہے بغیر نہیں رہا جاتا ۔ اللہ کرے یہ رنگ نکھرتا ہی رہے ۔۔۔ خاص نمبر میں سال بھر کے
قات پر تبصرہ بنام " یوم الحساب " کی کمی محسوس ہوئی ۔

حسن مثنیٰ ندوی

لا کمیشن کے قیام سے آرزوئے دیرینہ کے بر آنے کی نہ سہی کم از کم اس کی داغ بیل پڑ جانے کی امید تو بندھتی ہے یہ بھی کچھ کم نہیں لیکن بد قسمتی
ہے کہ اہل ملک ایک مرکز پر سمٹ کر ایک لگن کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتے ۔ سیاست بازی کی " روح الاجتماع " چاروں طرف مسلط
ہے اس کی سمیت نے خالص علمی حلقوں کو بھی معاف نہیں رکھا ۔ میں نے ضمیمہ پڑھا ۔ مجھے بھی بڑا دکھ ہوا کہ جب کبھی کسی اچھے کام کے ہو جانے کے
امکانات پیدا ہوتے ہیں ایک شور و شر بپا ہو جاتا ہے ، حالانکہ سب جانتے ہیں کہ دنیا میں کوئی چیز بنی بنائی نہیں ملتی ، خود بنانی پڑتی ہے ۔ آخر یہ
کیا شور بپا ہے کہ فلاں شخص کو کیوں کمیشن میں رکھا گیا ، اس کو ہٹاؤ ، میں اس شور کو دانشمندی قرار نہیں دیتا ۔ اس طرح لوگ خود اپنی گردن مار
لیں گے ، دائرہ اسلام میں کوئی جماعت ایسی نہیں جس کے اہل علم کو علمی طور پر ایک دوسرے سے اختلاف نہ رہا ہو ، آج ہی نہیں کسی زمانہ میں بھی نہیں ،
جس زمانہ میں ابو حنیفہ نے تدوین فقہ کی بنیاد رکھی ، ڈیڑھ درجن سے زیادہ مکاتب خیال تھے ۔ ان کی " مجلس البرکہ " میں بھی بیشتر ائمہ فکر ہی
تھے ، تاریخ فقہ اسلامی کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اختلاف کا اور ذرا ذرا سی بات پر بھی ان کی شدت احساس و جذبات کا یہ عالم تھا
کہ ایک دوسرے کی تکفیر تک سے نہ رکے ۔۔۔ لیکن اس تکفیر کی حیثیت بھی اسی نقہ میں " کفر دون کفر " کی اصطلاح میں بتادی گئی ہے
اس تکفیر سے کوئی شخص دائرہ اسلام سے خارج متصور نہ ہوتا تھا ، اور نہ اس اختلاف سے کبھی اصل مقصود سے وہ غافل ہوتے تھے ۔ ورنہ کم از
کم سنیوں ہی میں چار نہیں ، درجن دو درجن سے کم مکاتب فقیہہ نہ ہوتے جو تیان کعبہ کی طرح پہلو بہ پہلو موجود ہوتے اور کوئی ان کو چھو تک
نہ سکتا تھا ، حیرت تو یہ ہے کہ اس پر بھی کوئی غور نہیں کرتا کہ ابو حنیفہ ، مالک و شافعی اور احمد حنبل کے چار مکاتب فقیہہ بھی دراصل میں چار
نہیں ہیں ، کیونکہ ان سب نے اکثر و بیشتر اختلافات کو ختم ہی کرنے کی جد و جہد کی ہے اور جو اختلافات ہیں وہ فروعی ہیں ، نا قابل اعتنا ۔
ایک زمانہ میں علامہ تیمیہ نے باقاعدہ تحریک کی تھی کہ ان چاروں مکاتب فکر کو بھی ملا کر ایک کر دیا جائے ، ایک کرنے کی صورت ظاہر ہے کہ چاروں
پر عالمانہ نظر ثانی ہی کی طلب گار تھی ۔

ہمارے سامنے ابتدا اسلام سے لے کر آج تک کے سارے اختلافات موجود ہیں ، بعض اختلافات نے سنگین صورت بھی ضرور اختیار کی تھی ،
لیکن آج ان سب کی شدت تحلیل ہو چکی ہے ۔ آپ کو اندازہ ہے کتنے فرقے پیدا ہو چکے ہیں مگر اب وہ کہاں ہیں ، اسلام نے " مسلمان " پیدا کیا تھا
۔۔۔ مسلمان نے شیعہ ، سنی ، خارجی ، معتزلہ ، نجاریہ ، جہمیہ ، کرامیہ ، وغیرہ پیدا کئے ، اسی پر بس نہیں ، ان سب کی بے شمار شاخیں
پھوٹیں ، زیدیہ اور اس کی متعدد شاخیں ، کیسانیہ اور اس کی متعدد شاخیں ، امامیہ اور اس کی پندرہ شاخیں ، غلاۃ اور اس کی متعدد شاخیں
یہ تو صرف شیعوں میں ہیں ، سنیوں میں فقہا اور محدثین ، اور پھر ان کی بے شمار شاخیں ، گن لیجئے اگر آپ گن سکتے ہوں ، خوارج کی بیسیوں
شاخیں نکلیں ، معتزلہ کیوں کم رہتے ، ان کی بھی بیس شاخیں نمودار ہوئیں ، اسی طرح نجاریہ ، جہمیہ ، کرامیہ وغیرہ بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے
اور آج ہمارے عہد میں تو شاخیں ہی شاخیں ہیں ، جڑ کہیں نظر نہیں آتی ۔۔۔ ہمارا دل دکھتا ہے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی ۔
پاکستان میں آپ کے سامنے واقعتہً علمی طور پر غور و فکر کرنے والے بھی موجود ہیں اور ایک دو نہیں ، درجنوں ، ان میں ترجمان القرآن

کے مدیر مودودی صاحب، طلوع اسلام کے مدیر پرویز صاحب، اور ثقافت کے مدیر خلیفہ عبدالحکیم صاحب بہت نمایاں ہیں کیونکہ ان کے ادارے بھی ہیں، آرگن بھی ہیں اور رفقاء بھی، ملک میں انہیں کی آوازیں زیادہ گونج بھی رہی ہیں، باقی افراد اپنے اپنے گوشے میں کام کر رہے ہیں، لیکن یہ سمجھنا کہ ہر سیاسی یا نیم سیاسی جماعت، علمی طور پر کچھ غور و فکر بھی کر رہی ہوگی، یہ سراسر غلط ہے، چاہے وہ جمعیۃ علمائے اسلام ہو چاہے جمعیۃ علمائے پاکستان چاہے موتمر اہل حدیث ہو چاہے کوئی انجمن صوفیہ — مغربی پاکستان میں ہو چاہے مشرقی پاکستان میں — غور و فکر کی ان بیچاروں کو فرصت بھی کہاں ہے۔

بہت سی باتیں ایسی ہیں جن میں مجھ کو مودودی صاحب سے بھی اختلاف ہے، پرویز صاحب سے بھی اختلاف ہے خلیفہ عبدالحکیم صاحب سے بھی اختلاف ہے، لیکن اس کے باوجود میں ان کو سرتاپا غلط سمجھنے کا قائل نہیں ہوں، ان لوگوں نے عرق ریزی کی ہے سوچنے سمجھنے کی کوشش کی ہے، غلطیوں سے تو کوئی بری نہیں ہو سکتا، پھر ان کو بری سمجھنے کا تقاضا، بڑا ظلم ہے — افسوس ہے کہ خلیفہ عبدالحکیم صاحب کا ادارہ اس کمیشن سے الگ رہا، ان کا خیال یہ ہے کہ حکومت کے مقرر کردہ کمیشنوں سے، بالعموم کوئی اہم انجام تک پہونچی نہیں ہے، لہذا کیا فائدہ کہ تضیع اوقات کی جائے اس کی بجائے ہم خود ایک چیز مرتب کر کے پیش کرنے کا عزم رکھتے ہیں — لیکن انہوں نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ اگر کمیشن نے واقعی کام کیا تو ان کی تائید اس کو حاصل رہے گی اس طرح کمیشن پر اگر غور کیجئے تو ان تینوں اداروں کی تائید سے حاصل ہے، حافظ کفایت حسین صاحب بھی اس میں داخل ہیں لہذا ان کا حلقہ بھی شریک ہے، انفرادی طور پر مولانا ظفر احمد تھانوی اور مولانا راغب احسن بھی اس میں موجود ہیں، اور علامہ آئی، آئی، قاضی بھی ہیں، بروہی صاحب نے اپنی بدقسمتی سے ایک سیاسی شوشہ چھوڑ کر اپنے آپ کو ملک میں خواہ مخواہ رسوا کیا تھا، انہوں نے اعلان کیا تھا کہ قرآن میں کانسٹی ٹیوشن نہیں ہے، اب انہوں نے اس کمیشن کی رکنیت قبول کر لی ہے اس کمیشن میں بقیہ اور تمام اراکین ان کے اس "خیال" کے حامی نہیں ہیں، اچھا ہے مل بیٹھیں، یا تو وہی اپنے خیال سے رجوع کر لیں گے یا پھر اپنے رفقاء کار کو سمجھا لیں گے، کہ کانسٹی ٹیوشن سے مراد ان کی کیا تھی، غور کیجئے تو یہ نتیجہ بھی فائدے سے خالی نہ ہوگا — بہر حال گنوا یئے تو سہی کہ ان میں کا فرد غیر مسلم کون کون ہے۔

یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر، اور سید سلیمان ندوی، جیسے وسیع النظر اہل قلم جن کی نظر جدید و قدیم دونوں پر تھی سازگار وقت آنے سے پہلے ہی اٹھ گئے — تو اب اور کون ہے؟ اور کہاں ہے؟ اور جو ہو تو اس کو کمیشن میں داخل کرنے کی کوشش کیجئے، ورنہ یہ لوگ بھی اگر اٹھ گئے، جنہوں نے تھوڑا بہت وقت اسلامیات کے مطالعہ اور غور و فکر میں صرف کیا ہے تو پھر تو شور و غل کرنے والے ہی صرف باقی رہ جائیں گے، کیونکہ آج کل کی علمی تحقیق و تحسین کا تو وہ انداز پایا جاتا ہے، نہ لگن، اور اگر ہو بھی تو — ۲۰ کو پہنچ کر عمرا اثر رہنے تک" اور قوم کو ضابطۂ حیات کی ضرورت آج ہے،

حکومت تو آج بھی شاید یہی سمجھتی ہے کہ لندن سے امپورٹ کیا ہوا کوئی قانون دان اگر آجائے تو وہ اسلامی ضابطۂ حیات شاید بہتر مرتب کرے گا، بشرطیکہ وہ کوئی پروفیسر گب جیسا نہ ہو — مگر کیا ہمارا آپ کا خیال بھی یہی ہے؟

مجھے امید ہے کہ یہ مختلف مکاتب فکر کے لوگ ایک جگہ بیٹھیں گے تو یوں بھی بہت سے مسائل صاف ہو جائیں اور یہ بالکل فطری بات ہے، بشرطیکہ لوگ یہ طے کر کے نہ جائیں کہ حق صرف ہمارے ہی ساتھ ہے، مجھے یقین ہے کہ کمیشن نے اگر واقعی ایمانداری اور خلوص کے ساتھ کام شروع کیا تو جو لوگ کام چاہتے ہیں وہ کمیشن کے اندر رہیں یا نہ رہیں جب بھی پوری پوری تقویت اس کو پہونچائیں گے، اور اگر یہ کام ہو گیا تو یہ پوری ملت اسلامیہ کا ایک اہم کارنامہ ہوگا کسی ایک یا چند افراد کی بات نہ ہوگی — خدا کرے اس کمیشن کی راہ میں کوئی سیاست پھوٹ حائل نہ ہو — اور اگر اس کمیشن کو ناکام ہی ہونا ہے تو وہ ملت کے ہاتھوں نہ ہو۔

ارشد کاکوی

کشمکشِ حسرت دیدار

غالب کا ایک شعر ہے ؎ دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار
آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا ہے

غالب کے اندازِ بیان یعنی تراکیب اور اضافات کی بلند آہنگی سے قطع نظر، شعر بالکل صاف ہے اور اس کا مفہوم بالکل وہی ہے جو داغ کے اس شعر کا ہے ؎

تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام
تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنا

یا پھر بقول عندلیب شادانی ؎

انھیں آرائشِ گیسو سے مطلب
کوئی دیوانہ ہو جائے بلا سے

غالب کے یہاں بھی یہی صورتِ حال ہے۔ ان کا دل کشمکشِ حسرتِ دیدار میں خون ہو گیا ہے اور نہاں بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ آرائش سے فرصت نہیں۔ کس کو آرائش سے فرصت نہیں؟ محبوب کو۔ محبوب کون؟ "بتِ بدمستِ حنا" یہاں حسرتِ دیدار کے خون کی سُرخی ہے وہاں حنا کی شفق پھول رہی ہے بس اتنی سی بات ہے کہ ؎

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں!

لیکن غالب کے اس شعر کو بھی شارحین نے اپنا آلۂ کار بنایا اور ابھی حال میں اس شعر کی ایک شرح پڑھ کر کچھ نہ پوچھیے کہ کیا گزر گئی۔
فروری ۸۵ء کے آج کل میں مولانا غلام رسول مہر نے غالبیات کے سلسلہ میں ایک مقالہ سپرد قلم کیا ہے اس میں انہوں نے گیا (صوبہ بہار) کے بڑے مشہور صوفی شاہ باقر علی گیاوی کا ذکر کیا ہے کہ موصوف غالب کے بڑے مداح تھے۔ غالب کی شاگردی پر وہ نازاں تھے اور انہوں نے جابجا اپنے کلام میں غالب سے اپنی عقیدت کا اظہار بھی کیا ہے۔ ایک دن کوئی صاحب شاہ باقر علی گیاوی سے ملنے آئے اور غالب کے بہتیرے اشعار کو مہمل و بے معنی کہتے ہوئے مثال میں انہوں نے یہی شعر پڑھا ؎

دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار
آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا ہے

راوی کہتا ہے کہ اس شعر کو سُن کر شاہ صاحب پہلے تو بہت دیر تک اس کی تعریف کرتے رہے، اس کے بعد اس کا مطلب ایسے لطیف اور دلکش طریقے پر بیان فرمایا کہ جتنے وہاں بیٹھے تھے نہایت محظوظ ہوئے۔ صوفی صاحب نے اس شعر کا جو مفہوم بتایا وہ سننے کے

لے مہر نیمروز کی کسی پچھلی اشاعت میں غالب کے دو اشعار پر اُن کے شارحین کی کرم فرمائی کا ذکر کر چکا ہوں۔ یہ مضمون بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔

قابل ہے لے

"ایسی مضمون کا فارسی کا ایک شعر ایک استاد کا ہے۔ غالب کے شعر سے اس کا مضمون زیادہ صاف ہے اور اسکو سمجھنے کے بعد غالب کے شعر کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ وہ شعر یہ ہے

مراجدائی او سوخت، وقت شبنم خوش
کہ در مشاہدۂ آفتاب می سوزد

شاعروں کے تخیل میں شبنم آفتاب پر عاشق ہے جب آفتاب طلوع ہوتا ہے، اس کی تمازت سے شبنم خشک ہو جاتی ہے گویا جل جاتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم بھی جل گئے اور شبنم بھی جلی لیکن جلنے جلنے میں فرق دیکھئے کہ ہم تو معشوق کی جدائی اور فراق کی آگ میں جلے اور خوشا وقت شبنم کا کہ وہ اپنے معشوق کے عین مشاہدے میں اسکی تجلیات کی گرمی سے جلتی ہے۔ اس قسم کے مضمون کو حضرت غالب نے اپنے شعر میں نہایت لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے"

یہاں تک جو مفہوم بیان کیا گیا ہے اس کا اس شعر سے کوئی تعلق نہیں، غالب کے دو ایک اردو اشعار میں یہ تخیل البتہ موجود ہے لیکن زیر بحث شعر کو اس تخیل سے کیا سروکار؟ اب صوفی صاحب یوں آگے بڑھتے ہیں۔

"قاعدہ ہے کہ کسی چیز پر جب چاروں جانب سے نہایت سخت دباؤ پڑتا ہے تو وہ چیز گھل جاتی ہے، حنا بھی پس جاتی ہے اور خون کی طرح سرخ رنگت پیدا کرتی ہے اور گوری رنگت کا آدمی جب شراب پی کر بدمست ہو جاتا ہے تو اس کا چہرہ بھی خون کی طرح سرخ ہو جاتا ہے۔ اس وقت اگر وہ آئینہ ہاتھ میں لے کر دیکھے تو اس کے چہرے کی سرخ رنگت سے عکس پذیر ہو کر گویا وہ بھی حنائے سودہ کی طرح خون جیسا سرخ ہو جاتا ہے۔ حضرت غالب فرماتے ہیں کہ معشوق کے فراق میں اس کے دیدار کی حسرتوں کی یورش اور کشمکش سے عاشق کا دل گھل کر خون ہو گیا۔ اس کے مقابلے میں آئینہ کی خوش نصیبی دیکھئے کہ پسی ہوئی حنا کی طرح خون جیسا ہوا تو وہ بھی لیکن اس کی یہ حالت معشوق بدمست کے ہاتھ میں جا کر اس کے عین دیدار میں اس کے رخسار کے عکس سے نصیب ہوئی۔ عاشق کے دل کی یہ حالت فراق کی بدولت ہوئی اور آئینہ کی عین وصال اور مشاہدۂ رخسار یار کی بدولت"

غور کرنے کا مقام ہے کہ کس قدر دور کی کوڑی لائی گئی ہے؟ بت بدمست حنا سے ایسا محبوب مراد ہے جو آرائش و ناز آرائش میں محو ہے نہ یہ کہ چہرہ سرخ ضرور ہو جاتا ہے لیکن یہاں غالب نے اس تشبیہ و تعبیر کا اشارہ تک نہیں کیا۔ صوفی صاحب کا یہ کہنا کہ عاشق اپنی حسرت اور آئینہ کی حسرت دیدار کا موازنہ و مقابلہ کر رہا ہے محض تاویل ہے۔ آئینہ سے کوئی مقابلہ نہیں۔ موازنہ ہے صرف اپنی نیاز مندیوں اور محبوب کی بے نیازیوں کا کہ یہاں تو یہ عالم ہے کہ ایک جھلک دیکھنے کی حسرت میں دل خون ہوا جاتا ہے اور وہاں حنا کی سرخی محبوب کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ "حسرت" اور "سرخی حنا" کی رعایت البتہ موجود ہے لیکن یہ رعایت محض لفظی نہیں بلکہ اس کے پس پردہ سچا جذبہ کارفرما ہے اور یہی عالم ایک پوری مسلسل غزل میں بھی موجود ہیں جس کے دو تین اشعار یہ ہیں

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام	گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا
واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال	یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا
جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبجو	یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

لے صوفی صاحب کے بیان کردہ مفہوم [illegible] صاحب [illegible] مرحوم کے فارسی دیوان [illegible] (حیدرآباد) کے دیباچہ میں اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

کابلی مصنّف کی تلاش میں

عبدالرحمٰن کابلی کبھی ہمارے اسٹیج اور پردۂ سیمیں کی ایک عظیم شخصیت تھے آج وہ ریڈیو پاکستان کے محض ایک "اداکار" ہو کر رہ گئے ہیں ــــــ انھوں نے ایک متنوع اور بھرپور زندگی گزاری ہے اور آج وہ مصنف کی تلاش میں ہیں آیئے ذرا اُن سے ملئے ـــ اس انٹرویو میں اُن سے آپ کی ملاقات مشہور شاعر جناب عزیز حامد مدنی کرا رہے ہیں۔

"م" اور "ک" کے اشارے مدنی اور کابلی کو پیش کرتے ہیں۔

م:- کابلی صاحب اب تو آپ مصنف کی تلاش میں نکلے ہیں پہلے تو زندگی میں آپ کو کسی مصنف نے تلاش کیا ہوگا۔ اس لئے چاہیئے تو یہی کہ ہم آپ کی داستان کا وہ حصہ پہلے سنیں۔

ک:- صاحب بات یہ ہے کہ پہلے نہ مصنف نے مجھے تلاش کیا نہ میں نے مصنف کو تلاش کیا۔ میں تو گھر سے زندگی کی تلاش میں بھاگا تھا۔

م:- یعنی یہ کیا؟ یہ تو ایک دریافت کے اندر ایک دوسری دریافت کی داستان نکل آئی۔

ک:- جی بس ایسے ہی ہوتا ہے۔ میں خود مجبور تھا۔ افغانستان کے قاضیوں کے خاندان سے ہوں عربی کی سند لے کر ابھی دم نہ لینے پایا تھا کہ والد صاحب نے یہ فیصلہ کیا کہ میں مولوی بن جاؤں لیکن مجھے شوقِ مصوری سب سے پہلے اسکول آف آرٹ بمبئی لے گیا۔

م:- اچھا ہے کابلی صاحب تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے سو یہی غالباً آپ کے تلاش کی ایک منزل تھی؟

ک:- جی ہاں تلاش کی پہلی منزل ایک بار سینما کی بڑی سڑک پر چلتے چلتے بورڈ پڑھا کرتا تھا۔ یہ میرا مشغلہ تھا۔ جہاں خوبصورت بورڈ آگیا تھوڑی دیر کھڑا ہو جاتا ایک دن ایک بہت خوبصورت بورڈ نظر آیا وہ ایک تھیٹریکل کمپنی کا تھا۔ سیدھا سیٹھ صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ اس سے میں نے کہا کہ پینٹر کی حیثیت سے رکھ لیجئے

م:- خوب صاحب خوب۔ بورڈ کی پینٹنگ سے اصل کردار کی پینٹنگ تک تو بڑا فاصلہ ہے معلوم نہیں یہ سفر آپ نے کیسے طے کیا۔

ک:- ایک دن عجیب اتفاق ہوا [illegible] علاؤالدین ڈرامہ کا وزیر بیمار ہوگیا۔ کمپنی کے مالک نے مجھے وزیر بنا دیا ڈرامہ میں وزارت [illegible] پارٹ ادا کیا [illegible] ڈرامہ ختم ہوگیا مالک نے میری پینٹنگ والی نوکری ختم کر کے [illegible] ایکٹنگ والی شروع کردی۔ کچھ دنوں کے بعد آغا حشر صاحب سے ملاقات ہوئی [illegible] مصنف نے مجھے تلاش [illegible] دریافت کیا

[illegible]

ش:- جی ہاں آپ نے پودوں کے متعلق سنا ہوگا کہ ہر پودہ ایک خاص زمین ایک خاص موسم ایک خاص آب و ہوا میں جیتا ہے۔ میں اسٹیج کا پودہ تھا میں نے اپنی زمین پالی۔

م:- کابلی صاحب آپ کی گفتگو کا یہ مطلب ہوا کہ آپ ہر تحریر کو ایک ایکٹر کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور اکثر ایک اسٹیج کے ایکٹر کی حیثیت سے۔

ش:- جی ہاں میں ہر تحریر کو ایک صداکار اور ادا کار کی حیثیت سے دیکھتا ہوں۔ ڈرامے کا مطلب تو زندگی کے کسی ایسے منظر کو جو نظر سے اوجھل ہو رہا ہو سامنے لانا ہے تحریر تو ایک اسٹیج ہوتی ہے ایک لباس ہوتی ہے ایک عمل ہوتی ہے ایک خیال ہوتی ہے آغا صاحب کی تحریر میں یہ سب باتیں ملتی تھیں یہ سب باتیں جیسے میں نے کسی صندوق میں بند کر دی تھیں اور اس کے بعد ہر مصنف کو اپنے ان خیالات کا لباس پہنا کر دیکھتا ہوں۔

م:- کسی پر یہ پوشاک سجی بھی؟

ش:- کیوں نہیں۔ بیتاب دہلوی احسن لکھنوی محی الدین نازاں اس لباس میں بھلے معلوم ہوتے تھے۔ مگر وہ لوگ پرانے زمانے کے آدمی تھے۔ اب بہت وقت گزر چکا ہے۔ ہو سکتا ہے میرے خیالات کی یہ پوشاک پرانی وضع کی ہو اس لئے کچھ لے استعمال کم کرتا ہوں فیشن بدل گیا۔

م:- جی ہاں فیشن بدل گیا۔ آپ نے ایک بات یاد دلا دی برنارڈ شا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میرا درزی سب سے زیادہ سمجھدار آدمی ہے وہ ہر دفعہ میرا نئے سرے سے ناپ لیتا ہے۔ باقی تمام لوگ پہلے ناپ پر اکتفا کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ میں جیسا تھا ویسا ہی ہوں۔

ش:- جی ہاں مغرب کے اس ڈرامہ نویس کی بہت سی باتیں میں نے سن رکھی ہیں اور میں ان کی اس بات سے متفق بھی ہوں دیکھئے نا میں ابھی آپ سے کہہ رہا تھا کہ میں گھر سے بھاگا ملازمت بنتے بنتے ایکٹر بن گیا۔ لکھنے والوں کی تحریریں میری سانس بن گئیں۔ کیا میں یہ نہ چاہوں کہ میری سانس میں تازگی قائم رہے اسی لئے مصنف کی تلاش میں ہوں مصنف مجھے ملتے رہتے ہیں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ تعلیم عام ہو گئی ہے چھاپے خانے بڑھ گئے ہیں کتابیں بے تعبیر ست ون نکل آتی ہیں۔ مگر مجھ ڈھونڈنے کی تلاش اور بھی مشکل ہو گئی ہے۔ پہلے زندگی کے میدان میں میٹھے پانی کا چشمہ سامنے نظر آتا تھا۔ اب درخت آگئے ہیں۔ جنگل آگئے ہیں آپ برا نہ مانئے سائنس علم کی ترقی نے میرے مصنف کو اس جنگل میں کھو دیا ہے مگر میں اسے ڈھونڈ کر ضرور نکالوں گا

م:- آپ اپنے مصنف کو تلاش بھی کر لیں گے کہیں آپ کے مصنف صاحب شعر جادوداں کے لئے چھڑ کر اس جنگل میں تو نہیں گھس گئے۔

ش:- جناب میں تو اس زمانے کا آدمی نہیں ہوں۔ جو صاحب اس زمانے کے ہوں وہ جواب دیں لیکن میرا یقین ہے کہ مصنف سامنے ضرور آئے گا۔ ممکن ہے میں تلاش میں کامیاب نہ ہوں کوئی دوسرا آدمی اسے پالے۔ آپ یوں سمجھئے کہ میں اس جنگل سے کئی بار [illegible] [illegible] تحریر کے دو ٹکڑے آ جاتے ہیں جن سے صورت آشنا [illegible] اور پھر مصنف کا پتا تو [illegible] ان کے پاس [illegible] نہیں ہے میری تلاش جاری رہے گی [illegible]

حسن مثنیٰ ندوی

فقہ اسلامی کی تشکیل جدید

(پاکستان بننے کے بعد ہم نے اور ہمارے چند احباب نے "فقہ اسلامی کی تشکیل جدید" کی ایک علمی تحریک شروع کی تھی اور روزنامہ امروز کے صفحات پر مضامین سے اس کا آغاز ہوا، پہلا مضمون مولانا عبدالقدوس ہاشمی نے لکھا تھا اور مختلف چھوٹے بڑے مراسلات چھپتے رہنے کے بعد میں نے ایک تفصیلی بحث پیش کی تھی، میرا یہ مضمون جون اور جولائی ۱۹۵۰ء کے شماروں میں چھپا تھا۔ کراچی میں عالم اسلام کے علماء و مفکرین کے اس اجتماع کی یاد بھی شاید ابھی تازہ ہو جس کا نام احتفال علماء اسلام تھا، اس اجتماع کی تحریک بھی ہمیں لوگوں نے کی تھی، علامہ سید سلیمان ندوی داعی یا الخلیز بننے پر آمادہ بھی ہم ہی نے کیا تھا اور علماء اسلام کے نام جو دعوت نامہ گیا تھا اس کے مرتب کرنے والے بھی ہمیں تھے، اس اجتماع کا انعقاد و اہتمام کی ذمہ داریاں مولانا اسد القادری نے اپنے سر لی تھیں، سامنے وہی تھے اور ڈاکٹر محمود حسین خاں کو جو اس وقت وزیر تھے مجلس استقبالیہ کی صدارت کے لئے انھیں نے کھینچا تھا —— اس احتفال کے دعوت نامے کا اہم ترین مقصد عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق فقہ اسلامی کی تدوین جدید تھا۔ اس دعوت نامے کو پاکر عالم اسلام کے علماء و مفکرین اور اسلام کی سربلندی کی آرزو رکھنے والوں نے بیباکانہ لبیک کہی تھی جن میں سب سے موثر اور درد مندانہ آواز آیت اللہ محمد حسین آل کاشف الغطاء اور علامہ بشیر الجزائری جیسے ضعیف العمر مگر جواں ہمت بزرگوں کی تھی۔ اس اجتماع میں چاروں طرف سے ممتاز اہل علم سمٹ کر آئے اور کئی دن تک اجتماعات ہوتے رہے۔

مسلمانوں کا ہر مفید کام ان کی غفلت اور بدنصیبیوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس کا حشر بھی وہی ہوا۔ احتفال کے بعد اس مہم کے آغاز کی ذمہ داری اہل پاکستان کے سر تھی، مگر ان کو تو ذاتیات ہی سے فرصت نہیں ملتی ورنہ اس مہم کا آغاز بھی ہو گیا ہوتا تو آج لا کمیشن کی شروعات پر جو ذہنی الجھنیں لوگوں کو لاحق ہو رہی ہیں، اس کی نوبت نہ آتی۔ اس احتفال میں شیعہ سنی، مقلد غیر مقلد، صوفی و فلسفی، جدید اور قدیم سب ایک جگہ سمٹ آئے تھے، اور وہ بھی ایک جگہ کے نہیں عالم اسلام کے۔ لا کمیشن بھی اسی طرح تعلق میں پڑ گیا تو شاید سب چین سے بیٹھے نظر آئیں گے مگر آج بڑی بیقراری دکھائی دیتی ہے۔ اس کیفیت کو دیکھ کر ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لوگ اس پر تو متفق ہیں کہ کوئی مفید کام شروع نہ ہو —— اس سے بڑی بدقسمتی اور کوئی نہیں ہو سکتی ——!

بہرحال پہلے بھی ہم نے اپنے آپ کو کسی پارٹی سے وابستہ نہیں کیا تھا، نہ اب کرتے ہیں لیکن کسی مفید کام کی راہ میں رکاوٹ جدھر سے بھی پیدا ہوگی اس پر ہم تنقید کریں گے، اور اس تنقید کا مقصد بھی صرف یہ ہوگا کہ اصل مقصد کی حمایت ہو اور کام شروع ہو، لا کمیشن میں ہزاروں خامیاں سہی مگر خامیاں کسی ادارے میں نہیں ہیں، ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ خوبیاں پیدا کی جائیں، اہل فکر و نظر، چاہے وہ اسلام کے کسی مکتب خیال سے تعلق رکھتے ہوں، اس میں داخل ہوں اور انکی تائید اسے حاصل ہو۔ ہم اس مسئلہ سے متعلق چھ سال پہلے کا یہ مضمون قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اور ان کی توجہ اس طرف مبذول کرتے ہیں جو اقبال تدوین فقہ اسلامی کے عنوان سے مہر نیمروز میں شایع ہو چکا ہے اور جس میں پوری بحث اقبال کی زبان میں درج ہے۔)

اس حقیقت پر تمام مسلمانان عالم کا اتفاق ہے کہ اسلام کا قطعی اور اساسی اصول قرآن مجید ہے اور رسول صلعم کی زندگی اس کی عملی تفسیر و ترجمان (کان خلقه القرآن) (لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ) چنانچہ رسول اللہ صلعم نے اہل دنیا سے رخصت ہوتے وقت صاف اور صریح الفاظ میں یہی نصیحت فرمائی کہ (قد ترکت فیکم ما ان تضلوا بعدہ ان اعتصمتم بہ کتاب اللہ) میں تم میں وہ چیز چھوڑ جاتا ہوں کہ اگر تم نے اسے مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھا تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ (انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و اہل بیتی) (وفی روایۃ سنتی) (و عترتی کما فی) میں تمہارے ہاتھوں میں دو وزنی چیزیں چھوڑے جاتا ہوں کتاب اللہ

سے کئی اشخاص ایسے ہوئے ہیں جو حضرت عبداللہ بن مسعود اور عمر کی رائے کو لے لیتے ہیں ـــــ

پھر صحابہ کے بعد ائمہ اہلبیت کے علاوہ مدینہ منورہ میں سعید بن مسیب، عروہ بن زبیر، خارجہ بن زید، قاسم بن محمد، سلیمان بن یسار، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود اور ابوبکر بن عبدالرحمن بن حارث مشہور فقہا ہوئے۔ مرکزیت علمی پہلے مدینہ کو حاصل تھی پھر کوفہ و بصرہ اور بعد ازاں بغداد کو۔ عہد عمر میں عمار بن یاسر جب امیر بنا کر کوفہ بھیجے گئے تو ان کے ساتھ عبداللہ بن مسعود معلم کتاب اور وزیر کی حیثیت سے روانہ کئے گئے تھے پھر خود علی مرتضیٰ نے کوفہ کو پایۂ تخت بنایا۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ عراقی فقہا کو وراثت علی ابن ابی طالب کے فہم و ادراک اور علم کی بھی پہونچی اور عبداللہ بن مسعود کی بھی یہی سبب تھا کہ ابوحنیفہ نے زانوئے تلمذ مدینہ جا کر امام جعفر صادق کے سامنے بھی تہ کرنا ضروری سمجھا چنانچہ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ امام جعفر صادق سے زیادہ فقیہ یعنی (سمجھ بوجھ والا) میں نے نہیں دیکھا۔

اس طرح فقہ کی دو قسمیں ہوئیں مدنی اور کوفی۔ مدنی فقہ موطا امام مالک میں جمع ہوئی (جو بعد کو اندلس میں حکومت کا قانون بنی) اور کوفی فقہ امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں کی تصانیف میں مدون ہوئی (جو سلطنت عباسی کا قانون بنی) یہ مدنی اور کوفی فقہیں بعد کو حجازی فقہ اور عراقی فقہ کے نام سے یاد کی جانے لگیں۔ حجازی اور عراقی فقہ کے مشہور مذاہب دیکھو کہ ان کے علاوہ بھی اور متعدد مذاہب فقہ پیدا ہو گئے ہیں، مگر اس وقت جو اہل سنت میں رائج ہیں، چار ہیں، مالکی، شافعی، حنبلی اور حنفی۔

مالک کتاب و سنت کے بعد معاملات میں اہل مدینہ کے اجماع کو حجت مانتے ہیں ان کی رائے یہ ہے کہ مدینہ رسول و خلفا کا مرکز تھا اہلبیت اور صحابہ و اولاد صحابہ سب وہیں رہے وحی بھی وہیں اتری تھی لہذا احکام کی حکمت سے اہل مدینہ ہی سب سے زیادہ واقف ہو سکتے ہیں۔

شافعی نے اس میں صرف اتنا کیا کہ معاملات میں پورے حجاز کے اجماع کو حجت مانا مگر ساتھ ہی روایات کی چھان بین بھی کی اور بعض مسائل میں بیرون حجاز کے ائمہ اور فقہا کی روایات کو اہل حجاز کے قول پر ترجیح دی۔

احمد بن حنبل حدیث پر عمل کرتے تھے اور کوئی تاویل اس میں نہیں کرتے تھے مگر ایک ہی معاملے کے متعلق مختلف حدیثیں ہوں اور ان میں علت کا اختلاف بھی نہ ہو تو احمد بن حنبل ان سب حدیثوں کو لیتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کو اپنی جگہ مخصوص کر دیتے تھے۔

ابوحنیفہ یہ کہتے ہیں کہ احکام شریعت دو قسم کے ہیں ایک عمومی جن میں کوئی استثنا نہیں ہے دوسری وہ کہ حکم کسی جزوی واقعہ یا مخصوص حالات کی بنا پر صادر ہوا لہذا قاعدے اور قانون بناتے وقت احکام عمومی کو قاعدہ کلیہ کے طور پر پیش نظر رکھنا چاہئے اب اگر کسی حکم عمومی کے خلاف کوئی روایت سامنے آئے اور کوئی وجہ استثنا بھی ظاہر نہ ہو تو صرف اس کی بنا پر حکم عمومی یعنی قاعدہ کلیہ چھوڑنا نہیں چاہئے۔

اس کے علاوہ یہ چاروں ائمہ ابوحنیفہ و مالک و شافعی و احمد حنبل سب قیاس کے بھی قائل ہیں یہ روایت سب کی راہ نما ہے کہ "اجتہاد کرنے والا خطا بھی کر سکتا ہے اور صواب کو بھی پہونچ سکتا ہے صحیح فیصلے کی صورت میں اسے دو ثواب ملیں گے اور خطا کی صورت میں صرف ایک ثواب ملے گا (رسالہ امام شافعی) اس طرح یہ صورت نکلی کہ ایک مجتہد کے بعد دوسرا مجتہد بھی اجتہاد کرے چنانچہ اجتہادات ہوتے رہے۔

امام شافعی امام مالک کے شاگرد ہیں اور انہوں نے ان کی موطا پڑھی ہے اور پھر اسی موطا پر تنقید بھی کی ہے۔ ادھر امام شافعی کے دوسرے استاد امام ابو محمد ہیں (جو امام ابوحنیفہ کے شاگرد تھے) انہوں نے بھی موطا پر تنقید کی ہے اور جس طرح امام شافعی نے اپنے استاد مالک کی موطا پر تنقید کی اسی طرح امام ابو محمد نے اپنے استاد ابوحنیفہ سے بہت سے مسائل میں اپنے تفقہ اور غور و فکر کی بنا پر اختلاف کیا یہی حال امام ابوحنیفہ کی مجلس وضع قوانین کے جملہ اراکین کا تھا جو ایک ایک مسئلہ پر گھنٹوں اور بعض اوقات کئی کئی دن تک بحثیں اور اختلاف کرتے رہتے تھے ان میں ابو یوسف، زفر، محمد، یحییٰ بن ابی زائدہ، حفص بن غیاث، حبان و مندل بن علی، قاسم بن معن یعنی عبدالرحمن ابن عبداللہ بن مسعود، اور داؤد بن نصیر طائی، فضیل بن عیاض اور حسن بن زیاد وغیرہم جیسے ارباب فکر و نظر شامل تھے اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر دنیا میں علم ترقی نہ کرتا۔

اب دیکھئے کہ ان فقہا نے اپنی علمی کاوشوں کے بعد اعلانات کیا کئے اور آنے والی نسلوں کی رہنمائی کس طرح کی اور ان سے توقعات کیا قائم کیں ـــــ یہ بہت اہم اعلانات ہیں۔

امام مالک فرماتے ہیں کہ کوئی شخص بجز رسول کے ایسا نہیں ہے کہ جو کلام کی وجہ سے مسول نہ ہو اور اس کا قول مسترد نہ کیا جائے۔ امام مالک کے مشہور شاگرد اشہب جب کوئی مسئلہ پوچھ کر امام کا جواب قلمبند کرنے لگے تو امام نے انہیں یہ کہہ کر منع کیا کہ مجھے معلوم نہیں جانا کہ اس جواب پر آئندہ خود میں بھی قائم رہوں گا یا نہیں۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ میرا کوئی قول اگر حدیث کے خلاف ہو تو حدیث پر عمل کرو اور میرے قول کو دیوار پر کھینچ مارو (دلا عیب اگر حدیث درست ہو تو وہ میرا مذہب ہے) انہوں نے فرمایا کہ

ابن ندیم
مترجمہ مولانا مظہر علی کامل

ہندوستان کے مذاہب[1]

ابن ندیم کی کتاب الفہرست، کتاب نہیں معلومات کا انسائیکلوپیڈیا ہے — علوم مشرقیہ اور تاریخ کے سلسلہ میں ابن ندیم کے حوالے شبلی، سید سلیمان ندوی اور دوسرے محققین نے بار بار دیئے ہیں — ہماری بدنصیبی کہ الفہرست کا ترجمہ اب تک نہ ہوا تھا۔ مولانا مظہر علی کامل نے اس اہم کام کو مکمل کرکے اردو پڑھنے والوں پر ایک بڑا علمی احسان کیا ہے۔

زیر نظر مضمون ابن ندیم کی کتاب کے "نویں مقالے" (دوسرے فن) کا ترجمہ ہے۔ (ادارہ)

ایک کتاب جس میں ہندوستان کے مذاہب اور اعتقادات کا ذکر تھا میں نے اس کے دیباچہ کے ایک حصہ میں پڑھا جس کی نقل یہ ہے۔ یہ کتاب میں نے اس کتاب سے نقل کی ہے جو جمعہ کے روز بتاریخ ۱۰ محرم ۲۴۹ھ میں لکھی گئی تھی میں نہیں جانتا کہ اس کتاب میں جو بیان ہے وہ کس کا ہے البتہ میں نے دیکھا کہ حرف بہ حرف یعقوب بن اسحٰق کندی کی قلمی ہے اسی دیباچہ میں اس کے کاتب کے الفاظ میں جو لکھا ہوا ہے اسی کی یہ نقل ہے۔ بعض متکلمین نے بیان کیا ہے کہ یحییٰ بن خالد برمکی نے ایک آدمی کو ہندوستان بھیجا تھا کہ وہاں کے ملکوں کی جڑی بوٹیاں لا دے اور وہاں کے باشندوں کے مذاہب قلمبند کرکے اس کو دے اسی شخص نے یہ کتاب یحییٰ بن خالد برمکی کے لئے لکھی۔ محمد بن اسحٰق کا بیان ہے کہ عرب کی حکومت میں یحییٰ بن خالد اور برمکیوں کی ایک جماعت ہی نے ہندوستان کی طرف توجہ کی اور وہاں کے اطبا اور حکما کو لانے کا اہتمام کیا۔

(ہندوستان کے ملکوں میں پرستش کے مقامات کے نام۔ مندروں کا بیان اور بتوں کا حال)

سب سے بڑا مندر مانکیر میں ہے جس کا طول ایک فرسخ ہے۔ یہ مانکیر وہی شہر ہے جس میں البلہرا ہے اس کا طول چالیس فرسخ ہے جس میں ساگوان تھا اور اقسام کی لکڑیاں ہیں کہا جاتا ہے کہ یہاں اسباب و سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لئے عام لوگوں کے پاس ایک لاکھ ہاتھی ہیں۔ بادشاہ کے اصطبل میں ساٹھ ہزار ہاتھی اور یہاں کے دھوبیوں کے پاس ایک لاکھ بیس ہزار ہاتھی ہیں۔ اس مندر میں تقریباً بیس ہزار بت اقسام کے جواہر کے بنے ہوئے ہیں۔ مثلاً سونا۔ چاندی، لوہا۔ پیتل، تانبہ، ہاتھی دانت، اقسام کے ملے ہوئے پتھر یہ بت قیمتی جواہر سے مرصع ہیں۔ ہر سال بادشاہ کی سواری اس مندر کو جاتی ہے بلکہ بادشاہ اپنے گھر سے پیدل جاتا ہے اور سواری پر واپس آتا ہے۔ اس میں سونے کا بت ہے جو بارہ ہاتھ اونچا ہے یہ سونے کے گنبد کے بیچ میں سونے کے ایک تخت پر ہے۔ یہ پورا بت سپید جواہر۔ موتی اور سرخ۔ زرد۔ نیلے اور سبز رنگ کے یاقوت سے مرصع ہے۔ اس بت کے لئے جانور ذبح کئے جاتے ہیں زیادہ تر بیٹیاں سال میں ایک دن چڑھائی جاتی ہیں اور یہ رواج ان کے پاس مشہور ہے۔

[1] تین میل ہاشمی یا بارہ ہزار گز کو فرسخ کہتے ہیں۔

ملتان میں ایک مندر ہے بیان کیا جاتا ہے کہ یہ مندر سات مندروں میں کا ایک ہے اس میں گنبد کے بیچوں بیچ سات ہاتھ لانبا لوہے کا ایک بت ہے
ہر طرف سے مقناطیسی پتھر متعلقہ قوت سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اس بت پر کوئی آفت آگئی تھی جس کی وجہ سے وہ ایک طرف ہٹ گیا ہے
پہاڑ کے دامن میں ہے۔ یہ ایک گنبد ہے جو ایک سو اسی ہاتھ بلند ہے۔ ہندوستان کے لوگ دور دور کے شہروں سے خشکی اور تری کی راہ طے کرکے یہاں نیاز
آتے ہیں۔ بلخ سے اس کا راستہ سیدھا ہے کیونکہ ملتان سواد بلخ سے قریب ہے۔ پہاڑ کی چوٹی پر اور اس کے دامن میں پجاریوں اور سنیاسیوں کے لئے مکانات
ہے ہیں۔ اور یہیں جانوروں کے ذبح کرنے اور قربانی ادا کرنے کے مقامات ہیں۔ کہا گیا ہے کہ یہ مندر زائرین سے کبھی ایک گھڑی کے لئے بھی خالی نہیں رہا۔ ہندوؤں
و بت ہیں۔ ایک کا نام جبیکت اور دوسرے کا نام زنبیکت ہے۔ ان دونوں کی صورتیں ایک بڑی وادی کے دونوں کناروں سے نکلی ہوئی ہیں جو ایک پہاڑ کے
سے تراشی گئی ہیں ان میں سے ہر ایک کی بلندی اسی ہاتھ کی ہے یہ دور کی مسافت سے دکھائی دیتے ہیں۔ ہنود ان کی زیارت کے لئے آتے ہیں اور اپنے ساتھ قربانی کے جانور
عود ریحان کی خوشبو لاتے ہیں۔ جب دور کے فاصلے سے ان دونوں بتوں پر نظر پڑتی ہے تو دیکھنے والے کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ تعظیماً اپنا سر جھکا لے
آنے والے کو ان بتوں کی طرف متوجہ ہونے کی توفیق نہ ہو یا بھولے سے انھیں دیکھ لے تو اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس مقام تک واپس جائے
سے یہ بت نہ دکھائی دیتے ہوں۔ پھر وہاں سے اپنا سر جھکا کر ان کی طرف روانہ ہو یہ طریقہ ان بتوں کی تعظیم کے لئے ہے۔ ان بتوں کو دیکھنے والے شخص نے مجھ سے
کہا کہ بسا اوقات ایسا اتفاق ہوا ہے کہ پچاس ہزار یا اس سے بھی زیادہ [illegible] دی گئی ہیں۔ واللہ اعلم

ہندوؤں کا ایک مندر بامیان میں ہے جو ہندوستان کے ابتدائی حصہ میں سیستان سے متصل ہے جب یعقوب بن لیث نے ہندوستان فتح کرنے کا ارادہ
کیا تو اسی مقام تک پہنچا تھا اور جو مورتیاں بغداد میں ہیں وہ اسی بامیان کی فتح کے وقت یہاں سے بھیجی گئی تھیں۔ یہ بڑا مندر ہے جس میں پجاری اور سنیاسی لوگ
رہتے ہیں۔ اس میں سونے کے مرصع بت ہیں جن کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان کی تعریف و توصیف کی جا سکتی ہے۔ اہل ہند دور دراز کے ممالک سے خشکی اور
پانی راستے سے آکر اس کی زیارت کرتے ہیں۔ سونے کے مندر کے بیچ میں ایک مندر ہے جس کے متعلق اختلاف ہے ایک جماعت کا کہنا ہے کہ یہ مندر پتھر کا ہے
...میں کی ہیں اس کو سونے کا مندر اس لئے کہا جاتا ہے کہ جب حجاج کے زمانے میں عربوں نے اس مقام کو فتح کیا تو یہاں سے ایک سو بہار سونا حاصل کیا
ابودلف ینبوعی سیاح نے مجھ سے بیان کیا کہ جو مندر سونے کے مندر کے نام سے مشہور ہے وہ یہ مندر نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے جنگلوں میں مکران
اور قندھار کی سرزمین پر جو مندر ہے جہاں ہندوستان کے پجاریوں اور سنیاسیوں کے سوا کوئی نہیں پہنچ سکتا یہ سونے کا بنا ہوا ہے جس کا طول سات
ہاتھ ہے اور عرض بھی اسی قدر ہے اور بلندی بارہ ہاتھ ہے یہ اقسام کے جواہر سے مرصع ہے اس میں کئی بت ہیں جو سرخ یاقوت کے علاوہ نادر اور قیمتی پتھروں
کے بنے ہوئے اور بہترین موتیوں سے مرصع ہیں جنھیں کا ایک موتی پرندے کے انڈے کے برابر بلکہ اس سے بڑا ہے اور بیان کیا کہ ثقہ ہندوستانیوں نے
...کو خبر دی ہے کہ بارش اس مندر کے سیدھے بائیں اور اوپر کی طرف سے ہٹ کر رہتی ہے مندر پر پانی نہیں گرتا اسی طرح جب سیلاب بڑھتا ہے تو اس کے
سیدھے بائیں جانب سے بہہ جاتا ہے اور بیان کیا کہ بعض ہندوستانیوں نے مجھ سے کہا کہ کوئی مریض چاہے وہ کسی بیماری میں مبتلا ہو اس مندر کو دیکھ لے
تو اللہ جل اسمہ اس کو شفا دیتا ہے اور کہا کہ جب اس مندر کے متعلق میں نے تحقیق کی تو لوگوں میں اختلاف پایا بعض برہمنوں نے مجھ سے بیان کیا کہ یہ
مندر بلا کسی سہارے اور علاقے کے آسمان و زمین کے مابین معلق ہے ابودلف نے مجھ سے کہا کہ ہندوستان میں قمار کے مقام پر ایک مندر ہے جس کی
دیواریں سونے کی ہیں اور چھت عود ہندی کی لکڑیوں کی ہے ان میں کی ہر لکڑی کا طول پچاس ہاتھ بلکہ اس سے زیادہ ہے اس کے بت اور محرابیں اور وہ
مقامات جن کی طرف رخ کرکے عبادت کی جاتی ہے بہترین موتیوں اور بڑے بڑے یاقوتوں سے مرصع ہیں۔ کہا کہ بعض میرے بھروسہ کے لوگوں نے بیان کیا
شہر صنف میں اس مندر کے علاوہ ان کا ایک اور مندر ہے اور یہ مندر قدیم ہے اس میں جتنے بد ہیں وہ پوچھنے والوں سے گفتگو کرتے ہیں اور یہ لوگ جو بھی سوال کرتے

۱؎ چار سو رطل کی گونی

یہاں پر اس کا جواب دیتے ہیں ابودلف کا بیان ہے کہ جس وقت میں ہندوستان میں تھا اس وقت صنف کا بادشاہ لاصین نامی تھا۔ بجرانی راہب نے مجھ سے کہا کہ اس و
بادشاہ ہے وہ شاہ لوقین کے نام سے معروف ہے اس نے صنف کا رخ کرکے اس کو ویران کر دیا اور وہاں کے تمام باشندوں کا مالک بن گیا ہے

بد کا بیان

یہ بیان کندی کی قلمی کتاب کا نہیں ہے۔ بد کے متعلق ہندوستانیوں میں اختلاف ہے ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ باری تعالیٰ کی صورت ہے ایک جماعت کا بیا
یہ رسول کی صورت ہے جو ان کے پاس بھیجے یہاں ان میں اختلاف ہے ایک جماعت کا قول ہے کہ رسول فرشتوں میں سے ایک فرشتہ تھے ایک جماعت کہتی ہے کہ
انسانوں میں سے ایک انسان ہے ایک جماعت بیان کرتی ہے کہ عفریتوں میں سے ایک عفریت تھے۔ ایک جماعت کا قول ہے کہ حکیم بوداسف کی صورت ہے جو اللہ جا
کی طرف سے ان کے پاس آئے تھے۔ ہر جماعت کے لئے بد کی عبادت اور تعظیم کا ایک خاص طریقہ ہے۔ ان میں سے بعض لوگوں نے جن کو سچا سمجھا جاتا ہے۔ بیان
ان کے ہر مذہب کے لئے ایک صورت مقرر ہے جس کی یہ پرستش اور تعظیم کرتے ہیں۔ بد رسم جنس ہے اور بت مثل نوع کے ہے۔ بد اعظم کی ہیئت ایک انسان کی سی
کرسی پر بیٹھا ہوا ہے جس کے چہرہ پر بال نہیں ہیں اور تھوڑی منہ میں گھسی ہوئی ہے یہ چادر لپیٹے ہوئے نہیں ہے۔ چہرہ پر مسکراہٹ ہے ہاتھ سے بتیس کا عدد گن رہا
ثقہ لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ہر گھر میں انسان کے حسب حیثیت بد کی صورت اقسام کی چیزوں سے بنی ہوئی ہوتی ہے یا سونے کی جو اقسام کے جواہر سے مرصع ہوتی
چاندی، پیتل، پتھر، لکڑی کی ہوتی ہے۔ جس طرف سے بھی اس کے چہرہ کا سامنا ہو لوگ اس کی تعظیم کرتے ہیں چاہے مشرق سے مغرب کی طرف ہو یا مغرب سے مشرق کی
ہو لیکن یہ لوگ اکثر بد کی پیٹھ مشرق کی طرف رکھتے ہیں اور خود مشرق کی طرف رخ کرتے ہیں اور بیان کیا کہ ان کے اس بت کی صورت چار جیسی ہوتی ہے جو انجینیری اصو
نازک کاریگری سے بنائی گئی ہے کہ جس جگہ سے بھی اس کی طرف رخ کریں تو اس کا پورا چہرہ اور صحیح و سالم رخسار دکھائی دیتے ہیں چہرہ کی کوئی چیز بھی نظر سے غائب نہ
ہوتی۔ کہا گیا ہے کہ ملتان کے بت کی یہ صورت[2] ہے (کندی کی قلمی)

جہا کالی

ان کا ایک بت ہے جس کو جہا کالی کہا جاتا ہے اس کے چار ہاتھ ہیں اس کا رنگ آسمانی ہے اس کے سر میں بال زیادہ اور لانبے ہیں۔ دانت نکلے ہوئے۔ پیٹ کھلا ہ
پیٹھ پر ہاتھی کی کھال ہے جس سے خون ٹپک رہا ہے۔ اس کے سامنے کی طرف ہاتھی کے پاؤں کی کھال میں گرہ لگی ہوئی ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں اژدہا منہ
کھولے ہے دوسرے ہاتھ میں لکڑی تیسرے ہاتھ میں انسان کا سر ہے چوتھا ہاتھ بلند کئے ہوئے ہے۔ اس کے دونوں کانوں میں دو سانپ بالیوں کی طرح ہیں
جسم پر دو اژدہے لپٹے ہوئے ہیں سر پر کھوپڑیوں کی ہڈیوں کا تاج ہے اور انہی کا ہار پہنے ہوئے ہے بیان کرتے ہیں کہ یہ شیطانوں میں کا ایک عفریت ہے جو اپنے مرتبہ کی عظمت
لحاظ سے مستحق پرستش ہے اور یہ استحقاق نیک اور پسندیدہ، بری اور ناپسندیدہ خصلتوں کی وجہ سے ہے جیسے دنیا اور دنیا۔ بھلائی کر اور برائی کر
مصیبتوں کے زمانے میں یہی بت ان کی پناہ گاہ ہے۔

اہل ہند میں سے بعض کا مذہب دینکیتی ہے

یہ لوگ آفتاب کے پجاری ہیں انھوں نے آفتاب کا ایک بت بنایا ہے جو گاڑی پر ہے اور گاڑی کے پہیئے چار گھوڑے ہیں اس بت کے ہاتھ میں آتشی رنگ
ایک جوہر ہے ان کا بیان ہے کہ آفتاب فرشتوں کا بادشاہ ہے جو پرستش اور سجدہ کا مستحق ہے۔ یہ لوگ اس بت کو سجدہ کرتے ہیں اور خوشبو جلاتے بجتے اقسام کے با
کے ساتھ اس کے اطراف گھومتے ہیں اس بت کی جائدادیں اور آمدنیاں ہیں اس کے خدمت گزار اور منتظمین بھی ہیں، جو اس کی اور اس کی جائداد کی بہبودی کا انتظا
ہیں۔ اس بت کی پرستش دن میں تین دفعہ کی جاتی ہے۔ ان کے لئے پرستش کے دوران میں پڑھنے کی اقسام کی عبارتیں ہیں۔ بیمار، جذامی، کوڑھی، لنگڑے ان کے

[1] عقد وافاصل کے حساب سے
[2] اصل کتاب میں کوئی صورت درج نہیں ہے تین نقطے دے دیئے گئے ہیں۔ (ت)

ری اری بیماریوں کے مریض اس بت کے پاس آکر ٹھہرتے اور یہیں راتیں گزارتے ہیں اس کو سجدے کرتے اور گڑگڑا کر اس سے اپنی صحت کی دعا کرتے ہیں۔ کچھ کھاتے نہیں بلکہ اس کے نام پر برت رکھتے ہیں۔ یہ بیمار اسی طرح دن گزارتے ہیں یہاں تک کہ خواب میں دیکھتے ہیں کہ گویا کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے کہ تو اچھا ہو گیا اور اپنی مراد کو پہنچ گیا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بت خواب میں مریض سے گفتگو کرتا ہے اور مریض اچھا ہو جاتا ہے اور صحت کی حالت پر آجاتا ہے۔

(ان میں سے بعض کا مذہب چیندر بھکتی ہے)

یہ چاند کے پجاری ہیں ان کا بیان ہے کہ چاند فرشتوں میں سے ہے جو تعلیم و پرستش کا مستحق ہے ان کا طریقہ یہ ہے کہ گاڑی پر ایک بت بناتے ہیں اس گاڑی کو بیل کھینچتے ہیں۔ اس بت کے ہاتھ میں ایک جوہر ہوتا ہے جس کو چیندر کیت کہا جاتا ہے ان کے مذہب میں اس بت کو سجدہ کرتے اور اس کو پوجتے ہیں۔ ہر ماہ میں ہے مہینہ تک برت رکھتے ہیں جب تک چاند طلوع نہ ہو جائے برت نہیں توڑتے۔ جب چاند طلوع ہوتا ہے تو یہ لوگ بت کے پاس دودھ اور کھانے پینے کی چیزیں لے کر آتے ہیں اور اس کے روبرو اپنی عاجزی و درماندگی کا یہ اظہار کرتے ہیں اور چاند کو دیکھ کر اس سے اپنی حاجتیں مانگتے ہیں۔ جب مہینہ کی پہلی تاریخ آتی ہے اور چاند نکلتا ہے تو یہ لوگ چھتوں پر چڑھ کر چاند کو دیکھتے ہیں اور خوشبو جلاتے ہیں جب چاند پر نظر پڑتی ہے تو اس کو پکارتے ہیں اور اپنی عاجزی و انکساری کا اظہار کرتے ہیں پھر چھتوں سے اتر کر کھانے پینے، خوشی مسرت میں مشغول ہو جاتے ہیں تاوقتیکہ بہتر وجوہ پیدا نہ ہو جائیں پھر چاند کو بلا وجہ نہیں دیکھتے۔ جب آدھے مہینہ میں افطار سے فارغ ہو جاتے ہیں تو چاند اور بت کے سامنے ناچ، گانے اور لہو و لعب میں مصروف رہتے ہیں۔

(ان میں سے بعض کا مذہب انشنی ہے یعنی کھانا پینا ترک کئے ہوئے)

(ان میں سے بعض کا مذہب بکر نشنی ہے یعنی اپنے کو لوہے میں قید کئے ہوئے)

ان کا طریقہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے سروں اور داڑھیوں کو منڈھاتے ہیں ستر عورت کے سوا باقی جسم کو برہنہ رکھتے ہیں۔ ان کا مذہبی طریقہ یہ ہے کہ کسی کو تعلیم نہیں دیتے اور کسی سے گفتگو کرتے ہیں تاوقتیکہ وہ ان کے مذہب میں داخل نہ ہو جائے۔ جو کوئی ان کے مذہب میں داخل ہوتا ہے اس کو اظہار عجز و نیاز کے لئے خیرات کا حکم دیتے ہیں جو شخص ان کے مذہب میں داخل ہو اس کو لوہے میں مقید نہیں کیا جاتا جب تک کہ وہ اس مرتبہ پر نہ پہنچ جائے جس پر پہنچنے کے بعد اس کو اس کا استحقاق پیدا ہو جاتا ہے یہ لوگ کمر سے سینہ تک اپنے کو لوہے میں مقید کرتے ہیں اس کے متعلق ان کا بیان ہے کہ یہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ کثرت علم اور غلبۂ فکر کی وجہ سے کہیں ان کے پیٹ پھٹ نہ جائیں۔

(ان میں سے بعض کا مذہب کنکا یاترہ ہے)

اس مذہب کے لوگ ہندوستان کے تمام شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں ان کا طریقہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بڑا گناہ کرے اور وہ دریا زہ بیک سے دکھائی دینے کے قبل ہی وہ نہر گنگ میں نہالے تو گناہ سے پاک ہو جاتا ہے۔

(ان میں سے بعض کا مذہب راجبریہ ہے)

یہ لوگ بادشاہوں کے طرفدار ہیں، بادشاہوں کی مدد کرنا ان کا دینی طریقہ ہے۔ ان کا قول ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے بادشاہوں کو مالک بنایا ہے اگر ہم ان کی فرمانبرداری میں قتل ہو جائیں تو جنت میں جائیں گے۔

(ان میں سے بعض کا طریقہ یہ ہے کہ)

وہ اپنے بالوں کو بڑھاتے ہیں اور ان کو اپنے چہروں پر بانٹتے ہیں ان کے سروں کے تمام گوشے ڈھکے ہوئے ہوتے ہیں، اور سر کے گوشوں پر بال برابر ہوتے ہیں۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ شراب نہیں پیتے۔ ان کا ایک پہاڑ ہے جس کو حور رنجن کہا جاتا ہے یہ اس کی زیارت کے لئے جاتے ہیں جب یہ زیارت سے پلٹتے ہیں تو واپسی میں کسی آبادی میں داخل نہیں ہوتے اگر کسی عورت کو دیکھیں تو اس سے بھاگتے ہیں یہ جس پہاڑی کی زیارت کے لئے جاتے ہیں اس پر ایک بڑا مندر ہے جس میں ایک مورت ہے۔

(چینیوں کے مذاہب اور ان کے کچھ حالات)

یہ بیان نجرانی راہب کا ہے جو چین کے شہر سے ۳۷۷ھ میں آیا ہے یہ شخص اہل نجران سے ہے قریباً سات سال ہوئے کہ جاثلیق نے اس کو چین روانہ کیا تھا اور اس کے ہمراہ پانچ عیسائیوں کو بھی بھیجا تھا جو دینی امور کا انتظام کرنے والوں میں سے تھے اس جماعت میں سے راہب اور ایک دوسرا شخص چھ سال کے بعد واپس آئے ہیں۔ میں کنیسہ کے پیچھے ملا۔ میں نے اس کو نوجوان خوبصورت شخص پایا یہ کم گو تھا البتہ اگر اس سے کوئی چیز پوچھی جائے تو گفتگو کرتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کس مقصد سے یہ چین گیا تھا اور اتنی مدت تک تاخیر کا کیا سبب تھا اس نے بعض امور بیان کئے جو راستہ میں اس کو پیش آئے اور اس کو روک دیا۔ اور جو عیسائی چین میں تھے بعض اسم سے وہ سب فنا ہو گئے تمام شہروں میں ہر ایک کے کوئی باقی نہیں رہا اور بیان کیا کہ وہاں ان کا ایک بھی تھا جو ویران ہو گیا۔ جب میں نے وہاں کسی کو نہیں پایا جن کی خدمت کر سکوں تو جتنی مدت میں وہاں گیا تھا اس سے کم مدت میں واپس آ گیا۔ اس کا بیان ہے کہ دریا کی مسافتیں بدل گئیں ہیں۔ اور دریا کا معاملہ خراب ہو گیا ہے دریا کے واقف کار لوگ کم رہ گئے ہیں۔ دریا میں ایسی آفتیں، خوف اور جزیرے پیدا ہو گئے ہیں جنھوں نے مسافتوں کو درہم برہم کر دیا ہے البتہ جو شخص خود کو ہلاکت کے سپرد کرنے وہ یہ راستہ اختیار کرتا ہے اور بیان کیا کہ پادشاہ کے شہر کا نام طاجو تہ ہے اسی میں پادشاہ رہتا ہے۔ یہاں کی مملکت دو شخصوں کے سپرد تھی جن میں سے ایک فوت ہو گیا دوسرا باقی ہے۔ اس نے کہا کہ سب سے بہتر اور عمدہ چیز جس کو پادشاہ کے خدام اپنے ہمراہ لے کر دربار میں داخل ہوتے ہیں وہ بشان ہے یہ سینگ کے ٹکڑے ہوتے ہیں جن پر پیدائشی طور پر تصویریں اتری ہوئی ہوتی ہیں۔ بشان کے وقیہ[1] کی قیمت پانچ من سونا ہوتی ہے اب جو پادشاہ باقی رہ گیا ہے اس نے اس طریقہ کو روک دیا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ اگر دربار میں آنے والے سونے یا اس کے مماثل چیزوں کے پٹکے لگا آئیں اس کی وجہ سے بشان کی قیمت گھٹ گئی ہے اب اس کا ایک روقیہ سونے کے ایک روقیہ بلکہ اس سے بھی کم کے مساوی ہو گیا ہے۔ راہب نے کہا کہ میں نے اس سینگ کے متعلق دریافت کیا تو چین کے علماء فلاسفر نے بیان کیا کہ جس جانور کی یہ سینگ ہے اس کا بچہ جنم نکلنے کے وقت سب سے پہلے جس چیز کو دیکھتا ہے اسی کی صورت اس کی سینگ میں اتر جاتی ہے۔ سینگ میں اکثر جو تصویریں پائی جاتی ہیں وہ مکھیوں اور مچھلیوں کی ہوتی ہیں میں نے کہا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ گینڈے کی سینگ ہوتی ہے اس نے کہا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ وہ وہیں کے ممالک کے چوپایوں میں سے ایک چوپایہ ہے راہب نے کہا مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ وہ چوپایہ ہندوستان کا ہے اور یہی صحیح ہے۔ چین کے ہر شہر میں چار حاکم ہوتے ہیں ان میں سے ایک کو لانجون کہا جاتا ہے جس کے معنی امیر الامراء کے ہیں۔ دوسرے کا نام حراجیہ ہے جس کے معنی لشکر کے سردار کے ہیں۔ بغبور کی صورت کا سب سے بڑا بت جس مقام میں ہے اس کو بغران کہتے ہیں بغران سرزمین مملکت خانقوں میں واقع چین کے شہروں میں سے ہے جون، سیلیون اور جنبون ہیں اور بیان کیا کہ چینی زبان میں بغبور کے معنی آسمان کے بیٹے کے ہیں یعنی وہ آسمان سے اترا ہے۔ اس طرح ۳۰۵ شہر ہیں جن کی چینی نے ہی مجھ سے کہا تھا۔ میں نے مذہب کے متعلق راہب سے پوچھا اس نے کہا کہ یہاں کے اکثر لوگ ثنوی اور سمنی مذہب کے ہیں اور عام لوگ پادشاہ کی پرستش اور اس کی مورت کی تعظیم کرتے ہیں۔ پادشاہ کی مورت کا بتوں کے شہروں میں بڑا مندر ہے تقریباً دس ہزار ہاتھ لانبا اور اسی قدر چوڑا ہے۔ اقسام کے پتھر، اینٹ، سونے اور چاندی سے بنا ہوا ہے جو شخص اس مندر کا رخ کرتا ہے تو اس کو وہاں پہنچنے سے قبل اقسام کے بت جیسے، تصویریں اور خیالی چیزیں دکھائی دیتی ہیں جن سے اس شخص کی عقل گم ہو جاتی ہے جو یہ جانتا ہی نہیں کہ یہ چیزیں کس طرح کی ہیں اور ان کا مقصد کیا ہے اور مجھ سے کہا یخذا اے ابو الفرج یہ لوگ قطع نظر پادشاہ کی ذات کے اس کی تصویر کی جو عظمت کرتے ہیں اگر ہم نصاریٰ یہود اور مسلمانوں میں سے کوئی شخص اللہ جل اسمہ کی ویسی ہی عظمت کرے تو اللہ اس کے کہنے سے پانی برسائیں۔ یہ لوگ جب پادشاہ کی مورت کو دیکھتے ہیں تو ان پر لرزہ، کپکپی اور خوف طاری ہو جاتا ہے۔ اکثر اوقات تو ان میں سے بعض کی عقل دنوں تک گم رہتی ہیں۔ میں نے کہا کہ شیطان ان پر اور ان کے شہروں پر چھایا ہوا ہے ان کو گمراہ کرتا ہے تاکہ یہ اللہ کے راستہ سے ہٹ جائیں۔ اس نے کہا کہ تقریباً ایسا ہی ہوگا

(راہب کے سوا دوسروں کا بیان)

ابو دلف ینبوعی نے کہا ملک اعظم کے شہر کا نام حمدان سوداگروں اور سرمایہ کا شہر خانقو ہے جس کا طول چالیس فرسخ ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ راہب نے

[1] وقیہ - پون چھٹانک وزن کو کہتے ہیں

ے بہت کم بتایا ہے۔ دوسروں نے بیان کیا کہ چین کے تین سو شہر ہیں جو سب کے سب آباد ہیں ہر پچاس شہروں پر بغبور کی جانب سے ایک بادشاہ مقرر ہے۔ انہی
ں کے شہروں اور صنو اور بالفو ہے ایک اور شہر ہے جس کو دریانیل کہا جاتا ہے دریانیل سے بالفو تک دو مہینے کی مسافت ہے بالفو تبت ترک اور
ہوا ہے اور ان میں باہمی مصالحت ہے۔ تبت سے خراسان اور ساحل چین تک گول گھاؤ کی صورت میں تین ہزار فرسخ کا فاصلہ ہے چین میں سیلا نامی ایک شہر ہے
م شہروں سے بڑا اور بہتر ہے اور سب سے زیادہ مشہور ہے چین میں نہر ... اور اس پہاڑ تک جس کے پیچھے سے آفتاب طلوع ہوتا ہے بہت سے بیابان پہاڑ
جنگل ہیں۔ اندلسیوں کی ایک جماعت نے مجھ سے بیان کیا کہ ان کے اور چین کے شہر کے مابین بہت سے صحرا ہیں اور بیان کیا کہ چین کو ارض کبیر کہا جاتا ہے
رس شمال کی طرف ہے اسی وجہ سے یہ آفتاب طلوع ہونے کے مقام سے اور چین کے ممالک سے قریب ہے۔ چین کے ممالک میں سفر کرنے والا خواہ وہ چینی ہو
چینی جب سفر کرتا ہے تو اپنا نسب، حلقہ عمر، باندی غلام اہل و عیال، ساتھ کے سامان کی مقدار اور دولت و اسباب کی تفصیل لکھ دیتا ہے کہ وہ اپنی منزل مقصود
بادشاہ کو پہنچ جاتے اس اندیشہ سے کہ چین کے حدود میں اس پر کوئی حادثہ نہ ہو جائے جو بادشاہ کے لئے معیوب ہے۔ اگر کوئی چینی مر جائے تو لکڑی میں گڑھا بنا کر اس
ان کی میت رکھی جاتی ہے اور پھر اسی طرح یہ میت ایک سال تک اسی کے گھر میں رکھی رہے گی سال ختم ہونے پر اس کو صندوقی قبر میں جو بند نہیں ہوتی ہے دفن کیا
تا ہے۔ میت کے اہل و عیال اور پسماندوں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ تین سال تین ماہ تین دن اور تین گھنٹوں تک رنج اور سوگ منائیں۔ جو رنجیدہ اور سوگوار
رنہ کرے اس کے سر کو لکڑی سے مارتے ہیں روز اس سے کہا جاتا ہے کہ تو ہی نے اس کو مارا ہے۔ ہر میت کو اس کی پیدائش کے مہینہ، دن اور ساعت ہی میں دفن
جاتا ہے۔ اگر کوئی ہم میں سے وہاں کی عورت سے شادی کرے پھر وہاں سے واپس ہونا چاہے تو اس سے کہا جاتا ہے کہ زمین کو چھوڑ دے اور بچے کو لیجا۔ اگر پوشیدہ
طور سے کوئی شخص عورت کو لے جانا چاہے اور یہ معاملہ کسی وجہ سے ظاہر ہو جائے تو اس پر جرمانہ کیا جاتا ہے۔ جس کی مقدار انھوں نے مقرر کر دی ہے اور قید کیا جاتا
ہے اور اکثر مار بھی جاتا ہے۔ وہاں کا بادشاہ چالیس سال سے کم عمر والے شخص کو حاکم اور افسر مقرر نہیں کرتا۔ تمام دنیا کے ممالک کے مقابلہ میں یہاں عدل و انصاف
زیادہ ہے۔ چین میں وہی شخص داخل ہو سکتا ہے اور وہاں سے وہی باہر آ سکتا ہے جو حسب مسافت ایک سو بلکہ اس سے زیادہ مقامات سے واقفیت رکھتا ہو
جس روز میت قبر کی طرف لیجائی جاتی ہے اور اس روز میت کے مرتبہ اور حیثیت کے موافق راستہ کو اقسام کے ریشمی کپڑوں سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ جب واپس
ہوتے ہیں تو ان کے خادم، نوکر وغیرہ کپڑوں کو لوٹ لیتے ہیں۔ چینی لوگ دعوے کرتے ہیں کہ وہ کی قوم سے ہیں۔ کے ممالک چین کی سرحد سے ملے ہوئے ہیں۔
تبت اور چین کے مابین ایک وادی ہے جس کی گہرائی کا پتہ نہیں چلتا یہ وادی بڑی ہولناک اور وحشتناک ہے اس کے مغربی جانب سے مشرقی جانب تک تقریباً پانچ سو
ہاتھ کا فاصلہ ہے اس پہاڑ کی جانب سے ایک پل ہے جس کو چین کے حکما اور کاریگروں نے بنایا ہے یہ دو ہاتھ چوڑا ہے۔ بغیر باندھے اور کھینچے چوپایوں وغیرہ کا اس پر
سے گزرنا ممکن ہے کیونکہ نہ یہ اس قابل ہے اور نہ چوپائے اس پر ٹھہر سکتے ہیں اگر انسانوں کا بھی یہی حال ہے البتہ انسانوں اور چوپایوں کو زنبیل کی طرح ایک ٹوکرے میں
رکھتے ہیں اور جو لوگ اس پل کو عبور کرنے کے عادی ہیں وہ اس ٹوکرے کو کھینچ کر پل کے پار کر دیتے ہیں بادشاہوں کی تعظیم اور پرستش کرنا چین کا طریقہ ہے اور اکثر عوام
لوگوں کا اسی پر عمل ہے۔ لیکن بادشاہ اور شرفا کا مذہب ثنوی اور سمنی ہے۔

ملک حسین

جل تارا

نیلا وسیع سمندر نیلے آسمان تلے ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ چھوٹی بڑی لہریں ایک دوسرے سے لپٹتی الگ ہوتی۔ دبتی، اچھلتی، دودھیا جھاگ اڑا ساحل کی طرف دوڑتی آتیں اور لوٹ جاتیں۔ ناریل کے جھنڈ ساحل کے کنارے کنارے دور تک چلے گئے تھے۔ ادھر ادھر کہیں کہیں سمندری گول گول چکنے پتھروں پہ چپک گئی تھی جو اٹھتی ہوئی لہریں چھوڑ جاتیں ——— ساحل سے دور لشکتے پانی کے اندر کچھ بڑے بڑے سیاہ پتھر تھے۔ اور سمندر کا پانی چڑھتا تو پانی کی گہرائیوں میں یہ کبھی چھپ جاتے اور کبھی نکل آتے۔ کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے پودے جن کے نچلے پتے ہرے ہرے لمبے ریشمی ربنوں کی طرح ہوتا اور اوپر کے پتے نسبتاً چوڑے چکلے ننھے ننھے پھولوں کے ہار سے لدے ہوئے ان پتھروں کے درمیانی خلاؤں کو پر کر رہے چڑھتی لہروں پہ لمبے نچلے پتے لہراتے اور اوپر کی ہوا سے جھومتے ——— سمندری ہوا سے ——— جو اونچے اونچے ناریلوں کے گھرے گھرے کٹے ہوئے پتوں کو چھیڑتی ہوئی ساحل کو اپنی مہک سے رچاتی بساتی نکل جاتی ——— سورج پوری آب و تاب سے جگمگاتا۔ اور کرنیں ساحل پر پھیلی بھوری ریت پر روشنی اور جگمگاہٹ بکھیر دیتی ———

وہ سرخ نیکر پہنے اپنی چھوٹی سی بالٹی اور کھرپا لئے چپ چاپ سمندر کو گھور رہا تھا۔ دور وہ اس کی بالٹی سے بنائے ہوئے چند شکستہ و خستہ اہرام مصر پڑے تھے۔

چھپاک! اس کے منہ پر پانی کی چھینٹیں اڑیں۔ اس نے اپنی ننگی بانہوں سے منہ پونچھا ——— اور پھر مسرت سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ "جل تارا!" کھڑی تھی ——— نصف جسم پانی کے اندر تھا۔ اس نے ایک خوبصورت جھٹکے سے اپنے گیلے سنہرے بالوں کو پیچھے ہٹایا۔ اور ایک معصوم مسکراہٹ اس کے تازہ کنول چہرے کو کھلا گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا تو نوشی نے ہاتھ پکڑ کر اسے بڑے پتھر پر کھینچ لیا۔ اس کے نچلے جسم نے جو سفید ساٹن کی طرح نرم اور چکنا تھا ایک نیم دائرے کی صورت میں پتھر کو جکڑ لیا۔ اور اس کی نگاہیں اس مچھلی نما دھڑ پہ پھسل گئیں۔

"تم اتنی دیر میں کیوں آئیں؟" اس نے پوچھا ——— "میں اکیلے کھیلتے کھیلتے تھک گیا" ——— اس نے برا سا منہ بنایا۔

"اپنا کام پورا کر رہی تھی نا؟ اس لئے"

"تو کیا تمہارے ہاں بھی کام کرنا پڑتا ہے" نوشی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں اور کیا ہم تمہاری طرح پڑھتے لکھتے تھوڑی ہیں ——— مجھے اور میری ساتھی جل پریوں کو سیپیاں ڈھونڈنا۔ موتی نکالنا۔ پھر ان موتیوں کے ہار گوندھنا سکھاتے ہیں۔ ——— اور سمندر کے اندر تیرتے ہوئے ریشمی پودوں کے لمبے لمبے پتوں سے پہننے کے لباس تیار کرنا ——— ہم تو پانی کے باسی ہیں ——— کبھی کبھار پہنتے ہیں ——— کسی خوشی کے دن یا کسی دکھ کے دن ——— یہ ہمارا لباس ہے ——— اور ——— خوشبوؤں کے تاج تیار کرنا ——— اور تارا مچھلیاں پکڑنا ——— جب یہ مچھلیاں بڑی ہو جاتی ہیں تو ان پر سنہرا رنگ کیا جاتا ہے ——— یہ دیکھو! ——— اس نے اپنے بالوں میں اٹکی ہوئی ایک ستارہ نما مچھلی دکھائی "انہیں ڈھونڈتے ہیں" یہاں ساحل کالائیوں کو سجانے کے لئے ——— یہ بڑی اچھی لگتی ہیں نا ——— میں ہمیشہ سے لگی ہوں ——— اور کبھی کبھی تو [illegible]

جانتے ہو جل شہزادوں کو کیا کرنا پڑتا ہے؟ اس نے سوالیہ نظروں سے توشی کو دیکھا۔ اور توشی جو دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ تھامے اس کی باتوں میں کھو گیا تھا چونک گیا! ——— اس کی نگاہیں اس کی نیلی نیلی سمندر جیسی گہرائیاں رکھنے والی آنکھوں سے ہوتی ہوئی سنہرے جسم سے گذرتی ہوئی نچلے مچھلی نما جسم پر ٹک گئیں جو دھوپ میں اس طرح چمک رہا تھا جیسے کہکشاں سے بنایا گیا ہو ——— اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "جل شہزادوں کو سکھاتے ہیں کہ چھوٹی مچھلیوں کو بڑی مچھلیوں سے کیسے بچایا جاتا ہے ——— اور سارے بڑے اور چھوٹے دریائی جانوروں سے محبت کس طرح کی جاتی ہے۔ اور ان کو کس طرح اپنا دوست بنایا جاتا ہے ——— اور سمندر کی سات تہوں کے اندر تک پہونچ کر بڑی بڑی سیپیوں اور موتیوں کے ذخیروں کی تلاش کیسے کی جاتی ہے اور دریائی گھوڑوں کی سواری کیسے کرتے ہیں۔ اور پانی کے محل کیسے بناتے ہیں ——— اور ——— "

" تم مجھے کب لے جاؤ گی؟" وہ بیچ میں بول اٹھا ——— تم کہتی تھیں میں تمہیں ایک دن سمندر کی دنیا کی سیر کراؤں گی "

" ہاں ——— ہاں ——— میں لے چلوں گی کسی دن ——— دادی اماں راضی ہو جائیں ——— کل میں نے اتنا کہا تھا کہ ایک دن میں زمین کے شہزادوں سے ملوں گی، تو جانتے ہو انھوں نے کیا کہا ——— ؟"

" کیا کہا؟"

" وہ بہت بگڑیں تھیں ——— اس کی نیلی آنکھوں میں خوف جھلکنے لگا۔ اور آواز دھیمی ہو گئی۔ وہ کہہ رہی تھیں نہیں جل پریاں زمین کے شہزادوں سے نہیں ملا کرتیں ——— وہ پکڑ لے جاتے ہیں ——— بہت برے ہوتے ہیں " ———

" تو میں برا ہوں؟" اس نے بگڑ کر کہا۔

اور اس نے جلدی سے کہا ——— " نہیں ——— نہیں تم ——— تم بہت اچھے ہو ——— بالکل ان شہزادوں سے ملتے ہو جن کا میری دادی اپنی راتوں کی کہانیوں میں ذکر کرتی ہیں ——— جن کے پیر ہوتے ہیں تب ——— اس نے اس کے پیروں پر نگاہیں جما دیں۔ جو ننھی ننھی لہروں سے کھیل رہے تھے ——— " اور تیز بھی سکتے ہیں۔ وہ بڑے بہادر ہوتے ہیں اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ اور بڑے اچھے اچھے کپڑے پہنتے ہیں ——— اور کسی سے نہیں ڈرتے ——— جبھی تو مجھے زمین کے شہزادوں کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوا ——— اور میں روز صبح اپنے محل کے دریچوں میں کھڑے ہو کر ان کا انتظار کیا کرتی ——— جب سورج کی روشنی پانی کی تہوں میں سے چھن چھن کر ہر طرف نیلاہٹ بکھیر دیتی ——— اور سمندر شہزادہ اور دھنک رنگ دور دور سیر کو نکل جاتے تو میں تمہارا انتظار کیا کرتی تھی ——— زمین کے شہزادے کا ——— " وہ مسکرا دی۔

" تم اپنے سمندر شہزادے کو بھی لایا کرو یہاں " اس نے کہا۔

" نہیں ——— وہ نہیں آئے گا ——— دادی اماں کا حکم بہت مانتا ہے، لاڈلا ہے نا ان کا، مگر بڑا خوبصورت ہے وہ، اس کے بال بہت سنہرے ہیں اور آنکھیں بھی سنہری اور جسم کا رنگ بھی اور اس کے دم کے پر بھی ——— اسے ہم سنہرا شہزادہ بھی کہتے ہیں ——— وہ بے حد خوبصورت ہے تم دیکھو گے تو . . . . . .

اس نے منہ بنا لیا " کون ہے وہ تمہارا تم تو کہہ رہی تھیں ابھی کہ تم زمین کے شہزادوں کی طرح خوبصورت ہو، کیا وہ مجھ سے بھی پیارا ہے؟" ———

اور اس نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا " نہیں ——— وہ تو جل شہزادوں میں سب سے خوبصورت ہے ——— میرا بھائی ہے وہ "

اس نے لمبی ہوں بھری ——— " تمہارے تو پیر بھی ہیں ——— اور تم تو چل سکتے ہو ——— تم زیادہ پیارے ہو " اس نے پیاری پیاری نظروں سے دیکھا ———

" میری امی اور دادی بھی کہتی تھی ——— تم بہت پیارے ہو " اس نے فخر سے سینہ پھیلاتے ہوئے کہا ——— " اور کچھ بتاؤ، وہ دھنک رنگ کون ہے " ——— اس نے مسکراتے ہوئے کہنا شروع کیا ———

" وہ ——— وہ میری بڑی پیاری سہیلی ہے ——— بڑی نٹ کھٹ ——— بہت شریر ——— سب کی چوٹیاں چرا کر مالا گوندھتی ہے اور پہاڑوں کے جنگلوں میں دھکیل دیتی ہے اور کھل کھلا کر ہنس پڑتی ہے ——— یعنی کچھ نہیں کہتا [illegible] سب جانتے ہیں کہ یہ ان کے چرائے ہوئے موتی ہیں، اور ——— اور جانتے ہو اسے دھنک کیوں کہتے ہیں؟

" مجھے کیا معلوم تم ہی بتاؤ " اس نے معصومیت سے کہا۔ اور پھر اس کے چہرے پر سے سنہرے بالوں کے گچھے ہٹا دیئے ——— وہ مسکرا دی ———

محمود علی

جنت کی تلاش

دو ماہ ختم ہو چلے تھے۔ چند روز باقی تھے۔ صرف چند روز۔ جب اسے اس شہر کو خیرباد کہہ کر اس اجنبی دیس کی طرف لوٹ جانا تھا جو اس کے لئے اب اجنبی نہیں تھا۔۔۔ ہاں۔ دس برس پہلے جب اس نے اس دیس کی سرزمین پر پہلا قدم رکھا تھا تو اس کے ذرّے ذرّے سے اسے اجنبیت کی بو آئی تھی لیکن کتنی مہربان تھی وہ سرزمین۔ کتنا شفیق تھا وہ دیس۔۔۔ جس نے جلد ہی اسے اپنی پیار بھری آغوش میں لے لیا تھا۔۔۔ جس نے اس کے سر پر شفقت کا سایہ کیا تھا۔ اس کے گرد سے اٹے ہوئے بالوں کو دھویا تھا۔ اس کی پسینہ سے تر آلود پیشانی کو پونچھا تھا اور اس کے دکھوں غموں کے زخموں سے چکے ہوئے جسم ایک رحم سے بھری نگاہ میں اور درد سے بھرا دل رکھنے والی نرس کی طرح ہمدردی کے مرہم کے پھاہے رکھے تھے۔۔۔ نرم و نازک انگلیوں کے لطیف لمس کے ساتھ رکھے ہوئے ٹھنڈے ٹھنڈے مرہم کے پھاہے۔۔۔ کتنے اچھے ہیں وہ لوگ۔ وہ سوچ رہا تھا۔۔۔ اور یہ شہر یہ جو اس کا اپنا وطن ہے۔۔۔ کبھی تھا۔۔۔ کتنا اجنبی لگا ہے ان دو مہینوں میں۔ اسے لوگ۔ بیگانے بیگانے، مطلبی، خود غرض، کسی نے سچے دل سے اس کی طرف بڑھ کر مسرت کا نعرہ بلند نہیں کیا۔ کوئی اس کی طرف خلوص کے ساتھ بغلگیر ہونے کے لئے نہیں بڑھا۔۔۔ کسی نے پیار سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی! سب بیگانے۔۔۔ سب بیگانے۔۔۔ میں کیوں آیا تھا یہاں۔ دس برس بعد اچانک مجھے یہ کیا سوجھی تھی؟ یہاں میرا کون ہے؟ لیکن وہاں بھی میرا کون ہے؟ مجھے نہ معلوم کس کی تلاش ہے؟

ان دو ماہ میں وہ کہاں کہاں نہیں گھوما؟ دولت اس کے پاس کافی تھی۔۔۔ وہ اونچے اونچے ایوانوں میں بھی گیا۔ عالیشان ہوٹلوں میں بھی ٹھہرا۔ اس نے پرتکلف کھانے بھی کھائے۔ اف! کیا ماحول تھا وہ کیا وہ دس برس پہلے اس کا تصور بھی کر سکتا تھا! وہ جو راتوں کو ریلوے پلیٹ فارم کے مسافرخانوں میں بھٹکا کرتا تھا۔ وہ جس کو خلق خدا کبھی کسی سڑک کے کنارے سویا ہوا پاتی تھی کبھی کسی باغ کی بینچ پر۔ (جہاں سے پولیس والوں کے ڈنڈے اسے پھر کسی فٹ پاتھ کا رخ کرنے پر مجبور کر دیتے تھے) ۔۔۔ اسے دو وقت کی روکھی سوکھی بھی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ اسے جاڑوں میں گرم کپڑا اور گرمیوں میں برف کا ٹھنڈا پانی تک میسر نہیں تھا۔

اور اب! وہ اسی شہر کے سب سے اونچے درجے کے ہوٹل میں مقیم تھا۔۔۔ اس کی تیسری منزل پر۔۔۔ نرم گدیلے بستر۔ خوشنما پردے۔۔۔ پھلدار تصویروں والی دیواروں کا خوبصورت کمرہ۔ چھری کانٹوں۔ چاندی اور چینی کے برتنوں سے سجی میزیں اور ان پر چنے ہوئے طرح طرح کے کھانے۔۔۔ اونچی سوسائٹی کی عورتوں کی سیر۔ کوٹھیوں اور بنگلوں کی دعوتیں۔ رت جگے۔ نت نئی محفلیں۔ ڈانس۔ تھیٹر۔ سینما۔ ریس کورس۔ ساحل سمندر اور عورتیں۔۔۔ عورتیں۔۔۔ عورتیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر اس کے قدموں میں بچھی جاتی ہوں۔

سب بیگانے۔۔۔ سب بیگانے۔ وہ ان چیزوں سے بہت جلد اکتا گیا۔ بہت جلد اس پر اس ماحول کا فریب واضح ہو گیا۔ یہ سب ملمع ہے۔ سب تصنع ہے۔ سب دکھاوا ہے۔

تو پھر اسے اور کس کی تلاش ہے؟ دولت۔۔۔ جو اس نے ان دس برسوں میں خون پسینہ ایک کر کے کمائی تھی۔۔۔ اس کے پاس بہت تھی۔۔۔ وہ اس اونچے ماحول سے تنگ آ گیا تھا۔ کتنے نقلی ہیں یہ لوگ۔ دیکھ لیا ہے کہ ایک سیٹھ نوٹوں سے بھرا ہوا۔۔۔ بھری ہوئی جیب

سید محمد احمد سعید

فریبِ غمِ زیست

کیوں مری تشنگیٔ شوق کا افسانہ لیے
رات صہبائے جوانی سے لپٹتی ہی رہی
چشمِ بے خواب متاعِ مے جانانہ لیے
عہدِ رفتہ کے فسانوں پہ چھلکتی ہی رہی

زندگی سوزِ مسلسل میں بدلتی ہی رہی
جھلملاتے رہے غم خانۂ مفلس کے دیے
اور جوانی شبِ تاریک کی ڈھلتی ہی رہی
اپنی مجبوریٔ فطرت کو نیا روپ دیے

بجھ چلی رات کے ایواں میں چراغوں کی قطار
اور ہم کیوں اسی امید پہ جیتے ہی رہے
ہے ابھی وقت بہت۔ آئے گی وہ جانِ بہار
دُردِ ساغر بھی بڑے شوق سے پیتے ہی رہے

آخرِ شب کے ستاروں کے بھی دل ڈوب گئے
آخری شمعِ فسردہ کو بھی نیند آ ہی گئی
سیلِ جذبات میں آنکھوں کے کنول ڈوب گئے
یاس امید سے اس راہ پہ ٹکرا ہی گئی

کٹ گئی رات گئی زیست کی صہبا کا خمار
صبح آئی بھی تو پینے کی ادا بھول گئے
اور گھٹنے لگا خم خانۂ ہستی کا وقار
تشنہ لب رند بھی ساقی کی صدا بھول گئے

مل کے گو مٹ تو گئے محفلِ برہم کے نقوش
پھر بھی باقی ہیں ابھی حسرت و حرماں کے نشاں
ثبت ہیں ذہن پہ ناکامیِ پیہم کے نقوش
مُہر ہیں جسم پہ مجوں نابیِ داماں کے نشاں

کیوں ہے تصویر وہی عہدِ گذشتہ کی ابھی
اب تو ماضی کے دھندلکوں میں کوئی رنگ نہیں
کیوں خلش سی ہے وہی عہدِ شکستہ کی ابھی
آج پہلا سا شگفتہ تو دلِ تنگ نہیں!

ذہن تھک ہار کے لے دوست سکوں پاتا ہے
تیرگی رات کے دامن میں سمٹ جاتی ہے
دل پراگندہ خیالات میں کھو جاتا ہے
روح رنگینیِ ماضی سے لپٹ جاتی ہے

آج بھی نیرِ مشرق کی وہی پہلی کرن
شبستانِ خیالات سے ٹکراتی ہے
اور بڑھ جاتی ہے رہ رہ کے مرے دل کی جلن
بھولی بسری جو کہانی کوئی یاد آتی ہے

ختم ہو جاتا ہے پل بھر میں فریبِ شب روز
میں لپٹ جاتا ہوں پھر رات کی تنہائی سے
اور بڑھ جاتا ہے کچھ روح میں نغمات کا سوز
عہدِ رفتہ کی سلگتی ہوئی شہنائی سے

کچھ بھی ہو پھر بھی حسیں ہے یہ فریبِ غمِ زیست　　گو بہانہ ہے بہانا تو ہے جینے کے لئے
تلخ ہے ساغرِ ہستی میں متاعِ غمِ زیست　　پھر بھی ساغر کو اٹھانا تو ہے پینے کے لئے

رئیس فروغ

کارِ جنوں

مصلحت سے نہیں کچھ ذوقِ طلب کو پیوند
دلِ پُرشوق جوان و سرِ پُرشوق بلند

روزِ روشن میں سرِ کوئے بتاں پہونچے ہیں
شبِ مہتاب میں پھینکی ہے دریچوں پہ کمند

ہم نے اے جراتِ رندانہ! بہت کھیلے ہیں
دستِ بیباک و خمِ کاکلِ دلدار کے کھیل
نکہت آمیز فضاؤں میں لب و رخسار کے کھیل

کبھی سمٹے ہوئے جسموں سے ردا کھینچی ہے
کبھی سہمے ہوئے چہروں سے اُٹھائے ہیں نقاب

کہیں خوابیدہ بہاروں کو کیا ہے بیدار
کہیں نادیدہ نظاروں سے ہٹائے ہیں حجاب

کارِ یارانِ جنوں پیشہ نہیں ختم ہنوز
کچھ نظاروں کی بہاریں ابھی خوابیدہ ہیں
کچھ بہاروں کے دریچے ابھی نادیدہ ہیں

صبا اکبرآبادی

دوزخ

ہجر:-

وہ شامِ ہجر کے مہلک نظارے
وہ کالی چاندنی خونیں ستارے

عذابِ زندگی وہ اپنے اوقات
جہنم کی سحر اور قبر کی رات

وہ سوکھے پھول وہ پژمردہ کلیاں
وہ ویرانہ سا گھر جنگل سا بستاں

وہ دورِ نزع کی سی زندگانی
وہ بے حس عمر وہ بوڑھی جوانی

وہ بے رنگ آسماں وہ خشک برسات
وہ سوکھا ابر وہ افسردہ جذبات

وہ خون آلود زہریلی ہوائیں
وہ صحنِ باغ کی اُجڑی فضائیں

معاذ اللہ وہ نیرنگِ ایام
قیامت کا سا دن ظلمات سی شام

وہ بے امید دل بے مدعا غم
وہ بے میت کے اپنے گھر میں ماتم

وہ آنسو اور وہ ذوقِ اشکباری
وہ آہیں وہ مذاقِ جاں سپاری

لہو اُبلا ہوا اشکِ رواں میں
وہ ٹکڑے دل کے چشمِ خونفشاں میں

خدا لائے نہ وہ دورِ جدائی
جئے اس طرح جیسے موت آئی

وصل:-

وہ آئے ہیں تو اب بدلی ہو دُنیا
ہوئی موجِ ہوا بھی موجِ صہبا

معطر شام ہے راتیں جواں ہیں
سحر رنگیں ہے دن گلفشاں ہیں

سنہری ہو رہی ہے چاندنی رات
جواں ہونے لگے خاموش جذبات

اُمید انگڑائیاں لینے لگی ہے
تمنا چٹکیاں لینے لگی ہے

جوانی جوش پر آئی ہوئی سی
نظر پہ مستیاں چھائی ہوئی سی

پیامِ سرخوشی لاتے ہیں بادل
مئے انگور برساتے ہیں بادل

چنبیلی کی صباحت بڑھ گئی ہے
شگوفوں کی نزاکت بڑھ گئی ہے

فضائے باغ ہے جنت در آغوش
خیاباں در خیاباں جوش در جوش

جوانی۔ نوجوانی بن گئی ہے
شبِ ہجراں کہانی بن گئی ہے

نگاہیں جلوۂ ایمن سے معمور
اتر آیا ہے دل میں شعلۂ طور

صبا یوں ہی گذر جائیں تو اچھا
اسی عالم میں مر جائیں تو اچھا ہے

امیر مینائی

نکلی ہے حور خلد سے گھونگھٹ نکال کے
گرما رہے ہیں برق کو جلوے جمال کے

چوٹی بندھی جو کھینچ کے چڑھیں اور تیوریاں
ڈالی بھووں پہ گیسوؤں سے بل نکال کے

پھیری نگاہ تم نے، میں دیوانہ ہو گیا
پہنا دو طوق گردش چشم غزال کے

بھرتا نہیں ستم سے دل اس کا کسی طرح
ملتا ہے چٹکیوں میں کلیجا نکال کے

آئی ادھر سحر کہ اُدھر شام ہو گئی
دو دو گھڑی کے ہونے لگے دن وصال کے

افشاں میں گر حریف کرے ماہوش مرا
دے دوں میں اپنی آنکھوں سے تارے نکال کے

یہ ناتواں ہوئے کہ سبک ہو گئے امیر
ہم ساتھ ساتھ پھرتے ہیں اپنے خیال کے

مرسلہ
پروفیسر کریم الدین احمد

شاہ ولی الرحمٰن ںتحاکوی

محبت میں جنوں کی حیرت افزا ہے فسوں کاری
خودی ہے بیخودی میری، مری مستی ہی ہشیاری

جرس کے شور سے بھی قافلے میں کیا ہو بیداری
ہے میر کارواں پر خود ابھی خوابِ گراں طاری

شبِ تارِ گماں میں ہے یونہی صبحِ یقیں تاباں
فروزاں جس طرح ہو راکھ کے تودے میں چنگاری

اگر ناز اُن کو میرے عشق پر ہے حق بجانب ہے
مرے جوشِ تمنا سے ہے اُن کی گرم بازاری

طریقِ عشق میں ذوقِ عمل ہے ضامن منزل
جو بڑھنے سے ہے آسانی تو رُکنے سے ہے دشواری

مرے ظلمت کدے کی رات پر اب دن کا دھوکا ہے
تبسم نے کسی کے کی ہے ایسی آئینہ کاری

ولی کیوں منحصر ہو موسم گل پر تری وحشت
مزہ جب ہے کہ ہو فصل خزاں میں بھی جنوں طاری

نشورؔ واحدی

○

کبھی جھوٹے سہارے غم میں راس آیا نہیں کرتے
یہ بادل اُڑ کے آتے ہیں مگر چھایا نہیں کرتے

چراغِ مہر و مہ جلتے ہیں تابندہ فضاؤں میں
جو خود روشن نہیں، وہ روشنی پایا نہیں کرتے

یہی کانٹے تو کچھ خوددار ہیں سارے گلستاں میں
یہ شبنم کے لئے دامن تو پھیلایا نہیں کرتے

ہمیشہ قافلے امید کے کرنوں کی زد میں ہیں
شجرہائے تمنا راہ میں سایا نہیں کرتے

نہیں معلوم کتنے کھو گئے کوئے تمنا میں
فریبِ زندگانی سب کو راس آیا نہیں کرتے

سلیقہ جن کو ہوتا ہے غمِ دوراں میں جینے کا
وہ یوں شیشے کو ہر پتھر سے ٹکرایا نہیں کرتے

جو قیمت جانتے ہیں گردِ راہِ زندگانی کی!
وہ ٹھکرائی ہوئی دنیا کو ٹھکرایا نہیں کرتے

قدم میخانہ میں رکھنا بھی کارِ پختہ کاراں ہے
جو پیمانہ اٹھاتے ہیں وہ تھرّایا نہیں کرتے

نشورؔ اہلِ زمانہ بات کرتے ہیں زمانے کی
وہ شاعر ہیں جو حق کہنے میں شرمایا نہیں کرتے

[illegible] کراچی

خالد میاں

جتنا بھی ستم ہو دلِ مشتاق پہ، کم ہے
راحت مری قسمت میں باندازۂ غم ہے

بے وجہ تو غم دوست نہیں ہے دلِ آدم
منظور تہیں پرورشِ لوح و قلم ہے

بے سجدہ کناں ہم کو تری رہ سے گذرنا
آثارِ جہاں سلسلہ نقشِ قدم ہے

لرزاں ہیں دو عالم ترے آگے سرِ محشر
سرمایۂ تقریر فقط لا و نعم ہے

انعام ہے جو عمر تری یاد میں کٹ جائے
جو دم بھی ترے غم میں گذر جائے کرم ہے

ہے تیری غلامی میں بہت مجھکو فراغت
اس در کا گدا ہمسرِ اسکندر و جم ہے

جھک کر جو اٹھی چشم گہربار تو خالد
دیکھا کہ بھری بزم میں جو آنکھ ہے نم ہے

یوسف جمال انصاری

خم کے خم کھول دیے ہیں مست گھٹا نے ساقی
سر بمہر اب بھی ہیں صہبا کے خزانے ساقی

ابر پاروں نے بہم چھیڑ دیا میگھ ملہار
بانسری بڑھ کے اٹھا لی جو صبا نے ساقی

دیکھ بادل سرِ میخانہ امڈ آتے ہیں
تیری پازیب کی جھنکار چرانے ساقی

وہ جو پردے میں صراحی کے چھپی بیٹھی ہے
دل کو لوٹا ہے اسی جانِ حیا نے ساقی

جرسِ قافلۂ وقت کے لب پر ہے وداع
مغتنم جان یہ مستی کے زمانے ساقی

بات جب ہے کوئی محروم نہ رہنے پائے
تشنہ لب کتنے ہیں محفل میں نہ جانے ساقی

کوئی مجھ سا بھی ہے محنت کش و آوارہ نصیب؟
قیس و فرہاد کے قصے ہیں پرانے ساقی

اطہر حسین نادر

چلے گئے تھے تری بزم سے جو اکتا کر
ترے حضور پھر آئے ہیں دل کو سمجھا کر

علاجِ گردشِ لیل و نہار کیا ہو
کسی کے وعدۂ فردا سے دل کو بہلا

زمانہ بیت گیا تیری جستجو کرتے
الجھ گیا ہوں غمِ زندگی کو سلجھا کر

رخِ حیات سے چھپتی نہیں ہے گرد ملال
ترے کرم کا فسانہ بھی دیکھا دہرا کر

اب ان سے ترکِ تعلق کے بعد کچھ بھی ہو
خرد کی بات تو رکھ لی جنوں کو ٹھکرا کر

یہ بیخودیٔ محبت بھی خوب ہے نادر
کہ خود کو بھول گیا ہوں میں ان کو اپنا کر

○

دل و نگاہ کا شیرازہ منتشر ہی رہا — یہ دور منتظرِ سعیِ چارہ گر ہی رہا

مہ و نجوم کا اندیشۂ سحر ہی رہا — ترا جمال بہر رنگ جلوہ گر ہی رہا

کوئی تو بات ہے آخر ترے فسانے میں — ہزار بار سُنا پھر بھی تازہ تر ہی رہا

ادھر کا حال زمانے پہ آشکار ہے — خدنگِ گردشِ ایام کچھ ادھر ہی رہا

رہِ طلب میں قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا — ترے نثار ترا شوق راہبر ہی رہا

خرد نے لاکھ دلائل دیئے مگر پھر بھی — حضورِ دوست جنوں حرفِ معتبر ہی رہا

ٹھہر سکا نہ کہیں کاروانِ شوق و جنوں — دل و نگاہ کو درپیش اک سفر ہی رہا

یہ دَور دورِ ہوس ہی سہی مگر پھر بھی — دلوں کا فیصلہ محتاجِ یک نظر ہی رہا

دبی دبی سی رہی شمعِ آرزو کی لو
دلوں کو وسوسۂ فکرِ خیر و شر ہی رہا

چہ دلاوراست

ادبی سراغ رساں نے جب ترغیبات جنسی کے سلسلے میں حضرت نیاز فتحپوری کا ذکر "چہ دلاوراست" کے تحت کیا تھا تو مشہور نقاد خواجہ احمد فاروقی صاحب نے لکھا کہ "اردو حضرت نیاز کی ہے"۔ ادبی سراغ رساں حضرت نیاز کے ادبی مرتبہ سے آگاہ ہے اور مدتوں اُن کے اسلوب کا اسیر رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ نیاز صاحب نے اوریجنل چیزیں بہت کم لکھی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہر صنف ادب اور علم کے ہر شعبہ میں انھوں نے اپنے نقوش [illegible] والوں کو متاثر کرنے کی کوشش کی۔ کبھی مذہب پر لکھا کبھی تاریخ پر، کبھی جنسیات پر قلم اٹھایا اور کبھی نفسیات پر۔ نتیجہ کے طور پر نیاز صاحب کو نقصان پہنچا اور [illegible] ادبی صلاحیتوں سے زیادہ استفادہ نہ کرسکے اور اب صورت حال یہ ہے کہ "چہ دلاوراست" کے سلسلے میں نیاز کا دش کی ضرورت نہیں۔ کسی بھی [illegible] کو اوریجنل کہا جائے تو تلاش کرنے والے کو ناکامی نہ ہوگی۔

ولیم ہنری ہڈسن کی کتاب AN INTRODUCTION TO THE STUDY OF LITERATURE انگریزی کی مشہور و معروف تنقیدی کتاب ہے، مگر اس کا ترجمہ کیا ہے؟۔ وہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ بدقسمتی یہ کہ اردو کے بہت سے نقادوں نے اس کتاب کو اپنی "بائبل" بنا لیا۔ اور اس سے اس درجہ استفادہ کیا کہ سرقہ کی حدوں کو جا چھوا، ان نقادوں میں حضرت نیاز اور جناب حامد اللہ افسر شامل ہیں۔ ایک باخبر دوست تو جناب اعجاز بٹالوی کو بھی اس صف میں شامل سمجھتے ہیں۔ یہ تو جملہ معترضہ ہوا۔ اس وقت گفتگو جناب نیاز فتحپوری کی ہو رہی ہے۔

حضرت نیاز انگریزی سے اس قدر واقف ہیں کہ انگریزی تصانیف کا ترجمہ کرکے اُن پر اپنا نام ڈال دیتے ہیں مگر کسی موضوع کے متعلق انھیں یہ نہیں معلوم کہ اس موضوع پر مستند لکھنے والے کون کون ہیں؟ ورنہ وہ ٹی۔ایس۔ ایلیٹ، ہکسلے اور رچرڈسن وغیرہ کی بھی خوشہ چینی کرتے اور یہ زیادہ بہتر ہوتا۔ اُن کے حق میں بھی اور پڑھنے والوں کے حق میں بھی۔

"انتقادیات" حضرت نیاز فتحپوری کی بڑے معرکہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ یہ کتاب دو حصوں میں ہے۔ انتقادیات کے دوسرے حصہ میں ایک مضمون ہے "ادبیات اور اصول نقد" (از صفحہ ۲۶۵ تا ۲۸۷)۔ اس مضمون کے دو حصے ہیں: "ادبیات" اور "اصول نقد"۔ پہلا حصہ کُل گیارہ صفحات پر محیط ہے۔ پہلا حصہ ہڈسن (HUDSON) کی مذکورہ بالا کتاب سے تمام و کمال اڑا لیا گیا ہے اور غریب مصنف کا نام صرف صفحہ ۲۶۷ پر ایک جگہ برسبیل تذکرہ آگیا ہے۔ نیاز صاحب نے اس کے ٹکڑے اِدھر اُدھر چسپاں کرکے اپنا کام چلایا ہے۔ دوسرے مغربی نقادوں کے جو حوالے نیاز صاحب نے دیئے ہیں وہ بھی ہڈسن کے یہاں سے لئے گئے ہیں اور براہ راست مطالعہ کا نتیجہ نہیں۔ اُن حوالوں کی ترتیب اور پیش کش سے بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ "زمین التحریر" کا سلیقہ بھی "ادبی چوری" کے چہرہ پر "نقاب" نہ بن سکا۔

"نیمروز" کے اس دبلے پتلے نمبر میں اتنی گنجائش نہیں کہ زیادہ حوالے دیئے جا سکیں۔ بہرحال چند حوالے پیش کئے جاتے ہیں۔ انھیں پھولوں سے "گلستاں" کا قیاس کیجئے۔

A GREAT BOOK GROWS DIRECTLY OUT OF LIFE; ایک قابل قدر کتاب براہ راست زندگی سے

[illegible] ARE BROUGHT INTO [illegible] پیدا ہوتی ہے کہ اس کے مطالعے [illegible]

WITH LIFE.

...ہو جائیں گے"

(HUDSUN PAGE 10)

LITERATURE IS A VITAL RECORD OF WHAT MEN HAVE SEEN IN LIFE, WHAT THEY HAVE EXPERIENCED OF LIFE..... IT IS THUS FUNDAMENTALLY AN EXPREISION OF LIFE THROUGH THE MEDIUM OF LANGUAGE

(Page 10)

(انتقادیات صفحہ ۲۷)

ادب حقیقتاً ایک ریکارڈ ہے ۔ ان تمام تجربات و احساسات کا جن سے ایک انسان اپنی زندگی میں دوچار ہوتا ہے ۔ گویا بہ الفاظ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ ادب زندگی کا اظہار ہے الفاظ کے ذریعہ سے ......

(انتقادیات صفحہ ۲۷)

اوپر جو اقتباسات دیئے گئے، وہ حضرت نیاز اور ہڈسن کے یہاں بہت قریب قریب ہیں ۔ اگر یہ ترجمہ نہیں تو پھر ہم ترجمہ کسے کہیں گے ۔ "ایک قابلِ قدر کتاب براہ راست زندگی سے پیدا ہوتی ہے" یہ جملہ ہی پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں ترجمہ ہوں، ورنہ نیاز ایسی غیر مانوس اور کڈھب اردو نہیں لکھ سکتے ۔ نیاز صاحب نے اپنا دامن بچانے کی کوشش میں ہڈسن کے ساتھ مزید ظلم کیا ہے ورنہ وہ "great" کا ترجمہ "قابلِ قدر" کی جگہ "عظیم" کرتے ۔ ہم یہ عرض کرنے کی جرأت کیسے کر سکتے ہیں کہ نیاز صاحب "great" اور "vital" کا ترجمہ کرنے پر قادر نہیں ۔

جو اقتباسات اوپر پیش کئے گئے وہ تو صاف صاف ترجمہ ہیں ۔ کئی اور حصوں کا بھی نیاز صاحب نے ترجمہ کیا ہے مگر ذرا آزاد ترجمہ ۔ اگر ہڈسن نے کسی انگریزی کتاب کی مثال دی ہے تو نیاز صاحب نے اردو کتاب کی مثال دیدی ۔

نیاز صاحب کے مضمون اور ہڈسن کی کتاب کی ابتدا "لٹریچر" کی تعریف اور حدود سے ہوتی ہے ۔ ہڈسن کا ترجمہ کرتے ہوئے نیاز صاحب لکھتے ہیں کہ "ادبی اور غیر ادبی کتابوں کے درمیان ہمیں خطِ امتیاز کھینچنا ضروری ہے ۔" یہ خطِ امتیاز ہڈسن کی BOUNDARY LINE کا ترجمہ ہے ۔ اب ذرا آگے دیکھئے ۔

"WE SHOULD ALL AGREE ABOUT THE PLACE TO WHICH, FOR EXAMPLE, A RAILWAY GUIDE OR A MANNUAL OF COOKERY, PARADISE LOST OR SORTOR RESARTUS SHOULD RESPECTIVELY BE ASSIGNED." Page 9.

"ظاہر ہے کہ ہم ایک کھانا پکانے کی ترکیبیں بتانے والی کتاب اور دیوانِ غالب کو ایک ہی درجہ نہیں دے سکتے اور ان کے درمیان کوئی فرق کرنا پڑے گا ۔"

(انتقادیات صفحہ ۲۲۶)

گزشتہ سطور میں یہ بات عرض کی گئی ہے کہ دوسرے ناقدوں اور مصنفوں کے جو حوالے نیاز صاحب نے دیئے ہیں وہ بھی ہڈسن کی خوشہ چینی کا نتیجہ ہیں ، براہ راست مطالعہ سے ان کا تعلق نہیں ۔ یہ بات ایک اقتباس سے واضح ہو جائے گی ۔

SHALL WE FOLLOW CHARLES LAMB, WHO NARROWED THE CONCEPTION OF LITERATURE TO SUCH AN EXTENT THAT HE EXCLUDED THE WORKS OF HUME, GIBBON ... TOGETHER WITH DIRECTORIES..... SHALL WE ADOPT THE VIEW OF HALLAM, WHO, UNDER THE GENERAL HEAD OF LITERATURE, COMPRISED JURISPRUDENCE, THEOLOGY AND MEDICINE? (P. 9-10)

"چارلس لیمب نے ادبیات کو اس قدر محدود کر دیا ہے کہ اس میں ہیوم اور گبن کی تصانیف بھی داخل نہیں ہو سکتیں ، برخلاف اس کے ہلم نے ادبیات میں قانون، مذہبیات اور طب سبھی کو شامل کر لیا ہے ۔" (انتقادیات صفحہ ۲۲۶)

... علامہ نیاز فتحپوری نے مشرقی علم کا جو مظاہرہ کیا ہے اس کا اندازہ مندرجہ بالا اقتباسات سے ہو سکتا ہے ... اقبال کے ... افکار و تخیل کی ... گدائی ... کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

میں لکس ٹائیلٹ صابن
استعمال
کرتی ہوں
مسرت نذیر
کہتی ہے
LUX
TOILET SOAP
ستاروں کا حسن بخش صابن

سالنامہ

مہر نیمروز

جنوری ۵۸ء

جلد ۳

شمارہ (۱)

ترتیب

حسن مثنیٰ ندوی
ابوالخیر کشفی
علی اکبر قاصد

منتظم۔ شاہ محمد حسانی
پرنٹر حسن مثنیٰ ندوی
پریس انجمن پریس کراچی
کتابت ادارہ فیض الکتابت کراچی

قیمت سالانہ چھ روپے
سالنامہ بارہ آنے

فون نمبر [illegible]
دفتر [illegible]

ہندوستان میں ارسال زر کا پتہ :- شاہ محمد زید خانقاہ سلیمانیہ پھلواری شریف پٹنہ

پہلی کرن

بین الاقوامی اسلامی مذاکرہ

دسمبر کے اواخر اور جنوری کے اوائل میں لاہور میں بین الاقوامی اسلامی مجلس مذاکرہ کے اجلاس کئی دن تک ہونے والے ہیں۔ بہت سے ملکوں سے مستشرقین اور علماء و مفکرین اس مذاکرہ میں شرکت کرنے کے لئے تشریف لائے ہیں، پاکستان کے علماء، ادبا، مورخین اور محققین بھی اس میں شرکت کر رہے ہیں۔ گزشتہ سال ایسا ہی ایک مذاکرہ امریکہ میں منعقد ہوا تھا۔ اس مرتبہ حکومت پاکستان اور پنجاب یونیورسٹی نے مذاکرہ کے انعقاد کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے تاکہ "اسلامی ماحول میں اسلامی مسائل و علوم اور مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت پر غور کیا جا سکے"۔

اس مذاکرہ کے سلسلہ میں جو خبریں ہم تک پہنچی ہیں، وہ خوش آئند نہیں۔ اور ویسے بھی اُن خبروں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں، ہم تو مذاکرہ کے منتظمین، پاکستانی مندوبین، پریس اور زندہ دلان لاہور کی توجہ ایک اہم مسئلہ کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

اس مذاکرہ میں شامل ہونے والے مستشرقین اور علماء نے اپنے مقالے منتظمین کو بھیج دیئے ہیں۔ مستشرقین اپنے مقالے اپنی مادری زبان میں پڑھیں گے اور شرکاء کے لئے انگریزی، عربی اور فرانسیسی زبانوں میں ان کے ترجمے کرائے جا رہے ہیں ـــ اردو زبان کو ایک مرتبہ پھر نظرانداز کیا گیا ہے، اس زبان کو جو سارے پاکستان کی قومی اور سارے برعظیم کی علمی زبان ہے، جسے ہم سب نے اور اہل پنجاب نے خاص طور پر عہد حاضر میں ایک وسیع اور رفیع زبان بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔

پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر میاں افضل حسین کے ہوتے ہوئے اس قسم کا فیصلہ کوئی حیرت ناک بات نہیں ہے ـــ بلکہ اگر اس کے برعکس ہوتا تو ہمیں اس "کافر" کے "مسلمان" ہونے پر ایک مسرور انگیز حیرت ہوتی۔

اردو زبان ویسے تو دوسری زبانوں کی طرح اپنا کوئی "مذہب" نہیں رکھتی لیکن جس مفہوم میں ہم عربی، فارسی اور ترکی وغیرہ کو "اسلامی زبانیں" کہتے ہیں اُس مفہوم میں اردو بھی ایک اسلامی زبان ہے ـــ آج اگر کوئی مستشرق یا عالم صرف عربی، فارسی اور ترکی کے مطالعہ کے بعد اسلام یا مسلمانوں کے نئے رجحانات پر کچھ لکھے گا تو اس کی یہ کوشش یقیناً ادھوری ہوگی اور اس کے اخذ کردہ نتائج گمراہ کن ہوں گے۔ اس کی مثالیں مستشرقین کی ہر کتاب میں ملیں گی۔

گزشتہ ڈیڑھ دو سو سال میں جو ذہنی اور فکری تحریکیں برعظیم میں اُٹھیں اُن کی مثال کسی اور اسلامی ملک میں نہیں ملتی۔ ایک طرف تو شاہ ولی اللہ، حضرت اسمٰعیل شہید اور سید احمد بریلوی جیسی شخصیتیں ہمیں علم و عمل کے میدان میں نظر آتی ہیں دوسری طرف ۱۸۵۷ء کے بعد دارالعلوم دیوبند، مدرسۃ العلوم علی گڑھ، مجلس ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسے ادارے وجود میں آئے۔ انہیں اداروں کے ساتھ مولانا سر سید احمد خاں، مولانا قاسم نانوتوی جیسے اکابر ہماری قومی زندگی کے اسٹیج پر دکھائی دیتے ہیں۔ سر سید احمد خاں نے مذہب عقل اور علوم و فنون میں جو رشتہ پیدا [illegible] کی یاد دلاتا ہے جب مسلمان پہلے پہل فکر یونانی سے دوچار ہوئے تھے۔ یہ کہانی بہت طویل ہے۔ حالی، شبلی، شاہ سلیمان پھلواروی، شیخ الہند محمود حسن، آزاد سبحانی، سید سلیمان ندوی، اقبال .... اسلم جیراجپوری، حسین احمد مدنی، شبیر احمد عثمانی، ابوالکلام آزاد، ابوالاعلیٰ مودودی اور غلام احمد پرویز وغیرہ وغیرہ ان سب کی کوششوں اور غور و فکر نے عہد حاضر میں "الٰہیات" کے موضوع

کو پہلے سے کہیں زیادہ وسیع اور ہمہ گیر بنا دیا۔ ایسی ہمہ گیر شخصیتیں کسی اور اسلامی ملک میں نہیں ملیں گی۔ ان تمام حضرات نے اور ان کے علاوہ رفقائے دارالمصنفین، انجمن ادارۂ ثقافتِ اسلامی وغیرہ نے اردو زبان ہی کو اپنے خیالات کے اظہار کے لئے مناسب و موزوں پایا۔ ان کے مطالعہ کے بغیر آج کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ اسلام کے جدید رجحانات سے واقف ہے۔

اسلامی علوم و افکار سے مالا مال زبان کو اسلامی مجلس مذاکرہ سے یوں شہر بدر کرنا ہماری غلامانہ ذہنیت کی بدترین مثال ہے۔ یہی تو وہ موقع ہے جب ہم مغربی علماء کی توجہ اردو زبان کے اسلامی ادب کی طرف مبذول کرا سکتے ہیں۔ ہمیں معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی ہے کہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اسی موضوع پر اسلامی مذاکرہ میں اپنا مضمون پڑھیں گے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہوا ہے کراچی سے اسلامی مذاکرہ میں شرکت کرنے والے اصحاب میں پرویز صاحب، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر امیر حسن صدیقی، ماجد غلام سرور اور علامہ عبدالعزیز میمن شامل ہیں — ہم ان تمام حضرات سے خاص طور پر درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس مذاکرہ میں اپنے مقالات اردو زبان میں پڑھیں۔ اور جس وقت یہ لوگ اردو میں اپنے مقالات پڑھ رہے ہوں اس وقت مقالوں کے عربی، انگریزی اور فرانسیسی ترجمے غیر ملکی علماء کے ہاتھوں میں ہوں۔ اسی طرح ہم ساری دنیا کے عالموں کو یہ بتا سکتے ہیں کہ پاکستان کی اپنی ایک قومی اور علوم و افکار کی دولت سے مالا مال زبان بھی موجود ہے۔ اور وہ زبان تمام علمی مسائل و مباحث کو ادا کرنے پر قادر ہے۔ پاکستان کے دوسرے تمام مندوبین سے بھی ہم یہی درخواست کرتے ہیں۔ اگر ہمیں اُن کے نام معلوم ہوتے تو یہ درخواست نام بنام کی جاتی۔

پاکستانی مندوبین کے علاوہ ہم مشہور مستشرق جناب اسکندر بوسانی (نمائندۂ اطالیہ) سے بھی التماس کرتے ہیں کہ وہ بھی اردو میں اپنا مقالہ پڑھ کر "فرنگی ماب پاکستانیوں" (یہ ترکیب خود بوسانی صاحب کی ہے) کے سامنے اردو زبان کی عالمگیر حیثیت کو واضح کر دیں اور انہیں "تماشائے عبرت" بنا دیں۔

یہ شمارہ :-

مہر نیمروز نے اپنی زندگی کا ایک اور سال پورا کر لیا۔ زیر نظر شمارہ کو دوسری سالگرہ کا تحفہ سمجھئے۔

اس شمارے میں پانچ مقالے پیش کئے جا رہے ہیں —— مقالہ نگاروں میں پروفیسر کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بھی شامل ہیں — ان دونوں حضرات نے عرصے کے بعد کرم فرمایا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی "شبلی" ہر پسند کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ہر تقابلی مطالعہ بحث کا موضوع ہو سکتا ہے۔ "ترقی پسندوں کی روایت پرستی" شہاب جعفری صاحب کے اس مضمون کا جواب ہے جو مہر نیمروز میں شایع ہوا تھا۔ فرمان فتح پوری نے بہت کم مدت میں اہل نظر کو اپنی طرف توجہ کر لیا — ان کا تحقیقی ذوق نئے لکھنے والوں میں مشکل سے نظر آئے گا۔

مہر نیمروز کتابوں پر تبصرے شایع کرتا رہا ہے لیکن اب نئی کتابوں پر مضامین کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اس سلسلہ کا آغاز فرماتے ہیں۔ اگلے شمارہ میں "نذر داغ دل" پر پروفیسر حبیب اللہ غضنفر کی عالمانہ تحریر ملاحظہ فرمایئے۔

اس شمارہ میں بہار اردو کے متعلق پروفیسر بوسانی کا مقالہ فخر کے ساتھ پیش کرتے ہیں پروفیسر بوسانی مغرب کے واحد مستشرق ہیں جو اردو میں لکھتے ہیں۔ شاہ سلیمان پھلواری کا مضمون عہد حاضر کے علماء سے کسی عملی قدم کا منتظر ہے .... اور یہ مضمون ۱۹۴۵ء میں لکھا گیا تھا۔

تخلیقی نظموں اور افسانوں کے حلقے بھی ہمارے پڑھنے والوں کو مایوس نہ کریں گے۔ ہم نے نئے لکھنے والوں کو زیادہ نمائندگی دی ہے تاکہ ادب میں

نئی آواز محسوس کی جا سکے ——— یہ نئے لکھنے والے اردو ادب کے مستقبل کی ایسی ضمانت ہیں جس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

اب ایک معذرت پیش کرنی ہے — نومبر میں مہرِ نیم روز طلوع نہ ہو سکا ——— اس مہینے کو آپ سورج گہن سمجھ لیجئے — لیکن سورج کا طلوع اس کے طلوع کی نوید ہوتا ہے۔ ہم یہ نمبر عملی معذرت کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔

یہ تو ہوئی بہانہ سازی ——— ہوا یہ کہ ادارہ مہرِ نیم روز کراچی سے غائب تھا۔ ایک صاحب تو نئے گلستانوں میں نئی بہاروں کی تلاش میں چلے گئے دوسرے صاحب ایبٹ آباد میں "اسلام اور موسیقی" پڑھ پڑھ کر ستار بجا رہے تھے اور تیسرے صاحب تسخیرِ کائنات کے چکر میں نکلے اور خلاصۂ کائنات کو پا کر گمراہ ہو گئے ———

لارک پبلشرز

شمارہ اکتوبر کے اداریہ میں کرشن چندر کی ناولوں کے سلسلہ میں لارک پبلشرز کا تذکرہ آ گیا تھا۔ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ہم نے "قرآن محل" کی طرح لارک پبلشرز کو موردِ الزام نہ بنایا تھا بلکہ محض ایک وضاحت چاہی تھی۔

ہمیں خوشی ہے کہ لارک پبلشرز نے اس سلسلہ میں "طوفان کی کلیاں" چھاپنے کی وضاحت کر دی ہے۔ انہوں نے یہ ناول کرشن چندر صاحب کی تحریری اجازت سے شائع کیا ہے — غلط فہمی کا سبب دراصل کرشن چندر صاحب خود ہیں جو ایک طرف اپنی تمام ناولوں کے حقوق "مکتبۂ افکار" اور "سلطان حسین صاحب" کو دینے کا اعلان کرتے ہیں اور دوسری طرف، دوسرے ناشرین کو بھی خصوصی اجازت نامے عطا کرتے ہیں۔

ہم لارک پبلشرز سے معذرت خواہ ہیں — اس لئے نہیں کہ ہم نے اُن پر کوئی غلط الزام لگایا تھا بلکہ اس لئے کہ اس ضمن میں ان کا نام بھی نہیں لینا چاہیئے تھا۔

یارانِ نکتہ داں

جد الباقری

صد نیاز! آپ کے موقر جریدہ ماہنامہ مہر نیمروز" کا جشنِ استقلال پاکستان نمبر گذشتہ نظر سے گذرا۔ صوری اور معنوی اعتبار سے یہ خاص نمبر نہایت کامیاب و گرانقدر ہے۔ آپ کی مساعی جمیلہ اس ذیل میں قابل صد مبارکباد ہیں۔

حصۂ نظم سے متعلق نہ صرف آپ کے جریدہ بلکہ ملک کے تمام جرائد سے یہ شکایت ہے کہ ان میں شرکت کرنے والے بعض فنکار کہنہ مشق اور بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے باوصف شعر کے فنی پہلوؤں پر زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ چند ایسے ابھرے ہوئے نقائص جو میں محسوس کر سکا ہوں۔ درج ذیل ہیں امید ہے آپ کو بھی میری رائے سے اتفاق ہوگا۔

صفحہ ۱۰ پر جناب فیض احمد فیض کی ایک نظم ہے ملاحظہ ہو ؂

جنوں کی یاد مناؤ کہ جشن کا دن ہے   صلیب و دار سجاؤ کہ جشن کا دن ہے

قوافی میں ایطائے جلی ہے بلکہ عرض یہ کرنا ہے کہ "یاد منانا" اردو میں کوئی محاورہ نہیں ہے۔ البتہ "خبر منانا" واقعی محاورات سے ہے۔ جس طرح میں کہوں "دھوم مناؤ" تو آپ فرمائیں گے خلاف محاورہ ہے اور اصل محاورہ "دھوم مچاؤ" ہے۔ میری اس مثال سے بات صاف ہو گئی ہے۔

اسی غزل کے دوسرے شعر کا مصرعہ ثانی ہے ؏

جگر کے چاک سلاؤ کہ جشن کا دن ہے!

یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ ناسخ مرحوم نے ایک مصرعہ کہا تھا ؏

ظالم نے جلتے چاکِ گریباں سلائے ہونٹ

تو ضیا نے کہا تھا کہ "سینا" کی متعدی "سلوانا" ہے اس لئے "سلائے" کی جگہ (سلوائے) ہونا چاہئے لہٰذا اب یوں کہنا ضروری ہے کہ فیض نے "سلاؤ" کی جگہ "سلواؤ" کہنا چاہئے۔ اسی غزل کے تیسرے شعر میں "جیز چاؤ" کا قافیہ نہایت متبذل ہے اسے ضرور بدلنا چاہئے۔ اسی غزل کا چوتھا شعر ہے۔

تمیز رہبر و رہزن کرو نہ آج کے دن   ہر اک سے ہاتھ ملاؤ کہ جشن کا دن ہے

میرے خیال کے مطابق یہ شعر اس طرح ہوتا تو اعتراض کی گنجائش نہ رہتی ؂

تمیز رہبر و رہزن نہ آج ان میں کرو   انھیں گلے سے لگاؤ کہ جشن کا دن ہے

اس کے بعد آخری شعر اور مقطع میں "بجز" اور "غم" میں کتابت کے اغلاط ہیں۔

صفحہ ۱۹ پر جناب شاعر لکھنوی کی تخلیقات کے دوسرے شعر کے مصرعہ ثانی میں "خزاں" اسی طرح لکھا ہے یہاں "خ" پر زبر کی علامت چاہئے۔ صفحہ ۲ پر جناب خالد مینائی کی نظم کے اشعار نمبر ۵، ۱۸، ۲۲، میں "سوئے" کو بروزن فعل نظم کیا ہے اسے بروزن "فعلن" ہونا چاہئے۔ جیسے غالب مرحوم کے اس شعر میں ہے ؂

قوا عد ہوئے غیر نظر ہائے تیز تیز　　میں اور دکھ تری ہٹ رہائے دراز کا

اسی نظم کا ایک مصرعہ ہے ع

مجھ سے ہے عشق تو امدا جنوں لیجیے!

یہاں "لیجیے" کو بر وزن "فاعلن" ہونا چاہئے نہ کہ "فعلن"۔

اسی نقسم کا ایک شعر ہے ع

زندگی بے سر و سامان نظر آتی تھی　　میں بنی ہمت و پامردی و عزم سنگیں

یہاں بے سر و ساماں میں "ن" کا اعلان نہیں ہونا چاہئے۔ باقی چند کتابت کے اغلاط ہیں جن کا اظہار ضروری نہیں ہے۔

صفحہ ۱۲۲ پر جناب لیث قریشی کی نظم کا پہلا مصرعہ ہے ع

عروس آزادی انجمن میں جھنانے بن سنور کے آئی

یہاں "آزادی" کی "ی" کا تقطیع سے گرنا معیوب ہے۔

صفحہ ۱۲۹ پر جناب جون ایلیا کا ایک مصرعہ ہے ع

پر کچھ سحر رخان شبستان بھی ہیں عزیز

یہاں پر کچھ "کی جگہ "لیکن" لکھتے تو "پر" بمعنی "لیکن" کے استعمال کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ کہنا غلط سا ہے کہ صاحب نظم کو "پر" بمعنی لیکن کے متروک ہونے کی اطلاع نہ ہو۔

جناب جون ایلیا کا ایک اور مصرعہ ہے ع

ناقوسیان شہر بتاں سے ہے ربط خاص!

اس میں ناقوسی کی جمع "ان" سے بنائی ہے جبکہ اردو زبان کے الفاظ کی جمع "وں" سے بنائی جاتی ہے زیادہ محنت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مصرعہ یوں بھی بن سکتا ہے ع

ناقوسیوں سے شہر بتاں کے ہے ربط خاص

صفحہ نمبر ۱۵۱ پر جناب ہادی مچھلی شہری کی غزل کا پانچواں شعر ہے ۔

مرا ایک دل اور اتنے مصائب　　مری ایک جاں اور اتنی بلائیں!

"جاں" میں اعلان نون کو فصحا ضروری سمجھتے ہیں۔

صفحہ ۱۶۳ پر جناب آفتاب شوق کی غزل کے تیسرے شعر کے پہلے مصرعے میں "کیا" سے پہلے "میں" کاتب نے زیادہ لکھ دیا ہے۔

صفحہ ۱۶۸ پر جناب نیاز بدایونی کی غزل کے دوسرے مصرعے میں "دل زار" لکھا گیا ہے۔ غالباً یہ "دل بزار" ہوگا۔

نیاز بدایونی

اپنے ایک رفیق عزیز کے ہاتھوں میں "مہر نیمروز" کا خاص نمبر دیکھا۔ انھوں نے شاید اس لئے دکھایا کہ میں بھی شریک بزم ہوں ۔۔۔ اپنی غزل دیکھی اور اس کے دوسرے ہی شعر میں کاتب صاحب کی اصلاح بھی ۔۔۔ "دل زار" نالہ بلب ہے! ۔۔۔ یقیناً میرے "دل زار" پہ رحم آگیا ۔۔۔ ورنہ دل زار چہ معنی ۔۔۔؟

بہت دن ہوئے شاعر کی زبان سے کچھ ایسا سنا تھا کہ۔

"..... ہم نے فکر و فن کو زیر پا ڈالا ہے،"

اگر آج عصر کا شاعر مجھے مل جائے تو عرض کروں، نہیں بھیا! اپنے "مہر نیم روز" کے یہاں تو دنیا کو اس کے کلام کی غزلیت کے باوجود بھی ایک کاپی بھیجنے کی دعا تیں ہیں ــــــ فکر و فن کو کس نے بیچا ہے؟ کہاں بیچا ہے؟ بیچا ہو گا کسی نے اختر بیچارہ ہو گا کسی نے ع:-

ہم لوگ ایسے ہیں تو ہم سے ایسی بات نہ کر

بہرحال نیاز نوازی کا ممنون ہوں۔

خاص نمبر کی خاص دلکشی نے جی خوش کر دیا۔ سوچتا ہوں کیا اسی مہر عالمتاب کے لئے کسی نے کہا تھا ع

تجھ سے ملا کے نظر، حوصلۂ بشر نہیں

فیض کی غزل اور رضا الدین بنائی کی طویل نظم "حمد شعر کی آبرو ہیں۔ ڈاکٹر دیوانہ کی غزل میں بھی ان کا خاص رنگ ہے۔ تحقیقی نوعیت سے اگر آپ صرف "عربی مبتین" ہی شامل کرتے تو بھی یہ فرض ادا ہو جاتا ــــــ ورنہ شہاب نے بھی بہت کچھ نئی باتیں کہنے کی کوشش کی ہے۔ خصوصاً میں انھیں سلام کرتا ہوں " کے نئے پن کو قبول عام و خاص ہونا چاہئے۔ کشفی صاحب اپنے اس غائبانہ نیاز مندکی جانب سے بہت بہت پر خلوص مبارکباد قبول کریں۔ خدا کرے انھیں معذی ایسے نئے نئے عنوانات ملتے رہیں۔

مولانا حسرت مرحوم سے متعلق، ان کی آخری سطر کی صداقت میں ایک قصہ میں بھی سنا سکتا ہوں جو اپنے ایک دوست کے دوست سے مجھ تک پہنچا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ اس وقت میرے دوست کے "وہ دوست" مشاعروں کے افق پر ایک کامیاب شاعر کی حیثیت سے ابھر رہے تھے (آج تو وہ فلم لائن کی ایک مشہور شخصیت ہیں) مگر اس وقت تک انھوں نے مولانا مرحوم کا نام ہی صرف سنا تھا۔ وہ صاحب علی گڑھ کے طالب علم تھے۔ ایک بار کسی ناگہانی سفر میں کاسگنج جنکشن پر ٹرین بدلنا تھی۔ ٹرین کی ضرورت پیش آئی۔ ایسے موقع پر ہتی دست مسافر اِدھر اُدھر کے مسافروں میں کوئی معقول انسان ہی ڈھونڈتا ہے۔ انھیں بھی پلیٹ فارم کے اندر ریلوے ٹائم ٹیبل کے سامنے ایک میلی کچیلی شیروانی میں چشمہ لگائے۔ کاندھے پر گٹھری ڈالے ایک بزرگ "نظر آئے اور ان کے ہاتھ میں ان ہی جیسا ٹین کا ایک لوٹا بھی ــــــ قریب پہنچ کر وہ کچھ مسکرائے اور عرض کیا" قبلہ آپ کیا انگریزی پڑھ رہے ہیں؟"

مولانا نے بھی بڑی سادگی سے کہا "میں یہ سوچ رہا تھا کوئی صاحب" آجائیں تو یہ معلوم کر لوں کہ کانپور جانے والی گاڑی کا کیا وقت لکھا ہوا ہے؟" ــــــ اب یہ شاید اس نے کھل کر ہنس پڑے کہ یہ بڈھا کیسا برا جھوٹ بول گیا اگرچہ وہ ٹائم ٹیبل کو قطعی اس طرح دیکھ رہا تھا گویا بڑا انگریزی داں ہے ـــ! بہرحال انھیں ان سے غرض تھی وقت بتانا ہی پڑا ــــــ تھوڑی دیر بعد جب یہ لوٹا واپس کرنے آئے تو جی چاہا کہ اس عجیب الخلقت، درویش سے کچھ اور دل لگی ہی سہی چنانچہ پوچھ بیٹھے "قبلہ نام تو بتلائیے اپنا؟" "میرا نام حسرت موہانی ہے بھائی۔" جواب ملا۔ اور اس کے بعد میرے دوست کی روایت ہے کہ ان کے وہ دوست اپنی ٹرین کی لنکنگ تک مال گاڑی کے کسی ڈبہ میں بیٹھے رہے۔

ایک ایسا ہی واقعہ کراچی میں خود میرے ساتھ پیش آیا۔ مجھے کولی مار میں ایک صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچنا تھا معلوم ہوا گرو مندر بس اسٹاپ نمبر دو پر سامنے ہی پان فروش سے ان کا پتہ مل سکتا ہے۔ چنانچہ وہاں پہنچا مگر اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ قریب ہی ایک اور کیبن میں چند بیڑی سگریٹ کے بنڈل اور کچھ ڈبے وغیرہ رکھے ایک خوش وضع مولوی صاحب بیٹھے تھے۔ سوچا شاید یہ کچھ رہنمائی کر سکیں۔ پہنچ کر بعد سلام عرض کیا "یہاں بدایوں کے وارث صاحب رہتے ہیں۔ کچھ بتا سکیں گے آپ؟" وہ کچھ مسکرائے اور فرمایا "میاں۔ میں تو بدایوں کے صرف بارہ اصحاب سے واقف رہا ہوں" پوچھا وہ کون؟" بولے "پہلے مولوی انصار حسین صاحب زلالی وکیل و رئیس بدایوں اور دوسرے حاجی عطا محمد صاحب" اپنے والد کے حقیقی نانا حضرت زلالی مرحوم کا سن کر میں کچھ چونکا۔ عرض کیا "حضرت زلالی سے تو مجھے بھی کچھ نسبت ہے، جناب انھیں کہاں سے جانتے ہیں؟" لیکن وہ خوش ہو گئے۔ میں نے چاہا وہ اپنا نام بتا دیں مگر وہ ٹال گئے۔ میں نے پھر اصرار کیا مگر اس مرتبہ بھی انھوں نے اپنا نام نہ بتایا۔ لیکن یہ کہ وہ حضرت بیخود دہلوی مرحوم کے فرزند ہیں ــــــ وہی بیخود دہلوی جن کے متعلق قصر زبان اردو کے اہم معمار مرزا داغ نے لکھا تھا کہ میں نے اپنے بعد بیخود جیسا شاگرد چھوڑا ہے۔ (بحوالہ "اردو ڈائجسٹ" کراچی شاہد احمد دہلوی کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اس مجمع کے صیغہ میں دوسرے بیخود بدایونی تھے جو داغ کو اپنے شاگردوں میں خصوصیت سے عزیز تھے) ــــــ لاریب کہ ایسی ہی نہ جانے کتنی جلیل القدر ہستیاں اِدھر اُدھر گوشوں میں چھپی پڑی ہیں۔

اس مرتبہ فرمان فتح پوری صاحب تو ادبی سراغ رساں" نے بھی بازی لے گئے۔ ایک لمحہ کے لئے تو دل و دماغ پر سکتہ کا عالم رہا آپ نے اس نمبر کی ایک جلد نیاز صاحب کو تو بھیجی ہی ہو گی اور ان کا جواب بھی ناظرین تک پہنچے گا۔ فیصلہ بھی اسی وقت ہو گا۔

شفقت تنویر میرزا

آپ کے مسلسل کرم کے طفیل "مہر نیمروز" تقریباً باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں پرچہ کے لئے کچھ لکھنے لکھانے کا معاملہ تو الگ رہا ہے شکریہ بھی ادا نہ کر سکا جس کی بڑی وجہ دیگر مصروفیات کے علاوہ ۴ ماہ کی مسلسل بیماری تھی، یوں تو یہ وجوہات اب بھی لکھنے پڑھنے اور آپ جیسے کرم فرماؤں سے مراسلت کا سلسلہ قائم رکھنے میں مانع ہیں مگر پرچے کے تازہ ترین شمارے نے یہ سطور لکھنے پر مجبور کر دیا۔

ابن الوقت اور ادب سے بے بہرہ قسم کے لوگوں کے پرچے بھی مارکیٹ میں آتے ہیں۔ وہ ادیبوں کی باہمی رنجشوں، شہرت پسندی، اور ادبی سیاست کی بنا پر اچھے بھلے لکھنے والوں کی چیزیں حاصل کر لیتے ہیں۔ اس لئے چار و ناچار وہ پرچے دیکھے ہی جاتے ہیں لیکن ادبی اخلاق کی پامالی دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔

جشنِ آزادی، نمبر سے قطع نظر وحشت نمبر نکال کر آپ نے بڑا اچھا اور قابل قدر اقدام کیا۔ وحشت مرحوم کی ادبی قدر و قیمت کے بارے میں میں کچھ نہیں کہتا ہاں اتنا افسوس ضرور ہوتا رہا ہے کہ متذکرہ بالا قسم کے رسائل نے وحشت تو الگ ہے حسرت موہانی کے بارے میں بھی کبھی ایک آدھ مضمون چھاپنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ پروفیسر قسم کے لوگ محض اپنے لکچروں کے ٹکڑے اگر کسی پرچہ میں چھپوا دیں تو وہ الگ بات ہے۔ بہرکیف وحشت نمبر پر میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں،

ستمبر کے پرچے کے ساتھ ضمیمہ میرے لئے خاص طور پر دلچسپی کا باعث تھا۔ مذہب کی طرح بامعنی لٹریچر کو (باوجود ادب اور زندگی اور سیاست کے فلک شگاف نعروں کے) قومی زندگی کے دور رس اور بنیادی مسائل سے الگ کر کے رکھ دیا ہے اور ادبی پرچوں کے ہاں کبھی ایسے مسائل کے بارے میں ذکر نہیں کیا گیا جو بظاہر ادب سے غیر متعلق نظر آتے ہیں مگر مستقبل میں انہی مسائل پر ادب کی بنیاد بھی استوار ہونا ہے۔ لا کمیشن پر بحث (اختلاف یا اتفاق سے قطع نظر) یقیناً قابل تعریف ہے اس لحاظ سے کہ ہماری قومی زندگی بلکہ بین الاقوامی سطح پر ہماری زندگی اور مستقبل کے معاشرے کا بڑا اہم بنیادی پتھر ہے۔

علامہ جمیل مظہری، ڈاکٹر شادانی، ڈاکٹر صدیقی کے نام ہی پرچہ کی عظمت اور آپ کی بہترین صلاحیتوں کے ضامن ہیں نشریات والا مضمون بھی ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہرحال دونوں نمبر پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی۔

آزادی نمبر میں میری جو نظم چھپی ہے اس میں آخری بند کا تیسرا مصرعہ غلط ہے۔ یعنی رخصت کے بجائے رفعت چھپ گیا ہے۔ دراصل مصرعہ یوں ہے،

جانے کب رخصت فریاد فغاں مل جائے

ناظم کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ

مکرمی ۔۔۔! السلام علیکم۔ "مہر نیمروز" کا وحشت نمبر ملا۔ شکریہ۔ وحشت نمبر واقعی خوب ہے۔ بڑے اچھے مضامین کا مجموعہ ہے علامہ وحشت مرحوم کے متعلق اتنی معلومات کسی اور جگہ ملنی مشکل ہیں۔ یہ واقعی بڑا کام آپ کے ہاتھوں ہو گیا۔ کتب خانہ کی طرف سے اتنا اچھا نمبر نکالنے پر مبارکباد قبول فرمایئے۔

حکیم محمد یوسف رضوی

چمن سحرگاہ رسید و بسرا پردہ خیز
ای مغنی بمن آمد نگارے خوشتر
ای مغنی کہ ہم از صورت و ہم از معنی
کرد بے قدر زحسن مہر بچشم گوہر

خوش کتابے است با قصہ وحشت گوید
طرز اش ہیں بہر وحشت دلہا یکسر!
وہ چہ گلدستہ مضمون است بہم بشگفتہ
وہ چہ آئینہ معنی است مصفا جوہر
دلہا از روئے ادب گفت لبسال طبعش   دُرِ یکدانہ معنی است کہ وحشت نمبر
۱۹

اصغر تنشیط۔ کراچی

"مہر نیمروز" کا تازہ شمارہ "وحشت نمبر" نظروں سے گزرا۔ یوں تو بہت سارے مضامین میرے پڑھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ آپ نے مجتنے مضامین مہیا کئے ہیں سب اعلیٰ پایہ کے ہیں جس سے علامہ وحشت مرحوم کی شخصیت اور ان کی شاعری پر اچھی خاصی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے متعلق مضامین پڑھنے کے بعد کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ کاش ـــ آج وہ زندہ رہتے۔ مگر وہ زندہ کیسے رہتے۔

خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی   تمام رات جلی شمع انجمن کے لئے

ان کا یہ شعر ان کی موجودہ زندگی پر بالکل منطبق تھا۔
آپ نے وحشت نمبر کا اجرا کر کے علامہ وحشت اور خاص کر کلکتہ والوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ اس کیلئے مبارکباد قبول کیجئے۔ امید ہے خیریت سے ہونگے۔

سحر قادری

آج ہی "نمکدان" کا شمارہ مطبوعہ ۵ نومبر ۱۹۵۸ء نظر سے گزرا۔ صفحہ پر مولانا مظفر حسین شمیم صاحب مضمون بعنوان "ادب اور سرقہ" کے تحت "نیچہ ملاحظ" کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔ ادبی سراغرساں نے مرحوم ادیبوں پر جھوٹا الزام عائد کیا ہے کہ قاضی عبدالغفار صاحب مرحوم اور ظفر عمر صاحب مرحوم نے علی الترتیب "اس نے کہا" اور "نیلی چھتری" کو ترجمہ کے نام سے نہیں پیش کیا ہے۔ شمیم صاحب مرحوم ادیبوں کی "نیک نیتی" کو ظاہر کرنے کے لئے رقمطراز ہیں۔ کہ انھوں نے کتابوں کے تمام ایڈیشنوں میں ان کتابوں کو ترجمہ کے نام ہی سے پیش کیا تھا۔

آگے لکھتے ہیں کہ ظفر مرحوم کی نیلی چھتری کے متعلق صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس کے اولین ایڈیشنوں میں جو مصنف کی نگرانی میں شائع ہوئے ہیں ہمیشہ اس امر کی وضاحت موجود ہے کہ "نیلی چھتری" کس کتاب سے ماخوذ ہے"!

لیکن آپ کی اطلاع کے لئے اتنا عرض کرونگا کہ شمیم صاحب خوش عقیدگی میں مبتلا ہیں۔ شمیم صاحب کے "نیلی چھتری" کے بارے میں بیان کی تردید رام بابو سکسینہ کی کتاب "تاریخ ادب اردو" مطبوعہ ۱۹۲۹ء تیسری بار کے ان سطروں سے ہوجاتی ہے۔

"مولوی ظفر صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس ممالک متحدہ جاسوسی قصے لکھنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ آپ کے ناول "نیلی چھتری" اور "بہرام کی گرفتاری" بہت مشہور و مقبول ہیں" صفحہ نمبر ۱۴۳۔

مذکورہ بالا سطروں سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ ظفر عمر صاحب مرحوم نے کہیں بھی اپنے کو مترجم ظاہر نہیں کیا تھا بلکہ مصنف کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا ورنہ تاریخ اردو ادب کا ایک مورخ کس طرح کہتا کہ "آپ کے ناول "نیلی چھتری" اور "بہرام کی گرفتاری" بہت مشہور و مقبول ہیں"!

قاضی عبدالغفار صاحب کی ترجمہ کتاب "اس نے کہا" کے بارے میں جو دلائل مہر نیمروز نومبر ۱۹۵۸ء زیر عنوان چہ دلاور است پیش کئے گئے ہیں کافی وزن دار ہیں اگر کچھ اطلاعات اس سلسلہ میں فراہم ہوسکے تو اس کی اشاعت مناسب ہے کیونکہ شمیم صاحب کی تحریر سے غلط فہمی کے امکانات پیدا ہوگئے ہیں۔ کیا ادیب شہر اس سلسلے میں کچھ تحریر کریں گے۔

محمد حسن عسکری

کلیم الدین احمد صاحب نے اپنی مشہور کتاب "اردو تنقید پر ایک نظر" پر نظر ثانی کی ہے اور اضافے کئے ہیں جن میں موجودہ نقادوں کا انداز تنقید زیر بحث آیا ہے۔ اس میں ایک مضمون آل احمد سرور پر ہے، دوسرا سید احتشام حسین پر، تیسرا محمد حسن عسکری پر۔ اور تیسرا مضمون انھوں نے ماہ نو کو بھیجا ہے ——————— (ادارہ)

تاثراتی تنقید کی دوسری مثال محمد حسن عسکری کی تحریروں میں ملتی ہے۔ عسکری صاحب ترقی پسندوں سے برہم ہیں اور ان کا بار بار مضحکہ اڑاتے ہیں

"ایک ایسا ہی مجرب اور خاندانی نسخہ ترقی پسندوں کے پاس بھی ہے، یہ نسخہ "ھوالمارکس" سے شروع ہوتا ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں:- طبقاتی کشمکش، مادی جدلیات، ذرائع پیداوار اور اسی قسم کی دوسری گھاتیں، رہا سوال کنجرے کے لنگوٹے کا تو وہ کیمرکاڈول کی کتاب الیوژن اینڈ ریلٹی (Illusion & Reality) سے پوری ہو جاتی ہے۔ بس یہ دو چار چیزیں آپ کو ازبر ہو جائیں تو پھر یہ سمجھئے کہ آپ کو اسم اعظم آگیا۔ عقل کا حملہ ہو یا احساس کا شبخون، سب سے مکمل محافظت ہو گئی"

اسی ڈھنگ سے وہ استہزا کرتے ہیں تنقید نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں:-

جہاں تک سائنس، معاشیات، سیاست، فلسفہ، مذہب وغیرہ کا تعلق ہے وہاں تک مجھے دم مارنے کی مجال نہیں، ان چیزوں میں تو ترقی پسندوں کو بالکل محمد اسماعیل کی چیونٹی سمجھتا ہوں۔ بڑی عاقل ہے، بڑی دور بین ہے یہاں ترقی پسند جو کچھ کہیں مجھے منظور ہے۔

وہ کہتے ہیں لیکن شاید دل سے نہیں کہتے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ مارکسی نقطۂ نظر کا جواب استہزا نہیں ہو سکتا۔ اس نقطۂ نظر کی جانچ پرکھ ضروری ہے اور جانچ پرکھ کے بعد یہ دکھانا چاہئے کہ اسکے بنیادی اصولوں کی جڑیں کھوکھلی ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے بارے میں بہت سی باتیں جو عسکری صاحب کہتے ہیں ان سے مجھے بھی اتفاق ہے۔ لیکن "میں کبھی رائے نہیں دیتا بلکہ صرف اپنے تاثرات بیان کر دیتا ہوں" کہنے سے کام نہیں چلتا۔ مارکسی فلسفے کی کاٹ عسکری صاحب کے تاثرات سے نہیں ہو سکتی اور عسکری صاحب کے پاس تاثرات کے سوا کچھ بھی نہیں۔

عسکری صاحب کے تاثرات اردو ادب کے متعلق ہوتے ہیں اور مغربی ادب کے بھی۔ اردو ادب کو لیجئے۔ اور ان تاثرات کے نتائج کو دیکھئے وہ اکبر کو ترقی پسند تنقید کی زد سے بچانا چاہتے ہیں اور خود بھی اسی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جو ترقی پسند تنقید کی عام غلطی ہے۔ ترقی پسند اکبر کے دو ٹکڑے کرتے ہیں۔ ایک ترقی پسند اور دوسرا رجعت پسند تھا۔ اور عسکری صاحب "شاعری سے قطع نظر کر کے محض خیالات کی بنا پر" اکبر ہی کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ بے پردگی، تعلیم نسواں، اور کالج کے خلاف تھے۔ انھیں شاعری سے قطع نظر "نہیں کرنا چاہئے۔ یہ بات غیر متعلق سی ہے کہ اکبر بے پردگی، تعلیم نسواں اور کالج کے خلاف تھے یا موافق۔ بہر حال ان کی شاعری پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

وہ کرشن چندر کے افسانوں کی تعریف کرتے ہیں تو شاید اس لئے کہ "ان کا افسانہ زندگی کا ایک ذاتی اور بلاواسطہ تجربہ ہے۔" اور کہتے ہیں

وہ ہر افسانے میں جو چیز ڈھونڈتا ہے وہ کچھ روحانیت اور سچی محبت [illegible]

۔ایسے نظام میں جہاں روپے کی پوجا ہوتی ہے۔ جہاں ایک جھوٹی شرافت کو ہر جذبہ پر مقدم سمجھا جاتا ہو
جہاں ہوس اور وقتی تسکین کو محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ اور ایک چیز جسے کرشن چندر بار بار دکھانا چاہتا ہے وہ یہ ہے
کہ خوشحال طبقے کا نوجوان قطعاً محبت نہیں کرسکتا۔ نہ اس کی روح میں لگن ہے۔ نہ اس کے تخیل میں بلندی، اس کے معیار
محض دو ہیں۔ روپیہ اور شرافت۔ اور جس چیز کو یہ نوجوان رومانیت اور محبت کہتا ہے وہ محض ایک رنگین خواب ہے
جس میں وہ خود بھی مبتلا ہے اور دوسروں کو بھی پھنسانا چاہتا ہے۔ محض بیکاری کا مشغلہ، محض خمار گندم ——— دھوئیں
کی طرح ناپائیدار۔"

یہ سب صحیح۔ لیکن یہ تو وہی باتیں ہیں جو ترقی پسند کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ ان افسانوں کا مواد ہے۔ پھر عسکری صاحب کا وہ قول کہاں گیا کہ ہیئت ہی آرٹ ہے۔ اس مضمون میں افسانوں کی ہیئت کے متعلق کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر کہتے ہیں:-

"کرشن چندر کے یہاں ان چیزوں کی (خارجیت، انفعال اور غیر جانب داری) کی تلاش بالکل بے کار ہے۔ وہ اپنی نظروں سے دیکھتا ہے بلکہ یوں کہئے کہ وہ اپنے مزاج اور طبیعت کی عینک سے دیکھتا ہے اور ساری چیزیں اسی کے رنگ میں رنگ جاتی ہیں۔ کرشن چندر سے غیر جانبداری کا مطالبہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے پنساری کی دکان پر گوشت لینے جانا۔ اسی طرح اس کے یہاں انفعال بھی نہیں ہے۔ اس کے افسانوں میں ہم ہر وقت اس کی شخصیت کو محسوس کرتے رہتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہو تو ان کی دلچسپی کم ہو جائے۔ اور وہ دور سے کھڑا ہو کر زندگی کو نہیں دیکھتا بلکہ اس سمندر میں کود پڑتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں اور تاثرات کو اپنے تخیل میں صرف تصویر کی طرح نہیں دیکھتا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنے آپ کردار بن جاتا ہے اور ذہنی طور پر ان ہی تجربات سے گذرتا ہے۔ وہ اس کے جسم اور احساس کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔"

پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:-

"میرا یقین نہیں بلکہ عین الیقین ہے کہ بے تعلقی آرٹ کے سب سے پہلے اصولوں میں سے ہے۔

اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:-

"جوائس کے نزدیک آرٹ کی معراج یہ ہے کہ فنکار کائنات کے خالق کی طرح اپنے فن پارے کے اندر بھی ہو اور باہر بھی ہو۔ اس کے نیچے بھی ہو اور اس کے اوپر بھی اور اپنی تخلیق سے بالکل بے پرواہ دور کھڑا ہوا ناخن تراشتا نظر آئے۔"

اور تضاد کے الزام سے یہ کہہ کر بچ نکلنا چاہتے ہیں کہ بعض مقامات ایسے آتے ہیں جہاں یہ سوال غلط نہیں بلکہ غیر ضروری اور بے محل معلوم ہونے لگتا ہے اور کہتے ہیں:-

"یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ شیکسپیئر اصول سازوں کے لئے پورا دردِ سر (نہیں بلکہ دردِ جگر) ہے۔ بڑی محنت مشقت کے بعد تیار کئے ہوئے اصول بھی اس کی ایک جنبش میں اناناً دھم کرکے زمین پر آ رہتے ہیں۔"

یعنی کامل "نراج"۔ یہی تاثراتی تنقید کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ آپ جب جیسا جی چاہے اسی قسم کی باتیں کرسکتے ہیں۔ فنکار بے تعلق بھی ہوتا ہے اور بے تعلق نہیں بھی ہوتا۔ آرٹ ہیئت بھی ہے اور مواد بھی ۔۔۔ معلوم نہیں وہ کون سے اصول ہیں جو شیکسپیئر کی ایک جنبش میں اناناً دھم کرکے زمین پر آ رہتے ہیں۔ اس طرح کرشن چندر کا آرٹ شعور اور غیر شعور کے مشترک عمل کا بہترین مرکب ہیں "شعور تحت الشعور، لاشعور ——— یہ غیر شعور بھی شاید نئی اصطلاح ہے۔ تو مجھے کہنا پڑتا ہے کہ عسکری صاحب فرائڈ کی اس اصطلاح کے معنی سے واقف نہیں ہیں۔

تضادات کا دوسرا نمونہ فراق کی نظم و نثر کے ذکر میں مل چکا ہے۔ ایک نمونہ فراق کے ذکر میں پیش ہو چکا ہے۔ "روحِ کائنات" پر لکھتے ہوئے جو

تاثرات عسکری صاحب بیان کرتے ہیں وہ یہ ہیں :-

"اس پر کچھ لکھنے کی ہمت میں اپنے اندر بالکل نہیں پاتا کیوں کہ فراق صاحب کی شاعری اتنی تہ دار ہے کہ اگر میں اسے نثر میں سمیٹنا چاہوں تو سمیٹنے میں نہیں آتی ۔ ۔ ۔ اس کتاب پر بہترین تبصرہ یہ ہوگا کہ آپ کو اس میں سے دو چار شعر سنا دوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں فراق صاحب کی شاعری کی ایک خصوصیت کا ذکر ضرور کروں گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یعنی فراق صاحب کے شعروں میں اکثر محبوب کے حسن کا بیان کائنات کی اصطلاحوں میں ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس قسم کے دو چار شعر سنئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ وہ مقام آجاتا ہے جہاں میرے پر جلتے ہیں اس لئے میرا خاموش رہنا ہی بہتر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تعریف کرنے کی بجائے میں محو حیرت ہو جاتا ہوں ۔"

اور انھیں تاثرات کے بل بوتے پر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ "آج اگر اردو نظم اور نثر میں کوئی چیز پڑھنے کے قابل لکھی جا رہی ہے تو وہ فراق صاحب کی شاعری اور تنقید ہے ـــــ باقی بس اللہ کا نام ہے ۔" اگر یہی تنقید ہے تو وائے بر تنقید !

اب دوسرا نمونہ دیکھئے :-

" یہ نظمیں (آدھی رات کو، اور دھندلکا) اردو نظم میں بعض نئے عناصر کا اضافہ کرتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دونوں کی دونوں نظمیں استعجاب انگیز مانوسیت، ہم آہنگی، اور اپنے پن کے احساس میں ڈوبی ہوئی ہیں ۔ اور ان نظموں کے انداز بیان کو دیکھئے تو ایک طرف تو مشاہدے کی گہرائی کے سبب الفاظ بڑے غیر مبہم اور بچے تلے ہیں ۔ دوسری طرف ان میں اشاریت اور معنی آفرینی غضب کی ہے لیکن دیکھئے تو ان نظموں میں ہر تاثر الگ الگ ہے ۔ ہر چیز کو ایک ایک کر کے غور سے الگ الگ دیکھا گیا ہے لیکن یہ سب تاثرات ایک دوسرے سے اس طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ ایک عجیب و غریب خواب جال ابھرتا چلا جاتا ہے پہلی نظم "آدھی رات کو" میں ذرا سی کمزوری یہ ہے کہ یہ نظم پوری طرح ہموار نہیں ہے ۔ بعض بعض جگہ شدت احساس میں کمی پائی جاتی ہے لیکن دوسری نظم "دھندلکا" تو اتنی کسی ہوئی ہے اور اس میں نشو و نما کی ایسی شدید کیفیت نظر آتی ہے کہ اردو میں اس کا جواب مشکل سے ملے گا ۔ خصوصاً ایک التزام نے عجیب لطف دیا ہے ۔ ہر بند کا پہلا اور آخری مصرع "ک" کی آواز پر ختم ہو جاتا ہے ۔"

فراق غزل گو شاعر ہیں اس لئے ان کی نظمیں کامیاب نہیں ہوتیں ۔ وہ نظموں کے بھیس میں غزلیں لکھتے ہیں اس لئے نظموں کے اشعار میں ربط و تسلسل اسی قسم کا ہوتا ہے جو مسلسل غزلوں میں ملتا ہے ۔ "آدھی رات کو" میں بہت سے ٹکڑے ہیں لیکن ٹکڑوں میں کوئی ناگزیر ربط نہیں ، منطقی ارتقاء خیال نہیں ۔ ان میں سے کتنے ٹکڑوں کو حذف کر دیا جا سکتا ہے اور یہ محسوس بھی نہ ہوگا کہ کوئی کمی ہے ۔ آخری ٹکڑے کو لیجئے :-

فضائے صاف میں رقصاں ہیں چاند کی کرنیں
کہ جیسے شیشے پہ پڑتی ہو نرم نرم پھوار !
یہ موج غفلت معصوم یہ خمار بدن ! !
یہ ادھ کھلی ہوئی سانسیں یہ آنکھیں نیند بھری
مرے کلیجے سے آؤ لپٹ کے سو جاؤ !
اب آنکھیں بند کرو اور مجھ میں کھو جاؤ

اگر آپ صرف اسی ٹکڑے کو پڑھئے تو آپ کو یہ احساس بھی نہ ہوگا کہ یہ ایک لمبی نظم سے تعلق رکھتا ہے ۔ یہ مصرعے مکمل ہیں [illegible] اس نظم کا صرف یہی عیب نہیں کہ اس میں [illegible] احساس میں کمی آ جاتی ہے ۔ اصل عیب یہ ہے کہ [illegible] نظم [illegible] حیثیت [illegible]

فراق کو لفظوں سے خاص دلچسپی ہے۔ یہ مصرعہ ——— "یہ چھب یہ روپ، یہ سکمار، یہ کومل گات، انگریزی تنقید کی نقالی کر کے عسکری صاحب اس مصرعہ کی تعریف آوازوں کے لحاظ سے بڑی شدت سے کرتے ہیں۔ "س" اور "ل" کی آواز سے نرمی اور ملائمت کا احساس ہوتا ہے اور "چھ" "اور "ر" سے نکیلی بدن کا گٹھا اور اچپلاہٹ اور تیکھا پن پیدا ہوتا ہے۔ منہ میں جو کُرکرے لیکن "چھ" "اور "ر" سے نکیلی بدن کا گٹھاؤ اچپلاہٹ اور تیکھاپن صرف عسکری صاحب کے ذہن میں پیدا ہو سکتی ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ فراق حسین الفاظ کو پسند کرتے ہیں اور ان کو استعمال کرنے میں خاص لذت محسوس کرتے ہیں۔ "روپ" "سکمار" "کومل" "رسمساتا" "کام روپ کا جادو" "کمدنی کے پھول" "سکھی گھن پرچھائیں" "کنول" "ندی کا سہاگ"..... یہی لذتیت ان کی خصوصیت ہے۔

غزلوں کے متعلق بھی عسکری صاحب مبالغہ آمیز تعریف کرتے ہیں لیکن اس تعریف کے ضمن میں کچھ عجیب و غریب باتیں بھی کہہ جاتے ہیں:۔

"یہ شاعری ابہام اور وضاحت دونوں کا امتزاج ہے"

"ان کی شاعری ایسی دنیاؤں میں سانس لیتی ہے جو کچھ سمجھ میں آتی ہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتیں۔ کم سے کم ان کا بیان کبھی مکمل طور سے نہیں ہو سکتا ہے"

"میرا خیال ہے کہ فراق صاحب کی شاعری اتنی ان کی آواز میں نہیں جتنی اس جھنجھناہٹ میں ہے"

معلوم نہیں ابہام اور وضاحت کا امتزاج کیسا ہوتا ہے، ان کی شاعری ایسی دنیاؤں میں سانس لیتی ہے جو کچھ سمجھ میں آتی ہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتیں، یعنی وہی ابہام اور وضاحت کا امتزاج؟۔ بات یہ ہے کہ اکثر فراق اپنے معنے واضح طور پر ادا نہیں کر سکتے۔ یہ کوئی تعریف کی بات نہیں، پھر یہ جھنجھناہٹ بھی ایک زبردست عیب ہے۔ ان کے شعروں میں گہرے جذبات نہیں محض جھنجھناہٹ ہے اور اکثر وہ "جھنجھناہٹ" کو اصل شاعری سمجھتے ہیں۔ فراق اچھے غزل گو شاعر ہیں لیکن مبالغہ آمیز تعریف سے ان کی غزلوں کے محاسن اجاگر نہیں ہوتے، مدھم پڑ جاتے ہیں۔

اب دیکھئے عسکری صاحب کے مغربی ادب کے متعلق کیا تاثرات ہیں۔ وہ انگریزی اور فرانسیسی ادیبوں اور کتابوں کا برابر ذکر کرتے ہیں اور شاید اسی طرح پڑھنے والوں کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ عسکری صاحب کی ایک حیثیت "دلال" کی ہے۔ وہ مغربی مال ہندوستان میں بیچنا چاہتے ہیں۔ وہ مغربی ادیبوں کے مضامین کا ترجمہ یا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ فی الحال میں فرانس کے سب سے بڑے زندہ ادیب کے نمونہ کے طور پر چند اقتباسات پیش کر رہا ہوں۔

"اس کتاب پر دو تبصروں کا خلاصہ پیش کرتا ہوں، پہلا تبصرہ ہے ایچ۔ اے میسن کا جو اسکروٹنی میں نکلا تھا..... دوسرا تبصرہ ہے مڈلٹن مرے کا جو کرائیٹرین میں نکلا تھا"..... میں اس ضمن میں ای۔ ایم فورسٹر کی ایک تقریر نقل کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے ان کے ایک مضمون میں سے دو چار اقتباس سن لیجئے۔ "یہ مضمون تقریباً ترجمہ ہے" اس غلط فہمی کے انسداد کے لئے میں ذیل میں ایک مضمون کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔ میں اس مضمون کا ترجمہ نہیں دے رہا ہوں بلکہ کئی سال پہلے لئے ہوئے نوٹوں کی مدد سے اسے دوبارہ گڑھ رہا ہوں"

ظاہر ہے کہ وہ دلالی کرتے ہیں، دوسروں کا مال بیچتے ہیں۔ دوسری حیثیت ان کی رپورٹر کی ہے وہ خبر دیتے ہیں کہ دنیائے ادب میں کیا ہو رہا ہے:۔

"آج کل فرانس کے ادبی حلقوں میں ایک بڑی مزیدار اور گرما گرم بحث چھڑی ہوئی ہے۔ بحث یہ ہے کہ فرانس کے ادیبوں کے حالات تیس سال پہلے کی نسبت بہتر ہیں یا نہیں" "اوڈن، اسپنڈر اور پائیلن گروپ کے عروج کے بعد پچھلے چھ سال میں جو شاعر انگریزی شاعری میں ابھرے انھوں نے اپنی جماعت کا نام رکھا ہے اپوکلپس"——— "پچھلے اکتوبر میں پارٹیزن ریویو نے ایک خاص نمبر کا اعلان کیا تھا جس میں چند ایسے فکری میلانات پر بحث ہوئی تھی جو اس پرچے کے خیال میں ترقی کے دشمن اور خطرناک ہیں"——— "اردو پڑھنے والوں کے لئے یہ خبر کوئی دلچسپی نہیں رکھے گی کہ ورجینیا وولف کا انتقال ہو گیا"

یہ پہلے ——— [illegible] اب دیکھنا ہے کہ اس دلالی اور رپورٹری سے کیا فائدہ مقصود ہے۔ اگر [illegible]

کو نہ پڑھ سکتے ہیں۔ عسکری صاحب کی وساطت کی ضرورت نہیں۔ اور اگر ہم ان مضامین کو نہیں پڑھ سکتے تو مختلف قسم کی باتوں سے وہ ذہنی انتشار ممکن ہے رد بیشی اور سکون ممکن نہیں یہاں بھی تاثرات بیان ہوتے ہیں۔ ابھی کچھ اور ابھی کچھ۔ اگر ان ترجموں میں انتشار کے عوض ربط ہوتا اگر ایک مضمون کے خیالات کو دوسرے مضمون کے خیالات سے کوئی لگاؤ ہوتا، اگر یہ مختلف مضامین آپس میں مل کر کوئی سمجھ میں آنے والا نقش مرتب کرتے تو کام کی بات ہوتی۔ ورنہ فائدہ صرف یہی ہے کہ لوگ ان مضامین کو نہیں پڑھ سکتے وہ عسکری صاحب کی قابلیت اور وسیع معلومات سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور پھر "ساقی" کے صفحے بھی بھر جاتے ہیں۔

رپورٹیں تو اور بھی بیکار سی ہیں۔ تر دلیان باندا مر گیا تو مر گیا۔ یہ خبر دینے سے کیا فائدہ ہم اسے زندہ تو نہیں کر سکتے۔ بہتر تو یہ تھا کہ اس کے خیالات کو پیش کی جاتی۔ فرانس میں مزید ادبی بحث چھڑی ہوئی ہے۔ اور جرمنی، اٹلی، رشیا میں کوئی مزید ادبی بحث نہیں چھڑی ہوئی ہے۔ اور اگر ہے تو ہمارے ادبی نامہ نگار کو اس کی خبر نہیں۔ پارٹیزن ریویو نے ایک خاص نمبر کا اعلان کیا ہے، ٹھیک ہے ہم اس خاص نمبر کو پڑھ لیں گے۔ عسکری صاحب شاید یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے سوا اور کوئی پارٹیزن ریویو نہیں پڑھتا۔ اپوکلپٹک گروپ قائم ہوا۔ ہم ہنری ٹریس کی دی اپوکلپس پڑھ لیں گے۔ اور اگر ہم پارٹیزن ریویو اور دی اپوکلپس نہیں پڑھ سکتے تو یہ خبر ہمارے کام کی۔ یہاں نامہ نگار بیکار نہیں بیٹھا ہوا ہے۔ اور پھر ساقی کے صفحے بھر تے جاتے ہیں۔

دلالی اور رپٹ بازی کے علاوہ عسکری صاحب بعض مغربی ادیبوں کا بار بار ذکر کرتے ہیں۔ خصوصاً جیمس جوائس، پروست، بودلیر، فلوبیر کا۔ ان کے علاوہ اپنی تحریروں میں اکثر مغربی ادب کے حوالے دیا کرتے ہیں۔ پہلے ان حوالوں کا سرسری جائزہ لینا چاہتا ہوں، پھر جیمس جوائس اور مارسل پروست کی باتیں ہوں گی۔

(۱) "میرے خیال میں چسٹرٹن کے اندر بڑا مزاح نگار بننے کی کچھ صلاحیت موجود تھی"

اس بیان میں اسی قدر صحت ہے جتنی اس بیان میں کہ عسکری صاحب میں بڑا تنقید نگار بننے کی صلاحیت ہے۔ مزاح اور ظرافت اور چیز ہے، اور نکتہ سنجی اور۔ چسٹرٹن میں نکتہ سنجی ہے۔ ظرافت نہیں اور نہ ظرافت کے امکانات ہیں۔ پھر چسٹرٹن بڑا نہیں، اس کی بڑائی کا نقش کب کا مدھم ہو چکا۔

(۲) وہ ورڈز ورتھ کی دو لائن نقل کرتے ہیں:-

But She is in her grave and, oh
The differnce to me.

اور کہتے ہیں:-

"ان دو لائنوں میں بڑی زبردست ٹریجڈی ہے" یہ درست ہے۔

پھر کہتے ہیں:-

"میرا خیال ہے اگر اس نظم میں صرف یہ دو لائنیں ہوتیں تب بھی ٹریجڈی میں کوئی خاص کمی نہ آتی" یہ درست نہیں معلوم ہوتا ہے کہ عسکری صاحب کے کسی استاد ـــــ فراق؟ ـــــ نے ان دو لائنوں کی تعریف کی ہوگی۔ اور اسی بات کو وہ یہاں تکرار کر رہے ہیں۔ ان دو لائنوں کو اگر نظم سے الگ کر دیجئے تو پھر ٹریجڈی جاتی رہے گی۔ ورڈز ورتھ کی نظم اردو غزل تو ہے نہیں کہ دو مصرعوں میں آفاقیت آ جائے۔ "لوسی مر گئی۔ اور ورڈز ورتھ کا غم تازہ ہے لوسی کی موت کا خیال برداشت سے باہر ہے۔ ورڈز ورتھ لوسی کا نام نہیں لیتا۔ وہ کہتا ہے "ایسی جگہ رہتی تھی جہاں انسان کے قدم نہیں پہنچے تھے۔ وہ ایک چشمے کے نزدیک رہتی تھی" اور چشمہ زندگی کی علامت ہے۔ اسے خوش کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اور اس سے محبت کرنے والے بہت کم تھے۔ لیکن وہ پتھر کے نزدیک ایک "وائلٹ" ... تھی جو آنکھوں سے نیم پنہاں تھی۔ اور وہ ستارہ جیسی حسین تھی جب ایک ہی ستارہ آسمان میں چمک رہا ہو ـــــ یہ وائلٹ اور یہ ستارہ علامتیں ہیں لوسی کی جسمانی اور روحانی حسن کی ـــــ پہلے ورڈز ورتھ کی نظر زمین پر ہے۔ پھر یہ آسمان کی طرف اٹھتی ہے۔ اور اس کی نظر میں ساری کائنات روشن نظر آتی ہے جس میں صرف ایک پھول اور ایک ستارہ، ایک لڑکی ہے۔ [illegible] اسی طرح گمنام رہی اور کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کب لوسی گزر گئی۔ لیکن وہ قبر میں ہے اور میری دنیا بدل گئی [illegible]

[illegible] ـــــ پھر شاید

عسکری صاحب یہ بھی نہیں جانتے کہ ان دو لائنوں میں ٹریجڈی کس طرح ابھرتی ہے ۔ ایسے لگتا ہے کہ ورڈزورتھ لوسی کا نام لینے سے پرہیز کرتا ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ لوسی کا نام لیا اور اس کا صبر اس کا قرار ٹوٹ جائے گا ۔ اور وہ بے اختیار ہو جائیگا اس لئے وہ جہاں تک ہو سکتا ہے اس کا نام نہیں لیتا ـــــ لیکن آخر کب تک لیتا ہے ۔ یہ خیال کہ لوسی مر دہ ہے اور قبر میں ہے ـــــ اسی خیال کو وہ پیچھے دھکیلے ہوئے تھا ۔ اس کا صبر و قرار ٹوٹ دیتا ہے اس کی آواز جیسا بھی تک قابو میں تھی قائم نہیں رہتی ۔ ٹوٹ جاتی ہے ۔ *And , Oh* اور وہ آنسو بھری آواز میں کہہ اٹھتا ہے :۔

The difference to me.

آخری لفظ بہ صورت "ایکسینٹ" ہے ـــــ *me* ـــــ لیکن اس ٹریجڈی کے احساس سے بھی اس کا ذہنی توازن نہیں جاتا ۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی دنیا اجاڑ ہو گئی ۔ لیکن اس ٹریجڈی کا دنیا پر کوئی اثر نہ ہوگا ۔ آفتاب نکلے گا ، چاند ستارے نکلیں گے ۔ اور دنیا اپنے محور پر گھومتی رہے گی ۔

(۳) معلوم ہوتا ہے کسی نے ان سے کہہ دیا ہے یا انھوں نے کسی کتاب میں دیکھ لیا ہے کہ شیکسپیئر کی یہ لائنیں بہت حسین ہیں :ـــ

Daffodils
That come before the swallow dare and take
the wind of March with beauty.

اس لئے وہ ان لائنوں کو بار بار نقل کرتے ہیں ۔ لیکن بجز ایک دھندلے احساس کے کہ یہ لائنیں حسین ہیں ۔ انھیں مطلق خبر نہیں کہ نقاد ان لائنوں کا بار بار حوالہ کیوں دیتے ہیں ۔ کہتے ہیں تو یہ کہ :ـــ

"جب کائنات بھری پری نظر آئے اور انسان خلاؤں میں یکہ و تنہا یا بے یار و غمخوار رہ جائے ۔"

یہ بات تو عام ہے اور ان لائنوں کے حسن پر کوئی اثر نہیں ڈالتی ۔ پہلے "ڈیفوڈلز" کو اندرونی آنکھ سے دیکھئے ، پھر یہ دیکھئے کہ *Daffodils that Come* اگرچہ دو لائنوں میں ہے ۔ لیکن آپ ان لفظوں کو ایک سانس میں پڑھتے ہیں جس سے ڈیفوڈلز کو آپ اپنی آنکھوں سے تنے ہوئے دیکھتے ہیں ۔ پھر *Comes* اور *Dares* میں *Vowel Sounds* کا فرق دیکھئے ـــ عسکری صاحب تو اکثر اس قسم کی چیزوں کا ذکر کرتے ہیں ۔ اور پھر آخری لائن کے لفظی اور معنوی حسن کو دیکھئے ، ڈیفوڈلز کا رنگین حسن ان کی جسارت ، ان کا غیر متوقع طور پر آنا اور دنیا میں حسن پھیلانا ــ ابھی بہت سی باتیں کہی جا سکتی ہیں ، پھر وہ یہ لائنیں بھی نقل کرتے ہیں :ـــ

And jocund day
Stands tiptoe on the misty mountain tops.

لیکن یہ نہیں بتاتے کہ ان میں کیا حسن ہے ۔ کس طرح *jocund* اور *Stands tiptoe* دن میں زندگی ڈال دیتے ہیں ۔ اس کی انفرادی شخصیت نظر آتی ہے ۔ پھر "M" کی تکرار سے دو لفظ الگ نہیں رہتے ۔ بلکہ ایک لفظ ہو جاتے ہیں ۔ پھر "T" کی تکرار سے معلوم ہوتا ہے کہ دن کے پنجے پہاڑ کی چوٹی کو چھو رہے ہیں ۔ اور *Stands tiptoe* "اسپرنگی" ہے ۔ یعنی دو لفظوں پر ایکسنٹ ہے یعنی دونوں پنجے پہاڑ کی چوٹی پر جمے ہوئے ہیں ۔ دن کھڑا ہے پنجوں پر کھڑا ہوا ہے ۔ یعنی دن کسی آدمی کی طرح پہاڑ کی کہر آلود چوٹی پر کھڑا ہوا ہے ۔ ان سب کے باوجود جو حسن پہلی مثال میں ہے وہ اس میں نہیں ۔ عسکری صاحب کو اس کا بھی احساس نہیں ۔

(۴) وہ الہامی کلاسیک شاعری کا بار بار ذکر کرتے ہیں اور ان سے کافی مرعوب معلوم ہوتے ہیں ۔ ان کے نقطۂ نظر کی لاٹھی لے کر مارکسیت پر حملہ کرتے ہیں بات تو یہ ہے کہ انھیں کوئی ہتھیار مل جائے وہ اس سے اشتراکیت پر حملہ کر بیٹھتے ہیں بہرحال وہ یہ نہیں بتاتے کہ ان شاعروں کی دنیائے شاعری میں کیا اہمیت ہے اور ان کا مقام کیا ہے ۔ بہت سے تنقید نگار ان شاعروں کو جتنا بڑا سمجھتے ہیں اتنے بڑے نہیں ۔ ان کی نظریاتی اہمیت کا نام [illegible]

نہیں بتا سکا تو پھر اس نظریہ کی تعریف سعی لاحاصل ہے۔ اس گروپ کا بھی وہی حشر ہوا جو جنت گروپ کا ہوا تھا۔ تھوڑے دنوں تک کافی شور ہے لوگ تعجب سے دیکھتے رہے لیکن یہ نیا ستارہ بھی دیر تک آسمان شاعری پر چمک نہ سکا۔

وہ گولڈ اسمتھ کی یہ لائنیں نقل کرتے ہیں:-

Ill forces the land to hastening ills a prey
Where wealth accumulates and men decay,

اور کہتے ہیں:-

"گولڈ اسمتھ نے مارکس سے تقریباً ایک صدی پہلے کہہ دیا تھا"

گویا سمجھتے ہیں کہ ان لائنوں میں وہی بات ہے جو مارکس نے کہی ہے۔ یہ روشنی طبع ہے اور کچھ نہیں۔ ورنہ ان لائنوں اور مارکس کی جدلیات سے کوئی واسطہ نہیں۔

محمد حسن عسکری صاحب بودلیر، فلوبیر، پروست، جیمس جوائس کا بار بار حوالہ دیتے ہیں اور پھر تفصیل سے بھی لکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ چیخوف پر بھی کبھی کبھا لکھتے ہیں حسب دستور وہ مونٹگومری بلچین کے ایک مضمون کا ترجمہ کرتے ہیں اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ دوستوئفسکی کا فن چیخوف کے فن سے کہیں زیادہ بلند ہے وہ چیخوف سے زیادہ شغف رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں:-

"چاہے میں موپاساں کی تکنیکی خوبیوں کی کتنی ہی داد کیوں نہ دوں زیادہ دیر تک وہ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ اس کے برخلاف چیخوف کو میں متواتر ایک سال تک پڑھ سکتا ہوں۔ کیوں کہ اپنے اچھے افسانوں میں وہ قطعاً یہ مطالبہ نہیں کرتا۔ کہ میں زندگی کے متعلق کسی خاص عقیدے کا قائل ہو جاؤں۔ وہ بار بار انسان کی لازمی تنہائی کا تصور پیش کرتا ہے، مگر ڈی ایچ لارنس کی طرح ڈنڈے کے زور سے ہمیں یہ ماننے پر مجبور نہیں کرتا کہ انسان کی زندگی کا اصول ہی تنہائی ہے"

معلوم نہیں عسکری صاحب ٹولسٹوائے اور دوستوئفسکی اور پشکن کو متواتر ایک سال تک پڑھ سکتے ہیں یا نہیں۔ بڑے بڑے ادیبوں کے رہتے ہوئے وہ عموماً ایسے ادیبوں کا پرچار کرتے ہیں جو انھیں کسی خاص تاثراتی وجہ سے پسند ہیں۔ بھلا جب ٹولسٹوائے اور دوستوئفسکی میسر ہوں تو وہ چیخوف کی طرف کیوں توجہ ہو۔؟ بہرکیف عسکری صاحب لارنس سے زیادہ واقف نہیں اور اس سے کچھ برہم معلوم ہوتے ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اس کی شاعری "بہت تیرے وقت تیرے" کی شاعری ہے۔ یہ درست ہے کہ لارنس کا سب سے اہم کارنامہ ناولسٹ کی حیثیت سے ہے لیکن اس نے کچھ اچھی نظمیں بھی کہی ہیں۔ جن میں "بہت تیرے" کی شاعری نہیں ہے۔ عسکری صاحب نے ان نظموں کو نہیں پڑھا ہے ایک PIANO کو لیجیے جو اس کی بہترین نظموں میں ہے۔ پھر ڈی ایچ لارنس ڈنڈے کے زور سے "کوئی چیز منوانا نہیں چاہتا ہے۔ اس میں اگر کچھ تشدد ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس نے زندگی کی حقیقت کو پالیا ہے۔ اور تہذیب خودکشی کرنے سے بچ سکتی ہے تو اس حقیقت کو جان کر اس کو اپنا کر۔ کاش عسکری صاحب ایف آر لیوس کی ڈی ایچ لارنس پر کتاب پڑھیں اور پھر تنگ نظری اور ذہنی کم روی سے الگ ہو کر اس کتاب کی روشنی میں اس کے ناولوں کا مطالعہ کریں تو شاید ان کی سمجھ میں آجائے کہ ڈی ایچ لارنس بہت بڑا آرٹسٹ ہے۔

اب رہا چیخوف تو کوئی تیس برس پہلے وہ کافی مقبول تھا لیکن اب اس کی مقبولیت ختم ہو گئی ہے چیخوف Milk and Water فلسفی ہے شیلی جیسے عسکری صاحب اس کو پسند کرتے ہیں، ہر شخص تنہا ہے، اپنی الگ دنیا رکھتا ہے اور اس دنیا میں ہاتھ پیر مارتا ہے۔ لیکن اس کا کچھ حاصل نہیں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

FLEURS DU MAL کا ترجمہ کر ڈالیں۔ فرنچ سے نہ سہی انگریزی سے۔

اب فلوبیر تو اس کا ایک ہی ناول کامیاب ہے، بہت کامیاب ہے۔ اور وہ "مادام بواری" ہے لیکن فلوبیر سے بڑے ناولسٹ فرنچ لٹریچر میں ملتے ہیں اور دوسرے ادبوں میں بھی۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ فلوبیر کو اردو پڑھنے والوں کے منہ پر بار بار پھینکا جائے۔ "مادام بواری" مشہور ہو گئی ہے، وہاں ایما ایک ناول دوست [illegible] مل جاتا ہے۔ جذبات سے مغلوب ہو کر مدافعت چھوڑ دیتی ہے۔ اور اپنے ایک دوست کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جاتی ہے۔ فلوبیر اس کا ذکر تک نہیں کرتا کہ گاڑی کے اندر کیا ہوا بلکہ پورے ایک صفحہ میں شہر کے ان حصوں کا نام گنواتا ہے جہاں وہ گاڑی دن کے مختلف وقتوں میں دیکھی گئی تھی۔ ظاہر میں تو یہ بیان بالکل بے رنگ ہے لیکن دراصل یہاں فلوبیر نے جذبات اور نفسانی خواہشات کی شدت اور تندی کو جنون کی حد تک پہنچا دیا ہے۔" یہ ایک مشہور مثال ہے۔ یہ نہ سمجھیے کہ عسکری صاحب نے پہلی بار اسے "مادام بواری" میں پایا ہے اور یہ محض تکنیک کی بات ہے۔ "جذبات اور نفسانی خواہشات کی شدت" کو دوسری طرح بھی بیان کیا جا سکتا تھا۔ فلوبیر نے تو بالواسطہ بیان کیا ہے۔ گاڑی دن کے مختلف وقتوں میں کہاں کہاں دیکھی گئی۔ اور بس۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ اس پر سر دھنا جائے۔ فلوبیر آرٹسٹ ہے اس کی آرٹسٹری کی خیر ہے اس کی ایک خاص تکنیک ہے۔ وہ کم سے کم اور بہترین لفظوں میں "مادام بواری" کی زندگی کو فنکارانہ بے تعلقی کے ساتھ پیش کرتا ہے اور یہی اس کی کامیابی ہے۔ بار بار فلوبیر کا حوالہ دینے سے بہتر ہوتا کہ عسکری صاحب فلوبیر پر ایک مقالہ لکھ دیتے اور اس کے ناولوں کا تفصیلی تجزیہ کرتے پھر شاید وہ مبہم لفظوں میں "مادام بواری" "بوارائے پیکوشے" کی تعریف نہیں کرتے۔ وہ کئی مرتبہ "بوارائے پیکوشے" کا بھی ذکر کرتے ہیں، اس کی ہیئت کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن کہیں اس کتاب کا تجزیہ نہیں کرتے کہیں وہ نہیں بتاتے کہ ہیئت اچھی ہے تو کیوں۔ عسکری صاحب تجزیے سے گریز کرتے ہیں۔ شاید وہ تجزیہ کر بھی نہیں سکتے۔ خصوصاً ایک فرنچ ناول کا۔ پھر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایک طرف وہ فلوبیر کی مدح کرتے ہیں اور دوسری طرف مارسل پروست اور جیمس جوائس کو آسمان پر چڑھاتے ہیں۔ اور انھیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ فلوبیر اور پروست یا فلوبیر اور جیمس جوائس میں فرق مشرقین ہے۔ لیکن یہ تو تاثرات کی بات ہے اس لئے کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا۔ عسکری صاحب سب سے زیادہ پروست اور جیمس جوائس کے مداح نظر آتے ہیں اور اپنے ان دونوں بتوں کی پوجا اپنا شعار قرار دیتے ہیں۔ کسی کا ذکر کیوں نہ ہو پروست اور جیمس جوائس کو وہ زبردستی کھینچ لاتے ہیں:-

"اس ضمن میں جوائس کا ذکر کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

اور ان بتوں کی پرستش میں عجیب و غریب باتیں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:-

"ایک بات کا مجھے کبھی یقین نہیں آیا بلکہ اُس پر ہمیشہ جھنجھلاہٹ ہوئی۔ . . . . . وہ بات یہ ہے کہ پروست جزئیات نگاری اور تفصیلات کا بادشاہ ہے۔"

اور ہربرٹ ریڈ کے سہارے وہ اس بات کو جھٹلانا چاہتے ہیں، وہ نئے فن پارے کو ایک نئی کائنات کی طرح حیرت و استعجاب اور احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اس کی دور سے پرستش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:-

"آرٹ کا سب سے بنیادی اصول انتخاب ہے۔ تفصیل نگاری تو اس کا بالکل تضاد ہوا۔"

یہاں کی معصومیت ہے، انتخاب اور تفصیل نگاری میں کوئی تضاد نہیں۔ زولا جسے عسکری صاحب فطرت نگاری کا بہترین نمونہ سمجھتے ہیں تفصیل سے کام لیتا ہے۔ جزئیات کی بھرمار ہوتی ہے لیکن —— (اور عسکری صاحب یہی نہیں سمجھتے) —— مفصل سے مفصل جزئیات نگاری میں بھی آرٹ کا انتخابی عمل ہوتا ہے۔ جزئیات نگاری ذریعہ ہے مقصد نہیں۔ عسکری صاحب یہ جانتے ہیں کہ جزئیات محض ایک ذریعہ ہیں نہ کہ مقصد۔ زولا کا بھی ایک مقصد ہے اور جزئیات سے وہ اپنے مقصد کے حصول میں کام لیتا ہے۔ وہ بھی جزئیات کا انتخاب کرتا ہے۔ کسی آرٹسٹ کے لئے ناممکن ہے کہ وہ ساری باتیں کہہ دے، ساری جزئیات پیش کر دے۔ اس کے لئے ایک ناول نہیں ایک لائبریری کی ضرورت ہوگی۔ فلوبیر میں بھی یہ فطرت نگاری ہے۔ یہ کہنا بت پرستی ہے کہ فلوبیر تو اتنا بڑا فنکار ہے کہ اسے صرف فطرت نگار کہنا اس کی توہین ہے۔ فلوبیر بھی فطرت نگار ہے۔ فطرت نگاری ایک تکنیک ہے اور فلوبیر میں بھی یہ تکنیک پائی جاتی ہے۔ بہر حال یہ ایک تکنیک ہے اور یہ پروست اور جوائس میں بھی پائی جاتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ زولا اور فلوبیر میں خارجی دنیا کی جزئیات نگاری ہے اور پروست اور جوائس میں اندرونی دنیا کی۔ اگر عسکری صاحب اتنی بات سمجھ لیتے تو [illegible] زولا اور فلوبیر خارجی دنیا کی جزئیات پیش کرتے ہیں اسی طرح پروست اور جوائس شعور کی رو کی تفصیلات پیش کرتے ہیں۔ لیکن [illegible]

کرکے پڑھنے والے تجربے میں جذب ہو جائیں تو اس کا نتیجہ وہی نکلے گا جو نفسیاتی علاج کا"

بے حد خوش ہوتے ہیں۔ آپ سائیکی ایٹرسٹ" کے پاس بغرض علاج جاتے ہیں جب آپ بیمار ہوتے ہیں اور وہ آپ کی نفسیاتی گتھیوں کو سلجھا کر آپ کے مرض کا علاج کرتا ہے، اگر آپ مریض نہیں، اگر نفسیاتی گتھیوں نے آپ کے توازن، آپ کی صحت، آپ کی ذہنی و جذباتی ہم آہنگی میں رخنے نہیں ڈالے ہیں، اگر آپ NORMAL ہیں تو آپ سائیکی ایٹرسٹ کے پاس نہیں جاتے۔ ہیرج کا کہنا ہے کہ جوائس کے ناولوں کو پڑھنا ایک قسم کا نفسیاتی علاج ہے۔ یہ آپ کی نفسیاتی گتھیوں کو سلجھا دیں گے لیکن یہ ایسی صورت میں ہوگا جب آپ "نورمل نہیں" "ایب نورمل" ہو گئے ہیں۔ عسکری صاحب کو یولیسز شاید اسی لئے پسند ہے کہ ان میں نفسیاتی گتھیاں ہیں۔ "ایب نورمل" بہر طور ان ناولوں کو ادب نہیں سمجھتا نفسیاتی کتابیں سمجھتا ہے یہ عام عیب ہے جو فرائڈ سے لے کر آج تک سارے سائیکو انیلسٹ میں ملتا ہے۔ وہ ادب کو ادب کی حیثیت سے نہ پڑھ سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ جانچ سکتے ہیں۔ اس کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ "اس کے سمجھنے والے تو بس عام آدمی ہو سکتے ہیں" اسے کہنا چاہئے کہ اس کے سمجھنے والے سائیکو انیلسٹ قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں اور وہ عام آدمی نہیں، جو "ایب نورمل" ہیں وہ اس کتاب کو پڑھ کر اپنے مرض میں کمی محسوس کر سکتے ہیں اس کو سمجھنا ہم جیسے لوگوں کے بس کی بات نہ ہوگی۔

عسکری صاحب پروفیسروں سے ملتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ یولیسز اور فنی گنز ویک کو کتابوں کی مدد کے بغیر سمجھ سکتے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے دعوے کے باوجود کتابیں پڑھی ہیں۔ بلکہ [illegible] ہیں۔ اور انھیں سنی سنائی باتوں میں سے کچھ ادھر ادھر کی باتیں لے کر انھیں اپنی باتوں کے طور پر پیش کرتے ہیں ساری مثالیں جو انھوں نے دی ہیں وہ اپنی نہیں۔ پھر وہ انھیں حصوں کا ذکر کرتے ہیں جو نسبتاً آسان ہیں جس نے یولیسز پڑھی ہے وہ اس کی دشواریوں سے واقف ہو سکتا ہے اور میں تو دعوے سے کہتا ہوں کہ عسکری صاحب فنی گنز ویک کو KEY کی مدد سے بھی نہیں سمجھ سکتے۔ غریب اردو کو مرعوب کرنا اور بات ہے۔ وہ یہ باتیں انگریزی میں کیوں نہیں لکھتے، یہ "فنی گنز ویک" کے ابتدائی پیراگراف ہیں عسکری صاحب "پروفیسروں" اور کتابوں سے مدد لے کر اپنے تاثرات بیان فرمائیں۔

RIVERRUN, PAST EVE AND ADAM'S, FROM OF SHORE TO BEND OF BAY, BRINGS US BY A COMMODIUS OF RECIRCULATION BACK TO HOWTH CASTLE AND ENVIRONS.

SIR TRISTRAM VISLER DÅMORES FR'OVER THE SHORT SEA, HAD PASSENCORE REARRIVED NORTH AMERICA ON THIS SIDE THE SCRAG-GY ISTHMUS OF EUROPE MINOR TO WIELDER FIGHT HIS PENISOLATE WAR NOR HAD TOPRAWJER'S ROCK BY THE STREAM OCONEA EXAGGERATED THEMSELSE TO LAURAN'S COUNTRY'S GORGIOS WHILE THAY WENT DOUBLIN THEIR MUMPER ALL THE TIME NOR AVOICE FROM AFIRE BELLOWESED MISHE MISHE TO TAUF TAUFTHUART PEATRICK NOT YET, THOUGH VENNISSOON AFTER, HAD A KISEAD BUTTENDED A BLAND OLD ISAAC, NOT YET THOUGH ALL'S FAIR IN VANESSY, WERE SOSIE SESTHERS WORTH WITH TWONEHATH AND JOE. ROT A PECK OF PA'S MALT HAD JHEM OR SHEN BREWED BY ARCLIGHT AND RORY END TO THE REGGINBROW WAS TO BE

'EN RING SOME ON THE AQUIA FACE. THE FALL (BABABADAL)
HARAGHTAMM INARRONNKONN BRONN TONNERRONN TUON THUNN
TOVARR HOUNAWNSKAWNTOO HOO HOOR DENEN THURNUK) OF A
YCE WALL STRAIR OLD PARR IS RETALED EARLY IN BED AND
TER ON LIFE DOWN THROUGH ALL CHRISTIAN MINSTRELSY.
HE GREAT FALL OF THE OFF WALL ENTAILED AT SUCH SHORT
OTICE THE PETJSCHUTE OF FINNEGAN, ERSE SOLID MAN, THAT
HE HUMPTY HILL HEAD OF HUMSELF PRUMPTLY SENDS ON
NQUIRING ONE WELL TO THE WEST IN QUEST OF HIS TUMPTY,
TUMTOES, AND THEIR UPTURNPIKE POINT AND PLACE IS AT
THE KNOCK OUT IN PARK WHERE ORANGES HAVE BEEN LAID TO
UST UPON THE GREEN SINCE DEVLINS FIRST LOVED LIVVY.
WHAT CLASHES HERE OF WILLS GEN WONTS, OYSTRY. GODS
BAGGINGFISHY GODS! BREKEK KEKKEK KEKKEK! KOAK KOAK KOAK!
KOAK! VALU VALU! QUAOUAUH! WHERE THE BADDALARIES
PARTISANS ARE STILL OUT TO MATHMASTER MALACHUS MICAGRANES
AND THE VERDANS CATAPELTING THE CAMIBATISTIES OUT OF
THE WHOYTE BOYCE OF HOODIE HEAD.
ASSIEGATES AND BOOMERING STROMS. GODS BROOD, BE ME FEAR!
SANGLORIUNS, SAVE! ARMS APEAL WITH HARMS, APPALLING,
KILLY KILLY KILLY, A TOL, A TOLL. WHAT CHANCE CUDLLEYS,
WHAT CHASHELS AIRED AIRED AND VENTILATED! WHAT
BIDIMETOLOVES SINDUCED BY WHAT TEGOTETABSOLOVERS!
WHAT TRUE FEELING FOR THEIRS HAYAIR WITH WHAT STRAWNG
VOICES OF FALSE JICCUP! O HERE HERE HOW SPROWLED MET
THE DUSKT THE FATHER OF FORNICATIONISTS BUT, (O MY
SHINING STARS AND BODY!) HOW HATH FANNED PANNED MOST
HIGH HEVEN THE SKYSIGN OF SOFT ADVERTISEMENT! BUT
WAS IN ERE WERE SEWERS? THE OAKS OF OLD NOW THEY

LIE IN PEAT YET ELMS LEAP WHERE ASKESLAY, PHALL IF YO
BUT WILL, RISE YOU MUST; AND NONE SO SOON EITHER SHA
THE PHARU FOR THE MUNCE TO A SETDOW SECULAR PHOE

اُردو دانوں کے لئے مغربی ادب سے متعلق معلومات کو جٹیا کرنا بُری بات نہیں، لیکن اس کام کو سلیقے سے کرنا چاہیئے اور سپرڈنگ سے کیا رسنتے ہے!

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

ایک نیا شعری مجموعہ

غزلیں دوہے گیت

اتنی بات اب ہم میں سے ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ ہماری شاعری ایک سنگم اور ایک دوراہے پر پہنچ گئی ہے۔ ایک طرف ہماری کلاسیکی شعری روایات ہیں جو ہمارے مزاج میں رچ بس گئی ہیں اور دوسری طرف نئے تجربوں کی وہ لگن ہے جو ایک نئے ذہن کی علامت ہے۔ اور آج جو کشمکش ہے وہ انہیں دونوں میں توازن یا مفاہمت پیدا کرنے کی ہے۔ روایت سے بغاوت کی آندھی بڑی تیزی سے چڑھی تھی اور اس کے سامنے کلاسیکی اقدار خس و خاشاک کی طرح اڑنے لگیں، لیکن آندھی کا زور ٹوٹا تو معلوم ہوا کہ ان اقدار میں بڑی جان اور توانائی تھی، ان کے مقابلے میں نئے تجربوں میں بڑا کھوکھلا پن تھا، یہی وجہ ہوئی کہ ہیئت اور اسلوب میں جو انقلاب آفریں تجربے ہوئے تھے وہ اکثر سسک سسک کر ختم ہو گئے۔ لیکن اس آندھی نے پرانی روایات اور اقدار کے چہرے پر سے بھی گرد اڑائی اور انہیں نیا روپ بخشا۔ یہ نیا روپ جو آج کی غزل، گیتوں اور دوہوں میں ہر جگہ نمایاں ہے،

اس سارے ہنگامے میں غزل بیچاری بڑی رسوا ہوئی اور اس "نیم وحشی صنف" کو اردو ادب کی سرزمین سے نکال کر کالے پانی بھیجنے کی تجویز ہوئی، لیکن یہ تھی بڑی سخت جان، جس نے نادر گردی، ابدالی کی لوٹ مار اور ۱۸۵۷ء کا انقلاب دیکھا ہوگا، وہ ایسی بودی نہ تھی کہ آسانی سے سولی پر چڑھا دی جاتی۔ جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے اور آج غزل پھر ہمارے سر پر چڑھ کر بول رہی ہے۔

جمیل الدین عالی کے اس مجموعہ کلام میں ترتیب میں سب سے پہلے غزل ہی ہے اور ایسا ہونا بالکل قدرتی تھا، جو اپنے آپ کو دہلوی کہتا ہے۔ آل درد میں اپنے کو شمار کرتا ہے۔ میر اور غالب سے اپنا ذہنی ناطہ جوڑتا ہے اور جو شعوری اور غیر شعوری طور پر اقبال سے بھی متاثر ہے جسے فیض کی بڑائی کا احساس ہے، وہ کہے گا اور ضرور کہے گا، پھر غزل محض باتیں بنانے کا نام نہیں، اس کے لئے چوٹ کھایا ہوا دل، ایک لگن اور سوز ناتمام بھی درکار ہے، پھر اس کا ایک اپنا انداز اور آہنگ الگ ہے جو اس میں آبگینے کی نزاکت اور نفاست پیدا کرتا ہے۔ اس مجموعے کی غزلوں میں ان باتوں کا سراغ ملتا ہے، یہ چند اشعار دیکھئے:۔

دل آشفتہ پہ الزام کئی یاد آئے ؎ جب ترا ذکر بہ ہر نام کئی یاد آئے

پھر چھوٹے چھوٹے دکھ اپنے کچھ دکھ اپنے عزیزوں کے ؎ ان سے ہی جیون بنتا ہے سو جیون بن جائے گا

خدا کہوں گا تمہیں ناخدا کہوں گا تمہیں ؎ پکارنا ہی پڑے گا تو کیا کہوں گا تمہیں

تم ایسے کون خدا ہو کہ عمر بھر تم سے ؎ امید بھی نہ رکھوں ناامید بھی نہ رہوں

رہی خزاں میں تمنا کہ پھول چن لیتے ؎ بہار آئی تو ہے دامن تمنا چاک

ادا نہیں ہے یہ سب زندگی ان آنکھوں نے ؎ بہت حسین، بہت مضطرب، بہت غمناک

ہمیں سے تذکرہ تھا عاشقاں تو یہ ؎ [illegible]

وہ تیری یاد جو اب تک کروٹ کب بیتا تھی ؎ تری قسم ہے کہ اب وہ بھی ناگوار آجا

دل ابھی [illegible] ؎ [illegible]

مسرتیں جو ملیں تیرے لطف پیہم سے ؛ مچل رہی ہیں کسی چشم ناگہاں کے لئے

یا اور ایسے مضامین اس مجموعہ کی غزلوں میں جا بجا موجود ہیں لیکن غزل کی کائنات اور پھر آج کے غزل کہنے والے شاعر کا سرمایا صرف یہی اشعار نہیں، آج کا غزل گو ایک نئے ذہن کا مالک بھی ہے ۔ آج کے مسائل اور تقاضے بھی ہیں اور غزل کی دلنوازیاں بھی ہیں اس کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ یہ آوازیں بھی آتی ہیں -

سوکھ چلا وہ غنچۂ چمن سے کیا کیا پھول ابھرنے تھے ؛ اب بھی نہ ان کی پیاس بجھی تو گھر جنگل ہو جائے گا۔
خزاں میں منزل درد تک ہے لیکن ؛ یہیں سے ہے میری روداد شوق کا آغاز
اب انتظار کی کچھ اور رمز لیں اے دوست ؛ کہ تیرے چاہنے والے مسجد بھی دیکھ چکے
یہ کچھ دن سے دیوانوں کی حالت جو سنبھلی جاتی ہے ؛ یا منزل نزدیک آ پہنچی یا راہ بدلی جاتی ہے
ہم نے ہی خبر اڑائی نہیں اکثر کی تازی تیرے آنے کی خبر ؛ اے باد سحر اے باد سحر کیوں ہم کو مسلی جاتی ہے

ایسی باتوں کو غزل کی زبان اور رمز غزل کے اشاروں میں کہنے سے بڑی فنی نزاکت پیدا ہو جاتی ہے شاعر یہاں پیشہ ور انقلابی، مصلح اور واعظ بن کر سامنے نہیں آتا، وہ اثر طلب نہیں کرتا ؛ پیدا کرتا چلا جاتا ہے ۔ نئے صحت مند ذہن کی ایسی بہت سی جھلکیاں ان اشعار میں موجود ہیں -

غزل اپنی ہیئت اور فن میں جدت طرازی کے عمل جراحی کی متحمل نہیں ہو سکتی، آپ اس ہرن کی پیٹھ پر گھانس نہیں لاد سکتے، اور اس مجموعے میں ایسی کوئی کوشش نہیں،

اس کے بعد دوہے شروع ہوتے ہیں، غزل کی طرح دوہوں کی بھی ایک چھب الگ ہوتی ہے اس کے لئے موضوع کی قید نہیں البتہ جذبے کی شدت اور بیان کی سادگی اور بیساختگی درکار ہے دو مصرعوں میں پورے خیال کو صفائی سے ادا کرنا کہ بھرپور تاثر قائم رہے ایک مشکل فن ہے، ان دوہروں کو دیکھئے جو اس مجموعے میں شامل ہیں،

عمر گنوا کر پیت میں ہم کو اتنی ہوئی پہچان ؛ چڑھتی ندی اور اتر گئی پر گھر ہو گئے ویران
ساجن ہم سے ملے بھی لیکن ایسے ملے کہ ہائے ؛ جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اڑ جائے
بیتے دنوں کی یاد ہے کیسی ناگن کی پھنکار ؛ پہلا وار ہے زہر بھرا اور دوجا امرت دھار
اپنے ہی من کا رونا کیا ہر من میں لگی ہے آگ ؛ ساجن مل کر جدا نہ ہوں اے سکھی یہ کیسے بھاگ
کہو چندر ماں آج کدھر سے آئے جوت بڑھانے ؛ میں جانوں کہیں رستے میں میری ناری کو دیکھ آئے
میں نے کہا کبھی سپنوں میں تو شکل نہ مجھ کو دکھائی ؛ اس نے کہا بھلا مجھ بن تجھ کو نیند ہی کیسے آئی
ڈھونڈ لو میری ناری کو جو اس کی اک پہچان ؛ چٹکی لو تو پگھل بہے اور بولو تو بھگوان

ان دوہروں میں نئی شعور آہستہ آہستہ پروان چڑھ رہا ہے محض ہندی الفاظ کا رسمی استعمال نہیں، نہ محض کبیر، بہاری، میرا، رحمن اور تلسی داس کی صدائے بازگشت ہے، حالی نے ان دوہوں کے لئے ایسی زبان استعمال کی ہے جو بڑی حد تک ان کی اپنی ہے،

اور پھر ان دوہوں میں بھی صرف پیم رس نہیں، دھرتی کی کٹھن راہوں کے بنجارے کو یہ بول بھی سنائی دیتے ہیں:-

اے بالک تو جگ جگ جیوے رکھیو یاد یہ بول ، ؛ جیون کے اندھیارے میں ہے دکھ ہی سکھ کا مول
اے بالک اس جگ میں رکھیو آندھی جیسے ٹھاٹ ؛ نیچے پودے اونچے کیجو اونچے دیجو کاٹ
اک گہرا انسان سمندر جس کے لاکھ بہاؤ ؛ تڑپ رہی ہے اس کی اک اک موج پہ جیون ناؤ
کیا جانے یہ چلی کہاں سے اور کہاں تک جانے ؛ کون کنارا چھوڑ آئی ہے کون کنارا پائے

ان دوہوں کے مجموعوں میں دو مسلسل مضمون کے دوہے بھی ہیں، ایک میں حیدرآباد اور بمبئی کے سفر کے تاثرہیں دوسرے آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

عالی جی اک کوی رسیلے دھنک سے جن کو پیار ؛ پہنچ گئے اک گاؤں کبھی جو دھنک کے ملے پار

اس نظم میں وہی ریت تھی جو ہمیں اپنے چاروں طرف ملتی ہے۔

گاؤں کی سب سے سندر بالا لے گئے سرکار
گاؤں کی ہر اوڑھنی لے گئے تھانیدار

آلہ اور دل گلنے والے پیار سے کترائیں ؛ ہل کا بوجھ اٹھانے والے ڈنڈے سے دب جائیں

مضمون کو خاص پھیلانے کے بعد کوی کہتا ہے: ـ

کس کس ماں کی کوکھ جلے کس کس دلہن کا سہاگ ؛ ایک پرانی چنگاری سے کب تک جلے گی آگ

اسکے بعد کے دوہوں میں البتہ کوی نے اپنے رنگ کو چھوڑ دیا ہے اور دوہے کے مدھم سروں کو انقلاب کے نعروں میں الجھا دیا ہے۔ البتہ آخری دو دوہے بہت اچھے ہیں۔

اے بھین وہ دیکھ سمے نے اپنی تان لگائی ؛ اے بھین وہ ہوا سویرا نئی کرن لہرائی
اک دوجے کا ہاتھ پکڑ لو اور آواز لگاؤ ؛ اے اندھیارو سورج آیا سورج آیا جاؤ

مجموعے میں کچھ گیت بھی ہیں لیکن گیتوں میں ابھی عالی کا انداز پوری طرح ابھرا نہیں ہے آخر میں ایک کہانی ہے "معصوم آنکھیں" جو ہے تو نثر میں، لیکن شروع سے آخر تک فعولن فعولن لکھی گئی ہے یہ ایک تجربہ ہے اور بس۔

بحیثیت مجموعی یہ مجموعہ ہمارے ایک ابھرتے ہوئے شاعر کے کلام کا اچھا ترجمان ہے، میں یہ تو نہیں کہوں گا جیسا اس مجموعے کے مقدمہ نگار نے لکھا کہ عالی ان دو ڈھائی شاعروں میں ہیں جن کے کلام کا وہ دلچسپی سے مطالعہ کرتے ہیں، ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ عالی کی آواز اس کی اپنی آواز ہے جو سب سے الگ صاف سنائی دیتی ہے۔ اس کا نقطۂ عروج ابھی نہیں آیا۔

ایک تقابلی مطالعہ

دو شخصوں یا چیزوں میں موازنہ اور مقابلہ اسی وقت ممکن ہے جب ان میں کوئی چیز مشترک ہو، حالی اور شبلی کی حیثیتیں اور کارنامے گوناگوں ہیں اس لئے منصفانہ اظہار رائے کے لئے سب سے پہلے ایسے موضوع کا انتخاب ضروری ہے جو مشترک ہونے کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی زیادہ سے زیادہ صلاحیتوں کا ترجمان بھی ہو۔ سعدی کی زندگی اور ان کے کلام پر ان دونوں بزرگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور ان کی خوبیاں اور خامیاں بتائی ہیں، حالی کو یہ فخر حاصل ہے کہ انھوں نے شبلی سے پہلے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور بڑی تفصیل سے، دو سو آٹھ صفحات میں سعدی کی زندگی اور ان کے کارناموں پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی ہے، شبلی بعد میں اس میدان میں اترتے ہیں اور اس اعتراف کے ساتھ:-

"مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے حیات سعدی میں،
سعدی کے حالات اور شاعری پر جو کچھ لکھ دیا ہے۔ اس کے بعد کچھ
لکھنا بے فائدہ ہے۔ لیکن بعض تعلیم یافتہ لوگوں نے حد سے زیادہ اصرار
کیا اور آخر مجبوراً لکھنا پڑا۔" [1]

اس سلسلے میں ایک چیز جس پر توجہ دلانا ضروری ہے، یہ ہے کہ شبلی کا مقصد سعدی نہیں "شعر العجم" ہے، شعرائے فارسی کا یہ تنقیدی تذکرہ نامکمل رہ جاتا اگر وہ سعدی جیسے مشہور و مقبول زمانہ نامور اور شاعر کے ذکر سے خالی رہ جاتا ہے، بخلاف اس کے حالی کی توجہ کا مرکز، محور، مقصد، سعدی اور صرف سعدی ہیں،

تصنیف و تالیف کے دوران میں مصنف کو یوں تو مختلف منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور بہت سے مراحل طے کرنے ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں چند ایسے بھی ہوتے ہیں جو کبھی اور کسی صورت میں نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔

پہلا مرحلہ مواد کی تلاش اور فراہمی سے متعلق ہے، اس سے مصنف کی محنت، تلاش اور جستجو کے مدارج کا اندازہ لگانے میں مدد ملتی ہے۔

دوسرا مرحلہ فراہم کئے ہوئے مواد کی تحلیل، تقسیم، ترتیب یا تہذیب سے تعلق رکھتا ہے یہ کام پہلے سے زیادہ مشکل اور صبر طلب ہوتا ہے۔ اس سے لکھنے والے کے سلیقے اور تمیز کے بارے میں رائے قائم کی جاتی ہے۔

تیسرا اور آخری سب سے اہم مرحلہ، اظہار رائے کا ہوتا ہے، یہ چونکہ مصنف کی قوت فیصلہ، تنقیدی صلاحیت اور

---

[1] ملاحظہ ہو فٹ نوٹ (شعر العجم جلد دوم صفحہ ...)

انفرادی طبیعت کی غمازی کرتا ہے اس لئے اس سے اس کے افکار و خیالات، مبلغ علم، مزاج اور انداز فکر و نظر کو سمجھنے، پرے رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔

حالی نے "حیات سعدی" کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے میں سعدی کی زندگی کے نقوش مرتسم کئے گئے ہیں میں ان کی مقبولیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ تیسرے میں عام حالات، اور شاعری سے بحث ملتی ہے۔

دیباچے میں حالی لکھتے ہیں:-

"اگرچہ اسلام کے قدیم مصنفوں میں بے شمار لوگ ایسے گزرے ہیں جن کی عظمت وجلالت سامنے شیخ کو کچھ رتبہ نہیں ہے۔ مگر ہم نے سب سے اول شیخ کا حال اس لئے لکھا ہے کہ ہندوستان میں اس سے زیادہ کوئی مسلمان مقبول اور مشہور نہیں ہے اور خاص کر فارسی شعراء میں میرے کوئی شاعر اس کے رتبہ کو نہیں پہنچا۔" ؎

حالی اگر سعدی کی شہرت اور مقبولیت کا ذکر نہ کرتے تو بھی کوئی مضائقہ نہ تھا۔ لیکن ان کی شرافت نفس کیسے گوارا تھی کہ اظہار حقیقت میں ذرہ برابر کمی رہ جائے۔ اس بیان سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ حالی فارسی شعراء میں کسی کو وہ درجہ دینے کے لئے تیار نہیں جو ان کے نزدیک سعدی اور صرف سعدی کا حق ہے۔

سعدی کے معاملہ میں، جہاں تک مسالہ اور مواد کی تلاش اور فراہمی کا تعلق ہے۔ حالی کا کام شبلی سے زیادہ مشکل ہے ماخذات کی تلاش اور چھان بین میں شبلی کو زیادہ محنت اور کاوش نہیں کرنی پڑی۔ اس لئے کہ حالی نے آنے والوں کے اس کام کو بہت کچھ آسان بنا دیا تھا۔ البتہ اس میں شبہ نہیں کہ شبلی نے "مواد" کو زیادہ دل نشیں طریقے سے پیش کیا ہے۔ معلومات میں بھی کہیں کہیں اضافہ نظر آتا ہے لیکن یہ اتنا نمایاں نہیں کہ اس کا نظر انداز کردینا، بددیانتی کے مترادف ہو۔

سعدی کی عمر، سن پیدائش اور سیاحت کا جہاں تک تعلق ہے۔ شبلی، حالی کی معلومات پر، کچھ زیادہ قابل قدر اضافہ نہ کرسکے۔ یہ ضرور ہے کہ جو باتیں "حیات سعدی" میں کچے مال کی صورت میں ملتی ہیں انہیں شبلی نے زیادہ سجل اور نوک پلک سے درست کرکے پیش کیا ہے۔ نقش اول اور نقش ثانی میں جو فرق عام طور پر ہوا کرتا ہے یہاں بھی نمایاں ہے۔

سعدی کی تعلیم و تربیت کے باب میں اگرچہ شبلی نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے۔ لیکن معلومات کو کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے کہ نگاہ خود بخود حالی سے ہٹ کر شبلی پر پڑنے لگتی ہے۔ شبلی کا "اختصار" حالی کی "تفصیل" سے زیادہ مؤثر ہے۔ حالی کے سعدی میں جان تو ہے لیکن توانائی نہیں۔ شبلی کا سعدی جاندار بھی ہے اور توانا و تندرست بھی۔ "تربیت" کے بارے میں حالی اور شبلی کے بیانات یہ ہیں:-

حالی کہتے ہیں:-

"شیخ کا باپ جیسا کہ اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے ایک باخدا آدمی تھا۔ شیخ کے بچپن کا حال اس سے زیادہ معلوم نہیں کہ نماز روزہ کے مسائل اس کو بہت تھوڑی عمر میں یاد کرا دیئے گئے تھے اور بچپن ہی میں اس کو عبادت، شب بیداری، اور تلاوت قرآن مجید کا کمال شوق تھا۔ جیسا

اور تہواروں میں ہمیشہ باپ کے ہمراہ رہتا تھا۔ باپ اس کے اقوال و افعال کی نگرانی عام باپوں کی نسبت زیادہ کرتا تھا اور بے موقع بولنے پر زجر و توبیخ کرتا تھا۔ شیخ نے اپنی تربیت کا بڑا سبب اسی باپ کی تادیب اور زجر و توبیخ کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ بوستاں میں لکھا ہے:۔

ندانی کہ سعدی مکاں از چہ یافت
نہ ہامو نوشت و نہ دریا شگافت
بخردی بخورد از بزرگاں تفا
خدا دادش اندر بزرگی صفا " سلہ

اب شبلی کا بیان دیکھئے:۔

" شیخ کے بچپن کے حالات اگرچہ کسی تذکرہ نویس نے قلمبند نہیں کئے تھے۔ لیکن خود شیخ کے بیانات سے بہت سی دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شیخ کے والد شیخ کو مزید محبت اور تربیت کے خیال سے ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے۔ ایک دفعہ عیدگاہ میں ان کو ساتھ لیکر چلے ہاتھ میں دامن پکڑا دیا تھا کہ ساتھ سے الگ نہ ہوں ۔ راستہ میں بچے کھیل رہے تھے۔ یہ دامن چھوڑ کر ان میں جاملے۔ اور باپ کا ساتھ چھوٹ گیا۔ کشمکش اور ہجوم میں باپ کی صورت نظر نہ آئی تو گھبرا کر رونے لگے۔ اتفاق سے باپ نے دیکھ لیا۔ کان پکڑ کر کہا " احمق تجھ سے کہا نہ تھا کہ دامن نہ چھوڑنا " سلہ

شبلی اگر یہیں تک لکھ کر چھوڑ دیتے تو بیان کا مفہوم تقریباً وہی ہوتا، جو حالی کی تحریر کا ہے لیکن شبلی نے ان چند لفظوں کے اضافہ سے

" لیکن اس سے (دامن نہ چھوڑنے) یہ پاکیزہ نتیجہ نکالنا کہ:۔

توہم طفل راہی ، بہ سعی اے فقیر
برو دامن مرد دانا بگیر

شیخ ہی کا کام ہے " سلہ

ایک جہانِ معنی پیدا کر دیا ہے۔

حالی کے بیان سے سعدی کے والد کی شخصیت ، ان کی بزرگی ، خدا ترسی ، زہد و اتقا کا پتہ ضرور چلتا ہے لیکن سعدی کی فطری صلاحیتوں کا کوئی پہلو نمایاں نہیں ہوتا۔ شبلی کا آخری فقرہ سعدی پر کچھ ایسے زاویہ سے روشنی ڈالتا ہے کہ اس پیکر میں چھپی ہوئی ذہانت تاریکیوں کا پردہ چیر کر اجالے میں آجاتی ہے اور نگاہیں خود بخود باپ سے ہٹ کر بیٹے پر پڑنے لگتی ہیں سعدی کی طباعی اور ذہانت کو پیش کرنے کا، کیا اس سے بہتر طریقہ ممکن تھا۔

سعدی کم سن ہی تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ماں البتہ ان کی جوانی تک زندہ رہیں۔ اس واقعہ کو دونوں بزرگ بطرح بیان کرتے ہیں

سلہ حیات سعدی ۔ صفحہ ۱۱

حالی

لیکن شیخ کے بعض اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ باپ اس کو کم سن چھوڑ کر مر گیا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد غالباً والدہ نے اس کو تربیت کیا ہوگا کیونکہ اس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جوانی کی حالت میں اس کی ماں زندہ تھی۔

شبلی

شیخ کے باپ نے ان کے بچپن ہی میں وفات پائی اور جس ناز و نعم سے پل رہے تھے وہ سامان جاتے رہے۔ خود لکھتے ہیں:-

من آنگہ سر تاجور داشتم ٭ کہ سر در کنار پدر داشتم
اگر بر وجودم نشستے مگس ٭ پریشاں شدے خاطر چند کس
کنوں دشمناں گر برندم اسیر ٭ نباشد کس از دوستانم نصیر
مرا باشد از درد طفلاں خبر ٭ کہ در طفلی از سر برفتم پدر

لیکن ان کی والدہ ان کی جوانی تک زندہ رہیں اور ان سے بھی ان کو اخلاقی سبق ملتے رہے۔ گلستاں میں لکھا ہے:-

"وقتے از جہل جوانی بانگ بر مادر زدم، دل آزردہ بہ کنجے نشست و گریاں ہمیں گفت مگر خردی را فراموش کردی کہ درشتی می کنی۔"

حالی نے اجمالی انداز بیان اختیار کیا ہے۔ لہٰذا اسے پڑھ کر بات تو ضرور معلوم ہو جاتی ہے۔ لیکن خاطر خواہ تشفی نہیں ہوتی۔ شبلی نے بات کو چونکہ وثوق اور اعتماد کے ساتھ کہا ہے۔ اس لئے ان کے بیان سے ہم پورے طور پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ "گلستاں" سے اقتباس پیش کر کے شبلی نے اپنے دعوی کا ثبوت ہی فراہم نہیں کیا ہے۔ سعدی کی "اخلاقی جرارت" کی بھی ایک جھلک دکھا دی ہے

تحصیل علم کی غرض سے، شیراز چھوڑ کر سعدی بغداد جانے اور مدرسہ نظامیہ میں داخل ہونے کا ذکر حالی اور شبلی دونوں نے کیا ہے۔ البتہ "ترک وطن" کے جو وجوہ بیان کئے گئے ہیں وہ بالکل مختلف ہیں۔ شبلی کہتے ہیں:-

"شیراز میں اگرچہ تحصیل علم کا ہر قسم کا سامان مہیا تھا۔ سیکڑوں علماء و فضلا درس و تدریس میں مشغول تھے۔ . . . . . لیکن اس زمانہ میں تحصیل کمال کے لئے ممالک دور دراز کا سفر اور مشہور درسگاہوں میں حاضر ہونا لازمی اور ضروری امر خیال کیا جاتا تھا۔"

حالی اس کی وجہ شیراز کی اس ابتری اور خراب حالت کو قرار دیتے ہیں جو مفسدوں کے حملوں اور قتل و غارت گری سے پیدا ہو گئی تھی اور ذیل میں سعدی کے لئے یہ چار مصرعے:-

دلم از صحبت شیراز بکلی بگرفت ٭ وقت آنست کہ پرسی خبر از بغدادم
سعدیا حب وطن گرچہ حدیث است صحیح ٭ نتواں مرد بسختی کہ من ایں جا زادم

شبلی نے گو بات گلی بھی کہی ہے۔ لیکن یہ محض [illegible] قیاسیات پر مبنی ہے اس لئے اسے وہ درجہ حاصل نہیں ہو سکتا جو حالی بیان کو حاصل ہے۔ آگے چل کر حالی لکھتے ہیں:-

"آخر کو شیخ نے مدرسہ نظامیہ میں جا کر تحصیل علم شروع کی [illegible]۔ بغداد میں جن لوگوں سے شیخ نے

وصیت کی تھی کہ میں نے جن قلموں سے حدیث لکھی ہے ان کا تراشہ میرے حجرے میں ہے مرنے کے بعد مجھ کو نہلائیں تو غسل کے لئے اس تراشے سے پانی گرم کریں۔ چنانچہ اس کی وصیت کے موافق عمل کیا گیا اور پانی گرم ہو کر کچھ تراشہ بچ رہا۔ سلہ

یہ بیان نہایت بچپسپا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس میں ایک ایسے واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے جو عقل و روایت کی رو سے ناقابل قبول ہے یہ بات بھی پورے طور پر صاف نہیں ہوتی کہ آیا ابن جوزی کا تعلق مدرسہ نظامیہ سے تھا بھی یا نہیں۔ دوسری طرف شبلی نہ صرف قلم کے تراشے سے پانی گرم کرنے کے خلاف عقل واقعہ کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے، اور نظر انداز کر دیتے ہیں بلکہ سعدی کے تلمذ اور نظامیہ سے ابن جوزی کے تعلق کے بارے میں بھی ہماری معلومات میں، بعض باتوں کا قابل قدر اضافہ کرتے ہیں مثلاً یہ مدرسۂ نظامیہ کی فہرست میں ابن جوزی کا نام نہیں، یا یہ کہ سعدی کے اساتذہ کے بارے میں قطعی اور یقینی طور پر کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ سعدی خود کو ابن جوزی کا شاگرد بتاتے ہیں۔ حالی اسے تسلیم کرتے ہیں اور تسلیم نہ کرنے کی کوئی معقول وجہ بھی نہیں معلوم ہوتی ہے۔ البتہ شبلی کی رائے یہ ہے:۔

"ان قرائن سے کہ شیخ نے ابن جوزی کی شاگردی کی، ابن جوزی بغداد میں رہتے تھے، شیخ نظامیہ میں حدیث پڑھتے تھے لوگوں نے نتیجہ نکالا ہے کہ شیخ نے نظامیہ میں ابن جوزی ہی کے آگے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ لیکن مدرسین نظامیہ کی فہرست میں ہم ابن جوزی کا نام نہیں پاتے۔ بے شبہ ابن جوزی بغداد میں حدیث کا درس دیتے تھے لیکن اپنے مکان پر دیتے ہوں گے۔ نظامیہ سے ان کا تعلق ثابت نہیں ہوتا یہ عجیب بات ہے کہ ابن جوزی کا اثر شیخ کی تعلیم پر نہیں پڑا۔ ابن جوزی ان محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں جو حدیث اور روایت میں نہایت سخت احتیاط سے کام لیتے تھے اور مشتبہ اور ضعیف روایتوں کو بالکل ترک کر دیتے ہیں۔ لیکن شیخ اتفاق سے کہیں کوئی حدیث ذکر کرتے ہیں تو عموماً ضعیف بلکہ مصنوعی ہوتی ہے" سلہ

"حیات سعدی" میں سعدی کے اس کمزور پہلو کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ اس فروگذاشت کی تین وجہیں ہو سکتی ہیں یہ کہ حالی سعدی کی بزرگی کے خیال سے عمداً اور قصداً اس کا ذکر نہیں کرتے۔ دوسری یہ کہ اس عقیدت و محبت کی بنا پر جو حالی کو سعدی سے تھی، اُن کی نگاہیں اس نقطہ تک نہ پہنچ سکیں، جہاں پہنچ کر سارے حجابات خود بخود اُٹھ جاتے ہیں۔ تیسری یہ کہ علم حدیث میں حالی کو خود وہ مرتبہ حاصل نہیں تھا، کہ وہ کسی روایت کو فنی اعتبار سے حقیقی یا وضعی کہنے میں اعتماد سے کام لے سکیں۔ آخری صورت زیادہ قرین قیاس، معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ "حیات سعدی" میں ایک موقع پر ان الفاظ میں ان کا اعتراف مل جاتا ہے:۔

" بہ نسبت اس کے کہ شیخ پر غلط بیانی کا الزام لگایا جائے۔ یہ بہتر ہے کہ اس کے بیان کو اس مقام پر ادائے مطلب سے قاصر سمجھا جائے۔" سلہ

سعدی نے عباسیہ کے آخری خلیفہ مستعصم باللہ کا جو مرثیہ لکھا ہے اس پر حالی اور شبلی اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:۔

حالی

"مستعصم باللہ کو کیسا ہی نالائق اور قابل نفریں سمجھو ... کہ جب ہلاکو خاں نے بغداد پر چڑھائی کی تو ابوبکر نے بیٹے ...

شبلی

"ابوبکر سعد نے ہلاکو خاں کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ یہاں تک کہ ... کر کے اس کے بگڑنے سے نہ صرف ...

بنی عباس کی حکومت دنیا سے اٹھ گئی بلکہ مشرق و مغرب تک، جہاں عرب کے قدم جمے ہوئے تھے۔ یکبارگی ان میں تزلزل آگیا . . . . . . شیخ نے حقیقت میں مستعصم باللہ کا مرثیہ نہیں لکھا بلکہ اسلام کا مرثیہ لکھا ہے۔[۱۸]

سعد کو فوج دے کر اعانت کے لئے بھیجا۔ اور جب بغداد تاراج ہوا تو ابوبکر نے مبارکباد کے لئے سفارت بھیجی باینہمہ شیخ نے بغداد کی تباہی اور خلیفہ مستعصم باللہ کے قتل کا مرثیہ لکھا ہے اور اس قدر پر اثر لکھا کہ لوگوں کے دل ہل گئے۔ یہ مرثیہ درحقیقت ابوبکر سعد زنگی کی ہجو تھی کہ اس نے اسلام کی تباہی اور بربادی میں ہلاکو خاں کا ساتھ دیا۔[۱۹]

مذکورہ بالا اقتباسات، "پیرایۂ بیان" اور "تاویل" کے اعتبار سے مختلف ہیں (حالی اسے اسلام کا مرثیہ قرار دیتے ہیں اور شبلی اسے سعد زنگی کی ہجو ملیح بتاتے ہیں)۔ لیکن بات دراصل ایک ہی کہی گئی ہے۔ سعد بن زنگی کی ہجو ملیح ہو یا اسلام کا مرثیہ۔ تہہ میں ایک ہی جذبہ کام کر رہا ہے (سعدی کی اسلام سے غیر معمولی محبت اور ہمدردی کا جذبہ)۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ شبلی کے بیان سے ایک مرتبہ پھر سعدی کی بے مثل اخلاقی جرأت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ سب جانتے اور مانتے ہیں کہ سعد بن زنگی سعدی کا ممدوح ہے۔ مگر اس بات سے فائدہ شبلی نے اٹھایا ہے۔ سعد کو سعدی کا ممدوح اور مستعصم کے مرثیہ کو سعدی کی ہجو ملیح قرار دے کر کیا سعدی کی اخلاقی جرأت اور آزادی رائے کو واضح اور متعین نہیں کر دیا۔

حالی نے سعدی کی "سیاحت اور سفر سے واپسی" کا حال چھبیس[۲۶] صفحوں میں نہایت شرح و بسط سے لکھا ہے لیکن اس سے نہ سعدی کے مشاہدات و تجربات پر روشنی پڑتی ہے، نہ پورے طور پر اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سیر و سیاحت نے ان کی کن کن صلاحیتوں کو کس طرح اور کس حد تک متاثر کیا۔ شبلی زیادہ نہیں پھیلتے یہاں بھی انھوں نے حسب معمول "اجمال" سے کام لیا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ تصویر کا ہر ضروری خط یہاں موجود ہے۔ مثال کے طور پر دو اقتباسات پیش ہیں:-

۱۔ "شیخ کا شمار صوفیہ کبار میں ہے اور بے شبہ وہ پاکیزہ باطن اور صاحب حال تھے۔ لیکن ان کی مخصوص حالت یہ ہے کہ وہ اس رتبہ پر مجاہدہ اور ریاضت کے بعد پہنچے تھے۔ ان کی اصل سرشت یہ تھی، بچپن سے شباب بلکہ ادھیڑ پن کے زمانہ تک ان میں وہ اوصاف نظر آتے ہیں جو مولویوں کا خاصہ ہیں۔ یعنی خودبینی، حرف گیری، مشیخت و مخاصمت۔ باپ کی صحبت کے اثر سے بچپن میں عبادت کا ذوق و شوق ہو گیا ہے۔ شب بیداری اور وظائف میں مصروف ہیں لیکن ساتھ ہی اوروں پر حرف گیری بھی کرتے جاتے ہیں . . . . حسن پسندی، امرد پرستی تک پہنچ گئی ہے اور ایسے کھل کھیلتے ہیں کہ اس کا ذکر تک نہیں کیا جا سکتا۔ بے شبہ یہ باتیں ان کے عارض کمال کے داغ ہیں لیکن ایک رفارمر اور مصلح کے لئے ان تمام مراحل سے گزرنا ضرور تھا۔ . . . . . شیخ نے چونکہ بیماریاں اٹھا کر صحت پائی تھی اس لئے وہ امراض (اخلاقی) کی حقیقت، ماہیت، علامات اور طریق علاج سے جس قدر واقف ہو سکے دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔"[۲۳]

۲۔ "سیر و سیاحت کی غرض مختلف ہوتی ہے اور ہر غرض پیش نظر ہوتی ہے۔ سیاح اسی حیثیت سے تمام

چیزوں کو دیکھتا ہے، بلکہ تمام چیزیں اُسی حیثیت سے اس کی نظر میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ شیخ میں کثرت سے
مختلف حیثیتیں جمع تھیں۔ وہ شاعر تھے، صوفی تھے، فقیہ تھے۔ واعظ تھے، حسن پرست تھے۔ رند تھے
شوخ طبع تھے اس لئے انھوں نے تماشا گاہ عالم کو ہر ہر پہلو سے دیکھا۔" [۱]

سعدی کی زندگی میں جو تنوع اور رنگا رنگی ہمیں ملتی ہے۔ اس کے اظہار کا اس سے بہتر طریقہ تصور میں نہیں آسکتا۔ الفاظ
کی سادگی اور زبان کی صفائی اور روانی کے ساتھ ساتھ زور بیان، صحت خیال، حسن ادا، غرض کیا ہے جو اس اقتباس میں موجود نہیں۔
"بوستاں" میں سب سے زیادہ عجیب و غریب چیز "واقعہ سومنات" اور اس کا ذکر ہے۔ اس کی بنیاد اتنی کمزور اور جزئیات
اس درجہ ناقص اور ناقابلِ فہم ہیں کہ بات حلق سے نیچے نہیں اترتی۔ اور واقعہ سرے سے ناقابلِ قبول ہو جاتا ہے:۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

سعدی کے اس بیان پر دونوں بزرگوں نے تنقیدی نظریں ڈالی ہیں اور اس پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ اس لئے حالی اور
شبلی کی بعض صلاحیتوں کو جانچنے کا اس سے بہتر اور کوئی موقع میسر نہیں آسکتا پھر کیوں نہ اسی کسوٹی پر دونوں کے سونے کس
لئے جائیں۔ حالی نے اس حکایت کو "گلستاں" اور "بوستاں" کی ساری حکایتوں سے زیادہ عجیب قرار دیا ہے۔ پھر بھی اس خلاف
قیاس قصہ پر جو اعتراض تھا، اس کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں:۔

"اس اعتراض کے جواب میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید یہ واقعہ یعنی سومنات میں جانا اور مندر
میں ہندو بن کر رہنا اور ایک شخص کو اپنی جان کے خوف سے کنویں میں ڈھکیل کر بھاگ جانا صحیح ہو مگر
اس صورت میں یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اس واقعہ کے تمام جزئیات کی صحیح تصویر شیخ سے پوری نہیں
کھنچ سکی اصل یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ نظم میں بیان کیا جاتا ہے تو شاعر کو اکثر وزن و قافیہ کی ضرورت
سے کہیں کہیں اصل مدعا میں ضرور کمی بیشی کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات وہ شاعرانہ خیالات کی رو میں اصل
واقعہ سے دور جا پڑتا ہے۔" [۲]

اعتراض کا جواب لفظ "شاید" سے شروع ہوتا ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ حالی کا دل اس حکایت کو باور کرنے پر پورے
طور پر آمادہ نہیں۔ پھر بھی شرافت نفس کا تقاضہ اور سعدی کی عظمت و بزرگی کا احترام، مجبور کرتا ہے کہ کھلم کھلا اس کا اظہار نہ
ہو اور دل کی بات زبان پہ نہ آنے پائے چنانچہ وہ تاویل پر اتر آتے ہیں اور سارا الزام ردیف و قافیہ کی مجبوری اور "شعری ضرورت"
کے سر تھوپ دیتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ "پردہ رکھنا" بڑی صفت ہے۔ مگر "انصاف" بھی تو عیب نہیں۔ شبلی نے پردہ رکھنے کی کوشش نہیں
کی ہے انھوں نے واقعہ پر تیز، گہری اور غیر جانبدارانہ نظر ڈالی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نگاہیں "توہمات" میں الجھے بغیر "تجلیات"
تک پہنچ گئیں اور وہ ان جہلیات کا پردہ فاش کرنے میں کامیاب ہو گئے جو واقعہ کی جزئیات کی رگ رگ میں دوڑ رہے تھے۔ چنانچہ
وہ سعدی کے اس بیان کو "نہایت بعید از قیاس" کہنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"ان واقعات بیان میں عام غلطیاں تو یہ ہیں کہ بت کو ہاتھی دانت کا بنایا ہے حالانکہ ہاتھی دانت کو ہندو پاک نہیں سمجھتے اس لئے اس کا بت نہیں بنا سکتے۔ برہمنوں کو لکھا ہے کہ وہ پاژند پڑھتے تھے:-

فتادند گبران پاژند خواں کہ چون سگ بامن از بہر آن استخواں

حالانکہ پاژند۔ ہندوؤں کی کتاب نہیں بلکہ پارسیوں کا صحیفہ ہے۔

برہمنوں کو کہیں "گبر" اور کہیں "مطران" کہتے ہیں:-

پس پردہ مطران آذر پرست

حالانکہ مطران عیسائیوں کے پادری کو کہتے ہیں۔ پھر مطران کو آذر پرست کہنا اور بھی لغویت ہے" لہ

شبلی جس نتیجہ پر پہنچے ہیں، وہ بھی انہیں کی زبان سے سننے کے لائق ہے:-

"حقیقت یہ ہے کہ یہ (سعدی) تازہ ولایت تھے۔ خدا جانے کس چیز کو کیا سمجھے۔ اور کس واقعہ کو کیونکر لکھ گئے۔ اکثر انگریزی خواں سیاحوں کا یہی حال ہے۔ دو چار دن ہندوستان میں رہ کر سفرنامے لکھتے ہیں۔ جن کو پڑھ کر ہندوستانیوں کو غور کرنا پڑتا ہے کہ یہ کس ملک کی داستان ہے۔" سلہ

حالی کی توجہ "نفس واقعہ" پر اتنی نہیں، جتنی "اعتراض" پر ہے۔ شبلی نے صرف واقعہ اور اس کی جزئیات سے سروکار رکھا ہے وہ اعتراضات کو خاطر میں نہیں لاتے۔ انھیں اس سے بحث نہیں کہ دوسرے کیا کہتے ہیں وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور دوسروں کے اقوال و آرا پر اس وقت تک توجہ نہیں کرتے۔ جب تک کہ خود کسی نتیجہ پر نہ پہنچ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی رائیں عموماً صحیح، متوازن اور واضح ہوتی ہیں۔ وہ اپنی رائے اور خیال کا اظہار اس وقت تک نہیں کرتے۔ جب تک کہ خود بات کے ایک ایک پہلو کو دیکھ اور پرکھ کر پورے طور پر مطمئن نہیں ہو جاتے، حالی نے سعدی کے بیان کئے ہوئے ناقابل یقین واقعات کی جو تاویل کی ہے۔ ممکن ہے کہ حالی کی بزرگی کے پیش نظر لوگ اس کی تردید پسند نہ کریں۔ لیکن واقعات کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ مولانا حالی کی تاویل کے باوجود پڑھنے والے کا دل بطور خود مطمئن نہیں ہوتا اور اس کے دل میں یہ خلش برابر باقی رہتی ہے کہ سعدی نے اس محل پر دانستہ یا نادانستہ واقعات کے بیان میں غلطی ضرور کی ہے اس کے علاوہ حالی کے بیان سے سعدی ایک چھوٹے سے الزام سے ضرور بچ جاتے ہیں۔ لیکن غور تو کیجئے حالی کی اس وکالت سے ان کی قادرالکلامی پر حرف آتا ہے، چند سنگ ریزے دریا کے بہاؤ کو روک دیں، قیاس میں آنے والی بات نہیں، ردیف و قافیہ کی مجبوری سہائی بند شاعروں کی بے بضاعتی کا مضحکہ اڑا سکتی ہے شاعر کے راستہ میں حائل ہونے کی جرأت و جسارت نہیں کر سکتی۔

حالی نے جو عذر پیش کیا ہے وہ عام شاعروں کو الزام سے بچانے کے لئے یقیناً کافی ہے۔ مگر فردوسی اور انوری کی صف میں بیٹھنے والے شاعر کا شمار عام شاعروں میں تو نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کہنا کہ سعدی کو وزن و قافیہ کی ضرورت سے کہیں اصل مضامین کی بیشی کرنی پڑی اور وہ شاعرانہ خیالات کی رو اصل واقعہ سے دور جا پڑے، سعدی کو اس بلند مقام سے محروم کر دیتا ہے جس کے بجا طور پر وہ مستحق ہیں۔ شبلی تازہ ولایت کہہ کر اپنا کام بھی نکال لیتے ہیں اور سعدی کی شاعرانہ عظمت پر بھی حرف نہیں آتا۔

یہ بات شبلی ہی کے لفظوں سے ہمیں معلوم ہوتی ہے کہ سعدی نے تصوف اور سلوک کا قطرہ شبنم شمار [illegible]

"اس سیاحت کی بدولت انکا (شیخ شہاب الدین) ساتھ ہوا۔ اور ان کی فیض صحبت سے شیخ نے تزکیۂ نفس کے مراتب طے کئے۔"

اور پھر ثبوت میں سعدی کے یہ اشعار پیش کرتے ہیں :۔

مرا پیر دانائے فرخ شہاب کرد دو اندرز فرمود بر روئے آب
یکے آں کہ بر خویشن خود بیں مباش گرد دگر آں کہ بر غیر بدبیں مباش

حالی نے ابوبکر سعد کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ غور و فکر کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتا۔ یہ بیان متناقض اور متضاد خیالات کا مجموعہ ہے۔ معلومات، جہاں اور جس ذریعہ سے ہاتھ آئے یکجا جمع کر دیئے گئے ہیں۔ مواد پر تنقیدی نگاہ نہیں ڈالی گئی۔ حالی نے محض "روایت" پر بھروسہ کیا ہے۔ "درایت" سے کام نہیں لیا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض ایسی باتیں سلسلۂ کلام میں جذب ہو کر رہ گئیں جو "حیات سعدی"، جیسی سنجیدہ تصنیف کے شایانِ شان نہیں۔ حالی تاریخ وصّاف کے حوالے سے لکھتے ہیں :۔

"ایک جاہل آدمی شیخنت آب بن کر ابوبکر کے دربار میں آیا۔ اتابک نے اس کی بہت تعظیم و تکریم کی اور جب نمازِ مغرب کا وقت آیا تو اس کو اپنا امام بنایا۔ شاہ صاحب نے قرات غلط پڑھی۔ مگر جس قدر انھوں نے قرات میں غلطیاں کیں اسی قدر اتابک کو ان کے ساتھ زیادہ عقیدت ہوئی اور بہت کچھ دیکر انھیں رخصت کیا۔" ۵۲

یہ بیان اس وقت اور بھی زیادہ مضحک نظر آتا ہے جب ہم ماقبل کی اس عبارت کے ساتھ پڑھتے ہیں :۔

"آپ نے اپنی خوبیوں کے سبب بے انتہا شہرت اور نیک نامی حاصل کی تھی اور اطراف و جوانب سے مشائخ اور زہاد ان کی شہرت سن کر آتے اور ان کی کمال تعظیم اور احترام کیا جاتا تھا۔ شیراز کی خانقاہیں، عبادت خانے، مدرسے اور مسجدیں جو ویران ہو گئیں تھیں، اس کے عہد میں آباد کی گئیں اور ایسی عمارتوں کی امداد کے لئے گاؤں اور جاگیریں وقف کیں۔ ایک شفا خانہ شیراز میں بنوایا اور بڑے بڑے حاذق طبیب اس پر مامور کئے گئے۔ اپنی دانشمندی اور حسن تدبیر سے ملک فارس کو مغول تاتار کے سیلاب سے جس کی کہیں پناہ نہ تھی محفوظ رکھا۔"

وہ بادشاہ جس کی شہرت اور نیک نامی کے ڈنکے بج رہے ہوں جس نے اپنے حسنِ انتظام سے ملک کو از سر نو رونق بخشی ہو۔ جس میں تعمیر و تنظیم کی غیر معمولی صلاحیت ہو۔ جس کے دم سے زہاد و مشائخ شاد اور مسجدیں آباد ہو گئی ہوں جس کے فیض و برکات مدرسوں اور شفا خانوں کی شکل میں ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہوں اتنا احمق تو نہیں ہو سکتا کہ ایک شیخنت مآب جاہل کی جہالتوں کو بڑی سی بڑی قیمت پر خریدنے کو تیار ہو جائے۔ آگے چل کر حالی سعدی کے اس قطعہ کو جس کے آخری دو شعر یہ ہیں :۔

چناں بود در عہد اول کہ دیدم گرد جہاں پر ز آشوب و تشویش و تنگی
چناں شد در ایام سلطان عادل گرد اتابک ابوبکر بن سعد زنگی

نقل کر کے لکھتے ہیں :۔

"شیراز پہنچ کر ظاہرا شیخ نے جامۂ علم وفضیلت اتار کر بالائے طاق رکھ دیا تھا کیونکہ اتابک ابوبکر میں باوجود ان تمام خوبیوں کے جو اوپر مذکور ہوئیں ایک نہایت سخت عیب بھی تھا وہ ہمیشہ علماء اور فضلا سے بدگمان رہتا تھا . . . . . اسی بدگمانی کے سبب سے چند جلیل القدر ائمہ اور علماء کو اس نے جبراً شہر سے نکلوا دیا تھا۔" سلہ

اس واقعہ سے انکار کی ضرورت نہیں کہ ابوبکر سعد نے چند جلیل القدر علماء کو شہر بدر کر دیا تھا لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ بزرگ محض اپنے علم وفضل کی بنا پر معتوب ہوئے، یقیناً صحیح نہیں۔

شبلی کا بیان اس سے مختلف ہے اسے پڑھ کر اس بات کا خوشگوار احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے تذکرہ نگاروں کے دور از کار بلکہ لغو بیانات کو جو جرح وتعدیل کی میزان پر پورے نہیں اترتے، سرے سے قلم انداز کر دیا ہے اور محض ان معلومات کو اپنایا ہے جو سعدی کی شخصیت اور شاعری کے کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کرنے میں کام آسکتے تھے۔ سعدی کا شیراز واپس آنا، ابوبکر سعد کے دربار سے وابستہ ہونا، مدحیہ قصائد لکھنا، "گلستاں" اور "بوستان" کو اسی کے نام سے معنون کرنا، ان تمام باتوں کو انھوں نے اس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا اس سے اختلاف کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ان تمام باتوں کے پیشِ نظر شبلی جو نتیجہ نکالتے ہیں یہ ہے:۔

"لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ (سعدی) آزاد مزاجی کی وجہ سے دربار کے قابل نہ تھے اور ابوبکر سعد نے اس وجہ سے ان کی چنداں قدر نہیں کی چنانچہ ایک قصیدے میں ہلکی سی شکایت بھی کی ہے:۔

بہ دولتت ہمہ افتادگاں بلند شدند　چو آفتاب کہ بر آسماں برد شبنم
مگر کمینہ اساد بندگاں سعدی کو کہ سعیش از ہمہ بیش است وحظش از ہمہ کم

سعدی کی اسی آزاد مزاجی نے جو درحقیقت ان کی اخلاقی جرأت کا سرچشمہ ہے اور جس کا ثبوت قدم قدم پر ان کی شاعری میں ملتا ہے۔ انھیں ان مذموم عادات وخصائل سے محفوظ رکھا جو دربار میں فروغ پانے کے لئے ازبس ضروری ہیں ایسی صورت میں سعدی اور ابوبکر سعد کا ایک دوسرے سے مطمئن نہ ہونا قرینِ عقل ہی نہیں قطعی اور لازمی ہو جاتا ہے۔

سعدی کی شہرت کی بنیادیں ان کی زندگی ہی میں استوار ہو چکی تھیں اور دور دراز ملکوں تک ان کی فصاحت، بلاغت اور جادو بیانی کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ جہاں جاتے ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے۔ سعدی کے کاشغر جانے اور وہاں کی مسجد میں ایک طالب علم سے ملنے کے دلچسپ واقعات پر حالی اور شبلی کے بیانات خصوصی توجہ کے مستحق ہیں:۔

حالی	شبلی
جس زمانہ میں شیخ کاشغر پہنچا، غالباً یہ وہ زمانہ ہے کہ چنگیز خاں، چینی تاتار کو خوارزمیوں سے فتح کر چکا ہے اور سلطان محمد خوارزم کے ساتھ چند روز کے لئے اس کی صلح ہو گئی ہے جب شیخ کاشغر کی جامع مسجد میں گیا تو وہاں ایک طالب علم مقدمۂ زمخشری ہاتھ میں لئے	جس زمانہ میں سلطان خوارزم شاہ نے خطا والوں سے صلح کر لی شیخ کاشغر میں آئے، جامع مسجد میں ایک مدرسہ تھا جس میں حسبِ دستور درسیات کی ابتدائی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ سیر کرتے کرتے مدرسہ میں آئے ایک خوش جمال لڑکا زمخشری کی کتاب غالباً مفصل ہوگی

زبان سے یہ کہہ رہا تھا ضرب زید عمروا ۔ شیخ اس سے
چل کی باتیں کرنے لگا اور کہا کہ کیوں صاحب خوارزم
اور خطا میں صلح ہو گئی مگر زید و عمرو کی خصوصیت بدستور
چلی جاتی ہے ۔ طالب علم ہنس پڑا اور شیخ کا وطن پوچھا ۔
فرمایا خاک پاک شیراز ۔ اس نے کہا کہ کچھ سعدی کا کلام
یاد ہے ؟ شیخ نے بطریق مزاح اسی وقت دو عربی کے شعر
کہہ کر پڑھے ۔ اس نے کسی قدر تامل کے بعد کہا ۔ سعدی کا
زیادہ تر کلام فارسی ہے اگر کچھ اس میں سے یاد ہو تو پڑھیے
آپ نے ویسے ہی دو فارسی شعر پڑھے جن میں سے ایک یہ ہے :-

اے دل عشاق بدام تو صید
ما بتو مشغول و تو با عمرو زید

صبح کو جب شیخ نے کاشغر سے چلنے کا ارادہ کیا کسی نے
اس طالب علم سے کہہ دیا کہ سعدی یہی شخص ہے ۔ وہ بھاگا
ہوا شیخ کے پاس چلا آیا اور نہایت افسوس کیا کہ پہلے سے
آپ نے اپنا نام نہ بتایا کہ میں آپ کی خدمت گزاری کی سعادت
حاصل کرتا ۔ اگر اب بھی چند روز شہر میں چل کر قیام کیجیے
تو ہم لوگ خدمت گزاری سے مستفید ہوں اس کے جواب
میں آپ نے یہ شعر پڑھے :-

بزرگے دیدم اندر کوہسارے
قناعت کردہ از دنیا بہ غارے
چرا گفتم بہ شہر اندر نیائی
کہ بارے بند از دل برکشائی
بگفت آنجا پری رویان نغز اند
چو گل بسیار شد، پیلاں بلغزند

پڑھ رہا تھا ۔ اور یہ فقرہ زبان پر تھا ۔ "ضرب زید عمروا"
شیخ نے کہا خوارزم اور خطا میں صلح ہو گئی ۔ اور زید و عمرو کا جھگڑا
اب تک ختم نہیں ہو چکا ۔ لڑکا ہنس پڑا اور ان کا نام اور پتا
پوچھا ۔ انھوں نے کہا شیراز ۔ شیخ کا شہرہ عالمگیر ہو چکا تھا ۔
شیراز کا نام سن کر اس نے کہا کہ سعدی کے شعر بھی کچھ آپ
کو یاد ہیں ؟ انھوں نے عربی کے دو شعر اسی وقت موزوں کر کے
پڑھے ۔ لڑکا سمجھ نہ سکا ۔ بولا ہمارے ملک میں تو ان کے
فارسی شعر مشہور ہیں ۔ آپ فارسی شعر پڑھتے تو میں سمجھ
بھی سکتا ۔ شیخ نے برجستہ کہا :-

اے دل عشاق بدام تو صید
ما بتو مشغول و تو با عمرو زید

دوسرے دن کسی نے لڑکے سے کہہ دیا کہ یہی سعدی
ہیں وہ دوڑا ہوا شیخ کے پاس آیا اور نہایت اخلاص
عقیدت ظاہر کی اور کہا کہ آپ نے نام کیوں نہیں ظاہر
فرمایا کہ میں خدمت گزاری کی سعادت حاصل کر سکتا ۔ شیخ
نے جواب دیا :-

با وجودت ز من آواز نیاید کہ منم

لڑکے نے عرض کیا کہ چند روز آپ کا قیام ہوتا تو سب آپ
سے مستفید ہوتے ۔ شیخ نے کہا نہیں ۔ ہما نہیں ٹھہر سکتا
پھر یہ اشعار پڑھے :-

بزرگے دیدم اندر کوہسارے
قناعت کردہ از دنیا بہ غارے
چرا گفتم بہ شہر اندر نیائی
کہ بارے بند از دل برکشائی
بگفت آنجا پری رویان نغز اند
چو گل بسیار شد، پیلاں بلغزند

وقت کی تہذیب دیکھو شیخ جیسا مقدس لوگ

لہ حیات سعدی صفحہ ۵۳

صوفی منش ایک امرد کو گلے لگاتا ہے، منہ چومتا ہے اور سپر دیدہ دلیری سے کہتا ہے:-

"ایں بگفتیم و بوسۂ چند بر سر و روئے یکدگر دادیم و وداع کردیم" سلہ

حالی اور شبلی کے مذکورہ بالا بیانات کیا مندرجہ ذیل نتائج کی طرف ہماری رہبری نہیں کرتے؟

۱۔ حالی نے یہاں بھی حسب معمول "اجمالی انداز بیان اختیار کیا ہے اور یہ ان کی عادت معلوم ہوتی ہے یہی وا[ضح ہے] کہ اپنی جس رائے پر انھیں پورا پورا اعتماد اور کامل وثوق بھی ہوتا ہے اُسے بھی وہ مبہم طریقہ سے بیان کرتے [ہیں] یہ ہوتا ہے کہ ان کی بات، آخری بات نہیں معلوم ہوتی اور پڑھنے والا "کسی شے" کی کمی محسوس کرتا ہے۔

۲۔ حالی انسان کو خطا اور نسیان کا پتلا جاننے اور ماننے کے باوجود، اس کی کمزوریوں کا برملا اظہار [مناسب] نہیں سمجھتے اور حتی الوسع ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس کوشش میں پورے طور [پر] کامیاب نہیں ہو پاتے - وہ "طالب علم" کا ذکر کرتے ہیں، سعدی اور اس کے درمیان جو گفتگو ہوئی مزے لیکر بیان کرتے ہیں۔ لیکن کچھ فطری شرم و حیا اور کچھ رسم و رواج کی بیجا پابندی انھیں اس کی اجازت نہیں دیتی کہ طالب علم کی اس صفت کا بھی ذکر کر دیں جس کی جاذبیت نے سعدی کی توجہ کو اپ[نی] طرف مبذول کر لیا تھا۔ اور جو درحقیقت اس سارے واقعہ کی علت، سبب اور رجحان ہے۔ طبیعت [کی] اس شرمیلے پن نے اس حقیقت کے اظہار سے باز تو نہیں رکھا البتہ "اظہار" کا پورا پورا حق ادا نہ ہو سکا۔ سعدی کی "نظر التفات" کو جذب کرنے والی شے کوئی اور چیز ہے "ضرب زید عمرا" ہرگز نہیں اس "شے" کا سراغ لگانا مقصود ہو تو شبلی کے بیان کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے

سامنے کی بات کو سیدھے سادے طریقے سے بیان کر دینا تو ہر شخص کے لئے بہ آسانی ممکن ہے لیکن اپ[نے] تجربات، جذبات اور احساسات کو اس طرح کھول کر دوسروں کے سامنے بیان کر دینا کہ وہ بھی اسے اسی طر[ح] سمجھ لیں اور محسوس کرنے لگیں جس طرح کہنے والے نے اسے سمجھا یا محسوس کیا تھا یقیناً بڑا کارنامہ ہے لیک[ن] سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ بات اس طرح کہی یا لکھی جائے کہ اس سے سامع یا قاری پورے طور پر لطف[اندوز] بھی ہو - "فصاحت" اور "بلاغت" میں بڑا نازک اور لطیف فرق ہے - کوئی کلام اس وقت تک بلیغ [نہیں] ہو سکتا جب تک کہ وہ فصیح نہ ہو۔ یہ دونوں صفتیں ایک دوسرے کی ضد ہرگز نہیں، معاون و [مددگار] ہیں۔ ان میں آپس میں بڑا ربط و ارتباط ہے پھر بھی اگر ہم تفریق کرنا ہی چاہیں تو "جادہ" و "منزل" [کے] کر انھیں دو خانوں میں بانٹ سکتے ہیں۔ مذکورہ بالا دو نقل بیانات میں فرق ہے تو صرف اتنا ہی ہے واقعہ کے بیان کا جہاں تک تعلق ہے دونوں پورے طور پر اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

حالیؔ اور شبلیؔ دونوں ہی ادب کے تیز رو شہسوار ہیں۔ لیکن اس دور میں حالیؔ کا پیر کہیں کہیں رکاب سے نکل گیا ہے اور وہ ڈگمگائے ہیں۔ اس خیال کی تائید میں ذیل کے جملے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ شیخ اس سے چہل کی باتیں کرنے لگا۔

۲۔ اگر اب بھی چند روز شہر میں چل کر قیام کیجئے تو ہم لوگ خدمت گزاری سے مستفید ہوں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے حالیؔ نے اپنے بیان میں کسی ایسی چیز کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے جو سعدیؔ کی "چہل کی باتوں" کے لئے "موقع و محل" کی زمین تیار کرتی۔ اس کے علاوہ مولانا حالیؔ نے شیخ سعدیؔ کو عموماً تقدس و اتقا کے لباس میں پیش کیا ہے۔ اس بنا پر چہل کا لفظ ایک مقدس بزرگ کے شایانِ شان معلوم نہیں ہوتا۔ اور اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے قیاس بھی کر لیں تو بھی چہل کا لفظ کھٹکتا ہے۔ دوسرا جملہ "شہر میں چل کر قیام کیجئے" غیر ضروری ہی نہیں بے محل بھی ہے۔ حالیؔ کے یہاں جو کچھ ہے۔ بیان ہے۔ شبلیؔ کے بیان میں بیان کے ساتھ ساتھ انداز بیان بھی دیکھنے کی ایک چیز ہے۔ انھوں نے طالب علم کو "خوش جمال" کہہ کر قارئین کو پہلے سے پیش آنے والے واقعے کی طرف اشارہ کر کے متوجہ کر دیا ہے۔ پڑھنے والا امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا، منتظر ہے کہ دیکھئے کس خرمن کی قسمت جاگتی ہے اور کہاں یہ بجلی گرتی ہے۔ بادی النظر میں "خوش جمال" کا ٹکڑا طالب علم کی صفت ہے اور بس مگر غور کیجئے تو اس سے کتنا بڑا کام لیا گیا ہے۔

حالیؔ کے بیان پر شبلیؔ کا یہ اضافہ:۔

"وقت کی تہذیب دیکھو! شیخ جیسا مقدس اور صوفی منش ایک امرد کو گلے لگاتا ہے منہ چومتا ہے اور پھر دیدہ دلیری سے کہتا ہے:

ایں بگفتیم و بوسۂ چند برسر و روئے یک دگر دادیم و وداع کردیم"

امرد کو گلے لگانا، اس کا منہ چومنا، یوں بھی قابلِ اعتراض ہے لیکن جب ایک مقدس اور صوفی منش بزرگ اس منظر میں شریک غالب کی حیثیت سے نظر آئیے تو اس کا ہلکا پن اور بڑھ جاتا ہے۔ "وقت کی تہذیب" کہہ کر شبلیؔ نے نہ صرف اس ناگوار واقعہ کو کسی حد تک گوارا بنا دیا ہے بلکہ سچ پوچھئے تو سعدیؔ کے ہاتھ میں ایک ایسی سپر دے دی ہے جو طعن و تشنیع اور اعتراضات کے تیر باراں سے بچنے کے لئے کافی ہے۔ حالیؔ نے جس واقعہ کو "ناگفتنی" سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا، شبلیؔ نے اسے "گفتنی" بنا کر حق یہ ہے کہ واقعہ نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ (باقی)

اجمل اجملی

ترقی پسندوں کی روایت پرستی

ادھر دو چار برس میں ہمارے بعض نوجوان ادیبوں کے ذہن میں پرانی نسل اور نئی نسل کی باہمی آویزش کا تصور بری طرح گھر کر گیا ہے۔ ادیبوں کی پرانی اور نئی نسل کی یہ باہمی آویزش ہمارے ادیبوں کو ایک ایسی منزل کی طرف لے جا رہی ہے جو ہمارے مشترکہ مقصد، مشترکہ نظریئے اور مشترکہ تصورات کے لئے انتہائی نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ جہاں تک بنیادی عقائد کا سوال ہے ترقی پسند ادیب تمام کے تمام ان پر متفق ہیں۔ نہ کوئی پرانا ادیب زندگی کی قوتوں سے دور رہ سکتا ہے اور نہ کوئی نیا ادیب، ہمارے حالات ایک ہیں معاشرہ ایک ہے، مقاصد ایک سے ہیں، ہم سب ایک ہی تحریک سے وابستہ ہیں۔ ہم سب ایک ہی قسم کے تصورات رکھتے ہیں، پھر آخر ہمارے اندر اس قسم کا جذبہ کیوں پیدا ہو رہا ہے، اس سوال کا جواب بہت آسان بھی ہے اور بہت مشکل بھی۔ آسان اس لئے کہ نئے ادیبوں کی بعض شکایات بہت واضح ہیں۔ اور مشکل اس لئے کہ ان شکایات کا رشتہ بعض ایسے حالات سے ملا ہوا ہے جن کی ذمہ داری پورے سماج پر ہے، پرانے ادیب یا نئے ادیب پر نہیں۔ ساتھ چلنے والوں میں شکایات بھی پیدا ہوتی ہیں، بدگمانیاں بھی جنم لیتی ہیں اور اختلافات بھی ابھرتے ہیں۔ لیکن یہ شکایات، یہ بدگمانیاں، اور یہ اختلافات وقتی اور ہنگامی ہوتے ہیں۔ مقصد اور تصورات کی وحدت بہت جلد انھیں شیر و شکر کر دیتی ہے۔ اور جہاں تک مجھے علم ہے یا ایک نئے ادیب ہونے کی حیثیت سے میں کہہ سکتا ہوں، زیادہ تر نئے ادیب اسی خیال کے ماننے والے ہیں لیکن نئے ادیبوں کی صف میں بعض ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اپنی سطحی جذباتیت اور ذہنی الجھنوں کی وجہ سے اس باہمی اختلاف کو ایک غلط رنگ دے رہے ہیں۔ پرانے ادیبوں کی طرف ان کا رویہ بزرگ اور خورد کا رویہ نہیں ہے، ایک تحریک کے دو رفیقوں کا رویہ نہیں ہے بلکہ دشمنوں کا رویہ ہے۔ وہ ان پرانے ادیبوں کو جنھوں نے بہرحال ہم نئے ادیبوں سے زیادہ آگے بڑھ کر اور آج کے دور سے کہیں زیادہ بحرانی دور میں آئندہ آنے والوں کے لئے شمع جلائی تھی۔ آج قابل گردن زنی سمجھتے ہیں، وہ ان ادیبوں کو شک و شبہہ کی نظر سے دیکھتے ہیں جنھیں ۱۹۳۶ء کے بعد اعلان حق کے لئے بڑی بڑی صعوبتیں جھیلنی پڑی تھیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کا ہر قدم، ہر فعل اور ہر نظریہ صحیح تھا۔ یا آج صحیح ہے لیکن ترقی پسند تحریک کے ہراول دستے کے سپاہی ہونے کی حیثیت سے ان کی غلط باتوں پر انتہائی کڑی تنقید کرتے ہوئے بھی ہمارے دل میں ان کے احترام کا جذبہ ہونا چاہئے۔ جو ہمارے بعض نوجوان ادیبوں کے دل سے دور ہو چکا ہے۔ میرے دوست شہاب جعفری صاحب نوجوان ادیبوں کے اسی گروہ سے متعلق ہیں۔ نئے ادیبوں کے اس مخصوص گروہ کی "نفسیات" اور شکایات بھی کچھ عجیب و غریب سی ہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ ہم ادیبوں کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہم جس رتبے اور درجے کے مستحق ہیں ہمیں وہ رتبہ نہیں دیا جاتا۔ مثلاً شہاب ہمارے ایک بزرگ نقاد سے صرف اس لئے کچھ ناراض تھے کہ انھوں نے موصوف کا شمار ملک اور ادب کے شہزادوں کی صف میں نہیں کیا۔ یہ نوجوان ادیب اپنی باتیں منوانے کے لئے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ خواہ ان ہتھکنڈوں سے ہمارے بنیادی عقائد کی توہین ہی کیوں نہ ہوتی ہو۔ مثلاً کچھ دنوں پہلے اسی گروہ کے ایک ممتاز رکن نے "ہماری زبان" کے مخصوص کالم میں ایک بزرگ نقاد پر شخصیت پرستی کا الزام عاید کر کے ادب کے میدان میں ایک انتہائی قسم کی فرقہ پرستی کو راہ دینے کی کوشش کی تھی، انسانیت پرستی، احساسات، اور ترقی پسندی کے مدعی ان ادیبوں کی ذہنیت [illegible] جس گندگی اور اوچھے پن کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس کی تازہ مثال شہاب جعفری کا وہ مضمون ہے جو "نیم روز" کے جولائی اگست کے مخصوص شمارے میں شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے بزعم خود بعض مشہور ترقی پسند ادیبوں کی روایت پرستی کا پردہ فاش کیا ہے۔

اس مضمون میں سب سے پہلے تو ترقی پسند ادب کے اس سرمایہ کا مذاق اڑایا گیا ہے جو ہمارے [illegible]

بعض کو ترقی پسند ادب کی تحریک کے نئے تجربوں، رجحانوں اور زندگی کی نئی سمتوں سے اردو ادب کو روشناس کرانے "کا سہرا باندھتے ہیں لیکن فوراً یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہی تحریک ترقی پسندوں کے کرتوتوں سے بہت جلد روایت پرستی کا شکار ہو گئی۔ یہاں "بہت جلد" کا لفظ محل غور ہے۔ ترقی پسند تحریک پچیس سال کی ہے، اس پچیس سال کے عرصہ میں بہت جلد کا مفہوم تو یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ۴۸ء تک ترقی پسند تحریک اپنی اصلی شکل پر رہی اس کے بعد وہ روایت پرستی کی آغوش میں چلی گئی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ۴۸ء سے لیکر آج تک کا ادب جو اپنی افادیت، عظمت اور صداقت کے لحاظ سے ترقی پسند تحریک کا مایۂ ناز ادب ہے، روایت پرست ہے۔ اس لحاظ سے کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت کے افسانے، فیض، مجاز، فراق، ندیم، اور مخدوم کی نظمیں، ڈاکٹر علیم، سجاد ظہیر، اعجاز حسین، احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور وغیرہ کی تنقیدیں سب کی سب جو ۴۸ء کے بعد آنے والے ادب کے شہپارے ہیں روایت پرستی کی صف میں داخل ہو جاتے ہیں۔ خیر یہ تو تعبیر اور مفہوم کی بات تھی خود شہاب نے اس رجحان کی نمائندگی کرنے والوں کے نام گنائے ہیں جس میں ہمارے ترقی پسند شعراء میں سے سردار جعفری، مخدوم محی الدین، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، نیاز حیدر، غلام ربانی تاباں، جاں نثار اختر، پرویز شاہدی، احبیب تنویر، وامق جونپوری، اور اس کے بعد نئے شعراء میں سے کمال احمد اور راہی معاصوم رضا تک کے نام آ گئے ہیں۔ شہاب نے بڑا کرم کیا کہ اس فہرست میں فیض، ندیم، مجروح، اور مجاز کا نام نہیں شامل کر لیا ورنہ اس کے بعد ترقی پسند ادب یا تو ان غزلوں پر منحصر ہوتا جو میر کے رنگ میں لکھی جا رہی ہیں یا پھر جینیئس کی قنوطی اور شکست خوردہ شاعری کو سرمایۂ ادب قرار دینا پڑتا۔ کیونکہ پہلی فہرست کے نکل جانے کے بعد صرف یہی نام بچتے ہیں جنھیں شہاب نے ترقی پسند کہا ہے۔ پھر بقول ان کے جب یہ دیکھا گیا کہ دو چار شعراء کو چھوڑ کر پرانی نسل کی اکثریت روایت پرستی کا شکار ہے تو نئی نسل جس کی نمائندگی شہاب اور ان کے دوست کر رہے ہیں اپنی بقا کے لئے پرانی نسل کے ذہن، تصورات اور معیار فن کے خلاف دھاوا بولنے پر مجبور ہو گئی۔ شہاب نے اپنے پورے مضمون میں صرف یہی جملہ ایسا لکھا ہے جس سے صداقت کی بو آتی ہے۔ وہ غیر شعوری طور پر اپنے مضمون کے حدود اربعہ کا پتہ دے گئے ہیں۔ ان کے نزدیک نئی نسل اور پرانی نسل کی کشمکش کا مقصد اپنی بقا ہے۔ انھیں نہ تو ادب سے کوئی ہمدردی ہے نہ ترقی پسند تصورات سے عقیدت، ان کی نظر میں نئے ادیبوں کی وہ مشکلات اور شکایات جو تہذیبی، اور اجتماعی زندگی سے منسلک ہیں ہیں۔ بلکہ ذاتیات کی حد میں داخل ہیں۔ خیر ترقی پسند تصورات سے عقیدت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن جو شخص اس پرانی نسل کے ذہن، تصورات، اور معیار فن کے خلاف دھاوا بولنے پر مجبور ہو جس میں مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر علیم، سجاد ظہیر، ڈاکٹر اعجاز، احتشام حسین اور ان جیسے دوسرے بزرگ بھی شامل ہیں جن کی رہنمائی میں ترقی پسند تحریک نے نشو و نما پائی ہے، وہ ترقی پسند تحریک کا معتقد کہاں ہو سکتا ہے؟ البتہ شہاب جعفری کے اس جملے سے نئے ادیبوں کے خلوص کی توہین ہوتی ہے جن کی رہنمائی کے دعویدار خود شہاب صاحب ہیں۔

ان باتوں سے اس مضمون کی قدر و قیمت واضح ہو جاتی ہے آیئے اب ان کے اس نظریے کا جائزہ لیا جائے جس کے بل پر انھوں نے ترقی پسند ادیبوں کی نگارشات میں انھیں کس طرح روایت پرستی کا احساس ہوا۔ اس پر شہاب نے کوئی بحث نہیں کی ہے۔ بلکہ صرف بعض ترقی پسند ادیب یا یوں کہا جائے کہ صرف وامق اور تاباں کی غزلوں کے بعض اشعار سے جس میں لب و لہجے کے لحاظ سے پرانے طرز کی تقلید کی گئی ہے شہاب نے یہ اندازہ کیا ہے کہ یہ ترقی پسند ادیب روایت پرستی کا شکار رہے ہیں، اگر یہ حقیقت ہے کہ یہ ترقی پسند ادیب روایت پرستی کا شکار ہیں تو یقیناً انھیں ترقی پسند ادیبوں کے زمرے سے باہر نکال دینا چاہیے کیونکہ ترقی پسندی اور روایت پرستی دونوں چیزیں ایک ساتھ پروان نہیں چڑھ سکتیں لیکن صرف لب و لہجہ کی تقلید ہرگز روایت پرستی نہیں ہے۔ پرانی زبان کی سادگی اور پرانے اسلوب کی لچک اور لوچ کے سہارے اگر کوئی ترقی پسند ادیب زندگی کی نئی قدروں کی ترجمانی کرتا ہے تو اسے مجرم نہیں گردانا جا سکتا، بلکہ روایت پرستی کا مفہوم اس سے بالکل الگ ہے۔ چونکہ شہاب کے ذہن میں روایت پرستی کا خود کوئی واضح تصور نہ تھا۔ اس لئے وہ اس کی وضاحت سے عمداً پہلو بچا گئے ہیں۔ لیکن ان کے اس خیال پر گفتگو کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم روایت پرستی کے حدود متعین کر لیں تاکہ ان کے مضمون کی صداقت کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

روایت پرستی جمود کا نام ہے۔ زندگی کے بدلتے ہوئے حالات اور زمانہ کی رفتار سے پہلو تہی کر کے اگر کوئی آج سے سو سال پہلے کے نظریات خیالات اور معیار فن کو اپنائے تو اسے ہم جامد ہی کہیں گے۔ روایت پرست کے نزدیک بزرگوں کا حد درجہ ہی سب کچھ ہے۔ اور آج کے ادیب کا ذہن بھی کسی

صرف ان مقررہ اسلوب، طرزِ ادا، تراکیب، اصناف اور تصورات تک اپنی دنیا محدود رکھے جو ہمارے پیشتر شعراء کے کلام میں ملتے ہیں۔ یا مجموعی طور پر یوں کہا جائے لکیر کا فقیر ہو کر رہ جانا ہی روایتی شعراء کے نزدیک سب سے بڑا کارنامہ ہے اور انھیں حدود میں رہ کر جولانیٔ طبع کے جوہر دکھانا ایک سچے روایتی شاعر کا طرۂ امتیاز۔ لیکن ترقی پسند شاعر کا نظریہ اس سے الگ ہے۔ وہ اپنے بزرگوں کے تہذیبی ورثہ کا احترام کرتا ہے، ان روایتوں کا اپنے کو جائز وارث سمجھتے ہوئے ان کی صحت مند قدروں سے اپنے ادب کو جاندار اور خوبصورت بناتا ہے۔ لیکن اسے ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی احساس ہے کہ زندگی بہت بدل چکی ہے، زمانہ کے ہاتھوں انسان کا شعور بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ پرانے تصورات، نظریات اور معتقدات جو مخصوص حالات اور مخصوص سماج کی دین تھے۔ آج کے حالات اور سماج میں فرسودہ ہو چکے ہیں کیونکہ ہمارا سماج اس سماج سے بے حد مختلف ہے اور ان تمام احساسات کے ساتھ وہ اپنے پشتینی ورثہ کی بنیادوں پر نئے محل تعمیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ادب زندگی کے ساتھ بڑھتا، بدلتا اور پروان چڑھتا ہے اس لئے ادب میں جدید تصور کوئی بدعت نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اگر کوئی ترقی پسند ماضی کی صحت مند روایات اور قدروں سے خود کو الگ کرنے کی کوشش کرے تو یہ ہٹ دھرمی اور انتہا پسندی ہوگی بقول فراق "مسلسل تاریخ انسانی و تاریخ ادب کا اٹل قانون ہے۔ ماضی سے بے خبری ترقی پسندی نہیں ہے نہ ماضی کی قدر شناسی رجعت پسندی اور قدامت پرستی ہے"[1]۔ اور اسی لئے جو باشعور ادیب تاریخ انسانی کے تسلسل سے واقف ہیں وہ ماضی کے ورثہ سے استفادہ کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں اور جو لوگ اس تاریخی تسلسل کا شعور نہیں رکھتے وہ بڑی آسانی کے ساتھ دوسروں کو روایت پرست کہکر ماضی کی اس مقدس امانت سے یکسر بیگانہ ہو جاتے ہیں۔

ماضی کی شاندار ادبی روایات سے استفادہ کرنے کی بھی دو راہیں ہیں کچھ لوگ کسی خاص دور یا کسی مخصوص شاعر کی پیروی میں اس کے اسلوب اور رنگ شاعری کو اپناتے ہیں۔ جو بظاہر بہت آسان کام ہے لیکن کچھ شاعر کلاسیکی ادب کے پورے سرمایہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے کلام میں وہ رچاؤ، سنگھار اور زبان و بیان کی وہ ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں جو بڑی شاعری کی روایت ہے اور دراصل یہی وہ منزل ہے جہاں صحیح معنوں میں بڑے شاعر اور بڑے فنکار کے مرتبے کا پتہ چلتا ہے۔ فانی، حسرت، فراق، اصغر، جگر وغیرہ نے یہی روش اپنائی اور آج ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز یہی روش ہے۔ فراق نے کسی استاد کے رنگ میں غزل نہیں لکھی لیکن ان کی پوری شاعری میں کلاسیکی ادب کی انھیں روایتوں کی جھلک ملتی ہے جو ہم سب کے لئے قابل احترام ہیں۔ کیا شہاب صاحب فراق کی شاعری کو روایتی شاعری کہنے کی ہمت کریں گے؟ اگر فراق کی شاعری روایتی شاعری نہیں ہے تو پھر موجودہ دور کے ان ترقی پسندوں کی شاعری روایتی کیسے ہو سکتی ہے جو فراق کی پیروی میں ماضی کے اسی سرمایہ سے اپنے چراغ روشن کر رہے ہیں۔ یاد رہے یہ بات ہے کہ ابھی ہمارے ان شعراء کے کلام میں کلاسیکی ادب کا وہ رچاؤ نہ پیدا ہوا ہو جو فراق کی شاعری میں ملتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کیا یہ کوشش کسی خاص استاد کے رنگ میں طبع آزمائی کرنے سے بہتر ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ کسی مخصوص شاعر کے رنگ کو پیش نظر رکھنے سے کہیں زیادہ اہم اور خوبصورت بات یہ ہے کہ پورے ادبی سرمائے کو پیش نظر رکھا جائے تاکہ ادیب ماضی کی اس سنواری ہوئی نکھری ہوئی روایت سے اپنے انفرادی رنگ کی آبیاری کر سکے، اور ہمارا ادب لکیر کا فقیر ہونے کی بجائے نت نئے رنگوں اور مختلف آوازوں کے اتار چڑھاؤ سے مالا مال ہو سکے۔ کسی خاص شاعر کے رنگ کی غزلیں لکھنے میں رنگوں کا نیا پن اور مختلف آوازوں کی اسی سرگوشی پر حرف آتا ہے اور ہمارا ادب صحیح معنوں میں لکیر کا فقیر ہو کر رہ جائے، اس کے خدشات شدید ہو جاتے ہیں۔ واثق جونپوری اور تاباں کا جو کلام شہاب نے روایت پرستی کی مثال میں پیش کیا ہے وہ دراصل پرانے اسلوب کی مدد سے ایک انفرادی رنگ قائم کرنے کی کوشش کا غماز ہے۔ اور میرے خیال میں ان کا یہ رویہ خالص ترقی پسندانہ اور صحت مند رویہ ہے۔

ترقی پسند ادب اور روایت پرست ادب کے بارے میں حتمی فیصلہ کرنے کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ تصورات اور نظریات کا جائزہ لیا جائے۔ اگر کوئی ترقی پسند بالکل نئے اسلوب میں پرانی باتیں رقم کرتا ہے۔ جو آج سے سو سال پہلے کے تصورات اور حالات پر مبنی ہیں تو اس کے تمام فنی نئے پن کے باوجود اس کے ادب کو ترقی پسند ادب نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح اگر کسی شاعر کے یہاں ہمیں موجودہ صحت مند نظریات اور تصورات کا بیان قدیم اسلوب میں ملے تو ہم اسے روایت پرست نہیں کہہ سکتے کیونکہ اسلوب تو ایک اضافی شے ہے۔ ترقی پسند ہونے نہ ہونے کا فیصلہ "کس طرح کہا ہے" پر نہیں کیا جا سکتا بلکہ دیکھنا یہ ہوگا کہ "کیا کہا گیا ہے" کیونکہ اسی "کیا کہا گیا ہے" سے حالات اور زندگی کی طرف شاعر کا رویہ ظاہر ہوتا ہے اور اسی رویہ پر اس کے ترقی پسند ہونے یا نہ ہونے کا دار و مدار ہے۔ واثق، رہبر، تاباں، مجروح، گوپال متل، تاباں جیسے شعراء کا کلام جو

[1] اندازے۔ صفحہ ۱۱

جینیت اعتبار سے ماضی کی محدود ادبی روایات کے خلاف صحت مند بغاوت کا نتیجہ ہے اپنے تمام نئے پن کے باوجود ترقی پسند ادب کے دائرے میں شامل نہیں ہو سکتا اگر حضرت ذرہ تابا دی کوئی آزاد نظم لکھیں تو اسے یا معنی دعوے کی نظموں کو کیا شہاب صاحب ترقی پسند ادب کے زمرے میں شمار کرنے کی جراُت کریں گے۔ حالانکہ اسلوب نگارش کے لحاظ سے ان کے نئے پن میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس مندرجہ ذیل اشعار دیکھئے جو اپنے رنگ روپ، طرزِ ادا، زبان و بیان کے لحاظ سے قدیم رنگ سخن سے مشابہ ہیں ؎

دیکھ رفتارِ انقلاب فراق	کتنی آہستہ، اور کتنی تیز!
وہ گرد اڑائی ہے رفتارِ زمانہ نے	انسان بھی مشکل سے انساں نظر آتا ہے
چپ ہو گئے تیرے رونے والے	دنیا کا خیال آگیا ہے!
حسرتوں کا ہمیں نہ پرسا دو!	ہم نے یہ رسم ہی اٹھا دی ہے
دستِ دریا شل ہیں کنارے سے لگا بیٹھا ہوں	لیکن شورشِ طوفان سے ہارا تو نہیں
دیارِ حسن نگاہوں سے دو قدم بھی نہیں	مگر یہ فاصلۂ یک دو گام کم بھی نہیں
سنانے یہ مت جاؤ یہ دل کی روایت ہے	دشت سے تو ویرانہ آباد نکلتا ہے!
آئی جو اسے یاد ترے رنگ حنا کی	تا دیر جنا دشت میں آوارہ پھرا کی
آتی ہے زنداں میں اس پردہ نشیں کی یاد بھی	مجھ اسیرِ غم کی خاطر پا برہنہ سر کھلے
قدم قدم پہ نئے فتنے جاگ اٹھتے ہیں!	زمانہ چال چلے ہے مرے حسین کی سی
وہ فسانہ کہ جو فرہاد نے تیشے سے لکھا	اس میں فنکار کی کچھ شوخیِ تحریر بھی ہے
سر پہ ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ	اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ
دیر پہ سنا، پند سنی، ذکر سنا!	اب میاں بند کرو فتنۂ افرنگ کی بات

قدیم رنگ شاعری سے قریبی مشابہت کے باوجود ان اشعار میں نیا ذہن، نئے تصورات، اور نئی حقیقتوں کی جو روشنی موجود ہے اسے دیکھنے کے بعد کون صاحب نظر ان اشعار کو اسلوب کی قدامت کی بنا پر غیر ترقی پسند یا روایتی اشعار کہہ دیگا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر شہاب جعفری صاحب الفاظ و تراکیب کے گورکھ دھندے سے نکل کر اپنے پیش کردہ اشعار ہی کا جائزہ لیں تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ وامق اور تاباں دونوں ہی ذہنی طور پر ترقی پسند ہیں خواہ اسلوب نگارش میں وہ کسی خاص استاد یا پورے کلاسیکی سرمایہ کا تتبع ہی کیوں نہ کر رہے ہوں۔ خود انھوں نے جو غزلیں تاباں اور وامق کی "مکروہ روایت پرستی" کی مثال میں پیش کی ہیں انھیں کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جانے کس نے لیا اس زاہدِ بدکیش کا نام	آج پھر محفلِ رنداں میں چلی سنگ کی بات
کیا تماشہ ہے کہ خود گھر میں پڑا ہو کہرام	اور سب نے حسین کرے سیکڑوں فرسنگ کی بات
جو فروشی کریں گندم کے بہانے جو لوگ	ان سے اچھی نہ ترازو کی نہ پاسنگ کی بات!
گفتنی ابلق ایام کی رفتار بھی ہے!	ان کو بھاتی ہے مگر زین کی اور تنگ کی بات
ناگوار ہے بہت ذکر تغیر ان کو!	کوئی کس طرح کرے چرخ کے نیرنگ کی بات

قید تو دونوں ہوئے فرق مگر اتنا ہے!	صحنِ زنداں انھیں اور ہم کو ملے ویرانے
لئے پھرتا ہو جو انسانوں کی میت وہ ہوس	جلتی بھرتی ہوئی لاشوں کو بھلا کیا جانے

آج کیوں ان کو نہیں جُرأتِ تقریر کہ ہم — منتظر کب سے کھڑے ہیں رسن و دار کے پاس

پھر کوئی جذبۂ بےنام ہوا حشر خرام — پھر حسین کوئی چلا اپنے قیامت کا لباس

شہاب یقینی طور پر اس نئے ذہن اور نئے شعور کو نہیں سمجھ پائے ہیں۔ جو ان اشعار میں جھلکیاں دکھا رہا ہے اور یہی نیا شعور سیاسی اور سماجی حالات کا صحیح احساس ہے جو ان اشعار کو روایتی شاعری سے الگ کر دیتا ہے۔ شہاب اسے سمجھ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ جو شخص ۱۹۳۵ء سے لیکر ۱۹۵۵ء تک کے اس ادب کو جو کم از کم افادہ کے لحاظ سے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے "موقعہ پرستانہ" ادب قرار دے اور اس کی اہمیت ایسی سمجھے جیسے پرانے زمانہ میں "عید، بقر عید، شادی بیاہ، ولادت، سالگرہ، ختنہ، میلاد شریف، تعمیر مکان، تعمیر چاہ، کسی افسر کی آمد، کسی افسر کی بدلی، وغیرہ کے موقعوں پر روایتی شاعر چند جھوٹے جذبات اپنے اوپر طاری کر کے نظم میں داخل کر دیتے تھے" وہ نئے شعور اور انسانی زندگی کے گوناگوں مسائل کی ادبی اہمیت کیا سمجھ سکتا ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ ۱۹۳۵ء سے لیکر ۱۹۵۵ء تک جو ادب پیدا ہوا اس میں بہت سی کمزوریاں بھی ہیں۔ اس میں جھلاہٹ اور تیزی ہے۔ شعور کا رچاؤ اور موضوع و اسلوب کی ہم آہنگی اس دور کے ادب میں بہت کم ہے۔ لیکن ان ساری نفسیاتی اور حالات کی پیدا کردہ کمزوریوں کے باوجود اس کی اہمیت اور افادیت سے انکار کرنا میرے نزدیک کفر میں داخل ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر شہاب کا ذہنی افلاس اپنے انتہائی شباب پر پہنچ جاتا ہے یہاں پہنچ کر وہ ایک کروٹ اور لیتے ہیں اور ایک انتہائی بچکانہ قسم کا اعتراض فرماتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ غزلوں میں "وہ" اور "ان" کے جو اشارے اور علامتیں بار بار آئے ہیں وہ مہمل ہیں کیونکہ "نیا ذہن ان کے معنی اور مشار الیہ کو سمجھنے سے قاصر ہے"۔ شہاب خود ایک اچھے غزل گو شاعر ہیں اور اس لئے یقیناً وہ غزل کے مخصوص فن، مخصوص لب و لہجہ اور مخصوص اشاریت سے بخوبی واقف ہوں گے۔ انھیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ تفصیل غزل کے لئے موت کے مترادف ہے، غزل میں جامعیت اور اجمال ہی ایسی چیزیں ہیں جو زور پیدا کرتی ہیں، پھر اس کے بعد اگر وہ ہمارے کسی شاعر سے غزل میں تفصیل اور وضاحت پیدا کرنے کا مطالبہ کریں تو ان کی حیثیت مشتبہ ہو جاتی ہے۔ جہاں تک نئے ذہن کی سمجھ اور ناسمجھی کا سوال ہے میں شہاب صاحب کو یقین دلاتا ہوں کہ نیا ذہن جو غزل کی روایات سے بخوبی واقف ہونے کے ساتھ ساتھ عہدِ حاضر کے ادب کا مزاج داں ہے اور ادیبوں کے رویے، ماحول اور سماج کی متضاد قوتوں اور طبقاتی کشمکش کا علم رکھتا ہے وامق اور تاباں کے ان اشعار کی اشاریت اچھی طرح سمجھ جائے گا۔ کیونکہ یہ اشارے اور علامتیں صرف وامق و تاباں کی غزلوں تک محدود نہیں ہیں بلکہ یہ علامتیں اور اشارئیے ہماری زندگی کی علامتیں اور اشارئیے ہیں اور ہم اگر اپنی زندگی سے آگاہ نہ ہوں تو ہمیں باشعور کہلانے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اس بنیادی بحث کے بعد چاہئے تو یہ تھا کہ شہاب کی دوسری ان باتوں کا بھی جواب دیا جائے جو صرف زیبِ داستاں کے لئے قلم بند ہوتی ہیں، لیکن ان کی غیر مفید فضا اور سطحی جذباتیت کی بنا پر میں اسے اس قابل نہیں سمجھتا کہ ان کا جواب دیا جائے۔ مثلاً جب نثر سے دل اکتا گیا تو انھوں نے اپنے دل کا بخار ایک مشترکہ نظم میں نکالا ہے جس کے نظم کرنے والے بقول ان کے خلیل الرحمٰن اعظمی، انور معظم اور شہاب جعفری ہیں۔ مستقبل کے ان عظیم شعراء کی ذہنی سطح سے واقفیت کے لئے صرف دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

سرِ نوح کا منہ جوش کا مجروح کی گردن — بہروپ بھرے ہے تنِ بے روح کی گردن

غرقاب ہے طوفانِ ادب میں غزلِ نو — ہر طرح نمایاں ہے مگر نوح کی گردن!

ظاہر ہے اسے سوائے سستے پن، بازاریت اور کھوکھلی جذباتیت کے اور کیا کہا جا سکتا ہے اور اس کا جواب ہو بھی کیا سکتا ہے سوائے خاموشی کے۔

اسی طرح بار بار وامق اور تاباں یا پھر بعض اچھے خاصے نئے شعراء مثلاً راہی غازی پوری اور کمال احمد وغیرہ کو جو خطابات عطا کئے گئے ہیں یا ان کی شاعری کے بارے میں جو نظریات قائم کئے گئے ہیں ان سے بھی شہاب کی کم علمی، کم نظری اور نئے ادب سے ناواقفیت کا احساس ہوتا ہے۔ شہاب کی اطلاع کے لئے صرف اتنا عرض کروں گا کہ راہی اور کمال احمد دونوں ہی ان سے اور ان کے گروہ کے دوسرے شعراء سے کہیں زیادہ ممتاز ہیں۔ اور ان کے ادب میں اس مریضانہ قنوطی شاعری سے جو میر کے رنگ کا سہارا لیکر آگے بڑھائی جا رہی ہے کہیں زیادہ زور اور جان ہے۔

بہرحال شہاب کا یہ مضمون ایک طرح بڑی اہمیت کا مالک ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ اس سے اس ڈھکے چھپے گروہ کے چہرے سے چلمن سرک جاتی ہے جو اب تک ترقی پسندی کا خول پہن کر ادب اور زندگی کی غیر صحت مند قدروں کو پروان چڑھا رہا ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ کے بعد شہاب جعفری کے مضمون کے پیچھے جو ذہنیت کام کر رہی ہے اور ہماری زبان کے مخصوص کالم کے لکھنے والے جس احساسِ کمتری کے شکار ہیں وہ اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے اور میرے اس مضمون کا مقصد بھی یہی ہے۔

فرمان فتحپوری

قدیم اردو شعرا پر تاریخی نظر

تحقیقی کام کی دلچسپی اور حوصلہ فرسائی کو مشق سخن اور چکی کی مشقت سے ملتی جلتی چیز سمجھنا چاہئے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ جو چیز آج سچ بنا کر سامنے لائی جاتی ہے کل وہی سب سے بڑا جھوٹ ٹھہرتی ہے۔ تحقیق کی یہ کانٹ چھانٹ سائنس سے لیکر ادب تک نظر آئے گی۔ ارسطو نے بتایا تھا کہ اگر دو چیزیں ایک ہی بلندی سے نیچے گرائی جائیں تو وزنی چیز ہلکی کے مقابلے میں جلد تر نیچے پہنچے گی۔ گلیلو نے ارسطو کی اس تحقیق کو غلط ثابت کر کے اس امر کا اظہار کیا کہ ایسی دو چیزیں ایک ساتھ نیچے آئیں گی۔ نصف سولہویں صدی تک سائنس والوں کا خیال تھا کہ سورج زمین کے گرد چکر لگاتا ہے اور دائرہ بناتا ہے لیکن جان کیپلر نکولس نے دونوں باتیں غلط ثابت کر دیں اور یہ بتایا کہ زمین سورج کے چاروں طرف چکر لگاتی ہے اور اسکا گشت دائرہ کی صورت میں نہیں بلکہ بیضاوی ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک سائنس والوں کا یہی خیال تھا کہ مادہ بالذات متحرک ہے اور حیات کائنات سارے سارے وہ مظاہر ہیں جو خود بخود رونما و روپوش ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح زندگی کی آسودگی کا ذریعہ صرف مادیت کو بتایا جاتا تھا۔ اور باطنی شعور یا قوت کا وجود کالعدم قرار پایا۔ آج آئن سٹائن نے سارے سائنس والوں کو جھٹلا دیا اور بتایا کہ مادہ کی اصل خود مادہ نہیں بلکہ [illegible] ہے ایک طرح کی [illegible] ہے جو تمام مادی اجزاء میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ تحقیق کی یہی صورت زندگی کے ہر شعبے میں کار فرما نظر آئے گی۔ ہمارا ادب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے محمد حسین آزاد نے خالق باری کو امیر خسرو کی تصنیف اور ولی کو اردو کا پہلا با دیوان شاعر قرار دیا تھا۔ آج تحقیق نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اور "آب حیات" کی جو تحقیق بطور اسناد نقل کی جاتی تھیں وہی آب حیات کی کمزوریاں بنی ہوئی ہیں۔ یہ کچھ عجب نہیں کہ آج محققین جن چیزوں کو اپنا کارنامہ سمجھتے ہیں کل وہ خود اسی تحقیق کے ہاتھوں ان کا عیب بن جائیں۔ لیکن ادبی اور سائنسی تحقیق میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ سائنس کے نتائج چونکہ خالص علمی، اصولی اجتماعی اور عملی تجربوں کی مدد سے ظہور میں آتے ہیں۔ اس لئے ان میں اختلافات کی گنجائش بہت کم رہتی ہے۔ اس کے برعکس ادبی تحقیق چونکہ انفرادی ہوتی ہے اور صرف تاریخ و مواد کی فراہمی اور مذاق سلیم کے سہارے آگے بڑھتی ہے اس لئے ان میں اکثر معمولی معمولی مسائل میں بھی وہ اختلاف رونما ہوتا ہے جو اپنی جگہ دلچسپ اور مفید ہوتے ہوئے بھی ادب سے عام دلچسپی رکھنے والوں کو الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ اور کسی نتیجہ پر پہونچنے نہیں دیتا۔ اردو شاعری کے آغاز اور اس کی تاریخ ترتیب کا مسئلہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ ہر چند کہ آج اردو ادب میں تنقید تحقیق اور تاریخ کی متعدد کتابیں موجود ہیں لیکن نتیجتاً یہ معلوم کرنا کہ اردو کا پہلا شاعر کون ہے اور اردو شاعری کے سلسلے میں ہمارے شعراء کی تاریخی ترتیب کیا ہوگی صرف ادب کے طالب علم کے لئے نہیں بلکہ اچھے پڑھے لکھے لوگوں کے لئے بھی آسان نہیں ہے۔ مثلاً نصیر الدین ہاشمی مولف "دکن میں اردو" لکھتے ہیں:۔

"ہم نے اس کتاب کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں وجدی کو پہلا شاعر قرار دیا تھا مگر یہ غلط فہمی تھی . . . . . . جہاں تک ہم نے اب تحقیقات کی ہے اس لحاظ سے نظامی پہلا شاعر ہے جو بہمنی سلطان نظام شاہ ۸۶۵ھ تا ۸۶۷ھ کے دور میں موجود تھا۔"

رام بابو سکسینہ رقمطراز ہیں کہ:۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ سب سے پہلا شاعر زبان اردو کا اس دھندلکے میں جو صاف طور پر نمایاں نظر آتا ہے وہ حضرت امیر خسرو دہلوی ہیں۔" (تاریخ ادب اردو)

نیاز صاحب اردو کے "درخت" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس درخت کی سب سے پہلی کلی امیر خسرو کی صورت میں نمودار ہوئی۔ انھوں نے سب سے پہلے فارسی آمیز برج بھاشا میں الٹ شاعری کی ابتدا کی۔"

(انتقادیات حصہ دوئم۔)

پنڈت برج موہن دتاتریا کیفی امیر خسرو کے اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے بیان کرتے ہیں۔

"میں ان اشعار کو اب تک کی تحقیقات کی بنا پر اردو کے قدیم ترین اشعار اور امیر خسرو کو اردو کا پہلا شاعر قرار دیتا ہوں۔"

مولوی عبدالحق[1] محمود شیرانی[2] اور سید سلیمان ندوی[3] نے بابا فرید گنج شکر کے اشعار بھی اپنے مضامین میں درج کئے ہیں۔ اور چونکہ گنج شکر امیر خسرو سے پہلے کا ہے۔ اس لئے واضح ہے کہ ان حضرات نے اردو شاعری کا سہرا گنج شکر کے سر باندھنا چاہا ہے۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ اکثر محققین و مورخین لسانی و تاریخی نقطۂ نگاہ سے اپنے دعوؤں کا جائزہ نہیں لیا ہے۔ استدلال و برہان سے نتائج کا استخراج نہیں کیا بلکہ جو مواد ہاتھ آیا اسی پر بھروسہ کر انفرادی رائے کا اظہار کر دیا گیا ہے ـــــ یہ تمام کتابیں علما ادب کی نظر سے گذری ہوں گی۔ لیکن اگر آپ ان کا تقابلی مطالعہ کرنا چاہیں تو آپ کو اس سلسلے میں ان کتابوں سے کوئی مدد نہ ملے گی۔ ہر شخص نے دوسرے کی رائے سے بے نیاز ہو کر اپنی ذاتی رائے کا اظہار کر دیا ہے یہی اختلاف آرا ہے جو تاریخ نگاری کی راہ میں روڑا اٹکاتا ہے اور ادب کے طالب علم کو اردو شعر گوئی کے تاریخی ارتقا کے واضح تصور سے محروم رکھتا ہے۔ ان حالات میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری کے آغاز کے متعلق جو رائیں ملتی ہیں ان کا لسانی، تاریخی اور تحقیقی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیا جائے اور ایک ایسا خاکہ مرتب کر دیا جائے جو قدیم اردو شعراء کی تاریخی ترتیب اور تدریجی ترقی کو سمجھنے میں مدد دے سکے۔

اس سلسلے میں ہم اردو شاعری کے آغاز سے لیکر صرف ولی دکنی کے عہد کو زیر بحث لائیں گے۔ اس لئے کہ اسی دور کی تاریخ خاموش اور مبہم ہے اور بعض ادبی امور کے متعلق علمائے ادب میں اختلاف ملتا ہے۔

شعراء کی تاریخی ترتیب میں بھی ان کی تاریخ پیدائش نہیں بلکہ تاریخ وفات کو ملحوظ رکھیں گے کیوں کہ اکثر شعراء کی تاریخ پیدائش کا صحیح پتہ نہیں چلتا۔ دوسرے تاریخی زاویہ نظر سے یہی طریقہ زیادہ مناسب ہے۔

پہلا شاعر: بوعلی قلندر شاہ۔ متوفی ۷۲۴ھ۔ ہمارے خیال میں سن وفات کی تقدیم کے لحاظ سے اردو کے پہلے شاعر نظامؔ ہیں نہ گنج شکر اور نہ امیر خسرو کو بوعلی شاہ کا پیش رو کہا جا سکتا ہے۔ ہرچند کہ امیر خسرو اور شرف الدین بوعلی قلندر شاہ ایک دوسرے کے ہم عصر ہیں دونوں نظام الدین اولیاء دہلوی کے ارادتمندوں میں تھے۔ دونوں نے ایک وقت میں اردو کے الفاظ کو شعر و سخن میں جگہ دی۔ لیکن چوں کہ بوعلی قلندر کی وفات امیر خسرو سے ایک سال پہلے ہوئی اس لئے تاریخی ترتیب میں بوعلی قلندر شاہ ہی کا نام سرفہرست آنا چاہئے۔ مولوی عبدالحق نے بوعلی قلندر کے ذکر میں ان کا یہ شعر نقل کیا ہے ؎

سجن سکارے جائیں گے نین مریں گے روئے ٭ بدھنا ایسی رین کو بھور کبھی نہ ہوئے

یہ دوہا ہم میں سے اکثر کو یاد ہوگا۔ لسانی اعتبار سے اس دوہے میں جو زبان استعمال کی گئی ہے اس کی قدامت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا بوعلی قلندر کی زبان اپنے معاصر امیر خسرو کی زبان سے ملتی جلتی ہے۔ اور اس پر شورسینی پراکرت اور ہریانی زبان کا اثر پوری طرح نمایاں ہے اور بقول صاحب فرہنگ آصفیہ۔

"محمد تغلق شاہ اور علاء الدین خلجی کے عہد میں جس زبان کا رواج تھا بوعلی قلندر کے دوہے سے اس کا صاف پتہ چلتا ہے۔"

---

[1] اردو کی نشو و نما میں صوفیہ کرام کا حصہ [2] پنجاب میں اردو [3] نقوش سلیمانی

یہ ہیں حقائق جن کی بنا پر ہم امیر خسرو کے ایک گمنام معاصر بو علی قلندر شاہ کو جن کا مذکورہ بالا دوہا ہم سالہا سال سے سنتے چلے آرہے ہیں امیر خسرو کا پیش رو اور اردو کا پہلا شاعر قرار دیتے ہیں۔

ہمارے نزدیک نصیر الدین ہاشمی کا یہ خیال صحیح نہیں کہ نظامی بعہد ۸۲۶ھ تا ۸۵۵ھ اردو کا پہلا شاعر ہے۔ اول تو نظامی کا عہد بو علی قلندر اور امیر خسرو دونوں سے بہت بعد کا ہے۔ دوسرے خود نصیر الدین ہاشمی کے اپنے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا کلام مشتبہ ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"اس کے متعلق بہت کم معلومات ہیں۔ صرف یہ پایا جاتا ہے کہ وہ سلطانی عہد کا درباری شاعر تھا۔ اس کی مثنوی "کدم راو پدم" کا پتہ چلا ہے۔ یہ مثنوی لطیف الدین دلیمی صاحب کتب فروش کے پاس ہم نے دیکھی ہے۔"

بلا کسی تاریخی اور عقلی شہادت کے ایسے کمزور حوالوں کے سہارے نظامی کو پہلا شاعر قرار دینا ناقدانہ بے اعتدالی اور بقول دتاتریا کیفی "مورخانہ بددیانتی ہے"۔

بابا فرید گنج شکر کا عہد البتہ امیر خسرو اور بو علی قلندر شاہ دونوں سے تقریباً چالیس سال پہلے کا ہے۔ اور اس لحاظ سے گنج شکر کو ان دونوں پر اولیت حاصل ہونی چاہیے تھی۔ لیکن ہمارے خیال میں انھیں اردو کا پہلا شاعر کہنا تاریخی اور لسانی دونوں اعتبارات درست نہیں۔ بابا فرید گنج شکر کے جو شعر و اشعار اردو کے نام سے ملتے ہیں وہ یہ ہیں ؎

اسا کیری بہی سو ریت جاؤں تلے کر جاؤں میت
گنت نہوتیں کاری ناکاں است منائے لس کندھے بدھن گر ہو ایں لما ے[ع۱]

دوسرا شعر سیر الاولیا سے سید سلیمان ندوی نے اور پہلے شعر کو جبعات شاہی کے حوالے سے حافظ محمود شیرانی اور مولوی عبد الحق نے نقل کیا ہے۔ سیر الاولیا محمد سید مبارک کی تالیف ہے جو نظام الدین اولیا کے مرید خاص تھے۔ جبعات شاہی شاہ عالم کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ ان اشعار کو لسانی کسوٹی پر رکھئے تو اردو سے ان کا کوئی رشتہ نہیں ملتا۔ امیر خسرو اور گنج شکر کی وفات کے وقت امیر خسرو کی عمر ۲۰ سال تھی اس لئے اگر گنج شکر اور امیر خسرو دونوں بیک وقت ابتدائی اردو شاعری کے نمائندے ہیں تو ان کی زبان میں معاصرانہ یک رنگی کا ہونا ضروری تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ امیر خسرو کے جو اشعار اب تک دستیاب ہوتے ہیں۔ ان کی زبان گنج شکر کی زبان سے بالکل مختلف ہے۔ امیر خسرو کی اردو اپنے اصل ماخذ شورسینی اور ہریانی سے تعلق کا صاف پتہ دیتی ہے۔ اس کے برعکس گنج شکر کے اشعار اس لسانی رشتہ کو ظاہر نہیں کرتے۔ گنج شکر کی زبان دراصل وہ پراکرت ہے جو تیرہویں صدی عیسوی میں شورسینی کی بہن کی حیثیت سے پنجاب کے علاقے میں بولی جاتی تھی۔ چنانچہ گنج شکر کی زبان پر اردو کا نہیں بلکہ پنجابی بولی کا اثر غالب ہے۔ اور چونکہ گنج شکر ملتان کے رہنے والے تھے اس لئے لسانی نقطہ نظر سے ان کی زبان کو موجودہ پنجابی کی ایک قدیم صورت سمجھنا چاہئے جیسا کہ مولوی عبد الحق نے ایک جگہ محمود شیرانی کی تصنیف "پنجاب میں اردو" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اردو پنجابی سے نہیں نکلی۔ پنجابی اور اردو میں جو مشابہت نظر آتی ہے وہ اسی شورسینی کے اثر کا نتیجہ ہے جو ایک طرف اردو کو جنم دے رہی تھی اور دوسری طرف پنجابی پراکرت کو بھی متاثر کر رکھا تھا"۔[ع۱] حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی آمد کے وقت ہندوستان میں جو پراکرتیں بولی جاتی تھیں ان میں علاقائی قربت کی وجہ سے بڑی مماثلت ہے۔ لیکن شورسینی کا حلقہ اثر بہت وسیع تھا بنگال سے لے کر سندھ، پنجاب اور سرحد تک اس بولی کو سمجھنے اور بولنے والے موجود تھے۔ اردو اور دوسری مقامی زبانوں خصوصاً پنجابی میں جو مشابہت ہے وہ اسی شورسینی کی بدولت ہے۔ اس لئے گنج شکر کی زبان کو اردو نہیں بلکہ پنجابی کہنا درست ہے اور اگر اس قسم کی زبان کو بھی اردو سمجھا گیا تو اردو کا اصل ماخذ ہی غائب ہو جائے گا گو تم بدھ کے ان الفاظ کو دیکھئے[ع۲]

"دھرم کرو دھرم کرو دھرم کا سنگھ پھونکو دھرم کی ڈونڈ مچاؤ"

ع۱ تنقیدات عبد الحق ع۲ داستان اردو از نصیر حسین خیال

یہ پالی زبان ہے اور حضرت عیسٰی مسیح کی پیدائش سے ساڑھے چار سو سال قبل مہاتما گوتم بدھ نے استعمال کی تھی۔ اس میں اور شور سینی ملی ہوئی اردو میں کتنی مشابہت نمایاں ہے۔ اب کیا گوتم بدھ کی اس زبان کو اردو کہیں گے؟

اس کے علاوہ خود فریدالدین گنج شکر کے کلام میں ایک ایسی داخلی شہادت موجود ہے جو ان کے اشعار کو اردو کہنے سے مانع ہے گنج شکر کے ذکر میں حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں۔

"ذیل کی نظم حضرت بابا گنج کی طرف منسوب ہے جس کیلئے میں جناب سید نجیب اشرف صاحب ناظم کتب خانہ الاصلاح دلیسنہ ضلع پٹنہ کا ممنون منت پذیر ہوں کہ یہ نظم سید اشرف صاحب نے دلیسنہ لائبریری کے بعض بوسیدہ اوراق سے حاصل کی ہے جن پر حضرت بابا کے اقوال بھی درج ہیں ؎

وقت سحر وقت مناجات ہے — خیز در آں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا — خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
پند شکر گنج کہ بدل جان شنو — ضایع کن عمر کہ ہیہات ہے

(پنجاب میں اردو از شیرانی)

اسی نظم کو غزل ریختہ کے نام سے نقل کرتے ہوئے مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں۔
"کئی سال ہوئے محمد ہاشم صاحب دلسنوی۔ ماری کا ایک خط مجھے موصول ہوا جس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ کتب خانہ الاصلاح دلیسنہ کی ایک قلمی کتاب کی جلد خراب ہوگئی تھی جب اس کی نئی جلد بندھنے کو دی تو جلد کے اندر ایک کاغذ لگا ہوا تھا جس پر حضرت فرید گنج شکر کی یہ غزل لکھی ہوئی تھی۔"

اوپر کے بیانات و اشعار میں دو چیزیں کھٹکتی ہیں۔ شیرانی صاحب کو یہ نظم نجیب اشرف اور عبدالحکیم کے ذریعے ملی ہے اور مولوی صاحب کو ہاشم صاحب کے ذریعہ ملی ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ دونوں صاحبان نے اسی ایک اصل کی نقل مختلف اصحاب سے حاصل کی تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ کتب خانہ مذکور میں جو کاغذ ملا تھا وہ گنج شکر اور ان کے عہد ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ اس نظم یا غزل کی زبان ان دو شعروں سے بالکل مختلف ہے جو سیرالاولیاء کے حوالے سے اوپر درج کیے جا چکے ہیں۔ پہلے دو شعر اردو سے بے تعلق معلوم ہوتے ہیں اور اس نظم کی زبان ایسی رواں اور صاف ہے کہ خسرو نہیں بلکہ ولی کے عہد سے جا ملی ہے۔ ایک ہی شخص کے کلام میں زبان کا یہ تفاوت اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اگر پہلے دو شعر گنج شکر کے ہیں تو یہ نظم ان کی نہیں ہو سکتی۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی جو قدیم اردو ادب اور لسانیات پر گہری نظر رکھتے ہیں بابا فرید گنج شکر کی مذکورہ نظم کے متعلق لکھتے ہیں۔
"پنجاب میں اردو" کے مصنف نے بیان کیا ہے کہ ذیل کی مناجات بھی خواجہ صاحب موصوف سے منسوب ہے مجھے دو سے اتفاق نہیں۔
(ادب القدیم، باب سوم علیگڑھ میگزین)

ان حالات میں جب تک گنج شکر کے اشعار کے متعلق مزید ماخذات و شواہد سامنے نہ آئیں ان کو اردو کا سب سے پہلا شاعر کہنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

امیر خسرو متوفی ۷۲۵ھ: ہم ابتدا میں بتا چکے ہیں کہ بوعلی قلندر شاہ اور امیر خسرو دونوں معاصر ہیں لیکن چونکہ بوعلی کا وصال امیر خسرو سے ایک سال پہلے ہوا اس لئے ہم نے قلندر شاہ ہی کو اردو کا پہلا شاعر لکھنا مناسب سمجھا اس کے بعد امیر خسرو کا کلام تمام اردو شعرا پر مقدم ہے امیر خسرو کی زبان اسی ہریانی سے متاثر نظر آتی ہے جس نے اردو کو جنم دیا ہے۔ امیر خسرو کا تبحر علمی غیر معمولی تھا۔ وہ ضلع ایٹہ کے متوطن اور حضرت نظام الدین اولیا کے خلیفہ و مرید تھے انھوں نے غلام خاندان کے آخری حکمرانوں سے لیکر محمد تغلق تک کا زمانہ دیکھا تھا۔ فارسی شاعری میں ان کا مرتبہ سارے ہندی نژاد فارسی شعراء سے بلند ہے اردو میں بھی فارسی آمیز ایک غزل "پہیلیاں" دوسخنے کہاوتیں اور کہ مکرنیاں ان کی یادگار ہیں۔ قدیم ترین تذکروں سے لیکر آزاد کی آب حیات سے لیکر مرآۃ الشعراء تک اردو شاعری کی حیثیت سے ان کا ذکر ملتا ہے۔ میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں خسرو کی فارسی آمیز غزل نقل کی ہے

ریختہ کا یا نمونہ ہے۔ خسرو کے کلام کا ایک اور قدیم ماخذ ملتا ہے۔ ملا وجہی نے اپنی تصنیف سب رس مصنفہ ۱۰۴۵ھ صفحہ ۸۰ میں امیر خسرو کا ایک دوہا نقل کیا ہے اس جگہ ان کی دو غزلوں کے چند اشعار اور ایک دو سخنہ جو جمد میں ہے نقل کئے جاتے ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ خالق باری امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے لیکن ذیل میں جو اشعار نقل کئے جا رہے ہیں وہ آج تک کی تحقیق کی روشنی میں یقینی امیر خسرو ہی کے ہیں۔

غزل

زحال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں ! | کہ تاب ہجراں ندارم اے جان نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلش چو عمر کوتاہ | سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں | کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

غزل[1]

جب یار دیکھا نین بھر دل کی گئی چنتا اتر ! | ایسا نہیں کوئی عجب راکھے اسے سمجھائے کر
تو تو ہمارا یار ہے تجھ پہ ہمارا پیار ہے | تجھ دوستی بسیار ہے یک شب ملو تم آئے کر
خسرو کہے باتاں غضب دل میں نہ لاوے کچھ عجب | قدرت خدا کی ہے عجب جب جیو دیا گل لائے کر

دو سخنہ

سب کوئی اس کو جانے ہے | پر ایک نہیں پہچانے ہے
دھرتی میں لکھا ہے | فکر کیا من دیکھا ہے

اشرف جہانگیر سمنانی متوفی ۸۰۲ھ

اشرف جہانگیری اپنے ہم عصر امیر خسرو سے تین سال چھوٹے تھے۔ نظام الدین اولیاء سے مرید ہونے کے لئے دہلی آئے۔ لیکن شیخ کا پہلے ہی وصال ہو چکا تھا۔ آپ نے ۸۰۲ھ میں انتقال فرمایا اور کچھوچھا شریف علاقہ اودھ میں مدفون ہوئے ان کا رسالہ تصوف اردو[2] کی پہلی تصنیف شمار کیا جاتا ہے حافظ محمود شیرانی اور حامد حسن قادری نے ان کے اشعار کے نمونے بھی نقل کئے ہیں۔

خواجہ گیسو دراز متوفی ۸۲۵ھ

آپ کا نام سید محمد حسینی ہے۔ ۸۱۵ھ میں دہلی سے گلبرگہ تشریف لے گئے ان کی مشہور تصنیف معراج العاشقین اردو کی قدیم ترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ مولوی عبدالحق شمس اللہ قادری اور ڈاکٹر ابواللیث نے ان کے یہ اشعار بھی نقل کئے ہیں ۔

دو ہے رہ کا باں نیک بد رکھنا قدم توں دیکھ حد | کچھ ہو پڑے گا دیکھ تب تو بہکی جا بک مار توں
تب قید گھوڑا آئے گا تجھ لا مکاں لے جائے گا | تب عشق جھگڑا پائے گا خندہ ہانے تروار توں
پانی میں نمک ڈال مزہ دیکھنا اسے | جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا سے

کبیر داس متوفی ۹۴۵ھ

کبیر داس بنارس کے باشندے تھے۔ ان کے کلام اور نام دونوں سے ظاہر ہے کہ فارسی اور بھاشا کی آمیزش ان کے عہد میں پوری طرح شروع ہو گئی تھی اور بول چال سے آگے بڑھ کر شعر و ادب میں اس کا استعمال کثرت سے ہونے لگا تھا۔ کبیر داس کے اکثر دوہے اردو کے ہی ماخذ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ان کے دوہے زبان زد خلائق ہیں۔ حامد حسن قادری ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور ڈاکٹر اعجاز حسین نے ان کی

---

[1] پنجاب میں اردو۔ از شیرانی و مختصر تاریخ اعجاز حسین ۔ [2] تاریخ و تنقید ادب از حامد حسن قادری

ایک غزل بھی درج کی ہے۔ اس غزل کو کبیر سے منسوب کرنے کے سلسلے میں انھوں نے کبیر گرنتھاولی کے مستند نسخوں کے حوالے دیئے ہیں اور بتایا ہے کہ کبیر مجموعہ کلام کے جتنے بھی مصدقہ نسخے ملے ہیں ان سب میں یہ دو غزل شامل ہے۔ کبیر کے سن وفات کا صحیح پتہ نہیں چل سکا ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور حامد حسن قادری نے ۹۲۴ھ لکھا ہے۔ مولوی عبدالحق نے ۹۸۰ھ لکھا ہے جو ۸۱۸ھ کے مطابق ہوتا ہے لیکن حافظ محمود شیرانی نے بڑی چھان بین کے بعد انکا سن وفات ۸۵۵ھ کے قریب متعین کیا ہے چنانچہ ہم نے اسی کو درست جانا ہے کبیر داس کے دو تین دوہے اور ایک مشہور غزل کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں ؎

ایسا کوئی نہیں ملا جا سوں رہیے لاگ
سب جگ جلتا دیکھیا اپنی اپنی آگ

کبیر الوہا ایک ہے گڑھنے کا ہے پھیر
لوہے سے بکتر بنے لوہے سے شمشیر

رنگی کو نارنگی کہیں بنے دودھ کو کھویا
چلتی کو گاڑی کہیں دیکھ کبیرا رویا

ہمن ہے عشق مستانہ ہمن کو ہوشیاری کیا
رہیں آزاد یہ جگ میں ہمن دنیا سے یاری کیا

جو بچھڑے ہیں پیارے سے بھٹکتے دربدر پھرتے
ہمارا یار ہے ہم میں ہمن کو انتظاری کیا

کبیرا عشق کا ماتا دوئی کو دور کر دل سے
جو چلنا راہ نازک ہے ہمن کو بوجھ بھاری کیا

شاہ میرانجی متوفی سنہ ۹۰۲ھ

شاہ میراں جی جو شمس العشاق بیجاپوری کے نام سے مشہور ہیں، حضرت شاہ کمال الدین بیابانی کے مرید تھے۔ شمس العشاق کے یہاں نثر و نظم دونوں تصنیفیں ملتی ہیں ان کی ایک نظم "شہادت الحقیق" بہت سے نمونے نقل کئے جن سے چند شعر بطور نمونہ یہاں دیئے جاتے ہیں ؎

بسم اللہ الرحمٰن
الرحیم توں سبحان

توں دانا اور بینا
توں سب تجھے ہے توانا

یہ سب عالم تیرا
رزاق سب ہوں کیرا

شیخ باجن متوفی سنہ ۹۱۲ھ

باجن کا اصلی نام بہاء الدین تھا۔ گجرات کے رہنے والے تھے اور فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے ان کے کلام سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت فارسی آمیز اردو کو زبان دہلوی۔ گجراتی اور ریختہ بھی کہتے تھے شیرانی نے باجن کا حال بڑی تفصیل سے لکھا ہے ان کی نظم جو زبان دہلوی" صفت دنیا کے عنوان سے ملتی ہے اور بہت مشہور ہے اسکا ایک مطلع بطور نمونہ نقل کرتے ہیں ؎

یہ ٹھگنی کیا کسی سے ملتی ہے
جب ملتی ہے تب چھلتی ہے

شاہ علی متوفی سنہ ۹۷۳ھ

شاہ علی محمد جیو گام دھنی بھی گجرات کے رہنے والے تھے۔ آپ کے کلام کا مجموعہ اسرار اللہ کے نام سے ان کے پوتے شاہ ابراہیم نے دیوان کی صورت میں مرتب کیا جو پہلی مرتبہ ۱۳۲۸ھ میں بمبئی میں طبع ہوا تھا۔ مولوی عبدالحق اور حافظ شیرانی نے ان کے حالات و کلام پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے نمونتاً ایک شعر نقل کیا جاتا ہے۔

آپیں کھیلوں آپ کھلاؤں
آپیں آپس لے گل لاؤں

امین گجراتی سنہ ۹۷۳ھ

ملک امین گنال عرف ایمن سلطان بہادر محمود شاہ ثالث گجراتی ثانی کے ندیم خاص تھے۔ محمود شاہ کا عہد

عہد تیغیہ از ... [illegible]

[illegible]۔ امین کا سن وفات اب تک نہیں مل سکا۔ لیکن تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ شاہ علی گجراتی متوفی سنہ ۹۷۳ھ کے معاصر تھے اور ان کی ایک نا تمام نظم "بہرام گور اور حسن بانو" کے نام سے ملتی ہے۔ اس میں بہرام اور حسن بانو کے حسن و عشق کا افسانہ نظم کیا گیا ہے۔ اس نظم کو بعد میں دولت نامی ایک شاعر نے مکمل کیا تھا۔ امین کی زبان اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ رواں اور صاف ہے۔ اس کی مثنوی کے چند اشعار دیکھئے ؎

امین حمد حق کر تو بے انتہا ۔۔۔ بہ نعت محمد قلم کو چلا
امین آستانوں کی اب خاک ہو ۔۔۔ حشر کے عذابوں سے بیباک ہو
الٰہی جہاں کا کرن ہار توں ۔۔۔ غریبوں یتیموں کا ادھار توں

شاہ برہان عالم متوفی سنہ ۹۹۵ھ :- یہ میراجی شمس العشاق کے بیٹے ہیں۔ ان کی کئی نثری تصانیف اور نظمیں ملتی ہیں چند اشعار یہاں دیئے جاتے ہیں ؎

اللہ پاک منزہ ذات ۔۔۔ اس سوں صفتاں قائم سات
علم۔ ارادت۔ قدرت۔ بار ۔۔۔ سنتا دکھتا۔ بولنہار

محمد قلی قطب شاہ متوفی سنہ ۱۰۲۰ھ۔ گولکنڈہ کے قطب شاہی خاندان کے پانچویں حکمراں تھے۔ قلی شاہ اور اکبر کا عہد ایک ہی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے عہد سے مسلسل اردو شاعری کے ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے دربار میں کئی شعراء کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن ابھی تک ان کے نام کے سوا ان کا کوئی کلام ایسا دستیاب نہ ہو سکا جو ان سے وثوق کے ساتھ منسوب کیا جا سکے۔ قلی قطب شاہ کا دیوان اس کے بھتیجے اور جانشین محمد قطب شاہ کے ہاتھوں سنہ ۱۰۲۵ھ میں مرتب ہوا۔ اٹھارہ سو صفحے کے اس ضخیم کلیات میں قصائد۔ مرثیے۔ مثنویاں، رباعیاں۔ قطعات۔ اور غزلیات سب کچھ ہی شامل ہے۔ مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو سنہ ۱۹۲۲ء میں قلی کے کلام پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ سلسلہ آصفیہ سے قلی کا جو کلیات شائع ہوا اس میں محی الدین قادری زور کا طویل تنقیدی مقدمہ شامل ہے۔ ہم اس جگہ دو شعر نقل کرکے اکتفا کرتے ہیں ؎

گرجا ہے میگھ سر تے تازہ ہوا ہے بستاں ۔۔۔ پھولاں کی باس پایا بلبل ہزار دستاں
اے خوش خبر صبا توں لے جا جواں فراں کن ۔۔۔ چمنا کی آرزو میں بیٹھے ہیں مے پرستاں
اولو منہال پھولاں ہے جام جوں نے سو بارہ ۔۔۔ نرگس اپس پلک سوں جھاڑو کرے شبستاں

افضل متوفی سنہ ۱۰۳۵ھ۔ افضل کا پورا نام محمد افضل تھا۔ جھنجھانہ ضلع میرٹھ کے متوطن تھے۔ ان کی مشہور نظم "بارہ ماسہ" اردو کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک صاف ستھری مثنوی ہے جسے واقعی قدیم اردو سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ افضل کا عہد اکبر و جہانگیر کا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کا بھی یہی زمانہ تھا۔ اس لحاظ سے شمالی ہند اور دکن دونوں جگہ بیک وقت منظوم تالیف و تصنیف کا باقاعدہ کام شروع ہو گیا تھا۔ ابھی تذکرہ کا بیان ہے کہ اف[illegible] کلام عبداللہ قطب شاہ و علی اللہ سے مقدم ہے۔ افضل کی تاریخ پیدائش کا پتہ نہیں چلتا۔ ان کا سال وفات سنہ ۱۰۳۵ھ ہے۔ افضل جھنجھانوی ایک عا[illegible] مزاج شخص تھے۔ ایک ہندو عورت کے عشق میں ہندی زبان سیکھی۔ ہندو کے پجاری بنے آخر کار وہ عورت مسلمان ہو گئی اور مولانا نے شادی کر لی۔ میر حسن کے تذکرۃ الشعراء سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ہندو لڑکے گوپال پر عاشق تھے۔ حقیقت کچھ ہو یہ امر واضح ہے کہ افضل ایک عاشق مزاج شخص تھے

۱؎ اردوئے قدیم از شمس اللہ قادری۔ پنجاب میں اردو از شیرانی۔
۲؎ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے افضل کا سن وفات سنہ ۱۰۴۰ھ بتایا ہے اس لحاظ سے افضل اور محمد قلی قطب شاہ کا انتقال ایک ہی سا[illegible]
چونکہ دونوں معاصر اور ہم عصر شاعر ہیں اس لئے محمد قلی قطب شاہ کے سر اولیت کا سہرا باندھنا درست نہیں۔

افضل کی مثنوی "بارہ ماسہ" ان کی آپ بیتی ہے۔ افضل نے بارہ ماسہ اس لئے نام رکھا ہے کہ سال کے بارہ مہینوں میں سے ہر ایک کو اپنی طویل مثنوی کا ایک باب قرار دیا ہے اور اسی مادے کے لوازم کی رعایت سے پوری نظم کہی ہے۔ چند اشعار دیکھئے ؎

سنو سکھیو بکٹ میری کہانی　　بھئی ہوں عشق کے غم سوں دوانی
نہ مجھکو سوے دن نہ نیند راتا　　برہوں کی آگ میں سینہ جراتا
نہیں اس درد کا دارو کسی کن　　بھئے حیراں سبھی حکمائے ذوفن
اری جس شخص کو یہ دلو لاگا　　سیاناں اوس کوں دور بھاگا
اری یہ عشق ہے یا کیا بلا ہے　　کہ جس کی آگ میں سب جگ جلا ہے
دہی جانے کہ جسکے تن لگی ہے　　برہوں کی آگ تن من میں دگی ہے

محمد قطب شاہ متوفی سنہ ۱۰۳۵ھ - قطب شاہی خاندان کا چھٹا حکمراں اور قلی قطب شاہ کا بھتیجا ہے۔ یہ اپنے باپ کی طرح علم دوست ادب نواز اور اچھا شاعر تھا۔ اس نے بھی اپنا ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے ؎

پیا سانولا من ہمارا بھلایا　　نزاکت عجب سبز رنگ میں دکھایا

سید میر حسینی متوفی سنہ ۱۰۴۹ھ - آپ نے فارسی کی ایک مثنوی تحفۃ العاشقین کو اردو نظم میں منتقل لیا ہے۔ نمونہ یہ ہے ؎

خدا نام کرتا ہوں میں ابتدا　　کہ قدرت لوں اسکے ہوئے دوسرا
بہوت مہوشاں اس نے پیدا کیا　　خط دل پسند رنگ زیبا دیا [1]

چندر بھان برہمن متوفی سنہ ۱۰۷۳ھ - چندر بھان اکبر آبادی بعہد شاہجہاں فارسی کے زبردست شاعر گذرے ہیں۔ اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان کی ایک اردو غزل کیفی نے نقل کی ہے اور اسے اردو کی پہلی غزل بتایا ہے۔ مولانا حسرت موہانی چندر بھان برہمن کے متعلق لکھتے ہیں۔

"چندر بھان برہمن اکبر آبادی کے نام سے مجھے محبت ہے۔ اور دوں کا گرویدہ ہوں لیکن ان کا دلدادہ ہوں۔ افضل خاں شیرازی وزیر شاہجہاں کے ملازم تھے انھیں کے ذریعے دربار شاہی میں باریاب ہوئے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں بھی نوازشات شاہی مبذول ہوتی رہیں اور ان کا تقرر خدمات عمال پر رہا۔ سنہ ۱۰۷۳ھ میں انتقال فرمایا۔"

(افادات حسرت موہانی بحوالہ نگار سنہ ۵۲ء)

قدرت اللہ قدرت نے اپنے تذکرۃ الشعرا میں ان کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ پنڈت کیفی نے ان اشعار کو اردو کی پہلی غزل بتایا ہے ؎

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے　　نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے [2]
پیا کے ناؤں کی سمرن کیا چاہوں کروں کس سیں　　نہ تسبیح ہے نہ سمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے
پیا کے نام عاشق کوں قتل یا عجب دیکھے ہوں　　نہ برچھی ہے نہ کرچھی ہے نہ خنجر ہے نہ بھالا ہے
برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیاں میں　　نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

---

[1] اردوئے قدیم از شمس اللہ قادری　[2] نمخانۂ جاوید

عبداللہ قطب شاہ متوفی سنہ ١٠٨٣ھ - محمد قطب شاہ کا فرزند اور قطب شاہی خاندان کا ساتواں حکمران ہے۔ عبداللہ تخلص تھا۔ اس کا بھی دیوان شائع ہو چکا ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

اے پری پیکر تر امکھ آفتاب   دیکھتا ہوں نور ہے نا مجھ میں تاب[1]

امین دکنی متوفی سنہ ١٠٨٥ھ - امین مخلص العاشق میراں جی کے پوتے اور بیجاپور کے باشندے تھے کئی مثنویاں ملتی ہیں - رسالہ قربیہ مشہور مثنوی ہے جس کے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں ؎

مطلق سب پر شاہد ہے   سب سوں دیک واحد ہے
پڑکو ہارا مشکل بات   بن کر ایک نہ آئے بات

نصرتی متوفی سنہ ١٠٩٥ھ - شیخ نصرت بیجاپوری کی تین منظوم مثنویاں ملتی ہیں۔ علی نامہ گلدستہ عشق اس کے علاوہ قصائد و غزلیات کا ایک مکمل دیوان بھی یادگار چھوڑا ہے۔ علی نامہ سے دو شعر نقل کئے جاتے ہیں ؎

انا نصرتی ختم کر یو کلام   دعا سوں ہے تج مدعا، تمام
الٰہی جگ تیغ سوں آفتاب   دباوے ستارے کوں رنگ ہو ولب

ہاشمی متوفی سنہ ١١٠٩ھ - سید میراں ہاشمی بیجاپور کے متوطن تھے۔ ان کی مثنوی یوسف زلیخا خاص شہرت رکھتی ہے۔ دو شعر دیکھئے ؎

تماشے کی عاشق جنم ہے وہ نار   اوڑھی سر پو چادر چلی گھر کے بھار
یہاں غلغلہ ہو رہیا تھا تمار   زلیخا ہر ایک جاتی ہے بھار

پدماوت کی تصنیف کا سن سنہ ١١٠٩ھ ہے۔ یہی سال قطب شاہی خاندان کے آخری حکمران تانا شاہ کی وفات کا ہے۔ محمد قطب شاہ متوفی سنہ ١٠٤٠ھ سے ابوالحسن تانا شاہ متوفی سنہ ١١٠٩ھ تک اردو شعر گوئی کا عام رواج ہو گیا تھا۔ شاہان گولکنڈہ کی علم دوستی اور ادب نوازی نے شہر کو علماء و فضلا کا مرکز بنا دیا تھا۔ قطب شاہی حکمرانوں کے علاوہ متعدد درباری و غیر درباری شعرا کا ذکر بھی تاریخ میں ملتا ہے۔ متعدد شعرا کے مجموعۂ کلام مرتب ہوئے کئی شاہکار مثنویاں سامنے آئیں، مرثیے، قصائد، قطعات سبھی کچھ اس دور میں ملتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ ان شعرا کے تفصیلی حالات اب تک دستیاب نہیں ہوئے ان کی تاریخ پیدائش، تاریخ وفات اور وطن تک کا سراغ نہیں ملتا۔ مختلف تذکروں اور مخطوطات سے ان کے کلام کی تصدیق و توثیق ہوتی ہے۔ ان کی مشہور منظومات کے سن تصنیف کا بھی پتہ چلتا ہے لیکن بجز اس کے کہ وہ قطب شاہی خاندان کے دور حکومت میں تھے ان کے عہد کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ذیل میں ہم ایسے چند معروف دکنی شعراء کے نام، ان کی منظومات اور سن تصنیف کی فہرست دے رہے ہیں اس سے ان کے عہد اور ان کی تاریخی ترتیب کو سمجھنے میں بہر طور مدد ملے گی۔

١۔ محمود احمد - محمد قلی قطب شاہ کا درباری شاعر تھا اس کی منظوم داستان لیلیٰ مجنوں بہت مشہور ہے۔
٢۔ ملا وجہی - محمد قلی قطب شاہ کا معاصر ہے اس نے سنہ ١٠١٨ھ میں مثنوی قطب مشتری لکھی۔
٣۔ غواصی - ملا وجہی کے ہم عصر ہیں عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر تھے۔ طوطی نامہ ان کی مشہور تصنیف ہے جو سنہ ١٠٤٩ھ میں وجود میں آئی۔
٤۔ ملا قطبی - معاصر عبداللہ قطب شاہ نے سنہ ١٠٤٥ھ میں شیخ یوسف دہلوی کی تصنیف تحفۃ النصائح کو اردو نظم میں منتقل کیا
٥۔ ابن نشاطی - عبداللہ قطب شاہ کا درباری شاعر تھا اس کی مثنوی پھول بن بہت مشہور ہے اس کا سن تصنیف سنہ ١٠٦٦ھ ہے۔

---

[1] اردوئے قدیم از شمس اللہ قادری

جینیدی:۔ اصل نام شیخ احمد تھا عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ان کی مشہور مثنوی "ماہ پیکر" ملتی ہے یہ مثنوی ۱۰۶۱ھ میں مکمل ہوئی

۷۔ طبعی گولکنڈہ کے متوطن تھے انھوں نے ۱۰۸۱ھ میں ایک مثنوی لکھی

۸۔ فائز۔ فائز نے ۱۰۹۴ھ میں قصہ رضوان شاہ نظم کیا۔

۹۔ معظمی معظمی نے ۱۰۹۵ھ میں قصہ ماہ پارہ لکھا۔

۱۰۔ عاجز:۔ ۱۱۰۰ھ میں "ملکہ مصر" نام کے قصہ کو نظم کیا۔

۱۱۔ عشرتی عشرتی نے ۱۱۰۰ھ میں ایک مثنوی لکھی

۱۲۔ بحری۔ بحری نے "من لگن" نام کی ایک مثنوی ۱۱۱۲ھ میں لکھی۔

۱۳۔ ولی دکنی۔ متوفی ۱۱۱۹ھ نے اپنا بیش بہا کلام جدید طریقہ پر مرتب کیا اور غزل۔ قصیدہ۔ رباعی اور مثنوی پر مشتمل ایک مکمل دیوان یادگار چھوڑا ولی کے کلام پر اصل اردو کا اطلاق ہوتا ہے۔ دوسرے دکنی شعراء کی طرح ان کے کلام پر دکھنی زبان کا اثر ضرور ہے لیکن دہلی میں سعد اللہ گلشن سے ملنے کے بعد ان کی زبان ایا پلٹ گئی۔ فارسی زبان کا اثر بڑی خوبصورتی سے دکھنی زبان پر چھا گیا۔ فارسی محاورات کے ترجمے۔ تشبیہیں۔ استعارات کارآمد ترکیبیں اردو میں شامل ہوگئیں جس سے نہ صرف زبان کو وسعت نصیب ہوئی بلکہ ولی کے کلام میں ایسی نرمی۔ مٹھاس اور لطافت پیدا ہوگئی کہ میر جیسے بد دماغ نے ولی کو اپنا محبوب بنا لیا۔ ولی کے کلام پر تفصیلی تنقید کی یہاں گنجائش نہیں بالا ختصار یہ کہا جاسکتا ہے ولی کے کلام میں غزل بیشتر خصوصیات موجود ہیں تصوف کے نکات اور واردات قلبیہ کو وہ بڑی کامیابی سے شعر میں بیان کرجاتے ہیں مسلسل غزل بھی ان کے یہاں ملتی ہے غزل میں جمالیاتی احساس۔ حسن انگیزی۔ محبوب کی سراپا نگاری۔ مجسمہ سازی۔ غزلیت۔ رجائیت اور الفاظ و تراکیب کی فنکارانہ تکرار ان کے کلام کے خاص جوہر ہیں ــــ ان کی زبان ایسی صاف سادہ اور دلکش ہے کہ میر کے لب ولہجہ سے مل جاتی ہے انھوں نے آج تک کے سارے غزل گو شعراء کو متاثر کیا ہے۔ دہلوی شعراء اگرچہ ان کے دہلی پہونچنے کے قبل سے غزل کہتے تھے لیکن جسے ہم گیر تغزل کہتے ہیں وہ ولی کے اثر سے دہلوی شعراء کے اردو کلام میں آیا ہے ــــ ولی کے چند منتخب اشعار سے ولی کے شاعرانہ مرتبہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ؎

عجب کچھ لطف دیتا ہے شب فرقت میں دلبر سوں

سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

مسند گل منزل شبنم ہوئی ‏ ‏ ‏ ‏ دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا ‏ ‏ ‏ ‏ جادو ہیں ترے نین غزالاں سے کہوں گا

زندگی جام عیش ہے لیکن ‏ ‏ ‏ ‏ فائدہ کیا اگر مدام نہیں

مفلسی سب بہار کھوتی ہے ‏ ‏ ‏ ‏ مرد کا اعتبار کھوتی ہے

ولی کے کلام کا دہلوی اور دکنی دونوں شعراء پر اچھا اثر پڑا۔ قدیم اردو سے دکنی کا خصوصی اثر مٹنے لگا اور فارسی کی آمیزش سے ایک ایسی شیریں زبان وجود میں آگئی جسے آج ہم اردو کہتے ہیں چوں کہ ولی کے بعد کے دہلوی اور دکنی شعراء کے حالات و کلام آسانی سے دستیاب ہوجاتے ہیں اس لئے تاریخی نقطۂ نگاہ سے اس بحث کو آگے بڑھانا مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے۔

سرشار صدیقی

عروجِ آدمِ خاکی

(روس کے مصنوعی چاند اور طفیلی سیارہ کی کامیابی پر انسانی اور شاعرانہ تاثرات)

قبائے چاک پہ تحریر ہے عذابِ نمو — کلی پہ حشر گذرتے ہیں مسکرانے تک
ازل سے قافلۂ ارتقا روانہ تھا — جو آج پہنچا ہے انساں کے آستانے تک
ہم آخر آ ہی گئے دورِ سنگ و آہن سے — مہ و نجوم کی تسخیر کے زمانے تک
جو ذہنِ خاک میں آتا ہے اِک خیالِ عروج — نہ ختم ہوگا ستاروں پہ فتح پانے تک

بشارت اے غمِ صبحِ طرب کہ میں تجھ کو — شکستِ ظلمتِ شب کا پیام دیتا ہوں
ہلاکِ گردشِ سیارۂ سیاہ کو آج — مہ و نجوم کا فیضانِ عام دیتا ہوں
خزاں نصیب گل برگ برگ کو مژدہ — کلی کلی کو بہارِ دوام دیتا ہوں
خبر کرو مرے گلشن کے غنچے غنچے کو — نسیمِ صبح کو اذنِ خرام دیتا ہوں
وہ مشتِ خاک جو کل آسماں پہ چمکے گی — میں اس کو آج اک انساں کا نام دیتا ہوں

زمیں سے عرش تک انساں کا بول بالا ہے
نئی حیات کا سورج نکلنے والا ہے

رئیس فروغ

طفیلی سیّارہ

فضا میں آدم خاکی کے اقتدار کا نقش
کمالِ ناز کا ساماں ہے۔ ناتمام سہی

ملا ہے پاؤں کو چکر نصیب کو گردش
پرائے دیس میں اک اجنبی ہے آوارہ
جہاں عظیم خدا کے عظیم ماہ و نجوم
وہیں حقیر بشر کا حقیر سیارہ

بشر حقیر سہی، لیکن اس قدر بھی نہیں
کہ یوں طلسم زمان و مکاں میں قید رہے
بلندیوں پہ کمند جنوں نہ پھینک سکے
نشیب ہی میں بہ انداز بکر و زید رہے

متاعِ چشم و دل بکر و زید کی قیمت
حصولِ علم و خبر کے سوا کچھ اور نہیں
بڑھے چلو کہ یہی زندگی کا منشا ہے
"حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں"

کمالِ ناز کا ساماں ہے ناتمام سہی
فضا میں آدمِ خاکی کے اقتدار کا نقش

عزیز قیسی

سنّاٹا

کس کس سے چھپاؤں۔ تم بتاؤ
کس طرح سے دن گزر رہے ہیں
توہین، حقارتیں، تنفّر
کس کس سے نباہ کر رہا ہوں
با وصفِ سرشتِ خود شناسی
تذلیلِ طلب سے بڑھ گیا ہوں

شکر اور شکایتیں دعائیں
تم کو تو خبر ہے اس جہاں میں
میرے لئے کوئی آستانہ
تاثیر دہِ فغاں نہیں ہے
جز جبرِ نفس یہ زندگانی
تم کو تو خبر ہے کچھ نہیں ہے
ہر رشتہ یہاں کا افترا ہے
ہر جھوٹ یہاں کا حق نما ہے

یوں فیضِ خرد سے بہرہ ور ہوں
ہر ایک فریبِ وہم کھو کر
اس رات یہ سوچنے لگا ہوں
میں معتقدِ پناہ ہوتا
اتنا تو نہ روسیاہ ہوتا
اے کاش حیات بے حسی میں
مر کے جی کے گزار لیتا

تم کو تو خبر ہے اس جہاں میں
میرا کوئی آسرا نہیں ہے
اک تم تھے سو تم بھی چھپ گئے ہو
اب میرا کوئی خدا نہیں ہے

مظہر امام

سفر ہے شرط...

مرے عزیز! مہ و سال کی گذرگاہیں
ترے شعورِ سفر سے ہیں لو لگائے ہوئے
وہ دیکھ عارضِ گلگونِ شاہدِ فردا
کہاں چلا ہے تو ماضی کی لاش اُٹھائے ہوئے؟

ہے امتحاں ترے ذوقِ چمن طرازی کا
کہ بے شمار گل و لالہ درکفِ خاک است
"کماں مبرکہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ دررگِ تاک است"

ہے تیرا ساغرِ دل سوزِ آرزو سے تہی
تری خودی کو ابھی کچھ گداز ہونا ہے
خدا کرے کہ تجھے کوئی آستاں مِل جائے
کہ تیرے ناز کو رشکِ نیاز ہونا ہے

ترا شباب ہو گر آندھیوں سے گرم ستیز
دل و نظر کے گلستاں لہک بھی سکتے ہیں
اگر یہ غازۂ برق و شرار سے کھیلیں
تری حیات کے عارض چمک بھی سکتے ہیں

تو سوئے منزلِ مقصد قدم بڑھا تو سہی
وہ مصرِ شوق، وہ شہرِ نگار راہ میں ہے
"سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتر ہے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے"

پروفیسر الکزاندر دبوسانی (اطالیہ)

ایک یوروپین کی نظر میں اُردو کی اہمیت

مشہور اطالوی مستشرق پروفیسر الکزاندر دبوسانی غالباً مغرب کے واحد عالم ہیں جنھوں نے اردو شعر و ادب کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے۔

پروفیسر بوسانی ۲۹ مئی ۱۹۲۱ء کو روم میں پیدا ہوئے اور روم یونیورسٹی میں تعلیم پائی آپ عربی، فارسی، ترکی اور اُردو زبانوں کے عالم ہیں، "ہند و پاکستان کے اسلامی رجحانات" آپ کا خاص موضوع ہے۔ پروفیسر بوسانی نے اطالوی زبان میں قرآن حکیم اور اقبال کے جاوید نامے کا مکمل ترجمہ کیا ہے۔ آپ نے اقبال کی منتخب نظموں کو بھی اطالوی زبان کا جامہ عطا کیا ہے۔ ان نظموں میں "مسجد قرطبہ" جیسی مشکل نظم بھی شامل ہے پروفیسر بوسانی نے بیدل اور غالب کو بھی مغربی دنیا سے روشناس کرایا ہے۔ اب وہ پاکستانی زبانوں اور ان کے ادب پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔

یہ تقریر پروفیسر بوسانی نے ۱۱ دسمبر کو انجمن اردو، اُردو کالج کا افتتاح کرتے ہوئے اُردو میں پیش کی۔ کراچی کے اساتذہ اور طلبہ نے مسرت و حیرت کے ساتھ ایک غیر ملکی کو اپنی زبان کے بارے میں اس عالمانہ انداز میں بولتے ہوئے سنا۔ ہم جناب آفتاب حسن پرنسپل اردو کالج کے شکریے کے ساتھ اس تقریر کو شائع کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

ہاں۔ میں یوروپین ہوں۔ مگر اطالوی بھی ہوں اور آپ حضرات جانتے ہیں کہ مغربی ثقافت کے جغرافیائی اور روحانی [illegible] میں اطالیہ شرق و غرب کے درمیان واقع ہوا ہے اور اطالیہ کی تاریخ میں آسیائی، افریقائی اور یورپی مختلف اثرات باہم [illegible] ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے میں بھی اطالوی ہو کر نصف مشرقی اور نصف مغربی اپنے کو سمجھتا ہوں اور بے شبہ آپ مجھ کو [illegible] کریں گے اگر اردو کے مسئلہ میں مداخلت کروں۔ میری اردو اتنی ناقص ہے کہ میں مجبور ہوں کہ اپنے فکر کو بہت مختصر اور کوتاہ جم[illegible] سے ظاہر کروں۔ اس لئے شاید میرے جملوں کا مدعا اور میرے اظہارات باریک اور نازک شاخوں سے محروم دکھائی دیں گے۔ میں اس کے لئے بھی آپ حضرات سے معذرت مانگتا ہوں۔

میرے خیال میں اردو زبان کی اہمیت تین گنی ہے۔ اس کا ایک لسانی، ایک ادبی، اور ایک سماجی پہلو بھی ہے آئیے ہم لسا[illegible]

عہ شدہ وکر..

کہ فارسی داں یا عربی داں جو مسلمان فوجیں برِصغیر ہند و پاکستان آئیں ان کے سپاہیوں نے مقامی لوگوں سے ملنے اور بات چیت کرنے کے واسطے بالعموم زبان ایک مخصوص آمیختہ زبان کو ایجاد کیا۔ جانتا ہوں کہ ہند و پاکستان کے نقادوں نے اس OVER-SIMPLIFYING نظریے کا انکار و رد کیا ہے۔ لیکن بہر حال یہ ثابت چیز ہے کہ شروع ہی سے اُردو زبان ایک بین الاقوامی زبان ہوتی ہے اور اس کا کسی نہ کسی نسل و نژاد سے خاص تعلق نہیں۔ اس معنی میں اُردو زبان بھی ایک (مسلمانی بولی) کہلا سکتی ہے کہ وہ قدرتی صورت پر اسلامی تعا اصول کو مجسم کرتی ہے جس کی بنیاد سب لوگوں کا مساوات اور ذاتی اور قومی اور نژادی تعصبات کی تخریب ہے ہمارے تاریخی دور میں نژاد پرستی اور قومیت کا جوش بہت زور پاکر اب تقریباً سب زبانوں میں وہ مضحک اور نامعقول منظر دکھائی دیا ہے۔ جس کا نام انگریزی زبان میں PURISM (یا صفائی پرستی) کہتے ہیں مثلاً جرمنی زبان میں TELEFON کے بجائے FERNSPREECHER (یا دور سے بولنے والا) کہنے لگے اور ایرانی زبان میں طیارہ کی جگہ میں ہواپیما و یا THERMOMETRE کی لفظ چھوڑ کر وہ اب دگرما سنج) کہنا چاہتے ہیں یا نئی ترکی زبان میں قانونِ اساسی کے بجائے (آنا یاسا) ایک پرانی قبل اسلامی ترکی لفظ استعمال کی جاتی ہے اور اخیر کسی نے مجھ سے کہا کہ نئی ٹھیٹھ ہندی میں اسٹیشن کی جگہ میں BHAGBHAGHADDI کہنے لگے اور حتیٰ سادہ مقامی لفظوں کو چھوڑ کر مثلاً (اور) لفظ پر پرانی سانسکرت لفظ TATHA ترجیح دیتے ہیں۔ معلوم ہے کہ زبان اس کو بولنے والوں کے عادات و رسوم و تصورات اور آیڈیلوں کی زندہ رمز ہے۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ جو لوگ AUTOMOBIL کی جگہ میں KRAFURAYAN بولنے لگے یا کتاب کی جگہ میں پستک۔ وہ رفتہ رفتہ عملی میدان ہی میں بھی ایک خطرناک افراطی NATIONALISM کے خوگر ہو جائیں گے اس معنی میں اردو زبان بین الاقوامی امن و صلح کا ایک SYMBOL اور ایک ضمانت بھی ہو سکتی۔ شاید آپ کی نظر میں تھوڑی سی مضحک چیز پڑے گی۔ مگر میرے خیال میں ایک ہندو جس کی زبان میں (کتاب) (ثقافت) (علم) (تمدن) وغیرہ عربی الفاظ نیچرل آتی ہیں اور اس کی روزمرّہ زندگی کے بنیادی حصے بن گئیں۔ وہ آدمی مشکل ہے کہ مسلمانوں کے برخلاف لڑائی کرے۔ اور دوسری طرف سے ایک مسلمان جس کی بولی میں سماج۔ نرالا۔ دکھ اور اس قبیل کی ہندوستانی الفاظ رائج ہیں ہندو اور ہندی ثقافتی میراث کی بھی تحقیر نہ کر سکے گا۔

خوش بختانہ اُردو زبان میں PURISM ایک ناممکن بات ہے کیوں کہ اگر نہ خود (اُردو) کا مفہوم اور اردو ہی زبان اور حتیٰ اس کا نام (جو ترکی زبان سے مقتبس ہوا ہے) بالکل غائب اور ناپدید ہو جائیں گے۔ مختصر یہ کہ اردو زبان عالمگیری غیر قومی اور ضدِ نژادی تصورات کی ایک زندہ علامت اور نشان ہے۔

جو ملاحظات اُردو کے لسانی پہلو کے متعلق میں نے ابھی کئے ہیں اُردو کی اہمیت کے دوسرے پہلو کی طرف اچھی طرح سے راہنمائی کریں گے۔ یعنی اردو کی ادبی اہمیت۔ اُردو کی ادبی اہمیت اس کی لسانی خاصیات سے مربوط ہے۔ میں فکر کرتا ہوں کہ اُردو ادب کے تین عنصر ہیں جو باہم مل کر اُردو ادب کی مخصوص حیثیت کو تشکیل کرتے ہیں یعنی (الف) سبک ہندی یا ہندوستانی ادبی اُسلوب جو فی الا [illegible] صفوی دور کی فارسی شاعری میں پیدا ہوا ہے (ب) مقامی رنگ (ج) مختلف حرکیاتی حالات کو بخوبی ظاہر کرنے والے فعل۔

تیسرے عنصر سے شروع کر کے اُردو زبان میں جیسے فعل ہیں مثلاً ڈھلنا۔ لڑکھڑانا، گھلنا، لہلہانا، ٹپکنا، چمکنا وغیرہ ویسے فعل فارسی زبان میں بالکل نہیں ملتے۔ مثلاً وصف برشکال لاہور میں جو نظم مشہور فارسی زبان شاعر مسعود سعد سلمان نے لکھا اس میں باوجود اس کے وہ وصفی اور بیانی نظم ہے صرف دادن، داشتن، زدن، گفتن، کردن، کندن، گذشتن، بردن، خندن وغیرہ عمومی فعل استعمال کئے گئے ہیں۔ برعکس نظیر اکبرآبادی کے ایک بیانی نظم کے اس بند کو سنئے اس میں وہ زبردست اردو شاعر ہند

ہوائی شے کے ایک پہلو کو وصف کرتا ہے۔

ناؤ میں وہ جو گھرو ناچوں میں جھک رہے ہیں ٭ جوڑے بدن میں رنگیں گہنے چمک رہے ہیں

تائیں ہوا میں اڑتی طبلے کھڑک رہے ہیں ٭ عیش و طرب کی دھو میں پانی چھپک رہے ہیں

سو ٹھاٹھ کے بنا کر اطوار تیرتے ہیں

اس آگرے میں کیا کیا اے یار تیرتے ہیں

میں پروفیسر ابو اللیث صدیقی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے نظیر کے متعلق اپنی قیمتی کتاب مجھے دیکر اس قابل ملاحظ اردو شاعر کو جاننے کا امکان میرے لئے پیدا کیا۔

یہ پرانی دکھنی اردو سے موروث حرکیاتی فعلوں کا استعمال فارسی تاثیر رواج پانے کے بعد بھی باقی رہا اور جدید شاعری میں نئے روپ میں ظاہر ہوا۔ اردو زبان میں بہت مستقل فعل موجود ہونا۔ فارسی زبان میں ان کے ندرت کے مقابلے میں اردو زبان کو ایک بڑی اہم خاصیت دیتا۔ جس کے بدولت اس زبان میں مقامی رنگ اچھی طرح سے ابراز کیا جا سکتا ہے۔

مگر ایک ہی وقت میں اس موضوع پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ اردو ادب اس کے اوج کمال کے دور میں بہت پیچیدہ اور غیر طبیعی فارسی اسلوب کے تحت تاثر ہو پڑا۔ جس کا نام (سبک ہندی) ہے۔ پر سبک ہندی یا ہندوستانی فارسی اسلوب کو۔ باوجود اس کی پیچیدگی اور عدم طبیعیت کے۔ میرے خیال میں کسی معنی میں نئے اسلوب ہی کا مبشّر اور پیشرو ہم سمجھ سکتے ہیں۔ سبک ہندی کی مرکزی حیثیت یہ ہے کہ اس میں فارسی کلاسیکی اسلوب شاعری کا موزوں لیکن یکرنگ اور یکساں صوری کا اعتمال نہایتی طور پر توڑ گیا اور شاعروں کے لئے ایک نئی تخلیقی آزادی کا امکان کھل گیا۔ مثلاً جب بیدل کہتا۔

من آں ضو قمم کہ خود را در غبار خویش مے جویم

گویا پریشاں مے نوید کلک موج احوال دریا را

تو پہلے مصرع میں ایک صرف ذہنی اور ABSTRACT نام یعنی (شوق) مجسّم ہو کر اپنے کو انسانی تن کی گرد و غبار میں ڈھونڈتا ہے اور دوسرے مصرع میں (کلک) موج سے مشبّہ کیا جاتا ہے باوجود ان دونوں کی صوری اور ظاہری ناسازگاری کے۔ اردو شاعری میں میرے خیال میں غالب نے بیدل کی آزادانہ معنی آفرینی کو اوج کمال تک پہنچایا ہے۔ مثلاً

فضائے خندۂ گل تنگ و ذوق عیش بے پروا ٭ فراغت گاہ آغوش وداع دلپسند آیا

اس بیت میں جو صورۃً ناموزوں و غیر کلاسیکی استعارے ملتے ہیں وہ جدید شاعری کے پیشرو ہیں اور حتی کہ ایک معاصر یوروپین شاعر (فضائے خندۂ گل تنگ) اور (فراغت گاہ آغوش وداع) کو اپنے ذوق کے قریب سمجھیں گے اور ضرور قبول اور پسند کریں گے۔

یا دیکھئے کس طرح غالب سبک ہندی سے استفادہ کرکے جدید اور آتشیں حسیات کو ظاہر کر سکتا ہے۔

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا ٭ میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

یا

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر ٭ کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

اگر ہم غالب کے یہ نہایت ظریف اور نازک بیت کو:۔

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں ٭ جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں

نظیر اکبر آبادی کے صرف بیانی لیکن کبھی کبھی عامیانہ شعروں سے مقابلہ کرتے تو اردو ادب کی وسعت اور اس کی بے نظیر اسلوبی دولتمندی ہماری آنکھوں میں بخوبی نمایاں ہو جائے گی۔ اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں یعنی اس کے پختہ اور باذوق شاعروں کے نظموں میں سبک ہندی کا ظرافت اور معنی آفرینی مقامی رنگ اور بیانی حرکت و جنبش کی قوت سے عجیب آمیزش پاتے ہیں۔

ابھی۔ یہ لسانیاتی نقطۂ نظر سے نہایت دولت مند اور نفسیاتی احوال اور باریک باریک شاعرانہ خیال ظاہر کرنے کے بڑی مناسب زبان بدبختانہ آج تک پاکستان کی یونیورسٹیوں کا وسیلۂ تعلیم نہیں بن گئی۔ اجازہ فرمائیے کہ میں اس بارہ میں آپ کے ساتھ بہت برادرانہ اور بے تکلفانہ باتیں کروں اور اپنی ناقص اردو میں اردو زبان کی اہمیت کے تیسرے پہلو پر کوئی بات کہوں۔

یہ سماجی اہمیت ہے۔ آسیا کی اس نئے دور میں پیدا ہوئی ریاستوں کا سب سے بڑا نقص و عیب یہ ہے کہ انھوں میں اونچے اور نیچے اجتماعی طبقوں کے درمیان ایک بڑا فرق ہے اس افراطی فرق کو برطرف کرنے کے لئے پختہ اور باعقل سیاسیوں کا ایک نہایت ہی اہم فرض ہے اگر اس کام میں وہ موافق ہو جاتے تو انقلابی اور مبالغہ آمیز رجحانات خود بخود اپنی خطرناک قوت کو کھو کر ایک حقیقتاً اور عادلانہ سماجی انتظام برپا کر سکیں گے۔ دوسرے ملکوں میں بھی طبیعتوں کا فرق موجود ہے۔ مگر ہند و پاکستان میں اس فرق کا ایک لسانی پہلو بھی ہے جو مخصوصاً مہلک ہے۔ پاکستان میں اپنے سفر میں میں نے دیکھا کہ نام نہاد نیچے طبقوں میں بھی ایسے لوگ ہیں جو اردو زبان بحسن و خوبی بولتے اور سمجھتے بھی ہیں اور فنی شاعرانہ اور لسانیاتی ذوق کے بھی صاحب ہیں۔ یہ لوگ ابھی اپنے وطن میں نسبتاً پردیسی ہیں جو انگریزی نہیں جانتے تو اپنے ملک کی اداری اور دفتری زبان کو نہیں سمجھتے اور شاید پاکستان کی پوری شہریت کے حقوق سے عمداً استفادہ نہیں کر سکتے ہیں۔

غالباً بعضے لوگوں کی نظر میں اردو غریبوں کی بولی بن گئی ہے۔ غالب اور میر کی لسان، شاندار مغل بادشاہوں کی زبان صرف بیروں اور نوکروں کے لئے مناسب وسیلۂ گفتگو ہو گئی۔ اس چیز کا دوسرا نتیجہ یہ بھی ہے کہ اردو زبان اور ادب میں خارجی لوگوں کی دلچسپی گھٹ گئی۔ میں نے شخصاً ایک یورپین صاحب کو سنا جس نے مجھے کہا "اردو زبان نرالی ہی زبان ہے۔ وہ بہت ناقص اور حقیر مقامی بولی ہے اردو میں میرے خیال میں سو دو سو الفاظ سے زیادہ موجود نہیں ہوں گی" جب میں نے اس سے کہا کہ اردو زبان لااقل تین زبانوں کی ایک موزوں آمیزش ہو کر شاید بعضے یورپین زبانوں سے بھی دولت مند ہے اور اس کا ایک وسیع اور درخشاں ادب ہے، وہ نہایت متعجب ہو کر اپنی خاموش مسکراہٹ سے مجھ سے کہنے لگا کہ وہ میری باتوں کو باور نہیں کر سکتا تھا یورپ میں اردو زبان و ادبیات میں دلچسپی رکھنے والے مستشرقوں کی ندرت کا سبب عملی ہے یعنی کسی قدر تو آپ کا قصور بھی ہے، ان تنقیدوں کو معذور رکھئے۔ ان کا باعث اردو زبان کے لئے اور اردو بولنے والوں ہی کے لئے بھی میری محبت ہے۔ کیونکہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا بالکل ہم فکر ہوں جب وہ لکھتا۔ "اردو زبان میں جو وسعت، جو حسن، جو تنوع اور جو دل آویزی ہے اس پر رنگوں کی تخلیق کرنے والا۔ بادلوں کو پانی عطا کرنے والا اور سبزے کو ہریالی بخشنے والا خدا بھی رشک کر سکتا ہے۔ جو اردو کا دشمن ہے وہ ہماری تہذیب کا دشمن ہے۔ ایسے لوگ ایک حسین چیز کو مٹا تو سکتے ہیں، لیکن خود ویسی ہی یا اس سے کمتر درجہ کی بھی کوئی دوسری چیز نہیں بنا سکتے۔"

پہلے ہم نے دیکھا کہ اردو زبان اتنی لسانی خصوصیتوں پر مشتمل ہے جو اس کو ایک وسیع الاستعمال مثل آسیائی بین الاقوامی زبان بننے کی قابلیت دیتی ہیں۔ بعد میں میں نے مختصراً دکھلانے کی کوشش کہ اردو ادب ہند و پاکستان کے برصغیر میں سب سے زیادہ قابل استفادہ ادب ہے اور تیسری جگہ پر یہ بھی واضح و روشن ہو گیا کہ اردو کا بحیثیت سرکاری اور اداری زبان کے [illegible]

میں پاکستانی جماعت کے عین مسائل کے حل میں بڑا حصہ دار ہو سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ جب میں پھر پاکستان کو واپس آؤں گا تو ایک مسرا لکچر دے سکوں۔ اولاً اب سے اچھی اُردو میں اور ثانیاً ایک نئی پاکستانی یونیورسٹی میں جس کی تعلیمی زبان اُردو ہو۔

اُردو کے جن پہلوؤں پر ہم نے غور کیا۔ شاید ان پہلوؤں کا خلاصہ کر کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُردو بین الاقوامی میدان کا اسلام کا ایک SYMBOL ہے۔ مرتجع فقیہوں کے اسلام کا نہیں بلکہ اکبر اور تاج محل کے اسلام کا۔ اُردو ایک اسلامی روح کی لسانی عکاسی ہے جس میں عربی اور فارسی اور ترکی اور ہندی تعصبات تو مٹ گئے ہیں۔ اس معنی میں ایک ہندو بھی اُردو بولنے سے اور اردو میں شعر کہنے سے ناخواستہ بھی مسلمان ہو جائیگا۔ اس اسلام کا بنیادی اساس ہنرمندانہ موزونیت فکر بھی ہے اور وہ خرافات اور بے فائدہ قومی اور لسانی اور اجتماعی بندشوں کے برباد کرنے کا نتیجہ ہے۔

جو شعر علامہ اقبال نے "مسجد قرطبہ" میں عالمگیر اسلامی خوبصورتی پر کہے وہ شاید میں اب اس مختصر لیکچر کو شائستہ طور پر ختم کرنے کے لئے اردو زبان اور اُردو ادب کی نسبت کہہ سکتا ہوں۔

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اُس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند اس کا خیالِ عظیم
اُس کا سرور اُس کا شوق اُس کا نیاز اُس کا ناز

مہر نیمروز کراچی

عبدالحق

دو سوال

میں ایک بنگالی طالب علم ہوں۔ اردو میری مادری زبان نہیں مگر محبوب زبان ہے اور میں برسوں سے اس کے مطالعے میں مصروف ہوں ادھر چند سال سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں اردو کا ریسرچ اسکالر ہوں میرے استفسارات کی نوعیت طالب علمانہ ہے۔ امید ہے کہ جناب والا اور مہر نیمروز کے قارئین کرام میری رہنمائی فرمائیں گے' ازراہ کرم میرا عریضہ اور سطور ذیل اپنے موقر جریدہ میں شایع فرمائیے' تاکہ ارباب علم وفضل اس کے متعلق اظہار خیال فرماسکیں اور مجھے روشنی مل سکے۔

مہر نیمروز کا خاص نمبر بابت جولائی۔ اگست سنہ ۱۹۵۷ء نظر سے گزرا۔ صفحہ ۴۴ پر شاہ ولی الرحمٰن کاکوی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

" اس شعر پر۔

یکساں موسم یکساں راتیں' یکساں بادہ باراں ہیں — سونے والے سوتے ہیں اور رونے والے روتے ہیں

پروفیسر تجود جعفری صاحب کو یہ اعتراض ہے کہ " بادہ باراں " میں واؤ کا اشباع غیر فصیح اور مکروہ ہے "

سحر انصاری صاحب نے میر کا شعر سند میں پیش کر کے اس اعتراض کو غلط ثابت کر دیا۔ مگر میرا سوال اعتراض یا اس کے جواب کے متعلق نہیں میں محترم پروفیسر صاحب سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ " واؤ کا اشباع " کیا معنی رکھتا ہے۔

اشباع کے لغوی معنی پیٹ بھرنے کے ہیں اور اصطلاح میں اشباع کے یہ معنی ہیں کہ فتحہ یا کسرہ یا ضمہ کو اس طرح کھینچ کر پڑھا جائے کہ فتحہ (یعنی زبر) " الف " بن جائے اور کسرہ (یعنی زیر) " ی " میں تبدیل ہو جائے اور ضمہ (یعنی پیش) " واؤ " کی شکل اختیار کر لے۔ جب یہ صورت ہے تو " واؤ کا اشباع " کیا معنی۔

اگر بحث کی خاطر تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر لیا جائے کہ اشباع کے معنی ہیں واؤ کو کھینچ کر پڑھنا۔ تو اگر واؤ کو کھینچ کر پڑھا جائے تو وہ کیا صورت اختیار کرے گا؟ ضمہ کو کھینچ کر پڑھا جائے تو واؤ بن جاتا ہے۔ واؤ کو کھینچ کر پڑھا جائے تو وہ کیا بن جائے گا؟

انگریزی داں حضرات اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اردو میں short vowel کی (دیدہ یعنی پیش) کھینچ کر پڑھا جائے تو Long vowel (ی۔ ا۔ د) بن جاتا ہے۔ مثلاً بُرا کے پیش کو کھینچ کر پڑھیں تو " بورا " بن جائے گا۔ لیکن " بورا " کے واؤ کو کھینچ کر پڑھیں تو " بورا " کی آواز کیا ہوگی؟ اور آیا ایسی کوئی صورت ہماری زبان میں مروج و مستعمل ہے؟

دوسرا سوال شاہ ولی الرحمٰن صاحب ... [illegible] ... " بادہ باراں " ... [illegible]

معلوم ہوتا ہے "

"بادو باراں" میں واوٗ حرفِ عطف ہے۔ میں شاہ صاحب سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ واوِ عطف کو اس طرح دبا کر پڑھنا کہ وہ صرف ضمّہ (یعنی پیش) کی آواز دے ہر مقام پر فصیح تر ہے۔ یا یہ صورت صرف "بادو باراں" کے لئے مخصوص ہے؟۔ مجھے ایسا کوئی اصول معلوم نہیں جس کی بنا پر واوِ عطف کو دبا کر پڑھنا لازماً فصاحت میں داخل ہو۔ ہاں ضرورتِ شعری کی بنا پر ایسا کرنا جائز ہے اور یہ غیر فصیح بھی نہیں۔ ظاہر ہے اگر ایسا کوئی اصول ہو بھی تو وہ صرف "بادو باراں" کے لئے مخصوص نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ہر واوِ عطف پر اس کا اطلاق ہوگا۔

اب شاہ صاحب سے میرا یہ سوال ہے کہ وہ اصول جس کی بنا پر "بادو باراں" کو بروزنِ فاعلاتن پڑھنا یعنی واوِ عطف کو ضمّہ میں تبدیل کر دینا باعثِ فصاحت ہے کہاں اور کس کتاب میں لکھا ہے۔ کس نے وہ اصول بنایا اور کس نے اسے قبول کیا؟ جہاں تک میری محدود معلومات کا تعلق ہے اردو یا فارسی زبان میں ایسا کوئی اصول موجود نہیں جس کی بنا پر "بادو باراں" کا بروزنِ فاعلاتن ہونا (یا بہ الفاظ دیگر واوِ عطف کا دبنا اور ضمّہ میں تبدیل ہو جانا) فصیح تر سمجھا جائے۔ اگر جمہور اساتذہ کا عمل مستند سمجھا جاتا ہے تو میں عرض کروں گا کہ ان کے یہاں نظم میں جس طرح واوِ عطف کے دبنے کی ہزاروں مثالیں ملتی ہیں اسی طرح واوِ عطف کے اظہار کی بھی کثیر مثالیں موجود ہیں کثیر سے میری مراد دس بیس یا سو پچاس نہیں بلکہ ہزاروں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے اساتذہ کے نزدیک دونوں نہ صرف جائز بلکہ یکساں طور پر فصیح ہیں۔ اگر واوِ عطف کا اظہار مخل فصاحت ہوتا تو ظاہر ہے کہ اساتذہ اس سے پرہیز کرتے اور ہمارے پورے منظوم ادب میں اس کی مثالیں چند سے زیادہ نہ ملتیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہر مسلم الثبوت استاد کے یہاں واوِ عطف کے اظہار کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور یہ بات کسی خاص دور سے بھی مخصوص نہیں بلکہ اردو شاعری کے آغاز سے لیکر آج تک جملہ شعرا اس پر کاربند نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں یہاں اردو کے نامور شعرا کے کلام سے صرف ایک ایک شعر نقل کرتا ہوں جو اثبات دعویٰ کے لئے بالکل کافی ہے:-

میر تقی میر سے

میر کے دین و مذہب اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

سودا سے

غافل نہ رہ تو اہلِ تواضع کے حال سے
تیغ و کماں کی طرح خم و چم بہت ہے یاں

درد سے

باوجودیکہ پرو بال نہ تھے آدم کے
وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

سوز سے

مجھ کو تیرے نہیں ہے کچھ خیال خوب و زشت
ایک ہے اسکو ہوائے دوزخ و باغِ بہشت

جرأت سے

بندھ گیا تیرا تصور جس کی آنکھوں کے حضور
اس کو بس عالم وصال و ہجر کا یکساں ہوا

میر حسن سے

غیروں کی چھیڑ چھاڑ کے باتیں نہ دل جلا
جانے دے اب کچھ اور ہی گفت و شنید کر

[illegible] سے

ہے ذات حق جدا ہر ایک عراض سے بری
تشبیہ کیا ہے اس کو وجود و عدم کے ساتھ

[illegible] سے

[illegible] سرو و صنوبر کا
[illegible] سایہ [illegible] کا

شاہ نصیر ؎

برگشتہ بخت ہم وہ اس دور میں ہیں ساقی　　　لب تک کبھو ہمارے جام و سبو نہ آیا

ذوق ؎

ہمارے کعبۂ دل میں ہمیشہ روشن ہے　　　کسی کے باب کمال و ظہور کی قندیل

مومن ؎

رکھا تو دل و چشم سے اب اٹھ نہیں سکتا　　　قربان نزاکت کے ہیں، کیا پاؤں ہیں کیا ہاتھ

غالب ؎

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد　　　سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

ناسخ ؎

کم بضاعت جتنے ہیں کرتے ہیں وا جوش و خروش　　　لوٹا ہوتا ہے کسی دریا میں کب سیلاب کا

آتش ؎

بلند و پست عالم کا بیاں تحریر کرتا ہے　　　قلم ہے شاعروں کا یا کوئی رہرو ہے بیہڑ کا

انیس ؎

یکساں ہے بر و بحر ہماری نگاہ میں　　　غیظ و غضب کو دخل نہ دو حق کی راہ میں

دبیر ؎

واقف ہمارے رتبے سے سب خاص و عام ہیں　　　حور و ملک ہیں ملک میں غلماں غلام ہیں

امیر ؎

بت بن کے وقت نزع نہ بالیں پہ میری بیٹھ　　　ہوتا ہے آج خاتمہ گفت و شنید کا

داغ ؎

سرور عیش و نشاط کیسے بدل گئے رنگ ہی جہاں کے　　　سنا نہ کانوں سے تھا جو ہم نے وہ آنکھ سے انقلاب دیکھا

امید ہے کہ پروفیسر مجنوں جعفری صاحب اور شاہ ولی الرحمٰن صاحب خصوصیت کے ساتھ میری رہبری فرمائیں گے۔

حضرت شاہ سلیمان پھلواری

فرائضِ علماء

(آج سے باسٹھ تریسٹھ سال پہلے کی وہ تقریر و تجویز جو برعظیم ہند کے عظیم الشان اجلاس مجلس ندوۃ العلماء میں کی گئی تھی اور آج بھی تازہ ہے)

جناب صدر انجمن و دیگر بزرگان جلسہ! مجھے جلسۂ انتظامیہ ندوۃ العلماء نے مامور کیا ہے کہ علماء کے فرائضِ منصبی کو بیان کروں اور ضرورتِ زمانہ کو ان کے حضور میں پیش کروں اس لئے بہ تعمیلِ حکم اپنے خیالات کو ظاہر کرتا ہوں۔ آپ حضرات میری لغزشوں کو معاف کریں گے اور ان کی اصلاح کی کوشش فرمائیں گے۔ میں نے اپنی تقریر میں جابجا علماء کو الزام بیجا دیا ہے۔ خدا خوب جانتا ہے کہ وہ مخالفانہ حملہ نہیں ہے، اصلاح کی امید پر تقریر کی گئی ہے۔ اور صاف صاف یہ ہے کہ یہ فقیر آپ ہی بزرگوں کا کفش بردار اور آپ ہی کی جماعت میں شمار کیا جاتا ہے۔ پھر خطاب کروں تو کس سے کروں ؎

من بہ بیگانگاں نہ نالم فرد او ست چو آشنا شکایت از وست

مجھے جو شکایت و حکایت ہے وہ آپ ہی سے ہے، میں غیر کی طرف کیوں رُخ کروں ؎

چوں کحلِ بینش ما خاکِ آستانِ شماست کجا رویم بفرما ازیں جناب کجا

اصل مدعا سنئے "انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء" (اس میں شبہ نہیں کہ اللہ کے بندوں میں علماء ہی ڈرتے ہیں)۔ اللہ تعالیٰ نے تو خشیت کو اس جماعت علماء کے ساتھ منحصر کر دیا تھا۔ مگر سخن انصاف یہ ہے کہ ہماری جماعت میں محض شاذ و نادر کسی کو خشیت کما حقہ ہو تو ہو، یہ شے تو بالکل عنقائے مغرب ہو گئی ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ ہماری باتوں میں اثر باقی نہیں رہا۔ نمازیں کثرت سے پڑھی جاتی ہیں، مسجدیں بظاہر آباد ہیں مگر جب ہم اس نماز کو میزانِ الٰہی پر تولتے ہیں تو اس شے محض پاتے ہیں، خدائے تعالیٰ فرماتا ہے۔ ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر ولذکر اللہ اکبر، نماز کا خاصہ فحش و منکر سے باز رکھنا ٹھہرا۔ مگر ہمارے زمانہ میں تو اس کے برعکس نماز کی کثرت کے ساتھ فحش و منکرات بھی کثرت سے ہیں۔ پھر یہ نماز کیوں کر نماز ٹھہری، یہ بلا بیچارے عام نمازیوں ہی کے ساتھ نہیں ہے بلکہ ہم لوگ ائمۂ وقت کے ساتھ اور زیادہ ہے۔ کون سے منکرات سے ہم لوگ باز رہتے ہیں؟ آپس میں رسالے بازی، اور ان میں نوک جھونک کے کلمات، گالیاں، مار دھاڑ سب کچھ تو کر گذرتے ہیں۔ پھر یہ نماز کیسی نماز ٹھہری؟ اور خشیتِ الٰہی اور خشوع کا حال بھی معلوم،

تو درونِ نماز و دل بیروں گشتہا میکنی بہ بہمانی!

ایں چنیں حالتِ پریشاں را، شرم ناید، نماز میخوانی

اب روزے کا حال سنئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔ اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ پرہیزگاری اور تقویٰ کا سبب ہے۔ یہاں روزے تو بہت رکھے جاتے ہیں، فرض کیا، سنت اور نفل ـــــ بلکہ اور بڑھئے تو "نذرانہ" اور "لکتا" روزہ رکھا جاتا ہے۔ مگر تقویٰ کا نتیجہ کچھ نہیں پیدا ہوتا۔ بلکہ بھوک اور پیاس میں اور زہر اگلنے لگتے ہیں۔ پھر ہم اسے روزۂ اصلی کیوں کر کہیں۔ اب یہ نماز روزے ایسے ہو گئے جیسے بے معنی حروف، وجہ اس کی وہی ہے جو پہلے گذارش کی گئی کہ حضرات علماء کے دلوں سے خشیت غائب ہو گئی، اور جب مقتداؤں کا یہ حال ہے تو مقتدیوں کو کون پوچھتا ہے، ع

محتسب گر مے خورد معذور دارد مست را

ہمارے اگلے علماء حاشا و کلا ایسے نہ تھے، ان کی نمازیں ویسی تھیں جیسی خدائے تعالیٰ نے ان کی صفت بیان کی اور روزہ بھی ان کا ویسا ہی

تھا۔ جیسا بہ درد گار نے ان کا خود ذکر کیا۔ پھر اس کے ساتھ ان کو اپنے عدم خشیت اور غیر متقی ہونے کا ہردم خیال رہتا تھا۔ اسی درمیان میں شب رفتہ آمدہ ان کا رفیق تھا، دور جانے کی ضرورت نہیں، اہل بیت نبوی، و اصحاب مصطفوی تو کچھ اور ہی تھے۔ ان کے احوال کو عرض کرنا بھی چنداں ضرور نہیں، جو لوگ پچھلے گذرے ہیں اور اسی سرزمین ہندوستان میں گذرے، انھیں کے احوال کو دیکھئے اور فرمائیے، ان کی کیا حالت تھی۔ حضرت شیخ فخر الدین عراقی، حضرت بہاؤ الدین ملتانی (قدس سرہٗ) کے ایک اجل مریدان سے تھے۔ ان کا علم نرا ملاؤں کا سا علم نہ تھا۔ بلکہ بہت کچھ مواج البحر میں سے تھے۔ فلسفہ و الٰہیات کے بھی بڑے ماہر تھے۔ مدتوں تک عزلت اختیار کی، تلامذہ بھی ہمراہ رہتے تھے۔ درس و تدریس بھی جاری تھا۔ پھر ان سب حالتوں کے ساتھ امامت، نماز کی بھی نہ کی اور فرماتے کہ میں رند مشرب ہوں، مقتدا ہونے کی مجھ میں صلاحیت کہاں؟ جب حج کو تشریف لے گئے تو اہل قافلہ شوق سے طواف و زیارت میں مشغول ہوئے اور یہ حضرت حرم کی گلیوں میں ٹکراتے پھرتے تھے۔ اور آہ و بکا کے ساتھ اپنی یہ غزل پڑھتے تھے ؎

صنما رہ قلندر سزد ار بمن نمائی — کہ دراز و دور دیدم رہ رسم پارسائی
بقمار خانہ رفتم ہمہ پاکباز دیدم — چوں بہ صومعہ رسیدم ہمہ دیدم دغائی
بہ زمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا بر آمد — کہ مرا خراب کردی تو بہ سجدۂ ریائی
بطواف کعبہ رفتم بہ حرم رہم نہ دادند — کہ برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی
در دیر چوں زدم من ز درون ندا بر آمد — کہ بیا بیا عراقی تو ازان خاص مائی!

الغرض علماء کو جب تک خشیتِ الٰہی نہ ہوگی ہرگز وہ عالم نہ ہوں گے اور اگر عالم کہلائے بھی تو اسی طرح کے جن کی طرف خطاب خداوندی یوں ہے:۔ اَتَأمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ ــــ اور یہ باتیں جناب باری میں ہرگز پسند نہیں، ارشاد ہوتا ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔

ہندی کی نقل ہے کہ "پہلے گھر تب باہر" ــــ حضرات! پہلے ہم لوگ اپنے آپ کو درست کریں پھر قوم کی طرف متوجہ ہوں۔ یہ درستگی کیونکر ہو اور خشیتِ الٰہی کس طرح پیدا ہو، اس کو ہر عالم خوب جانتا ہے، کتاب اللہ و سنت رسول اللہ موجود ہے، اس وقت اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔

علماء کو زمانے کی ضرورتوں پر بھی نظر کرنا ضرور ہے۔ "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" اگر اس کے ثبوت میں چند جزئیات و آثار پیش کروں تو شاید ثبوت کافی نہ ہو، اس لحاظ سے میں ابتدائے اسلام سے اس وقت تک کا ایک خاکہ بنا کر دکھلاتا ہوں، اس سے آپ حضرات سمجھ سکتے ہیں کہ علوم اور علماء زمانے کے ساتھ کیوں کر بدلتے رہے، سنئے، مشکوٰۃ شریف کی پہلی حدیث ہے عن عمر بن الخطاب بینما نحن عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات یوم اذ طلع علینا رجل شدید بیاض الثیاب شدید سواد الشعر لا یرى علیہ اثر السفر ولا یعرفہ منا احدٌ... الخ ــــ ہر چند یہ حدیث سب صاحبوں کے ذہن نشین ہے مگر عامہ حضرات کے لئے ہم ترجمہ عرض کئے دیتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص نہایت سفید کپڑے پہنے ہوئے آیا۔ اور بال اس کے بہت کالے تھے، مگر ہم لوگوں میں سے کوئی اسے پہچانتا نہ تھا، اور نہ وہ مسافر ہی معلوم ہوتا تھا۔ آکر حضرت کے حضور میں بیٹھ گیا اپنے دونوں زانوؤں کو آنحضرتؐ کے دونوں زانوؤں سے ملا کر اور اپنے ہاتھوں کو آنحضرتؐ کے زانو پر رکھ کر سوال کرنے لگا کہ اے محمد، مجھے اسلام سے باخبر کیجئے، حضرت نے فرمایا کہ اسلام یہ ہے کہ تو گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمد اس کے رسول ہیں، اور نماز قائم کر، اور زکوٰۃ ادا کر، اور رمضان کے روزے رکھ، اور بیت اللہ شریف کا حج کر، اگر اس کا سامان ہو جائے۔" اس نے کہا آپ سچ کہتے ہیں، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم لوگوں کو تعجب ہوا کہ خود پوچھتا ہے اور خود ہی تصدیق کرتا ہے۔ پھر اس نے کہا مجھے ایمان سے باخبر کیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ "ایمان یہ ہے کہ تو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے ملائکہ پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر اور قیامت کے دن پر اور بھلی اور بری کی تقدیر پر، یعنی ان چیزوں کی تصدیق دل سے کیجئے" اس نے کہا آپ سچ فرماتے ہیں، پھر اس نے کہا مجھے احسان بتلائیے احسان کیا چیز ہے۔ آپ نے فرمایا: "احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طور سے کرے گویا اللہ کو دیکھ رہا ہے، اور یہ نہ ہو سکے تو یہ تصور کرے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے" پھر اس شخص نے قیامت اور اس کی علامت پوچھی اور جب آپ نے علامات بتا دیں تو وہ چلا گیا اور معلوم ہوا کہ وہ حضرت جبرئیل تھے [illegible]

اہل ایمان پر مقدم ہے، مگر امام بخاریؒ نے دوسری جگہ جو ابوہریرہ سے روایت کی ہے اس میں ایمان کا سوال مقدم ہے، اور ہمارے امام ابوحنیفہؒ سے بھی یہی روایت ہے (کما فی عقود الجواہر المنیفہ) اور میرے فہم میں اسی کو ترجیح ہے۔

یہ سوال و جواب درحقیقت علوم ثلثہ کا بیان ہے جو اس امت میں تا قیامت باقی رہیں گے، اول علم الایمان جس میں اللہ تعالیٰ کی ذات صفات و ملائکہ و رسالت تقدیر وغیرہ کی بحثیں ہیں، دوسرا اسلام جس میں صوم و صلوٰۃ و حج وغیرہ کے مباحث ہیں۔ تیسرا احسان جس میں اللہ کی معیت اور خشوع و خضوع کا مذکور ہے ——— یہ علوم نزت خود بدولت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم تک تو محض زبانی اور روحانی طور سے رہے، مگر دوسری صدی سے اس کے استحفاظ کا عام خیال پیدا ہوا اور علوم و فنون کی کتابیں مدون ہونے لگیں، علم ایمان کا نام کلام و عقائد، اور مسائل عبادات کا نام، فقہ، اور مسائل احسان کا نام تصوف مشہور ہوا۔ ماخذ اصلی ان سب علوم کا وہی قرآن و حدیث ہے۔

پھر جب زمانے نے اور ہی رنگ بدلا اور فلسفے نے اپنا علم نصب کیا اور اپنی جماعت میں سے معتزلہ و جبریہ و قدریہ پیدا ہوئے۔ ادھر مخالفین اسلام نے بھی علمی حملے شروع کئے تو اہل عقائد کو ضرورت ہوا کہ بمضمون وجادلھم بالتی ھی احسن اپنے عقائد کو دلیلوں سے مضبوط کریں اور مخالفین کے شبہات کو انھیں کے مسلمات سے دفع کریں، پس اس زمانے سے علم عقائد میں مسئلہ وجوب امکان و حدوث و قدم و علیت و غیریت صفات، و اثبات جزء الذی لایتجزّی و اثبات معجزہ بدلائل و براہین وغیر ذلک من المباحث کا اضافہ کیا گیا۔ رفتہ رفتہ تجرید و شرح تجرید و عضدیہ و شرح مقاصد و مواقف و نسفیہ وغیرہ ایک نئے انداز کی کتابیں تالیف کی گئی ہیں۔ ان کتابوں کو عقود ما قبل، کی کتابوں سے ملاؤ مثلاً فقہ اکبر، و قواعد عقیدہ سے شہابیہ تو ان کو دوسری ہی شے پاؤ گے۔ علامہ ابن خلدون کے مقدمے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ فرق مخالفین کی تردید اور عقائد کے مسائل کو بہ دلائل عقلیہ منضبط پہلے امام ابوالحسن اشعری نے کیا، ان کے بعد قاضی ابوبکر باقلانی امام الحرمین نے اس رنگ کو اور بھی پختہ کیا، پھر منطق و فلسفہ کی جب زیادہ اشاعت ہوئی تو امام غزالی نے اس کی تردید شروع کی اور تہافت الفلاسفہ وغیرہ لکھیں، پھر امام ابن الخطیب اور اکابر علماء نے عقائد میں اسی منہج کو اختیار کیا مگر اصل وہی ارشاد امام باقلانی ہے (واللہ اعلم بالصواب)

علیٰ ہذا القیاس جب فقہاء نے دیکھا کہ بعض لوگوں کی خراب ہر چلی ہے اور احادیث نبوی ضعیف و موضوع و منکر و معضل و شاذ ہر قسم کی شائع و ذائع ہیں تو ان لوگوں نے اپنے خیال کو تھوڑی وسعت دیکر احادیث کے لئے کچھ قواعد مقرر کرکے حسن و صحیح کو پرکھ کر، ان سے مسائل عبادت و معاملات مستخرج کئے تاکہ زمانے کے لوگوں کو عمل درآمد میں دقت نہ ہو۔ امام شافعی، امام زفر، امام ابو محمد و ابو یوسف نے امالی و جامع صغیر و آثار و حج وغیرہ وغیرہ تالیف کیں، پھر زمانے کی ضرورتیں جوں جوں بڑھتی گئیں فقہی تالیف کا انداز بھی اسی طرح بدلتا رہا، یہاں تک کہ اقناع، و قدوری، و ہدایہ اور رفتہ رفتہ درالمختار و فتح المبین اور فتاوٰی ہندیہ وغیر ذلک مدون ہوگئیں ان کتابوں کے انداز کو جامع صغیر ہی سے ملاؤ آسمان و زمین کا فرق پاؤ گے۔

علیٰ ہذا القیاس حضرات اہل احسان یعنی صوفیہ کرام نے بھی قرن اول کے کچھ تھوڑے ہی دنوں بعد دیکھا کہ اب قلوب میں رقت بہت کم ہوگئی اور طرح طرح کے آزادانہ خیالات پیدا ہونے لگے، جناب باری کی معیت اور حضور کا دھیان اب بہت کم ہوگیا اور خشوع و خضوع، و ذوق و شوق و مواجید و توحید یہ مفقود ہونے لگے، تو ان لوگوں نے محض محبت و ارادت سے کشود کار عمال سمجھ کر بہ ضرورت زمانہ ایک نیا انداز پیدا کیا، یعنی پہلے تو قرآن و حدیث سے کتاب الزہد والرقاق کو جمع کیا مثلاً کتاب الزہد عبداللہ بن مبارک و احمد بن حنبل وغیرہا، پھر اس اجمال کی تفصیل میں کتابیں لکھیں، اور مقامات صبر و رضا و زہد و شکر و توبہ و خوف و رجاء و فقر و توکل و محبت و ذوق و شوق و معارف توحید و تجلیات کو بشرح و بسط لکھا۔ رسالہ قشیریہ و قوت القلوب و احیاء العلوم و فتوح الغیب و آداب المریدین و عوارف وغیر ذلک ضخیم و طویل مؤلفات تیار ہوگئے، پھر بہ ضرورت زمانہ کچھ اور بھی مضامین داخل خارج ہوتے رہے۔ مکتوبات و ملفوظات کا ایک نیا سلسلہ قائم ہوگیا اب دیکھتے جاؤ موازنہ ان مکتوبات و ملفوظات کو فتوح الغیب اور احیاء سے ملاؤ، پھر انصاف کرو کہ کیا نسبت ہے؟ حضرات! ہم سا اناڑی بھی تو یوں ہی کہے گا کہ

چہ نسبت خاک را با عالم پاک ~~ این زمین را آسمانے دیگر است

مگر ہم پھر یہی کہیں گے کہ بالفرق تو بہت ہے مگر زمانے کی ضرورت اسی کی مقتضی تھی، ایسا ہی ہونا چاہیے۔

اور ان تینوں حضرات ——— متکلم و فقیہ و صوفی ——— کو علوم الٰہیہ کی ضرورتیں بھی وقتاً فوقتاً مختلف نہجوں سے ترقی رہیں۔ اہل کلام نے منطق و ریاضی و فلسفہ و حکمتِ مروجۂ زمانہ سے ذوق پیدا کیا۔ فقہا نے محاورات قرآنی و حدیثی کو سمجھنے کے لئے صرف و نحو و بلاغت و معانی (و ما معنا) کو اختیار کیا، پھر اس سے اضافات و دلالات و امر و نہی وغیر ذلک مباحث کا انتخاب کر کے اس کا اصولِ فقہ نام رکھا۔ اور صوفیہ نے بھی عملی طور سے جلسات و خلوات و حبسِ نفس و لحاظ نفوسِ داخلی و خارجی وغیرہ وغیرہ کی مشاقی کی، اور یہی ان کے علوم الٰہیہ ٹھہرے، اور یہ علوم الٰہیہ بھی جو بطور خدام کے ہیں اپنے مخدوموں کی اتباع میں بضرورت زمانہ مختلف رنگوں میں رنگے جاتے ہیں، ان عزیزوں کو بھی ایک طور سے قرار نہ رہا۔ مدارس، جہاں علوم و فنون پڑھائے جاتے تھے، وہ بھی ایک سلسلے کے، مدت تک پابند نہ رہے، سو پچاس برس کے بعد ضرور ایک نئی اپج پیدا ہو جاتی تھی۔ اگلے سلسلۂ عملی کو تاریخوں میں پڑھو پھر آخری سلسلۂ درس نظامی کو دیکھو تو معلوم ہوگا اور اسپر طرفہ یہ ہے کہ اگرچہ اس کی درس نظامی نام رکھتے ہیں مگر بیسیوں کتابیں ایسی اضافہ ہوئی ہیں جن کی اس سلسلے کے موجد حضرت مولانا نظام الدین قدس سرہٗ کو بھی خبر نہ تھی، مثلاً حمد اللہ، قاضی، غلام یحییٰ، ملا حسن، ہدیہ سعیدیہ وغیر ذلک، اس پر طرفہ تماشہ یہ ہے کہ بعض علماء اس کو بھی ایک نظام مذہبی تصور کرتے ہیں، اور نہ معلوم اس درسِ نظامی کا کیا مطلب سمجھتے ہیں، ہمارے ایک دوست مولوی نے ہماری انجمن کے خط کے جواب میں لکھا کہ ہاں میرے مدرسے کا نصاب وہی ہے جو دو سو برس سے ہندوستان کے علماء کا مقبول ہے جسکو لوگ درس نظامیہ کہتے ہیں، مجھے اس تحریر سے سخت ہنسی آئی کہ اس غریب ملا کو یہ بھی معلوم نہیں کہ حضرت مولانا نظام الدین کو کتنا زمانہ گذرا، اور اس درس کے سلسلہ میں وہ کتابیں ہیں جن کو تالیف ہوئے ابھی ڈیڑھ سو برس بھی نہیں گذرے۔ امیر غلام علی سبحۃ المرجان میں فرماتے ہیں کہ ملا نظام الدین علیہ الرحمۃ نے سالاالہ ھ میں انتقال فرمایا (مقصد یہ ہے کہ ملا صاحب کو تو انتقال کئے ڈیڑھ سو برس سے زائد ہوئے اور سلسلۂ درس میں بعض ایسی کتابیں ہیں کہ انھیں تصنیف کئے ہوئے بھی ڈیڑھ سو برس نہیں ہوئے پھر وہ کتابیں درس نظامی میں کیسے ہو سکتی ہیں۔؟) بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

اب میں عرض کیا چاہتا ہوں کہ یہ تقریر جس میں اگلے زمانے کے علمی مدوجزر کی میں نے خبر دی ہے، آپ بزرگوں کے نزدیک صحیح ہے یا نہیں؟ میرا جہاں تک خیال ہے ایسے تاریخی واقعات کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا پھر فرمایئے، ہم کو اس زمانے کی ضرورتوں کا بھی خیال کرنا ضرور ہے یا نہیں؟ ——— شاید ضرورتیں آپ بزرگوں کے فہم میں پوری طرح نہیں آئیں ورنہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ سب سے پہلے اور نوخیزوں سے کہیں آگے، آپ بزرگان ہوتے اور علوم الٰہیہ وغیرہ سب ایک نئے ڈھنگ کے ہو جاتے، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ نفس غبارے ہم نے لوگوں میں بہت ہیں۔ مگر اصلی مذہبی جوش اور سچی بہی خواہی آپ ہی بزرگوں کو ہے۔ آپ ہی لوگوں کی صلاح اور تقویٰ و خلوص نہایت و برکت کی ظلِ گستری نے ہم لوگوں کو ہلاک زمانہ و الحاد سے بچایا ہے، ورنہ نیچریت کا سبز باغ دیکھ کر ہم کب کے ادھر سے ادھر ہو گئے ہوتے۔ اللھم احفظنا ولا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا۔

اب زمانے کی علمی ضرورتوں پر تھوڑا غور فرمایئے، ایک زمانہ وہ تھا کہ یونانی فلسفہ دنیا میں تسلیم کر لیا گیا۔ ہر سوسائٹی کا وہی دستور العمل اور تمام مباحث علمیہ کا اسی پر مدار، ہمارے اسلام کے مقدس بزرگوں نے بھی اسی کو عربی میں ترجمہ کیا۔ پھر اس کے اصول و فروع پر جب جرحیں کیں، اعتراضات کی بوچھاڑ سے اس کے معتقدین کو گھبرا دیا۔ مخالفین جو قدمِ عالم کے قائل تھے ہمارے حشر و نشر کے عقیدے پر معترض ہوئے، ہمارے بزرگوں نے انھیں کے اصول سے حدوثِ عالم " و جزء الذی لا یتجزیٰ " وغیرہ ثابت کیا، ابن مکونہ وغیرہ کا توحیدی کلمے پر جو اعتراض تھا اس کا جواب دیا۔ معراج پر اس زمانے کے فلسفے کے بموجب خرق و التیام کا اعتراض تھا ہمارے علماء اس کے جواب سے بھی نہ چوکے، اور انھیں کی اصطلاحات و اصول پر معقول کرتے آئے۔ امام رازی کی تفسیر اور شرح اشارات اور امام غزالی کی تہافت الفلاسفہ ایسے مسائل سے مملو ہیں۔ اور آپ لوگ ان سے خوب واقف ہیں۔

حضرات! اسی طرح اس زمانہ میں فلسفے نے ایک دوسری کروٹ بدلی ہے جو اگلے زمانے کے فلسفے سے بہت کچھ فرق رکھتا ہے۔ اور جیسے زمانۂ پیشین میں مشائین کا فلسفہ مشہور آفاق تھا اب یورپین فلسفہ اور علم تمام دنیا میں دائر و سائر ہے۔ اور طرح طرح کے علوم و فنون نئے پیدا ہوئے مثلاً اصول کر اینرجی، علم جیالوجی وغیرہ وغیرہ ——— اب علوم نے یہ ظاہر کیا ہے کہ آسمان کا وجود ہی نہیں، زمین بھی ایک سیارہ ہے۔ سورج کے گرد دورہ کیا کرتی ہے، وغیر ذلک، ایسے اصولوں پر اسلامی عقائد و مسائل پر حملے شروع ہوئے۔ علم جغرافیہ نے ثابت کر دیا ہے کہ زمین گول ہے [illegible] نہیں [illegible] قاعدے کے مطابق [illegible]

ان کی جہات کس معترض کے جواب سے عاجز نہیں، ضرور اس کا جواب دیتی ہے اور ہمارے متقدمین اصول موضوعہ کی طرح اس کو تسلیم بھی کر لیتے ہیں اگر مخالفین ان پر قہقہہ لگاتے ہیں۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ صدرا شمس بازغہ کی اصطلاح کو نہیں سمجھتے اور نہ ہم بیکن اور مسٹر آئزک نیوٹن کی اصطلاحات سے واقف۔ مطالعہ آسمان باشد جواب از ریسمان گو ید یہ کا مضمون ہو جاتا ہے اور اس پر طرفہ یہ ہے کہ قاموس وصحاح جوہری بھی معترضوں کو حفظ نہیں۔

بہت لوگوں نے آپ حضرات کی شرح چغمینی و تشریح وغیرہ پڑھی ہیں۔ ان میں علم جغرافیہ کے مباحث بھی پڑھے ہیں۔ اس زمانہ کے خیال کے مطابق ربع مسکون سات اقلیموں پر منقسم تھا۔ اور جس میں کوہ الوند جو ایران کا ایک پہاڑ ہے دنیا بھر میں سب سے بڑا پہاڑ قرار دیا گیا تھا، اب اس زمانہ میں جغرافیہ نے ان سب خیالوں کا ناس کر دیا۔ اب کرہ کی دوسری طرف بھی آباد اور مردم خیز ملک جس کو امریکہ کہتے ہیں۔ اور اس سلت کی چار تقسیمیں ہو گئیں، یورپ، ایشیا، افریقہ، اوشینیا — کوہ الوند کا ذکر کسی اسکول کے لونڈے سے بھی ہم کریں تو وہ پاگل خانہ جانے کے قابل سمجھے۔ اب تو ہمالہ سب سے بڑا پہاڑ سمجھا جاتا ہے۔ الغرض دنیا کا ایک نیا انداز ہو گیا ہے، بجز آگ کے زوال غیر قوموں کے سامنے مجھے تفاسیر و قصص کی مقدس حکایات و امثال بیان کرتے بھی شرم آتی ہے۔ ہماری اکثر کتابوں میں اس زمانے کے خیالات کی بموجب صدہا قصص و حکایات بھری ہوئی ہیں جن پر آج مخالفین اسلام، برہمو سماج، آریہ، عیسائی، نیچری قہقہہ لگاتے ہیں۔ مگر ہم لوگوں نے دوسری گلستاں پڑھی نہیں، خواہ مخواہ انھیں بیانات پر مجبور ہو جاتے ہیں، ایک صاحب نے اپنے پر اثر وعظ میں ایک حکایت کا ذکر کیا کہ کسی بزرگ کا جہاز گھوڑ مونہوں کے جزیرے میں جا پڑا، ان لوگوں کا دھڑ تو آدمی کا سا ہے مگر منہ گھوڑے کا سا ——— اس جملے پر اس جلسہ کے حاضرین جو نئے علوم کے تعلیم یافتہ تھے حضرت کے منہ کو دیکھنے لگے۔ اور نہایت متحیر تھے۔ درحقیقت وہ بزرگ اپنے اس اظہار حال پر مجبور تھے۔ ہماری صدہا کتابوں میں ایسے قصص لکھے ہوئے ہیں جن کو اس زمانے کے تجربے نے غلط ثابت کر دیا ہے۔

حضرات! یہ فسانہ تو تمام ہی نہیں ہوتا، مگر انصاف کا مقام ہے کہ ایسی نازک حالت بلکہ نزع کی حالت میں کوئی اصلاح چاہئے یا نہیں؟ اور زمانے کی ضرورت کے لحاظ سے کچھ بدلنا چاہئے کہ نہیں؟ ——— ضرور اصلاح درکار ہے ورنہ الحاد و زندقہ دیکھئے وہ سامنے آ گیا، اور ہمارے ضعفاء کو کشاں کشاں لئے جاتا ہے، — فصبرٌ جمیل، ——— اور بہر خدا جلد خبر لیجئے عیسائی، آریہ، برہمو، و نیچریہ کے اعتراضات کے حملوں نے بہت سے مسلمانوں کو پائمال کر دیا، یا عباد اللہ اعینونی، استغیث العاجز المضطر شمروا ذیلکم الی المدد، اے مقدسین علماء! یہ بھی خیال شریف میں رکھئے کہ ان نئے علوم و اصطلاحات مغربیہ کی فقط متکلمین و واعظین ہی کو ضرورت نہیں بلکہ ان کے بغیر ہماری فقہ وغیرہ بھی بالکل ناقص ہو رہی ہے، صدہا چیزیں ضرورت زمانہ کی وجہ سے ایسی نئی پیدا ہو گئی ہیں جن کے مسائل فقہیہ، حلت و حرمت و جواز و ناجواز کے فتاوے میں داخل کرنا چاہئیں اور بیکار باتیں جن کی اب ضرورت نہیں ان کو خارج کرنا چاہئے مثلاً منی آرڈر، نوٹ کرنسی، پرامیسری، الکہال، اسپرٹ، وارنش وغیرہ وغیرہ کی حلت و حرمت میں ابواب فقہیہ قائم کرنا چاہئیں، عوام و خواص کو ان مسائل میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ بلغار میں نماز عشاء و صبح پڑھنے کی بحث فقہ کی کتابوں میں لکھی جاتی تھی اب اس کی جگہ آئس لینڈ جہاں چھ مہینہ تک آفتاب دکھائی نہیں دیتا۔ وہاں کے صوم و صلوٰۃ کے مسائل قلمبند کرنا چاہئیں۔ موجودہ جہازوں کے مسافروں کو جہاز پر نماز کی جو دقتیں پیش آتی ہیں اور طہارت وغیرہ بالکل ٹھیک نہیں رہتی اس کے مسائل کی تنقیح ضروری ہے۔ فقہ کی کتابوں میں جہاں باب السفاتج والصکوک ہے باب المنی آرڈر والنوٹ قائم کرنا چاہئے پھر اس کے مسائل فلان کان کذا، نسیاً محکم کذا، اما البرامیسری والذی حصلوہ من بنک البنگال عوض الی بابی والگی محکمۃ کذا ——— اس طور سے لکھنا چاہئے۔ علی ہذا القیاس ہدایہ وغیرہ میں جو کتاب الاشربہ میں شراب مثلث وغیرہ کا ذکر ہے اب کوئی بھی اس کا استعمال نہیں کرتا۔ فقط مفہوم ہی مفہوم ہے اور علی ہذا القیاس اناج کی شراب کو جو لکھا ہے ما یوخذ من الحنطۃ والشعیر والذرۃ الخ اب اس زمانے کے بجائے ایسی شراب جس پیتے بلکہ عوام تو مہوے کی پیتے ہیں اور امرا نئی قسموں کی شرابیں پیتے ہیں (ہمارے زمانے میں علماء شاید یہ کہیں کہ ایسی ناپاک شے کے انواع و کیفیات کے درپے ہونا علم مقدس کے خلاف ہے، تو نعوذ باللہ ہمارے حضرت امام ابو حنیفہ و امام ابو یوسف رحمہم اللہ کے اوپر بھی یہ شبہ ہو سکتا ہے حالانکہ ان بزرگوں کی تفتیش نے بہت فائدہ دیا) اب جو فقہ کی کتاب لکھی جائے اس میں کتاب الاشربہ یوں لکھا جائے۔ وما یتخذ من العنب علی اقسام منہا ما یکون [illegible] [illegible]

ابیض محکم کذا، وکذلک شمپین واسپرٹ وائین والرم والبیر وما یماثلہ۔ وعلی ہذا القیاس سفر وایاحت میں تیمم وآب سخن وغیرہ کی جگہ پر سوڈا واٹر، لیمنڈ، جنجر وائن کے مسائل لکھنا چاہئیں۔ بے ضرورت مسائل کے مطارحات اور ضروری مسائل کی فروگذاشت انصاف و دیانت کے محض خلاف ہے۔ اسپرٹ کی حلت و حرمت کا فیصلہ درحقیقت آج تک طے نہیں ہوا۔

حضرات! مجھے ہومیوپیتھک دوا کا بڑا شوق تھا، اور عرصہ یاد رہے اس کے تجربے میں میں نے صرف کیا، مگر اس کی ساری دوائیں بغیر اسپرٹ اور الکحل کے قابل استعمال نہیں ہو سکتیں، اسٹرانگ مدرٹنکچر اکلاً مستعمل نہیں، مجھے اسپرٹ کی حلت میں شک واقع ہوا، میں نے اپنے استاد مولانا عبدالحئی علیہ رحمت کے حضور میں استفتا کیا، جواب تو آیا مگر اس سے تشفی بالکل نہیں ہوئی، تب میں نے اپنے شیخ الحدیث جناب مخدومی مولوی سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا، وہاں سے بھی وہی غیر کافی جواب آیا، آخر میں نے خود تحقیقات شروع کی، پہلے اسپرٹ کی ماہیت دریافت کرنے کے لئے فارسی میٹریا میڈیکا وغیرہ کو بغور دیکھا، پھر اس کے مرکبات یعنی کمپونڈ کے حسی تجربات کو دیکھا، میری سمجھ میں حرمت کسی طرح نہیں آئی۔ پھر بھی مجھے مجرد اپنی رائے پر وثوق نہ ہوا اور احتیاط نے ایسا مجبور کیا کہ میرا ہومیوپیتھک میڈیسن . . . . بالکل مجھ سے علیحدہ ہو گیا، اور آج سات برس ہونے کہ مجھے ان دواؤں کے علاج معالجے سے بالکل بے سروکاری ہے میرا ذاتی نقصان تو اس میں چنداں نہ ہوا، اور کوئی دل لگی کا مشغلہ نکل آیا، مگر میرے وطن کے غربا بلکہ متوسط درجے کے لوگوں کو بہت نقصان عظیم اٹھانا پڑا۔ وہ لوگ مدتوں سے اس مفت دوا کے عادی تھے۔ اب فرمائیے یہ نقصان کس کے تغافل سے ہے۔؟ ہمارے ہی تغافل سے، ہم لوگوں نے جب اسپرٹ اور الکحل کا نام سنا تو متحیر ہو گئے کہ یہ کیا بلا ہے، معہذا کسی مستفتی نے اس کے معنی بھی روح شراب و جوہر شراب بتلا دیئے تو سمجھ یہ بزرگان، درمختار و عالمگیری سے باہر تحقیقات کے لئے ذرا آگے بھی تو تحفۃ المومنین و مخزن الادویہ کے میدانوں میں جا پہنچے اور آخر ان چیزوں کا سراغ نہ لگا، مجبوراً فتویٰ واپس۔

حضرات! اب ایسے تغافل کا وقت نہیں ہے ؎ جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا

ٹیلی گراف اور ٹیلیفون کے شرعی اعتبار کا مسئلہ ہنوز محقق نہیں ہوا، ہمارے جناب مکرم و استاذ معظم حضرت مولانا عبدالحئی کے مجموعہ فتاویٰ میں دو تحریریں اس مسئلہ کے متعلق میری نظر سے گزری ہیں، پہلی تحریر سے تو تار کی خبریں بالکل بے اعتبار ثابت ہوتی ہیں۔ مگر دوسری تحریر سے فی الجملہ اس کا اعتبار بھی معلوم ہوتا ہے علمائے دہلی و سہارنپور کا قول فیصل اس بارے میں سنا نہ گیا، ہاں بھوپال کے ایک محقق عالم نے بڑی پسند و نظر یہ اس مسئلہ میں کی ہے، ضرورت زمانہ سے ناواقف ہونے کی ایک وجہ اور بھی ہے کہ ہم لوگ کبھی اخبار وغیرہ نہیں پڑھتے۔ اور دنیا کے ملکی معاملات سے بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ ملکی معاملات سے میری پالیٹیکس کا مود نہیں ہیں۔ ان باتوں سے ہمیں کیا سروکار، رموز مملکت خویش خسروان دانند، غرض میری عام روش اور تعدد وعلل و تبدیل ہیئت ہے، نتیجہ اس بے خبری کا یہ ہے کہ دنیا میں ممالک کو خوشیاں ہوں ہم ان کے شریک نہیں، ان پر مصیبت ہو، ہم ان کے لئے دست بدعا بھی نہ ہوں، اسلام کہاں کہاں ترقی کر رہا ہے اور کس کس جگہ بے کسی اور غربت میں ہے اس سے ہمیں کچھ کام ہی نہیں رہا، خطبوں میں نہایت پرجوش الفاظ میں حضرت سلطان ابن السلطان والخاقان ابن الخاقان خلد اللہ ملکہ پڑھنے کو موجود مگر نہ اس سلطان غریب کی حالت موجودہ سے واقفیت اور نہ اس کے ملک کے آرام و راحت سے آگاہی، اور اگر کچھ خبر پہنچی بھی تو فلاں حاجی صاحب کے ذریعہ سے، اور انھوں نے بیت المقدس کے ایک شخص سے سنا ؎

چہ خوش گفتہ است سعدی در زلیخا   الا یا ایہا الساقی ادر کأسا و ناولہا

دنیا کا روزنامچہ رائٹر کے ٹیلی گراف پر ہے، لیکن ہم ابھی غافل ہی بیٹھے ہیں، اخبارات کے دیکھنے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی رہتی ہے کہ دنیا میں کس کس قوم کا دل اسلامی مادے کی قبولیت رکھتا ہے اور کون سی قوم اسلام سے زیادہ تر نفور ہے، ان خبروں سے حامیان دین و عمادار قدم آگے ہو کر اپنے خبر ہر زبان کی جھلک بخوبی دکھلا سکتے ہیں، اور تھوڑی محنت میں اغیار کو یار بنا سکتے ہیں، مگر افسوس صد افسوس کہ آج تک یہ کام ہم سے کبھی انجام نہ پایا ؎

ہر غنچہ لشگفت الاعلی من !!   اے وا ویلا من اعا ولی من

اس وقت تک علما و مصر ... مگر ان میں اقل قلیل چا ... کے واقعہ سے واقف ہوئے ہونگے حالانکہ یہ وہ واقعہ ہے کہ جس میں اسلام ... اس کی

مبارکباد ہمارے آپس میں ہونی چاہئے تھی تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ تعلیم یافتہ ملکوں میں ایکزبیشن (نمائش گاہ) قائم ہوا کرتی ہے، ہر جگہ ایک نئی اپج ہوتی ہے کلکتہ میں کچھ اور ہی طور تھا۔ فرانس میں کچھ اور ہی رنگ تھا، اس سال مشرقی تعلیم یافتوں نے اپنے ملک سے شکاگو نامی شہر میں مذہبی نمائش کی تھی، اس کے اشتہارات چھ مہینے قبل سے اخباروں میں شائع تھے، اس نمائش میں ہر مذہب والا اپنے مذہب کی خوبیاں دکھلاتا تھا، اور ان کو بہ دلائل و براہین ثابت کرتا تھا، آریہ و برہمو سماج سب کے وکیل وہاں جا دھمکے، مگر اس غریب اسلام کی طرف سے عرب و عجم و روم و شام و ہند وغیرہ سے کسی نے اور صرف قدم بھی نہ بڑھایا۔ مگر خدا اپنے دین کا آپ محافظ ہے ثمر دسانہ غیب برون آید و کارے بکنند۔ ایک شخص اسلام کا وکیل بھی بن کر جا کھڑا ہوا اور اسلامی سچے اصول اور اس پاک دین کی بھلائیاں ایسی دکھلائیں کہ اس وقت تمام بے تعصب عقلاء نے ان کو تسلیم کر لیا۔ تری اعینھم تفیض من الدمع مما عرفوا کا نمونہ بن گیا۔

اور سنئے یورپ میں ایک حکیمانہ خیال کا فرقہ پیدا ہوا ہے اس کے نزدیک جو چیز مشاعر حسیہ سے باہر ہے قابل تسلیم نہیں، گویا لا ادریہ فرقے والوں کی یہ دوسری مستم ہے، اگر اس فرقہ کی علمی قوت کو تو ملاحظہ فرمائیے یورپ کے بڑے بڑے فلاسفروں کو پیچھے ہٹا دیا ہے، اب اس کا مرد میدان وہاں کوئی دکھائی نہیں پڑتا۔ ہمارے ایک عزیز مولوی عبدالحکیم بی اے۔ رئیس نگینہ اپنے لکچر میں فرماتے ہیں کہ "اب اس فرقہ کی اسلام سے مڈبھیڑ باقی ہے، شام صبح میں وہ بھی ہوا چاہتی ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ اس وقت اسلام کو بڑے غزالی کی ضرورت ہے" ـــــ امام غزالی اور امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے نام ایسے موقع پر اس لئے لئے جاتے ہیں کہ یہ بزرگان زمانے کی ضرورتوں سے واقف تھے۔ اور پھر مخالف کو اسی کے خیالات واہیہ سے معقول کرتے تھے" ـــــ بیشک میرے لائق عزیز کا فرمانا بہت ہی درست ہے اور میں بھی حسرت سے کہہ رہا ہوں کہ اسلام بہت ہی پر درد آواز سے فریاد کر رہا ہے۔ ھل من مغیث یغیثنا ھل من ذاب یذب عنا؟

شاید آپ لوگوں کو یہ خیال ہو کہ اگلے زمانہ میں اخبارات کہاں تھے، اور علماء ایسی خبروں کے کب جویا رہتے تھے۔ تو حضرت سنئے اگلے زمانہ میں علماء کو ایسی خبروں کی جویائی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ زمانہ اسلامی سلطنت کا تھا، سلطنت کے ذریعہ بلا تجسس گھر بیٹھے بٹھائے ایسے نادر وقائع روز انھیں پہنچا کرتے تھے اور سلطنت ایسی باتوں کی کفیل تھی۔ اب وہ اسلامی سلطنت کہاں، اب تو سارا بار ہماری ہی گردن پر ہے۔ اور سب کچھ ہمیں کو بننا ہوتا ہے ؎

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ   خود بر سر آں کوزہ خریدار برآمد

مگر اس زمانہ کے علماء کرام کو عموماً ہر ملک کے مسلمانوں کے ساتھ کافی ہمدردی تھی، ان کی شادی و غمی میں اپنے کو شریک کرتے تھے چنگیز خاں اور ہلاکو نے جب تخم اندم سمرقند و بخارا کو برباد کیا اور وہاں مسلمانوں پر جو مصیبت گذری اس کا صدمہ دور دراز دہلی کے در و دیوار سے ظاہر ہوتا تھا۔ ہندوستان کے علماء وقت نے وہ حسرت ظاہر کی کہ گویا انھیں کے سر پر مصیبت آئی اور سچی بات بھی یہی تھی حضرت بابا فرید گنج شکر و سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ کی مقدس خانقاہیں ایسی خبروں سے ماتم سرا بن جاتی تھیں۔ ان بزرگوں کے ملفوظات دیکھئے تو معلوم ہو جائے گا کہ کس قدر مظلومان جمد تاری پر ان حضرات کے ہاں ہمدردی ظاہر کی جاتی تھی حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ عزلت نشین و گوشہ نشین ہو چکے تھے۔ مگر جب بغداد کی بربادی کی خبر آئی چپکا نہ رہا گیا۔ ان کی فریاد و فغاں نے تمام شیراز کو ماتم سرا بنا دیا۔ ایک مرثیہ تو عربی زبان میں لکھا اور دوسرا فارسی زبان میں۔ اس کے پر درد و حسرتناک مضامین کو کیا عرض کروں دیکھنے ہی سے تعلق ہے دو شعر فارسی کے مجھے یاد رہ گئے ہیں ؎

آسمان را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں   بر زوال ملک مستعصم امیر المومنیں!

اے محمد گر قیامت سر برون آری ز خاک   سر برآور وایں قیامت در میان خلق بیں

ابن اثیر جزری صاحب اسد الغابہ تاریخ کامل بھی اس وقت دمشق میں موجود تھے، مگر دسوا [illegible] مصیبت زدوں کی خبر [illegible]

[illegible] آخر جلد میں بہ واقعہ [illegible] سمرقند کی خبر سننے کے واسطے [illegible]

[illegible] اگلے زمانہ کے علماء [illegible] ہم اپنے زمانہ کے علماء کے حال کا [illegible]

(جو گل چندا ای کا ساتواں حصہ) کی نسبت بھی نہیں۔

اس تیرھویں بھلی صدی میں کیا کیا کچھ یہاں مسلمانوں پر نہ گذرا، ان کی عبادت گاہیں خراب کی گئیں، کتب خانے لوٹے گئے اور کیا کیا مصیبتیں پیش نہ آئیں مگر ہم نہیں جانتے کہ ہمارے علماء کی جماعت میں سے کسی بزرگ نے تاریخی واقعات کے طور پر بھی کچھ اس کو کہیں قلمبند کیا ہو۔ مرثیہ لکھنا تو بڑی بات ہے۔ اب زیادہ تفصیل اس کی ہم نہیں چاہتے۔ اصل مطلب یہ ہے کہ علماء کو وقائع و اخبارات سے تعلق ضروری ہے۔ ورنہ کبھی ہمدردی کا مادہ پیدا نہ ہوگا۔

پنجاب فرخ سیر کے زمانہ سے ابتدائے عہد انگریزی تک مسلمانوں کا قتل گاہ عام تھا، سکھوں نے ہماری مسجدیں لوٹیں، کتابیں جلائیں، مدتوں مساجد میں اصطبل دیوار کیا اور گھوڑوں کا اصطبل بنایا، مقابر اور خانقاہیں توڑی گئیں، سامانہ، ستام، ساڈھورہ کے سادات کے گھر جلائے گئے، سرہند شریف کے پیرزادے کس بے کسی سے جلاوطن کئے گئے۔

لقد اقام علی الفنجاب ناعیہا ؎ فلیبکہا الخراب لدہر باکیہا

مگر ہندوستان کے مشرقی حصے میں اس کا کیا اثر تھا اور ہمارے علماء نے جو ہمدردی آپ کی کی وہ ظاہر ہے کسی عالم نے اس مصیبت کی داستان کو کہیں قلمبند بھی تو نہیں کیا اور نہ یاد کیا کرتے۔ عجائب المقدور ہم دلچسپی کے ساتھ پڑھیں اور پڑھائیں اور گھر کے وقائع کی خبر نہ ہو۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

ضرورت زمانہ سے ناواقف ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری جماعت سے سیر و سیاحت بالکل مفقود ہے اور جیسا ذہن کو جمود ہے ویسا ہی جسم بھی ایک طود عظیم ہو گیا ہے۔ درسی کتابیں پڑھ کر ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ اور درس جاری ہو گیا۔ نہ کسی شہر و بلاد میں جانے کی ضرورت اور نہ کسی اہل کمال سے ملنے کی حاجت اور اگر بہت بڑی مصیبت اٹھائی اور کسی ضرورت سے دو چار شہروں میں جانے کا اتفاق بھی ہوا تو وہاں محض اپنے دو چار ہم خیال سے مل ملاتے۔ نہ علمی ذوق نہ اہل علم سے ملنے کا شوق، حضرات! ہمارے اگلوں کا یہ طور نہ تھا، ان بزرگوں کو طلب علم میں صحرا نوردی و کوچہ گردی مایۂ فخر تھی۔ جب مختلف ملکوں کی سیر کرتے تھے اور مختلف علوم کے جاننے والوں سے ملتے تھے اس وقت اپنے کو قابلیت کا مستحق سمجھتے تھے علامہ ابن خلدون نے مقدمہ میں ایک فصل قائم کی ہے، فصل فی ان الرحلۃ فی طلب العلوم ولقاء المشیخۃ مزید کمال فی التعلم۔ اگلے بزرگوں کی سیر و سیاحت پر جب ہم نظر کرتے ہیں تو حیرت کرتے ہیں کہ اس وقت نہ ریل تھی نہ سواری کا کافی بندوبست پھر بھی ان کا قدم شوق باہر ہی نکلا رہتا تھا۔ امام محمد بن اسماعیل بخاری جن کو امام الدنیا فی الحدیث کہنا بہت زیبا ہے۔ وہ حدیث کی طلب میں قریب قریب تمام اسلامی دنیا میں پھر آئے۔ بخارا کے تو وہ رہنے والے ہی تھے۔ وسط ایشیا تو ان کا وطن ہی تھا، ہرات، نیشاپور، سمرقند کے علاوہ مدتوں ملک شام و دمشق مقدس میں رہے، حجاز، مکہ معظمہ، مدینہ طیبہ، بار بار آیا جایا کئے، ملک مصر اور عراق کے بلاد مشہورہ بغداد، کوفہ، واسط، بصرہ وغیرہ تشریف لے گئے۔ وہاں کے اہل علم سے ملاقات کی، علمی اندازہ پر غور کیا۔ ہمارے حضرت شیخ الحدیث مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری اپنے مختصر رسالے میں لکھتے ہیں کہ امام بخاری نے طلب حدیث میں اپنے شہر بخارا سے نکل کر کہاں کہاں کی سیر کی۔ کابل، یزد، ہرات، بلخ، نیشاپور، شیراز، سمرقند، واسط، بصرہ، بغداد، کوفہ، مکہ معظمہ، مدینہ طیبہ، طائف، دمشق، بیت المقدس، مصر، اسکندریہ، افریقہ، ان سب شہروں کی زمین ان کے قدموں سے لگی ہوئی تھی اور بجز اندلس کے تمام اسلامی دنیا کے امام اور محدث، بخاری کے شیوخ و اساتذہ میں ہیں، اس محنت و مشقت کا ثمرہ یہ پایا کہ آج امام الدنیا فی الحدیث کہلائے، اور ایک جماعت عظیم ان کی جامع صحیح کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیتی ہے (واللہ اعلم بالصواب)

حضرت امام غزالی کو دیکھئے یہ بزرگ نواح خراساں کے رہنے والے تھے گھر سے باہر نکلے، وسط ایشیا میں خوب پھرے، ایران کے بلاد کی ہوا کھائی، پھر مدتوں امام الحرمین کی خدمت میں تکمیل پاتے رہے، فراغ کے بعد بھی گھر آنا نصیب نہ ہوا جس وقت تحصیل سے فارغ ہو کر دار الخلافہ بغداد جا پہنچے۔ وہاں امراء و اہل علم کی قدر دانی نے دامن پکڑ لیا، مدتوں مدرسہ نظامیہ میں تدریس کرتے رہے، پھر صوفیانہ خیال نے ان کو خانہ بدوش کیا، بغداد سے شام جا پہنچے، مدتوں حضرت قدس دمشق میں واعظ کی رہے مگر لفل ... تھی ... کی ... علوم کے ... [illegible]

[illegible]

سے ہیں اور شیوخ کاملین سے مستفیض بھی ہوئے۔ پھر مراکش جانے کا عزم فرمایا۔ راستے سے لوٹ آئے آخر عمر میں اپنے وطن کی جانب تشریف لائے اور شہر طوس میں خانقاہ بنائی۔ اور یہیں رحلت فرمائی۔

شیخ محی الدین اکبر امام ابن عربی کو دیکھئے یہ بزرگ اشبیلیہ اندلس میں پیدا ہوئے پہلے تو اپنے ملک کے شہروں میں علوم حاصل کئے، پھر شوق علم سمندر پھاند گئے، براعظم افریقہ میں تشریف لائے۔ محمز فارس مراکش مغرب اور سے کامیاب ہوتے ہوئے مصر میں پہنچے مدتوں یہاں درس و تدریس کی، پھر شام و عراق کے شہروں میں گئے ایک عمر تک حرمین میں اقامت کی، فتوحات مکیہ و مدینہ وہیں تالیف فرمائی۔ آخر عمر دمشق میں بسر کی۔ اور وہیں رحلت فرمائی۔

اور دور جانے کی کیا ضرورت ہے ہم اپنے ہندوستان ہی کے پیشواؤں کو دیکھ لیں۔

حضرت خواجہ خواجگان معین الدین چشتی اور حضرت شیخ الاسلام فرید گنج شکر و قطب الاسلام حضرت قطب الدین بختیار کاکی رضی اللہ عنہم نے کیا تھوڑا سفر کیا ہے ان کے ملفوظ ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت بابا صاحب نواح لاہور سے تین مرتبہ بغداد شریف فقط شیخ الشیوخ کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ وہ زمانہ خشکی سے سفر کرنے کا تھا۔ ذرا اس مسافت اور ہمت کو خیال فرمائیے یہ حکایتیں اور شخصی ذکر تو تمام ہی نہ ہوگا۔

اب ہم لوگ اپنے آپ کو دیکھیں کہ ہمارا سفر نامہ کس قدر ہے۔ حضرات! اوروں کا حال مجھے کیا معلوم ہے، اپنا علمی سفر نامہ عرض کرتا ہوں کہ میرا غریب خانہ پھلواری شریف یہاں سے گیارہ منزل ہے۔ بس وطن سے نکل کر اس شہر لکھنؤ میں پہنچا کچھ درسی کتابیں اور کچھ طب پڑھی اور تھوڑے ہی دنوں میں امام رازی بن گیا، پھر لوگوں کی دیکھا دیکھی حدیث پڑھنے کے لئے سہارنپور اور دہلی گیا۔ ایک سال کے اندر ہی امام الدنیا فی الحدیث بن گیا ——— نعوذ باللہ من ذلک السفر والشوق وا توب الیہ انہ ہو التواب الرحیم ——— ہاں خدا کا شکر ہے کہ میرے صوفیانہ خیال نے بہ نیت زیارات مزارات متبرکہ و شرکت اعراس بزرگان مجھے مختلف شہرو دیار و مواضع و قریات کی سیر کرائی ہے جس کی بدولت میں علماء و فضلاء و مشائخ سے ملا۔ اور ان سے مستفیض ہوا زمانے کی ضرورتوں سے واقف ہوا اب تو میرا خیال ہی کچھ اور ہو گیا۔ مجھے زیارت حرمین شریفین کا بھی اتفاق ہوا ہے، مدینہ طیبہ میں محمودیہ کتب خانے کی سیر کو گیا عجیب و غریب کتابیں دیکھیں، تاریخ خطیب بغدادی کا ایک پاکیزہ نسخہ میری نظر سے گذرا۔ اس کتاب کی ایک حکایت مجھے یاد رہ گئی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک بزرگ مصر میں امام شافعی کے حضور میں حاضر ہوئے آپ نے استفسار فرمایا بغداد کی بھی سیر کی، انھوں نے عرض کیا، حضرت نہیں، آپ نے فرمایا واللہ ما رایت الدنیا یعنی خدا جانتا ہے تم نے ابھی دنیا ہی نہیں دیکھی، اور ایک زمانہ یہ ہے کہ ہم لوگ گھر بیٹھے بٹھائے تجربہ کار و عالم اور امام الدنیا فی الحدیث بن جاتے ہیں۔ اور اس پر یہ دعویٰ کہ بڑے بڑوں کو میرے برابر علم و فضل کہاں تھا میں نے تو صحاح ستہ پڑھی ہے، انھیں تو کل سترہ حدیثیں معلوم تھیں فاعتبروا یا اولی الابصار،

حاصل یہ کہ سیر و سیاحت سے بڑا تجربہ ہوتا ہے ساری تعلّی و رعونت ہوا ہو جاتی ہے، ہمدردی کا مادہ اعلیٰ درجہ کا پیدا ہو جاتا ہے۔

ہمارے دو مکرم دوست یہاں پر تشریف رکھتے ہیں ایک جناب مخدومی مولوی عبدالحق صاحب تفسیر حقانی' ایک وہ زمانہ تھا کہ آپ فتحپوری کی مسجد میں مدرس تھے، طلبہ کی ایک فوج آپ کے ہاتھ میں تھی' قلم کی نیزہ بازی ہوتی تھی' شروح و حواشی لکھتے تھے' حسامی کی نہایت عمدہ شرح لکھی' اور ایک یہ زمانہ ہے کہ اب درس و تدریس کی فرصت نہیں اسلام پر مخالفین کے جو حملے ہو رہے ہیں اس کی طرف متوجہ ہیں اکثر پنجاب و بنگالہ و دکن کا چکر لگایا کرتے ہیں۔ کتب خانے اور قلمی کتابوں کے سر رشتہ میں لگے رہتے ہیں' اب انھیں سے پوچھئے کہ ضرورت زمانہ سے کب خبردار ہوئے اور اس سفر و سیاحت نے کیا فائدہ پہونچایا' آپ کی وہ حالت سلطنت جس میں طلبہ پر حکرانی کرتے تھے وہ بہتر تھی یا اب یہ حالت جس میں رات دن بجز آہ و بکا کے اور حسرت و افسوس کے دوسرا اثر نہیں' وہ یہی جواب دیں گے' وہ جہل تھا میری آخرت کے کام آنے والے میرے یہی خیالات ہیں ——— دوسرے صاحب ہمارے معزز دوست شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی ہیں' لیکن وہ زمانہ گذر رہا ہے کہ آپ سید و شریح مطالعے کے موجبات مشق کیا کرتے تھے اور رات دن بجز "صغریٰ کبریٰ" بنانے اور وہمی نتیجہ نکالنے کے دوسرا شغل نہ تھا' [illegible] کی طرف توجہ کی' [illegible] "[illegible] الامام" میں ایک چند رسالہ [illegible] مناظرہ و مباحثہ [illegible] کا شہرہ آفاق تھا۔ اسلام کو اس زمانے میں آپ سے [illegible] [illegible] [illegible] کی حالت ہے رات دن [illegible] کی کتابوں کی سیر ہے [illegible] تحریروں کا ملاحظہ، جو شبلی [illegible] [illegible]

نہ ہے اس پر طرہ یہ ہے کہ حضرت کو استغنا کا عارضہ بھی ہے یعنی کتابوں سے سیری نہیں ہوتی، حبیبہ العطش العطش کی فریاد ہے جہاں کتب خانہ سنا پہنچ پہنچے
اور کتابوں کے کیڑے بن گئے، شہر عظیم آباد پٹنہ میں خان بہادر خدا بخش خانی چیف جسٹس حیدر آباد کا ایسا نامی کتب خانہ ہے کہ شاید ہندوستان میں اس کا نظیر نہ ہو
سارے دوست ہر سال وہاں بھی ضرور پہونچا کرتے ہیں خیر یہ تو ہندوستان کی باتیں ہیں، روم و شام و مصر تمام سے ہو آئے ہیں، اور پھر بھی سیر نہ ہوئے سے

دریا رود از چشم لب تر نشود لیکن ـــــ این طرفہ تماشا ہیں بنشستہ بہ آب اندر

اب آپ کی تصنیفات ضرورت زمانہ ہی کے متعلق ہوتی ہیں اور سیر و سیاحت سے مسلمانوں کی ضرورتوں نے خوب ہی واقف کر دیا۔ یہ بزرگان میرے
بل کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ میرا یہ خیال کہ سیر و سیاحت ایک اعلیٰ درجے کا مفید کام اور بہت بڑا ذریعہ الوالعزمی اور بلند حوصلگی حاصل ہونے کا ہے۔ کس
حد تک صحیح ہے۔ حقیقت میں دنائت، پست ہمتی، بزدلی، جہالت وغیرہ مہلک امراض کا تیر بہدف علاج اگر ہے تو یہی سیر و سیاحت، اس سے علاوہ اس کے
انسان نئے تجربات کا ایک کافی ذخیرہ جمع کر لیتا ہے خود اسے اپنی حالت پر پورا تنبہ ہو جاتا ہے اور نہایت وثوق کے ساتھ اسے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ
میں کیا ہوں اور آئندہ مجھے کیا ہونا چاہئے" اور سچ پوچھئے تو یہی خیال دار و مدار اور اصل الاصول انسان کی دینی اور دنیاوی ترقیوں کا ہے اور بس۔

بشیشران گپت

دو نمبر کی گمٹی

ترجمہ:- پروفیسر منظر

تین سو پچاس نمبر فاؤن ٹرین پانچ بجے صبح ہی صبح گزرنے والی تھی، مدن سنگھ اپنی گمٹی سے نکل کر پھاٹک کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہری بتی لٹک رہی تھی۔ راستہ صاف تھا لیکن گاڑی تھی کہ آج آنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ مدن کھڑے کھڑے بیتاب ہی تو ہو گیا۔

آخر گاڑی چھک چھک کرتی، دھوئیں کے بادل اگلتی ہوئی، چنگاریاں اڑاتی طوفان کی طرح آئی اور مدن کی ہری بتی کی لہراہٹ میں آناً فاناً گذر گئی۔

بھری برسات کا زمانہ تھا، سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ پھر بھی آسمان پر چاروں طرف پانی سے بوجھل بادل منہ لٹکائے ہوئے تھے۔ کسی آشفتہ سر عاشق کے دہشت بستے چہرے کی طرح صرف دور کے اسٹیشن پر بتیاں منہ بسورتی معلوم ہوتی تھیں۔

گاڑی زن سے گذر گئی اور مدن کی نظر اس کے غائب ہوتے ہوئے عقبی سرخ نقطہ پر دیر تک جمی رہی اور وہ دل ہی دل میں کچھڑی پکانے لگا۔ گاڑی کی بھی برسات کی ایسی سہانی سہانی صبحوں میں جانا ہے تو شوق سے جایا کر، لیکن یہاں سے گزرنے کے وقت کا بھی تو خیال رکھا کر، تاکہ دو منٹ میں کام نپٹ جایا کرے اور پھر گمٹی میں سات بجے تک مزے سے سونے کو ملا کرے۔ سات بجے اسے پھر اٹھنا پڑتا ہے، جبکہ دس منٹ پر لال گولا پیل آتا ہے، اس وقت پھر پھاٹک بند کرنا ہوتا ہے دوپہری جھنڈی دکھانی پڑتی ہے۔

لیکن یہ گاڑی پانچ بجے آتی ہی نہیں، کبھی نہیں آتی، یہ گاڑی گیا پسنجر کہلاتی ہے۔ اور گیا سے ہنڈل اور رنے پٹی ہوتی ہوئی ادھر آتی ہے۔ پہلے یہ ادھر سے نہیں جاتی تھی۔ اور مدن چین کی بنسی بجایا کرتا تھا۔ شام سے لیٹا رہا کرتا اور گھوڑے بیچ کر نیند سویا کرتا۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ وہ پاربتی سے لپٹ کر اس کی چھلکتی ہوئی جوانی سے گرم گرم جسم کے لمس کے مزے لیا کرتا، لیکن اب وہ بات کہاں میسر تھی۔ اب تو اسے منہ اندھیرے ہی اٹھ جانا پڑتا ہے۔ پھر بھی اگر یہ گاڑی ٹھیک وقت پر گذر جایا کرتی تو بھی مصیبت سے دو چار ہونا نہ پڑتا، مگر اس گاڑی نے تو وقت پر نہ آنے کی قسم ہی کھا رکھی تھی اور مدن کو برسات کے دنوں میں ہری بتی دکھانے کے لئے باہر پھاٹک کے سامنے کھڑا ہونا پڑتا، بھیگنا پڑتا اور سردی کھا کھا کر کپکپانا پڑتا تھا، ایسی تیسی ایسی سسری نوکری کی کاش وہ اس نوکری پر لات مار سکتا۔ لیکن اب یہ اس کے بس کی بات ہی کہاں تھی۔ چھتیس برس کی عمر میں اس نے پھر سے بیاہ رچا لیا تھا۔ اور بیس سالہ پاربتی گمٹی کو پری خانہ بنائے ہوئے تھی۔ دوسری بیوی کی چاہت کی دھیمی دھیمی آگ دن بدن سلگتی جا رہی تھی۔ اور کیسے نہ سلگتی جب کہ مچلتی ہوئی تمناؤں سے بھرپور نرم و گداز سینہ کا اتار چڑھاؤ اور متناسب اعضاء سے لہلہاتا ہوا جسم پر بدن ہر وقت پاس جگایا کرتا تھا۔ جب کبھی مدن نوکری چھوڑنے کا خیال کرتا تھا تو پاربتی اپنی تمام فتنہ سامانیوں کے ساتھ اس کے دل میں چٹکیاں لینے لگتی، پاربتی کی اداؤں کی کشش اس کی ہنسی ہنسی رسیلی آنکھوں میں تیرتی ہوئی بے قرار خواہشیں اور گمٹی کی دلآویز پکار آج تک کبھی مدن کے دماغ سے اوجھل نہ ہو سکی تھی۔

اب آسمان صاف و شفاف تھا، اور چلچلاتی دھوپ پھیلتی جا رہی تھی۔ مدن دفتر لوٹنے کے ارادے سے آگے بڑھنے لگا۔ مگر چند ہی قدم پر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا سگنل کے پاس کالی کالی سی کوئی چیز پڑی ہوئی تھی، اسے خیال ہوا شاید کوئی کتا ہوگا! جیتے ہوئے لیکن غور سے دیکھنے پر جانور ریل سے کٹا ہوا پڑا تھا اور اس کا سر غائب تھا۔

مدن تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔ اب جو دیکھا تو وہ کتا نہ تھا بلکہ بکرا تھا۔ اس نے اسے گھسیٹا تو اسے بے اختیار ہنسی آگئی کیونکہ وہ بکرا بھی نہ تھا بکری تھی، اچھا خاصا تگڑی سی، مدن اس کو دونوں ہاتھوں سے گھسیٹتا ہوا گمٹی کی طرف چل پڑا۔ کھوتے سر پر منڈلا رہے ہیں۔ دو تین چیلیں بے غیرتی میں ملامت کرتی ہوئی

تیسرے دن کے قطرے چمکتے رہے۔

مدن دھولی کی پٹری کے پاس ہی رہتا تھا۔ ان دنوں دیوی کا تا اس کی قسمت پر گائیوں، بکریوں، بطخوں، اور مرغیوں کی بھینٹ چڑھایا کرتی تھی۔ کسی طریقے سے تو اس کی قسمت چمکنے کے امکانات نہ تھے۔ اس طرح سے البتہ چمک چمک اٹھتی تھی۔ گائے کا گوشت وہ نہیں کھاتا تھا۔ مگر بازار فروخت کرنے کے لئے موجود تھا بکرے کا گوشت وہ ایک گاشت والے کے ہاتھ بیچ ڈالتا۔ اور بکری کا گوشت کچھ تو وہ خود کھاتا اور بقیہ ایک ریسٹورنٹ کے مالک کے حوالہ کر دیتا اور دام کھرے کر لیتا اور یہ کوئی ادنیٰ درجہ کا روزگار نہ تھا۔ بلکہ بہت ہی اچھا روزگار تھا۔

ان کے علاوہ بھی چڑھاوے مدن کی قسمت پر روپے پیسے، سونے کے ابتام، فاؤنٹین پن گھڑیوں، انگوٹھیوں کے روپ میں چڑھا کرتے تھے۔ لیکن ایسے چڑھاوے ہمیشہ نہیں کبھی کبھار ہی حاصل ہوتے ہیں۔ اور صرف اسی وقت جب کوئی بابو صاحب گھر سے جوش کر نکلتے اور پٹری پٹری چلنے کے شوق میں انجن کی زد میں آن کر ایک حادثہ کا شکار ہو جاتے اور جب یہ حادثہ مدن کی گمٹی کے قریب ہوتا تو اس کی چاروں انگلیاں گھی ہی گھی میں ہو جاتی تھیں۔ اس طرح جو کچھ ہاتھ لگتا وہ مدن کے مہینے دو مہینے کی کم سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوتا۔ لیکن ایسا سنگین حادثہ روز روز واقع ہی کہاں ہو سکتا تھا۔ پھر بھی جب واقع ہو جاتا تو اس کے پو بارے تو ہو ہی جاتے۔ اور جب واقع نہیں ہوتا تو کو ملال اور افسوس بھی نہ ہوتا۔

گمٹی پر پہنچتے ہی اس نے پاربتی کو سنایا، گیا پسنجر سے یہ بکری کٹ گئی، اور یہ اچھا ہی ہوا گوشت بھی اڑانے کو ملے گا۔ اور کھال الگ بکے گی، اس وقت پاربتی گمٹی پر جگت پر نہا رہی تھی، بھیگی لت پت، ساڑی سے خوشنما دمکتا ہوا بدن دلفریب جھلکیاں دکھا رہا تھا۔ پاربتی نے شرما کر ذرا سا گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ ساڑی کو ادھر ادھر سے کھینچ کر برابر کیا اور ہنس پڑی، اس کے موتی جیسے دانت بجلی کی طرح چمک گئے اور کانوں کے آویزے متحرک اٹھے۔

مدن سر پر پگڑی باندھے بیڑی کا دھواں اڑاتا ہوا کھال اتارنے اور گوشت کاٹنے بیٹھ گیا۔ وہ بے حد دبلا پتلا سا تھا، اور اس کا چہرہ بھی پچکا ہوا اور غدار تھا اور بد ہیئت چہرے پر بڑی بڑی نکیلی مونچھیں پریشان تھیں۔ اور انہی مونچھوں کی دراڑوں سے ہنسی کی خفیف سی لکیر ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھنچ گئی۔ آج وہ بہت ہی خوش تھا۔

اس کے کھونٹی میں لتھڑے لتھڑے ہاتھ کھال اتارنے میں بے حد مصروف تھے اور بہت سے گوشت کے تصور سے اس کا دل بھی ٹھنڈا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے سرور سے لبریز آواز میں پاربتی کو پکارا۔

اور پاربتی بڑے ناز و انداز کے ساتھ مٹکتی ہوئی اس کے نزدیک جا پہنچی۔ گوشت کے ڈھیر پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور عجیب جھلاہٹ کے ساتھ بولی۔

"اتنا سارا گوشت پکائے گا کون؟"

"تم اور کون ——!"

"نا بابا ——! مجھ سے اتنا سارا گوشت نہیں پکے گا، کہے دیتی ہوں —— ہاں !!"

"اگر نہ پکا سکو گی تو بیچ ڈالیں گے، کھائیں گے کھائیں گے اور روپیہ پیسہ بھی چٹکاریں گے۔"

اور پھر وہ پاربتی کو دیکھ کر ہنس پڑا، وقت آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ دھوپ تھی کہ درختوں پر سے پھسلتی چھپر تک پر اتر آئی تھی۔

مدن کا وقت کی طرف جو دھیان گیا تو بس گھبرا گیا، اور گھبراہٹ میں پاربتی کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"ارے پاربتی ذرا جھنڈی دکھا دے نا، نئے ہٹی ادھر کل آ رہی ہے، اب پہنچا ہی چاہتی ہے۔"

پاربتی کے منہ سے زوردار قہقہہ نکلا، اس نے ہری جھنڈی اٹھائی اور باہر برآمدہ میں آن کھڑی ہوئی، سگنل ڈاؤن تھا، پھاٹک بند اور راستہ صاف۔ ذری دیر میں زمین کو دہلاتی طوفان اٹھاتی، دھواں اڑاتی گھڑ گھڑ کرتی نئے ہٹی نکل آئی اور چلی گئی اور پاربتی حیرت میں ڈوبی ہوئی اسے تاکتی کی تاکتی رہ گئی اتنی بڑی گاڑی ان دو پتلی پتلی پٹریوں پر کس طرح شیطان کی طرح چلتی رہتی ہے۔ روزانہ کتنے ایک لوگ کہاں کہاں نکل جاتے ہیں۔ اور وہ [illegible] ہی ہے
[illegible] . اور ایک [illegible] مدن کے پاس جا بیٹھی، بہت سے [illegible]

[illegible] گھڑی اور جیب سے قلم اور [illegible] ایک منٹ میں لوگ جمع ہو گئے، پولیس آ گئی، جرح ہونے لگی، کس کا سامان ہے، کہاں کا رہنے والا ہے، [illegible] معلوم کیا جانے لگا، اور مدن جلتے ہوئے خون کے پاس غم اور افسوس کی صورت بنا ہوا اتر سنک الفاظ بدکیا تا منہ بان سے چپ چپ کرتا رہا اور کچھ بلا لوگوں کو صلواتیں سنایا کیا، یہ سسری کچھ لا پانا لوگوں ہے، ظالم کہیں کی، ڈائن کہیں کی۔

کچھ دنوں کے بعد گھڑی اور قلم ٹھکانے لگا کر اس نے پیسے کھرے کر لئے، مگر انگوٹھی نہ بیچی اور پھر انگوٹھی کے چار آنے بھر سونے اور مٹی کی قسم سے اس نے ایک نازک سا ہار بنوا لیا، تھوڑے دنوں میں شام نگر اتر کا میلہ آ پہونچا اور پاربتی نے مارے تقاضے کے ناک میں دم کر دیا، مدن نے بڑی محبت سے پاربتی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور بڑے ہی تاسف کا اظہار کرنے لگا، اسٹیشن ماسٹر بابو نے چھٹی تو دی نہیں، میلہ کیسے جانا ہو سکتا ہے، اور پھر اس نے بات بنائی، اس میلہ ٹھیلہ میں دھرا بھی کیا ہے۔ اس سے بڑھ کر ایک چیز میں تم کو دونگا اور ضرور دونگا مگر پاربتی کی طرح بھی نہیں مانی اور منہ پھلائے رہی بس اس وقت مدن نے اس کے گلے میں ہار ڈال دیا اور اس کو سینے سے لگا کر اپنی چاہت کا ثبوت دینے لگا، پھر تو پاربتی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ رہا۔

اور پھر ایک دن شام کو اسٹیشن ماسٹر نے اسے بلا بھیجا اور جب مدن حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا میرے لڑکے کی بھات کھلائی" کی تقریب ہے دو بکرے چاہئے ہوں گے، قریب کے بازار میں تو مہنگے ملیں گے، اس لئے گاؤں میں جا کر خریدنے ہوں گے، وہاں دو تین روپے کم ہی میں ملیں گے، مدن نے بہت اچھا تو کہہ دیا مگر [illegible] لگا، اور ڈرتے ڈرتے اس کے منہ سے نکلا، گمٹی کے پھاٹک کا کیا ہوگا، جھنڈی کون دکھائے گا۔ اور ماسٹر بابو نے تیزی سے کہا،

ارے تیری بیوی تو ہے ہی کیا وہ ایک دن اتنا بھی نہ کر سکے گی، پھر مدن کو کہنا ہی پڑا جی کیوں نہ کر سکے گی۔

دوسرے دن صبح ہی صبح مدن بکروں کا انتظام کرنے چل دیا، اساڑھ کا مہینہ تھا، آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ رہ رہ کے پانی بھی برس جاتا تھا۔ اور سرد ہوائیں بھی سرسراتی پھر رہی تھیں اور مدن گاؤں گاؤں پھرتا رہا، اور شام ہوتے ہوتے اس کو تیس روپے کے دو بکرے مل ہی گئے اور وہ تین چار میل گاؤں سے دونوں بکروں کو کھینچتا ہوا ریل کی پٹری پٹری واپس چل پڑا، راستہ میں بارش بہت زور کی ہونے لگی، چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو گیا، چلتے چلتے ریل کی پٹری کے نیچے پڑے ہوئے پتھر سے اس نے ٹھوکر کھائی اور اس کا پیر شرابور خون ہو گیا، پھر بھی وہ چلتا ہی رہا یہاں تک کہ اسے پلیا دکھائی دینے لگی اور اس کے پاس ہی دھندلا سگنل کھڑا نظر آنے لگا اور اس سے پرے کو بارک پور اسٹیشن کی بتیاں جھلملانے لگیں پلیا سے گذرتے وقت مدن چونک سا پڑا شدید بارش کی وجہ سے مٹی بہہ گئی تھی اور پٹری دھنس گیا تھا، شاید کچھ ٹوٹ بھی گیا تھا، پرانی اینٹیں باہر نکل پڑی تھیں، اور اس نے دل میں طے کیا کہ وہ ماسٹر بابو کو پلیا کی خراب حالت کی ضرور اطلاع دے گا۔ وہ بھیگ کے شرابور ہو گیا تھا، اور اس کے کپڑوں سے پانی بے طرح ٹپک رہا تھا۔ وہ بکروں کو گھسیٹتا ہوا زور زور قدم بڑھانے لگا۔

اسٹیشن ماسٹر نے دونوں بکرے بہت پسند کئے، خوب ہی تو موٹے تازے اور چکنے چکنے تھے وہ، اس خوشی میں انہوں نے مدن کو بھی دوسرے دن کے کھانے پر نوتہ دیا، اور مدن نے جھکتے ہوئے سر کے خم سے عزت افزائی قبول کر لی،

جب مدن گمٹی کی طرف چلنے لگا تو سردی پانی سے سکڑے سکڑائے دونوں بکرے یاس اور بیچارگی بھری آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے، مدن کا دل ترس سے بھر گیا، مگر وہ اپنا راستہ ناپتا رہا، اس کا بدن بھیگ بھاگ کر امرس جیسا ہو گیا، اسے زور کی سردی لگ رہی تھی پھر بھی اس خیال سے اسے خوشی تھی کہ وہ پہنچتے ہی پاربتی سے گرم گرم چولہے کی تپش حاصل کرے گا، اور وہ جلدی سے چائے تیار کر دے گی، دفعتاً اس کے قدم رک گئے، اسے خیال آیا کہ وہ اسٹیشن ماسٹر کو پلیا کی حالت بتانا تو بھول ہی گیا، اسے اس بھیگی حالت میں پھر سے جانا کھلتا معلوم ہوا، گمٹی بھی نزدیک آ گئی تھی اور پھاٹک کی سرخ بتی، فرض شناس پہریدار کی طرح کام انجام دے رہی تھی، اس نے دل میں سوچ لیا کہ وہ کل صبح ہی صبح جا کر اطلاع دے دے گا۔ رات بھر میں کیا اٹھا جاتا ہے،

جب وہ گمٹی پر پہنچا تو دروازہ اندر سے بند تھا، اور بند کھڑکی کی درزوں سے مدھم روشنی پھوٹ رہی تھی اس وقت بھی [illegible]
[illegible]
[illegible]

وہ کہاں چلی گئی ، شاید ہاتھ منہ دھونے باہر گئی ہوگی ، ہاں ٹھیک ہی ہے روزانہ کی طرح وہ ہاتھ منہ دھونے باہر گئی ہے ، کنوئیں کی منڈیر پر اس کی لال کناری والی اوڑھنی رکھی ہوئی تو ہے ،

مدن باہر نکل کر کھڑا ہو گیا ، سگنل ہو چکا تھا ، گیا پسنجر آ رہی ہے ، اس کا انجن موڑ پر دکھائی دیا ، لیکن یہ کیا جیسے وہ اچانک رک گیا ، ہاں گاڑی کھڑی ہی ہو گئی تھی ، پلیا کے پاس ، یہ ڈرائیور کیوں اتر پڑا ، گارڈ صاحب انجن کی طرف کیوں آ رہے ہیں ، بہت سے مسافر بھی اتر پڑے ہیں ، سب ہی پلیا کی طرف دوڑ رہے ہیں ، مدن کے ہاتھ سے بتی چھوٹ گئی ، وہ دوڑ کر قریب پہنچا تو دیکھا ۔۔۔ پاربتی ۔

پاربتی ! اس کا سر چکرا گیا ، پیروں کے نیچے سے زمین سرکتی معلوم ہونے لگی ، آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا ، پاربتی یہاں کیسے ؟

اس نے خودکشی کر لی گاڑی کے نیچے آ کر ، لیکن کیوں ، رات کی تمام باتیں اس کی آنکھوں میں پھرنے لگیں ، یہ کیا اسی کی پشیمانی ہے ، کفارہ ہے جو اس نے خودکشی کر لی ، بہتے ہوئے خون میں پاربتی کا منہ لتھڑا ہوا تھا ، اس کے جسم کے پرخچے اڑ گئے تھے کمر سے نیچے کا حصہ کٹ کر الگ پڑا تھا اور آس پاس خون ہی خون جمتا جا رہا تھا ۔ جیسے کسی دیوی پر انسان کی بھینٹ دی گئی ہو ، گارڈ صاحب نے کمر پر ہاتھ رکھے رکھے فرمایا ، یہ خودکشی کا حادثہ ہے !

ڈرائیور بولا نہیں صاحب یہ بات نہیں ، سگنل ڈاؤن تھا ، میں گاڑی بڑھائے چلا آ رہا تھا دور سے دکھائی دیا کہ پلیا کے پاس کھڑی ہوئی یہ لڑکی ہاتھ ہلا ہلا کر جیسے کہ گاڑی کو رکوانا چاہتی ہو ، بریک لگاتے لگاتے بھی گاڑی اس سے پہلے نہ رک سکی اور یہ لڑکی لپیٹ میں آ گئی ، اتر کر دیکھا تو یہ پلیا ٹوٹی ہوئی تھی ، شاید وہ حادثہ بچانا چاہتی تھی ،

خیر ادھر ادھر پھیل گئی اور شیبو بھی وہاں آن پہنچا ، اس نے اپنا سر پیٹ لیا ، بال نوچ کھسوٹ ڈالے اور پھوٹ پڑا ، مدن بھیا کل تمہارے آنے میں دیر ہوئی میں پاربتی کے ساتھ کوڑی کھیل کھیل کر اس کا دل بہلاتا رہا اسے بہت ڈر لگ رہا تھا ۔

مدن یہ سب کچھ سنتا رہا اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا ، اس کی جھنجھلاہٹ میں اس نے شیبو کو ایک بار پھر دیکھا ، اس کے منہ سے کوئی بات نکلی ، اور وہ کہہ بھی کیا سکتا تھا ، بس ساری باتوں کا جواب ایک گریہ وزاری ہی تھی ۔ پاربتی کے حضور میں مسلسل سسکیاں اور آہیں اور دل کے تمام جذبے [illegible] تحفے کے طور پر پیش ہوتے رہے ۔

دو نمبر گمٹی کے پاس سے دو جوڑ پٹریاں برابر برابر کہیں سیدھی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی ، کنکروں سلیپروں ، اور سگنل کو پیچھے چھوڑتی ہوئی آگے دور بہت دور بڑھتی چلی گئی ہیں ، اس گمٹی میں مدن اب بھی رہتا ہے ، اب بھی حادثے ہوتے رہتے ہیں ، بکریاں ، گائیں ، اور آدمی کٹتے رہتے ہیں ، لیکن اب وہ کسی چیز کو بھی ہاتھ نہیں لگاتا ، اور جب آنکھوں کے سامنے کسی کو ریل سے کٹا ہوا پڑا دیکھتا ہے تو اس کے دماغ کے پردوں پر شباب کا ملائم نرم نکھار ، اور گھٹ کر مر جانے والی زندگی کی بہت سی آرزوؤں اور تمناؤں سے لبریز چہرہ ابھر آتا ہے ، وہ چہرہ جس کی مالک پاربتی تھی ، وہ پاربتی جو گمٹی والے کی بیوی تھی جس نے ریل کا حادثہ بچانے کی خاطر اپنی جان دے دی تھی اور مدن کا شکستہ اور رنج و الم میں ڈوبا ہوا دل فخر و ناز کے احساسات سے تھرکنے لگتا ہے اور گمٹی کے پھاٹک کے سامنے کھڑی بتی ہاتھ میں سنبھالے کبھی کبھی اس کی سوگوار آنکھوں سے آنسو جھر جھر گرنے لگتے ہیں ۔

قمرالدین اپل

"بزدل"

"وہ میرا بڑا گہرا دوست تھا اسے مرے ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں ..... ایک طویل عرصہ ..... مگر مجھے آج بھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کل کی ہی بات ہے۔" اتنا کہہ کر پروفیسر نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے جوان طالبعلموں پر نگاہ دوڑائی اور اس کے بوڑھے چہرے پر غم و یاس کے گہرے اثرات نمایاں ہو گئے۔ پھر وہ یکدم سنبھلا اور مسکراتے ہوئے بولا "زندگی کی دست برد سے بچنا ناممکن ہے ... کچھ حالات اور کچھ نظریاتی وجوہ ہی تخریب و تعمیر کا باعث ہوتی ہیں ..... مگر کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم ان مصائب کا یا مشکلات کا مقابلہ کر سکیں جو ہمیں مجبوراً پیش آتی ہیں جن سے ہماری مزاحمت کی قوتیں پسپائی کی طرف مائل ہو جاتی ہیں؟"

یہ کہہ کر پروفیسر نے اپنے ہاتھوں کو مسلتے ہوئے چاروں طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ "ہاں ہم ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ انسانی فیصلہ ہر تبدیلی کا باعث ہوتا ہے۔ فیصلہ ہی ایک ایسی چیز ہے جو زندگی کو خوشی کی طرف لے جاتا ہے ..... مگر اس نے فیصلہ نہیں کیا تھا ..... وہ میرا گہرا دوست تھا۔ مجھے اس سے بڑی محبت تھی۔ بالکل ایسا ہی خلوص جو مجھے تم سب سے ہے مگر مجھے اس سے نفرت بھی تھی۔ میری نفرت کی وجہ اس کے قہقہے تھے۔ اس کی زندگی ہی قہقہوں سے عبارت تھی اس نے کبھی سنجیدگی سے زندگی کے حقائق پر غور نہیں کیا تھا۔ وہ ہنستا تھا۔ زندگی اس کی نظروں میں ایک حسین سی عورت کی باہوں کے سوا کچھ بھی نہ تھی اور وہ عورت اس کے ہاتھوں میں ایک کھلونے کی مانند تھی۔ وہ میری باتوں کو سن کر تلخی پر اتر آتا۔ اس نے میرے زخموں کو کریدنے سے کبھی گریز نہ کیا اس کے ترکش میں میرے لئے طنز کے نشتروں کے سوا کچھ بھی نہ تھا ..... مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ مخلص تھا۔ انتہائی مخلص۔

زندگی نے ابھی اس سے کچھ نہیں چھینا تھا۔ اس نے ابھی افسردگی اور اذیت کا مزہ نہیں چکھا تھا۔ وہ مجھے قہقہوں میں الجھا کر کہتا "تم نے اپنے آپ پر افسردگی مسلط کر لی ہے ..... ہنسو ..... قہقہے لگاؤ۔ یہ بھول جاؤ کہ زندگی صرف ایک بوجھ ہے۔"

انتقام ..... ایک خواہش ..... ایک ان جانی آواز ..... میں چاہتا تھا۔ کاش ..... وہ اس افسردگی اور اذیت سے دوچار ہو جو زندگی میں ہر کس و ناکس کو رلاتی ہے ..... جلدی۔ بہت جلدی۔ پھر وہ آہ بھرے ... اور میں اس سے کہوں "برداشت کرو میرے دوست۔ کیونکہ برداشت کرنا ہی بہادری ہے۔"

آج مجھے محسوس ہوتا ہے شاید میں مجرم تھا کاش میں نے اس کے بارے میں ایسا نہ سوچا ہوتا۔ لیکن اگر یہ پست خیالی یوں ہی بلا ارادہ انسانی فطرت کے غلیظ دھوئیں سے اٹھے تو کسی کو مجرم ٹھہرانا مناسب ہوگا ــ انتقام، حسد، رشک، محبت، نفرت اور کتنے ہی اسی قسم کے جذبات سے انسانی فطرت مرکب ہے ..... میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میں ویسے ہی سوچنے پر مجبور تھا۔ وہ مجھے رلاتا تھا مجھے تنگ کرتا تھا مجھے ستانے میں اسے مزا آتا تھا۔

میں اس سے کہا کرتا تھا کہ تم ابھی زندگی کی ان الجھنوں سے دوچار نہیں ہوئے جو تمہاری ہنسی کو سسکیوں میں بدلنے کی طاقت رکھتی

ہیں۔ تم نے ابھی رونا نہیں سیکھا اور آدمی رو کر ہی غلطیوں کو محسوس کر سکتا ہے اور اسے روز و شب کی ترتیب د تواتر پر غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور وہ سوچ بچار سے زندگی کی الجھنوں کو حل کر لیتا ہے وہی کچھ میں کر رہا ہوں . . . میری افسردگی مسکرا کر بہاروں کو چھو لیتی ہے۔ تم قہقہوں سے چاند کے چہرے پر تھوک دیتے ہو . . . بس تم میں اور مجھ میں یہی فرق ہے۔“

وہ میری باتوں کو اپنے تیز تیز قہقہوں میں گم کر دیتا ہے اور میرے فطری جذبے ابھرتے نظریات کو تبدیل کرنا بڑی ہی مشکل بات ہوتی ہے کیونکہ ان کی بنیاد ضد پر ہوتی ہے . . . اور جہاں ضد ہو وہاں زندگی کے تلخ تجربات ہی تبدیلی کا باعث ہو سکتے ہیں۔“

پروفیسر خاموش ہو گیا اور پھر اس نے کوٹ اتار کر کھونٹی سے لٹکا دیا۔ اس کے بعد اس نے پیشانی کو صاف کیا اور ایک لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

وہ تمہاری طرح لمبا اور اونچا تھا مگر تم میں سے کوئی بھی اس جیسا خوبصورت نہیں۔ سفید رنگ اونچی ناک، سیاہ آنکھیں . . . جب میری اس سے پہلی بار ملاقات ہوئی تو میں سمجھا کہ شاید اس نے کسی مصنوعی طریقے سے اپنی آنکھوں کو یہ خوبصورت سیاہی بخشی ہے۔ مگر نہیں میرا خیال غلط تھا . . . فطرت نے اس کی تخلیق میں شاید خاص اہتمام سے کام لیا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں لمبی اور نازک تھیں اور پھیلی ہوئی ہتھیلیوں میں معمولی ڈھلوانیں۔ مجھے اس کے کانوں کی ساخت نہیں بھولتی۔ کتنے خوبصورت تھے متناسب اور نازک۔ کانوں کی لوؤں میں ہلکی سی سرخی تھی، وہی ہلکی سرخی جو بہار کے آخری دنوں میں گلاب کی پتیوں میں ہوتی ہے . . . ہاں مجھے وہ سب چیزیں یاد ہیں جو اس کے مردانہ حسن کو ابھارتی تھیں۔ جب ہم اکٹھے کہیں سیر و تفریح کو جاتے تو اس کی ہر حرکت سے بچپن کی شوخی جھلکتی۔ وہ بچوں کو چھیڑتا بوڑھوں کو چھیڑتے ہوئے گالی بھی سن لیتا۔ اگر کوئی بدصورت سی لڑکی دکھائی پڑتی تو وہ مسکراتے ہوئے زبان نکال دیتا۔ ایسے موقعوں پر وہ میری ڈانٹ ڈپٹ بھی سن لیتا . . . اس وقت مجھے اپنے مرحوم اکلوتے بیٹے کی یاد ستانے لگتی۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود مجھے اس کی سب حرکتیں پسند تھیں اور میں اسے زیادہ سرزنش نہیں کرتا تھا وہ میرا دوست تھا اور پھر وہ مجھ سے آٹھ سال چھوٹا بھی تھا۔

ایک رات مجھے ایک نئی پگڈنڈی . . . ایک نئے تجربے سے گزرنا پڑا۔ میں طلبا کی کاپیاں دیکھ رہا تھا وہ ایک پُرسکون رات تھی اور اس رات مجھے اپنی تنہائی کا احساس بھی نہیں تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے کوٹھی کا ہر گوشہ میری مرحوم بیوی اور بچے کے قہقہوں سے گونج رہا ہے۔ میں خوش تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے ہر پرچے سے میرے بچے کا مسکراتا ہوا چہرہ ابھر رہا ہے . . . اس وقت وہ میری کوٹھی آیا۔ اس کے ساتھ ایک جوان لڑکی تھی وہ کچھ شرماتے ہوئے، کچھ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ”یہ میری ایک فرینڈ ہے“ . . . . .

وہ رات ایک سنہری رات تھی . . . . وہ دونوں باغیچے میں ٹہلتے رہے باتیں کرتے رہے۔ سنہری اور ٹھنڈی دھوپ میں نہلاتے رہے . . . . اور رات گزر گئی۔

میں سوچتا رہا۔

اس نے اپنی پاکیزگی اور اپنی معصوم ہنسی کو گناہ کی سیاہی کے سپرد کر دیا تھا۔ کتنا عظیم نقصان تھا یہ کچھ میں ہی جانتا ہوں یا تم میں سے شاید چند ایک اس نقصان سے دوچار ہوئے ہوں۔ ہاں مجھے علم ہے، یہ گناہ روح کی ان لطیف حسیات کو چھین لیتا ہے جن سے زندگی میں روشنی پیدا ہوتی ہے اور جن سے قہقہوں میں اجالے کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ مگر . . . آؤ ہم اسی کی باتیں کریں . . . [illegible] کو ایک خود ساختہ عمل قرار دیا تھا زندگی کو ایک ایسی رات سے تعبیر کیا تھا جس میں [illegible]

چمن ہی تھے جن میں کانٹوں سے الجھنے کا احساس ناپید تھا۔ جن میں صرف کلیوں کی مہک اور خوشگوار ہوائیں تھیں اور اس مہک میں اس نے میری پاکیزہ پیشانی کو سیاہ کرنا شروع کر دیا۔ اس نے مجھے دعوت دی۔ اس نے مجھے زندگی کی ان لذتوں کی طرف بلانا چاہا جو صرف رات کی مہمان ہوتی تھیں۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر روک نہ سکا

"اُف . . . . . تم آخر اتنے سنگدل کیوں ہو؟ زندگی بھی آخر ان خوشیوں کی حقدار ہے جن سے تم اسے محروم کئے دیتے ہو۔" وہ مجھ سے کہتا۔

"میں ایک عظیم کام کر رہا ہوں . . . . . . میرے طالب علم ہی میری زندگی ہیں . . . . میں مطمئن ہوں۔" میں جواب دیتا تو وہ پگڈنڈی . . . وہ شاہراہ اپنے اندر ساری دلچسپیوں کو سموئے آئی۔ وہ خوبصورت تھا۔ جوان۔ صحت مند . . ایسا خوبصورت اور دلچسپ کہ اُسے زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑتی تھی۔ ایک ہنسی، ایک مسکراہٹ اور کبھی کبھی دل میں اتر جانے والی خود ساختہ سنجیدگی . . . . اس نے زندگی کے افکار و مسائل کو ان مسکراہٹوں کے سپرد کر دیا۔

ہاں میں یہ بتانا بھول گیا ہوں کہ اس کے والدین نے کافی جائیداد چھوڑی تھی۔ سکے اس کی جیبوں میں کھنکتے رہتے تھے . . . . . سکے اور جوانی۔ مگر افسوس۔ ایک وقت آیا جب اُسے احساس ہونے لگا کہ وہ خوبصورت ہے۔ بہت ہی خوبصورت۔ وہ مجھ سے کہتا "کہو . . . کونسی . . . . کوئی بھی۔" انہی دنوں ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ اس نے مجھے ایک ذلیل کیڑے سے تشبیہ دی۔ ایسا کیڑا جو زندگی پر بوجھ ہو . . . . ایک بے حس پتھر جو زندگی کی نایاب لطافتوں سے حظ اٹھانے سے کتراتا ہو۔ جس نے سوگواری کو اپنا شعار بنا لیا ہو . . . . وہ نہیں جانتا تھا کہ سوگواری زندگی کی اصل ہے اس سے بغلگیر ہوئے بغیر زندگی نامکمل ہے۔ خوشبو قہقہے ہنسی۔ ایک عورت۔ ایسی عورت جو رات کی بہار ہو . . . . صرف رات کی بہار . . . وہ کافی نہیں۔

شروع شروع میں دن بے کل ہو گئے۔ ایک انجانی الجھن طاری رہتی۔ میں چاہنے لگتا کہ اس کے پاس جاؤں۔ اس سے کہوں کہ خدا کے لئے رک جاؤ۔ زندگی یہ نہیں . . . . یہ خودفریبی ہے . . . . . مگر نہ جا سکا۔ تین مہینے گزر گئے۔ ہاں یہ ان دنوں کی بات ہے جب میری تبدیلی دوسری جگہ ہونے والی تھی۔ ایک دن ہم سرِ راہ مل گئے۔ وہ میرے پاس سے گزر جانا چاہتا تھا مگر میں نے روک لیا۔ تین مہینوں کی لمبی مسافت منٹوں میں طے ہو گئی۔ ہم باتیں کرتے رہے۔ اس کا طرزِ عمل وہی تھا۔ وہی تین مہینے پہلے والا۔ میں نے اسے اپنی تبدیلی کے متعلق بتایا اور پھر اپنی پرانی جھجک کو استعمال کرتے ہوئے اُسے زندگی کے بارے میں ٹھنڈے دل سے سوچنے کی تلقین کی۔ وہ کچھ سوگوار سا ہو گیا۔

ایک ہلکی سی تسکین اُس فطری جذبے کو میسر آ ہی گئی جو عرصے سے اس کی تلاش میں تھا زندگی کی چھینا جھپٹی اس سے اس کے مخلص دوست کو ایک طویل عرصہ کے لئے چھین رہی تھی۔ ہاں . . . . یہ چھوٹے چھوٹے نقصان ہی بڑھتے بڑھتے قہقہوں کو چھین لیتے ہیں اور آدمی مسکرانا چاہے تو مسکرائے مگر اس کی مسکراہٹ کے پیچھے مآلِ حیات کے چھن جانے کا احساس ضرور ایک ہچکی لیتا ہے اس کے لئے یہ نقصان ایک جھٹکے کی حیثیت رکھتا تھا۔

"میں نے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔" وہ اچانک بولا۔

مجھے انتہائی خوشی ہوئی . . . . ایک نئی شاہراہ۔ جہاں پہنچ کر زندگی ایک نیا رخ اختیار کر لیتی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بدل جائے گا۔ وہ اب ایک نیا اندازِ فکر اپنا لیگا۔

اس کی شادی ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ اُسے اپنی بیوی سے بہت محبت ہے اور وہ احساس جو زندگی اسے میسر آ گیا ہے

وہ آج تک محروم تھا۔ میں نے اس کی بیوی کو دیکھا۔ میری اس سے باتیں ہوئیں۔ وہ بڑی سنجیدہ اور سلجھے ہوئے خیالات کی لڑکی تھی اس
ت بھی میرے سامنے اس کا چہرہ ہے تفصیل میں جانا شاید ضروری نہ ہو۔ وہ اپنے خاوند سے کم خوبصورت نہ تھی۔ جوڑا خوب تھا ایک
دسرے پر فوقیت دی جاسکتی تھی۔

پھر میری تبدیلی ہوگئی۔ میں دوسرے شہر چلا گیا۔ شروع شروع میں اس کے خط میرے پاس آتے رہے۔ ان خطوں سے مجھے پتہ چلتا
ہ میری کمی بڑی شدت سے محسوس کر رہا ہے مگر جوں جوں دن گزرتے گئے اس کے خطوں میں کمی آتی گئی۔ بالآخر ایک وقت آیا کہ
ں کا یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ ایسی حالتوں میں بعض اوقات انسانی ذہن پر ان جانے خدشات حاوی ہو جاتے ہیں . . . میرے
رشات بڑھتے گئے۔ میں نے حالات کی نوعیت کا پتہ چلایا۔ وہ اپنی پرانی عادتوں میں پھر سے مبتلا ہو گیا تھا . . آہ . . . . وہ احساس
. . وہ احساس کہ وہ بہت ہی خوبصورت ہے اسے پھر پرانی راہوں پہ لے آیا تھا۔ اس نے بیوی کے بارے میں سوچنے کی ضرورت
ی۔ خوبصورت اور حسین بیوی کے بارے میں . . . . جس سے اسے انتہائی محبت تھی! . . . . . نہیں اسے محبت نہیں تھی اس
ب ایسا آلہ خریدا تھا جو اس کے تقاضوں کو پورا کر سکتا تھا۔ وہ اس احساس سے عاری تھا جس سے ایک عورت مطمئن ہو سکتی ہے
نے اپنی ازدواجی زندگی کی اساس صرف تقاضوں کو پورا کرنے پر رکھی تھی . . . . . وہ مسکراتا بھی ہوگا وہ ہنستا بھی ہوگا۔ وہ
امنی کی باتیں بھی کرتا ہوگا . . . مگر یوں ہی . . . . ورنہ ہر طرف خلا ہی خلا تھا . . . . کیوں کہ بنیادی نظریہ . . . . کچھ اور
. وہ ان خلاؤں کو پُر کرنے کے لئے واپس لوٹ گیا۔ اور انھیں پُر کرنے کے لئے اس کے پاس مردانہ حسن تھا اور جیب میں پیسے۔

جب میں دو سال کے بعد لوٹا تو وہ ایک بچے کا باپ بن چکا تھا۔ ہماری ملاقات ہوئی۔ اس کی صحبت میں کوئی نمایاں فرق
ں تھا۔ وہی شوخ اور چنچل عادتیں ۔ وہی ہنسی، وہی قہقہے۔ باتیں کرتے کرتے ہم پرانے موضوع پر آگئے۔ "یہ اچھا نہیں
کر رہے ہو۔"

"پھر وہی یاس آمیز پرانی باتیں"۔ اس نے قہقہہ لگایا۔

"تمھاری بیوی ہے۔ بچہ ہے؟"

"انھیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں"

"مگر تمھاری بیوی سب کچھ جانتی ہے؟"

"کوئی بات نہیں"

تو اسے قطعاً کوئی پروا نہیں تھی۔ اس کی راتیں اور دن اس پرانے نظریئے کے آغوش میں پل رہے تھے جن سے مجھے اختلاف
یں چاہتا تھا وہ ایک نارمل آدمی کی طرح زندگی گزارے۔ میں اس سے الجھ بھی پڑتا مگر وہ مجھے دھتکار دینے میں کوئی قباحت
ں نہ کرتا۔ وہ کہتا ۔ "تم بزدل ہو۔ تم میں زندگی کو اپنانے کی صلاحیتیں نہیں رہیں۔ تم مردہ دل ہو . . . . آؤ کچھ راتیں چاندنی
یں گزاریں۔ یہ راز۔ یہ بھید کتنے دلکش ہوتے ہیں۔ یہ خوبصورت جوان جسم . . . . . اوہ۔ تم تو اب بوڑھے ہو چکے
نے خوشیوں کو یاس اور قنوطیت کے سپرد کر دیا ہے۔ تم نے خود کو کاہلی کی چادر لپیٹ کر بند کر دیا ہے۔ عظیم کام . . . .
م ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ مجھے تمہارے اس فلسفے کی ضرورت نہیں۔ میرے چہرے کو دیکھو۔ دیکھو یہ کتنا خوبصورت ہے
انکار کر سکتے ہو۔ دیکھو میرے ہاتھ۔ میری انگلیاں۔ میری آنکھیں ۔۔ رات کی ہم آغوشیوں میں حسین لب [illegible]

محروم کرنا چاہتے ہو ـ مجھے تمہارے کسی بھی فلسفے کی ضرورت نہیں ۔"
اس نے مجھے برا بھلا کہا اور ہم علیحدہ ہوگئے ۔

نوجوان دوستو! میں تمہیں اس واقعے کے آخری مرحلوں تک لے آیا ہوں۔ وہ بزدل تھا ــــ وہ زندگی کے ایک ہی رخ سے مطمئن تھا۔ ہاں اس رخ سے جس میں زندگی اپنی تلخ حقیقتوں کو چھپائے رکھتی ہے اور میٹھے اور دلکش گیتوں کو بلند کرتی ہے جب آدمی اس منزل میں ہوتا ہے تو اسے ہر ایک کا دکھ اور رنج ایک اختراع معلوم ہوتا ہے۔ اسے دوسروں کے رونے میں تصنع اور بناوٹ کا احساس ہوتا ہے۔ کوئی آہ بھرتا ہے تو وہ اسے ایک فریب سمجھتا ہے ــــ وہ بھی انہی لوگوں میں سے ایک تھا۔ جو صرف بہاروں سے آشنا تھے جنھوں نے اپنی پلکوں سے آنسو نہیں گرائے تھے۔ جنھوں نے کبھی ہچکی نہیں لی تھی اور جنھوں نے کم مائیگی کے احساس کو چھوا تک نہیں تھا۔

وہ بزدل تھا . . . کیونکہ اس نے مقابلہ کرنے کی قوتوں کو اپنی آہوں کے سپرد کر دیا۔ میں تمہیں بتاتا ہوں وہ کیسے۔ وہ ایک حادثے سے دوچار ہوگیا جس میں اس کی ایک آنکھ ضائع ہوگئی ناک بیٹھ گئی اور جبڑے ٹوٹ گئے۔ وہ حسین چہرہ جو ہر راہ گیر کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا اب مکروہ اور قبیح ہو چکا تھا۔ زندگی اپنا دوسرا اجنبی رخ لیکر اس کے سامنے آگئی وہ رخ جو اس کے خیالوں میں لوگوں کا خود ساختہ تھا۔ میں نے اسے دور سے دیکھا۔ میرے قدم بڑھے۔ مگر میں اسے روک نہ سکا۔ وہ تیز تیز چلتا ہجوم میں غائب ہوگیا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو سیاہ چشمے سے ڈھانک رکھا تھا۔ مگر وہ اپنی ناک اور جبڑے کی نئی "ساخت" چھپانے میں ناکام تھا۔ کسی قیمتی چیز کے چھننے کا احساس . . . وہ افسردگی . . . جو یہ احساس پیدا کرتا ہے اس کے چہرے پر نظر آرہی تھی۔

جس رات اس نے خودکشی کی۔ اس سے چند دن پہلے میں نے اسے اسی پرانے باغ میں دیکھا جہاں بیٹھ کر وہ بدصورت چہروں کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ وہ ایک بنچ پر بیٹھا ہوا تھا اور تھوڑی ہی دور گھاس پر اس کا چار سالہ بچہ کھیل رہا تھا۔ میں رک گیا آج وہ بھاگ نہیں سکتا تھا۔ میں کھڑا رہا۔ اس نے سر اٹھایا اور مجھے دیکھ کر پھر سر جھکا لیا۔

اس مجرم کی جیت ہوگئی تھی جس نے انتقام کے لئے آہیں بلند کی تھیں۔ میری پیشانی پسینے سے تر ہوگئی۔

"حوصلے اور برداشت سے کام لینا چاہیئے۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش رہا۔

"آؤ بیٹے۔ آجاؤ۔" میں نے بچے کو مخاطب کیا۔

وہ میرے قریب آگیا اور میں نے اسے گود میں لے لیا۔

"تمہاری بیگم نہیں آئیں؟" میں نے سوال کیا۔

دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھی۔ "تم سچ کہتے تھے۔ تم سچ کہا کرتے تھے . . . . وہ . . . . وہ اپنے خالہ زاد بھائی کے ساتھ سینما گئی ہے۔ اسے میرے چہرے سے محبت تھی صرف میرے چہرے سے۔"

یہ کہہ کر اس نے بچوں کی طرح اپنا سر میری گود میں ڈال دیا اور سسکنے لگا۔ اس کے پیٹنے کے رونے کی آواز اس کی سسکیوں پر حاوی تھی۔"

یہ کہہ کر پروفیسر نے اپنی پیشانی سے پسینہ صاف کیا اور تھکی ہوئی آواز میں بولا "اس نے فیصلہ نہیں کیا تھا۔ ہاں۔ بلکہ اس نے فیصلہ کیا تھا۔ برداشت کرنے کا فیصلہ۔ مقابلے کرنے کا فیصلہ . . . . . وہ بزدل تھا

سپنے بکھیل تھا:

مسز کلا کلی کپور حسب عادت اپنے خوشنما بالوں کو ذرا پیچھے جھٹکا دیکر راجہ دریسین کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے لگی۔ گویا کہنا چاہتی ہو " آپ اس بھدی عورت کی باتوں میں آ گئے۔ دیکھئے میرے بال کتنے خوبصورت ہیں۔ دیکھئے " کلا کلی نے مکرر اپنے سر کو جھٹک کر اپنے زریں بالوں کو ہلایا۔

جب نور جہاں لندن اپنے چھوٹے بھائی اور بوائے فرینڈ کے ساتھ کلب ہال میں داخل ہو کر اپنی نشاں کو اتارا تو حاضرین اس کے برف کے مانند گورے گورے نیم عریاں بدن پر نہایت سلیقے سے چپکے ہوئے خوبصورت درخشاں سیاہ لباس کو دیکھ کر بوکھلا سے گئے۔

" واللہ، کیا حسن ہے۔ " ایک نوجوان کا وسکی کا گلاس اس کے ہونٹوں کے قریب رکا رہ گیا۔ نور جہاں کے چہرے کی دلنشیں بے داغ خطوط اور دلکش مسکراہٹوں سے اکثر خواتین کے چہرے تاریک پڑ گئے۔

" رنگ گورا ہے لیکن کان کتنے بڑے ہیں۔ " مسز کلا کلی کپور مسٹر کپور کے کانوں میں بڑبڑانے لگی۔ جواب میں مسٹر کپور اپنا گنجا سر سہلاتے ہوئے ہنسنے لگا۔

" ٹانگیں بدن کے حساب سے کہیں زیادہ لمبی ہیں " مسز جوجو نے اپنے چچیرے بھائی سے کہا۔ جو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نور جہاں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

" آنکھیں ضرورت سے زیادہ بڑی ہیں " ڈاکٹر رام متی رئیس اعظم نرنگر سے مخاطب ہوئیں " اور خالی خالی ہیں "

نرنگر نے نہایت دلچسپی سے نور جہاں کی جانب دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

" بشرے سے نہایت جاہل معلوم ہوتی ہے نرنگر صاحب۔ علم سے عورت کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے " ڈاکٹر رام متی دراصل یہ کہنا چاہتی تھیں " اب میری طرف ہی دیکھئے یورپ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے رکھی ہے میں نے "

نور جہاں شری بالمکند کے پاس آ بیٹھی۔

" لالہ جی، مجھے ڈاکٹر نے بکری کے دودھ میں نہانے کے لئے کہا ہے کہیں سے انتظام کر دیجئے نا "

" کیوں نہیں مس نور، کیوں نہیں " شری بالمکند نور جہاں کے قدموں کے آگے شہدوشکر کی چادر کی مانند بچھ گئے اور بکری کے دودھ کی خاصیتوں کی گنتی کرنے لگے۔

" بات تو یہاں ختم ہوتی ہے بکری " بیچارے راجہ دریسین بلڈ پریشر کے مریض کی سی شکل بنا کر کہنے لگے " کہ عورت کا جسم اس کی خوبصورتی کی روح ہے " مسز کلا کلی غصے سے اپنے سنہری بالوں کو پیچھے جھٹکتے ہوئے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

سب مرد مس نور جہاں کی مسکراہٹوں سے گدگدی سی محسوس کر رہے تھے۔ مس نور جہاں کا بوائے فرینڈ ذاکر حسین حاضرین کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔ گویا اس نے کوئی نہایت عمدہ شعر پڑھا ہو۔

ناچ کے لئے آرکسٹرا کی دھنیں انگڑائیاں لیتے ہوئے بیدار ہوئیں، تانہ دم جھومیں اور بے خود ہو کر دیوانہ وار بجنے لگیں۔

اپنا اپنا ساتھی لے سب ناچنے لگے۔

" وہ دیکھئے، کلا کلی اپنی موٹی ناک سے اپنے ساتھی کے کوٹ پر لٹکتی ہوئی گلاب کی کلی کو سونگھ رہی ہے۔ مجھے چپٹی ناک والی ہر عورت سے نفرت ہے " بیچارے راجہ دریسین کے بازوؤں میں ناچتے ہوئے نور جہاں اس کے کانوں میں اپنا پسندیدہ گیت گنگنا رہی تھی۔

" مجھے تو یہاں کوئی خوبصورت عورت نظر نہیں آتی " مس راؤ جی نے ذاکر حسین کے ساتھ ناچتے ہوئے کہا۔

" تم جو ہو "

مس راؤ جی کا فربہ جسم خوشی سے مزید پھیل گیا۔ اس کی آنکھیں ذاکر حسین سے کہنے لگیں " میں تو دوسروں کی بات کر رہی ہوں "

ڈاکٹر رام متی اور شری بالمکند ناچ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔

رام متی بگڑ گئیں: " لالہ جی، ذرا دیکھئے یہ کند ذہن عورتیں اپنی خوبصورتی کے باوجود کتنی بھدی لگ رہی ہیں۔ آپ مان جائیے علم بڑی چیز ہے۔ جاہل عورت کی خوبصورتی کی [illegible] جہالت ہے "

"یہی تو میں کہنا چاہتا ہوں رام متی جی" شری بالکند کے اندر جو کی ویسی بیڑ کے بخارات بکری کے دودھ میں گھلنے ملنے لگے۔ "مس رام متی، یہ چھالی چھوکریاں آپ کے سامنے کیا ٹھہریں گی۔ آپ کے روپ میں میٹھی ہوئی دو بیانے آپ کے جوبن کو امر کر رکھا ہے۔" شری بالکند نے فرطِ جوش میں ڈاکٹر رام متی کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ "آپ ان سب سے زیادہ خوبصورت ہیں۔"

ڈاکٹر رام متی اپنی تعریف سن کر حادثاً کرسی پر اکڑ کر بیٹھیں جیسے وہ کلاس میں اپنا لیکچر ختم کرنے کے بعد اترانے لگتی تھیں۔ "میں ان خوبصورت لڑکیوں سے خود کو بہت زیادہ خوبصورت سمجھتی ہوں کیونکہ کسی سندر لڑکی کو دیکھ کر میں اس سے جلنے نہیں لگتی ہوں، اور پھر یہ سب اتنی سندر بھی تو نہیں ہیں۔"

"رام متی جی، آپ ان سب سے زیادہ سندر ہیں۔" شری بالکند ڈاکٹر رام متی کا ہاتھ دبانے لگے۔ اسی اثنا میں ناچنے والوں میں چاروں طرف شور مچ گیا۔ مرد ایک طرف ہٹنے لگے۔ عورتیں ایک دوسرے کا منہ نوچنے لگیں۔ شور بڑھتا چلا گیا۔ کلاکلی نے نور جہاں کے دائیں کندھے پر اپنی منتسی جمادی۔ شستی نے غصہ سے بے تاب ہو کر اپنی پرانی دشمن جو جو کی ساڑھی کا ایک حصہ پھاڑ دیا۔ مس راؤ جی مسز راج کے بال نوچ نوچ کر اکھیڑنے لگی۔

"بڑی آئی بڑی بنی پھرتی ہے۔"

"ذرا اپنی شکل تو دیکھو۔"

"بیوٹی کمپیٹیشن جیتنے آئی ہے۔"

یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان خوبصورت بلاؤں کی چیخوں سے ڈیک کریچر کے ہال نے بھی اپنے کان بند کر لئے ہیں۔

"بھئی آخر بات کیا ہوئی؟" ڈاکٹر رام متی ایک کر راجہ ویریسین کے پاس اکھٹری ہوئیں۔

راجہ ویریسین کہنے لگے۔ "ناچتے ہوئے نور جہاں کا پاؤں کلاکلی کی ساڑی پر آ گیا۔ کلاکلی نور جہاں کو کاٹنے کو دوڑی اور پھر شستی پر آ گری۔ شستی جیتی ہوئی جو جو پہلا ہی سب ایک دوسرے کے خلاف بھری بیٹھی تھیں سو یہ دھینگا مشتی شروع ہو گئی۔"

"رک جاؤ!" ڈاکٹر رام متی نے یونیورسٹی کلاس میں حکم دینے کے انداز میں باآوازِ بلند کہا۔

"رک جاؤ!" سٹی کلب کی مجلس عاملہ کے صدر کے منہ سے صدائے بازگشت پیدا ہوئی۔

"رک جاؤ!" مجلس عاملہ کے دیگر اراکین کے منہ بھی خود بخود بول اٹھے۔

آخر سب عورتوں کو رکنا پڑا!

"خوبصورت عورتیں یوں نہیں لڑا کرتیں۔ لڑنے کا بھی کوئی خوبصورت ڈھنگ ہونا چاہئے۔" ڈاکٹر رام متی کی گرجدار آواز بہت پُرخشونت ہوئی۔ "میں سمجھتی ہوں کہ تم میں سے خوبصورتی کے انعام کا حقدار کوئی بھی نہیں ہو سکتا۔" ڈاکٹر رام متی نے دیگر دونوں ججوں کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں چیلنج کرنے کے انداز میں پوچھا۔ "کیا آپ مجھ سے متفق ہیں۔؟"

"سو فیصدی۔" شری بالکند نے فوراً جواب دیا۔ اور راجہ ویریسین نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مگر ٹھہریئے! وہ نوجوان عورت کون ہے؟" ڈاکٹر رام متی نے تھوڑی دور ایک میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں ایک لڑکی کسی نوجوان کے ساتھ چپ چاپ بیٹھی آنکھیں پھیلا پھیلا کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ "یہ خاموش لڑکی بظاہر شاید اس قدر خوبصورت نہیں ہے لیکن اپنی خاموشی اور سکون کی وجہ سے یہاں لڑتی جھگڑتی تتلیوں سے کہیں زیادہ سندر نظر آ رہی ہے۔ میں اسی لڑکی کو خوبصورتی کے انعام کا حقدار سمجھتی ہوں۔ کیا آپ مجھ سے متفق ہیں؟" ڈاکٹر رام متی نے پھر چیلنج کرنے کے انداز میں [illegible] سے پوچھا۔ جواب میں دونوں نے سر ہلا دیئے ——— مرد تالیاں بجانے لگے۔ عورتوں نے منہ سکیڑ لئے۔

"مبارک باد خوبصورت خاتون!" مجلس عاملہ کے صدر نے اس لڑکی کو قریب بلا کر کہا۔ "آپ کو [illegible] نظر آ رہے ہیں۔ شاید آپ [illegible] کچھ کہنا پسند کریں گی؟"

"مگر [illegible] کے ساتھ بیٹھا ہوا نوجوان [illegible] لگا۔ "مگر میری بہن بیچاری [illegible] ہے۔" ——— مجلس عاملہ [illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible]

جاں کاش

بیراگی کی رام کہانی

آج سے پندرہ سال پہلے کا واقعہ ہے۔

شیکھر نے ششی سے کہا۔ "ششی ڈیر! میں تمھیں چاند میں دیکھتا ہوں! تمھارا نام بھی چاند ہے اور تم خود بھی چاند! اماوس کی اندھیری رات میں تو تم اور بھی خوبصورت نظر آتی ہو۔ جب تارے چھپ جاتے ہیں اور صبح نیم باز آنکھوں سے دھرتی کی طرف دیکھتی ہے تب میں تمھارا تصور کرتا ہوں اور بادِ صبا کے نشیلے جھونکے میری روح میں ایک نامعلوم سی کسک بھر دیتے ہیں۔ تم کتنی حسین ہو ششی!"

ششی نے اپنی غزال سی آنکھوں میں دنیا کا سارا پیار بھر کر جواب دیا۔ "شیکھر! میں تو تمھارا سایہ ہوں تمھارا خیال ہی مجھے مست کر دیتا ہے۔ ہم تم تو جنم جنم کے ساتھی ہیں! میری سانس سانس میں تمھاری خوشبو ہے، روئیں روئیں میں تمھاری پیاس ہے! تم نے تو مجھ پر جادو سا کر دیا ہے۔ تم جادوگر ہو۔ تم نے تو میرا سب کچھ مجھ سے چھین لیا ہے۔ تم میرے ارمانوں کے چاند ہو! میری کنواری حسرتوں کے پھول ہو! میرے سپنوں کے دولہا ہو! میری جیون نیا کے مانجھی ہو! ... تم میرے سب کچھ ہو شیکھر! سب کچھ ..." اور یہ کہہ کر وہ شیکھر کے سینے سے لگ گئی۔

شیکھر نے اس کے رخساروں کو تھپتھپا دیا۔ اور اس کے ریشمیں بالوں کو سہلاتے ہوئے مسکرا کر بولا "تم نے مجھے گیت لکھنے کے جذبات و احساسات عطا کئے! تم نے میری بیقرار روح کو نغمہ اور زبان دی! تم کتنی پیاری ہو! ... کتنا عظیم احسان کیا ہے تم نے مجھ پر! ... میری زندگی کا ہر سانس تمھارا ممنون رہیگا۔ ابد تک ... تم ہی میری شاعری ہو! تم ہی میرے گیت ہو! تم ... !" اور فرطِ جذبات سے بے خود ہو کر اس نے اپنی محبوبہ کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

میں نے دونوں کو دیکھا اور بے اختیار مسکرا دیا۔

شیکھر اور ششی کی کہانی میں کیوں سنا رہا ہوں؟ ... آپ یہ جاننے کے لئے بے تاب ہوں گے۔ سچ پوچھئے تو میں ایک صدیوں بوڑھا جوگی ہوں۔ اور دنیا کے دکھ سکھ کو ایک تماشبین کی طرح دیکھنا میری فطرت بن گئی ہے۔ میں نے نہ جانے کتنے ہنگامے دیکھے ہیں اور نہ معلوم کتنی صدیاں میرے [illegible] کو چھوتی ہوئی گزر گئیں [illegible] دیکھا ہے [illegible] سے محبت کرتے اور دھلتے [illegible] ... ازلی اور ابدی کھیل کو دیکھتے دیکھتے میری آنکھیں پتھرا گئی ہیں [illegible] ہولناک مناظر دیکھے ہیں [illegible] سنجیدہ لمحات میں [illegible] سوچا ہے، محبت [illegible] ہے، جو کبھی ختم نہیں ہوتا؟ یہ کیسی وادی [illegible] ہے جہاں یکطرف زندگی اور دوسری طرف موت ہے، اور زندگی اور موت کی [illegible] ہر لمحے چلتی رہتی ہے؟

میں نے اس جادوگر کے بارے میں بھی سوچا ہے، جو اس سارے ناٹک کا خالق ہے، اور جو [illegible] کتنا عجیب مذاق ہے اس کا، جو کروڑوں برسوں سے ایک ہی ناٹک لکھتا اور اسٹیج کرتا آرہا ہے!

جب اس نے میری تخلیق کی تھی، میں نے اس سے پوچھا تھا۔ "مجھے کب تک نجات ملے گی میرے مالک؟"
وہ مسکرایا تھا۔ پھر ہنس کر بولا تھا۔ "تمہاری تخلیق نجات کے لئے نہیں کی گئی ہے! تم میرے ناٹک کے واحد تماشبین ہو۔ جب تک یہ ناٹک چلتا رہیگا تمہیں چھٹی کیسے مل سکتی ہے؟"

میرے دل پر گویا ہمالیہ رکھ دیا گیا ہو۔ میں نے قدرے گلوگیر لہجے میں کہا تھا۔ "یہ میرے کس گناہ کی سزا ہے؟"
"ارے بھئی! اس قدر گھبرا کیوں رہے ہو؟" اس نے ایک زور کا قہقہہ لگایا تھا۔ "اگر تم ناٹک کے مناظر سے دلچسپی لیتے رہے، تو تم کبھی نہیں اُدبوگے۔ میں کیا کوئی نادان لکھنے والا ہوں؟"

میں نے سر جھکا کر اس کے حکم کو لبیک کہا تھا اور زمین پر چلا آیا تھا۔
لیکن ——— یہ کیسی زمین ہے؟ . . . . . کیسی دھرتی ہے یہ؟ . . . . . یہاں میں نے کبھی امن و امان نہیں دیکھا کبھی طویل وقتی سکھ اور مسرت نہیں دیکھی۔ خالق نے کہا تھا۔ "دھرتی پر ایک عجیب جانور ہے ——— انسان! اور دھرتی کی سب سے حیرتناک چیز ہے اس انسان کا دل! . . . . . تم کبھی کبھی انسانی دل کے کرشمے بھی دیکھا کرنا!"
ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ میری بوڑھی آنکھیں خدا کی دنیا دیکھتے دیکھتے اور بھی دھندلی ہو گئی ہیں۔ گھومتے گھومتے میرے پاؤں تھک گئے ہیں، میں سر تا پا رعشہ زدہ ہو چکا ہوں۔ لیکن خدا مجھے واپس نہیں بلا رہا ہے مجھے نجات نہیں مل رہی ہے صدیوں سے میں اپنے خالق کے حکم کی تعمیل کرتا آ رہا ہوں۔ میری عمر ختم ہی ہونے کو نہیں آتی۔ خالق اسے بڑھائے جا رہا ہے۔ بڑھائے جا رہا ہے۔ اور میں جئے جا رہا ہوں۔
اس دن خالق نے میرے بہرے کانوں میں چلا کر کہا۔ "لو اب تم چلو نئے زمانے کا دیوتا سائنس آ رہا ہے۔ اب اپنی جگہ اسے دیدو۔"
میں نے انکساری سے کہا۔ "یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے میرے آقا! . . . . لیکن پندرہ سال کا عرصہ مجھے اور چاہیئے۔"
"پندرہ سال!" خالق ششدر رہ گیا۔ پوچھا۔ "کیوں بھئی! تم تو جانے کب سے اپنی نجات کے خواہاں تھے۔ یکایک دھرتی سے تمہیں اس قدر محبت کیوں ہو گئی؟" میں نے ششی اور شیکھر کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ "میرے آقا! مجھے ان دونوں سے ممتا سی ہو گئی ہے۔ تمہارے ناٹک میں قتل، خوں ریزی اور غارت گری، تباہی اور بربادی اور حیوانیت اور شیطنت کے اتنے سارے مناظر دیکھتے دیکھتے میرا دل خالی خالی سا ہو گیا ہے۔ میں کسی میٹھی یاد کے ساتھ دھرتی چھوڑنا چاہتا ہوں۔"
"بہت اچھا ایسا ہی ہوگا۔" اور خالق مسکرا دیا۔
ششی کے انگ انگ سے جوانی پھوٹی پڑتی ہے۔ چہرے پر حسن لوٹ لوٹ جاتا ہے۔ اس کی ہنسی اتنی دلفریب ہے کہ خوشبوؤں کی بھی نیند ٹوٹ جائے۔ اس کی مدبھری آنکھوں میں ایسی موہنی ہے کہ بڑے سے بڑے زاہدوں کے بھی قدم ڈگمگا جائیں۔ اسے دیکھ کر خالق کی فنکاری کا لوہا ماننا ہی پڑتا ہے۔ دوسری طرف شیکھر بھی خوبصورتی کا مجسمہ ہے گورا رنگ، گھنگھریالے بال اور ———
نامعلوم کب اور کیسے ان دونوں کا آپس میں تعارف ہوا اور دونوں کیوپڈ دیوتا کے تیروں کا شکار ہو گئے۔ جب وہ دونوں جدا ہو کر اپنے اپنے گھر کی طرف چلے۔ تو میں نے ششی کا پیچھا کیا۔ یونیورسٹی پارک سے نکل کر وہ جس بنگلے میں داخل ہوئی وہ کسی پروفیسر کا بنگلہ تھا۔ اتنا معلوم ہوا کہ وہ ایک کماتے پیتے پروفیسر کی اکلوتی اولاد تھی۔

ڈاکٹر اس کی ڈیوٹی رات کی ہوتی ہے۔

ایک دن آدھی رات کو جب میں نے کھڑکی سے شیکھر کو محویت کے عالم میں لکھتے پایا تو میری بے تابی بے پناہ ہو گئی اور جب میں نے نزدیک جا کر دیکھا تو ایک گیت کی کچھ سطور پڑھنے کو ملیں۔ شیکھر اپنی محبوبہ بخشی پر ایک جذباتی گیت لکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ ان دونوں کو بیاہ کے بندھنوں میں بندھتے ہوئے دیکھ کر میں اپنے کام سے چھٹی لے لوں گا اور زیادہ یہاں رہ کر کیا کروں گا۔ جو چیز ساتھ لیکر میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں، وہ مجھے مل ہی جائے گی۔

لیکن ایک سال نہیں گزرا تھا کہ مجھے ایک اور چوٹ پہنچی۔ بخشی کی شادی ایک اعلیٰ سرکاری افسر سے ہو رہی تھی۔ شہنائی کی آواز سن کر میں پروفیسر صاحب کے بنگلے میں داخل ہوا اور وہاں منڈپ میں بخشی کو ایک خوبصورت جوان کے پہلو میں بیٹھے پایا۔ معلوم ہوا کہ وہ جوان کوئی آئی۔ اے۔ ایس افسر ہے۔ وہاں سے دوڑا دوڑا میں شیکھر کے پاس گیا۔ دیکھا کہ وہ تکیے میں منہ چھپائے سسک رہا ہے۔ مجھے اس کی حالت پر بڑا رحم آیا اور میں سرتاپا اس کے تئیں پیار و شفقت سے بھر اٹھا۔ دل میں آئی کہ اُسے سینے سے لگا لوں اور اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہوں۔ "میں تمہارے دُکھ کو سمجھتا ہوں بیٹا! لیکن تم اس میں اور جلوگے تو یہ تمہارے اندر کے شاعر کو آبِ حیات بخشے گا اور تم دنیا میں امر ہو جاؤگے! .... میں جانتا ہوں یہ سب کیوں ہوا! تم شاید سو روپے ماہانہ مشاہرہ پاتے ہو اور تم سے تمہاری محبوبہ کو چھیننے والا آدمی شاید ہزار پاتا ہو! مگر! .... دولت محبت کو شکست دے گئی!"

لیکن میں کچھ بھی کہہ اور کر نہ سکا اور۔ "اف! کتنا بُرا زمانہ آگیا ہے کہ انسان کی قیمت پیسوں سے لگائی جاتی ہے!" بے اختیار یہ سوچتا ہوا ڈگمگاتے قدموں سے وہاں سے چلا آیا۔ اب میں خود پر لعنت بھیج رہا تھا کہ میں نے خدا سے پندرہ سال کا مزید عرصہ کیوں مانگ لیا؟

وقت گزرتا رہا ــــ اور پورے پندرہ سال گزر گئے۔

میں نہیں جانتا کہ یہ پندرہ سال میں نے کس بے کیفی کے عالم میں گزارے تھے۔ اگلے دن مجھے دنیا سے واپس جانا تھا۔ سوچا کہ جانے سے پہلے کیوں نہ ایک مرتبہ شیکھر اور بخشی کو دیکھ لوں....؟

بڑی مشکل سے پتہ لگا۔ بخشی نئی دہلی میں اپنے خاوند کے پاس تھی۔ اس کا خاوند اور بھی اونچا افسر ہو گیا تھا اور شاید چار ہزار روپے ماہانہ تنخواہ پاتا تھا۔ ایک موٹی سی اور ادھیڑ سی عورت کو دیکھ کر میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ پانچ چھ لڑکے بنگلے کے لان میں دوڑ رہے تھے۔ میں نے ان میں سے بڑے لڑکے سے پوچھا۔ "شنشی رانی یہیں رہتی ہیں کیا؟"

بارہ تیرہ سال کے اس لڑکے نے پہلے مجھے گھورا۔ پھر بولا۔ "آپ ممی کو کھوج رہے ہیں نا! وہ تو برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھی ہیں۔ آپ نہیں پہچانتے کیا؟"

مجھے ایسا محسوس ہوا گویا کسی نے میری کنپٹی پر گھونسہ مار دیا ہو۔ سوچا کہ کیا یہ وہی بخشی ہے جس کے حسن و شباب کو دیکھ کر میں نے خدا کی فنکاری کی بے ساختہ داد دی تھی؟

بغیر کچھ کہے، میں وہاں سے بھاگ آیا۔ پھر میں نے شیکھر کی تلاش کی۔ معلوم ہوا کہ وہ فلم لائن میں ہے اور ایک بہت بڑا فلم نویس اور ڈائرکٹر ہو گیا ہے۔ اس کی عالیشان رہائش گاہ دیکھ کر میں سہم گیا۔ کمرے میں جھانک کر دیکھا تو وہ کسی جوان عورت کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ رہ رہ کر وہ کچھ ایسی حرکتیں کرتا تھا کہ شرم سے میری آنکھیں جھک جاتی تھیں۔ مجھے سمجھتے ذرا بھی دیر نہ لگی کہ وہ عورت کوئی ایکٹرس لگتی ہے جو ہیروئن بننے کے چکر میں اپنا سب کچھ گنوانے پر کمربستہ ہے!

میں نے اپنی اور [illegible] کو [illegible] دیکھا۔ نہیں.... [illegible]

ہے! ـــ وہ ایک شاعر فطرت اور پاکیزہ کردار کا حامل شخص۔ اور یہ ایک گناہ و معصیت کے بحرِ بیکراں میں غرق بدکار انسان! ـــ اور سارا منظر مجھے ایک کارٹون سا لگا۔ میں نے سوچا کہ پندرہ سال کیا میں ایسے ہی منظر دیکھنے کے لئے دھرتی پر بیکار رہا؟ ـــ اور میں اپنی حماقت پر مسکرا دیا۔

آج جب نیا زمانہ مجھ سے چار چائے پینے آیا تو میں نے اس واقعے کا ذکر اس سے کیا۔ وہ قہقہہ لگا کر بولا "بھائی تمہاری عقل کو دیمک لگ گئی ہے آج کے زمانے میں تم محبت، اور وہ بھی سچی، دائمی . . . . نہ جانے کیسی کیسی محبت ڈھونڈتے ہو! بوڑھے میاں، ہائیڈروجن بم پھٹنے سے پہلے اس زمین کو چھوڑ کر سورگ میں بھاگ جاؤ۔ اور وہاں جا کر کارسازِ عالم سے کہنا کہ نئی دنیا کی تخلیق کے لئے تیار رہے۔ آج کے مادی انسان بہت جلدی اس کی موجودہ تخلیق کو نیست و نابود کرنے والے ہیں!"

آغا عادل ندیم

ایکانکی تمثیل

ڈھلوان

افراد

فرحت ——— آفتاب

اور

ایک ملازم

منظر

منظر کسی کوٹھی کے ایک کشادہ کمرے میں کھلتا ہے۔ جو درمیانہ قسم کے فرنیچر سے آراستہ ہے ہر چیز سلیقہ اور صفائی سے رکھی گئی ہے۔ پردہ اٹھنے کے بعد ہمیں فرحت اور آفتاب دونوں نظر آتے ہیں۔ دونوں کی شکل و صورت کی مشابہت یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ دونوں سگے بھائی ہیں لیکن فرحت نسبتاً کمزور اور زیادہ عمر کا ہے اس کی دونوں ٹانگیں یا تو کٹی ہوئی ہیں یا مفلوج ہیں جنھیں اس نے پہیوں والی کرسی کے دونوں بازوؤں تک ڈھکے ہوئے کمبل سے چھپا رکھا ہے۔ آفتاب جو اس وقت شب خوابی کے لباس میں ملبوس ہے سامنے ہی صوفہ پر نیم دراز ہے دونوں پریشان اور بے چین سے نظر آتے ہیں۔

پردہ اٹھنے کے بعد کچھ دیر تک اسٹیج پر مکمل خاموشی طاری رہتی ہے اس دوران میں فرحت اپنی پہیوں والی کرسی کی پشتی سہارے سے سر ٹیک کر چھت کو بے معنی نگاہوں سے گھور رہا ہے اور آفتاب صوفے کے بازو کو تذبذب کے عالم میں ٹٹول رہا ہے۔

آفتاب:۔ تو پھر آپ گاؤں جانے پر بضد ہیں بھائی جان؟

فرحت:۔ (دکھ بھرے انداز میں) ہاں۔

[illegible]

آفتاب:۔ سوچئے تو بھائیجان، عاطفہ آج آرہی ہے۔ میل رات کے گیارہ بجے آتا ہے۔ صبح ہم سب اکٹھے ناشتہ کریں گے اور ــــ

فرحت:۔ لیکن میرا فوراً چلے جانا ہی بہتر ہے آفتاب۔ تم نہیں جانتے کہ میدانِ جنگ پر گونجتے ہوئے طیاروں، سنسناتی ہوئی گولیاں اور گرجتی ہوئی توپوں نے میرے قلب و ذہن کو تہہ و بالا کر ڈالا ہے۔ اور اب مجھے سکون کی ضرورت ہے۔ مجھے سناٹا چاہیئے خاموشی، سکوت۔ کچھ دن گاؤں کے ویرانوں میں رہوں گا۔ اور ابھی تم بھی یہیں ہو اور ــــ عا ــــ عاطفہ بھی۔

آفتاب:۔ (وقفہ کے بعد) آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ فرحت بھائی جان، لیکن گاؤں سے لوٹنے کے بعد آپ ہم دونوں میں سے کسی ایک ہی کو یہاں پائیں گے ــــ یا مجھے ــــ یا عاطفہ کو۔

فرحت:۔ پھر وہی پاگلوں کی سی باتیں۔

آفتاب:۔ پاگلوں سے بدتر ہوں میں اس وقت بھائی جان۔ آپ نہیں جانتے جو مجھ پر بیت رہی ہے آپ کے ذہن کا سکون میدانِ جنگ میں پھٹتے ہوئے بارود اور تڑپتی ہوئی انسانی لاشوں نے ہی برہم کیا ہے۔ لیکن میں ــــ میرے (تذبذب کے عالم میں صوفہ سے اٹھ کر ادھر اُدھر کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے) لیکن میرے ذہن میں شورش اور اضطراب کی جو بجلیاں کوندرہی ہیں آپ شاید اندازہ نہ کرسکیں۔ اسی لئے تو کہہ رہا ہوں بھائیجان۔ آپ کم از کم ایک روز اور یہاں ٹھہر جائیے۔ آپ کی موجودگی میری بہت سی الجھنیں دور کردے گی ــــ عاطفہ کے آنے تک ٹھہر جایئے۔

فرحت:۔ (طنزیہ مسکراکر) یہ الجھنیں نہیں، ناسمجھی اور کج فہمی ہے۔ آفتاب ــــ تمہیں عاطفہ کی وفا پر اگر اب بھی بھروسہ نہیں تو ظلم ڈھا رہے تم۔ گناہ کے مرتکب ہو رہے ہو۔

آفتاب:۔ لیکن وہ خطوط ــــ

فرحت:۔ خطوط، خطوط ــــ رٹے ہوئے طوطے کی طرح بار بار وہی لفظ دہرائے جارہے ہو ــــ (وقفہ) ــــ وہ خطوط ہی تو عاطفہ کو ایک نیک اور باوفا بیوی ثابت کرتے ہیں آفتاب ــــ تم خود ہی تو کہتے ہو کہ عاطفہ نے ان خطوط میں کہیں بھی واصل کی محبت کا اقرار نہیں کیا ــــ اُن خطوط پر زہریلے ناگ کی طرح کنڈلی مار کر تم تمام گھر بھر کا سکون درہم برہم کر رہے ہو ــــ فوراً پھونک ڈالو انہیں۔

آفتاب:۔ ہاں، میں نے کب کہا ہے فرحت بھائیجان کہ مجھے عاطفہ کی وفا پر بھروسہ نہیں، عاطفہ نے اپنے ان خطوط میں واصل کو ایک بار نہیں ہزار ہا بار دھتکارا ہے ہر خط میں اس نے یہی لکھا ہے کہ وہ اپنی رگ رگ سے محبت کی جس نچوڑ کر میرے قدموں پر نثار کرچکی ہے ــــ واصل کے ہر خط کے جواب میں اس نے میری محبت اور میری وفاؤں کو بار بار دہرایا ہے، پھر بھی ــــ بھائی جان ــــ پھر بھی مجھے یہ غم کھائے جارہا ہے کہ میں واصل اور عاطفہ کے درمیان آہنی دیوار بن کر کھڑا رہا ہوں۔ واصل کی موت کا ذمہ دار میں ہی ہوں ــــ اور مجھے ــــ مجھے یہ موہوم اندیشے گھیرے ہوئے ہیں ــــ کہ ــــ کہ عاطفہ ــــ عاطفہ بھی ــــ ایک روز ــــ

فرحت:۔ (گھبراہٹ میں بات کاٹ کر) کیا ــــ؟

آفتاب:۔ (کچھ وقفہ کے بعد گہری سوچ میں) عاطفہ بالکل بدل کر رہ گئی ہے۔ بھائیجان ــــ وہ مٹتی ہوئی موم بتی کی طرح گھلتی جارہی ہے ــــ اسے واصل سے محبت تھی ــــ یہ خیال میرے ذہن میں پختہ ہوتا جارہا ہے۔ عاطفہ واصل سے محبت کرتی تھی، اس نے اپنی محبت کو، اپنی جوانی کو زوجیت کے کٹھن فرائض پر قربان کردیا۔ وہ [illegible] محبت

نہیں کرتی — نہیں کرتی بھائی جان — نہیں کرتی (قدرے جذباتی ہو کر) اس نے بھینٹ دی ہے (نیم مردہ اور نڈھال ہو کر کرسی میں دھنس جاتا ہے) محض بھینٹ دی ہے۔ اور میں — میں محض مورت ہوں۔ پتھر کی مورت، بے جان مبے حس۔

فرحت۔ لیکن تم کہتے ہو عالمہ بالکل بدل گئی ہے۔

(اثبات میں گردن ہلاتا ہے)

کیسے۔ کیا وہ تم سے بے رخی — (چپ ہو جاتا ہے)

آفتاب۔ نہیں نہیں بھائی جان — بلکہ وہ اور بھی زیادہ — پہلے سے کہیں زیادہ وہ میری دلجوئی میں لگی رہتی ہے، میری چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتی ہے — لیکن — لیکن میں اسے ہر روز، ہر لحظہ، لمحہ بہ لمحہ زیادہ دور محسوس کرتا جا رہا ہوں — پرائی، پرائی سی۔ جیسے میں زہریلے ناگ کی طرح اس کے سینہ پر کنڈلی لگا کر بیٹھ گیا ہوں۔ اس کی جوانی کو آہستہ آہستہ ڈسے جا رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے۔

فرحت:۔ تم پاگل ہو رہے ہو۔

آفتاب:۔ (بغیر سنے بدستور) مجھے معلوم ہے کہ اس کی پشت پر گذشتہ محبت کا تیز خنجر پیوست ہے — اور سینہ پر میں — میں ایک خاوند کی حیثیت سے اپنے فرائض کی کٹار لئے بیٹھا ہوں — اور وہ اُن دونوں کٹاروں کے درمیان زندگی کے فاصلے ناپ رہی ہے۔

فرحت:۔ تم علیل ہو آفتاب — مکروہات اور غلط خیالوں نے تمہارے ذہن کو جکڑ لیا ہے۔ تم پاگل ہو رہے ہو۔ دیوانے۔

آفتاب:۔ میں اب عالمہ کو زیادہ اذیت نہیں دے سکتا۔

فرحت۔ مطلب —؟

آفتاب۔ میں اسے آزاد کر دینا چاہتا ہوں۔

فرحت:۔ یعنی۔

آفتاب:۔ طلاق۔

فرحت:۔ احمق۔

آفتاب۔ نہیں بھائی جان۔

فرحت:۔ لیکن اب واصل مر چکا ہے۔ اب اگر جو کچھ تم کہتے ہو۔ سچ بھی ہے تو کیا حاصل۔ بیکار۔

آفتاب۔ ہاں۔ کاش یہ راز مجھے پہلے معلوم ہو جاتا — میرا مطلب ہے شادی سے پہلے — تو — تو۔

فرحت:۔ (پہیوں والی کرسی کو ذرا آگے لا کر حیرانی سے) تو کیا یہ راز تمہیں بعد میں معلوم ہوا۔

آفتاب:۔ محض اس وقت، جب واصل نے اپنے آخری خط کے ساتھ ساتھ عالمہ کے تمام خطوط اسے واپس بھیج دیئے تھے۔ اس کے ایک سال بعد۔

فرحت۔ سچ؟

فرحت:- ذرا صاف صاف کہو (چہرے کی پریشانی بڑھ جاتی ہے)

آفتاب:- میں نے واصل کو زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ بس یہ جانتا ہوں کہ دوسری عالمگیر جنگ میں وہ محاذ پر گولیوں اور بموں کی بارش میں بھی عاطفہ ہی کے لئے جیتا رہا۔ تخیل میں آشاؤں کے سنہری تار بنتا رہا۔ کاش کے سپنے دیکھتا رہا۔ اس کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ خاندانی جھگڑوں یا نجی معاملات نے اسے محاذ پر جانے کے لئے مجبور کیا تھا (اٹھنے لگتا ہے) ٹھہرئیے، وہ خطوط والا بنڈل لاتا ہوں۔ عاطفہ کی غیر موجودگی میں ہم آسانی سے پڑھ سکیں گے

فرحت:- (گھبرا کر) نہیں، نہیں آفتاب، میں وہ خطوط نہیں دیکھنا چاہتا، تم سب کچھ زبانی سناؤ۔

آفتاب:- جن دنوں آپ والد مرحوم سے جھگڑ کر چپکے سے فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔

فرحت:- (بات کاٹ کر) اصل بات کی طرف آؤ۔

آفتاب:- میں نے عاطفہ کو عشرت کی شادی پر دیکھا اور ـــ (گردن جھکا کر) اور اس پہلی دید کا نتیجہ آپ جانتے ہی ہیں پھر اگلے ماہ ہی ہماری شادی ہو گئی ـــ میں نے اپنے خوابوں کی تعمیر میں واصل اور عاطفہ کے سپنوں کے محلوں کو بے دردی سے ڈھا دیا۔ کاش مجھے پہلے معلوم ہوتا ـــ کاش ـــ!

فرحت:- تم بے قصور ہو آفتاب، تم انجان تھے، تم کہتے ہو کہ شادی کے دو سال بعد تمہیں یہ راز معلوم ہوا۔ کیوں

آفتاب:- جی ـ ایک سال بعد ایک دن عاطفہ کی غیر موجودگی میں مجھے واصل کا بھیجا ہوا پیکٹ ملا۔ غیر ملکی ٹکٹوں کو دیکھ کر میری تشویش بڑھی اور میں نے پیکٹ کھول لیا۔ اس میں عاطفہ کے خطوط اور واصل کا آخری خط تھا اور گلاب کا ایک سوکھا ہوا پھول۔ اس نے لکھا تھا کہ اگلے دن وہ محاذ کے اس حصہ پر جا رہا ہے جہاں سے اس کا لوٹنا ناممکن ہے۔

فرحت:- ان باتوں کو چھوڑو۔ پھر وہ پیکٹ تم نے عاطفہ کو دے دیا؟

آفتاب:- نہیں، ڈاک سے پھر عاطفہ کے نام بھیج دیا۔

فرحت:- پھر ـــ!

آفتاب:- میں عاطفہ کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا تھا۔

فرحت:- اس نے تم سے کچھ ذکر نہیں کیا۔

آفتاب:- نہیں ـ

فرحت:- پھر (عجلت میں)

آفتاب:- خطوں کا وہ پلندہ اس نے اپنے بکس کی تہہ میں رکھ لیا۔ اس روز وہ سارا دن اپنے دروازے بند کئے کمرے میں رہی، اس کی آنکھیں سوجی تھیں، چہرہ بھیانک طور پر زرد تھا، لبوں پر لرزشیں تھیں، پھر اگلے روز ہی وہ اجازت لے کر کچھ دنوں کے لئے اپنے والدین کے پاس چلی گئی۔

(فرحت آنکھیں پھاڑے پہیوں والی کرسی کو دھکیلتا ہوا آفتاب کے قریب آتا ہے)

اور پھر ذہن میں خفی سے اچھلتی اور

(عین اس وقت ملازم اندر داخل ہوتا ہے)

ملازم:- چھوٹے سرکار کا تمام سامان بندھوا دیا گیا ہے سرکار۔ گاڑی میں رکھوا دوں؟

فرحت:- رکھوا دو ۔۔۔ دو بجے میں یہاں سے چل دونگا۔

آفتاب:- آپ رکیں گے نہیں بھائی جان ۔۔ مجھے اس بے چینی اور تذبذب کے عالم میں ہی چھوڑ جائیں گے۔

فرحت:- (ملازم سے) تم جاؤ ۔۔ ہم ٹھیک دو بجے جائیں گے (آفتاب سے) نہیں آفتاب مجھے آج ضرور چلے جانا چاہیئے ۔ میں تمہاری الجھنیں دور نہیں کر سکوں گا ۔۔ گتھیاں اور الجھا دوں گا (چونک کر) معاف کرنا آفتاب ۔۔۔ محاذِ جنگ پر میرے ذہن کی قوت زائل ہو چکی ہے ۔۔ میں پتھر ہوں ۔ پتھر۔

(ملازم چلا جاتا ہے)

آفتاب:- عاطفہ نے آپ کو نہیں دیکھا ہے ۔ میں نے سارے صندوق ٹٹول ڈالے لیکن ابا حضور سے آپ اس ناراض ہوئے کہ اپنی تصویر تک بھی نہ چھوڑی جو مرتے وہ ہی دیکھ لیتے۔

فرحت:- تو پھر کیا ہوا ۔ عاطفہ کا ردِ عمل۔

آفتاب:- آپ رک بھی رہے ہیں یا نہیں۔

فرحت:- خدا تمہیں اور عاطفہ کو سلامت رکھے ۔ اپنی تمہاری شادی کی تصویر میں نے دیکھ ہی لی ہے ، خدا نے تمہیں خوبصورت ، خوبصیرت اور با وفا بیوی دی ہے ۔ گاؤں سے لوٹ کر باقی زندگی تمہارے ساتھ ہی گزار دوں گا۔

آفتاب:- صبح جب آپ آئے تو میں نے عاطفہ کو فوراً آپ کی آمد کا تار دیدیا تھا ، وہ ننھی کو لیکر دوپہر کی گاڑی سے چل دے گی ۔ میل یہاں رات کو گیارہ بجے پہنچتا ہے۔

فرحت:- پہلے وہ بات تو ختم کی ہوتی۔

آفتاب:- اس کے آگے کوئی اور بات ہے ہی نہیں بھائیجان۔

فرحت:- یعنی باقی تمہارا وہم ہی وہم۔

آفتاب:- اسے آپ وہم کہتے ہیں ۔۔ واصل بیچارہ سنسناتی ہوئی گولیوں کو اپنے سینہ میں سموئے میدان جنگ کا ہو رہا اس کا لہو میرے ہاتھوں پر جما ہوا ہے بھائیجان ۔ میں قاتل ہوں ۔ گناہ گار ۔۔ اس کے لہو کی بساندروز بروز تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔

فرحت:- (کچھ سوچ کر) فرض کرو کہ واصل زندہ ہو۔

آفتاب:- کاش ایسا ہوتا۔

فرحت:- تو تم کیا کرو گے ، تمہارا ردِ عمل کیا ہو گا ۔ فرض کرو۔

آفتاب:- میں یہ فیصلہ عاطفہ پر چھوڑ دوں گا (کچھ سوچ کر) نہیں ۔۔ میں ۔۔ اسے مجبور کر دوں گا کہ وہ فرائض کی کہ دیوار ڈھا دے اور اپنے پیار کا سہاگ بھر لے۔

فرحت:- دیوانہ وار ۔ جھوٹ سب جھوٹ تھا ۔۔ تم یہ نہیں کر سکتے آفتاب ۔ نہیں کر سکتے تم یہ سب کچھ ۔۔ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔

محبت ہے۔ میں یہ قربانی عاطفہ کی خاطر دوں گا۔ محبت کی قربان گاہ پر میں اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ دوں گا
سب کچھ قربان کر دوں گا سجاد بھیان ـــ سب کچھ ـــ عاطفہ کی خوشیوں کے لیے میں اپنے آپ کو جلا دوں گا تاکہ اس
کی زندگی کے چراغ کی سسکتی ہوئی لو پھر سے روشن ہو جائے ـــ اپنے آپ کو مٹا دوں گا تاکہ میرے ارمانوں کی خاک
پر اس کی امیدوں کے مسمار محل پھر سے تعمیر ہو سکیں ـــ میں سب کچھ کر لوں گا سجاد بھیان ـــ

فرحت:- (بڑبڑا کر زیر لب) قربانی ـــ قربان گاہ ـــ محبت ـــ فرائض (یکلخت چیخ کر) آفتاب ـــ ٹھہرو ـــ ٹھہرو
میں خود غرض ہوا جا رہا تھا، ظلم ڈھانے پر تل رہا تھا ـــ ٹھہرو ـــ ٹھہرو ـــ میں محبت، قربانیوں اور قربان
گاہوں کے فرائض بھول رہا تھا۔ واصل واقعی مر چکا ہے آفتاب ـــ واقعی مر چکا ہے۔ وہ اب کبھی زندہ نہیں
کبھی زندہ نہیں ہو سکتا۔

(دونوں مٹھیوں کو بھینچ کر)

اور ـــ اگر وہ زندہ ہوا بھی ـــ تو ـــ تو میں خود اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔ میں خود
اس کا سینہ گولیوں اور نشتروں سے چھلنی کر دوں گا ـــ تمہیں عاطفہ سے محبت ہے۔ تم سے عاطفہ کو دنیا کی کوئی
ہستی چھین نہیں سکتی ـــ کوئی بھی نہیں ـــ کوئی نہیں ـــ واصل مر چکا ہے ـــ (چیخ کر) واصل مر چکا ہے
(اور زیادہ چیخ کر) واصل مر چکا ہے۔

(فرحت اپنی پہیوں والی کرسی کو ہاتھوں سے دھکیلتا ہوا تیزی سے پچھلے دروازے
سے چلا جاتا ہے۔ آفتاب حیرت زدہ ہو کر سکتہ میں کھڑا ہے پردہ تیزی سے گرتا ہے)

سید محمد احمد سعید

○

گلوں کو خواہشِ نیرنگیِ بہار تو ہے
اک آرزو بہ نذرِ حسنِ اعتبار تو ہے

سوادِ رنگ و نظر تک ابھی غبار تو ہے
دل و نظر کو مگر شوقِ انتظار تو ہے

جہانِ وہم و گماں نذرِ طوق و دار تو ہے
نصیبِ رسمِ جنوں اِن کو اختیار تو ہے

جبیں جبیں میں وہی شوقِ سجدہ ریز لئے
قدم قدم پہ ابھی نقشِ پائے یار تو ہے

سکونِ دل تو نہیں لذتِ نگاہ سہی
فریبِ لطفِ نظر تک جمالِ یار تو ہے

نگاہِ شب میں کہاں رنگِ شعلۂ رخِ جام
لبِ سحر پہ مگر تشنگی کا بار تو ہے

فرید جاوید

○

تلخ گذرے کہ شادماں گذرے
زندگی ہو تو کیوں گراں گذرے

تھا جہاں مدتوں سے سناٹا
ہم وہاں سے بھی نغمہ خواں گذرے

مرحلے سخت تھے مگر ہم لوگ
صورتِ موجۂ رواں گذرے

چند لمحے خیال و خواب سہی
چند لمحے انیسِ جاں گذرے

کیوں نہ ڈھل جائے میرے نغموں میں
کیوں ترا حسن رائگاں گذرے

میرے ہی دل کی دھڑکنیں ہونگی
تم مرے پاس سے کہاں گذرے

کتنے خاموش خیال و نغمے جاوید
دل ہی دل میں نہاں نہاں گذرے

عبداللہ خاور

○

نقشِ گردوں کا خواب ہے گویا کرنوں کی تنظیم — قوسِ قزح ابھری، تو ہوئی ہے کلیوں میں تقسیم

لمحۂ بتاں پر شعلے دیکھے میری نگاہوں سے — میری نگاہِ شوق پہ کی ان شعلوں نے تنویم

دستِ طلب با وصفِ ساقی دور رہے ان سے دور — موجِ ہوائے گل سے ہوئی جن زلفوں میں ترمیم

حسن کے ہر جلوے میں بھرا میں نے رنگِ تقدیس — کلیوں کو مریم جانا ہے، شبنم کو تسنیم

پھر بھی دیارِ حسن میں ہے کیوں میری وفا بدنام — دل جیسے شعلے کو کیا ہے پابندِ تسلیم

کرنوں کی مہتاب سرا سے گذرے تھے اک بار — جب سے ہوئی ہے ہم پہ لازم، اس رخ کی تعظیم

منزل منزل تیرا تغافل، افسردہ راہیں — پھر بھی دلِ ناداں نے کی تا حدِ نظر تقدیم

اک مدت کے بعد نہ جانے کیا کیا یاد آیا — امڈی آہیں آنسو چھلکے، قلب ہوا دو نیم

ڈھلتی رات ہے شاید کوئی آہٹ پیدا ہو — دل میں ہلکورے لیتی ہے، موجِ امید و بیم

مطلعِ فکر پہ ابھرا خاور ایک زمانِ نو
حسنِ تخیل نے توڑی ہے پارینہ تقویم

مشفق خواجہ

○

کبھی غنچہ بن کے چٹک گئے، کبھی پھول بن کے مہک گئے
وہ شرابِ خانۂ زیست میں چلے دو قدم تو بہک گئے

کبھی پستیوں میں پڑے رہے، کبھی تا بہ اوجِ فلک گئے
ہوئیں منزلیں جو قریب تر، تو یہ اہلِ آرزو تھک گئے

کبھی نکہتوں کی ہے گفتگو، کبھی ذکرِ موجِ نسیم ہے
یہ ترے خیال کے سلسلے، نہیں یہ خبر کہاں تک گئے

نہیں جلوہ کوئی خیال میں، نہیں یاد بھی کوئی ذہن میں
وہ جو قافلے تھے خیال کے کسی دشتِ غم میں بھٹک گئے

کئی آنے والی مصیبتوں کا ابھی سے کچھ پتہ چل گیا
جو خوشی کی ساعتیں آ گئیں تو نصیبِ غم کے چمک گئے

درِ میکدہ کے قریب ہی سے غمِ زمانہ گزر گیا
جو تہی تھے جام وہ بھر گئے جو بھرے ہوئے تھے چھلک گئے

غمِ زندگی ترے میکدے کی شراب کیسی شراب ہے
کبھی پی کے بھی نہ ہوا نشہ کبھی تشنہ رہ کے بہک گئے

لیث قریشی

○

پیچ و خم میں راہوں کے کیا کہیں کہ کیا پایا؟
ذوقِ رہ نوردی کو منزل آشنا پایا

ایک گام سو بندش۔ ایک سانس سو خواہش
زیست کا ہر اک لمحہ ظرف آزما پایا

پھول ہو کہ شبنم ہو۔ شمع ہو کہ پروانہ
سب کو قیدِ ہستی میں درد آشنا پایا

میری خود شناسی نے اپنی سمت بھولے سو
مڑ کے بھی نہیں دیکھا جن کو خود نما پایا

دل سے یہ کوئی پوچھے آب و گل کی دنیا میں
کس کو بے ریا دیکھا کس کو با صفا پایا؟

کارگاہِ ہستی میں کیسی خود فریبی ہے؟
اک سکوں کی حسرت میں سب کو مبتلا پایا

اپنے ہوش میں آ کر نعمتِ خرد پا کر
کون بارِ ہستی کو جیتے جی اٹھا پایا

لیث اسی کے قدموں میں جوئے شیر بہہ آئی
تیشۂ عمل سے جو کوہ غم گرا پایا

میں جو مفہوم موجود تھی ایسی صورت میں یہ ۱۳ صفحات کیا اگر تیرہ سو صفحات بھی کالے کر دیئے جاتے تو کیا تھا۔ ۱۳ پر غالباً اکتفا اس لئے کی کہ (AMOR AND PSYCHE) کے ۱۵۰ صفحات کو ۱۳ کے کوزہ بند کرنا ۱۳ سو صفحات پر پھیلانے کی نسبت آسان نظر آیا ہو گا اور اس صورت میں خاصی عقل کی ضرورت تھی۔ خدانخواستہ میرا یہ مطلب نہیں کہ صلاح الدین صاحب نے ان تیرہ صفحات میں اپنی فہم و ادراک کا کوئی ثبوت نہیں دیا۔ ابھی تو یہ کیجئے۔ ماشاء اللہ پورے ٹڈ نکات خود دریافت کئے اور وہ بھی ایسے کہ (NEU MANN) ہزار سال جیکلا کر بھی ان کا سراغ نہ پاتا۔ اب یہ اور بات ہے کہ وہ دونوں نکات علم نفسیات کے دائرہ سے باہر ہیں۔ بہر حال ان کی تفصیل تو آگے پیش کی جائے گی۔ پہلے ذرا ان جملوں کی طرف تھوڑی توجہ دے لیجئے جو صلاح الدین صاحب نے بغیر عقل و فہم کے دخل کے (NEUMANN) کی کتاب AMOR AND PSYCHE سے نقل کئے ہیں شاید اس لئے کہ ادبی سراغ رساں یا ان کے کسی دوسرے ہم مشرب کو تلاش کرنے میں زحمت نہ ہو۔

FORM "AMOR AND PSYCHE" BY NEU MANN

"نسائیت کا چراغ" شیخ صلاح الدین۔

ALL HER MANIFEST BEAUTY HAD NO JOY FOR HER LOVELINESS, LONELY, WITHOUT LOVE OR HUSBAND SHE BEGAN TO HATE THE LOVELINESS (61, LINE 19)	۱- مگر اس کا (سائیکی کا) حسن اس کے لئے تنہائی کا جہنم بن گیا تھا عذاب ہو گیا تھا۔ اسے اپنے حسن سے نفرت ہونے لگی (ص۷۶ سطر ۱۵...)
NOW WHEN NIGHT WAS WELL ADVANCED A SOFT SOUND CAME TO HER EARS, SHE TREMBLED FOR HER HONOUR, SEEING THAT SHE WAS ALL ALONE .....AT LENGTHT HER UNKNOWON HUSBAND CLINBED THE COUCH, MADE HER HIS BRIDE AND DEPARTED IN HASTE BEFORE DAWN. (70, LINE 8)	۲- جب رات کافی گزر لیتی ہے تو نرم آواز اس کے (سائیکی کے) کانوں میں سرسرانے لگتی ہے۔ وہ اپنی عصمت کے لئے کانپ جاتی ہے اس پر خوف چھا جاتا ہے آخر اس کا دولہا اس کے پلنگ پہ آ جاتا ہے اور اسے اپنی بنا لیتا ہے۔ پھر صبح ہونے سے پہلے رخصت ہو جاتا ہے۔ (صفحہ ۸۲ سطر ۱۱)
THE INTRUDER, THE SNAKE (OF THIS PARADISE), IS REPRESENTED DX PSYCHE'S SISTERS.	۳- (ابلیس) اس کی جنسی لذت کی [illegible] جنت میں [illegible] کے آنے سے کم نہ تھا [illegible]

BUT ANALYSIS SHOWS THAT FAIRY-TALE MOTIF OF THE ENVIOUS SISTERS ..... IS NOT THE MURDER OF PSYCHE'S HUSBAND, BUT THE PSYCHE SHOULD BE PERSUADED TO BREAK THE TABLE, TO THROW LIGHT ON THE HIDDEN SECRET, IN THIS CASE TO LOOK UPON HER HUSBAND. FOR THIS IS THE PROHIBITION THAT PSYCHE'S UNSEEN HUSBAND HAD IMPOSED ON HER. (72, LINE 11)

بہنوں کے کردار کے بیان کی تفاصیل کا تجزیہ کر لینے سے یہ کھلتا ہے کہ بہنوں کی سازش کا مقصد سائیکی کے خاوند کی موت نہیں ہے بلکہ اس سازش کی محرک یہ خواہش ہے کہ سائیکی اپنے خاوند۔ یعنی مرد کے راز کو جانے، اس کی ان دیکھی صورت کو دیکھے اپنے خاوند۔ مرد۔ کی لگائی ہوئی ممانعت کو توڑے (صفحہ ۷۲ سطر ۱۱ . . . .)

THE APPEARANCE OF THE SISTERS FOR THE FIRST TIME GIVES PSYCHE A CERTAIN INDEPENDENCE SUDDENLY SHE SEES HER EXISTANCE WITH EROSE AS A "LUXURIOUS PRISON". (73, LINE 16)

سائیکی کو کہ "لاشعور کے وجد میں بسی تھی" بہنوں کی آمد سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ "حواس کی لذت" میں قید ہے۔ (صفحہ ۷۳ سطر ۲۳ . . . . .)

EROS DID NOT WANT SUCH A PSYCHE. HE THREATENED HER, FERVENTLY IMPLORED HER TO REMAIN IN THE PARADISE DARKNESS, HE WARNED HER THAT SHE WOULD LOSE HIM FOREVER BY HER ACT. THE UNCONSCIOUS TENDENCY TOWARDS CONSCIOUSNESS (HERETOWARD CONSCIOUSNESS IN THE LOVE RELATIONSHIP) WAS STRONGER

بالا ایروس ایسی سائیکی کو نہ چاہتا تھا اسی لئے وہ سائیکی کو بار بار تنبیہہ کرتا تھا کہ اسے دیکھنے کی خواہش نہ کرے۔ وہ اسے ڈراتا تھا۔ دھمکاتا تھا اس کی منتیں کرتا تھا کہ وہ "اندھیری جنت" ہی میں رہے۔ مگر سائیکی کے لاشعور کی طرف جو رجحان تھا وہ اس محبت سے بھی طاقتور تھا جو سائیکی کو ایروس سے تھی۔ کم از کم مرد ایروس یہی کہتا۔ مگر اس کا یہ خیال غلط ہوتا کیونکہ جنت کی کیفیات سے عاری سائیکی اس کی تابع تھی اندھیرے میں اس کے بس میں ہوگی تھی مگر اسے محبت نہ کرتی تھی۔ سائیکی مکمل میں غرق [illegible]

IN PSYCHE THAN EVEYTHINGELSE, EVEN THAN HER LOVE FOR EROS OR SO. AT LEAST THE MASCULINE EROS WOULD HAVE SAID. BUT WRONGLY SO, FOR THOUGH THE PSYCHE OF THE PARADISAICAL STATE WAS SUBSERVIENT TO EROS THOUGH SHE HAD YIELDED TO HIM IN THE DARKNESS, SHE HAD NOT LOVED HIM. .....IT IS IN THE LIGHT OF KNOWLEDGE, HER KNOWLEDGE OF EROS THAT SHE BEGINS TO LOVE (EROS) (80, LINE 78)

۶- یہی وہ مقام ہے جہاں ہر عورت کا امتحان ہوتا ہے . . . عورت کی تسکین اس تاریک جنت کی لذتوں سے نہیں ہوتی ۔ (صفحہ ۸۰ ۔ سطر ۳۳ . . .)

.....THIS IS THE TRAGIC MOMENT IN WHICH EVERY FAMININE PSYCHE ENTERS UPON ITS OWN DESTINY..... AN EXISTANCE IN PARADISAICAL DARKNESS CANNOT SATISFY HER. (81, LINE 10)

۷- تیل جو زمین سے پیدا ہوتا ہے ۔ یا زمین سے پیدا ہونے والی نباتات سے حاصل ہوتا ہے بے شمار تہذیبوں میں زمین اور نباتات کا اسم ہے ۔ اس داستان میں روشنی اسی سے پیدا ہوئی ۔ روشنی کو وجود میں لانے کے لئے تیل کا جلنا ضروری ہے ۔ اسی طرح نفسیاتی زندگی میں روشنی جذبات کی حدت اور عشق کی آگ سے پیدا ہوتی ہے (صفحہ ۸۱ سطر ۱۰)

THE OIL AN ESSENCE OF PLANT WORLD, AN ESSENCE OF THE EARTH, ...IS A WIDESPREAD SYMBOL. IN THIS CASE IT IS SIGNIFICANT AS THE BASIS OF LIGHT, AND TO GIVE LIGHT IT MUST KINDLE AND BURN SIMILARLY IN THE PSYCHIC LIFE

IT IS THE FIRE, THE HEAT OF PASSION, THE FLAME AND ARDOR OF EMOTION THAT PROVIDE THE BASIS OF ILLUMINATION. (84, LINE 6)

۸۔ سائیکی کے عمل سے اساطیری دور ختم ہوتا ہے۔ اور انسانی عشق کا عہد شروع ہوتا ہے جس میں انسانی روح اپنی تقدیر کا فیصلہ خود کرتی ہے۔ (صفحہ ۸۶ سطر ۲۱)

PSYCHE'S ACT ENDS THE MYTHICAL AGE IN THE ARCHETYPAL WORLD .... NOW BEGINS THE AGE OF HUMAN LOVE, IN WHICH THE HUMAN PSYCHE CONSIOUSLY TAKES THE FATEFUL DECISION ON IT-SELF. (86, LINE 21

۹۔ افرودیتی اور سائیکی (نئی افرودیتی) کی آویزش اور ستیزہ۔ کشش اور جاذبیت اور عشق کا تصادم ہے سائیکی کی پرستش حسن کا دھیان اور گیان ہے۔ جو اس اصول کا نقیض ہے۔ جس کا اسم افرودیتی ہے۔ افرودیتی بھی حسین ہے۔ مگر اس کا حسن مقصود بالذات نہیں بلکہ افزائش نسل کا ذریعہ ہے۔ اسی لئے ایروس جو بیک وقت انسانیت کا اسم ہے۔ اور عشق کا بھی۔ سائیکی کو چھوڑ افرودیتی کی پناہ لیتا ہے۔ مقصود بالذات حسن کی ابھی اس میں تاب نہیں۔ ایسے میں سے اس کا رشتہ شعور اور علم سے جنم لینے والے عشق کے ذریعے سے بھی ہو سکتا تھا مگر ابھی وہ افزائش نسل ہی کا آلہ ہے۔ (صفحہ ۸۷ سطر ۱ ....)

THE RIVALRY BEGAN WHEN MEN, BEHOLDING THE BEAUTY OF PSYCHE, NEGLECTED THE CULT OF APHRODITE. THIS PURE CONTEMPLATION OF BEAUTY IS IN ITSELF CONTTRARY TO THE PINCIPLE REPRESENTED BY APHRODITE. APHRODITE TOO IS BEAUTIFUL AND REPRESENTS BEAUTY, BUT HER BEAUTY IS ONLY A MEANS TO AN END. THE END SEEMS TO BE DESIRE AND SEXUAL INTOXICATION ACTUALLY IT IS FERTILITY. (87, LINE 1)

۱۰۔ دیہاتی فضا یعنی زمین کی اصلی اور فطری فضا کا دیوتا [illegible] ہے اور پان بالکل اساس

PAN IS THE GOD OF NATURAL [illegible]ISTENCE ..... CLOSE TO EARTH

AND ANIMALS, AND HIS ADVICE TO PSYCHE IS THIS: EROS IS THE GREATEST OF GODS; AND AS FOR YOU PSYCHE, BE FAMININE AND WIN HIS LOVE. (97, LINE 25)

کہ عاشق بنجا آسے اور اسے مشورہ دیتا ہے کہ وہ ایروس کے حضور جاکے اور اسے اطاعت سے موہ لے۔
(صفحہ ۹۷ سطر ۲۵)

PSYCHE POSSESSES WITHIN HER TO SELECT, SHIFT, CORRELATE AND EVALUATE .....(95, LINE 24)

۱۔ سائیکی اپنے لاشعوری عوامل کی قسموں میں تمیز کرنا سیکھے اور انھیں قسم کے لحاظ سے نظام میں ڈھالے۔
صفحہ ۹۵ سطر ۲۴ . . . .)

...SHE IS AIDED BY REED, THE HAIR OF THE EARTH, THAT IS CONNECTED WITH THE WATER OF DEPTHS. (100, LINE 16)

۱۔ سرکنڈا اسے مہم سر کرنے کا طریقہ سمجھاتا ہے۔ سرکنڈا مٹی اور پانی کے باہمی ملاپ سے پیدا ہوا ہے۔ صفحہ ۱۰۰ سطر ۱۶ . . . . .)

IT IS NOWHERE MENTIONED WHAT QUALITIES THE WATER OF OUR SPRING POSSESSES, AND NOT EVEN IMPLIED THAT IT IS ANY SPECIAL KIND OF WATER. HENCE WE MAY ASSUME THAT THE SECRET DOES NOT LIE IN THE QUALITY OF THE WATER BUT IN THE SPECIFIC DIFFICULTY OF ATTAINING IT.

۱۱۔ داستان میں چونکہ پانی کے اوصاف کا ذکر نہیں۔ اس لئے اس مہم کی اساطیری معنویت پانی کے اوصاف میں نہیں۔ بلکہ پانی کے حاصل ہونے کے عدم امکان میں مضمر ہے (صفحہ ۱۰۱ سطر ۳۲)

...THE TOWER IS .... A PRODUCT OF MAN'S COLLECTIVE, SPRITUAL LABOUR. THUS IT IS A SYMBOL OF HUMAN

۱۲۔ مینار انسانی تمدن اور اختراع سے وجود میں آتا ہے لہٰذا ان کا اسم ہوا۔ (صفحہ ۱۰۳ سطر ۱۵)

CULTURE AND OF HUMAN CONSCIOUSNESS. (111, LINE 22)

۱۵۔ جب تک عورت میں شعور نہ جاگے اس کے حسن میں ابدیت کا روپ نظر آتا ہے اور اس پر کنوارپنے کی آب قائم رہتی ہے۔ یہ آب اور حسن اگر ابدی بن جائے تو موت کا حسن بن جاتا ہے (صفحہ ۱۱۸ سطر ۲۵ ۔۔۔۔)

THIS BEAUTY OF EXISTANCE GIVES THE FEMININE A NATURAL MAIDENLY PERFECTION. BUT PRESERVED FOREVER, IT BECOMES A BEAUTY OF DEATH (118, LINE 25)

یہ تو ہو گئیں وہ سطور جو لفظ بہ لفظ (آپ نے دیکھ ہی لیا) چوری کی گئی ہیں۔ خیالات کا قصداً ذکر نہیں کیا کہ پورا مضمون صلاح الدین صاحب کا اور (NEUMANN) کی پوری کتاب نقل کرنا پڑتی۔ ویسے ان دو نکات میں سے جن کا ذکر اوپر کیا ہے۔ پہلا تو بے معنی ہے یہ آپ کو مضمون کے آغازی پیراگرافوں میں دستیاب ہوگا یعنی ص۱۰۲ اور ص۱۰۳ کے تھوڑے حصہ پر۔ اس کے بعد صلاح الدین صاحب کو نقل کرنے کی دشواری کے علاوہ اور کوئی محنت نہیں کرنا پڑی یہاں تک کہ وہ اپنے مضمون کے اس تاریخی اختتام پر آئے کہ " مرد اور عورت میں جسمانی ساخت اور معاشرہ میں الگ الگ نوعیت کے فرائض ادا کرنے کے باوجود دونوں اصل میں ایک ہیں۔ وحدت ہیں۔ اور دونوں کو ایک سی نفسیاتی منزلوں سے گزرنا پڑیگا (ص۱۰۸ سطر ۲۴) لیجئے صاحب چھٹی ہوئی۔ تمام علم نفسیات کی بنیاد ہی بٹھا کر رکھ دی صلاح الدین صاحب نے چاہے (NEUMANN کا یہ مقصد ہو یا نہ ہو خود صلاح الدین صاحب (فرض کیجئے یہ مضمون خالصتاً انہیں کا ہے) کے اپنے مضمون کی روح کے منافی بات ہے اور بیچارے (NEUMANN عزیز نے تو صرف اتنا کہا ہے کہ عورت جب خود اپنا نفسیاتی ارتقاء کرتی ہے۔ لاشعور سے شعور کی طرف آتی ہے تو ساتھ ہی مرد کا بھی نفسیاتی ارتقاء کرتی ہے۔ یعنی ہر چند مرد اور عورت نفسیاتی طور پر مختلف ہیں (کسی حد تک ضد ہیں) لیکن ارتقاء کے معاملہ میں باہم انحصاری INTER DEPENDENT ۔ اسے صلاح الدین صاحب نے کہاں پہنچایا۔

اس کے آگے چلئے تو اس سارے مضمون کا اطلاق اردو ادب پر کر ڈالا ہے جو قطع نظر اس کے کہ غلط ہے یا صحیح۔ روح مضمون سے اتنا ہی غیر متعلق ہے جتنا یہ کہ صلاح الدین صاحب یہ لکھ دیتے کہ رات انھوں نے گھر میں کلیجی کھائی تھی یا یہ کہ ان کے کسی دوست کی بیوی گلابی رنگ کی ساڑھی باندھے تھیں۔

مطلب اس سے یہ تھا کہ لوگ چوری بھی کرتے ہیں۔ اس سے بری حرکتیں بھی کرتے ہیں مگر ایسا شاید ہی کسی نے کیا ہو کہ چوری کرنے کے بعد جو باتیں خود لکھی ہوں وہ اس قدر بھونڈے پن کے ساتھ غیر متعلق اور ناقص ہوں۔

کتابوں میں

(۱)

لکھنؤ کا دبستانِ شاعری

"لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" کا دوسرا ایڈیشن اردو مرکز۔ لاہور نے حال ہی میں شایع کیا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا یہ تحقیقی کارنامہ عرصہ سے نایاب تھا۔ ہند و پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں یہ کتاب اردو کے اعلیٰ امتحانوں میں داخلِ نصاب تھی لیکن طلبا کو دستیاب نہیں ہوتی تھی طلبا کے علاوہ علمی و تحقیقی کام کرنے والے اس کتاب کی کمی شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ اردو مرکز نے ادبی کساد بازاری کے اس دور میں یہ ضخیم کتاب شایع کر کے ادب کی بڑی خدمت کی ہے کتاب بڑے سائز کے تقریباً ۹۰۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ قیمت ساڑھے تیرہ روپے ہے۔

لکھنؤ کا دبستانِ شاعری کئی حیثیتوں سے ایک اہم کتاب ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اردو کی کوئی مستند اور تنقیدی تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی۔ یہ کمی جن کتابوں سے پوری ہوتی ہے ان میں "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" بھی شامل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ کتاب اردو میں علمی تحقیق کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب نے "دہلی کا دبستانِ شاعری" کے عنوان سے دہلی کے شعرا اور رنگِ سخن پر تحقیق کی ہے۔ لیکن ڈاکٹر ہاشمی کی کتاب میں نہ تو یہ تفصیل ہے اور نہ تحقیق کا یہ معیار — انتہا تو یہ کہ ڈاکٹر ہاشمی نے دہلی کے قدرے گمنام مگر اہم شعرا کی طرف بھی چنداں التفات نہ کیا —

ڈاکٹر ابواللیث صاحب کو اس تحقیقی کارنامہ پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اردو میں پی ایچ ڈی کی پہلی سند دی تھی۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۴ء میں شایع ہوا تھا۔ پندرہ سال کے بعد دوسرا ایڈیشن ہمارے سامنے آیا ہے اور اس کے مطالعہ سے مصنف کے ذہنی ارتقا کا پورا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔ خوب سے خوب تر اور تکمیل کی تلاش میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے تحقیق کی کتنی ہی وادیاں طے کی ہیں اس کا اندازہ یوں لگایئے کہ خود ان کے الفاظ میں — "یہ بجائے دوسرے ایڈیشن کے ایک نئی تصنیف کہنا چاہیے"

باب اول، "آغازِ داستان" کے عنوان سے از سرِ نو لکھا گیا ہے۔ خانِ آرزو، سودا اور [illegible]
[illegible]

خاں رنگین اور مصحفی کے تذکرے از سرِ نو لکھے گئے ہیں۔ نئے ماخذ کی دریافت نے گزشتہ تحقیقات کو بڑی حد تک بدل دیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ قدما کے کلام کے بارے میں تنقیدی نقطۂ نظر کا بڑی حد تک تعلق ان کے دور اور ان کے شخصی حالات سے ہوتا ہے اسی لئے ڈاکٹر صاحب موصوف کی کاوشیں ہمیں دبستانِ لکھنؤ کے شعراء کا نئے تنقیدی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے میں مدد دیں گی۔

گزشتہ چند سالوں میں جو تحقیقی مقالے شائع ہوئے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری "ترتیب" ہے۔ ابتدائی ابواب کا یا تو اصل کتاب سے تعلق ہی نہیں ہوتا یا انھیں ضرورت سے زیادہ طول دیا جاتا ہے۔ اس طرح ان کا اصل موضوع سے گہرا تعلق نہیں پیدا ہوتا اور کتاب " وحدت " سے محروم رہتی ہے۔ "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" اس عام کمزوری سے مبرا ہے۔ تاریخی حالات محض اسی قدر پیش کئے گئے ہیں جو لکھنؤ کی اجتماعی زندگی، گزرے ہوئے دور اور کلچر کو سمجھنے کے لئے ضروری ہیں۔ کتاب کا تیسرا باب ہمارے خیال میں اردو کے تحقیقی اور تنقیدی ادب کے بہترین نمونوں میں سے ہے۔ اس میں ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے "لکھنویت" کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ کون سے اجزا ہیں جو لکھنوی تمدن اور شاعری کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس موضوع پر کسی اور نے اس عالمانہ اور تجزیاتی انداز میں قلم نہیں اٹھایا۔

باب دہم میں ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے مولانا حسرت موہانی کو بھی " آخری دور کے لکھنوی شعراء " میں شامل کیا ہے۔ اس مسئلے میں ہمیں ان سے اتفاق نہیں۔ حسرت امیر اللہ تسلیم کے شاگرد ضرور تھے۔ مگر خود تسلیم اپنے آپ کو شعرائے لکھنؤ میں شامل نہیں کرتے ؎

میں ہوں اے تسلیم شاگردِ نسیم دہلوی ہر مجھ کو طرزِ شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض

خود حسرت نے زبانِ لکھنؤ کے قائل ہونے کے باوجود صاف صاف الفاظ میں اعلان کیا ؎

حسرت مجھے پسند نہیں طرزِ لکھنؤ ہر کیوں سلسلہ ملائیں کسی لکھنوی سے ہم

لیکن غالباً ڈاکٹر ابو اللیث صاحب نے حسرت کو شعرائے لکھنؤ میں اس بنیاد پر شامل کیا ہے کہ بہرحال ان کے استاد لکھنوی ہی تھے اور حسرت کے کلام میں بھی لکھنوی طرز ملتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو۔

اس کتاب کی ایک بڑی خوبی تحقیق و تنقید کی ہم آہنگی ہے یہ ہم آہنگی فاضل مصنف کا مزاج بن چکی ہے اور ان کی تمام تحریروں میں نظر آتی ہے۔ اس طرح ڈاکٹر صدیقی ہمارے گزرے ہوئے محققین کی یادگار بھی ہیں اور جدید تنقید کی بزم کے ایک ممتاز نمائندے بھی۔

کتاب کے آخر میں " خلاصۂ داستان "، " شعرائے لکھنؤ کے سلسلے "، " فہرست ماخذ " اور " اشاریہ " بھی شامل ہے۔ ان ضمیموں سے اس تحقیقی کارنامہ کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

خوبصورت انداز میں منعکس کیا ہے ، قیمت ۳ روپیہ ہے۔

قتیل شفائی عہد حاضر کے ایک خوش فکر شاعر ہیں۔ محض خوش فکر نہیں بلکہ وہ اپنے تجربات ، مشاہدات اور احساسات کو مخصوص انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنے ہم عصروں کے درمیان اپنے منفرد لہجہ کی بنا پر پہچانے جاتے ہیں۔ قتیل نے نظمیں بھی لکھی ہیں، غزلیں بھی اور گیت بھی —— لیکن وہ غزلوں اور گیتوں کے میدان میں زیادہ کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی افتاد طبع اور لہجہ غنائی اور رومانی ہے۔

ہمارے دور میں غزل کا احیا ہوا ہے۔ نئے شاعروں نے غزل کی لغت میں اضافہ کیا ہے۔ نئے عناصر شامل کئے ہیں۔ اس کے باوجود قتیل ان کے درمیان بھی ایک مخصوص امتیاز کے مالک ہیں۔ لیکن انھیں یہ کامیابی نظم گوئی میں حاصل نہیں ہوئی۔

قتیل کی نظموں میں "جدت و اظہار" ہے۔ ان کا خمیر جیتا لوں سے گزر لیا ہے۔ یہ درست ہے لیکن آج فیض، اختر الایمان، مجاز، جذبی، احمد ندیم قاسمی، ابن انشا اور جعفر طاہر وغیرہ نے نظم کو جس طرح نئی وسعتوں سے آشنا کیا ہے، اُسے پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ نوجوانی کے تاثرات کو خلوص اور شدت سے بیان کرنے کے بعد بھی کوئی شاعر بڑا نظم نگار نہیں کہا جا سکتا۔ اس مجموعہ کی ابتدائی دو تین نظموں میں گہرائی کسی قدر ملتی ہے مگر باقی نظموں میں محض اپنے خوابوں کی شکست کا ماتم ہے، کسی کے دلھن بن جانے کا نوحہ ہے —— وہ جو ریشمی کفن میں اپنی مرضی سے لپٹ گئی۔

بہرحال نوجوان یقیناً ان نظموں کو دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے غالباً اس مجموعہ کی نظموں کے عام رجحان کو سامنے رکھ کر قتیل نے مجموعہ کو "روزن" کا نام دیا ہے۔

روزن کی غزلیں بہت اچھی ہیں اور ان کے مطالعے کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ غزل میں قتیل کی شخصیت اور فن کا اظہار اچھی طرح ہوا ہے۔ ان غزلوں میں "سادگی و پرکاری" ہے۔ مخصوص انداز نظر ہے۔ عشقیہ تجربوں میں خلوص ہے اور یہ غزلیں وہ دریچے ہیں جن سے ہم شاعر کی زندگی میں جھانک سکتے ہیں۔ ان غزلوں میں کچھ ایسی بات ہے کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو قتیل کا دوست سمجھنے لگتا ہے۔ قتیل نے ہندی اور عام بول چال کے الفاظ کو بھی غزل میں جگہ دی ہے اور چند مقامات کے علاوہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں۔ چند شعر پیش کئے جاتے ہیں، انتخاب میں کسی کاوش کو دخل نہیں ہے اور اس بات سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ قتیل غزل کے اچھے شاعر ہیں ؎

ترا پیکر تو غیر اک شعلۂ تاباں تھا پہلے بھی ترے سائے کو بھی ہم خونفشاں محسوس کرتے ہیں

نہ کہیں سایۂ گل ہے نہ کہیں ذکرِ حبیب اور اب گردشِ ایام کہاں تک پہنچے

ہر قدم ہی کو اپنی آبلہ پائی نہیں کرتی وہ افسانے گل و گلزار سے آگے نہیں جاتے

جاگتے سپنے جوانی چاندنی کے دریچے سے جب چراغِ بے خانہ ٹمٹمانے لگتا ہے

[illegible] سے تو منع کیا گیا جب خیالوں میں وہ آ جاتے ہیں [illegible]

شیخ صلاح الدین صاحب کا یہ مضمون "ادبی سرقہ ہے ؟ یہ کہانی تم دلا دراست "..... کے عنوان سے ہمارے اس شمارہ میں پیش کی گئی ہے۔

سویرا کے اس شمارہ میں خاص بات "جاوید اقبال" کے ڈرامہ "گردش" کی اشاعت ہے۔ جاوید اقبال اردو ڈرامہ کیلئے ایک نیا باب بن کر آئے تھے مگر جلد ہی وہ ادبی دنیا سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ ہم اس درخشاں واپسی پر ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

اس مرتبہ سویرا کا حصہ نظم خاصا کمزور رہا ہے۔ اس کا اندازہ منیر نیازی صاحب کی "بچوں جیسی باتیں" سے کیجئے۔

آج کا کام نہ کل پر ٹالو
جو کچھ کہنا ہے، کہہ ڈالو
ادھر ادھر کی جھوٹی باتیں
ذرا ذرا سی جیتیں، باتیں ..... وغیرہ وغیرہ

نہ جانے یہ شاعری ہے یا کوئی ایسا عظیم شعری تجربہ جسے شاید کوئی پڑھنے والا نہ سمجھ سکے۔

سویرا کے اس شمارے میں تین افسانے شامل ہیں اور تینوں اچھے ہیں، خاص طور پر اشفاق احمد کا افسانہ "گاتو"۔ اشفاق اپنے ہر افسانہ کے ذریعہ ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ وہ "نئی پود" کے سب سے اچھے افسانہ نگار ہیں۔

خطوط کے زیر عنوان عصمت چغتائی کا ایک خط شائع کیا گیا ہے حنیف رامے صاحب نے اس خط پر جو حاشیے چڑھائے ہیں وہ حد درجہ غیر ادبی اور رکاکت آمیز ہیں۔ خدا حنیف رامے صاحب کو عصمت کے قلم سے پناہ میں رکھے۔

علی گڑھ میگزین شمارہ ۲

قمر رئیس صاحب نے اس سال علی گڑھ میگزین کے دو شمارے شائع کر کے ایک صالح روایت کی بنیاد ڈالی ہے۔ ان کے دور ادارت کی دوسری نمایاں خصوصیت تنقید کے مقالوں میں اضافہ ہے۔

اس شمارہ میں "تحت میر کی شاعری اور زندگی کے بارے میں" تین مقالے شامل ہیں۔ "میر کے مطالعہ کی اہمیت" پروفیسر آل احمد سرور کی کتاب کا پہلا باب ہے انھوں نے اپنے مخصوص سلجھے ہوئے انداز میں مختلف گوشوں کو سمیٹنا چاہا ہے۔ سرور صاحب نے میر کے نقادوں کے سلسلہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا تذکرہ نہ کر کے ان کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ نے میر کے فن اور زندگی پر جو کچھ لکھا ہے اس کی گہرائی اور معنویت سے کون انکار کرے گا؟

دوسرا مقالہ ڈاکٹر سید عبداللہ کا ہے "کلام میر میں لکھنوی عنصر" اس میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔

محترم رشید احمد صدیقی کی سرگزشت "آشفتہ بیانی میری" کی دوسری قسط اس شمارہ میں درج کی گئی ہے۔ رشید صاحب کی سرگزشت ایم، اے۔ او کالج مسلم یونیورسٹی اور کتنے ہی ادبی و تہذیبی تحریکوں اور واقعات کی کہانی ہے۔ رشید صاحب مختلف بکھری ہوئی باتوں کو ہم رشتہ کرنے کا فن جانتے ہیں اور اسی لئے یہ سرگزشت حد درجہ کامیاب ہے۔ رشید صاحب ہمارے ان بزرگوں میں سے ہیں جنہوں نے زندگی کو ہر رنگ میں دیکھا ہے اور اسی لئے انہیں سرگزشت لکھنے کا پورا حق حاصل ہے۔

غزلوں اور نظموں کا حصہ اچھا اور پڑھنے کے قابل ہے۔ اختر انصاری۔ ڈاکٹر محمد رشید الاسلام، خلیل الرحمن اعظمی، قمر رئیس اور سید امین اشرف وغیرہ کی شعری تخلیقات میں بڑی تازگی ہے ساغر نظامی صاحب نے اپنی جو غزل میگزین کو عطا فرمائی ہے وہ بارہا کی مطبوعہ ہے۔

مقالات کے حصے میں دو مقالے اچھی فکری کاوش اور مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ ایک تو ڈاکٹر محمد حسن صاحب کا مقالہ "ایک خطرناک میلان" اور دوسرا "اردو ادب میں قومی رجحانات" از ضیاء احمد

میگزین میں ایک افسانہ اور ایک ڈرامہ شامل ہے... دونوں تخلیقات اچھی ہیں مگر ہماری رائے میں اس حصہ میں اور وسعت ہونی چاہیئے۔

"علی گڑھ میگزین" نے شاید افسانوی ادب کو کچھ کم اور معقول اہمیت نہ دی ہے

مکتبۂ افکار کی نئی مطبوعات

LUX
TOILET SOAP

ماہنامہ

مہر نیمروز

فروری ۵۸ء

جلد ۳ شمارہ ۲

ترتیب

حسن مثنیٰ ندوی
ابوالخیر کشفی
علی اکبر قاصد

منتظم شاہ محمد حسان
پرنٹر حسن مثنیٰ ندوی
پریس انجمن پریس کراچی
کتابت کاشانۂ اردو صدر کراچی

قیمت سالانہ چھ روپے
فی پرچہ آٹھ آنے

فون نمبر ۴۱۶۶۶ - ۳۳۳۰۹
دفتر ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

پہلی کرن

یادِ رفتگاں

دل ہی تو ہے اور غم کی طوفاں سے کم نہیں
آنکھوں سے کیوں نہ خونِ تمنا اُبل پڑے

مرزا غالب نے اپنے غموں کی نسبت سے خدا کے حضور کئی دلوں کی تمنا کی تھی۔ آج ہم سوگوارانِ ادب و تہذیب بھی کچھ ایسے ہی ذہنی کرب میں مبتلا ہیں۔

مولانا حسین احمد کی موت صرف ایک عظیم المرتبت عالم کی موت نہیں بلکہ تحریکِ آزادی کے ایک اولو العزم مجاہد کی موت ہے۔ ہمیں اُن کے سیاسی عقائد اور مسلک سے شدید ترین اختلاف تھا لیکن اس بات پر پورا یقین تھا کہ مولانائے مرحوم غیروں کی چشم و ابرو کے اشاروں پر چلنے والے نہیں تھے بلکہ انھوں نے اپنے لئے وہ راستہ اپنی بصیرت کے مطابق چنا تھا۔ وہ مسلمانوں کے بہی خواہ تھے مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت سے انھیں والہانہ دلبستگی تھی لیکن اُن میں وہ سیاسی شعور نہ تھا جو نقد دیرِ ملت کو بے نقاب دیکھ لیتا ہے۔ اسی لئے انہوں نے آزاد ہندوستان میں اپنی زندگی کے آخری دس سال بڑے ہی کرب و اضطراب میں گزارے۔

مولانا حسین احمد شیخ الہند محمود الحسنؒ کے جانشین تھے۔ انہوں نے اس جانشینی کا حق ادا کر دیا لیکن ...... ہمیں دُکھ تو یہ ہے کہ حسین احمد مرحوم کوئی بڑا علمی کارنامہ اپنی یادگار کے طور پر نہیں چھوڑ گئے ہمیں یہ تسلیم ہے کہ اس عہد کے کتنے ہی علما کی ذہنی تربیت مولانائے مرحوم نے فرمائی ' مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ علمائے دیوبند نے تحقیقی و تالیفی کاموں میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔

احمق پھپھوندوی ان لوگوں میں سے تھے جن سے مل کر زندگی خوبصورت اور خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ وہ اپنی زندگی میں تیدو بند کلفتِ معاش اور کتنی ہی مشکلوں سے گزرے۔ محمد مصطفیٰ خاں مداح واحمق بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ زندان حماقت اُن کی طبعی شگفتہ دلی اور لطیف طنز و مزاح کا ادبی مرقع ہے۔ وہ اُن شاعروں میں سے تھے جنہوں نے اکبر الہ آبادی کے بعد اردو شاعری میں طنز و مزاح کو اس طرح پیش کیا کہ زندگی کا کوئی پہلو نظر انداز نہ ہونے پایا۔ آج سید محمد جعفری کے علاوہ اس رنگ سخن میں کوئی دوسرا استاد شاعر نظر نہیں آتا ' اسی لئے احمق پھپھوندوی کی دائمی رخصت کا غم کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ۲۹ دسمبر ۱۹۵۷ء کو ہم سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو گئے۔ میرٹھ ریلوے اسٹیشن پر دل کا دورہ پڑا اور [illegible] ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی موت نے اردو کے مشہور شاعر چکبست کی موت کی یاد دلوں میں تازہ کر دی — وہی ریلوے اسٹیشن اور وہی حرکت قلب کا بند ہو جانا۔
ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کا شمار بجا طور پر اردو کے محسنوں میں کیا جاتا ہے۔ اردو زبان و ادب کی کوئی جامع اور مکمل تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی ہے کہ

قیں موجود ہیں اُن میں رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب سب سے رفیع اور قابلِ قدر ہے۔ سکسینہ آنجہانی نے اپنی تاریخ کے ذریعہ انگریزی زبان اور اُردو کے ب کو مغربی دُنیا سے روشناس کرایا اور مستشرقین کو احساس دلایا کہ اُردو زبان و ادب کا دامن کتنا وسیع ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کو اگرچہ شہرت عام تاریخ ادب اُردو کی وجہ سے حاصل ہوئی لیکن اُن کی دوسری کتابوں کا تحقیقی اور ادبی درجہ کہیں بلند ہے۔ ہیں اور انگریزی میں شعرائے اُردو کا تذکرہ اس درجہ کی کتاب سمجھی گئی کہ آگرہ یونیورسٹی نے آپ کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دیکر خود اپنی عزت افزائی کی۔ گزشتہ سال ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی دو کتابیں شائع ہوئی تھیں ایک تو "مرقع شعرا" اور دوسری "مثنویات میر بخط میر"۔ اگرچہ مرقع شعرا کے مولف کے نام کا پتہ نہ چل سکا لیکن تذکرہ کئی حیثیتوں سے بہت اہم ہے۔ مرزا محمد حسن قتیل فرید آبادی کا اُردو کلام اسی کے ذریعہ پہلی بار ہم تک پہنچا ہے۔ اماچہ دیدہ لغزش پارا بہانہ ساخت بے قتیل — ذرا قتیل کے دو اُردو شعر سنئے ؎

اُس زلف کی کیا بات ہے آدمی اِدھر آدھی اُدھر ✽ پھیلی یہ کالی رات ہے آدھی اِدھر آدھی اُدھر

زندہ کروگے مُردوں کو تم ایک آن میں ✽ عیسیٰ کا معجزہ ہے تمہاری زبان میں

"مثنویات میر بخط میر" کی اہمیت اس بات سے ظاہر ہو سکتی ہے کہ چار مثنویوں میں سے ایک مثنوی "جنگ نامہ" غیر مطبوعہ ہے۔ مثنوی کے خاتمہ پر ایک غیر مطبوعہ غزل بھی ملتی ہے ہم اس شمارہ میں ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی دیوان کا ایک غیر مطبوعہ پیغام شائع کر رہے ہیں۔ انہوں نے یہ پیغام کل ہند اُردو کانفرنس کانپور ۱۹۳۷ء کیلئے بھیجا تھا۔ میر تقی میر کی غزل بھی علیحدہ شائع کی جا رہی ہے تاکہ اہل نظر اسے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کے تحفہ کے طور پر قبول فرمائیں۔

ڈاکٹر سید احمد بریلوی اور الیاس مجیبی کراچی کی سرزمین کا پیوند ہو گئے ——— ڈاکٹر سید احمد اُردو کے پُرانے خادم اور بہت اچھے ادیب تھے آج سے پچیس تیس سال پہلے وہ ہمارے معروف ترین لکھنے والوں میں سے تھے، لیکن اُن کی مسلسل خاموشی کی وجہ سے شاید نئی نسل اُن سے اچھی طرح واقف نہیں ہے۔

الیاس احمد خاں مجیبی پرانی تہذیب کا ایک خوبصورت اور نستعلیق نمونہ تھے ——— ویسے تو وہ کم آمیز تھے لیکن اگر کوئی اُن کی زندگی میں اپنے لئے جگہ بنا لیتا تو اُس سے ہمیشہ شفقت نرمی اور محبت سے ملتے تھے۔ الیاس مجیبی کی موت ایک اور صاحبِ طرز انشاپرداز کی موت ہے۔ وہ مشکل سے مشکل مسئلہ اور بات کو آسان اور روزمرہ کی زبان میں لکھنے پر قادر تھے انہوں نے بچوں کے لئے جو کتابیں اور کہانیاں لکھی ہیں وہ صرف بچوں کی دلچسپی کا سامان نہیں بلکہ اُردو ادب کے قابل قدر نمونوں میں سے ہیں۔

حضرت علی اختر ان شعرا میں سے تھے جو ماضی کے شعری سرمایہ پر گہری نظر اور آج کے ادبی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ علی اختر اسے نقادوں کی کم نگہی کا شکار تھے۔ ان کی شاعرانہ اہمیت کو دبی زبان سے تسلیم تو سب کرتے تھے لیکن نیاز فتحپوری کی طرح فراخ دلی سے اعتراف کسی نے کیا۔ ہم اس شمارے میں حضرت علی اختر مرحوم کی ایک نمائندہ نظم شائع کر رہے ہیں نظم کے ساتھ جو نوٹ درج کیا گیا ہے وہ ہمارے سچے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔

پنڈت ہری چند اختر بقول مولانا عبدالمجید سالک "مہرا چاند ستارا" بھی آنجہانی ہو گئے۔ پنڈت جی کا تعلق ارضِ پاک سے تھا اور وہ دو تین بار یہاں اس ذوق و شوق سے آئے۔ جیسے پردیسی وطن واپس آتا ہے۔ پنڈت جی ایک ایسے باکمال شاعر اور بامذاق آدمی تھے کہ مدتوں اُن کی یاد دل میں چٹکیاں لیتی رہے گی۔

آج ہم نیرنگِ خیال کی پہلی کرن کو سیاہ حاشیوں میں لکھ رہے ہیں۔ غم کی اس کیفیت میں ہمارے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ ہم کسی اعلیٰ پایہ تہذیبی سلسلہ کو چھیڑیں یا اس شمارے کی تخلیقات کا جائزہ پیش کر سکیں۔

رام بابو سکسینہ

اُردو زبان اور نئے تقاضے

مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی تمناؤں کے باوجود آپ کی کانفرنس میں شریک نہ ہو سکوں گا، لیکن میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اور میں اردو کانفرنس کی روئداد کا منتظر رہوں گا۔

آج جو لوگ اردو کی پرخلوص خدمت میں مصروف ہیں، وہ ہندوستان کی تہذیب اور تمدن کی حفاظت کر رہے ہیں۔ اس وسیع ملک میں آج ہر چیز پر ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کی چھاپ لگی ہوئی ہے چاہے وہ فنِ تعمیر ہو، یا موسیقی، لباس ہو یا رہن سہن۔ ان دونوں بڑی قوموں نے ایک ساتھ تہذیب و تمدن اور علم و ادب کو پروان چڑھایا ہے۔ اس اتحادِ فکر و عمل کا سب سے بڑا دستاویزی ثبوت ہماری اردو زبان ہے۔ اردو زبان کوثر و تسنیم اور گنگ و جمن کا سنگم ہے۔ یہ زبان اسی دیس کی بیٹی ہے۔ اس کی ماتھے کی بندیا سدا چمکتی رہے گی۔

مجھے یقین ہے کہ آپ کی کانفرنس میں صرف چند تجویزیں منظور نہیں کی جائیں گی بلکہ قابلِ عمل منصوبے پیش کئے جائیں گے اور انہیں پورا کرنے کی کوئی سبیل نکالی جائے گی۔ آپ نے میری تاریخ ادب کا ذکر جن لفظوں میں کیا ہے اس کے لئے بے حد ممنون ہوں لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اردو زبان کی ایک ہمہ گیر اور بڑی تاریخ کی ضرورت ہے۔ مگر یہ کام کسی ایک آدمی کے کرنے کا نہیں۔ اگر آپ اردو کے بڑے ادیبوں اور نقادوں سے کام کرا سکیں تو یہی کارنامہ ایسا ہوگا جسے کوئی نہ بھول سکے گا۔

ہماری زبان بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں بڑی جان اور حسن ہے لیکن ہمیں اس کی کمزوریوں کو نظر کے سامنے رکھنا چاہئے۔ سچی محبت اور پیار کا تقاضہ یہی ہے۔ میں سوچ بچار کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نیچے لکھی ہوئی باتوں کو حاصل کئے بغیر ہم اپنی زبان کو زیادہ ترقی نہیں دے سکتے۔

۱ - اردو کی ایک بڑی اور جامع لغت مرتب کی جائے۔

۲ - اردو میں ٹائپ کو رواج دیا جائے۔ سائنس، جغرافیہ، تاریخ کی کتابیں اور ٹیکنیکل کتابیں ضرور ٹائپ میں شائع کی جائیں۔

۳ - اردو میں انسائیکلوپیڈیا مرتب کی جائے۔ یہ ایسا کام ہے جس کے لئے سارے علمی و ادبی اداروں کو ایک مرکز پر جمع ہو جانا چاہئے۔ آپ کوشش کریں کہ جامعہ عثمانیہ، انجمن ترقی اردو، ہندوستانی اکیڈمی، دار المصنفین اور دوسرے ادارے یہ کام مل جل کر شروع کر دیں۔

۴ - مختلف علوم پر جو کتابیں لکھی جائیں ان میں معیاری اور ایک ہی اصطلاحات استعمال ہوں۔ یہ نہ ہو کہ مختلف لوگ مختلف اصطلاح استعمال کریں۔ اس سے بہت نقصان پہنچ رہا ہے اور آئندہ زیادہ نقصان پہنچے گا۔

۵ - ہندوستان کے ہر صوبے میں کم از کم اردو کا بہت بڑا کتب خانہ بنایا جائے جس میں تمام کتابیں ہوں۔ اردو کے مصنف اور پبلشر ان کتب خانوں کو اپنی کتابیں مفت دے کر اردو کی خدمت کریں۔

۶ - اردو پڑھنے والے اور اردو سے محبت کرنے والے اردو کی کتابیں، رسالے اور اخبار زیادہ سے زیادہ خریدنے کی عادت ڈالیں۔ یہ بات بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ منشی پریم چند مرحوم آخر زمانے میں اردو کی جگہ ہندی میں کیوں لکھنے لگے تھے؟ یہ سوچنے کی بات ہے۔ وجہ

(باقی صفحہ پر)

یر تقی میر

غزل

[یہ غزل "مثنویاتِ میر بخطِ میر" سے پیش کی جا رہی ہے۔ یہ غزل میر صاحب کے کسی مطبوعہ کلیات میں شامل نہیں ہے اور اس کے لئے اُردو دُنیا ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی مرہونِ منت رہے گی۔]

نج کی اُس کے جو خبر گزرے رفتہ وارفتہ اُس کا مر گزرے

یک پل بھی نہ اُس سے آنسو پُچھے روتے روتے پہر پہر گزرے

وئے خوں آنکھوں سے بہی شاید خون سے میرے وہ بھی در گزرے

ارے غیروں کو، یا مَرے عاشق کچھ نہ کچھ چاہیئے کہ کر گزرے

رہِ جاناں سے ہے گزر مشکل جان ہی سے کوئی مگر گزرے

نچہ ہو شرم سے، اُن آنکھوں کی گُلِ نرگس اگر نذر گزرے

علی اختر مرحوم

اپنے بچے سے آخری باتیں!

آج سے کوئی پندرہ سال پہلے حضرت علی اختر اتنے بیمار ہوئے تھے کہ زندگی کی امید نہ رہ گئی ۔ اس علالت کے دوران اُنھوں نے یہ نظم لکھی تھی ۔۔ اُن کا خطاب اپنے کمسن بچے "مسعود" سے تھا۔ اور آج جب علی اختر اس دنیا میں نہیں ہیں اُن کا یہ پیغام مسعود کو اپنی زندگی کی منزل کی نشاندہی کرا رہا ہے ۔

اس نظم میں حضرت علی اختر کا مخصوص اندازِ بیان اور تفکر ہی نہیں ہے بلکہ اپنی زندگی پر اُنکا جامع تبصرہ بھی ہے ۔ وہ شاعر ہمیشہ کیلئے رُخصت ہو گیا جس کی کُلاہ ہمیشہ گردشِ روزگار کے سامنے کج رہی۔ اگر علی اختر شاعر بھی نہ ہوتے تو اُن کا کردار ہمیں سوگوار کرنے کیلئے بہت تھا۔ علی اختر کی موت صرف ایک شاعر کی موت نہیں بلکہ ایک انسان کی موت ہے اور اس دَور میں جبکہ اہلِ نظر کو بھی کسی انسان کی زیارت مشکل سے نصیب ہوتی ہے ———— ادارہ

غنچۂ نورس! مُبارک ہو تجھے سیرِ حیات
میں عدمِ ہستی سے برسوں رہ چکا گرمِ ستیز
جانتا ہوں تھک چکی ہے دانشِ سعیٔ و عمل
موت کا آئین محکم ہے، بدل سکتا نہیں
موت ہے تنہا امینِ عرصۂ سُود و ضرر
موت کا عرفاں ہے، عنوانِ حیاتِ مختصر
الغرض جب زمزمے، چونکیں گے تیرے ساز میں

سرمدی آسائشیں ہوں اور تیری کائنات
ہو رہی ہے ہر نفس اب وقت کی رفتار تیز
میری بالیں پر کھڑی اب مُسکراتی ہے اجل
زندگی کے دل سے یہ کانٹا نکل سکتا نہیں
خاک ہو یا پھول، ذرّے ہوں کہ امواجِ گہر
میں ہوں یا تو ہو، کوئی قارون ہو یا دریوزہ گر
زندگی جب مسکرائے گی ترے انداز میں

موت مرہم رکھ چکی ہوگی دلِ صد چاک پر
عنبریں ردتی ملیں گی تجھ کو میری خاک پر

میرے بچے! اپنی دُنیا کا تماشہ دیکھنا
ہاں نقاب اُلٹے عروسِ شادمانی آئیگی
زندگی کی وہ درخشاں فصل، وہ عہدِ جمیل
زندگی کا وہ لطیف احساس، وہ پنہاں اُمنگ
زندگی کا وہ خیالِ جستجو، وہ حسنِ خیال

زندگی کو ہر قدم پر مُسکراتا دیکھنا
وہ بھی کیا دن ہوں گے جب تیری جوانی آئیگی
جیسے جنّت کا تصور، رقصِ جوئے سلسبیل
خاک کے سینے میں جیسے اِک مچلتی موجِ رنگ
جیسے شب کی تیرگی میں ماہِ تاباں کا جمال

زندگی کے وہ طپش آمیز ایامِ سکوں
عقل جن ایام میں کرتی ہے تعمیرِ جنوں

کاش میں بھی دیکھتا ننھی کلی! تیری بہار
تیرے ہونٹوں پر تبسم، رُخ پہ رنگِ افتخار

ولولے مچلیں گے سینے میں، نگاہوں میں سرور
آسماں کو خاک جانے گا جوانی کا غرور

ہر نفس بن جائے گا اِک موجِ طوفاں آفریں
اللہ اللہ وہ جوانی کا سرورِ دلنشیں

آہ! لیکن گھر کے جب اٹھّے گا ابرِ نوبہار
جانے کس عالم میں ہوگی یہ مری مشتِ غبار

میرے بچے! رازِ ہستی ہے ابھی زیرِ نقاب
جس کو ہم سمجھے ہیں دُنیا، ہے وہ بیداری کا خواب

ساحرہ دنیائے فانی کی بصد حسن و جمال
پھینکتی ہے روحِ انساں پر تمناؤں کے جال

اور پھر چہرے پہ اپنے ڈال لیتی ہے نقاب
آدمی ہوتا ہے، یہ قیدِ زبوں اور اضطراب

چھا رہا ہے اِس کرّے پر درد و عبرت کا دھواں
عشرتوں کے کچھ ادھورے خواب، کچھ مایوسیاں

زندگی اُن کی ہے جو آئیں شناسِ روزگار
جبر کے اجزا سے رکھتے ہیں بنائے اختیار

جن کے سینوں میں ہوس نشتر لگا سکتی نہیں
جن کی پیشانی کبھی دُنیا جھکا سکتی نہیں

روح کی تعمیر ہے بیدارئ سعی و عمل
صف بہ صف موجوں کے جزر و مد میں کھلتا ہی کنول

سینۂ انساں ہے اِک دریائے ناپیدا کنار
جس کی وسعت میں ہیں بے اندازہ موجیں بیقرار

اہلِ ہمت حلقۂ امواج میں رہتے نہیں
رُخ بدل دیتے ہیں طوفانوں کا، خود بہتے نہیں

وقت کی ناسازگاری پر نہ جانا چاہیئے
کھیل ہے یہ، رنج کیسا، مُسکرانا چاہیئے

یوں تو ہے ہر موجِ ہستی دشمنِ صبر و شکیب
سب سے گہرا ہے جہاں میں علم و دانش کا فریب

علم کیا ہے؟ خاطرِ ہستی کا ایسا فیضِ عام
جس سے ہو جائے گوارا زندگی کا تلخ جام

علم کیا ہے؟ ظلمتوں میں ناتواں سی موجِ نور
چند دن اس درد کی دُنیا میں جینے کا شعور

بے نیازِ منطق و حکمت ہے شرحِ کائنات
علم کی حد سے بہت آگے ہیں اسرارِ حیات

درسِ دانش لے مگر اندازِ نادانی نہ سیکھ
سیر کر لیکن اِس آئینے سے حیرانی نہ سیکھ

شاعری دنیا میں ہے گو اِک مقدس فن ضرور
بچ کے رہنا اس کے سائے سے مری آنکھوں کے نور!

دیکھتا ہے اُن کو شاعر کی نظر کا اضطراب
زندگی کے جو حقائق ہیں نقاب اندر نقاب

[illegible] ہے سرنامۂ ہستی فریبِ اعتبار
چند ذرّے خاک کے ہیں ورنہ [illegible] بہار

شاعر اوروں کو [illegible] سکتا ہے [illegible] سکتا نہیں
زندگی کا درس دے سکتا ہے جی سکتا نہیں

میرے بچے! دشمنِ علم و یقیں ہے روزگار
ذہن تا خورشید ہے لیکن سطح بینی کے شکار

عقل کی رَو میں بہا جاتا ہے انسانِ حقیر
روح کی آواز سے بیگانہ [illegible] ضمیر!

کچھ کھلونے ہیں زمانے کے نشانِ امتیاز
چند اوہامِ زبوں جن پر ہے اِس دُنیا کو ناز
اِک نہ اِک دن زندگی سے ہاتھ دھونے ہی تو ہیں
قصر و ایواں کیا ہیں، مٹی کے کھلونے ہی تو ہیں

ان میں دب کر رہ گئی دانش، کہ تھی انجم طراز
ان میں پھنس کر رہ گیا انساں، کہ تھا دانائے راز

چھوڑتا ہوں میں تجھے تنہا یہاں میرے یتیم!
آہ! وہ غنچہ کہ ہو بیگانۂ لطفِ نسیم
زندگی بھر کشتۂ بے مہریٔ دوراں رہا!
میں رہا، لیکن رہین کاوشِ پنہاں رہا
دردِ محرومی سے تھی آباد میری کائنات
صرف اِک غم تھا مری دنیا میں آئینِ حیات
صبح کو جب مسکراتا تھا جہانِ رنگ و بو
میری آنکھوں سے برستا تھا مرے دل کا لہو
جب سناتی تھی عروسِ شام رودادِ طرب
میرے سینے میں تڑپ جاتا تھا احساسِ تعب

ہر نفس تھا آتشِ پنہاں سے کھلایا ہوا
کچھ دھواں سا میری دنیا پر رہا چھایا ہوا

میری اِس حالت کا شاہد ہے خداوندِ قدیر
میں نے اِس حالت میں بھی بیچا نہیں اپنا ضمیر
خم ہوئی گردن نہ میری ماسوا کے سامنے
سر جھکایا تو جھکایا بس خدا کے سامنے
میں رہا گو عمر بھر تلخی کشِ روزِ سیاہ
میری پیشانی پہ لیکن کج رہی میری کلاہ
نامرادی پھینکتی تھی گو مرے دل پر کمند
اور بھی لیکن بپھرتا تھا مرا عزمِ بلند
جس قدر اٹھتا تھا گھر کر ابرِ وحشت آفریں
میرے سینے میں چمک جاتا تھا ایمان و یقیں

دیدۂ بینا، ضمیرِ بے ریا رکھتا تھا میں
کیوں فریبِ ناخدا کھاتا، خدا رکھتا تھا میں

سازِ ہستی میں نوائے درد گو پاتا نہیں
میں تری تعمیرِ مستقبل سے گھبراتا نہیں
جانتا ہوں یوں تو ہیں اس کی جفائیں بے پناہ
دہر میں بخشا نہیں جاتا یتیمی کا گناہ
جانتا ہوں بے کسوں کو آسرا ملتا نہیں
آہ کیا ملتا ہے اس دنیا میں کیا ملتا نہیں
تیری مونس ہونگی اے آسائشِ جانِ تباہ
وہ دعائیں جن کی بے اندازہ تاثیریں ہیں گواہ
ان عزیزوں سے اُمیدِ دلنوازی کیا کروں
قاتلوں پر اعتمادِ چارہ سازی کیا کروں
"جنگی دغابازی" یہ ہے جن کی محبت کا مدار
جن کی پیغمبر ہے دولت، جن کا خالق روزگار
جو مرے زخمِ جگر پر مسکراتے ہی رہے
نفس کے بندے فریبِ نفس کھاتے ہی رہے
میں خدا کو سونپتا ہوں تجھ کو اے جانِ پدر!
جس کی رحمت ہے طرازِ محفلِ نوعِ بشر
ہو سکے تو قوم کے غم سے نہ کرنا احتراز
بن پڑے تو ملک کی خدمت سے ہونا سرفراز
مضمحل ہونے نہ پائے کلفتوں میں قلبِ شاد
دیکھ، اپنی قوتِ بازو پہ رکھنا اعتماد

تو نہ ہونا عمر بھر منت پذیرِ ناخدا
تیری کشتی ہے، یہ دریا، تو ہے اور تیرا خدا

پنڈت ہری چند اختر

آخری غزل

ملے گی شیخ کو جنت ہمیں دوزخ عطا ہوگا
بس اِتنی بات ہے جس کے لئے محشر بپا ہوگا

رہے دونوں فرشتے ساتھ اب انصاف کیا ہوگا
کسی نے کچھ لکھا ہوگا، کسی نے کچھ لکھا ہوگا

بروزِ حشر حاکم، قادرِ مطلق خدا ہوگا
فرشتوں کے لکھے اور شیخ کی باتوں سے کیا ہوگا

تری دُنیا میں صبر و شکر سے ہم نے بسر کر لی
تری دُنیا سے بڑھ کر بھی ترے دوزخ میں کیا ہوگا

مُرکب ہوں ہیں نسیان و خطا سے کیا کہوں یارب
کبھی حرفِ تمنّا بھی زباں پر آ گیا ہوگا

سکونِ مستقل، دل بے تمنّا، شیخ کی صحبت
یہ جنّت ہے تو اس جنّت سے دوزخ کیا بُرا ہوگا

مرے اشعار پر خاموش ہے جز بر نہیں ہوتا
یہ واعظ واعظوں میں کچھ حقیقت آشنا ہوگا

بھروسہ کس قدر ہے تجھ کو اختر اس کی رحمت پر
اگر وہ شیخ صاحب کا خدا نکلا تو کیا ہوگا

یارانِ نکتہ داں

سید حسن مثنیٰ انور:۔

میں اپنے ایک عزیز دوست کے یہاں سال رواں کے سالنامہ "مہر نیمروز" کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اچانک صفحہ ۱۴ پر نگاہ ٹھہر گئی۔ بعنوان فرمان فتحپوری صاحب کا مضمون، "قدیم شعراء پر تاریخی نظر" تھا جسے پڑھ کر تحقیقی تشنگی کا شدید احساس ہوا۔ فرمان فتحپوری صاحب صفحہ ۱۶ پر حضرت مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

۱۔ (حضرت مخدومؒ) "نظام الدین اولیاؒ کے مرید ہونے کے لئے دہلی آئے"

۲۔ "آپ نے ۸۲۰ھ میں انتقال فرمایا"

فاضل مقالہ نگار کی دونوں باتوں سے مجھے اتفاق نہیں۔ نہ جانے موصوف کے علم میں یہ بات کہاں سے آئی کہ حضرت سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ سے بیعت حاصل کرنے کی غرض سے دہلی پہنچے؟

لطائف اشرفی مؤلفہ حضرت حاجی نظام یمنیؒ خلیفہ حضرت اشرف جہانگیرؒ میں تو ایک علیحدہ باب کے تحت حضرت مخدومؒ کے سفر و سیاحت اور بیعت کا ذکر ہے۔ "در میان ترک اورنگ سلطنت و اعراض از سریر مملکت و سپردن طریق سفر و انتقاب بعضے مشائخ عصر در راہ بتخصیص بحضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ و اتیان بجنازہ حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ و رسیدن بحضرت شیخ علاؤ الدینؒ (پنڈوی) و وصول بمقصود و ایثار مقامات خود و ارو القاب بخطاب جہانگیری ــــــــ" لیکن اس باب کی تفصیل میں کہیں بھی اس بات کا ذکر نہیں جس سے فرمان فتحپوری صاحب کے خیال کی تائید ہو۔ علاوہ ازیں دوسری کتب سیر مثلاً مراۃ الاسرار اور اخبار الاخیار وغیرہ میں بھی موصوف کی اس تحقیق کا کوئی نشان نہیں ملتا۔

اسی طرح حضرت مخدومؒ کا سن وفات ۸۲۰ھ بھی تاریخی اعتبار سے درست نہیں۔ مراۃ الاسرار مؤلفہ شیخ عبدالرحمٰن علوی (جس کا سال کتابت ۱۰۴۵ھ ہے) میں حضرت مخدومؒ کا سن وفات "بتاریخ بست و ہشتم ماہ محرم الحرام سنہ ثمان و ثمان مائۃ (یعنی ۸۰۸ھ) در زمان سلطنت سلطان ابراہیم شرقی" مندرج ہے اور اسی کے ساتھ ایک قطعہ تاریخ بھی ہے جس سے ۸۰۸ھ کی نشاندہی ہوتی ہے۔

"سید اشرف بہ جہانگیر جہان معرفت ✽ گشت چوں در بزم قرب از سر دلش آگہی

از پے سال وصالش از خرد کردم سوال ✽ گفت تاریخش بوصل حق بدہ جان نفیس" ۸۰۸ھ

۱۲۹۸ھ میں اعلیٰ حضرت سید شاہ علی حسین صاحبؒ سجادہ نشین درگاہ حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیرؒ کچھوچھہ شریف ضلع فیض آباد کی سعی و محنت سے لطائف اشرفی طبع ہوئی تھی، اس میں بھی حضرت مخدومؒ کے سن وصال کی تاریخ مادہ "اشرف المومنین" درج ہے جس کے اعداد بحساب ابجد ۸۰۸ نکلتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بعض متاخر نسخوں میں حضرت مخدومؒ کا سن وفات غلطی سے ۸۹۵ھ یا ۸۹۲ھ درج ہو گیا ہے

تذکرہ نویسوں نے اس کی اصلاح کی جانب توجہ نہ کی۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت مخدومؒ کی وفات دورِ سلطنت ابراہیم شرقی میں ہوئی۔ ——————— سلطان ابراہیم شرقی ۸۰۴ھ میں تخت سلطنت پر متمکن ہوا، لہذا حضرت مخدومؒ کا سن وفات ۸۰۴ھ سے قبل ممکن نہیں۔ البتہ ۸۰۸ھ میں حضرت عبدالرزاق نورالعینؒ کو حضرت مخدومؒ سے منصب خلافت و سجادگی ملا اسی لئے یہی سن مذکور حضرت کی وفات کا بھی معتبر سن ہے۔

لیکن جناب فرمان فتحپوری صاحب کی یہ تحقیق کہ حضرت مخدومؒ کا سن وصال ۷۸۲ھ ہے، سراسر غلط اور خلافِ واقعہ ہے۔ ۷۸۲ھ تو حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کا سنِ وفات ہے اور یہ وہی بزرگ ہیں جن کی نماز جنازہ حضرت مخدومؒ نے پڑھائی تھی۔ اب تاریخ کی اس روشنی میں اگر فاضل مقالہ نگار کی تحقیق پر جرأت لب کشائی کی جائے تو بات کہیں سے کہیں پہنچتی ہے۔

آخر میں جناب فرمان فتحپوری کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ حضرت مخدومؒ کی تصانیف میں بشارت الاخوان، ارشاد الاخوان، فوائد الاشرف، اشرف الفوائد، رسالہ بحث وحدۃ الوجود، رسالہ فضائل خلفائے راشدین، رسالہ قبریہ اور دیوان اشرف فارسی وغیرہ کے علاوہ رسالہ تصوف و اخلاق (بزبان اردو) کا بھی ذکر ملتا ہے جسے بعض اہلِ تحقیق نے اردو نثر کا نقشِ اول قرار دیا ہے۔ اسی تصنیف کے بارے میں میر نذر علی درد کاکوروی لکھتے ہیں:۔

"حضرت سید اشرف جہانگیرؒ والی مجلد ضخیم کتاب کو میں نے خود دیکھا ہے ضرورتاً اس صفحے پر ڈالے گئے ہیں۔ اس کتاب کے ص۱۸ کا ایک ٹکڑا ہے اے طالب آسمان زمین سب خدا ہیں ہے جو تحقیق جان اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرہ ہے تو صفات کے باہر بجز تمام ذات ہی ذات ہے۔" یہاں تک لکھ چکنے کے بعد اب خیال کرتا ہوں کہ اگر ہجوم اشغال سے ذرا بھی فرصت ملی تو باقی باتیں ایک تحقیقی مضمون کی شکل میں ماہ نیمروز کے لئے روانہ کروں گا۔ اس وقت تو صرف ان غلطیوں یا لغزشوں کی جانب اشارہ کرنا مقصود تھا۔

محمد شمس عظمی ماہ نیمروز کا سالنامہ بالاستیعاب نظر سے گذرا۔ میں آپ کو اس کی تنظیم و ترتیب پر ہدیۂ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ سالنامہ نظر فریب ہونے کے علاوہ دلفریب بھی ہے۔ لیکن یارانِ نکتہ داں کے تحت اس شمارہ میں جناب ماجد الباقری صاحب کے چند اعتراضات قابل غور ہیں۔ جناب موصوف نے ان شعرائے کرام پر جوش استقلال نمبر میں شریک تھے تنقید کی ہے۔

(۱) جناب فیض کی غزل کے پہلے شعر پر "یاد منانا" پر اعتراض کیا ہے انھیں معلوم ہونا چاہئیے کہ "یاد منانا" "یادگار منانے" کو کہتے ہیں اور اہلِ زبان اسی طرح بولتے ہیں خواہ وہ یادگار نغمہ شادی ہو یا نوحہ غم۔

اس غزل کے دوسرے شعر پر یہ اعتراض ہے "سلاؤ" کی جگہ "سلواؤ" کہنا چاہئیے تھا اور دلیل یہ دی ہے کہ ناسخ کے لفظ "بہلائے" پر فصحا نے اعتراض کیا تھا۔ اس کے متعلق یہ صراحت کہ پہلے تو یہاں بحث جواز یا عدم جواز یا صحیح اور غیر صحیح کی ہے۔ فصاحت اور عدم فصاحت کی نہیں۔ فصحا نے اگر اس کو غیر فصیح کہا ہو تو اس کو عدم جواز کی دلیل میں نہیں لایا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جائے گا کہ جائز تو ہے لیکن غیر فصیح اور اس نقطۂ نظر سے اعتراض نہیں ہو سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ "سلاؤ" امر ہے اور اس کا مصدر سلانا ہے جو متعدی ہے۔ سونا مصدر لازم کا، جس طرح سلوانا مصدر متعدی ہے اسی طرح سلانا بھی مصدر متعدی ہے اور زبان کا لفظ ہے البتہ سلوانا مصدر متعدی کا بھی مصدر متعدی ہے یعنی اس کا مصدر متعدی نمبر۲ سلانا ہے لیکن سلانا جس سے متعدی بنا ہے وہ مصدر متعدی نہیں بلکہ لازم ہے۔ یعنی "سونا" اور یہ ہر دو مصادر خواہ سلانا ہو یا سلوانا زبان کے الفاظ ہیں اور ان دونوں سے امر بنانا صحیح اور جائز ہے۔

تیسرے شعر پر "چڑھاؤ" کے لفظ پر ابتذال کا اعتراض کیا ہے اگر کسی کو اس میں ابتذال کی بو آتی ہے تو اس کی مثال ایسی ہے کہ "اذیت"

تنقید تسحیح بجا نیمہ

دوسرے یہ کہ چڑھانا زبان میں پینے اور نوش کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے شاعر نے اسی معنی میں اس لفظ کو استعمال کیا ہے اگر فاضل معترض ابتدا ہی کے بجائے یہ کہتے کہ شیشہ چڑھانا محاورہ نہیں تو ایک حد تک درست بھی ہوتا۔ اگرچہ پھر بھی معنویت کا لحاظ کرتے ہوئے درحقیقت یعنی جام یا بوتل لیا گیا ہے اور جام چڑھانا محاورہ میں داخل ہے۔

چوتھے شعر پر کوئی اعتراض نہیں اس میں اپنے نقطۂ نظر سے صرف اصلاح کر دی ہے کوئی اعتراض نہ کرنے یا کوئی قابلِ اعتراض بات موجود نہ ہونے کے باوجود لکھتے ہیں کہ "شعر اس طرح ہوتا تو اعتراض کی گنجائش نہ رہتی" اعتراض کی غیر موجودگی کے باوجود اعتراض کی گنجائش نہ رہتی کا کیا مطلب

اب یہاں یہ دیکھنا ہے کہ مصلح نے شعر میں اصلاح کر کے شعر کو بلند کر دیا یا پست اور قابلِ اعتراض بنا دیا اول یہ کہ امتیاز اجنبیت کو دور کرنے کے لئے مصافحہ کیا جاتا ہے البتہ اعترافِ خلوص کے لئے گلے لگایا جاتا ہے اور یہاں محل امتیاز اجنبیت سے اعتراض کا ہے نہ کہ اظہارِ خلوص کا اس محل پر جو محل ہے کہ اس شعر میں ہے ہاتھ ملانا ہی برمحل ہے۔

دیکھیے ذرا ہماری رواداریاں کوئی
اٹھے تو بزمِ غیر میں سب ملا کے ہاتھ

دشمن کا لفظ استعمال کر کے شاعر بتاتا ہے کہ اس سے بھی دشمن کے روز رواداری برتو اظہارِ خلوص نہیں یہاں رواداری یعنی ہاتھ ملانا ہی صحیح ہو سکتا ہے غرض یہ کہ معنویت کے لحاظ سے یہ اصلاح کس قدر بے محل ہے۔

اپنے اصلاح دادہ شعر کے پہلے مصرع میں یہ تصرف کیا ہے کہ

"تمیز رہبر و رہزن نہ آج ان میں کرو"

مجھے اس اصلاح پر سخت تعجب ہے "نا ـــــــــــــــــــــــــ لوگ" ایاز قدر خود بشناس کو ذرا ملحوظ نہیں رکھتے۔ اب اس مصرع کی نثر بنایئے تو جملہ یوں ہوگا کہ "آج ان میں تمیز رہبر و رہزن نہ کرو" بتلایئے تو یہ کہاں کی زبان ہوئی اور جملہ ترکیب کس قدر غلط ہوگئی نثر بنانے کی صورت میں ہوتا تو یہ چاہیئے تھا کہ "آج تمیز رہبر و رہزن نہ کرو" (ان میں) کہاں سے ٹپک پڑا جب رہبر و رہزن کے لفظ آ گئے اور اسم اپنی جگہ موجود ہے تو اس کا نائب یعنی ضمیر لانے کی ضرورت ہی کیا رہی فاضل معترض نے اصلاح دیتے وقت آخر غور کیوں نہیں کر لیا کہ اس سے تو شعر بننے کے بجائے اور بگڑ گیا (آج کے دن تمیز رہبر و رہزن نہ کرنا) اپنی جگہ بالکل درست تھا اگر یہ اعتراض کرتے کہ تمیز اردو لفظ ہے اور تمیز عربی لفظ میں تصرف کر کے اپنا لیا گیا ہے اور اردو لفظ کی اضافت فارسی لفظ کی طرف جائز نہیں تو یہ کہنا کسی حد تک بجا ہوتا۔

(۲) جناب خالد مینائی کی نظم میں لفظ "سوے" پر اعتراض کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ بروزن فعل نظم کیا گیا ہے حالانکہ پانچویں اور پندرہویں شعر میں دونوں جگہ یہ لفظ بطور (ساکن الاوسط) استعمال نہیں ہوا بلکہ (متحرک الاوسط) استعمال ہوا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بروزن فعلن ہونا چاہیئے حالانکہ ایسی کوئی تخصیص نہیں بروزن فعلن اور بروزن فَعِلُ اور بروزن فعل (ساکن الاوسط) اور بروزن فع (متحرک الاول والآخر) چاروں طرح یہ لفظ آ سکتا ہے۔ فاضل معترض نے وزن فعلن کی تخصیص کے ساتھ مرزا غالب کا شعر پیش کیا ہے۔ تعجب ہے کہ مرزا غالب نے تو لفظ (سوے) کو بروزن فعل (ساکن الاخیر) استعمال کیا ہے۔ نظیر دعوے کی مخالفت کر رہی ہے یعنی دعویٰ مسن چہ سرا کا مصداق ہے غرض یہ کہ خالد صاحب نے تینوں جگہ یہ لفظ صحیح استعمال کیا ہے۔

چھبیسویں شعر میں (لیجے) پر اعتراض ہے حالانکہ لیجے اور لیجیے۔ کیجے اور کیجیے زبان میں دونوں صحیح ہیں یہ اعتراض بھی بانظیر کے خلاف ہے۔

بے سروسامان کا اعتراض قابلِ وقعت نہیں اس لئے کہ اعلانِ نون، جب اس کے پہلے حروفِ علت آئے ہوں تو فارسی میں جائز نہیں لیکن اردو میں نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہی رہی یہ چیز کہ بے سروسامان کو کیا سمجھنا چاہیئے اردو یا فارسی یہاں یہ لفظ اردو سمجھ لیا گیا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ فارسی ترکیب اضافی سے باہر ہے۔ اگر "مردِ بے سروسامان کہا جاتا" تو بے شک اظہارِ نون جائز نہ ہوتا یہ شبہ کہ (بے) فارسی کا ایک حرف (نافیہ) ہے اور سروسامان کو اردو قرار دیں تو فارسی لفظ کی اردو لفظ کے ساتھ ترکیب غلط ہو جائے گی تو یہ شبہ ٹھیک نہیں کیونکہ (بے) کا لفظ بطور نفی اردو میں بھی آیا ہے۔ جیسے (بے جوڑ۔ بے لاگ) اور پھر یہ کہ یہ لفظ مفرد استعمال ہوا ہے اور اردو نے اس کو اپنا لیا ہے۔ اب اظہارِ نون جائز بلکہ ضروری کیوں نہ ہو۔

(۳) جناب لیث قریشی کی نظم کے ایک مصرع۔

سہ "عروسِ آزادی انجمن میں جو ناز سے بن سنور کے آئی"

پر یہ اعتراض فرمایا ہے کہ آزادی کی (ی) کا تقطیع سے گرنا معیوب ہے واقعہ تو یہ ہے کہ فاضل معترض نے یہ اعتراض محض برائے اعتراض کیا ہے۔

جب کسی لفظ کے بعد الف وصل آ جائے اور توازن کی ضرورت ہو تو اس کے پہلے والے ساکن حرف کو گرا دیتے ہیں یعنی اس کو تقطیع میں شریک نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ تقطیع کے قواعد کے رو سے جب حروفِ علت الفاظ کے آخر میں آ جائیں تو ان کے ماقبل کی حرکت ہی پورا کام کرتی ہے اور وہ حروفِ علت تقطیع میں شمار نہیں کئے جاتے۔ اس کی بین مثال شیخ سعدی کے ایک مصرع میں موجود ہے فرماتے ہیں۔ سہ "چو آں جملہ را سعدی املا کند"

سعدی املا کند میں جس طرح (ی) خارج از تقطیع ہے بالکل اسی طرح آزادی انجمن میں بھی (ی) خارج از تقطیع ہے۔

(۴) جناب جمن ایلیا کا یہ مصرعہ ہدفِ اعتراض ہے۔

سہ "ناقوسیان شہرِ بتاں سے ہے ربطِ خاص"

فرماتے ہیں ناقوس اردو کا لفظ ہے اس لئے اس کی جمع بحالت (حملہ) واو نون سے ہونا چاہیئے حالانکہ یہ لفظ اردو نہیں عربی ہے اہلِ فارس نے اولاً اپنایا پھر اپنے قواعد کے رو سے اس میں (ی) فاعلی لگا کر ناقوس بجانے والے کے معنی میں لیا۔ اب اس پر بلحاظ فارسی ہونے کے بصورتِ جمع الف نون بالکل صحیح ہے۔ لیکن اس کی اصلاح جو فاضل معترض نے کی ہے وہ بہت ہی ناروا ہے۔ کہتے ہیں یوں ہونا چاہیئے

سہ "ناقوسیوں سے شہرِ بتاں کے ہے ربطِ خاص"

اس طرح ناقوسی کی جمع ناقوسیوں ہوئی اور ناقوسی اردو زبان میں کوئی لفظ نہیں۔ کیونکہ یائے فاعلی فارسی میں ہے اردو میں نہیں اس لئے یہ اصلاح (شعر مرا بہ مکتب کہ برد) بن کر رہ گئی۔

۵۔ فاضل معترض کے ترکش کا آخری تیر جناب ہادی مچھلی شہری جیسے محتاط و کہنہ مشق صاحبِ فن کو نشانہ بناتا ہے فرماتے ہیں۔ جان کا نون بالاعلان ہونا چاہیئے۔ یہ دعویٰ تو صحیح ہے لیکن محلِ اعتراض بالکل غلط ہے کیوں کہ یہاں نون کے بعد الف وصل ہے۔ جس کو گرا کر نون بالاعلان پڑھا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتراض بھی صاحبِ اعتراض کی فنی ناواقفیت کا غماز ہے۔

محمد امین شمسی :۔

مہر نیمروز کا جو استقلالِ پاکستان نمبر میری نظر سے گزرا اس میں شک نہیں کہ صوری و معنوی اعتبار سے قابلِ ستائش دوا ہے "یارانِ نکتہ داں" کے سلسلے میں ایک صاحب ماجد الباقری نے جن کو میں تفصیلی طور پر نہیں جانتا۔ چند شعراء پر اعتراض کرنے کی کوشش کی ہے

ن کی چند باتوں سے مجھے قطعی اتفاق ہے۔ لیکن خدا جانے کس رو میں چند بیگناہ بھی ان کے قلم کا شکار ہو گئے ہیں مثلاً

؎ عروسِ آزادی انجمن میں جہاں سے بن سنور کے آئی۔

یہ معروف لیث قریشی صاحب کی ایک نظم کا ہے۔ اس پر یہ اعتراض ہے کہ آزادی کی "ی" تقطیع سے گر رہی ہے اور یہ معیوب ہے اعتراض محلِ غور ہے۔

دوسرا اعتراض جناب ہادی مچھلی شہری کی غزل کے پانچویں شعر پر ہے۔ شعر یوں ہے ؎

مرا ایک دل اور اتنے مصائب ہو مری ایک جاں اور اتنی بلائیں

ماجد الباقری صاحب فرماتے ہیں کہ "جاں" میں اعلانِ نون کو فصحا ضروری سمجھتے ہیں۔ میری رائے میں صرف یہی نہیں کہ "جان" ں میں اعلانِ نون ضروری ہے۔ بلکہ ہر دو سہ حرفی اسماء جس کے آخر میں "نون" ہو۔ بغیر عطف و اضافت کے "نون" کا اعلان ہی کرنا بہتر ہے۔ ہادی صاحب کے شعر پر یہ اعتراض اس لئے غلط ہے کہ "جاں" کے بعد "اور" کا لفظ ہے جس میں "الف" وصل کے گرنے سے "جاں" نون کا اعلان ہو جاتا ہے۔ ہادی صاحب کہنہ مشق شاعر ہیں ان سے ایسی سطحی غلطیوں کے امکان کا تصور نہیں ہو سکتا۔ نہ جانے ماجد الباقری صاحب سے یہ کس نے کہہ دیا ہے کہ "ناقوس" اردو کا لفظ ہے۔

مہر نیمروز کا سالنامہ جنوری ۱۹۵۹ء کا شمارہ بھی میرے پیشِ نظر ہے۔ مضامین دلکش ہیں اور ادبی لحاظ سے بڑی خوبیوں کا حامل ہے اس ن ایک مضمون اجمل اجملی کا بھی ہے۔ جس کا عنوان ہے "ترقی پسندوں کی روایت پرستی"۔ اگرچہ اجمل اجملی سلمہ کے بعض نظریات سے مجھے ی قدر اختلاف ہے پھر بھی مجھے مسرت ہے کہ مضمون میں کاوش کی گئی ہے اور خیالات اچھے انداز سے پیش کئے گئے ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

مسلسل ۲ ماہ[1] تک کشاکش "ایاب و ذہاب"، اور کشمکش "طلوع و غروب" کی کیفیات سے دوچار رہنے کے بعد آسمانِ ادب پر مہر نیمروز ن آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا طوفان کی آمد سے پہلے ساحل کی خاموشی جس چیز کا پتہ دیتی ہے اس پر کوئی تلاطم آشنا ہی روشنی ڈال سکتا ہے سکی بار مہر نیمروز اپنے جلو میں کیا کچھ لے کر نہیں آیا۔ جناب حسن عسکری پر کلیم الدین صاحب کے اعتراضات میں واقعات و حقائق پر روشنی ڈالی ہے میں ایک عرصے سے محسوس کر رہا ہوں کہ ان دنوں ہمارے ادبی نظام میں "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کی تحریک بڑی شدت سے زور پکڑ رہی ہے، اس تحریک کا بہترین نمونہ ہمارے سامنے محمد طفیل صاحب کے مؤقر رسالہ نقوش کے شخصیات نمبر میں نظر آیا۔ چند مضامین سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو بیشتر افراد نے ایک دوسرے پر طبع آزمائی فرمائی ہے جسے تحریک تحسین باہمی "کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ مقام شکر ہے کہ کلیم صاحب نے وہی کیا اور وہی لکھا جس کی توقع ہم ایک صائب الرائے اہلِ قلم سے رکھتے ہیں البتہ مجھے ان کے اندازِ تحریر سے اتفاق نہیں غیر ملکی ادب کو مقامی ملکی ادب سے روشناس کرانا کوئی جرم نہیں بلکہ یہ اقدام تو مستحسن ہے۔ ابتدائے آفرینش سے مختلف علاقائی تہذیبیں ایک دوسرے سے متعارف ہوتی آئی ہیں اور ہمیشہ ان کے حسنِ و قبح نے "غالب و مغلوب" کا فیصلہ خود کر دیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تہذیب و معاشرہ کی ترقی میں ادب سے بہت بڑا کام لیا گیا ہے۔ ہمارے آئینہ ادب کے حق میں اگر کوئی غیر ملکی ادب صیقل کا کام کرتا ہے تو ہم اسے ضرور خوش آمدید کہیں گے مگر صرف اس لئے کہ ایک "ادب"، ہمارے "ادب" کے مہمان خانہ میں جلوہ فرما ہے خواہ وہ بد باطن ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی نیت تخریبی ہی کیوں نہ ہو ہم اسے اپنے سر آنکھوں پر جگہ دیں، یہ ہمارا شیوہ نہیں۔ اس وقت تو ہمارے ذہن میں استفسار کا یہ پہلو پیدا ہوگا کہ

---

[1] تین ماہ نہیں، دو ماہ کہیے۔ (ادارہ)

سه حضرت ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرش راہ　　کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

ہمارے ملک کے ادیب و شاعر اب ذہنی طور پر اتنے بالغ ہو چکے ہیں کہ وہ اب یہ نہیں دیکھتے کہ کون کہہ رہا ہے بلکہ اس پر غور کرتے ہیں کہ کیا کہا جا رہا ہے
عسکری صاحب حضرت فراق کی ہمنوائی کرتے ہیں اور مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ فراق صاحب ایک عرصے سے اردو دشمنی پر تلے ہوئے ہیں مجھے
اچھی طرح یاد ہے کہ الہ آباد کی ادبی نشستوں میں (جو پروفیسر ضامن علی مرحوم کے گھر پر یا مسلم بورڈنگ ہاؤس میں ہوا کرتی تھیں) آج سے چودہ سال پہلے
فراق صاحب کھلے بندوں کہا کرتے تھے کہ میں ہندی الفاظ کا سہارا لے کر ہندی شاعری کے اچھوتے خیالات کو اردو شاعری میں سمونا چاہتا
ہوں ... رسماہٹ، کمناہٹ، مسکان، روپ، کامنی، سندرتا، اگنی، آشا، آکاش، نیلما، اور مورتی جیسے (شبدوں کے پریوگ سے)
الفاظ استعمال کر کے انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارا ادبی سرمایہ ہندی ادب کے مقابلے میں کم ہے، وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ
میں ہندیت، "بمقابلہ فرعونیت، لکھنا میں اردو شاعری میں جائز تصور کرتا ہوں، فراق صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں :-

"اگنی کنڈ ہے سینہ فراق　　کا　　دھڑ دھڑ جلتی ہے آگ

اردو شاعری نے جو اصناف سخن مقرر کئے ہیں، اُن میں گیت اور دوہے کوئی چیز نہیں۔ مگر آج کل یہ دیکھا عام ہوتی جا رہی ہے کہ اردو شعراء
غزلوں کے ساتھ گیتوں اور دوہوں کو بڑے ذوق و شوق کے ساتھ منظر عام پر لانے کی کوشش کر رہے ہیں ان کو یہ نہیں معلوم ہے کہ ہمارا ادبی سرمایہ آج
سے نہیں ہے، جو خسرو کی خالق باری، ملک محمد جائسی، اور عبدالرحیم خانخاناں کے دوہوں کی زبان تک محدود تھا۔ پھر جائسی اور خانخاناں تو باضابطہ
ہندی کے شاعر تھے۔ ہمارے اردو شعراء ہندی اور سنسکرت میں فکر فرمانا چاہتے ہوں تو شوق سے فرمالیں۔ مگر اس کو اردو شاعری سے تو
الگ رکھیں، ہم ان کو اردو زبان کا نہیں ہندی کا شاعر کہیں گے غالباً اس حقیقت کو اردو زبان کے خوش فکر شاعر جناب جمیل الدین عالی نے سمجھا جب ہی
اپنے مجموعہ کا نام غزلیں، دوہے اور گیت،، رکھا ہے، اور جناب انشاء نے بلکہ زیادہ صحیح تو یہ کہنا ہوگا کہ انشا جی نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام چاند نگر
رکھا ہے، وہ ظاہر تو یہ کرتے ہیں کہ میر سے بہت متاثر ہیں۔ مگر وہ شاید باخبر ہوں کہ میر کی زبان سنسکرت سے معرّیٰ ہے۔ عسکری صاحب پر تو
بڑا الزام ہے کہ وہ غیر ملکی ادب کو ہمارے ادب کی رگ و پے میں جاری و ساری کرنا چاہتے۔ مگر آپ ان کے بارے میں کیا فتویٰ دیتے ہیں جو لوگ
بہ نفس نفیس غیر ملکی، غیر علاقائی اور غیر معاشرتی زبان کو ہماری نئی پود پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔

امتیاز علی عرشی

کچھ غالبؔ کے متعلق

میرزا غالب اُردو شاعروں میں سب سے زیادہ خوش بخت ہیں کہ ان کے متعلق ہر سال ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اگلی سطروں میں اپنی تازہ دریافت پیش کرتا ہوں، تاکہ غالب دوست اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

(۱)

نواب محتشم الدولہ غوث محمد خاں بہادر شوکت جنگ والی جاورہ نے ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں ہندوستان کی سیر و سیاحت کی تھی۔ ان کی روداد سفر مذکورۃ صدر سال کے اندر ہی ریاست کے سرکاری مطبع سے مصوّر شائع ہوئی تھی۔ یہ "سیر المحتشم" نام سے موسوم ہے اور مورخین کے مطالعے کی حق دار ہے۔ نواب صاحب نے شعرائے دہلی میں سے میرزا غالب، امام بخش صہبائی اور ذوق کا ذکر کیا ہے۔ غالب کے بارے میں اُن کا بیان حسب ذیل ہے۔

"شاہجہان آباد میں شعرا بھی بہت ہیں۔ ہر ایک اپنے اپنے انداز خوش بیانی اور طرز شیریں کلامی میں ہلالی و زلالی اور فیضی و عرفی ہے مگر میرزا اسداللہ خاں غالب عرف میرزا نوشہ کمالِ سخنوری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اگر وہ وکی اس زمانے میں ہوتا، تو اپنے دیوان کو روِد اشکِ ندامت میں دھوتا۔ اگر آذری ان کے کلام روشن کو دیکھتا تو آتشِ غیرت سے اپنی تصنیفات کو جلا دیتا۔ حقیقت میں اُن کا ہر مصرع، مصرعۂ ہلالِ آسمان سے بلند تر ہے، اور بیت، بیت ابروے خوباں سے خوب تر۔ معانی دقیق گویا تنگی دہانِ غنچہ وہناں، اور مضمونِ باریک موی میانِ نازک بتاں۔ خیالات میرزا جلال اُن کے دامِ زلفِ خیال بندی میں سراپا اسیر، اور معانیٔ بلند پروازِ بیدل اُن کی نظم مسلسل میں پابہ زنجیر۔ نثر گہر بار نصیرائے ہمدانی اُن کی عبارت پر بشارت کے آگے معترف بیچمدانی۔ چار عنصر میرزا بیدل اُن کے فقرات موزوں کے رو بہ رو نامقبول۔ انشاء وحید و ابوالفضل اُن کے رقعات بے بدل کے مقابل میں ذلیل و مبتذل۔ یہ اشعار انہیں کے ہیں۔ نظم

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد　　　بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی　　　ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق ہے　　　ہے مکرر لبِ ساقی سے صلا میرے بعد

ایضاً

دل جگر تشنۂ فریاد آیا　　　پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ　　　سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

ولہ

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں　　　ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

تیری فرصت کے مقابل اے عمر برق کو پابحنا باندھتے ہیں

ولہ

دوست غمخواری میں میری سعی فرماویں گے کیا زخم کے بھرتے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا

ولہ

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

ولہ

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ گھر میں آئے ہمارے خدا کی قدرت ہے کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اس اقتباس میں غالب کا تقابل فارسی کے استادوں سے کیا گیا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ خود نواب صاحب کی نظر میں، یا جن اصحاب نے انہیں معلومات بہم پہنچائیں تھیں ان کی نظر میں، غالب اردو کے نہیں فارسی کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں کے ہم پلہ تھے

(۲)

قاطع برہان کے جواب میں مولوی احمد بنگالی نے موید البرہان لکھی، تو جواب در جواب کا ایک طویل سلسلہ قائم ہو گیا۔ امیر مینائی مرحوم نے غالب کی حمایت میں ایک مضمون لکھ کر چھپوایا۔ تو اس کے جواب میں میرزا آغا علی شمس شاگرد قاضی محمد صادق خاں اختر نے اودھ اخبار شمارہ ۲۶، مورخہ ۲۵ جون ۱۸۶۷ء میں اس کی تردید کی۔ اس تردید میں آغا نے غالب کے چند اردو شعروں پر اعتراض بھی کئے تھے، باقر نے فارسی نثر میں ان کا رد کیا۔ اور خود نقیل پر اعتراض جڑے۔ آغا کا ایک اعتراض یہ تھا کہ غالب نے اپنے مصرع "نافہ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے" میں اعلان نون کیا ہے، جو درست نہیں۔ اس کا جواب باقر نے یہ دیا۔ (دیوان صفحہ ۴۴) کہ اصل میں مصرع یوں تھا۔ "نافہ زمیں ہے یہ نہ کہ نافِ غزال ہے" مطبوعہ نسخے کے کاتب نے لفظ "یہ" کو جو لفظ "نہ" کی تجنیس ہے، مکرر جان کر حذف کیا اور مصرع دیوان میں غلط چھپ گیا، ورنہ یہ غلطی تو مبتدی بھی نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ رئیس المنتہین۔ لیکن یہ واقعہ یہ ہے کہ غالب کے تمام قلمی و مطبوعہ نسخوں میں "نافہ زمیں ہے" اعلانِ نون ہی ہے، اس لئے باقر کا یہ جواب کسی طرح درست نہیں۔ اگر یہ غلطی ہے تو ان کے استاد رئیس المنتہین سے یقیناً سرزد ہوئی ہے

(۳)

کوئی بزرگ سید امداد علی شاہ وغیرہ وارثی تھے انہوں نے بوئے خلد نام کی ایک چھوٹی سی کتاب مرتب کی تھی جو مختلف شعرا کے چیدہ منقبتی کلام پر مشتمل ہے اور مطبع یوسفی دہلی میں ۱۳[illegible] میں چھپی تھی۔

اس کتاب کے آخر میں (ص ۵۶) انہوں نے بعنوان "لطیفہ غالب" لکھا ہے کہ مرزا اسد اللہ الغالب (غالب) دہلوی اپنے معمولی شغل میں تھے ناگاہ ایک شخص نے دستک دی، معلوم ہوا کہ میر حامد ہیں۔ اندر آنے کی اجازت ہوئی۔ بعد مزاج پرسی حال تشریف آوری دریافت فرمایا۔ میر صاحب نے عرض کی عرصے سے ایک مصرع کے واسطے متفکر اور متحیر ہوں۔ ہر چند مغز مارتا ہوں لیکن مصرعہ ثانی موزوں نہیں ہوتا۔ مرزا صاحب نے کمال مہربانی سے مصرع پوچھا۔ میر صاحب نے یہ مصرع کہا۔

اسپ و زن و شمشیر وفادار کہ دید؟

مصرع سنتے ہی مرزا صاحب جوش میں اٹھ کھڑے ہوئے اور بآواز بلند بڑے جذبے اور شوق سے یہ فرماتے تھے۔ واللہ علی دید علی دید علی دید، اور بار بار متکرر خوش ہو کر اچھلتے تھے اور فرماتے تھے۔

اسپ و زن و شمشیر وفادار کہ دید؟ واللہ، علی دید، علی دید، علی دید

میر حامد صاحب اس علم و لیاقت پر اور حاضر جوابی پر عش عش کر گئے اور خوش و خرم اپنے دولت سرا کو واپس ہوئے۔ (ملخص)

مسیح الزماں

غالب کے چند اشعار

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا　　　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا!

نظم طباطبائی نے غالب کے اس مشہور شعر کو مہمل قرار دیا ہے عبدالباری آسی نے اس کی تشریح یوں کی ہے :-

"مصنف مرحوم نے اس شعر کے معنی عودِ ہندی میں بیان کئے ہیں کہ ایران میں رسم ہے کہ مستغیث کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے۔ یہ لباس گویا دادخواہوں کا نشان قرار دیا گیا ہے۔ مستغیث اس سے پہچانا جاتا ہے۔ تو اس صورت میں شعر کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ نقش یعنی تصویر نقاش کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے کہ اس نے یہ لباس پہنایا ہے یعنی نقاش حقیقی نے اس شوخی سے جس سے غالباً صفائی مراد ہے۔ تصویرِ انسانی کو صفحۂ ہستی پر کھینچا ہے کہ ہر تصویر اس شوخی سے فریاد کرتی ہے۔ اور اس جدائی سے جو ہستی کی صورت حال میں ظہور میں آئی ہے ہر تصویر نالاں ہے۔ مولانا روم کے یہاں بھی ایسا ہی خیال ہے :-

بشنو از نے چوں حکایت می کند　　　　وز جدائی ہا شکایت می کند

آسی کی اس تشریح میں کاغذی پیرہن کی وضاحت نہیں ملتی۔ جب یہ مراد لے لیا کہ نقاش حقیقی نے تصویرِ انسانی کو صفحۂ ہستی پر کھینچا ہے تو جب تک صفحۂ ہستی کو کاغذ یا کاغذی ثابت نہ کیا جائے ایران کی رسم کے مطابق انسان کو دادخواہ کیسے کہا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ شوخی سے صفائی مراد لینے سے شعر کے معنی صاف نہیں ہوتے۔ جوش ملسیانی نے اس شعر کے معنی یوں بیان کئے ہیں :-

"بعض کا قول ہے کہ یہ شعر مہمل ہے۔ مگر یہ سراسر ناانصافی ہے۔ مرزا صاحب تجاہلِ عارفانہ کے انداز میں فرماتے ہیں کہ موجودات کے ہر نقش میں کسی نے اپنی صنعت گری سے اتنی شوخیاں بھر دی ہیں کہ کوئی شخص ان شوخیوں کی تاب نہیں لا سکتا اور فریاد کرتا ہوا نظر آتا ہے دوسرے مصرعے میں صنعت حسن تعلیل ہے۔ تصویر کا لباس کاغذی ہوتا ہے۔ مرزا اس لباس کو فریادیوں کا لباس قرار دیتے ہیں۔ شوخیوں سے مراد ہے اشیاء کا بننا اور بگڑنا"

اس تشریح میں جوش ملسیانی نے نقش اور تصویر کو الگ الگ قرار دیا ہے اس کے علاوہ نقش، شوخیٔ تحریر، اور پیکرِ تصویر میں جو رعایت ہے اسے نظر انداز کر دینے سے ان کا بیان کیا ہوا مفہوم شعر سے نہیں نکلتا۔ اس طرح ان دونوں تشریحوں کے باوجود بھی شعر پر نظم کا اعتراض باقی رہتا ہے۔

ہمارے نزدیک اس شعر کے معنی یوں بیان کئے جائیں تو متذکرہ بالا عیوب نہیں رہیں گے۔

نقش اور تصویر سے مراد انسان یا موجودات عالم۔ تحریر سے مراد تخلیق کائنات ذہنی طور پر ایرانی رسوم و روایات سے وابستہ ہونے کی وجہ سے شاعر کے ذہن میں کاغذی کپڑے پہننا دادخواہی کی علامت ہے۔ دنیا کی ہر چیز اور اس طرح انسان کا جسم بھی فانی اور چند روزہ ہے جسے ناپائیداری کے لحاظ سے کاغذی کہہ سکتے ہیں۔ کاغذی پیکر اور کاغذی لباس کا جو مفہوم شاعر کے ذہن میں پہلے سے موجود ہے اس کی وجہ سے ساری خلقت اس کو فریادی نظر آتی ہے۔ اور وہ حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ دنیا میں جسے دیکھو کاغذی پیرہن پہنے (مراد ہستی ناپائیدار) نظر آتا ہے یہ سب کے سب نقاش حقیقی کے ناز معشوقانہ یا ستم دلبرانہ (شوخی) کے شاکی ہیں کہ جب ان کو آتی ناپائیدار کے ساتھ چند روزہ زندگی دینا تھی تو یہ بخشش کی ہی کیوں گئی؟ انھیں پیدا ہی کیوں کیا گیا۔؟ اس تیرہ خاکدان میں بھیجا ہی کیوں گیا۔ بقول ظفر

اس سے بہتر تو یہی تھا کہ نہ بنایا ہوتا

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی
کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا!

نظم طباطبائی :- "آشوبِ ہوشیاری کے برداشت کرنے سے حوصلے کو عجز ہے۔ اس عجز نے ہوشیاری و آگہی پر خطِ ایاغ کھینچ دیا ہے۔ یعنی صفحۂ خاطر پر سے اسے کاٹ دیا ہے۔ حاصل یہ کہ ایاغ پیکرِ ہوشیاری کو محو کر دیتا ہے۔"

آسی :- "بے شراب کے آشوبِ ہوشیاری کے برداشت کرنے کی کسے طاقت ہے اسی لئے میرے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کھینچ کر صفحۂ دل پر سے اسے کاٹ دیا۔ خط کھینچ دینے کی بجائے خطِ ایاغ کھینچ دینا ایک لطیف معنی رکھتا ہے۔ یعنی اس کے مقابلہ پر اس کو ترجیح دی۔ اور جس چیز کی وجہ سے ترجیح دی اس کے خط سے آشوبِ آگہی کو رد اور باطل کیا یعنی ہوشیاری کے مقابلہ پر میں نے بے ہوشی کو اچھا سمجھا۔"

جوش ملسیانی :- "عقل و فہم نے جو شورش برپا کر رکھی ہے اس کا تدارک کرنے کی طاقت شراب کے بغیر اور کس چیز میں ہے۔ شراب سے مراد محبتِ الٰہی کی شراب ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ عقل و فہم کی شورش نے حوصلہ کو عاجز کر دیا اور اسی عجز و حوصلہ نے خطِ جام کھینچ دیا یعنی اس شورش کو صفحۂ خاطر سے کاٹ دینے کے لئے ہمیں مے کشی پر مائل کر دیا۔"

شعر کا مفہوم تو یقیناً وہی ہے جو ان لوگوں نے بیان کیا ہے لیکن جو تشریح کی گئی ہے اس سے دوسرے مصرعے کے الفاظ کی تشنگی باقی رہتی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ سب شارحین نے خط کھینچنے کو محاورے کے اعتبار کاٹ دینے یا مسترد کر دینے کے معنوں میں لیا ہے۔

شیشے کے پیالے یا گلاس میں جس سطح تک کوئی رقیق بھرا ہوتا ہے وہاں پر دیکھنے والے کو ایک نشان سا نظر آتا ہے۔ اسے خطِ ایاغ یا خطِ جام کہتے ہیں۔ جب شراب کی مقدار پیالے میں زیادہ ہوگی تو یہ خط اوپر ہوگا۔ اور جب کم ہوگی تو نیچے ہوگا۔ گویا خطِ جام سے شراب کی مقدار معین ہوتی ہے۔

آگہی کو برداشت کرنے کی کسی میں طاقت نہیں اس آشوب کی تاب لانے سے حوصلہ عاجز ہے اور اس لئے آدمی شراب پینے لگتا ہے کہ اس کے نشے میں آدمی بے خود ہو کر اس آشوب کو برداشت کرلے جائے۔ لیکن یہ بے خودی لانے کے لئے بھی ہر ایک کو شراب کی یکساں مقدار درکار نہیں ہوتی۔ کوئی ذرا سی پی کر جھومنے لگتا ہے اور کوئی زیادہ پی کر بھی باہوش رہتا ہے۔ اس لئے شاعر نے یہاں کہا ہے کہ عجزِ حوصلہ شراب کی مقدار معین کرتا ہے یعنی جس کا حوصلہ جتنا عاجز ہوتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ شراب پیتا ہے تاکہ آشوبِ آگہی کو برداشت کرلے جائے۔

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

اس شعر کا مطلب عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ عاشق اپنے محبوب کی کج ادائی سے تنگ آ کر عشق و وفاداری کے تمام تقاضوں کو پس پشت ڈال دینے کے لئے تیار ہو گیا ہے اور سر پھوڑنے کے لئے محبوب کے سنگِ آستاں کی قید اٹھا دینا چاہتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو اس شعر کا سب سے اہم لفظ "ٹھہرا" ہے جس کے معنی ہیں قرار پایا یا طے کیا گیا۔ اسی سے یہ ظاہر ہے کہ محبوب نے عاشق کی جبیں سائی کو جو اس کی بے پناہ عقیدت اور جاں سپاری کی ایک نشانی ہے، صرف سر ٹکرانا قرار دیا ہے۔ اسے وفاداری اور عشق سے غیر متعلق ٹھہرایا ہے کہ کیسی وفا اور کہاں کا عشق یہ تو سر کی شوریدگی مٹانے کے لئے سر مارتا پھرتا ہے۔ اس کے جواب میں عاشق کہتا ہے کہ اگر میرا مقصد صرف سر پھوڑنا ہوتا تو وہ ہر پتھر سے حاصل ہو سکتا تھا تیرے سنگِ آستاں کی کیا خصوصیت ہے۔ اس طرح وہ یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ صرف تیرے در کی جبیں سائی اس بات کا ثبوت ہے کہ میں تیرا سچا چاہنے والا ہوں۔

اس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ نہیں، خفگی نہیں، عاجزی ہے۔ جب محبوب اس کی محبت کو کیسی وفا اور کہاں کا عشق کہہ کر سر پھوڑنا ٹھہراتا ہے تو وہ محبوب ہی کے الفاظ "وفا کیسی کہاں کا عشق" دہرا کر اس سے سوالیہ انداز میں پوچھتا ہے کہ "جب سر پھوڑنا ٹھہرا تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو"۔ اس پہلو پر بھی تو نے غور کیا ہے؟ صرف تیرے ہی در پر پیشانی گھسنے سے یہ ثابت ہے کہ مجھے تیرے ساتھ وابستگی ہے اور یہی میری وفا اور عشق کا ثبوت ہے۔

اس شعر کو اس پہلو سے دیکھئے تو اس میں غالب کی جدت ادا بھی ملے گی اور پھیلی ہوئی بات کو ایک شعر میں سمیٹنے کی عادت بھی۔ اس کے علاوہ غزل کی روایت

ہیں یہ باعث ننگ ہے کہ عاشق آئینِ عشق و وفا ترک کرنے کا اعلان کر دے اور یہ بھی نہ بتائے کہ محبوب کی کس غلطی پر وہ اس قدر سیخ پا ہو رہا ہے صرف سنگدلی اس کی علیحدگی کا معقول بہانہ نہیں بن سکتی۔

غالب نے اس شعر میں جو معنویت رکھی ہے بات کو ایک نئی طرح کہہ کر اس میں جو لطف پیدا کیا ہے اسے اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ عاشق کی خفگی کا مفہوم نکالنا شعر کو بالکل سپاٹ کر دینا اور غالب کی فنکاری کے ساتھ ظلم کرنا ہے۔

داغ آنکھوں سے کھل رہے ہیں سب
ہاتھ دستہ ہوا ہے نرگس کا !!

میر نے اپنے عہد کے ایک رواج پر اس شعر کی بنیاد رکھ کر ایسے لوگوں کے لئے اسے مبہم بنا دیا ہے جنہیں اس کا علم نہ ہو۔ محبت کرنے والے اپنے محبوب کے نشانی کے طور پر اس کا چھلا اپنے پاس رکھتے یا اپنی انگلی میں پہنے رہتے تھے۔ جب ہجر کی کاہش بڑھتی اور وہ زیادہ مشتاق ہوتا اسے گرم کر کے بدن پر رکھ لیتے تھے جس کی وجہ سے اس کا داغ پڑ جاتا تھا۔ محاورے میں اسے داغ کھانا، داغ کھینچنا اور گل کھانا کہتے ہیں۔ اظہارِ غم کا یہ طریقہ ایسا عام تھا کہ محرم کے مہینے میں لوگ امام حسین کا غم ظاہر کرنے کے لئے بھی سینے پر داغ کھایا کرتے تھے۔ خود میر نے اپنے مرثیوں میں اس رسم کا ذکر کیا ہے۔ میر کے علاوہ اردو شاعری میں اس رواج کا ذکر بہت جگہ ملتا ہے مثلاً واجد علی شاہ اختر:۔

بدنِ صاف پہ رنگینی دکھاؤ صاحب ! قول ہارے ہو تو گل چھلوں کے کھاؤ صاحب
کھاتے ہیں گل چھین کر چھلا کسی محبوب کا ! ہر برس اک داغ تازہ دے کے جاتی ہے بہار (رند)
دستِ گل خوردہ و شاخِ گل و گلزار بہم ان دونوں نشو و نما کرنے میں ہیں ضرب مثل (سودا)

ان مثالوں کے بعد اس رواج کی موجودگی سے غالباً کسی کو انکار نہ ہوگا لیکن مزید ثبوت کے لئے ہم دیوانِ رند سے ایک منظوم خط کے تین شعر پیش کرتے ہیں جن میں واضح طور پر اس رواج کا بیان ہے تاکہ کوئی خلش باقی نہ رہ جائے۔ پردیس سے عاشق اپنے محبوب کو خط لکھتا ہے اور اس میں یہ فرمائش کرتا ہے کہ:۔

کوئی ہاتھ کا اپنے چھلا ضرور مجھے بھیجو خط میں اے رشکِ حور
رہے گا مرے پاس تیرا نشاں ! کروں گا میں تعویذِ دل حرزِ جاں
اور اکثر جو فرقت میں گھبراؤں گا اسے لال کر کر کے گل کھاؤں گا !

"سے" کے معنی مانند۔ ہجر کی بے تابی اور یادِ محبوب کی شدت میں عاشق نے اپنے ہاتھوں پر جو داغ کھائے ہیں ان کی شکل آنکھوں سے ملتی جلتی ہے اس لئے کہ گرم چھلے کے داغ بھی چھلے کی طرح ہیں یہی داغ ہاتھ پر آنکھوں کی طرح زیب دے رہے ہیں جنہیں دیکھ کر عاشق اس لئے مسرور ہے کہ اس سے اس کی محبت کی گہرائی اور سچائی ظاہر ہوتی ہے چونکہ نرگس کے پھول کو آنکھ سے مشابہ کہا جاتا ہے اس لئے دوسرے مصرعے میں اس کو یوں ادا کیا ہے کہ ان داغوں کی وجہ سے میرا ہاتھ ان دنوں نرگس کے پھول کا گچھا معلوم ہوتا ہے۔

جو لوگ اس رواج سے واقف نہیں وہ پہلے مصرعے کے معنی یہ لیتے ہیں کہ شدتِ غم میں عاشق کی آنکھوں سے خون بہنے لگا ہے۔ جب اس نے ہاتھوں سے آنسو پونچھے تو خون کے داغ اس کے ہاتھوں پر پڑ گئے۔ ان معنوں میں دو قباحتیں ہیں ایک تو یہ کہ نشان جو دھبہ جب کوئی ایسی چیز لگ جاتی ہے جسے دھویا یا دور کیا جا سکے اس کے لئے اردو میں صحیح لفظ دھبا ہے داغ نہیں۔ داغ صرف ایسے نشان کو کہا جائے گا جو دھویا پونچھ کر دور نہ کیا جا سکے۔

دوسری بات یہ کہ خون سرخ ہوتا ہے اس لئے اگر شاعر کا یہی مفہوم ہے تو دوسرے مصرعے میں اس کی تشبیہ ایسے پھولوں کے دستے سے دی جانا چاہئے جو سرخ ہوں مثلاً گلاب یا لالہ۔ نرگس کا دستہ کہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ میر کا یہ مفہوم نہیں ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ تقریباً دس بارہ سال پہلے میرے ایک شاگرد نے اپنی ذہانت سے اس کا ایک پہلو اور نکالا تھا۔ انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ شدتِ گریہ سے آنسوؤں کی لڑی عاشق کے ہاتھوں پر بکھری ہوئی ہے۔ چونکہ آنسوؤں کی شکل

مولانا محمد متین شمسی

غالبؔ

تھا غالبؔ خوش فکر کا اسلوبِ بیاں اور
تھی اس کی روش اور، ادا اور، زباں اور

بھر دیتا تھا یوں رنگ وہ تصویرِ وفا میں
ہوتا تھا ہر اک دیکھنے والے کو گماں اور

لے نالہ و فریاد کی دنیا سے جدا تھی
تھا مردِ وفا کیش کا اندازِ فغاں اور

تھا صنفِ سخن میں وہ نئی طرز کا موجد
فکر اس کی تھی کچھ اور، حدیثِ دگراں اور

تھا مرغِ تخیل ہدفِ رفعتِ پرواز
رکھتا تھا وہ تیر اور نظر اور کماں اور

آتا تھا مجاز اس کو نظر عین حقیقت
تھا اس کا جہاں اور، زماں اور، مکاں اور

تاثیر کا یہ حال کہ دنیا تڑپ اٹھی
چھیڑی کچھ اس انداز سے اس نے رگِ جاں اور

اس شاعرِ فطرت کی نگاہوں میں ہر رنگ
تصویرِ بہار اور تھی، تصویرِ خزاں اور

بلبل کو جو دیکھا گلِ رنگیں سے ہم آغوش
وہ عاقبت اندیش ہوا اشک فشاں اور

تھے مومنؔ و میرؔ اک درِ نایاب سخن کے
تھی حضرت غالبؔ کی مگر فکرِ جواں اور

شمسیؔ ہیں زمانے میں سخنور تو بہت سے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

نذرِ غالب

لیث قریشی

ابواللیث قریشی۔ شاعر ہیں، اچھا ہوا۔ ورنہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے ساتھ توارد ہو جاتا۔

لیث قریشی ۲۶ مئی سنہ ۱۹۲۳ء کو اعظم گڑھ یو۔پی میں پیدا ہوئے۔ شاعرانہ عمر پندرہ سال ہے۔ یہ غزلیں غالب کی طرحوں میں لکھی گئی ہیں۔ یہ غالب سخنور کی ہم سری کا دعویٰ نہیں، بلکہ فیض غالب کا اظہار ہے۔ فروری کا مہینہ غالب کی یاد دلاتا ہے، اسی مناسبت سے یہ غزلیں پیش کی جا رہی ہیں۔

(ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا)

غالب

"شکستِ شیشۂ دل کی صدا کیا؟"
وفا کیا اور رودادِ وفا کیا؟
تبسّم آشنا ہیں فطرتاً گل
چمن زادوں پہ احسانِ صبا کیا؟
رہینِ موجِ غم ہے عمرِ جاوید
تلاشِ چشمۂ آبِ بقا کیا؟
وفا فطرت ہی جب ٹھہری تو اے دل
کوئی نا آشنا کیا۔ آشنا کیا؟
جنوں کے خود قدم لیتی ہے منزل
جنوں کو احتیاجِ نقشِ پا کیا؟
ہم اہلِ شوق ٹھہرے برق رفتار
ہمارا ساتھ دیں گے رہنما کیا؟
ترے اس شہرِ حسن و زندگی میں
ہمارا ابھی ہے کوئی ہم نوا کیا؟
نہ ہو حالات سے مجبور کوئی
خوشی سے کر رہا ہوں التجا کیا؟
ہو تم اے لیثؔ کیوں افسردہ خاطر
بتاؤ تو سہی آخر ہوا کیا؟

(ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا)

غالب

دوست مجھ کو دوست کہنے سے بھی شرمائیں گے کیا؟
میرے حالِ زار سے اس درجہ گھبرائیں گے کیا؟
آپ کی محفل میں ہم بیگانہ سمجھے جائیں گے
وقت کے ساتھ آپ بھی اتنا بدل جائیں گے کیا؟
ہم بھلا کس دل سے دیکھیں گے چمن لٹتے ہوئے
فرطِ غم سے آنکھ میں آنسو نہ بھر آئیں گے کیا؟
جن کی آغوشِ حوادث میں ہوئی ہو پرورش
گردشِ ایام کو خاطر میں وہ لائیں گے کیا؟
جان دے دیتے ہیں پروانے حضورِ شمع کیوں
تبصرہ اس پر کچھ اہلِ بزم فرمائیں گے کیا؟
وہ سفینے ناخدا ہی جن کے خفتہ مغز ہوں
سوچئے! گرداب سے باہر نکل آئیں گے کیا؟
آشیاں دیکھا ہو جن لوگوں نے خود جلتے ہوئے
پُرسکوں ماحول میں وہ عافیت پائیں گے کیا؟
اہلِ دل سے اپنا حالِ زار کیوں کہتے ہیں لیثؔ
خود تڑپ کر دوسروں کو آپ تڑپائیں گے کیا؟

○

(آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا)

غالب

عشق ہر چند کہ پابستۂ زنجیر بھی تھا
دردِ ہم خاک نشینوں کا ہمہ گیر بھی تھا

کوئی سمجھا ہی نہیں خود کو جہاں میں ورنہ
آدمی اپنے لئے کاتبِ تقدیر بھی تھا

خوابِ ماضی کی حقیقت کو بھلاؤں کیسے!
ہائے وہ خواب جو شرمندۂ تعبیر بھی تھا

ہم اگر خاکِ رہِ اہلِ وفا ہو جاتے
وجہِ اعزاز بھی تھا باعثِ توقیر بھی تھا

گردِ آلام نے ہر نقش مٹایا دل سے
دل وہی دل جو نہاں خانۂ تصویر بھی تھا

ہائے وہ دن کہ بہت عقدۂ دشوار بھی تھا
[illegible] تھا

○

(میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے)

غالب

حُسنِ طلب تو دیکھ! خذف میں گہر ملے
ہم کو ہجومِ خار میں گلہائے تر ملے

کوئی بھی ساتھ دے نہ سکا وقت جیسے
یوں راہِ زندگی میں بہت ہم سفر ملے

کہنا کہ رنگِ روئے گلستاں پریدہ ہے
اے باغباں کہیں جو نسیمِ سحر ملے

حالات کا بُرا ہو کہ اہلِ ریا سے ہم
ملنا نہ چاہتے تھے یقیناً۔ مگر ملے

تمیزِ خیر و شر بھی کسی کو نہیں نصیب
حسرت ہی رہ گئی کوئی اہلِ نظر ملے

گلشن میں دھوم فصلِ بہاراں کی تھی مگر
کچھ پھول پھر بھی مجھ کو برنگِ دگر ملے

روشن تمام خونِ دلِ رفتگاں سے تھے
جتنے چراغ ہم کو سرِ رہگذر ملے

کس طرح لطف کوئی الم کو سر کرے
[illegible] زندگی [illegible] ملے

○

(ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں)

غالبؔ

گل کے حق میں اُسے ہم دستِ قضا کہتے ہیں
لوگ گلشن میں جسے بادِ صبا کہتے ہیں

دمِ رخصت۔ سرِ مژگاں وہ ستاروں کی چمک
اہلِ دل اپنی زباں میں اسے کیا کہتے ہیں؟

چند ایسے بھی ہیں کشتۂ شمشیرِ فریب
کہکشاں کو بھی جو ظلمت کی ردا کہتے ہیں

یہ بھی کیا کم ہے کہ اپنا ہے وہ دنیا میں شعار
نہ برا کہتے ہیں جس کو نہ بھلا کہتے ہیں

انتہا یہ ہے کہ صرف اپنی غرض کی خاطر
لوگ اس دور میں انساں کو خدا کہتے ہیں

کیجئے حلقۂ احباب میں اسکو نہ تلاش
اب ہے نایاب جسے جنسِ وفا کہتے ہیں

گل نہ ہو جائیں سرِ شام گلستاں کے چراغ
ناموافق ہے زمانہ کی ہوا، کہتے ہیں

آپ کے دعوے حقائق پہ ہیں مبنی اے لیث
آپ جو بات بھی کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

○

(تم خدا وند ہی کہلاؤ خدا اور سہی)

غالبؔ

دوستو! سلسلۂ خونِ وفا اور سہی
دل کے آئینہ پہ تھوڑی سی جلا اور سہی

میں کہ امواجِ حوادث سے ہوں سرگرمِ ستیز
میری کشتی کے لئے سیلِ بلا اور سہی

ہم کو ہے پیرویٔ اہلِ جنوں ہی منظور
ہیں خفا اہلِ خرد ہم سے خفا اور سہی

ہم سمجھتے ہیں ترا حسنِ تضاد اے صنم
دل کا رنگ اور سہی رنگِ قبا اور سہی

ڈھونڈتا ہوگا کوئی گردشِ دوراں سے فرار
میری قسمت میں یہی صبح و مسا اور سہی

میں وفا کیش۔ وفا سے نہیں باز آ سکتا
مجھ کو ملتی ہے اگر اور سزا اور سہی

دستِ گلچیں کے تصرف میں نہیں گر غنچے
لیث مقصودِ رنگ و نازِ صبا اور سہی

رئیس فروغ

غالب

اتفاقاً کبھی صدیوں میں گذر کرتا ہے
سوئے گیتی کوئی صیقل گرِ آئینۂ سنگ

مدتوں بعد کوئی مست بتاتا ہے کہ ہے
مایۂ عقل ترازوئے جنوں کا پاسنگ

روز لگتا نہیں دارائے سخن کا دربار
جس کی سرکار میں کرتی ہے گدائی فرہنگ

بند پاتا ہے تو آزادہ روی میں مسرور
مردِ خود بیں درِ کعبہ سے پلٹ جاتا ہے

بے خطر شیفتۂ سادگیٔ جام سفال
شوکتِ ساغرِ جمشید کو ٹھکراتا ہے

برق سے شمع سیہ خانہ جلانے والا
آبگینہ کو مے تند سے پگھلاتا ہے

شیوۂ عشق تنک ظرفیٔ منصور نہیں
ورنہ ہر قطرہ میں دجلہ تو نظر آتا ہے

کچھ نہ پانے پہ بھی عالم کو دلِ رمز شناس
شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر پاتا ہے

فن پہ چلتا نہیں قزاقِ اجل کا قابو!
جل کے بجھتا ہے کہیں سوزِ تمنا کا چراغ!

آیۂ لوحِ ابد دستِ جنوں کی تحریر
شمعِ محرابِ بقا سینۂ فنکار کا داغ

معبدِ خضر کہن سال بنا کرتا ہے
خونِ یک کشورِ جذبات سے سینچا ہوا راغ

غالب اے راہبرِ روشنیٔ ذہن و ضمیر
سرِ مشرق ترے افکار کی عظمت سے بلند

ترے اقبال کی کھاتا ہے ہمالہ سوگند
لے کہ دیوان ترا دیدِ مقدس کی نظیر

شمیم احمد

اسپوٹنک نمبر ۳

ہم اس مضمون کو کئی وجوہ کی بنا پر شایع کر رہے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں :-

۱۔ یہ مضمون ایک ایسے مضمون کے بارے میں ہے جو مہر نیمروز ہی میں شایع ہوا تھا۔

۲۔ مضمون نگار نے اپنے آپ کو نئے لکھنے والوں کا نمائندہ قرار دیا ہے۔ صاف صاف الفاظ میں نہیں، لیکن دو مقامات پر ایسے اشارے ضرور ہیں . . . . اور یہ نئے لکھنے والے اپنے آپ کو عسکری صاحب کے خلاف ایک فریق سمجھتے ہیں، اسی لئے کسی فریق کے خیالات کو پڑھنے والوں کے سامنے پیش کر دینا مناسب ہے۔

۳۔ مضمون نگار نے مضمون دینے سے پہلے ہی اپنے ایک دوست کے اس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ ہم یہ مضمون شایع نہ کریں گے آپ ان وجوہ کو سامنے رکھتے ہوئے مضمون کو پڑھئے . . . . شمیم صاحب نے اس مضمون کا ایک تہائی حصہ خود لکھا تھا اور دو تہائی حصہ میں کلیم الدین صاحب کے مضمون کے اقتباسات دیئے تھے۔ ان حوالوں کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے حذف کر دیا گیا۔

ادارہ

(اس تحریر کو پڑھتے ہوئے عسکری صاحب کے "ساقی" والے مضمون کو ضرور ذہن میں رکھئے۔ جس میں فراق اور اثر کا ذکر کرتے ہوئے آل احمد سرور سے الجھ پڑے تھے)

یوں صاحب ۱۹۵۷ء کا سب سے بڑا ادبی واقعہ بھی ہو ہی گیا۔ ادبی جمود اور ادبی موت کے اعلان کو بہت دن گزر چکے ہیں۔ وہ زندگی اور وہ ہنگامے جو ۱۹۵۳ء سے پہلے ادب میں برپا رہتے تھے خواب و خیال ہو گئے ادب کی موت کے محضر پر سب سے پہلے تصدیق کرنے والے محمد حسن عسکری تھے۔

لیکن ۱۹۵۷ء ادب کے لئے بڑا مبارک ثابت ہوا۔ کیونکہ اس سال دو ایسے واقعات ظہور میں آئے جنھوں نے ادب کے ٹھہرے ہوئے پانی میں طوفان اٹھا دیا۔ ایک واقعہ تو روس کے دو اسپوٹنک چھوڑنا تھا جو فضائے آسمانی کو چیر کر انسانی فتوحات کا علم لئے ہوئے چاند کی طرف سرگرم سفر ہوئے۔ اس عظیم کامیابی کا اثر بالواسطہ طور پر ادب پر کافی پڑا اور لوگ پھر سے زندگی کے مسائل کی طرف توجہ دینے لگے اور دوسرا واقعہ بالکل تازہ ہے۔ یعنی کلیم الدین احمد صاحب نے ایک مضمون محمد حسن عسکری پر لکھا ہے جو مہر نیمروز میں شایع ہوا ہے۔ اس واقعہ نے تو ادب کے مور کو اٹھا گھمانا شروع کر دیا ہے خصوصاً اردو ادب کے لئے پہلا واقعہ دوسرے واقعہ یا حادثہ کے سامنے ہیچ نظر آتا ہے اس لئے اگر کلیم الدین احمد صاحب کے اس مضمون کو اسپوٹنک نمبر ۳ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ یوں تو عسکری صاحب کی شخصیت پچھلے پندرہ سال سے اردو ادب کی بڑی اہم شخصیت بنی رہی ہے کیونکہ انھوں نے جب سے افسانہ چھوڑ کر تنقید نگاری شروع کی۔ ان کی حیثیت ایک اکھاڑے کی سی ہو گئی تھی جس نے پوری ترقی پسند تحریک سے لیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اکھاڑے میں سارے ترقی پسند ایک طرف تھے اور محمد حسن عسکری کی ذات ایک طرف۔ البتہ اخلاقی تائید کے لئے

عسکری صاحب کو میراجی کے قدموں کی خاک لینی پڑتی تھی۔ لیکن اکھاڑا سر کرنے کا سہرا عسکری ہی کے سر بندھا۔ اس نبرد آزمائی میں عسکری کا مدمقابل پوری ترقی پسند تحریک میں سے ایک بھی نہیں نکلا۔ کیونکہ تنقیدی گالیاں دینے کا فن ایک الگ چیز ہے۔ عسکری کی اس فتح نے ان کے عقیدتمندوں میں خوشی کی لہر دوڑا دی اور بعض بعض عقیدتمند تو نہایت خلوص اور دعوے کے ساتھ یہ کہنے لگے کہ پاکستان میں ترقی پسند ادب کو بیخ و بن سے اکھاڑنے والا سوائے عسکری کے اور کوئی نہیں تھا۔ سیاست۔ معیشت۔ ماحول۔ ۴۷ء کے واقعات، ذہنی انتشار وغیرہ کی دلیلیں تو ترقی پسندوں کی اصطلاحیں ہیں ورنہ تو عسکری نے پوری تحریک کو ۴۷ء ہی میں دفن کر دیا تھا۔ حالانکہ ادب میں جمود کی تاریخ بھی اسی سنہ سے شروع ہوتی ہے۔ نہیں معلوم عسکری کے عقیدتمند اسے اُن کی تعریف سمجھتے ہیں یا تنقیص۔؟ پاکستان بننے کے بعد ادب کی ٹھیکیداری عسکری صاحب کے حصے میں آئی۔ لیکن کُشتی کا لپکا عسکری کو کہاں چین سے بیٹھنے دیتا۔ لہٰذا ایک چوٹ تاثیر مرحوم سے بھی رہی۔ اور پھر نزلہ برعضوِ ضعیف یعنی نئی نسل پر گرنا شروع ہو گیا۔ اس فن میں عسکری کا مدمقابل چین و ماچین تو الگ رہے فرانس اور انگلستان میں نکلنے محال تھے۔ کیونکہ جیت بھی میری پٹ بھی میری کہنے کے کئی گُر عسکری کو یاد تھے۔ حالانکہ وہ رازِ بلائے سربستہ سینہ بہ سینہ منتقل ہونے چاہیئں تھے۔ مگر برا ہو ۱۸۵۷ء کا یہ گُر بھی یار لوگوں تک پہنچ گئے۔ ایک گُر تو عسکری کا یہ تھا کہ انھوں نے کبھی اپنی بات کہی ہی نہیں۔ حالانکہ "میں" ہر سطر میں "انا الحق" کی طرح آواز دیتا تھا۔ دوسرا گُر یہ تھا کہ جب بھی حریف پر حملہ کرو۔ تو مغربی ادب کے بڑے بڑے ناموں کی فوج لیکر حملہ آور ہوتا کہ حریف نفسیاتی طور پر بوکھلا جائے۔ لہٰذا موصوف کا ہر مضمون انگلستان اور فرانس کے ادیبوں کے اقوال و افکار سے اتنا پُر ہوتا تھا کہ بیچاری اردو کا ذکر تو حاشئے پر ہی آتا تھا یا اس غریب کا جس کا تذکرہ کرنا مقصود تھا۔ تیسرا گُر یہ تھا کہ اُردو کے ادیبوں اور اردو ادب کا ذکر جب بھی کرو اتنی حقارت سے کرو۔ کہ لوگ شرم کے مارے اردو ادب کا نام لیتے ہوئے گھبرائیں۔ ان تمام داؤں اور پیچوں کے لئے عسکری صاحب نے بنیاد بڑی مضبوط کر رکھی تھی۔ کیونکہ پڑھنے پڑھانے اور مطالعہ کے سوا انھوں نے زندگی کے کسی دوسرے گوشہ اور سرگرمی سے کبھی کوئی علاقہ نہ رکھا۔ ترقی پسندوں کو اس معاملہ میں چوٹ تو کھانا چاہیئے تھی۔ کیونکہ وہ تو علاوہ زندگی کے روگوں کے سیاست کا روگ بھی لگا بیٹھے تھے۔ لہٰذا انھوں نے عسکری کا جواب دیا تو نظریاتی اختلاف اور ذاتی شکایت میں دیا۔ جس کا نتیجہ ظاہر تھا۔ نئی پود کو عسکری کے بے تحاشہ حملے سہنے پڑے تو وہ اور سہم گئی۔ ایک تو وہ پہلے ہی عسکری کے دادیلے اور یورپ کی دہائی سے خوفزدہ تھی۔ اب تو انھوں نے ان کی موت کا بھی اعلان کر دیا۔ نئی پود نے اتنا بھی نہیں پڑھا تھا جتنا ترقی پسند پڑھے ہوئے تھے۔ جب مبلغ علم اتنا ہو تو نتیجہ ظاہر ہے لیکن یہ عجیب اتفاق کہ نئی پود تقریباً اُسی نظریہ کی حامل تھی جس کی عسکری تبلیغ کر رہے تھے اس کے سوچنے اور محسوس کرنے کے ذرائع بھی تقریباً وہی تھے جو عسکری رکھتے تھے۔ لہٰذا ان سے عسکری صاحب کے مانگے تانگے کا حلوہ کیسے ہضم ہو سکتا تھا۔ جس شخص کے مضمون میں سو میں سے ۹۹ لائنیں یورپ کے ادیبوں کی ہوں۔ وہ اردو کا ادیب کیسے ہو سکتا ہے۔ یا اگر ہے تو یہ انگریزی میں کیوں نہیں لکھتا۔ یہ خیالات بدگمانی نہیں بلکہ اعتراضات کی شکل میں بھی ہمارے سامنے آتے رہے۔ مگر علم کے ڈھونگ کے سامنے احساس کمتری کا شکار ہو گئے (راقم الحروف بھی اسی گروہ میں شامل ہے) یہ بات کلیم الدین احمد صاحب نے بھی لکھی ہے کہ بھئی ایسا ہی شوق ہے تو انگریزی میں لکھو۔ اردو والوں کو کیوں ڈرا ڈرا کے مار رہے ہو۔ مگر یہ عظیم ترین نقاد خوب جانتا تھا کہ انگریزی میں اس کی تحریر دو کوڑی کی ہو جائے گی اور اس میں ہاتھ کی صفائی ذرا مشکل کام ہے عسکری کی مثال تو ایسی ہے کہ کمہار پر بس نہ چلا گدھی کے کان اینٹھے۔ اردو والوں کی گت کچھ گدھی کی سی ہے۔ کلیم صاحب کا بھلا ہو انھوں نے نئی پود کے سارے خدشات اور بدگمانیوں کو ثابت کر دیا۔ کچھ لوگوں کو شکایت ہے کہ کلیم صاحب کا مضمون ذرا تیز ہو گیا ہے۔ لیکن ان حضرات کو معلوم ہونا چاہیئے کہ عسکری نے اردو تنقید میں جو ہنگامہ اور انتشار پھیلایا ہے اس کا جواب کوئی اور نہیں دے سکتا۔ جس شخص نے دنیا کی تاریخ کو ایک نئے موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا جس کے نام کے ساتھ بیسویں صدی طلوع ہوئی ہے

جو عسکری کے پندرہ مداحوں کا نہیں بلکہ دنیا کے دو ادیبوں کا رہنما ہے اور جس کے متعلق اقبال نے ونیت پیغمبر ولے دارد کتاب " کہہ کر نسے پیغمبروں کی صف میں کھڑا کر دیا تھا۔ اس شخص کے متعلق عسکری صاحب کہتے ہیں کہ وہ "پمفلٹ باز" تھا۔ جس شخص نے تنقید کے ان "اعلیٰ معیاروں" کو قائم کیا ہو۔ اس کے سامنے بیچارے کلیم صاحب اپنی خرافت کا کیا مظاہرہ کر سکتے تھے۔ میرا کام اس وقت یہ ہے کہ کلیم الدین احمد صاحب کے ان اعتراضات اور الزامات کی فہرست پیش کر دوں۔ جو انھوں نے اس "فاضل یگانہ" پر لگائے ہیں۔ انھوں نے اپنی تمام تر ذہانت ادبی مرتبہ علم اور سنجیدگی کو بروئے کار لا کر چند الفاظ میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور ان جیسا آدمی ظاہر ہے کہ ہوا میں تیر نہیں چلاتا۔

کلیم الدین احمد صاحب کے اس مضمون کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے چند ایسی باتوں کی طرف اشارے کئے ہیں۔ جو نئے لکھنے والوں کے ذہنوں میں پہلے سے موجود تھیں۔ لیکن وہ اس گتھی کو سلجھا نہیں سکتے تھے۔ مثال کے طور پر ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کی وجہ کیا ہے کہ عسکری ہمیشہ بڑے ناموں کے سامنے نسبتاً چھوٹے ناموں کا ذکر کیا کرتے ہیں۔ غالباً ان کے اعصاب بڑی آواز سے جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ جوش کے منکر ہو کر فراق کو عہد حاضر کا سب سے بڑا شاعر ثابت کرنا۔ اقبال کو بھول کر حالی اور اکبر کا ذکر کرنا۔ آتش کو چھوڑ کر جراًت کو اچھالنا غالب کا دوسرے شاعروں سے تقابل کرنا آخر کس طرح یہ ادبی بے دیانتی برتی جا رہی ہے۔ کلیم صاحب کے مضمون سے یہ بات صاف ہو گئی کہ موصوف اُردو میں ہی یہ گھپلے بازی نہیں کرتے بلکہ یورپ کے ادیبوں کے ساتھ بھی یہی گھپلا کرتے ہیں اور وہاں کے دوسرے درجے کے ادیبوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ کیونکہ عام آدمی کا گزر وہاں آسانی سے نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ کلیم صاحب نے عسکری صاحب کی جو حیثیت متعین کر دی ہے غالباً اس سے بہتر مرتبہ انھیں نہیں دیا جا سکتا۔ انھوں نے عسکری صاحب کو ادبی رپورٹر کہہ کر سچائی کا حق ادا کر دیا ہے "زدلیاں باندا مر گیا" ایک خبر ہی تو ہے۔ اب میں اُن فقروں میں سے چند پیش کروں گا۔ جو کلیم صاحب نے جگہ جگہ موتی کی طرح پرو دیئے ہیں۔

"(۱) وہ انگریزی اور فرانسیسی ادیبوں اور کتابوں کا برابر ذکر کرتے ہیں اور شاید اسی طرح پڑھنے والوں کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں عسکری صاحب کی ایک حیثیت "دلّال" کی ہے۔ وہ مغربی مال ہندوستان میں بھیجنا چاہتے ہیں وہ مغربی ادیبوں کے مضامین کا ترجمہ یا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔"

(۲) ظاہر ہے کہ وہ دلّالی کرتے ہیں۔ دوسروں کا مال بیچتے ہیں۔ دوسری حیثیت ان کی "رپورٹر" کی ہے۔ وہ خبر دیتے ہیں کہ دنیائے ادب میں کیا ہو رہا ہے۔"

(۳) بڑے بڑے ادیبوں کے رہتے ہوئے وہ عموماً ایسے ادیبوں کا پرچار کرتے ہیں جو انھیں کسی خاص تاثراتی وجہ سے پسند ہیں"

(۴) لیکن عسکری صاحب نے ہضم کر لیا۔ اگر ہضم کر لیتے تو بار بار یہ بدہضمی کی ڈکار نہ لیتے اور بچوں کی طرح بغلیں نہ بجاتے"

(۵) اُردو والوں کے لیے مغربی ادب سے متعلق معلومات کو مہیا کرنا کوئی بری بات نہیں۔ لیکن اس کام کو سلیقے سے کرنا چاہیے اور پھر ڈینگیں مارنے کی کیا ضرورت ہے؟"

میرا خیال ہے کہ عسکری صاحب اس مضمون کو ہنس کر ٹال دینے کے لئے پرانی باتیں دہرائیں گے کہ میں ان باتوں کی پروا نہیں کرتا۔ مگر وہ عبارت کے متعلق لکھ چکے ہیں۔ آل احمد سرور کو نوٹس دے چکے ہیں اور بہرحال کلیم صاحب کا ادبی مرتبہ ایسا نہیں ہے کہ عسکری صاحب جیسا آدمی ان سے بے نیازی برتنے کا دعویٰ کر سکے۔ کلیم الدین احمد صاحب نے اپنے مضمون میں جو علمی انداز اختیار کیا ہے اور جو دیہ رکھا ہے وہ قابل تعریف ہے انھوں نے عسکری صاحب کو ایک طالب علم سمجھ کر مشورے دیئے ہیں۔ ادب کی پرکھ کے بارے میں بتایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اچھا برا چھوٹا بڑا ادب کسکو کہتے ہیں۔ بہرحال ہم نئے لکھنے والے جن کی موت کا اعلان عسکری صاحب بہت پہلے کر چکے ہیں۔ انھیں اسی طرح یہ نوٹس دینے کا حق رکھتے ہیں جس طرح انھوں نے آل احمد سرور کو دیا تھا کہ وہ ایک ماہ کے اندر اندر یا تو کلیم صاحب کے الزامات کی تردید کر دیں یا سچائی سے اپنے گھپلے بازی کا اعتراف کر لیں ورنہ ادب اور سچائی کی بارگاہ میں وہ ایک مجرم ہوں گے۔

ابوالخیر کشفی

عسکری بحیثیت نقّاد

عسکری کبھی افسانہ نگار تھے۔ لیکن آج ان کی سب سے اہم حیثیت نقّاد کی ہے، عسکری کی تنقید میں کئی عناصر ایسے ہیں جو عہدِ حاضر کے کسی نقاد کے یہاں نہیں ملتے۔ ان کی تنقید تہذیبی، تخلیقی اور تمدنی مسائل سے کبھی دامن نہیں چھڑاتی۔ یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی ان کا دامن بے طرح الجھ جاتا ہے۔ عسکری نے کبھی داخلیت کے خول میں پناہ نہیں لی۔ قوم کی بلکہ انسانیت کی اجتماعی زندگی اور ادب کی حیثیت اور کردار کا انہیں احساس ہے، لیکن وہ سیاسی حالات اور سیاسی مصلحتوں سے زیادہ تہذیب و تمدن کو بنیادی حقیقت سمجھتے ہیں۔ عسکری کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ وہ زوال پسند فرانسیسی ادیبوں کے ترجمان ہیں، اور "فن برائے فن" کا نظریہ ان کی پناہ گاہ ہے۔ لیکن ان معترضین نے یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ "فن برائے فن" سے عسکری کیا مراد لیتے ہیں۔ عسکری نے اپنے طویل مضمون "فن برائے فن" میں اپنے نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ نظریہ زندگی سے فرار نہیں سکھاتا بلکہ زندگی کی حقیقتوں کو تلاش کرنے کا ایک عزم ہے اور اسی لئے عسکری کو ان خیالات سے دلچسپی ہے جو انسانوں میں زندگی کی حرکت پیدا کر سکیں۔ میں اس مضمون کے چند ٹکڑوں کو اپنے طور پر مرتب کر کے پیش کرتا ہوں تاکہ یہ بات واضح ہو سکے کہ عسکری کے ذہن میں فن کا کیا تصور ہے، اور فن کے تقاضے اور مطالبے ان کے نزدیک کیا ہیں؟

"فن برائے فن" کا مقبول ترین تصور یہ ہے کہ فن کار زندگی کی تمام دلچسپیوں سے بے نیاز ہو کر بس جمالیاتی تسکین کے پیچھے پڑا رہے یہ تصور اس لحاظ سے تو مہمل ہے کہ خالص فن کا مکمل نمونہ کم سے کم ادب میں تو دستیاب نہیں ہو سکتا ... ساٹھ ستر سال پہلے مغرب میں دو چار افراد نے چاہا تھا کہ ساری زندگی کو فن بنا دیں یا زندگی کو اتنا سمیٹیں کہ اس میں فن کے سوائے کچھ رہ ہی نہ جائے ... گمر عملی طور پر مجھے کوئی ایسا معقول فن کار نظر نہیں آتا جس نے اس نظریے پر ایمان لانے کے بعد زندگی کے اہم ترین پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا ہو۔ یا ان سے دلچسپی ختم کر دی ہو یا محض جمالیاتی تسکین کا رسیا بن کر رہ گیا ہو ... فن کار تو محض ایک آدمی نہیں ہوتا۔ فن کار تو براہ راست زندگی کا آلۂ کار ہوتا ہے۔ وہ ایک معمل ہے جہاں زندگی تجربے کرتی ہے۔"[1]

اس اقتباس کو پیش کرنے کے بعد میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ان سطروں کے لکھنے والے کو ایک فراری ادیب کہنا ادبی نہیں بلکہ سیاسی مصلحت تو ہو سکتی ہے۔ دیانتداری نہیں۔

عسکری کی تنقید کی خصوصیات کا جائزہ لینے کے لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ان کے تصورِ ادب کو پیش کر دوں کیونکہ ادبی تنقید کی بنیاد نقاد کے تصورِ فن پر ہوتی ہے۔ ویسے تو عسکری نے تنقید کے منصب کو موجودہ حالات میں جس طرح سمجھا ہے اسی کی بنا پر وہ دوسرے نقا

---

[1] "فن برائے فن" محمد حسن عسکری۔ مطبوعہ "اردو ادب" نمبر ۲

سے ممتاز ہو جاتے ہیں۔ عسکری کی تنقید محض "مدرسوں کا کھیل نہیں۔" جو صرف ادب پاروں کو سمجھنے یا ان کی قدر و قیمت کے تعین کرنے کی کوشش سے آگے نہ بڑھے بلکہ اس کی تنقید تو "زندہ تخلیقی سرگرمیوں سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق ضرور رکھتی ہے۔ چاہے موافقت کا، چاہے مخالفت کا۔ ایسی تنقید چونکہ براہ راست تخلیقی سرگرمیوں کا ایک حصہ بن جاتی ہے اس لئے اس کا فریضہ ہر زمانے میں مختلف ہوتا ہے۔"[1]

عسکری نے اپنی تنقید نگاری کی ابتدا "جھلکیاں" سے کی۔ جھلکیوں میں ان کی ذہانت تو ہمیشہ جھلکی لیکن یہ کینوس بہت مختصر ہے، اسی لئے ان کی جھلکیاں اس اختصار کی وجہ سے محض چٹکلہ (مگر ادبی) بن کر رہ گئیں۔ عسکری چونکہ خود بڑے تخلیقی فن کار ہیں، اس لئے یہ اختصار اور بھی غیر مناسب ہوا کیونکہ خوبصورت جملوں اور نشتر زنی کی وجہ سے بات کی وضاحت نہ ہو پائی۔ عسکری نے جھلکیوں کی تنگنائے کو جب بقدر ظرف نہ پایا تو مستقل مضامین کی طرف توجہ دی۔ اردو میں اب تک تنقید کی تقسیم یوں کی گئی ہے۔ نظریاتی تنقید اور عملی تنقید۔ نظریاتی تنقید سے یہ مراد ہے کہ ادب کی ماہیت اور بنیادی مسائل پر غور کیا اور عملی تنقید سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کے فن کو نظریات کی روشنی میں پرکھا جائے۔ اردو میں نظریاتی تنقید بڑی تجریدی رہی ہے اور چند موضوعات تک محدود جو بہت فرسودہ ہو گئے ہیں۔ مثلاً ادب اور زندگی، ادب اور سیاست، ادب اور سماج وغیرہ۔

فرسودگی کی وجہ ہے کہ نئے حالات پیش کرنے کی جگہ تکرار کو شیوہ بنا لیا گیا ہے۔ ترقی پسند نقادوں میں عرصہ کے بعد ممتاز حسین نے اسلوب، اور ہیئت وغیرہ پر فکری مضامین لکھے، لیکن انداز بیان کی الجھن نے ان مضامین کو گرانبار بنا دیا۔ عسکری نے ایک دوسرے انداز سے اپنے نظریات کی وضاحت کی۔ ان کے نظریاتی مضامین میں وہی تخلیقی شان ہے جو فراق کی عملی تنقید میں۔ "فن برائے فن"، "نفسیات اور تنقید"، "تنقید کا فریضہ (موجودہ حالات میں)" اور "ادب اور جذبات"۔ ان مضامین میں عسکری نے ادب کے بنیادی مسائل پر غور کیا ہے۔ . . . لیکن میرے نزدیک یہ مضامین عسکری کا کارنامہ نہیں، عسکری کا کارنامہ تو یہ ہے کہ اس نے نظریاتی بحث کو "تجریدی" کی حد سے آگے بڑھا کر اردو ادب کے بنیادی مسائل پر قلم اٹھایا . . . بلکہ یوں کہنا صحیح ہو گا کہ اس نے نئے موضوعات پیدا کئے ہیں اور ہمیں یہ بتایا ہے کہ محض نظریۂ فن کے گرد بنیادی بحث محدود نہیں رہنی چاہیئے، آخر اردو ادب بھی بنیادی بحث کے لئے موضوعات دے سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ عسکری نے "افعال" اور "محاوروں" کے مسئلہ کو صرف "ونحو" کے حدود سے نکال کر تخلیقی ادب کا مسئلہ بنا دیا ہے۔ اردو تنقید میں یہ بات ایک اہم اضافہ ہے۔

عسکری کی عملی تنقید کے سلسلہ میں دو مضامین بہت اہم ہیں۔ جرأت اور حالی اردو کے کلاسیکی شعری ادب پر بہت کم لکھا گیا ہے اور فراق کے "اندازے" کے سوا کوئی ایسا تنقیدی مجموعہ نہیں جس میں (REVALUATION) کی کوشش کی گئی ہو۔ اب شاید عسکری اس کام کی تکمیل کر سکیں۔ راسخ عظیم آبادی، یقین، قائم چاندپوری، ظہیر دہلوی اور شیفتہ وغیرہ پر ابھی تک کسی نے اس نقطۂ نظر سے قلم نہیں اٹھایا۔ عسکری جھلکیوں میں بھی عملی تنقید کے نمونے پیش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن عسکری صاحب کبھی کبھی بات کہنے کے چکر میں غیر ذمہ دارانہ دعوے بھی کر جاتے ہیں۔ مثلاً فراق کی شاعری کے بارے میں یہ کہنا کہ زندگی اور فن کے کئی ایسے تقاضے فراق کی شاعری پورے کرتی ہے جو میر کی شاعری سے بھی پورے نہیں ہوتے۔ اس بات سے فراق کی بڑائی ثابت نہیں ہوتی۔ اگرچہ عسکری صاحب کی تنقید میں یہ پہلو نکلتا ہے کیونکہ میر کی شاعری نہ جانے کتنے ایسے تقاضے پورے کرتی ہے جن کا فراق کی شاعری میں عکس بھی نہیں۔

اور ویسے تو جان صاحب کی شاعری میں بھی کچھ تقاضوں کی تکمیل ہے۔ کسی ایک شاعر سے یہ توقع کرنی بے سود ہے کہ وہ ہماری زندگی

---

[1] "تنقید کا فریضہ (موجودہ حالات میں)" ماہ نو نومبر ۱۹۴۳ء۔

کے ہر تقاضے کو پورا کرے۔ بلکہ یوں دیکھنا چاہیئے کہ کس کی شاعری کتنے اور کس اہمیت کے تقاضوں کی تکمیل کرتی ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی عسکری سرپرستانہ موڈ کی وجہ سے، یا مروّت کی بنا پر یا کسی اور وجہ سے بعض ادیبوں اور شاعروں کو غلط طور پر سراہتے ہیں۔ مجھے بھی ان شاعروں اور ادیبوں کی خوبیوں کا احساس ہے مگر سوال سراہنے کے انداز کا ہے۔

عسکری صاحب کی تنقید میں مجھے کبھی کبھی دہشت کے عناصر بھی نظر آتے ہیں، اور آپ میری بات پوچھیں کہ مجھے ان کی بعض "جھلکیاں" پڑھ کر اختلاج سا ہو جاتا ہے اور یہ اختلاج کبھی کبھی دیرپا ہوتا ہے۔ مثلاً "ساقی" کے ایک شمارہ میں اردو ادب کی موت کا اعلان۔ عسکری صاحب خود ہی کہیں کہ جس دور میں وہ اتنی اچھی تنقید لکھ رہے ہیں اس دور میں اردو ادب کیسے مر سکتا ہے؟ عسکری کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ حقیقت پسند ہو جاتے ہیں۔ شاید میں نے قنوطیت پسندی کی جگہ حقیقت پسند لکھ دیا، مگر یوں ہی سہی۔

آخر میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ بہت سے نقادوں کی طرح عسکری کی زبان کتابی نہیں بلکہ اس میں گفتگو کا انداز ہے، عسکری کی تنقیدی زبان ان کی اپنی ہے اور ان کی شخصیت کی آئینہ دار، کاغذی پیراہن ان کے اور پڑھنے والے کے درمیان حائل نہیں ہوتا۔ عسکری اکثر اس مصنوعی سنجیدگی اور ثقاہت کو برقرار نہیں رکھتے۔ جس کا مطالبہ نقاد سے کیا جاتا ہے۔ "فن برائے فن" کی ابتدا میں عسکری نے خود بھی تو کہا ہے ۔ "بعض حضرات کو مجھ سے شکایت ہے کہ یہ اچھے خاصے علمی مضمون کو کرخنداروں کی زبان میں ادا کر کے مبتذل بنا دیتا ہے۔" (ایک طویل مضمون کی تلخیص بہ شکل نظرثانی)

غالب کے چند اشعار

کافی ہے اس لئے رونے والے کی آنکھوں کا عکس ان قطروں میں جھلک رہا ہے اور اس طرح نرگس کے دستے کی تشبیہ سامنے آجاتی ہے۔ ان کی طبیعت کی رسائی سے میں بہت خوش ہوا۔ ان کی تعریف کی اور کہا کہ دوسرے مصرعے کو تو آپ نے مجھ سے بہتر پیش کر دیا۔ لیکن پہلا مصرعہ بالکل الگ ہو گیا۔ آنسوؤں میں جو آنکھیں جھلکیں گی انہیں عکس کہیں گے، داغ کا لفظ کہاں جائیگا۔ وہ ایک لحظہ چپ رہے اور پھر شرما کر مسکرانے لگے۔

بکھرے رہتے ہیں سارے پھول ہی جس کے گریباں میں
وہ کیا جانے کہ ٹکڑے ہیں جگر کے میرے داماں میں　　　(مہیتر)

شعر کا مفہوم تو یہ ہے کہ جو لوگ عیش و عشرت میں زندگی گزارتے ہیں وہ غم نصیبوں کا حال کیا جانیں لیکن خلش ہوتی ہے گریباں کے قافیے سے پھولوں کا سیج سجا ہے۔ پھولوں کا بستر ہو، دامن میں پھول بکھرے ہوں۔ ہاتھوں میں ہوں تو ایک بات ہے گریباں میں کیسے؟ اگر مان لیا جائے کہ گریبان میں پھول لگا ہوا ہے تو "بکھرے" کا لفظ کھٹکتا ہے کیونکہ یہ کسی ظرف ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

اس شعر کو بھی سمجھنے کے لئے اس معاشرت اور طرز زندگی سے واقف ہونا چاہئے جس کے پیش نظر یہ شعر کہا گیا تھا۔ اس وقت خوش باش حضرات [illegible] بیلے یا جوہی کے پھول گریبان میں رکھ کر باندھ لیتے تھے [illegible] خوشبو عطر سے کہیں زیادہ اچھی آتی تھی۔ اس طرح پہلے مصرعے میں ان حسینوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو شباب کے عالم میں [illegible] کے ساتھ دولت وصل سے بھی شاد کام ہیں [illegible] سے دوسرے کی پروا نہیں کرتا [illegible]

حبیب اللہ غضنفر

زرِ داغِ دل

حبیب اللہ صاحب غضنفر زبان و عروض کے ایک مستند عالم ہیں۔ "زرِ داغِ دل" پر انکا یہ مقالہ محض ایک کتاب پر تبصرہ ہی نہیں، بلکہ اس میں زبان و بیان کے اہم پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ ہمارے دور میں ان پہلوؤں کو خاصا نظر انداز کیا گیا ہے، اسی لئے ہم اس مضمون کو شایع کر رہے ہیں۔ ادارہ

زیرِ نظر کتاب کا نام "زرِ داغِ دل" ہے، بظاہر عجیب سا معلوم ہوتا ہے کیوں کہ 'داغِ دل' اور 'زر' میں بے ربطی معلوم ہوتی ہے، مگر غور کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ مصنف مذکور جناب خالد دور کی کوڑی لائے ہیں اور چوں کہ داغ کو گل سے تشبیہ دی جاتی ہے اور گل میں زر ہوتا ہے لہذا زر کو داغ کا مضاف کر کے استعارہ بالکنایہ حاصل کیا۔ عصرِ حاضر میں کچھ لوگ اس قسم کی لکندن کے مخالف ہیں، مگر اس قسم کی کوششوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مصنف کو کس حد تک تعمق فکر حاصل ہے اور اس قسم کی تراکیب اختراع کرنے کیلئے بڑی جگر کاوی کی ضرورت ہوتی ہے اور اس جدت کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ مگر اسی کے ساتھ کچھ گذارشات ہیں جو امید ہے قارئین با تمکین غور فرمائیں گے۔

آواز کے اتار چڑھاؤ سے جو تال و سُر پیدا ہوتے ہیں ان کی مناسب لے سے ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے، جس کی ترتیب سے نغمات کی تدوین ہوتی ہے حسنِ صوت کو جب الفاظ میں منتقل کیا گیا تو اس نے شعر کا پیکر اختیار کر لیا۔ اگر وزنِ شعر میں نغمہ کا صحیح التزام ہو تو وہ خوش آئند ہوتا ہے۔ ورنہ خارج از آہنگ سمجھا جاتا ہے۔ موسیقی کا تعلق آواز سے اور شعر کا تعلق بول یعنی الفاظ سے ہے۔ اسی لئے ہر دو فنون کی اصطلاحات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ شعر کی موزونیت کا معیار فنِ عروض کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے اور اس فن کا مدار ہجائے کوتاہ اور ہجائے بلند پر ہے جو بنیادی ارکان کہلاتے ہیں ان ارکان کو ترتیب دیکر سبب، وتد اور فاصلہ حاصل کئے جاتے ہیں جو ارکان اولیٰ ہیں اوتاد و اسباب و فواصل سے ترتیب پاکر ارکانِ ثانیہ یعنی ارکانِ عروضی فعولن فاعلن وغیرہ اختراع کئے جاتے ہیں۔ چوں کہ دو ہجائے کوتاہ ایک ہجائے بلند کے مساوی ہوتے ہیں اس لئے ہندی اور سنسکرت میں عام رخصت ہے کہ ہر دو ہجائے کوتاہ کے مقابل ایک ہجائے بلند آ جاتا ہے۔ مگر عربی میں اس کی اجازت صرف فاصلہ میں ہے یعنی متفاعلن میں اضمار سے مستفعلن اور مفاعلتن میں عصب سے مفاعیلن پیدا ہوتے ہیں البتہ فاعلاتن کی مشعث فرعِ مفعولن ہے اس میں اختلاف ہے کہ یہ وزن کیوں کر حاصل ہوا ہمارے نزدیک واضع عروض خلیل کی رائے زیادہ صحیح ہے کہ لام ساقط ہوا اور عروضیین مابعد کے نزدیک مخبون مسکن ہے یعنی فاعلاتن سے مخبون ہو کر فعلاتن ہوا اور عین ساکن ہو کر مفعولن بنا۔ مگر عربی میں تسکین اوسط کوئی زحاف نہیں ہے پس مستفعلن سے جو مفعولن بنتا ہے وہ مقطوع ہے۔ یعنی لام ساقط ہو سکتا ہے، مسکن نہیں ہے۔ اور مستفعلن سے فا ساقط کر کے مفتعلن بنا کر عین کو ساکن نہیں کیا گیا۔ یہ درست ہے کہ فارسی سنسکرت کی بہن ہے اس لئے اس میں بھی ہر دو ہجائے کوتاہ کے مقابل ہجائے بلند آ سکتا ہے۔

اردو اگرچہ سنسکرت کی بیٹی ہے اور فارسی کا دودھ پی کر پلی ہے اس کی نشو و نما بھی ان ہر دو زبانوں سے متاثر ہوئی مگر کچھ ایسے عوامل کارفرما رہے ہیں کہ

عروض ضرب کے علاوہ ہر جگہ تسکین اوسط کو خارج از آہنگ سمجھا گیا ہے۔ تو اعد عروض کے مطابق حکیم جلال کا مصرع۔

خدا سلامت رکھے بتوں کی ٹھوکر کو

موزوں سہی مگر کانوں کو ناگوار گذرتا ہے۔ اسی طرح بحر کا یہ شعر

پوچھنا بھی ہے عبث حال خرابیٔ وطن　　　　بحری سبب نہ رہے کیا فیض آباد رہے

خارج از آہنگ معلوم ہوتا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ ترانہ یا رباعی میں بوجہ فارسی نژاد ہونے کے اس قسم کی سہولت عام ہے مگر اردو میں اس کے بارہ وزن مقبول نہ ہو سکے۔ البتہ ہزج مسدس اخرب الصدر والابتدا اشتوین مقبوض عروض وضرب مقصور یا محذوف میں اس کا استعمال تو ہے مگر اس میں بھی بعض جگہ ناگواری کا احساس ہوتا ہے مثلاً

لو مجھ کو اعتبار آیا　　　　اللہ نہ کھا ؤ جھوٹی قسمیں

مصنف مذکور نے بحر مجتث مثمن مخبون عروض وضرب مخبون مقصور یا محذوف یا مشعث مقصور یا محذوف اور بحر ہزج مثمن اخرب الصدر والابتدا مکفوف عروض وضرب مقصور یا محذوف میں اس زحاف کو عام طور سے استعمال کیا ہے مگر یہ تجربہ کچھ کامیاب نہیں معلوم ہوتا مثلاً

(۱) فضائے صحرا میں ساربانی کی خواں تو　　(۲) انیس احباب حرف سنج و نکتہ نواز

(۳) یہی مرغوب خاطر سپہر کبود　　(۴) ہوائی صورت اذاں ہے جوہر تخلیق

(۵) نعوذ باللہ من شرور انفسنا　　(۶) تمہاری خاموشی کا کوئی سبب تھا ہاں

(۷) نوید کلفت ہے زندگی کا پروانہ

ان مصرعوں کے پڑھنے میں صاف سکتہ معلوم ہوتا ہے جو ہماری زبان کے مزاج کے مخالف ہے۔ علاوہ ازیں کتاب مذکور میں جا بجا غریب اور وحشی الفاظ کا استعمال بھی نظر آتا ہے اور بعض الفاظ قیاس لغوی کے خلاف استعمال کئے گئے ہیں مثلاً

غرامیات: ادائیگی فرض و دَین و محصول کے علاوہ تاوان کے معنی میں آتا ہے مگر مصنف کا مفہوم غیر واضح ہے۔

صدود اربعہ آب و گل یعنی چہ

ہے گرچہ عرض ہنر پیش یار بےادبی　　　　نوائے رازمیں ہے سوز و ساز ہم نفسی

نوائے راز کا مفہوم بھی غالباً خود ساختہ ہے غالب نے جو نوا ہائے راز استعمال کیا ہے وہ اپنی جگہ برمحل ہے اور یہ اس کی ضد ہے غالب کا شعر ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا　　　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

جو سرکشیدہ ہو پامال ہوتا ہے　　　　کہ ماسوا کو ہمیشہ زوال ہوتا ہے

ماسوا کا سرکشیدہ ہونا ضروری نہیں نہ ہر سرکشیدہ لازماً پامال ہوتا ہے۔

تار مراب یعنی چہ

ہمیشہ مقبل و مدبر ہمیشہ خانہ خراب

اس مصرع میں مقبل کا استعمال محل نظر ہے کیوں کہ مقبل خانہ خراب نہیں ہوتا۔

ترے سکوت میں پوشیدہ ہیں نکات خفی　　　　مجھے ڈراتی ہے یہ تری سخن سنجی

سکوت و سخن سنجی کا تضاد عیاں ہے اگر سخن سنجی زبان حال سے ہوتی تو اعتراض نہ ہوتا۔

دلوں کا راز قیافے سے بھانپ لیتا ہوں!　　　　کہ ہوں زمانہ کا سب سے بڑا ستارہ شناس

قیافہ شناسی کافن سعد ستارہ شناسی سے بالکل مختلف ہے لہٰذا یہ تابش مرتفع ہونا چاہئے۔

حقیقت ابدی ہے تفلسف و برہان

برہان الٰی حقیقت ابدی ہے نہ کہ تفلسف پس دونوں کا عطف ناجائز ہے۔

اذن رخصت : اضافۃ الشئی الی نفسہٖ کی مثال ہے۔

لبیب نار و تموتند سود و صرصر ،

بقول غالب زباں ہے :

مجھے اندھیرے : یعنی چہ ؟

خدا معلوم ہابیل کو کس مصلحت سے عطا کیا ہے۔

شعاع خاور : شعاع خاور میں نہیں ہوتی خورشید خاور میں ہوتی ہے۔ اگر خورشید محذوف ہے تو اس کا کوئی قرینہ نہیں۔ اور چوں کہ خورشید ہر وقت خاور میں نہیں رہتا اس لئے ہر وقت شعاع کا آغاز وہاں سے نہیں ہو سکتا۔

مطلقہ : غرابت ظاہر ہے۔

بچاری خلا کو مرحوم کر دیا میں نے

بچاری کی یا مزدست شعری کی ہم گساری ہے اور مرحوم تو ہابیل تھا نہ کہ خلا۔

نزول کرتا ہے تم پہ آسماں سے عذاب   کبھی زمیں کے مساموں سے آ دبن کے اٹھے

یہ عذاب کی کون سی صورت ہے :

مطلق واحد دل میں صفت موصوف کی مطابقت فہم سے بالاتر ہے

مصنف کا یہ دعویٰ ہے

مشاہدات تفکر و بدیع و نادرہ کار   پرو کے نظم معرّی میں پیش کرتا ہے

اس بیت سے یہ خیال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ جملہ منظومات مشاہدہ پر مبنی ہوں گے مگر صرف روایات کو پیش کیا ہے اور مصنف نے صفحات چار سو تین پر خود اپنے ماخذ او منابع کا حوالہ دیا ہے۔ لہٰذا مشاہدات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا صرف تمثیلی نظموں کا مجموعہ ہے۔

مصنف نے ان نظموں میں حسب ضرورت ترمیم بھی کی ہے تقابلی مطالعہ کے بعد یہ بتایا جا سکتا ہے کہ اس ایجاد بندہ سے نظم کے مرکزی خیال میں اضافہ ہوا یا نقصان نہ پہونچا۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ اس مسئلہ پر تفصیل سے لائے زنی کریں۔ صرف چند امور کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔

پہلی نظم کا عنوان سوز ناتمام ہے جس میں قابیل کی سرگذشت نظم کی گئی ہے۔ عام روایت میں قابیل کی دشمنی کی وجہ زوج ہابیل ہے مگر یہود کی روایت کے مطابق قابیل کی قربانی کا قبول نہ ہونا اور ہابیل کی قربانی کا قبول ہونا بنائے عداوت ہے یعنی ہر دو صورت میں —— قابیل کے کردار کی توجیہ کی جا سکتی ہے اور ایک چابک دست مصنف قابیل کے لئے جذبۂ ہمدردی پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ مگر مصنف نے ان دونوں وجوہ کو درخور اعتنا نہیں سمجھا بلکہ قابیل کو نفسیاتی مریض ثابت کیا ہے یعنی جب حضرت آدم اپنے بچوں کو ساتھ لے کر درگاہ الٰہی میں مناجات کرتے ہیں قابیل خاموش رہتا ہے۔ حضرت آدم اس کے طرز عمل سے متعجب ہو کر وجہ سکوت دریافت کرتے ہیں اس پر وہ جواب دیتا ہے۔

مری خموشی ہے احتجاج سراپا   مجھے خودی نے عطا کی ہے شان استغنا

شان استغنا کا تقاضا احتجاج نہیں ہے۔ اور احتجاج کے لئے ضروری ہے کہ پہلے کوئی الزام عائد کیا جائے۔ البتہ دوسری تقریر سے

مگر کوئی شے شایان آرزو بھی تو ہو!

مناسب ہے۔ پہلا اور تیسرا مصرع ناموزوں ہے۔

اس کے بعد غضب حضرت آدم بشریت کی نعمت عظمیٰ بتلاتے ہیں، اور زندگی کے فیوض کی طرف اشارہ کرتے ہیں جواب میں قابیل زندگی کے مصائب گناتا ہے اور کہتا ہے۔

تو مہد تا بہ لحد اک گناہ بے لذت ۔۔۔ کوئی بتاؤ اس انعام کی مسرت کیا

گناہ بے لذت کا محل استعمال محل نظر ہے۔ اس کے جواب میں حضرت آدم نعوذ باللہ کہتے ہیں اور حضرت حوا سمجھانے کی کوشش کرتی ہیں، مگر قابیل کوئی جواب نہیں دیتا۔ حضرت آدم فکر معاش کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور حضرت حوا کو ساتھ لے کر چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد بھائی بہن سمجھانے کی بے سود کوشش کرتے ہیں اور پھر باہر چلے جاتے ہیں۔ اس وقت تنہائی میں قابیل اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے اور زندگی کو

عناں گسیختہ شوریدہ خو فساد پسند

اور تقصیر جرم ناکردہ قرار دیتا ہے کیوں کہ

ہمارے باوا نے کھا کے دانۂ گندم ۔۔۔ ہمیں شبستان خلد سے کیا محروم

اور خدا کو یہ الزام دیتا ہے

گناہ باپ کا اولاد بھگتے خمیازہ ۔۔۔ عجب قضا ہے عجب معدلت پناہی ہے

اس تقریر کے دوران میں ابلیس داخل ہو کر اس کی مدح وستائش کرتا ہے اور آخر میں قابیل اس سے یہ درخواست کرتا ہے۔

حیات و موت کے اسرار مجھ کو سکھلا دو

ابلیس قابیل سے اپنے ساتھ چلنے کو کہتا ہے۔ ادا آکر اسکو روکنا چاہتی ہے مگر وہ نہیں رکتا اور ابلیس کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ ادا ابلیس کو برا کہتی رہ گئی، اس سے قابیل کو صرف یہ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

موت: ماندگی کا وقفہ ہے۔

قابیل کا سوال ہے۔

خدا نے آخر تخلیق غم سے کیا پایا؟

ابلیس کا جواب ہے۔

یہ درد و غم اسی وہاب کا ہے فیض عمیم

قابیل پکار اٹھتا ہے۔

یہاں سے بھی کوئی درمان درد دل نہ ملا

یعنی یہ غیر مطمئن ہو کر دنیا میں واپس آیا اور ادا سے محو گفتگو ہوا، اس اثنا میں ہابیل آیا اور اس نے شیطان کی مذمت کی اور ادا سے باہر چلنے کو کہا کیوں کہ وہ چاہتا تھا کہ دونوں بھائی قربانی راہ خدا میں پیش کریں۔ قابیل بمشکل آمادہ کیا گیا تو اس کی قربانی قبول نہ ہوئی، اس پر اس نے پیچھے سے ہابیل کو قتل کر دیا۔ اس کی لاش کو دیکھ کر ندامت ہوئی

خدا رسیدہ بھائی کو جوش میں آ کر!
متاع زیست سے محروم کر دیا میں نے
دلوں میں نفرت کا بیج بو دیا میں نے

مگر یہ ندامت کا جذبہ دیرپا نہ تھا۔ بلیچر کی آواز سن کر ملائک وغیرہ وہاں آگئے تو قابیل نے اعتراف جرم نہ کیا۔ حضرت حوا نے بددعائیں دیں تو قابیل نے رسمے اولاً پشیمانی کا اظہار کیا لیکن حضرت آدم نے قابیل کو بددعا دی۔ مگر یہ سمجھ میں

عدو و نزاع کے مشکل کم پسند ہوتے ہیں

بعد ازاں قابیل اظہار ہمدردی اس طرح کرتا ہے۔

غضب ہے یہ بے اولاد مر گیا ہابیل

آخر میں آدم ہابیل کے حق میں دعا کرتی ہے تو قابیل یہ سوال کرتا ہے۔

مگر یہ سوختہ دل ــــــــــــ؟

ظاہر ہے کہ یہ تمثیلی نظم مصنف کے مشاہدہ کا نتیجہ نہیں ہے اور مجموعی تاثر یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو برا سمجھا جاتا ہے اور ان کے افعال کو جرم گنا جاتا ہے وہ صرف ذوق تجسس کا نتیجہ ہونے کے باعث مذموم نہیں اور اس طرح فلسفۂ اخلاقیات کی نئی تدوین کی ضرورت ہے۔

دوسری نظم جہان نو ہے جس میں خرافیات یونان سے پنڈورا کا افسانہ نظم کیا گیا ہے۔ جس کا خلاصہ مصنف کے الفاظ میں یہ ہے۔
ایک سنگ تراش آذر نے صبیحہ کا مجسمہ تیار کر کے اس کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا

حسن تخلیق کا اعجاز ہے یہ پیکر گل! مرے افکار کا آہو کہ تھا آوارہ خرام

تہ گرداب کہیں قلزم مینائی میں

قلزم مینائی سے شاید آسمان مراد ہے اور تہ گرداب سے زمین۔ اگر یہ درست ہے تو اسلوب بیان کی خامی ظاہر ہے اور اگر کچھ اور مفہوم ہے تو وہاں تک عام لوگوں کی رسائی دشوار ہے۔

طین لازب کا یہ پیکر کہ ہے بجز شوق میری تصویر گری میری قلم کاری ہے

طین لازب ہماری زبان میں اجنبی ہے۔

جس کے جلوؤں سے فروزاں ہے تخیل کا حریم جس کی خوشبو سے مہکتا ہے شبستان نسیم

پہلے مصرع سے لطیف و روحانی ہونا مستفاد ہوتا ہے دوسرے سے جسمانی' پس تضاد ظاہر ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ نسیم صبح کی ہوا کو کہتے ہیں اور اس کے رات کی آرام گاہ کا وجود صرف خیالی ہے اس لئے یہ تاویل دوسرے سے بھی روحانی ہونا ظاہر ہے تو صبیحہ کے مجسمہ پر صادق نہیں آتا۔ مگر مجسمہ اور تصویر جداگانہ چیزیں ہیں ابھی تک سائنس نے اس قدر ترقی نہیں کی کہ تصویر کو مجسمہ یا مجسمہ کو تصویر میں منتقل کیا ہو۔
بہرحال اپنے شاہکار کی توصیف کرتے ہوئے وہ ندائے غیب سنتا ہے کہ اس مجسمہ میں جب تک روح نہ ہو نامکمل رہے گا مگر آذر وثوق کامل سے سوال کرتا ہے۔ یہ بھی پائے گا حیات ابدی؟

مگر یہ سوال کا محل نہیں ہے بصورت بیانیہ آذر کی خود اعتمادی ظاہر ہوگی۔ ندائے غیب نے اس مجسمہ میں جان ڈالنے کا وعدہ کیا۔ معاً ہوا کا جھونکا آیا اور اس مجسمہ کو زندگی بخش کر چلا گیا۔ مگر ندائے غیب میں غزالان بہار کی تخصیص سمجھ میں نہیں آتی شاید شعرائے انگلستان کی تقلید بھی کی ہے۔ جو خرگوش بہار کے ترانے گاتے ہیں۔ مجسمہ میں جان پڑ جانے کے بعد بت بول آیا اور کہنے لگا

تا رم عرش سے پیغام ملا ہے مجھ کو جس جگہ رہتا ہے مجبور ستم شعلہ مآب

شعلہ مآب سے غالباً ابلیس مراد ہے مگر اس پر خدا کی عنایت اپنے بت کے اعتراف کے ساتھ کچھ عجیب ہے،

تاکہ وہ حسن جواں سال کی رعنائی سے اس کے اجڑے ہوئے گلزار کو آباد کرے

اس کی بجائے " اپنے " کا محل ہے۔

غمِ ایام کو دلوں یونہی بسائے رہیں　　　یونہی منظرِ گہِ آفاق کو مہکائے رہیں

غمِ ایام میں شاید قلب اضافت ہے ورنہ غمِ ایام کا مفہوم غیر واضح رہے گا

شعلہ مآب بھی غافل نہیں اپنے خیالات تنہائی میں ظاہر کر رہا ہے۔

رات بھر ذہن میں اوہام پریشاں کا ہجوم　　　کسی آئندہ مصیبت کی خبر دیتا رہا

مطلعِ خور سے ابھرتے ہوئے خم دار خطوط　　　آج شاید نئے آلام کا مژدہ لائیں

اوہام غلط نہ سہی مگر ہماری زبان میں غریب ضرور ہے

شعلہ مآب کے اظہارِ خیال کے دوران پیکرِ نور کے ساتھ جیسمنہ دہلیز پر آ کر اپنے خیالات کو ان الفاظ کا جامہ پہناتی ہے

ایک محبوس فغاں ایک گلوگیر نوا　　　در و دیوار سے ٹکرا کے پلٹ آتی ہے

محبوس فغاں تو وہی ہوگی جو انسان کے سینے سے نہ نکلے اور گلوگیر نوا وہ ہوگی جو حلق میں گھٹ کر رہ جائے۔ ایسی صورت میں در و دیوار سے ٹکرانا معلوم۔

حزنِ مجبور: ———————— کیا حزن آزاد بھی ہوتا ہے

پیکرِ نور شعلہ مآب کو تسلیم کرتا ہے مگر اس کا جواب یہ ہے۔

میرے مسکن میں تجھے کون سی حاجت لائی

کیا کوئی چیز چرانے کے لئے آئے ہو؟

نشتر گری عیاں ہے

پیکِ نور کا جواب

رب الارباب نے بھیجا ہے مجھے تیری طرف

تشنیت کا استعمال بے محل ہے۔

آگے چل کر

عیش و طرب کا سر و ساماں دے کر　　　کہ ترے کلبۂ احزاں کو کروں بقعہ نور

"کہ" حشو قبیح ہے۔ اگر مصنف اپنے اصول پر عمل پیرا ہوئے ہوتے تو "تیرے" کا استعمال کر سکتے تھے اور قدامت پرست لوگ "میں" یا "پھر" بڑھا کر مصرع موزوں کرتے

سوچ یہ مرمر و مرجاں کا حریری پیکر

مرمر پتھر ہے مرجان یعنی مونگا نباتی الاصل ہونے کے باوجود صلابت و سختی کے باعث احجار میں شامل ہو سکتا ہے مگر اس سے حریری پیکر کسی طرح تیار نہیں ہو سکتا۔

ان کے الطاف حسیں گرچہ ہوں دامن کشِ دل

الطاف کی صفت حسین کچھ مناسب نہیں۔

صفحہ ۵۰ پر جو الفاظ پیکرِ نور کی زبان سے ادا ہوئے ہیں غالباً طباعت کی غلطی ہے یعنی

کس طرح تجھ کو بھلا مجھ سے شناسائی ہے

یہ الفاظ شعلہ مآب کے ہوں گے۔ صفحہ آخر پر جو تقریر ہے وہ بھی اسی کی ہوگی جس کا آغاز یہ ہے

میرا طالع تو خلاؤں میں کہیں ڈوب گیا

مگر طالع ڈوب نہیں سکتا ستارہ ڈوب سکتا ہے۔ خلا میں ڈوبنا تو بالکل محال ہے۔ اس میں آوارہ یا گم ہو سکتا ہے۔

وہ بھی احسان فراموش ہی نکلے آخر

یہ "وہ" اظمار قبل الذکر ہے مگر مرجع غیر معین ہے۔ شاید انسان مراد ہو مگر اس کے فوراً بعد دیوتاؤں کا ذکر ہے جن سے شعلہ تاب پہلے ہی سے بدظن ہے۔

اسی طرح پیک نور کی تقریر میں

ان کا پیمان وفا ان کا خلوصِ نیت

مرجع سے بے نیاز ہے۔

تم کو یہ خواب مبارک ہو کہ طلسم — نامرادانہ خیالات کا سنسان دیار

ہیولیٰ کا مفہوم بھی خود ساختہ ہے۔ ہیولیٰ مادہ کو کہتے ہیں جس سے دیگر اشیاء وجود پذیر ہوتی ہے مثلاً مٹی سے کمہار گھڑا صراحی وغیرہ بناتا ہے یا سونے سے بالی جھومر ٹیکہ وغیرہ زیورات بنتے ہیں۔ پس مٹی یا سونا ہیولیٰ ہیں۔ دیار جمع ہے لہٰذا کا کے بجائے کے ہونا چاہئے۔

بطن ایتھر سے گذرتا ہوا مانند سناں

کیا سناں بطن ایتھر سے گذر جاتا ہے۔

بہرحال شعلہ تاب سے مایوس ہو کر پیک نور روانہ ہوتا ہے اور حاجب سے ملاقات ہوتی ہے۔ حاجب صحینہ کی مدح سرائی کرتا ہے مگر اس میں شتر گربگی پائی جاتی ہے اس کے بعد کی تقریر میں "ویرانہ ایام" میں جس طرح زبان و مکان کو پیوستہ کیا ہے وہ مصنف ہی کا حصہ ہے۔

جناب موصوف تسکین اوسط کے تو شائق تھے ہی تحریک اوسط سے بھی کام لینا جانتے ہیں اس کی مثال یہ مصرع ہے

سقف و بام تجھے کہتے ہیں اہلاً سہلا

سقف عربی زبان میں شتر مرغ کی ناہمواری کے لئے بولا جاتا ہے اگر اس مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے تو اردو کے لئے وحشی ہونا ظاہر ہے۔

یہ شبستاں بھی تیرا اس کا مکیں بھی دونوں

دونوں بے محل ہے یہاں تیرا زیادہ مناسب تھا

اے بت سحر فن اے شاہدۂ شعلہ جمال

تیری زلفوں میں ہیں سرگشتہ غزالان خیال

محبوب کے معنی میں شاہد فارسی ہے اس میں تائے تانیث کی گنجائش نہیں۔ عربی شاہد کے معنی گواہ کے ہوتے ہیں وہ محبوب نہیں ہوتا۔

زلفیں محسوس اور غزالانِ خیال معقول ــــــ کیا المعنیٰ فی بطن الشاعر کی مثال دینے کیلئے یہ مصرع ایزاد کیا گیا ہے؟

وہاں پر صحینہ کو ایک صندوق نظر آتا ہے اس کے متعلق وہ حاجت سے استفسار کرتی ہے وہ اپنی لاعلمی کا اظہار کرتا ہے صندوق کے متعلق یہ اظہار تو ٹھیک ہے کہ اس میں کچھ چھپا ہے مگر اس میں کچھ دفن ہے ایجاد بندہ ہے۔

جس وقت حاجب صحینہ سے اظہار عشق کر رہا ہے اس وقت شعلہ تاب اس کے پاس آتا ہے صحینہ چھپ جاتی ہے صفحہ اسی پر رائیگاں ہی گئے سے شاید شعلہ تاب کی تقریر شروع ہے اسی طرح صفحہ اکیاسی پر "بنت حوا" سے اسی کی تقریر کا آغاز معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال شعلہ تاب حاجب کو اس کے فرائض یاد دلاتا ہے اور عشق و محبت سے باز رکھنے کی تلقین کرتا ہے اس اثناء میں صحینہ تنہائی سے اکتا کر سو جاتی ہے پھر کوئی خواب دیکھ کر چونک پڑتی ہے اور اس صندوق کو کھول دیتی ہے معاً باد و باراں کا طوفان آتا ہے حاجب اپنے مسکن کی طرف پرواز کرتا ہے۔

ہر طرف ایک پُر اسرار حزیں سناٹا!

بغیر حزیں سناٹا کون سا ہوتا ہے۔ کیا حزیں کے لئے پُر اسرار ہونا بھی ضروری ہے۔ صبیحہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتی ہے اپنے حاجب کی محبت کچھ اور زیادہ ہو گئی۔ دیوتاؤں کا غضب مجھ پر ہی نازل ہوگا۔

اس قسم کی تراکیب میں ہی کے استعمال میں عام طور سے بے پروائی برتی جاتی ہے درست صورت یہ ہے کہ ہی اسم یا ضمیر کے ساتھ پیوستہ مستعمل ہو اور حرف جار اس کے بعد آئے یعنی مجھی پر تمہیں سے وغیرہ

شاہدۂ شعلہ جمال ——

عربی میں شاہد گواہ کے لئے آتا ہے فارسی میں محبوب کے معنی میں مستعمل ہے مگر وہاں بھی جنس کا فرق ہا سے نہیں آتا۔

تاب کا لاحقہ صرف صفات کے ساتھ ترکیب پاتا ہے اس لئے شعلہ تاب کی ترکیب محل تامل ہے۔

اس افسانہ کا پلاٹ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ آذر نے صبیحہ کا مجسمہ تیار کیا ندائے غیب آئی کہ اس میں روح کی بھی ضرورت ہے روح پڑ گئی اور ایک پیک نور آکر اس کو اپنے ساتھ شبستان شعلہ تاب کی جانب لے گیا شعلہ تاب نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو پیک نور آگے لیکر بڑھا حاجب رفتہ نے اس کو پسند کر لیا اور محو گفتگو ہو گئے وہیں صبیحہ کو ایک صندوق نظر آیا اس نے اس کی بابت سوال کیا حاجب نے اپنی لاعلمی ظاہر کی مگر اسی اثنا میں شعلہ تاب نے آکر حاجب سے گفتگو شروع کی اور موقع پاکر صبیحہ نے اس صندوق کو کھول دیا آلام و مصائب کو آزادی مل گئی۔ صبیحہ نے اعتراف قصور کیا اس کی حاجب کی محبت اور زیادہ ہو گئی۔

اس پلاٹ کی خامیاں ظاہر ہیں۔ ان خامیوں کو سمجھنے کے لئے اس تمثیل کا پس منظر ذہن میں رکھنا ضروری ہے وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ انسان نے جب خود کو مصائب و آلام میں گھرا ہوا پایا تو خود فریبی کے لئے ماضی کے دھندلکوں میں یا مستقبل کے خوابوں میں اپنے دور متعین کرنا پڑا جب دنیا میں ہر قسم کی مسرت موجود ہو قریب قریب ہر قوم میں اس قسم کی روایت موجود ہے کہ آخر زمانہ میں ایک ایسا شخص عالم وجود میں آئے گا جو اس دنیا کو ہر قسم کی آسائشوں سے معمور کر دے گا۔ کچھ لوگ اس کے قائل ہیں کہ اب سے پیشتر کا زمانہ بہتر تھا اسی ذہنیت کے لوگوں نے یہ قصہ ترتیب دیا ہے کہ خالق کائنات نے اس دنیا کو وجود میں لانے کے بعد آلام و مصائب کو ایک صندوق میں مقفل کر کے ایک دیدبان کے سپرد کر دیا اسکو ایک لڑکی نے اپنے ذوق تجسس کی تسکین کے لئے کھول دیا اور اس وقت سے عالم میں مصائب کا ہجوم ہو گیا۔

مصنف یہ چاہتے تھے کہ اس لڑکی کو عام انسانوں سے علیحدہ ثابت کریں اس لئے اس کا مجسمہ آذر سے تیار کرایا مگر اس میں روح بھی شیطان سے پھنکواتے اس طرح اس کا تجسس خدا ساز انسانوں سے مختلف ہوتا اور اس افسانہ کا آغاز مصائب سے کیا جاتا یعنی صبیحہ اور حاجب دونوں ناوک اجل کا نشانہ بنتے کیوں کہ موت سب سے بڑی مصیبت ہے ——————

—————— اور وہ اس عہد سے پہلے تھی ہی نہیں، اس المیہ کے بعد آذر اظہار ندامت کرتا اور وہ بھی موت کی آغوش میں چلا جاتا۔ اس وقت اس تمثیل کا تاثر زیادہ قوی ہوتا۔

بہ حالت موجودہ کوئی کردار اپنے صحیح مقام پر نہیں آتا۔ کیوں کہ جان ڈالنے کا مسئلہ خود جان آفریں کے سپرد ہے تو آذر کا مجسمہ بنانا غیر ضروری ہے اور مجسمہ بنانے کے بعد وہ بالکل غائب ہو جاتا ہے اسی طرح شعلہ تاب غیر ضروری ہے صرف اتنا سا کام اسکے سپرد ضرور ہے کہ باتوں میں لگا کر حاجب کو کہیں لے جائے تاکہ صبیحہ کو صندوق کھولنے کا موقع مل جائے باقی سب حصہ تطویل لاطائل ہے۔ اسی طرح پیک نور کا فرض صرف اتنا تھا کہ بہ ہدایت صاحب عرش اس کو شعلہ تاب کی خدمت میں پیش کر دیں مگر انھوں نے صبیحہ کو آگے لے جانا چاہا اور جس کام سے شعلہ تاب نے پہلوتہی کی وہ امین خداوندی ہوتے ہوئے حاجب رفتہ نے ایک لئے آمادگی ظاہر کر دی۔ لہٰذا یہ نظم اس تمثیل کا ناقص چربہ ہے

اس سلسلہ میں جو نفسیاتی تحلیل کی جا سکتی ہے میں اس کو فرائڈ کے پیروؤں کے لئے چھوڑتا ہوں (باقی آئندہ)

مولوی سید امانت حسین

قاضی عبدالودود

شاد عظیم آبادی شاگردِ صفیر بلگرامی

سید مرتضیٰ حسین صاحب بلگرامی نے علیگڑھ سے چند غیر مطبوعہ خطوط اشاعت کے لئے بھیجے ہیں۔ ان میں دو خط مولوی سید امانت حسین صاحب مرحوم ڈپٹی کلکٹر (صوبۂ بہار) کے ہیں جو سید وصی احمد صاحب بلگرامی ڈپٹی کلکٹر (صوبہ بہار) کے نام لکھے گئے تھے۔ یہ خطوط بہت سیدھے سادے اور مختصر سے ہیں اور بظاہر ان میں کوئی بات نظر نہیں آتی۔ لیکن اپنی جگہ ان کی بڑی اہمیت ہے۔ کیونکہ ان میں "س ش ص" کا تذکرہ ہے "س ش ص" سید وصی احمد صاحب بلگرامی کے ایک طویل اور ہنگامہ خیز مضمون کی انوکھی سرخی ہے۔ اس مضمون میں سید صاحب نے نواب تجمل حسین خاں سلطان عظیم آبادی سید محمد علی محبت و عظیم آبادی اور حضرت صفیر بلگرامی کے روابط پر بحث کی تھی اور بتایا تھا کہ سلطان و شاد نے اپنے عنفوان شباب میں حضرت صفیر سے کوئی سات سال تک تربیت پائی تھی، یہ تذکرہ ظاہر ہے کہ ایک خشک سی بحث ہے، پھر یہ کوئی ایسی بات بھی نہ تھی کہ دھوم دھڑکے جیسے سائز پر ستر بہتر صفحات میں بیان کی جائے اور قارئین اس کو دلچسپی کے ساتھ پڑھنے پر آمادہ ہوں۔ مگر سید صاحب کے قلم میں قدرت نے کچھ ایسی چاشنی ایسی لطافت ایسی حلاوت بخشی ہے کہ وہ خشک سے خشک عنوان پر بھی قلم اٹھا لیتے ہیں تو اس کو باغ و بہار بنا دیتے ہیں۔ س ش ص ایک ایسا مضمون ہے کہ ادبی معلومات کا ایک خوبصورت دفتر نگاہوں کے سامنے کھلتا چلا جاتا ہے۔ اس میں سلطان و شاد اور صفیر بلگرامی کی ادبی زندگی کے بہت سے نئے پہلو بھی روشنی میں آئے ہیں جو عام طور پر لوگوں کے علم میں نہ تھے۔ پھر یہ ایک خاص دور کا خاصہ قابل قدر تذکرہ شعراء بھی ہے۔ اس کے علاوہ نواب تجمل حسین خاں کی دلچسپ داستانِ معاشقہ بھی درج ہے اور لطف یہ ہے کہ یہ ساری باتیں موضوع کے دائرے کے اندر ہیں۔ شاد کی مشہور اور سلطان کی غیر مشہور غزل "سلطنت سے جدائی چاہئے رندانہ" کی شانِ نزول بھی بتائی گئی ہے جو بجائے خود اہم چیز ہے کیونکہ یہ کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔ مستقل قارئین "ماہِ نو" سید صاحب کے اندازِ تحریر سے واقف ہیں، ان کے مضامین "جلترنگ" اور "ذیرہ حرم کا افسانہ" ماہِ نو میں چھپ چکے ہیں۔ س ش ص جب پہلی مرتبہ رسالہ ندیم کے بہار نمبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا تو حضرت نیاز نے وہاں سے نقل کر کے بعد اس کو اپنے رسالہ نگار میں درج کیا تھا اور ادبی حلقوں میں بڑے لطف و لذت کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔

ان خطوط میں اسی مضمون س ش ص کا تذکرہ ہے، بلکہ تبصرہ بھی ہے اور اس ردِ عمل کا ذکر بھی جو غالباً ارباب پٹنہ پر اس کی اشاعت کے بعد ہوا ہوگا۔

مظفرپور ۱۷ر اکتوبر [illegible]

مجی۔ کرم گستری! السلام علیکم! محبت نامہ آپ کا موصول ہوا۔ بفضلہ تعالیٰ سب لوگ بخیریت ہیں۔ مضمون کو خوب پڑھا۔ پٹنہ میں بہت کچھ تعریف سنی۔ لیکن کچھ لوگ جواب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ [illegible] پورنیہ میں خوش نہیں ہیں۔ مکان نہیں ہے۔ ان کے متعلقین ہمارے ساتھ ہیں۔ [illegible] سے چوماہ کی رخصت بخیال علاج طلب کی ہے۔ میرے جانے پر متعلقین کو پورنیہ میں کس حالت سے رکھیں گے۔

آپ الہ آباد غالباً کسی کام سے گئے ہیں، وہ کیا کام ہے اور مشاہرہ کچھ فاضل ہو گیا نہیں۔ ہم آپ کے دعاگو ہیں اور آپ کی ترقی کے خواہاں ہیں۔ بہت مبالغہ معلوم ہوگا اگر ہم یہ کہیں کہ ہم نے آپ سا دوسرا سعید لڑکا نہیں دیکھا ہے۔ معاف کیجئے گا میں نے زیادہ لکھ دیا۔

خیریت سے اپنے بچوں کی مطلع فرمائیے اور ہمارے لئے دعا کیجئے۔ امانت

---

(۲) مظفرپور ۲۴ر اکتوبر ۱۹۳۵ء

مجی۔ تسلیم۔ کارڈ موصول ہوا۔ ہم ایک شادی کی تقریب میں پٹنہ میں شریک تھے ۔۔۔۔۔۔ اندر شہر اور بانکی پور کے خاص لوگوں کا مجمع تھا۔ اتفاق سے آپ کے مضمون "[illegible]" کا تذکرہ آگیا۔ تحریر اور عنوان بیان سب کو پسند۔ لیکن بعض پٹنہ شہر کے بولنے لگے کہ

"جواب دینا ضروری ہے کیونکہ شاگردی، روش، و شاد کی اس تحریر سے منوانی ہے اور جواب نہیں دینے سے مجبور ہو جائیگی"۔

ہم کسی کے نام سے واقف نہیں ہیں جو کچھ ریمارک تھا وہ یہ تھا کہ بلگرامی صاحب نے نازک قصہ کو جس کو لوگ بھول گئے تھے چھیڑ دیا ہے اور اصل خدمت حق کی مقصود ہے شاہ غفور الرحمٰن صاحب والد ماجد ولی الرحمٰن سلمہ مجھ سے فرماتے تھے کہ شاد صاحب پہلی شاگرد حضرت صفیر تھے۔ لیکن اپنی کسی خاص مصلحت سے منکر تھے۔ ولی الرحمٰن [illegible] ایک ہفتہ سے پورنیہ میں بخار میں مبتلا ہیں، سخت تکلیف ہے باقی خیریت ہے آپ کا دعاگو۔ امانت

اس خط پر سید وصی احمد صاحب بلگرامی کا یہ حاشیہ بھی جو اسی زمانے کا لکھا ہے، درج ذیل ہے:۔

یہ خط مولوی امانت حسین صاحب کا آخری خط ہے جو ہم کو آیا۔ تین ماہ بعد ۹ر فروری ۱۹۳۶ء کو انھوں نے مظفرپور ہی میں کچھ دن بیمار رہ کر انتقال کیا۔ ان کی نعش مظفرپور سے پھلواری شریف ضلع پٹنہ میں گئی اور خانقاہ کے قبرستان میں وہ مدفون ہوئے۔ مرحوم نہایت ہی زندہ دل، نیک اور مرنجاں مرنج شخص تھے۔ ہماری تبدیلی جب ڈالٹن گنج ہوئی تو جنوری سے جولائی ۱۹۳۱ء تک ہمارا اور مرحوم کا ساتھ رہا تھا۔ ڈالٹن گنج سے وہ رخصت پر گئے اور پھر مظفرپور گئے۔ مرحوم

؎ یہ خطوط سید وصی احمد بلگرامی صاحب کو الہ آباد لکھے گئے تھے۔ سید صاحب کو گورنمنٹ آف بہار نے الہ آباد بورڈ آف ریونیو کا قلمی کتب خانہ دیکھنے بھیجا تھا۔ جہاں وہ چار ماہ تک مقیم رہے تھے۔

کے انتقال کی خبر سن کر جب نے ان کے داماد شاہ سید علی الرحمٰن صاحب ڈپٹی کلکٹر کو مظفر پور کے پتے سے یہ تار دیا تھا:

"چشم گریان و سینہ بریان است"

یہی مصرع انگریزی حروف میں لکھ کر تار دیا تھا جس میں ہم نے تاریخ وفات یہ کہی:

(۱) مظفر پور دلم برفت — مظفر پور: ۱۴۲۸ — دلم ۷۴ = ۱۳۵۴

(۲) رسید از مظفر پور رفت — مظفر پور: ۱۴۲۸ — تعمیہ ۷۴ = ۱۳۵۴

واضح ہو کہ اس سے ٹھیک ایک سو برس پہلے یعنی ۱۲۵۴ھ میں حضرت ناسخ لکھنوی نے انتقال کیا تھا۔

ان خطوط کی کتابت ہو چکی تھی کہ ایک اور خط موصول ہوا۔ یہ تازہ ترین ہے اور برعظیم کے ایک بڑے محقق قاضی عبدالودود صاحب کا ہے یہ خط بھی سید وصی احمد صاحب بلگرامی کے نام ہے اور انھوں نے اپنے قیام کراچی کے دوران میں جواباً لکھا ہے، اس میں تین غیر متعلق باتیں درج تھیں — سید صاحب نے جس طرح ہمیں دیا ہے ہم اسی طرح اس کو درج کرتے ہیں۔ (ادارہ)

۱۲۳ مسلم کالونی

کراچی ۳ ۱۷ جنوری ۵۸ء

مجی تسلیم

آپ سے جو گفتگو ہوئی تھی، اس کے سلسلے میں گذارش ہے:-

(۱) . . . .

(۲) . . . .

(۳) . . . .

(۴) شاد و صفیر کے تعلقات کے متعلق قدیم و جدید تحریریں، تقریباً کل میری نظر سے گذری ہیں اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاد کو صفیر سے تلمذ رہا تھا۔ بندہ علی، نشتر، شاگرد نواب عالم شاہ میرے دادا کے رفیق تھے اور میرے ہی یہاں ۱۹۲۲ء میں ان کی وفات ہوئی۔ وہ مجھ سے کہتے تھے کہ شاد نے اپنی ایک غزل پر کشمیری کوٹھی میں صفیر سے میرے سامنے اصلاح لی تھی۔

مخلص عبدالودود

امراؤ طارق

دیواریں

پیر جی صبح ہی بستی سے گردن جھکائے چل دیئے
نیا معاشرہ انہیں منہ چڑا رہا تھا۔
اور بستی کے لوگ حسبِ معمول اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب میں جھونپڑی میں رہا کرتا تھا۔ یہ جھونپڑیاں شہر کے بالکل آخر میں بنائی گئی تھیں جن کے بعد جنگلی جھاڑیوں اور کیکر کے اکا دکا درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور میدان بستی والوں کی غلاظت سے اٹا ہوا تھا۔ ساری جھونپڑیاں چٹائیوں اور سرکیوں سے تیار کی گئی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کی دیواروں سے دیوار ملانے کا سلسلہ تقریباً پانچ ہزار جھونپڑیوں تک چلا گیا تھا۔ یہ دیواریں بس احساس کے طور پر تھیں ورنہ ان کے دوسری جانب ہونے والی تمام گفتگو اور حرکات میں سب ذہنی طور پر ایک دوسرے کے شریک تھے۔

میں جس جھونپڑی میں رہتا تھا وہ ایک گلی کے موڑ پر واقع تھی۔ سامنے امرتسر کے ایک مہاجر خاندان کی جھونپڑی تھی۔ شروع شروع میں یہ گلی نئی چوڑی تھی کہ میونسپل کارپوریشن کی غریب پرور لاری پانی لے کر اس گلی سے ہفتہ میں ایک بار گزر جایا کرتی تھی مگر اب امرتسری کی مسلسل پھیلتی ہوئی جھونپڑی نے لاری کا گذر ادھر سے بند کر دیا تھا۔ اور خیال تھا کہ ایک روز اچانک امرتسری مہاجر کی جھونپڑی کی ہوا سے کانپتی ہوئی دیواریں میری جھونپڑی کی نیم جان دیواروں سے مل جائیں گی اور گلی پر اسرار طور پر غائب ہو جائے گی۔ اس خاندان کے مرد بڑے کم گو اور خاموش طبیعت کے تھے اور انہیں بستی کے بہت کم لوگ جانتے تھے۔ لیکن اس واحد عورت سے سب واقف تھے جو ہر سال کچھ دنوں کے لئے جھونپڑی میں روپوش ہو جایا کرتی تھی۔ اور جب باہر آتی تو اس کی گود میں ایک گلگوتھنا سا بچہ ریں ریں کرتا رہتا۔ اور وہ جھونپڑی کی کانپتی ہوئی دیوار کے سہارے گلی کے موڑ پر بیٹھی ہوئی اسے تیل ملا کرتی۔ وہ جب امید سے ہوتی جب بھی اپنی دیوار کے سہارے گلی کے موڑ پر بیٹھی ہوئی ڈھیلے پائنچوں والی شلوار گھٹنوں کے اوپر چڑھا کے کھجا کھجا کر ڈھیلی ران پر لکیریں بناتی رہتی۔ اور سامنے والی پرچون کی دوکان سے ملتانی کی ٹکیاں لے کر چباتی رہتی اور بیزاری سے ہر گذرنے والے کو دیکھتی رہتی۔ اگر ان دنوں کسی سے ٹھن جاتی تو خواہ مرد ہو یا عورت اسکے بخئے ادھیڑ دیتی اور ساری تاریخ گالیوں کے ساتھ دہرا دیتی۔ اسکے یہاں کبھی کبھی ایک سانولی سی طرحدار عورت بھی تین چار سال کا بچہ لئے ہوئے آیا کرتی تھی جو قریب ہی کسی جھونپڑی میں رہتی تھی اور ہمیشہ سرخی پاؤڈر سے لیس رہتی۔ اس کا بستی کے ہر نوجوان سے کھلا مذاق تھا اور اسے ہر شخص پر فقرہ چست کرنے کی عادت پڑی تھی۔ لیکن آپس کی لڑائی کے دوران بھی اس کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات نہ سنائی پڑتی۔ شاید اس کا ماضی صاف تھا۔ میری جھونپڑی سے ملحق داہنی طرف ایک ٹیلر ماسٹر اپنی بیوی کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ جو تقریباً روز ہی شام کو کام سے واپسی کے بعد اپنی بیوی کو پیٹا کرتا تھا اور وہ بڑے خوشامدانہ انداز میں اپنے شوہر کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی۔ لیکن ماسٹر سعود کی کچھ سے شروع ہوتا اور طمانچوں اور گھونسوں پر تان ٹوٹتی اور تقریباً ساری رات ہی مغلظات کا سلسلہ جاری رہتا۔ لیکن صبح ہوتے ہوتے

[illegible] باتیں [illegible] ماسٹر [illegible] لڑکی کی شادی نہ کی تھی اُس وقت تک ماسٹر کا غصہ لڑکی کی
[illegible] بعد ہی ختم ہو جاتا۔ وہ باپ اور ماں کے درمیان کڑی ہو کر دونوں کی گرمجوشیوں میں مصالحت کرا دیتی اور جلدی دبے دبے قہقہے ابھرنے لگتے۔
لڑکی کی شادی کے بعد شیلا ماسٹر [illegible] دونوں کے [illegible] ٹوٹنے لگا تھا۔ اور بیوی پر اس کا غصہ طویل ہوتا جا رہا تھا۔ ماسٹر کا خیال تھا کہ
لڑکی کی عدم موجودگی میں اس کی بیوی کسی سے [illegible] اس کا یہ شک ابھی تک دھندلا اور غیر یقینی تھا۔ شیلا ماسٹر کی بیوی ساری رات
کے باوجود ماسٹر کے جانے کے بعد پڑوس والوں سے دیر تک باتیں کرتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے اس نے بڑی پرسکون رات گذاری ہو۔

سامنے کی طرف میری جھونپڑی کے برابر ایک بوڑھی عورت اپنے دو جوان پوتوں کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ ان میں سے ایک کسی مل میں ملازم اور دوسرا گدھا گاڑی چلایا کرتا تھا۔ رات میں دونوں بھائی فلموں پر تبصرہ کرتے۔ پہلا دیکھی ہوئی فلم کی کہانی مکالموں کے ساتھ دوسرے کو سناتے اور پھر فلم کے گانے کن سُری آوازوں میں گاتے جاتے اور پھر فلم پر تنقید کرتے۔ ایک [illegible] اور دوسرا اسی کی تعریف کرتا اور یہ سلسلہ گئی رات تک جاری رہتا۔ کبھی کبھی پڑوس کے شائقین فرمائشوں کا سلسلہ بھی شروع کر دیتے۔

ساری بستی نچلے طبقے کے افراد پر مشتمل تھی۔ ان میں ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کا بالکل احساس نہ تھا۔ یہ دن بھر اپنی روزی کماتے، شام لوٹتے کے جھکے ہوئے چھپروں والے چائے خانوں میں کسیلی اور اوٹی ہوئی چائے پیتے اور اس جائیداد کا رونا روتے جو ان میں سے ہر ایک عزت و ناموس کی خاطر ہندوستان میں چھوڑ آیا [illegible] یا پھر فلمیں دیکھتے، اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہوتا تو کچھ پھٹے پرانے تاش بچھا کر تاش یا شطرنج کھیلتے۔ بستی پر ایک غم آلود کہر دھند ہر وقت چھائی رہتی۔ جھونپڑیوں اور چائے خانوں کا دھواں گلیوں میں منڈلاتا رہتا اور سڑے ہوئے کیچڑ کی بو فضا میں رچی رہتی۔

ایک شام جب بستی پہونچا تو معلوم ہوا کہ میرے بائیں طرف کی جھونپڑی میں کوئی پیر جی آگئے ہیں۔ پیر جی سے پہلے اس جھونپڑی میں ایک خاموش سی بیوہ رہا کرتی تھی جو کسی مل میں کام کر کے اپنی تین عدد بچیوں کا پیٹ پالا کرتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ پیر جی نے کچھ نئی چٹائیوں اور سرکیوں سے اس جھونپڑی کی حالت بہتر بنالی تھی اور دیواریں پہلے کی بہ نسبت کافی اونچی اور مضبوط ہو گئی تھیں۔ جب میں نے جھونپڑی میں لیمپ روشن کیا تو پیر جی نے میرے دروازے پر آواز دی اور میرے بلانے پر اندر آگئے۔ ان کی عمر کوئی پچاس پچپن کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ دُہرا جسم تھا اور بھرے بھرے چہرے پر سفید براق سی لانبی داڑھی تھی جو ناف تک پہونچ گئی تھی۔ پیشانی پر سجدے کا نشان چمک رہا تھا اور ان کا چہرہ کافی نورانی اور بارعب نظر آرہا تھا۔ انہوں نے سفید ڈھیلا کرتا اور ڈھیلی شلوار پہن رکھی تھی اور سر پر تنکوں کی گول ٹوپی تھی اور گلے میں پیلے رنگ کا ریشمین رومال لپٹا ہوا تھا۔

"میں نے سوچا پڑوسیوں سے مل لوں۔" پیر جی بولے۔

"صبح میں خود ہی حاضر ہوتا۔"

"میاں اب پردیس میں پڑوسی ہی سب کچھ ہیں۔ مرنا جینا سب ساتھ ہی ساتھ ہے۔ عزیزوں نے تو طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لی ہیں۔ اگر اچھے پڑوسی مل جائیں تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔"

"میں تو واقعی خدا کا شکر گزار ہوں۔" میں نے کہا۔

پیر جی ہنس دیئے۔

"میاں یہاں اکیلے ہو۔ میرا مطلب تمہارے ماں باپ ——"

"سب ہندوستان میں ہیں۔"

پھر انہوں نے بتایا کہ وہ ہندوستان سے اسی ہفتہ آئے ہیں۔ وہاں سجادہ نشین تھے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دن اچھے گزر رہے تھے مگر حالات بدل گئے اور اپنی اکلوتی لڑکی کو لے کر پاکستان آگئے۔ اب یہاں جھونپڑی میں رہنے کے سبب بہت پریشان تھے کہ یہ ماحول اور ان کی لڑکی جس نے

تھی کبھی نامحرم کی شکل تک نہ دیکھی تھی ان کچی نیچی دیواروں والی جھونپڑی میں رہنے پر مجبور تھی۔

پیر جی کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک اس نئے جنم لیتے ہوئے معاشرہ کے بارے میں سوچنے لگا جس میں ایک طرف گلی کے موڑ پر جوان عورت ننگی ران کھجایا کرتی ہے۔ اور دوسری طرف چٹائیوں کی کانپتی ہوئی دیواروں میں ایک نوعمر لڑکی اپنی جوانی اور حیا سمیٹے ہوئے بیٹھی ہے جس نے بغیر پالکی کے گھر سے باہر قدم نہ نکالا تھا۔ ایسے ماحول میں اس لڑکی پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ جب وہ لڑکی یہاں کی عورتوں کے منہ سے مغلظات سنے گی اور جب عریاں فلمی گانوں کی تانیں فضا میں بلند ہوں گی تو اسکے ذہن پر کیسے آڑے ترچھے نقوش ابھریں گے۔

کئی دن مسلسل بستی سے باہر رہنے کے بعد ایک شام جب میں بستی میں داخل ہوا تو جھکے ہوئے چھجے والے چائے خانے میں پیر جی لوگوں کو نیک بننے اور نیکی پھیلانے کی تلقین کر رہے تھے، اور لوگ پیر جی کے گرد ہمہ تن گوش بنے بیٹھے تھے۔

"اتنے دنوں کہاں رہے" پیر جی مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"ذرا شہر میں رہ گیا تھا۔"

"میں نے جھونپڑی کے تمام لوگوں سے میل جول پیدا کر لیا ہے اور لوگ کافی تعداد میں نماز پڑھنے کے لئے جمع ہونے لگے ہیں۔"

"یہ تو بڑی مبارک بات ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ ایک روز یہ سب اسلام کی روح کو سمجھنے لگیں گے اور خدا کے نیک بندے بن جائیں گے۔ ان لوگوں میں اچھی اور بری بات کا پورا پورا احساس ہے۔ اب شریف اور دوسرے لوگ میرے ساتھ صبح کی نماز کے لئے لوگوں کو جگاتے ہیں۔"

"شریف کون؟"

"سامنے والی بڑھیا کا پوتا۔"

"وہی جو فلمی گانے گایا کرتا ہے؟"

"اب اسنے گانا چھوڑ دیا ہے۔ البتہ دوسرا ابھی اسی طرح گاتا رہتا ہے۔ انشاء اللہ ایک دن وہ بھی سدھر جائے گا۔"

"ممکن ہے۔"

"میرے بیٹے! یقین رکھو۔ اگر نیک نیتی اور خلوص سے کوشش کی جائے تو نیکی پھول کی خوشبو کی طرح دماغوں میں رچ جاتی ہے۔"

"ٹھیک فرماتے ہیں آپ۔"

دوسرے دن صبح سویرے لوگوں کو نماز کے لئے جگانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اگرچہ سحر خیزی کی مجھے عادت نہ تھی لیکن پیر جی کے خیال سے میں بھی شریک ہو گیا۔ فجر کی نماز کے بعد میں نے شریف کو دیکھا جو مجھے بالکل اچھا نہ لگا۔ شکل سے پکا غنڈا نظر آ رہا تھا۔ لیکن اس وقت جب کہ مسجد سے نماز پڑھ کر نکلا تھا، اسکے کھُرے پن پر کچھ کچھ نرمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ جب میں پیر جی کے ساتھ اپنی جھونپڑی میں آیا تو پیر جی کی لڑکی تلاوتِ کلام پاک میں مشغول تھی۔ مجھے ایک عجیب سا روحانی کیف محسوس ہوا۔ پیر جی کی لڑکی کا مقدس ترنم ساری فضا میں رچا ہوا تھا۔

"میری لڑکی عابدہ ہے" پیر جی میری حیرت محسوس کرتے ہوئے بولے اور تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد چلے گئے۔ اس دن میں نے محسوس کیا کہ جب محلہ کی عورتیں لڑنا اور گالیاں بکنا شروع کر دیتی ہیں تو پیر جی عابدہ سے اونچی آواز میں باتیں کرنے لگتے ہیں یا کوئی مناجات بلند آواز سے شروع کر دیتے ہیں۔ اسی طرح بڑھیا کا پوتا جب فلمی گیت چھیڑتا ہے تو پیر جی تلاوتِ کلام پاک شروع کر دیتے ہیں تاکہ عابدہ کے کانوں میں یہ آوازیں نہ پڑ سکیں۔ لیکن جھونپڑی کی نیچی نیچی دیواریں اور پیر جی کی بلند آواز سے پڑھی ہوئی مناجاتیں یہ آوازیں نہ روک سکتی تھیں۔ ایک طرف پیر جی کی تلاوت جاری رہتی اور دوسری طرف بڑھیا کا پوتا گاتا رہتا۔

جادوگرسیاں۔ چھوٹی خیری بیبیاں

ہوگئی آدھی رات

ایک دن پیرجی مجھے اور شریف کو ساتھ لے کر بستی کا چکر لگانے نکلے۔ شریف اب پابندی سے نماز پڑھنے لگا تھا اور عام طور سے پیرجی کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ گلی میں کیچڑ ہو رہی تھی۔ اور سامنے نل پر پانی کے منتظر لوگ بالٹیوں اور گھڑوں کی قطار لگائے کھڑے تھے۔ ساتھ ساتھ عورتیں بھی تھیں جو بالٹیاں آگے کرنے کے سلسلے میں گالم گلوچ بھی کر رہی تھیں۔ پاس ہی ایک چھوٹا سا بچہ اپنی توتلی زبان سے دوسرے بچہ کو گالیاں دے رہا تھا۔

سالے۔ تیری ماں ——— (ایک موٹی سی گالی)

چھوٹا سا بچہ جس کے منہ سے گالیوں کے تلفظ بھی صحیح ادا نہیں ہو رہے تھے گالیاں بکتا ہوا بڑا اجنبی سا لگ رہا تھا۔ پیرجی نے اس بچہ کو گود میں اٹھا لیا۔ پرچون کی دوکان سے بسکٹ دلا کر دیر تک اسے سمجھاتے رہے کہ اچھے لڑکے گالیاں نہیں بکا کرتے۔ اسکے بعد جب ہم لوگ جھونپڑی میں آئے تو پیرجی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ اس بچہ کی توتلی زبان سے نکلی ہوئی گالیوں کے تلفظ کو اسی انداز میں بار بار دہرا رہے تھے اور آنسوؤں سے ان کی سفید براق جیسی داڑھی بھیگتی جا رہی تھی۔ اس دن مجھے پیرجی بہت عظیم لیکن بہت ہی دکھی معلوم ہوئے۔ وہ گھنٹوں سسکیاں لیتے رہے۔ پیرجی رو رہے تھے۔ مُلا رو رہا تھا۔ انسان رو رہا تھا؟ یہ کب تک روتا رہے گا؟ میرے ذہن میں اسی طرح کے فضول سوالات کا تانتا بندھ گیا۔ حتیٰ کہ شریف پیرجی کے لیے پانی لے آیا۔ پیرجی منہ ہاتھ دھو کر پھر مستعد نظر آنے لگے۔

پیرجی کسی کپڑے کی دوکان پر ملازمت کرنے لگے تھے میں اپنی مصروفیت کی وجہ سے زیادہ تر بستی سے باہر رہنے لگا تھا۔ دو دو ہفتوں کے بعد بستی آتا تو پیرجی سے ملاقات بھی نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن لوگوں سے پیرجی کے مشن کے بارے میں حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ اب پیرجی رات میں بچوں کو مفت پڑھانے بھی لگے تھے اور مسجد میں نمازیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ حالانکہ بڑھیا کا دوسرا پوتا اب بھی فلمی گیت گاتا تھا۔ اور گلی کے موڑ پر بیٹھی ہوئی عورت اب بھی ڈھیلے گوشت والی تکیروں دار ران کھجایا کرتی تھی۔ اور ٹیلر ماسٹر اب بھی اپنی بیوی کو پیٹا کرتا تھا۔

سہ پہر کا وقت تھا میں کئی دنوں بعد بستی میں آیا تھا۔ صحن میں بیٹھا ہوا شیو کر رہا تھا۔ سامنے پیرجی کی جھونپڑی کی دیوار تھی جو اب ٹیڑھی ہو چلی تھی۔ اور چٹائی پر سیاہی دوڑ گئی تھی۔ پیرجی ابھی دوکان سے واپس نہ آئے تھے۔ میں ابھی شیو ہی کر رہا تھا کہ پیرجی کی جھونپڑی سے گنگنانے کی آواز آنے لگی۔ یہ پیرجی کی اکلوتی لڑکی عابدہ تھی۔ جو صبح صبح تلاوت کیا کرتی تھی۔ اس وقت فلمی گیت گنگنا رہی تھی۔

اب گھر جانے دو۔
ہوگئی آدھی رات۔ اب گھر جانے دو۔

میرا دماغ جھنجھنا گیا۔ زہر پھیل رہا تھا۔ زہر پھیل چکا تھا۔ معاشرہ سڑ رہا تھا۔ معاشرہ تباہ ہو چکا تھا۔ میں خاموشی سے شیو کرتا رہا اور عابدہ دیر تک گیت گنگناتی رہی۔

اُس رات میں کافی رات گئے بستی لوٹا۔ رات بھیگ چکی تھی۔ جھکے ہوئے چھجوں والے چائے خانے بند تھے۔ تنوروں پر کتے کوں کوں کر رہے تھے۔ بستی پر وہی غم آلود دھند چھائی ہوئی تھی۔ اور سڑے ہوئے کیچڑ کی بو سے دماغ معطل ہو رہا تھا۔ جب میں جھونپڑی میں داخل ہوا تو پیرجی میری ہی جھونپڑی کے صحن میں ٹہل رہے تھے۔ میں نے لیمپ روشن کیا اور روشنی پیرجی پر پڑنے لگی۔ انہیں دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ پیرجی کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں اور داڑھی کے بال رسی کی طرح بٹے ہوئے تھے۔ چہرہ بالکل ستا ہوا تھا اور دھلی ہوئی چادر کے مانند سفید تھا۔ ان کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"تم نے سنا" پیرجی آہستہ سے بولے۔ جیسے سرگوشیاں کر رہے ہوں۔

"جی"

"تم نہیں جانتے۔ تم بھی نہیں جانتے" انہوں نے میرے بازو پکڑ کر مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔
"میں لٹ گیا اور تمہیں خبر بھی نہیں۔ میری معصوم پھولوں جیسی نازک لڑکی کہیں چلی گئی"
میں سن سے ہو گیا۔
"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"
"ہو بھی چکا۔ شریف سامنے والی بڑھیا کا پوتا جس نے گانا چھوڑ دیا تھا، جو نمازیں پڑھنے لگا تھا، میری معصوم لڑکی کو لے کر بھاگ گیا۔ سنتے ہو چلی گئی۔ ساری بستی والے میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ آنکھوں کے اشارے سے ایک دوسرے کو مجھے دکھاتے ہیں اور مسکرا دیتے ہیں۔ اب کیا ہوگا"

پیر جی مجھے حیران چھوڑ کر اپنی جھونپڑی میں چلے گئے جس کی دیواریں ٹیڑھی ہو چکی تھیں اور جن پر سیاہی دوڑ گئی تھی۔ ساری رات پیر جی پھرتے رہے اور ٹہلتے رہے۔

دوسرے دن صبح پیر جی بستی سے گردن جھکا کے چپ چاپ چلے گئے۔

نیا معاشرہ ان کا منہ چڑا رہا تھا۔

اور بستی والے اپنے کام میں مشغول تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

پیر جی کو میں نے پھر کبھی نہیں دیکھا۔

اعادل ندیم

کھنڈر

صولت بھائیجان کے سنجیدہ چہرے پر ایکبار شفق کی سی سرخیاں پھوٹیں اور گہری اداسیوں میں ڈوب گئیں۔ ان کے خشک خشک ہوئے لبوں کے کناروں پر ہلکا سا تبسم بکھرا اور پھر ان کی ابدی سرد مہریوں میں کھو گیا۔ آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور دھلگاہٹ میں گم ہو گئی۔ شادی ——" وہ میرے لفظوں کو دہراتے ہوئے سرگوشی کے سے انداز میں بڑبڑائے "شادی کر کے میں کیا کروں گا بھلا ——"

یہ کہکر انہوں نے اپنے پائپ کے بجھے ہوئے شعلے کو دوبارہ ماچس سے سلگانا چاہا، لیکن ان کی انگلیوں کے پورے کانپ رہے دیا سلائی کا شعلہ تھرتھرا کر رہ گیا۔ انہوں نے ڈبیہ سے دوسری تیلی نکالی، دوسری تیلی بھی ان کی کانپتی ہوئی انگلیوں کی گرفت سے پھسل کر قالین پر گر پڑی۔

انہوں نے یکلخت چونک کر میری طرف یوں دیکھا جیسے وہ کسی بڑے بھاری گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے ہوں۔ پھر ان کے چشمے کے موٹے ملے شیشوں کے پیچھے ان کی بڑی بڑی آنکھوں کی پتلیاں پھیلیں اور سمٹیں اور پھر سمٹ کر پھیل گئیں۔ پھر انہوں نے اپنے لبوں کی لرزشوں کو اپنی مسکراہٹوں میں چھپاتے ہوئے ایک بار پھر میری طرف زخمی پرندے کی طرح گھور کر دیکھا اور ہارے ہوئے جواری کی طرح اٹھ کر لڑکھڑاتے ہوئے ڈرائنگ روم سے باہر چلے گئے۔

نچلی منزل کے بڑے کمرے میں درخشندہ اور اسمارہ پیانو پر دھیمے سُروں میں گا رہی تھیں "تمہیں نے مجھکو پریم سکھایا"۔

کچھ دیر تک سکتہ کی سی حالت میں صوفہ میں دھنسا میں آتشدان میں دھیرے دھیرے بجھتے ہوئے شعلوں کو گھورتا رہا۔

صولت بھائیجان کی مجبوریاں تمام خاندان پر عیاں تھیں۔ سب کو معلوم تھا کہ ان پر ابھی پوری طرح شباب بھی نہ آیا تھا کہ ابا حضور ان کے شانوں پر تمام ذمہ داریوں کا بار ڈال کر چل بسے تھے۔ اس وقت میں، درخشندہ اور اسمارہ ننھے معصوم تھے۔ درخشندہ اور اسمارہ کو تو ابا مرحوم کے متعلق کچھ یاد نہ تھا البتہ میں جب کبھی ذہن پر زور ڈالتا ہوں تو ایک دھندلا دھندلا سا عکس میرے ذہن کے سپاٹ پردوں پر متحرک ہوتا ہے اور مٹ جاتا ہے۔ اور جب میں دالان میں لگی ہوئی قدِ آدم دستی تصویر کو دیکھتا ہوں جس میں ابا حضور بھری بھری پنڈلیوں پر سفید چوڑی دار پائجامہ اور ابھرے ہوئے سینہ پر سیاہ اچکن کے بٹن کسے ہوئے کھڑے ہیں تو میرے ذہن میں زیادہ صاف اور زیادہ واضح عکس ابھرتا ہے، پھر ایک واقعہ یاد آتا ہے جس روز وہ گاؤں سے سات فٹ لمبا مار کر لائے تھے ہم سب کے ساتھ ملکر تصویر کھچوائی تھی صولت بھائیجان کی اسوقت میں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ مجھے یاد تھا کہ وہ تصویر ہمنے امی حضور کے انتقال کے کچھ روز بعد ہی کھچوائی تھی۔ عکاس نے ماضی کے ان گمگشتہ لمحوں کو کاغذ کی چکنی سطح پر سمیٹ کر ہمیشہ کے لئے ساکت کر دیا تھا۔ البتہ تصویر کا چکنا کاغذ کہیں کہیں سے بیچ گیا تھا اور سیپیا ٹون ہلکا زرد پڑ چکا تھا۔

ابا حضور کے انتقال کے بعد صولت بھائیجان نے ہمیں شفیق باپ کی طرح پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا۔ ابا حضور کے لئے ہم تینوں بچے زندگی میں ایک آدھ بار ہی روئے ہوں گے۔ ہمارے آنسوؤں کو صولت بھائیجان نے فوراً ہی اپنی مسکراہٹوں اور قہقہوں میں سمیٹ لیا

تھا۔ انہوں نے اپنے لبوں کی تمام تر مسکراہٹیں ہمارے لبوں میں جذب کر دی تھیں۔ ہماری خوشیوں کی خاطر اپنی آرزوؤں کا گلا گھونٹ دیا تھا، ہماری محبت کی خاطر اپنی خواہشات کو قربان کر ڈالا تھا۔ وہ مجسم قربانی بن گئے تھے۔ ننھے ننھے بھائی بہنوں اور قصرِ منیر کی سابقہ شاہانہ روایات کی خاطر اپنی رگوں کا خون انہوں نے فرائض کی قربان گاہ پر ایک ایک قطرہ کر کے نچوڑ دیا تھا۔

صولت بھائیجان نے یہ سب کچھ ہمارے لئے ہی کیا تھا۔

یہ بات ہم سب جانتے ہیں، میں بھی، درخشندہ بھی، اسمارہ بھی، اس کے علاوہ ہماری رعیت کا ایک ایک فرد جانتا ہے، سب یہ جانتے ہیں کہ میٹھی چھریوں کی طرح صولت بھائیجان کے سینہ میں ہم تین بھائی بہن ہی پیوست رہتے ہیں، تین جونکوں کی طرح ان کی رگوں کا لہو ہم تینوں نے ہی قطرہ قطرہ کر کے چوسا ہے۔ سپنولیوں کی طرح ہم تینوں نے ہی ان کی زندگی کی ایک ایک مسرت کو چن چن کر ڈس لیا ہے۔

ہوش سنبھالنے کے بعد سے آج تک یہ سوال رہ رہ کر میرے ذہن میں ڈنک لگاتا رہا ہے کہ آخر ہم تینوں کو ان کی اس عظیم قربانی کا کیا بدلہ دینا ہوگا، کیسے دینا ہوگا ــــ میں نے ہزار ہا بار سوچا کہ کاش صولت بھائیجان کی زندگی کی ویرانیوں میں سے کچھ ہم بھی لے سکتے۔ اپنی روح کی بچی ہوئی اداسیوں میں سے وہ کچھ ہمیں بھی دے سکتے۔ کیا یہ ممکن ہے ــ کاش ایسا ممکن ہوتا۔

صولت بھائیجان کی عمر اس برس کے آخر میں پورے پینتالیس ہوجائے گی۔ ایک روز اسمارہ نے بڑے بھولے پن سے مجھ سے کہا تھا کہ ابا حضور نے تو اپنی تیسری شادی پچپن برس کی عمر میں کی تھی۔ صولت بھائی جان تو صرف پینتالیس کے ہی ہیں۔ اس روز اپنے کمرے میں بیٹھا گھنٹوں میں اس بات پر غور کرتا رہا تھا۔ حالانکہ بھائی جان کی سنجیدگی اور ان کی ابدی ویرانیوں نے ان پر بے شک از وقت بڑھاپے کا نقاب ڈال دیا تھا لیکن پھر بھی ان کے گٹھے ہوئے متناسب اعضاء، بارعب چہرے، چوڑے سینے اور گھونگریالے بالوں اور بڑی بڑی چمکدار آنکھوں نے ان کے مردانہ حسن کو بڑی خوبصورتی سے برقرار رکھا ہوا تھا، ان کے شانوں سے بھاری ذمہ داریوں کا بار اتر چکا تھا۔ درخشندہ اور اسمارہ بی اے تک تعلیم حاصل کر چکی تھیں۔ میں ایک کامیاب ڈاکٹر بن چکا تھا۔ پھر آخر وہ کونسی مجبوری ہے، کونسا غم ہے جو صولت بھائی جان کو اب تک دھیرے دھیرے گھن بن کر چاٹے جا رہا ہے، ان کے سینہ میں آخر وہ کونسا منجمد گلیشیر پوشیدہ ہے جس کی تمام تر خنکیاں ان کی روح میں رچ گئی ہیں۔ ہر بار میں نے ان گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی تھی اور ہر بار یہ گتھیاں الجھ الجھ کر سلجھی اور سلجھ سلجھ کر پھر الجھ گئی تھیں۔ اور آج صولت بھائی جان کو میں نے جان بوجھ کر چھیڑا تھا۔ میں نے یہ نشتر جان بوجھ کر ان کے سینہ کے اس پرانے زخم پر مارا تھا جسے وہ تمام زندگی اپنی مصنوعی مسکراہٹوں میں چھپاتے رہے تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید آج وہ اس کرب کی تاب نہ لا سکیں اور آج ان کی زبان کے دھاگے آپ ہی ٹوٹ جائیں، لیکن وہ نشتر کی اس چبھن کو بھی آسانی سے سہہ گئے تھے۔ اس کرب کو بھی انہوں نے اسی سلیقہ سے اپنی مسکراہٹوں میں دفن کر دیا تھا۔ اپنی ویران زندگی کے مرقد پر انہوں نے جو لہو کے دیپ جلائے تھے انہیں جذبات کی تیز آندھیاں نہ بجھا سکی تھیں۔ صولت بھائی جان کے جانے کے بعد میں کچھ دیر تک وہیں صوفہ میں دھنسا آتشدان میں دھیرے دھیرے بجھتے ہوئے انگاروں کو راکھ بنتے دیکھتا رہا۔ دسمبر کی خنک رات کا گاڑھا گاڑھا کہرا روشندان سے چھن چھن کر اندر آ رہا تھا۔ حویلی سے بہت دور کہیں رات کا بوڑھا چوکیدار زور سے چیخا "جاگتے رہو"۔ اس کی آواز حویلی کی اونچی اونچی دیواروں سے ٹکرا کر ایک لمحہ کے لئے آوارہ روح کی طرح ادھر ادھر بھٹکی اور پھر قصرِ منیر کے سکوت میں ڈوب گئی۔ نیچے کے کمرے میں درخشندہ اور اسمارہ پیانو پر اپنے گیت کا آخری جملہ دہرا کر چپ ہو گئیں اور قصرِ منیر ایک بار پھر اپنی ابدی تاریکیوں اور سناٹوں سے لپٹ کر سو گیا۔

آتشدان کے بجھتے ہوئے انگاروں پر راکھ کی تہیں چڑھتی جا رہی تھیں، میں نے اٹھ کر پہلے روشندان بند کیا، شب خوابی کے لباس پر پشمینہ کا منقش گاؤن پہنا اور دروازے کی چٹخنی کھول کر باہر آ گیا۔

چاروں طرف سکوت ہی سکوت تھا۔ گاڑھا گاڑھا کہرا اُڑتی ہوئی ریت کی طرح چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ حویلی کی دیواریں ملگجے کہرے میں آسیب زدہ ہیولوں کی طرح ساکت کھڑی تھیں، درخشندہ اور اسمارہ کے کمروں کی روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ رات کا بوڑھا چوکیدار ایک بار چیخا۔ "جاگتے رہیو۔" لیکن اتنی دور کہ اس کی آواز فوراً رات کے سناٹوں نے نگل لی۔ غیر ارادی طور پر میں نے صولت بھائی جان کے کمرے کی طرف دیکھا۔ ان کے کمرے میں مدھم بلب روشن تھا۔ اور دروازے کے شیشوں کو مخمل کے بھاری سرخ پردوں نے ڈھانپ لیا تھا گستاخی کی حدوں تک پہنچ کر میں چوروں کی طرح میں دبے قدموں ان کے دروازے تک پہنچ گیا اور چابی والے سوراخ سے اپنی آنکھ لگادی۔

کمرے کا وہ حصہ جہاں صولت بھائی جان بیٹھے تھے پردے کے چاک سے نظر آرہا تھا۔

وہ آتشدان کے سامنے صوفہ میں دھنسے ہانپ رہے تھے۔ ان کی پیشانی اور کنپٹیوں سے پسینے کی بوندیں ٹپکتی ہوئی ٹھوڑی تک آگئی تھیں ان کی نگاہیں مینٹل پیس پر رکھے سیاہ فریم میں جڑے ہوئے تجریدی مصوری کے اس عمل پر جمی ہوئی تھیں جو خود ان کا تھا۔

صولت بھائی جان کا المیہ سب سے مدلگاؤ تھا ایک۔ موسیقی، المیہ کتابیں اور تجریدی مصوری کے اپنے اس عمل میں بھی انہوں نے اپنے حسنِ انتخاب کو برقرار رکھا تھا۔ تصویر میں ایک مخروطی شکل کو نہایت مدھم قرمزی رنگ سے پر کیا گیا تھا۔ اس پر سیاہ جھریوں اور دھبوں کا جال تھا اور یہ سب کچھ شیشے کے ایک ٹوٹے ہوئے جام میں رکھا ہوا تھا۔

دوسرے لمحہ وہ تذبذب کے سے عالم میں صوفہ پر سے اٹھے۔ اپنے پلنگ کے تکیہ کے نیچے سے چابی نکالی۔ ساتھ والی آبنوسی الماری کی طرف بڑھے اور یک لخت رک گئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ الماری کے اوپر لگے ہوئے آئینے میں خود اپنے ہی عکس کو سہمی سہمی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ دوسرے لمحہ انہوں نے آئینے کے سلکی پردے کو کھینچ دیا۔ لرزتے ہاتھوں سے الماری کے تالے میں چابی گھمائی اور اس میں سے آسمانی رنگ کا کاغذ اور لفافہ نکال کر میز پر آگئے۔

ان کا قلم دھیرے دھیرے چلتا رہا، نہ جانے کتنی دیر تک چلتا رہا۔ لکھتے وقت وہ آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑاتے بھی جا رہے تھے، پھر انہوں نے کاغذ لفافہ میں بند کیا، تھکے تھکے قدموں سے لفافہ الماری میں رکھ دیا۔ اور صوفہ میں بیجان سے ہو کر دھنس گئے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں، دسمبر کی اس خنک اور ٹھٹھری ہوئی رات میں بھی جبکہ جسم کا لہو بھی رگوں میں جما جا رہا تھا وہ پسینہ سے شرابور تھے۔ دھیرے دھیرے ان کی اکھڑی ہوئی سانسیں درست ہوتی گئیں، پسینے کے قطرے خشک ہوتے گئے اور وہ گہری نیند سو گئے۔

ایک جگہ پر اتنی دیر کھڑے کھڑے میرے پاؤں سن ہو گئے تھے۔ کمر اکڑ گئی تھی۔ ٹھٹھری ہوئی رات کا کہرا اور بھی گاڑھا ہو گیا تھا۔ قبرستان کے سناٹے میں الّو اور گیدڑ چیخ رہے تھے، رات کا بوڑھا چوکیدار کہیں اور بھی دور ہانکا مارتا ہوا گزر رہا تھا۔

"جاگتے رہیو ——— !"

لیکن دوسرے لمحہ میں پلنگ کے نرم گدے میں تھا۔ میری آنکھوں کے پپوٹے بھاری ہوتے چلے گئے، ذہن کے پردوں پر ہلکی ہلکی دھندسی چھاتی چلی گئی۔

★

رات بھر میں بھیانک سپنے دیکھتا رہا، لرزتا رہا۔

میں نے دیکھا کہ حویلی کے باہر والے دالان کی جگہ ایک عمیق کھائی بن گئی ہے۔ اس کھائی کے کنارے اسمارہ، درخشندہ اور میں تینوں کھڑے چیخ رہے ہیں اور صولت بھائی جان ——— صولت بھائی جان کھائی کی عمیق گہرائیوں میں لڑھکتے جا رہے ہیں، لڑھکتے جا رہے ہیں، جیسے لڑھکتے لڑھکتے وہ ایک خاردار جھاڑی میں پھنس گئے، ان کا تازہ تازہ لہو کانٹوں سے رس رس کر دھند میں

ہٹے جذب ہو رہا ہے اور وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنے لہو کی بوندوں کو سنگریزوں میں جذب ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن انکی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں سکون ہے ان کے منجمد لبوں کے خمدار کناروں پر وہی دلفریب تبسم رقصاں ہے۔ پھر جیسے میں نے چاہا کہ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے کھائی میں اتر کر انہیں ان پستیوں میں گرتے ہوئے تھام لوں لیکن جیسے انہوں نے میرے دل کی بات جان لی، یکلخت چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر نیچے لڑھکنے لگے۔ نیچے اور نیچے، ہماری پہنچ سے دور، انتہائی دور، پھر وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

گھبرا کر میری آنکھ کھل گئی۔

صبح کاذب کی نورانی کرنیں روشن دان سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھیں، چائے کا کپ میز پر رکھے رکھے ٹھنڈا ہو چکا تھا، اور اس کی سطح پر پتلی سی پپڑی جم گئی تھی۔

ٹھنڈی چائے کے دو چار گھونٹ بھر کر میں نے سامنے دیوار پر لگی ہوئی صولت بھائی جان کی تصویر کو غور سے دیکھا۔ وہی بارعب چہرہ الگھونگھریالے بال، چشمے کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے چمکتی ہوئی بڑی بڑی خوبصورت اور اداس آنکھیں اور لبوں کے خمدار کناروں پر اٹھلاتا ہوا ادھورا سا تبسم، تبسم جس میں حزن و ملال کا امتزاج تھا۔

"ناشتہ کر لیجئے چھوٹے سرکار۔"

دروازے میں پڑے ہوئے کمخواب کے بھاری پردے کے پیچھے سے فخرو بابا کی آواز آئی۔

"بیبیاں منتظر ہیں ٹیبل پر سرکار۔"

"اور صولت بھائی جان —" میں ہڑبڑا کر بول اٹھا۔

"بڑے سرکار تو تڑکے ہی گاؤں چلے گئے سرکار۔" وہ بولا

میرے سینے میں دل ایک بار زور سے دھڑک کر ڈوبا، ڈوبا اور پھر دھک دھک دھڑکنے لگا۔ ذہن میں سنسناتی ہوئی بجلی سی کوندی اور پھر گھٹن سے کوئی چیز ٹوٹ گئی۔

"گاؤں کے مزارعوں میں نااتفاقی کی بنا پر قتل ہو گیا ہے سرکار" فخرو بابا میری پریشانی کو بھانپ کر بولا "جوں ہی بڑے سرکار کو اطلاع ملی، بگھی میں بیٹھ کر چلے گئے — بیبیاں ٹیبل پر آپ کا انتظار فرما رہی ہیں"۔

یا اللہ تیرا ہزار شکر ہے — میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ میرے کانوں نے کوئی بری خبر نہ سنی اور ساتھ ہی بھیانک خوابوں کی تعبیر بھی پوری ہو گئی۔ فخرو بابا کے جانے کے بعد میں نے گاؤن پہنا، پاؤں میں مخملی سلیپر ڈالیں اور ملازموں کی نظروں سے بچتا ہوا سیدھا صولت بھائی جان کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اندر سے چٹخنی لگا کر کچھ دیر یوں ہی کھڑا سوچتا رہا پھر تکیہ کے نیچے سے چابی نکال کر آبنوسی الماری کا تالہ دھیرے سے کھول دیا۔

سورج کی پتلی سی کرن دروازے میں پڑے ہوئے مخمل کے دبیز پردے کے درمیانی چاک سے چھن کر اندر آ رہی تھی، آتشدان کا الاؤ بھڑک رہا تھا۔ دیوار پر ٹنگے ہوئے بوڑھے گھڑیال نے نہایت مدھم آواز میں صبح کے سات بجائے۔ کچھ دیر تک گھڑیال کا الم ناک نغمہ کمرے کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر اسطرح گونجتا رہا جیسے کلیسا کا گھنٹہ کسی نوعمر دوشیزہ کی موت پر مرثیہ خواں ہو، پھر چاروں طرف بوجھل سناٹا چھا گیا، میں نے ایک بار سہمی ہوئی نظروں سے بھاری پر سیاہ فریم میں جڑے ہوئے صولت بھائی جان کی تصویر کی معصومیت کے عکس کو دیکھا — مخمل جیسے کا قرمزی رنگ صبح کی ملگجی روشنی میں اور بھی پراسرار نظر آ رہا تھا۔

میں نے الماری کے دونوں پٹ کھول دیئے۔

الماری کے درمیانی خانے میں بیشمار لفافے بھرے پڑے تھے، لرزتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے ایک لفافہ اٹھایا اور اس میں احتیاط سے رکھے ہوئے خط کی تہیں کھولیں۔

صولت بھائی جان کے قلم سے نکلے ہوئے ننھے ننھے گول گول موتیوں جیسے لفظوں کی چند سطور ان کے پیڈ کے مدھم آسمانی کاغذ کی چکنی سطح پر بکھری ہوئی تھیں۔

میری بہار،

تمہیں پا لینے کا تصور جتنا حسین ہے، تمہارے قرب کا تصور اتنا ہی اذیت ناک — سوچو تو — تپتے ہوئے ریگزاروں میں کہیں کنول کے پھول بھی کھل سکتے ہیں؟ بنجر ویرانوں میں کہیں خوش الحان پرندے چہچہا سکتے ہیں، نہیں، ہرگز نہیں، پھر تم لوٹ کیوں نہیں جاتیں، لوٹ جاؤ، خدارا لوٹ جاؤ اور مجھے میری قسمت میں لکھی ہوئی ابدی ویرانیوں میں ہی بھٹکنے دو، میری نس نس میں فطرت نے جو خنکیاں سمیٹی ہیں، مجھے ان سے ہی لپٹ کر سو لینے دو، ٹھٹھرنے دو — مجھے تصورات کی دنیا میں مت کھینچو، بہاروں کے خیر مقدم کے لئے میرے پاس کچھ نہیں ہے، سوائے آنسوؤں اور آہوں کے لوگ کہتے ہیں کہ میں اپنے ویرانوں کو آباد کر لوں لیکن کیسے، یہ کیسے ممکن ہے — کاش یہ ممکن ہوتا — میں تو مجسم کھنڈر ہوں — کھنڈر — جس کے ملبہ کی اینٹوں اور گارے تک کو دیمک چاٹ چکی ہے

صولت

پھر میں نے دوسرا لفافہ کھولا، صولت بھائی جان کی وہی مخصوص لکھائی، وہی ننھے ننھے، گول گول لفظوں کی دو چار سطریں، وہی مدھم آسمانی پیڈ کا کاغذ، وہی مدھم دھانی لفافہ!

حیرت اور پشیمانی سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

ویرانوں کے باسی

تم حسین ہو خوبصورت ہو، چاہے جانے کے لائق ہو، بزدل نہ بنو — ورنہ دنیا کیا کہے گی کہ نواب زادہ عثمان علی خاں کی ایک اولاد — سنو، تم جئے جاؤ، اپنی خاطر نہیں، تو قصر منیر کی اس ایک ایک اینٹ کی خاطر، اپنے خاندانی ناموس کی خاطر — قدرت نے تمہاری روح میں جو کانٹے چبھو دئے ہیں ان کی چبھن اور کرب کو اپنی مصنوعی مسکراہٹوں میں سموتے رہو، جن ویرانوں میں تمہیں قیامت تک بھٹکنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے وہاں اپنے لہو کا دیپ جلائے قربان گاہوں کی اقدار کو پروان چڑھاتے رہو،

ایک بہار، ایک تصور

میرے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے دونوں خط پھسل کر آتشدان کے بجھتے ہوئے شعلوں میں گر پڑے، چنگاریاں تیزی سے لپکیں — کچھ دیر تک پتھر کی بے حس مورت کی طرح میں کھڑا انہیں راکھ بنتے دیکھتا رہا۔

کلاک کا پینڈولم دوسرے کے خنک لمس سے ٹھٹھرتے ہوئے مریض کی ڈوبتی ہوئی نبض کی طرح آہستہ آہستہ متحرک تھا اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے قصر منیر کی چار دیواریوں سے ایک بھیانک قہقہہ اٹھ رہا ہے، جیسے حویلی کی ایک ایک اینٹ تک اس مکروہ قہقہے کے زلزلے میں ڈھے جائے گی صولت بھائی جان اب کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ میرے ذہن کے گوشوں سے یہ آواز ٹکرائی، نہیں، نہیں، انہیں نہیں آنا چاہئے، ہرگز نہیں آنا چاہئے کبھی نہیں — کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ان طوفانوں میں، ان آندھیوں میں میرا خیال حویلی کی چار دیواریوں کے سامنے آہنی پردہ بن کر لٹک گیا ہو

ایم اے، اعظم
ترجمہ:- ابوالخیر کشفی — رفیق محمد خاں خاور

روشنی کا مینار

(دو منظر)

"روشنی کا مینار" عالمی امن کے موضوع پر جناب ایم اے۔ اعظم کا ایک طویل تمثیلی ڈرامہ ہے۔ ڈرامہ کے سارے کردار تمثیلی ہیں مثلاً "اوسا" امریکہ کو، "اوکا" برطانیہ کو، "ادسر" روس کو، "روایت نواز" روایتی مذہب کو، "انجمن آرا" انسانی معاشرہ کو اور "گیتی آرا" امن کو پیش کرتی ہے۔

مصنف نے تجسیم اور تمثیل کے ذریعہ فن کا جادو جگایا ہے

ہم اس شمارہ میں "روشنی کا مینار" کے دو منظر پیش کرتے ہیں۔ "اونا" اقوام متحدہ کو پیش کرتا ہے اور "فاضلہ" انسانی علم کو۔ یہ دونوں جنوبی کستمدان آئے ہیں تاکہ دنیا کے اس حصہ میں "اقوام متحدہ" اور عالمی اداروں کے تعمیری کاموں کا جائزہ لیں — پھر جو کچھ گزرتی ہے، وہ آپ کے سامنے ہے۔

اب آپ پوچھیں گے "یہ کستمدان کہاں ہے؟" — پہلے ڈرامہ پڑھئے۔

ادارہ

پہلا منظر

(جنوبی کستمدان کے ایک اسکول کا احاطہ، احاطہ میں اونا اور فاضلہ نظر آتے ہیں)

اونا :- ذرا دیکھو تو کتنی شاندار عمارت ہے فاضلہ پہلے یہاں ٹوٹی پھوٹی اور کچی عمارت تھی۔

فاضلہ :- واقعی؟

اونا :- ہاں ہاں — امریکہ کے فری رفاؤنڈیشن نے اس نئی عالیشان عمارت کی تعمیر پر دس لاکھ روپے خرچ کئے ہیں۔ یہ منصوبہ میری تنظیم کے تحت پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

فاضلہ :- بہت بڑا کام۔

اونا :- "ابا" نے چار لاکھ روپئے اسکول کے فرنیچر، سینما اور لیبوریٹری پر خرچ کئے۔

فاضلہ :- "ابا" یہ کیا چیز ہے؟

اونا :- ا۔ب۔ا - یعنی انجمن بہبودی واشتراک —

فاضلہ :- آؤ ذرا اسکول کے اندر چلیں ۔

اونا :- ضرور ضرور ہم اسی لئے تو آئے ہیں ۔

(لڑکے اسکول کے احاطے اور عمارت میں دکھائی دیتے ہیں ۔ عمارت میں داخل ہوتے ہی فاضلہ اور اونا کو چند لڑکے ملتے ہیں)

اونا :- میاں ذرا سننا ہم آپ کے ہیڈ ماسٹر صاحب سے کہاں مل سکتے ہیں ؟

طالب علم :- جناب ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب یہاں نہیں ہیں ۔

فاضلہ :- پھر کہاں ہیں ؟

طالب علم :- وہ امریکہ گئے ہوئے ہیں انھیں اسکالر شپ ملا تھا ۔

اونا :- یہ تو بہت برا ہوا (جلدی سے) میرا مطلب ہے بہت اچھا ہوا تم ہمیں اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس لے جا سکتے ہو ؟

طالب علم :- وہ بھی یہاں نہیں ہیں ۔

فاضلہ :- وہ کہاں گئے ہیں ۔

طالب علم :- وہ کچھ تحقیقی کام کرنے گئے ہیں ۔ انھیں فرینڈ شپ ملی تھی ۔

فاضلہ :- "فرینڈ شپ" ؟ اوہ تمھارا مطلب ہے فیلو شپ ۔

طالب علم :- جی ہاں ، جی ہاں ۔ فیلو شپ ۔

فاضلہ :- تمھیں کچھ معلوم ہے کہ وہ کیا تحقیقی کام کرنے گئے ہیں ؟ اور کہاں گئے ہیں ؟

طالب علم :- نیو گیانا گئے ہیں یا نیوزی لینڈ ۔ مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں ۔ ہاں ان کے تحقیقی کام کے بارے میں میں نے کچھ سنا ضرور ہے

فاضلہ :- تو پھر ان کے تحقیقی موضوع کے بارے میں کچھ ہمیں بھی بتاؤ ۔ (اونا کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہے ۔)

طالب علم :- مجھ سے نہ پوچھئے ۔ کچھ عجیب مضحکہ خیز موضوع ہے ۔ میں آپ کو نہ بتا سکوں گا ۔

فاضلہ :- شرماتے کیوں ہو ۔ شاباش کچھ تو بتاؤ ۔

(طالب علم اونا کو ایک طرف لے جاتا ہے اور اس سے سرگوشی کے انداز میں باتیں کرتا ہے)

طالب علم :- جناب وہ چوہے پر تحقیق کر رہے ہیں ۔

اونا :- چوہے پر ۔ ؟

طالب علم :- جی ہاں چوہیا پر ۔

اونا :- چوہیا پر وہ کیا تحقیق کر رہے ہیں ۔ ؟

طالب علم :- اس کے لئے آپ کو چوہیا کے بچے دینے کا انتظار کرنا ہوگا ۔

اونا :- کیوں چوہیا کے بچے کا میں کیا کروں گا ؟

طالب علم :- کچھ بھی نہیں دیکھنا تو ماں کو ہے ۔

اونا :- میری سمجھ میں تمھاری باتیں نہیں آ رہی ہیں ، سیدھی سیدھی بات کرو ، ماں پر تحقیق ہوگی یا بچہ پر ؟

طالب علم :- دونوں پر ۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو ماں کو عجیب عجیب چیزیں کھانے کی خواہش ہوتی ہے ۔

اونا :- واقعی ؟

طالب علم :- ارے تو کیا یہ بات آپ کو پہلے نہیں معلوم تھی ؟ تو ہونے والی ماں عجیب عجیب چیزیں کھانا چاہتی ہے مگر اس کی وجہ کسی کو معلوم نہیں
میں شرط لگاتا ہوں کہ آپ کو بھی نہیں معلوم ۔

اونا :- تم ٹھیک کہتے ہو ۔ مگر اس کی وجہ کیا ہے ۔؟

طالب علم :- جناب یہی ، کی تحقیق کا موضوع ہے ۔

اونا : ارے ۔ اب میں تمھاری بات سمجھا ۔

طالب علم :- اس تحقیق کا دائرہ بہت وسیع ہے ۔ اس میں حیاتیات ، علم غذا ، علم ولادتِ اطفال اور ہارمونوں کے سارے مسائل سمٹ کر آجاتے ہیں

اونا :- بہت بہت شکریہ ۔ مگر کیا تم ہمیں نائب ہیڈ ماسٹر کے نائب کے پاس لے چلو گے ؟

طالب علم :- انھیں بھی فاؤنڈیشن جو نکاتی پروگرام کے تحت تعلیمی وظیفہ مل گیا ۔ وہ بہت جلد سمندر پار روانہ ہونے والے ہیں ۔ اور آج کل پاسپورٹ
اور ویزا وغیرہ کی الجھنوں میں گرفتار ہیں ۔

فاضل :- تو پھر کوئی اس اسکول کا منتظم ہوگا ہمیں اسی کے پاس لے چلو ۔

(ایک دبلا پتلا اور میلا سا استاد آتا ہے)

استاد :- میں نائب ہیڈ ماسٹر کے نائب کا نائب ہوں اور جناب میں آپ کی مدد چاہتا ہوں

اونا :- مدد ؟ ۔ آپ مجھ سے کس قسم کی مدد کی توقع رکھتے ہیں ۔

استاد :- پہلے آپ اندر تشریف لے چلئے جناب ۔ آپ بھی تشریف لے چلئے محترمہ ۔ ہمارا فرنیچر بہت اچھا اور بہت قیمتی ہے ۔

(سب اندر جا کر ایک کمرے میں بیٹھ جاتے ہیں)

استاد :- آپ کو دیکھتے ہی مجھے پتہ چل گیا کہ آپ کا کسی فاؤنڈیشن یا عالمی ادارے سے تعلق ہے براہ کرم میری مدد کیجئے ۔

فاضل :- آپ وضاحت تو کیجئے کہ آپ کیا چاہتے ہیں ؟

استاد :- میں غیر ملکی تعلیمی وظیفہ چاہتا ہوں ۔

اونا :- تو اس میں کیا مشکل ہے ؟ آپ گریجویٹ تو ہوں گے ؟

استاد :- نہیں جناب میں گریجویٹ نہیں ہوں ۔ جب میں بی اے کے آخری سال میں تھا تو میری شادی ہوگئی اور . . . پھر میں امتحان میں
فیل ہوگیا ۔ "بیچلرز ڈگری" اور "شادی" یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ نہیں نبھ سکتیں ۔

اونا :- ممکن ہے آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے ۔

استاد :- (فاضلہ سے) محترم خاتون آپ ہی میری مدد کیجئے ۔

فاضلہ :- ہمیں یہ بھی تو معلوم ہو کہ آپ کے راستہ میں کیا رکاوٹ ہے ؟

استاد :- میں نے دن رات کام کیا بڑی محنت سے وہ اڑتالیس فارم بھرے جو درخواست کے ساتھ بھیجے جاتے ہیں ۔

فاضلہ :- آپ اپنی درخواست بھیجئے ۔ متعلقہ افسر یقیناً اس پر غور کریں گے ۔

استاد :- یقیناً ۔ وہ مجھے بھیج بھی دیں گے ۔

فاضلہ :- پھر آپ اور کیا چاہتے ہیں ۔

استاد: ۔ میں چھ مہینے پہلے جانا چاہتا ہوں تاکہ چھ مہینے پہلے لوٹ آؤں۔ اس بارے میں آپ کی سفارش یقیناً کام آئے گی اس کا مجھے یقین ہے۔

فاضلہ: ۔ آخر آپ کو واپسی کی ایسی بھی کیا جلدی ہے!

استاد: ۔ محترمہ! مجھے صاف گوئی سے آپ کو سب کچھ بتانا ہوگا۔ میں ایک جوان لڑکی کا باپ ہوں اور مجھے اس کی شادی کا بندوبست کرنا ہے۔

فاضلہ: ۔ تو آپ پہلے شادی کیوں نہیں کر دیتے؟ اس کے علاوہ یہ بتلائیے کہ لڑکی کی شادی کا آپ کے اسکالرشپ سے کیا تعلق ہے؟

استاد: ۔ بہت گہرا تعلق ہے۔ جب میں سمندر پار سے آؤں گا تو خسر کی حیثیت سے میری قیمت اور وقعت بڑھ جائے گی۔

فاضلہ: ۔ آپ کی بیٹی نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے؟

استاد: ۔ میرا کنبہ بہت بڑا ہے۔ مجھے بارہ پیٹ بھرنے پڑتے ہیں پھر آپ ہی بتلائیے کہ میں اسے اچھی تعلیم کیسے دلا سکتا تھا؟ میں شاید ولایت سے واپس آکر اپنی بیٹی کے لئے بھی " مفاسکر منصوبہ " کے تحت " غسل آفتابی میں مہارت " کا وظیفہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکوں۔ اس طرح وہ اپنے شوہر کے ساتھ جدیدہ ہوائی جائے گی۔ میں فوراً باہر جانے کے لئے بے تاب ہوں تاکہ جلد از جلد واپس آسکوں مجھے پورا یقین ہے آپ کی سفارش سے میرا کام بن جائے گا۔ ہمارے طلبا بھی سمندر پار جانے کے لئے بے چین و منتظر ہیں۔ مگر ابھی وہ اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ پہلے ان کے سب استاد ہو آئیں۔ ویسے وہ بین الاقوامی مسائل پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔

فاضلہ: ۔ لیجئے ذرا ہم طلبا سے باتیں کریں۔

استاد: ۔ بہت اچھا خیال ہے آپ دونوں طلبا سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ وہ بہت کچھ جانتے ہیں۔ ہم اس عمر میں بہت کم جانتے تھے سب سے مضحکہ خیز سی بات۔؟

(پردہ)

دوسرا منظر

(اونا اور فاضلہ ایک درجہ میں داخل ہوتے ہیں۔ استاد لڑکوں کو اشارہ کرتا ہے اور وہ اٹھ کر گانا شروع کر دیتے ہیں۔ " امریکہ کا تحفظ کر یارب "

اونا: ۔ شاندار (فاضلہ کی طرف مڑ کر) کتنا اچھا نغمہ ہے۔!

فاضلہ: ۔ بہت اچھا اور خوبصورت نغمہ۔

اونا: ۔ بچو! تمھارا بہت بہت شکریہ۔ اب تم ہمیں اپنا قومی ترانہ سناؤ۔

پہلا طالب علم: ۔ ابھی ہمارا قومی ترانہ مرتب نہیں کیا گیا ہے۔

(فاضلہ استاد کی طرف دیکھتی ہے جو گردن کے اشارے سے طالب علم کے بیان کی تصدیق کرتا ہے)

اونا: ۔ قومی ترانہ نہ سہی۔ ہمیں کوئی بین الاقوامی امن کا گیت سناؤ۔

دوسرا طالب علم: ۔ ہمارا " شاعر امن " مدتوں سے شہر خموشاں کا مکین ہے اور ویسے بھی اس کے نغمے آجکل زیادہ مقبول نہیں ہیں؟

فاضلہ: ۔ وہ کیوں؟

تیسرا طالب علم: ۔ اس کے اسی مصرع کو لے لیجئے۔ " آنکھ میری غیر کے غم میں سرشک آباد ہو " زیادہ تر لوگ کہتے ہیں کہ ایسے جذبات بہادری اور شجاعت کو ختم کر دیتے ہیں دوسرے کے غم میں رونا بالکل بیکار چیز ہے۔

اونا :۔ تم اپنے شاعرِ انقلاب کی کوئی نظم سنا سکتے ہو۔ وہ شاعر جو آگ اور تلوار کا مغنی ہے۔

تیسرا طالب علم :۔ بدقسمتی سے وہ کارنبکل کے موذی مرض میں مبتلا ہے اور اسپتال میں اپنی زندگی کے دن گزار رہا ہے۔

اونا :۔ اس بات کا اس کی شاعری پر کیا اثر پڑا؟

تیسرا طالب علم :۔ بہت بڑا اثر۔ آپ تو یہ جانتے ہوں گے کہ ہمارے شاعرِ انقلاب نے اپنی ایک نظم میں کہا تھا کہ میں مشیت کی پشت کو اپنے نیزے سے چھید ڈالوں گا۔ اس نے انتہا پسندی کا ثبوت دیا اور مشیت کے جس مقام کو اپنے نیزے سے چھیدنا چاہتا تھا وہیں اس کے پھوڑا نکل آیا۔ اسی لئے ہم لوگ اس کی نظموں کے بارے میں بڑے محتاط ہو گئے ہیں۔ اس کی غیر پسندیدہ نظم پڑھنے سے نہ جانے مشیت کا کون سا ستم ہم پر ٹوٹ پڑے۔

فاضلہ :۔ لیکن اپنے "قومی شاعر" کے کلام سے تو تم کوئی مناسب اور موزوں چیز انتخاب کر سکتے ہو۔

پہلا طالب علم :۔ جناب ہمارے دو قومی شاعر ہیں۔ ایک شمال کا قومی شاعر دوسرا جنوب کا قومی شاعر۔ اگر آپ کو شمالی زبان پسند ہے تو اس علاقہ میں جانا پڑے گا۔ کچھ شعر ہم بھی آپ کو سنا سکیں گے۔ لیکن ہمارا تلفظ بہت خراب ہوگا۔

فاضلہ :۔ صحیح تلفظ سے ہمیں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔

پہلا طالب علم :۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم غلط حرفوں اور ٹکڑوں پر زور دیں یہ بات مناسب نہ ہوگی۔

فاضلہ :۔ میں تمھاری مشکلوں کو سمجھ رہی ہوں کیا تم ہمیں جنوب کے قومی شاعر کی کوئی نظم یا شعر سنا سکو گے؟

پہلا طالب علم :۔ ہم شرمندہ ہیں۔ جنوب کے قومی شاعر نے مدت ہوئی شاعری کو خیرباد کہہ دیا۔ اب وہ ٹماٹر کی چٹنی اور اچار کا کارخانہ چلا رہا ہے اس کی چٹنیاں اور اچار بہت مزیدار ہوتا ہے اور بجر اسے کافی نفع بھی ہو رہا ہے۔

فاضلہ :۔ میرا خیال ہے اس کی ساری شاعری ٹماٹر کے عرق اور سرکہ میں نہیں ڈوب گئی ہوگی۔

استاد :۔ بات یہ ہے کہ لڑکوں کو اس شاعر کی نظموں سے کوئی ذہنی تحریک حاصل نہیں ہو سکتی۔ جس نے اچار اور چٹنی کو شاعری پر ترجیح دی ہو۔ خواہ اچار اور چٹنی کتنی ہی مزیدار کیوں نہ ہو۔

اونا :۔ شاعری کا ذکر ہی چھوڑئیے۔ کیا آپ اپنے طالب علموں سے کچھ سوالات کرنا پسند کریں گے تاکہ ہم ان کے جواب سن سکیں۔

استاد :۔ بڑی خوشی سے (پہلے طالب علم سے) ڈبلیو۔ ایچ۔ او۔ کا کیا مطلب ہے۔

پہلا طالب علم :۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن۔

اونا :۔ بہت اچھے۔

استاد :۔ میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ . . .

اونا :۔ میں آپ سے متفق ہوں۔

استاد :۔ ویٹو کا حق کسے حاصل ہے؟

دوسرا طالب علم :۔ اقوام متحدہ کی مجلسِ تحفظ کو۔

استاد :۔ ہمارے ملک کی ترقی میں کن اداروں اور ملکوں کا حصہ ہے؟

تیسرا طالب علم :۔ اقوام متحدہ، دولت مشترکہ، ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور بین الاقوامی تنظیم تعاون و اشتراک،

اونا :۔ بہت بہت شکریہ، یہ کافی ہے۔ ہمیں آپ کی معلومات کا صحیح اندازہ ہو گیا۔

استاد :۔ جناب میں نے ان طلبا کو اور بھی بہت کچھ بتایا ہے۔ بغداد پیکٹ، نیٹو، یونیسکو، یو۔ این۔ ڈی اور یو۔ این۔ ایف سے لیکر یو۔ این۔ زیڈ تک۔

فاضل :۔ (اونلسے) یو۔ این۔ زیڈ؟

اونا :۔ (استاد سے) یو۔ این۔ زیڈ؟

پہلا طالب علم :۔ جناب میں اس کا مطلب جانتا ہوں۔ یونائیٹڈ نیشنز زو یعنی اقوام متحدہ کا زندہ عجائب خانہ۔

فاضل :۔ (اونلسے) عجائب خانہ؟

اونا :۔ خدا مجھ پر رحم کرے۔ میرا خیال ہے کہ اقوام متحدہ کے مرکزی دفاتر یہاں ہونا چاہئیے تھے اسی اسکول میں۔

فاضل :۔ اس بات پر تم پھر غور کرنا۔ اب ہمیں صوبائی حکومت کے دفاتر کی طرف چلنا ہے (استاد سے) کیا آپ ہمیں بتا سکیں گے کہ صوبائی حکومت کے دفاتر کس طرف ہیں؟

استاد :۔ یقیناً۔ سرکاری دفاتر گلاب باغ میں ہیں۔

فاضل :۔ آپ بھول تو نہیں رہے۔ دفتر اور باغ میں؟

استاد :۔ اوہ میں شرمندہ ہوں میرا مطلب ہے گلاب کالج میں، جسے "روز کالج" بھی کہتے ہیں۔ یہ لڑکیوں کا کالج تھا۔ اب لڑکیوں کے ہوسٹل میں محکمہ خوراک کے دفتر ہیں اور دوسرے محکموں کے دفاتر مختلف کلاسوں میں قائم کئے گئے ہیں۔

اونا :۔ اب ہمیں چلنا چاہیئے۔ چلو فاضل۔

استاد :۔ ایک منٹ جناب۔ جب آپ سیدھے جائیں گے تو آپ کو لڑکوں کا کالج دکھائی دے گا۔ اب اس میں عدالت عالیہ قائم ہے آپ سیدھے ہاتھ پر آگے چلیں گے تو روز گارڈن ملے گا۔ اوہ معاف کیجئے روز کالج۔

فاضل :۔ آپ کا مطلب ہے سرکاری دفتر؟

استاد :۔ جی ہاں۔ جی ہاں۔

فاضل :۔ کیا آپ نے ابھی یہ بتایا تھا کہ لڑکوں کا کالج اب عدالت عالیہ کی عمارت میں بدل دیا گیا ہے؟

استاد :۔ جی ہاں اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت نہ تھی لڑکیوں کا کالج سکریٹریٹ بنا دیا گیا تو لڑکوں کے کالج کو عدالت عالیہ کے سوا اور کیا بنایا جاتا؟ آپ یہاں کے لڑکوں کو نہیں جانتے۔ دوسری صورت میں وہ قیامت برپا کر دیتے ہیں۔

اونا :۔ میں آپ کی بات سمجھ گیا اس سے بہتر اور کوئی دلیل نہیں ہو سکتی تھی۔ ویسے میں آپ کو ایک بات بتا دوں۔ آپ جیسی سمجھ بوجھ اور قابلیت کا آدمی اسکالرشپ سے محروم نہیں رکھا جا سکتا۔ کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ آپ کو جلد از جلد وظیفہ نہ مل جائے۔

فاضل :۔ کوئی بھی محروم نہیں رہ سکتا۔ نہ آپ کی بیٹی۔ نہ داماد اور نہ نانی۔ نواسے۔ سب کو اسکالرشپ ملے گا۔ بشرطیکہ آپ کی ذہانت اور ہوشیاری کا کوئی حصہ ان میں بھی موجود ہو۔

استاد :۔ (انتہائی انکسار کے ساتھ) اگر مجھے آپ کا اشتراک نصیب ہوا تو میں اس بات کا یقین رکھتا ہوں۔

(پردہ)

اطہر نفیس

علی گڑھ کے ایک قصبے میں پیدا ہوئے عمر یہی کوئی ستائیس اٹھائیس سال ہے۔
شاعری ہجرت کے ساتھ شروع کی۔ اس طرح ان کی شاعری کی عمر دس سال ہے۔
اطہر نفیس زیادہ تر غزلیں کہتے ہیں۔ اکثر غزلیں مسلسل ہیں، "ہجرت" اور "شاعری" کے ایک ساتھ وقوع پذیر ہونے کا ان کی شاعری کی فضا پر بڑا اثر پڑا ہے۔
اسی لئے ان کے اشعار میں ماضی کی یاد بھی ہے، نئے شہر سے ہم آہنگ ہونے کی تمنا بھی ہے۔
رہی عشق کی بات . . . . . اگر یہ بیماری نہ ہوتی تو شعر کیوں کہتے

○

عشرتِ سوزِ الم، دیدۂ نم یاد کرو
کیوں تمھیں یاد نہیں لذتِ غم یاد کرو
ہم جہاں رہتے تھے با دیدۂ نم یاد کرو
کیسا آباد تھا وہ شہرِ الم یاد کرو
کن ہواؤں میں جلایا تھا محبت کا چراغ
کن اندھیروں سے گزر آئے تھے ہم یاد کرو
رشکِ صد شہر تھا ویرانۂ احساس و خیال
رشکِ صد بزم تھی ہر خلوتِ غم یاد کرو
میں نے دیکھا تھا تمھیں تم نے مجھے دیکھا تھا
ٹھکرائے تھے یہ دیر و حرم یاد کرو
تھا محبت ہی محبت کا جہانِ [illegible]
درمیاں کوئی ستم تھا نہ کرم یاد کرو
مسکراتے ہوئے گزرے تھے کٹھن راہوں سے
منزلِ شوق تھی، ہر منزلِ غم یاد کرو
تابِ دیدار بھی کس کو تھی مگر اے اطہر
شوقِ دیدار بھی ہوتا نہ تھا کم یاد کرو

○

دشمنِ مہر و وفا، ہم نے تجھے یاد کیا
تو ہمیں بھول گیا، ہم نے تجھے یاد کیا
عقل کا ذکر چھڑا ہوش کی جب بات چلی
جلوۂ ہوش رُبا، ہم نے تجھے یاد کیا
دل کی آواز پہ جب گائی گئی کوئی غزل
نگہِ نغمہ سرا، ہم نے تجھے یاد کیا
شعرِ فانی کا سنا ذکرِ قیامت آیا
اے قدِ سرو نما، ہم نے تجھے یاد کیا
اس بھرے شہر میں ہم تجھ کو بھلا سکتے تھے
لیکن ایسا نہ کیا، ہم نے تجھے یاد کیا
سانس جب گھٹنے لگی ہجر کی تنہائی میں
اے سراپائے جفا ہم نے تجھے یاد کیا
دل بہلنے بھی لگا روح سنبھلنے بھی لگی
پھر بھی اے شوخ ادا، ہم نے تجھے یاد کیا
عشق اگر یہ ہے تو پھر عشق کیا ہے اطہر
کیا کہیں اس کے سوا، ہم نے تجھے یاد کیا

○

بے نیازانہ ہر اک راہ سے گذرا بھی کرو
شوقِ نظارہ جو ٹھہرائے تو ٹھہرا بھی کرو
وہ نظر آج بھی کم معنی و بیگانہ نہیں
اس کو سمجھا بھی کرو اُس پہ بھروسا بھی کرو
اتنے شائستۂ آدابِ محبت نہ بنو
شکوہ آتا ہے اگر دل میں تو شکوہ بھی کرو
سینۂ عشق تمنّاؤں کا مدفن تو نہیں
شوقِ دیدار اگر ہے تو تقاضا بھی کرو
تا بہ کے شکوۂ بے مہریٔ ساقی اطہرؔ
کبھی خود بڑھ کے کوئی جام اٹھایا بھی کرو

○

مہربانی میں غرورِ حسن و زیبائی بھی ہے
اس نگاہِ لطف میں شانِ خود آرائی بھی ہے
تیکھے پن سے بات کرنے میں محبت کا گداز
بھولے پن سے دیکھنے میں رنگِ دانائی بھی ہے
جانے کیوں رہتی ہیں مجھ سے وہ نگاہیں دور دور
جن میں میرے واسطے لطف پذیرائی بھی ہے
یہ مرا عہدِ جنوں طرزِ تمناؤں کا دور
خوف بدنامی میں پنہاں شوقِ رسوائی بھی ہے
اپنی یادوں میں غزلخواں اپنی دھن میں نغمہ ریز
اے ہجومِ نازنیناں اک تماشائی بھی ہے
اپنی دھڑکن ہی دل مایوس نے سمجھا اسے
گر کبھی کوئی صدائے ہم نفس آئی بھی ہے

O O

کبھی وہ بدگماں دیکھے گئے ہیں
کبھی ہم سرگراں دیکھے گئے ہیں

کبھی اک اشک کو ترسی ہیں آنکھیں
کبھی دریا رواں دیکھے گئے ہیں

کبھی موسم کی بے کیفی کا شکوہ
کبھی خود اک سماں دیکھے گئے ہیں

کبھی نا آشنائے لفظ و معنی
کبھی اک داستاں دیکھے گئے ہیں

ہمیں تنہا نہیں اس رہ گزر میں
ہزاروں کارواں دیکھے گئے ہیں

وہ ذرّے جو ترے قدموں میں آئے
وہ ذرّے کہکشاں دیکھے گئے ہیں

جہاں تیرے سوا کچھ بھی نہیں ہے
کبھی ہم بھی وہاں دیکھے گئے ہیں

بہت ہی مہرباں پایا ہے ان کو
وہ جب نامہرباں دیکھے گئے ہیں

وہ گوشے جن سے گلشن رشک جنت
وہ گوشے بھی تپاں دیکھے گئے ہیں

گل و لالہ، مہ و انجم بھی اکثر
ہمارے ہمزباں دیکھے گئے ہیں

ازل سے آج تک دیکھا ہے ان کو
مگر پھر بھی کہاں دیکھے گئے ہیں

جدھر تم چل پڑے ہو آج اطہر
وہاں دل کے زیاں دیکھے گئے ہیں

کتابوں میں

اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصّہ

ڈاکٹر محمد عزیر کا یہ تحقیقی مقالہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ نے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کو مسلم یونی ورسٹی سے اسی مقالہ پر
پی ایچ۔ ڈی کی سند ملی تھی۔ مقالہ مختصر کر کے ۲۰۳ صفحات پر شائع کیا گیا ہے۔ ہمیں اس بات سے اختلاف ہے کہ تحقیقی مقالوں کو شائع کرتے
وقت ان کے خلاصے تیار کئے جائیں۔ اس کی ذمہ داری ڈاکٹر محمد عزیر صاحب پر نہیں بلکہ انجمن ترقی اردو پر ہے۔

یہ ایک مذہبی حقیقت ہے کہ اردو کے ارتقا، اشاعت اور ترویج میں برصغیر کی تمام قوموں اور مذاہب کا حصّہ رہا ہے۔ اسی حقیقت
کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اردو نے ان مذاہب کو پھیلانے میں بڑا اہم حصہ لیا ہے ــــ اس کی وجہ یہی ہے کہ اردو ہی وہ زبان ہے جو برصغیر کے ہر
حصّہ میں بولی سمجھی اور پڑھی جاتی ہے ــــ ڈاکٹر محمد عزیر نے اسی موضوع کا ایک علمی اور تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ "اس
مقالہ کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب اور ان کے اخلاق کی اشاعت میں اردو زبان کا حصہ کتنا
ہے" ــــ زیر نظر کتاب صرف اسی مقصد کو پورا نہیں کرتی بلکہ کئی اور علمی ضرورتوں کو بھی پورا کرتی ہے۔ ان میں سے دو یہ ہیں۔

۱۔ اس کتاب میں ہندو مذہب، جین مت، سکھ مذہب، عیسائیت، بہائی مذہب اور ہندو مذہب کے اصلاحی فرقوں کے
بنیادی عقائد اور خصوصیات کو بڑے سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب ایک تحقیقی جائزہ کے ساتھ ساتھ مذاہب کے تقابلی مطالعہ بھی ہے

۲۔ اس کتاب کی وجہ سے اردو نثر کے ارتقا کا نیا پہلو سامنے آتا ہے۔

اردو میں سلیس نثر نگاری کا آغاز میر امّن کی جنبشِ قلم سے ہوا، مرزا غالب نے اس روایت کو مستحکم کیا، سرسید نے تو اردو نثر کی دنیا
ہی بدل دی لیکن ۱۸۶۰ء بلکہ اس سے پہلے ہی اردو میں مختلف مذاہب سے متعلق کتابیں لکھی گئیں۔ یہ کتابیں تبلیغی مقاصد کے تحت لکھی گئیں
اور ان کا مخاطب عوام تھے اسی لئے ان میں بڑی سلاست اور سادگی ہے۔ سرسید اور ان کے رفقا کی قلمی کاوشوں کے ساتھ ساتھ ان تحریروں کو اپنے
سامنے رکھئے تو اردو نثر کے ارتقا کی زیادہ صحیح اور مکمل تصویر سامنے آئے گی۔ "صحیفہ شریفہ الکھ پرکاش" مولفہ منشی کنہیا لال مطبوعہ جون ۱۸۶۱ء
کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

ــــ "انتہائے نظر ہے دیکھنا اور امکانِ بشر تک نیک اعمال کرنا یہی خلاصہ بید اور شاستر اور حکمت فلاسفہ کا ہے اور اسی ایک مطلب
کو بعبارت مختلف ہر ایک آپ نکتہ میں رقم کیا ہے۔ جو لوگ جہالت سے اپنی عمر کو ضائع کرتے ہیں اور مکاروں اور گمراہوں کے کہنے پر عمل کرتے ہیں وہ
اونٹوں کی طرح نکیل ناک میں ڈالے ساربانوں کے پیچھے چلتے ہیں اور بوجھ اپنی پیٹھ پر رکھتے ہیں اور قیمت مناسب اوروں کو کھلاتے ہیں، اور جاہل دھوکے بازوں
کے قول پر کام کرتے ہیں، اور جس طرح بندر والا بندر کو نچاتا ہے۔ وے ناچتے ہیں، وے دنیا اور عقبیٰ دونوں کو برباد کرتے ہیں اور رنج سے جدا
کبھی آزاد نہیں ہوتے"

اس اقتباس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ اسلوب کی سلاست اور سادگی کے لئے تصرف اردو کی دانش نقطۂ نظر

ضروری ہے۔

ڈاکٹر محمد عزیر صاحب نے خالص مذہبی کتابوں کے علاوہ اخلاقی کتابوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کو اس بات کا پوری طرح اندازہ ہے کہ مختلف مذاہب کے اثرات سے ان کے پیروؤں کے درمیان ایک اخلاقی نظام جنم لیتا ہے، جسے مذہب سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اخلاقیات کے موضوع پر ہندو اور عیسائی ادیبوں اور شاعروں نے بڑی وسیع النظری کا ثبوت دیا ہے۔ منشی کنہیا لال ہندی کی مثنوی اخلاق ہندی (مطبوعہ ۱۸۷۴ء) اس وسیع المشربی کے ساتھ ساتھ زبان و اسلوب کے لحاظ سے بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ منشی صاحب نے حمد، رام چندر جی اور سری کرشن کی مدح کے بعد ایک خوبصورت نعت بھی کہی ہے۔ چند اشعار دیکھئے ۔

شفیع جہاں، رہبر خاص و عام جناب محمد علیہ السلام!
جناب محمد، رسول امیں، عیاں جس سے علم عین الیقیں
سراپا عرب جس کے فرماں گزار عجم سربسر بندۂ جانثار،

اس کتاب میں نثر و نظم کے جو اقتباسات پیش کئے گئے ہیں۔ ان کا انتخاب ڈاکٹر محمد عزیر کی گہری نظر اور خوش مذاقی کی دلیل ہے۔ یہ اقتباسات اصل کتابوں کی روح اور اسلوب کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں۔

"اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ" ایک ایسی کتاب ہے جسے پورے یقین کے ساتھ اردو کے تحقیقی ادب میں ایک قیمتی اضافہ کہا جاسکتا ہے۔ (ا۔ح۔ک)

حکومت کا اسلامی نظام

مولانا مظہر علی کاتل مددگار، پروفیسر اردو کالج نے علامہ تقی الدین نبہانی کی کتاب "نظام الحکم فی الاسلام" کا ترجمہ "حکومت کا اسلامی نظام" کے نام سے کیا ہے۔ مولانائے موصوف "سلوک المالک فی تدبیر الممالک" کا ترجمہ اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ یہ کتاب مسلمانوں کی تاریخ میں سیاست کے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ اب انہوں نے ہمارے دور کے ایک ممتاز مسلمان مفکر کی کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ مولانا کی یہ خدمات بڑی خوش آئند اور اہم ہیں، کیونکہ اس طرح اردو زبان میں اسلامیات اور اسلامی سیاست کے موضوع پر دو اہم کتابیں منتقل ہوگئی ہیں۔

حکومت کے اسلامی نظام کے موضوع پر برصغیر کے علماء و مفکرین نے بھی کافی لکھا ہے، لیکن آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ دنیائے اسلام کے مفکرین اور عام مسلمانوں میں ذہنی رابطہ قائم ہو، تاکہ مشترکہ ذہنی کاوش کے ذریعہ ہم ہر مسئلہ پر قریب تر آسکیں۔ زیر نظر کتاب اس بڑے مقصد کے حصول کے سلسلہ میں ایک مستحسن کوشش ہے۔ اسلامی ممالک کی آزادی درحقیقت مشرق اور ایشیا کی آزادی ہے اور آج اس تھکی ہوئی دنیا کو ایک بہتر نظام حیات و حکومت کی تلاش ہے۔ کاش مسلمان ممالک اور ان کے سربراہ اس حقیقت کو سمجھ سکیں۔

علامہ تقی الدین نبہانی نے اسلامی نظام حکومت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار بڑی وضاحت سے کیا ہے ۔ ان کا انداز تجزیاتی ہے علامہ موصوف قدامت پسند علماء کی طرح عہد حاضر کے تقاضوں سے بیگانہ نہیں ہیں۔ اور نہ جدت پسند مفکرین کی طرح اسلامی روح کو مسخ کرنے کے قائل ہیں انہوں نے اسلامی روح اور عہد حاضر کے تقاضوں کو ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اسلام ایک ایسا دین ہے جس کا دامن وسیع اور ابدی بنیادوں پر ہے۔

مولانا مظہر علی صاحب نے ترجمہ بہت رواں اور صاف ستھرا کیا ہے ۔ وہ بڑی حد تک لفظی ترجمہ کرتے ہیں لیکن ان کی عبارت ہمیشہ اردو زبان کے ذوق اور محاورے کے مطابق ہوتی ہے۔ حضرات علماء کے تراجم میں یہ بات مشکل ہی سے ملتی ہے۔

یہ کتاب دائرۃ المعارف کراچی نے شائع کی ہے اور قیمت ایک روپیہ چار آنے ہے۔ (ط۔ا)

محمد شیبانی خاں اور سلطان احمد تنبل

انسانی تاریخ کے بعض ادوار ایسے ہوتے ہیں جب ہمیں کئی ہم تعداد ہم وزن شخصیتیں اپنے عمل سے تاریخ کے رخ کو بدلتے ہوئے نظر آتی ہیں۔ بابر، محمد شیبانی خاں اور سلطان احمد تنبل کا دور بھی ایسا ہی دور تھا۔ سب سے اہم بات یہ کہ یہ شخصیتیں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئیں اور یہ بات بھی قابل اعتنا ہے کہ جب بابر نے سمرقند و بخارا کی سرزمین میں اپنے لئے جگہ نہ پائی تو وہ ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا۔ اس طرح خود بابر کی زندگی اور کارناموں کا مطالعہ محمد شیبانی خاں اور سلطان احمد تنبل کے مطالعے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

جو شہرت بابر کو ملی وہ ان عظیم سپاہیوں اور سلطنتوں کے بانیوں کو نہ مل سکی۔ محمد رحیم صاحب نے ان دونوں پر علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھ کر عام نظروں سے چھپے ہوئے گوشہ کو واقعات و حقائق کے آئینے میں پیش کر دیا ہے۔ اسی لئے ان کی ان دونوں کتابوں سے اردو کے تاریخی ادب کی آبرو پہلے سے کچھ اور بڑھ گئی ہے۔

آج کل تاریخ کا ذوق کساد بازاری کا شکار ہو گیا ہے۔ آج کے مصنفوں میں بہت کم حضرات تاریخ کا سچا ذوق اور علم رکھتے ہیں، اس بنا پر محمد رحیم صاحب کی یہ کتابیں اہل علم اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بہت اچھا تحفہ ہیں۔ محمد شیبانی خاں اور سلطان احمد تنبل کے علاوہ کئی اور اہم شخصیتوں کے حالات بھی ان کتابوں میں آ گئے ہیں۔ بابر ایک درمیانی کڑی کا درجہ رکھتا ہے اور یہ کڑی ان دونوں اولوالعزم اور بہادر سپہ سالاروں کو ہماری تاریخ سے پیوستہ کر دیتی ہے ــــ "محمد شیبانی خاں" توران کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ جو لوگ عالمی تاریخ اور بالخصوص مشرق کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے اس کتاب میں بہت کچھ ہے۔ اسی طرح بابر اور احمد تنبل کی معرکہ آرائی تاریخ کے ایک فیصلہ کن موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔

محمد رحیم صاحب نے محض محمد شیبانی خاں اور سلطان احمد تنبل کا تعارف ہی نہیں کرایا ہے بلکہ ان دونوں کی زندہ اور متحرک داستان حیات بڑے سلیقے سے پیش کی ہے اور یوں کتنے ہی دوسرے تاریخی نقوش ابھرتے گئے ہیں۔

یہ کتابیں مکتبۂ رضیہ کراچی نے شائع کی ہیں۔ محمد شیبانی خاں کی قیمت تین روپے اور سلطان احمد تنبل کی قیمت دو روپے ہے۔

سلاطین اندلس

اندلس کے مسلمانوں کی ذہنی بلندی، علمی اور سائنسی فتوحات اور کارناموں کا مطالعہ کرنے والے بجا طور پر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اندلس والے دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے بہت آگے تھے۔

مسلمانوں میں تاریخ کی اولین کتابیں "خلفائے بنو عباس" کے عہد میں لکھی گئی ہیں۔ امیوں اور عباسیوں کی رقابت نے تاریخ کو مسخ کیا اور اس عہد کی تاریخوں میں امیوں کے کارناموں پر تاریک پردے ڈالے گئے۔ اندلس کے امیوں کے ساتھ عیسائی مورخوں نے کچھ کم مظالم نہیں کئے ہیں۔ اردو میں اندلس کی تاریخ پر کئی اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور بعض کتابوں کے ترجمے بھی شائع ہوئے ہیں۔ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کی کتاب "سلاطین اندلس" اس سلسلہ میں ایک اور اضافہ ہے۔ مفتی صاحب تحقیق و تحریر کے پرانے مرد میدان ہیں، وہ اس سے پہلے بھی تاریخ پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔

"سلاطین اندلس" ــــ اس کتاب کے نام ہی سے مفتی صاحب کی قوت فیصلہ کا اظہار ہوتا ہے کہ ان بادشاہوں کو "خلفاء" کے

زمرے میں شامل نہیں کرتے ـــــ ان کا طرزِ حکومت بادشاہوں کا تھا۔ لیکن اِن کے کارناموں سے مسلمانوں نے ترقی پائی ، علم و ادب اور سائنس کو فروغ ملا ـــــ مفتی صاحب نے اصل عربی تاریخوں کے علاوہ مغربی مورخین کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے ، مگر نتائج اخذ کرنے میں بڑی احتیاط برتی ہے ۔

یہ کتاب کراچی یونیورسٹی کے بی اے کے نصاب کے مطابق لکھی گئی ہے ، مگر محض طلباء کے لئے نہیں بلکہ تاریخ اندلس سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اسے ایک اچھی اور مفید کتاب پائیں گے ۔

مکتبۂ فریدی ، اردو کالج کراچی نے اِس کتاب کو شائع کیا ہے ۔ قیمت تین روپے ہے ۔

اُردو زبان اور نئے تقاضے

تھی کران کی ہندی کتابیں زیادہ بکتی تھیں ۔

۷ ۔ ابتدائی تعلیم میں اردو کو اس کی مناسب جگہ دلانے کی کوشش کی جائے ۔ اِس کے لئے ایک طرف تو عملی جدوجہد کرنی پڑے گی اور دوسری طرف نئے طرز کی کتابیں لکھوانی پڑیں گی ۔ افسوس کہ اس طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی ۔

میں نے یہ سب کچھ اِس لئے عرض کر دیا کہ آپ میرے خیالات سے آگاہ ہو سکیں اور کانفرنس میں میری عدم موجودگی سے زیادہ آزردہ نہ ہوں ۔

ادارہ

رسالوں میں

جدید سائنس کراچی :-

یہ سائنٹفک سوسائٹی پاکستان کا سہ ماہی رسالہ ہے میجر آفتاب حسن پرنسپل اردو کالج اس کے مدیر ہیں اور معاونین میں مستند ارباب فن سائنس پاکستان کے شامل ہیں۔ کیڑے مکوڑوں کی حیاتیاتی روک تھام، فلکیات کی اسلامی روایات، جغرافیہ کے جدید رجحانات، جواہرات، اکارکنان تحقیق کے مسائل رفتار سائنس وغیرہ مفید علمی مضامین اس رسالے میں درج ہیں۔ آخر میں حیاتیات (بائیولوجی) کی اردو اصطلاحات کی ایک فہرست بھی انگریزی اصطلاحات کے ساتھ پیش کی گئی ہیں اور مجلس وضع اصطلاحات نے اس کے بارے میں قارئین کی رائیں مانگی ہیں۔ یہ رسالہ اردو زبان میں یقیناً ایک بیش قیمت اضافہ قرار پائے گا۔ اب تک اس کے دو شمارے نکل چکے ہیں۔

فاران کراچی :-

اس مرتبہ پروفیسر اسرار احمد سہاروی نے انسانی ارتقا کے عنوان سے اس نکتہ پر بحث کی ہے کہ انسان اپنی فتوحات وارتقا کے آخری حدود تک پہنچ چکا یا ابھی اور آگے بڑھنے کا امکان باقی ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ دراصل انسانی زندگی کی دو حصوں میں بنیادی تقسیم باوجود انتہائی مادی ترقیوں کے آج بھی اپنی جگہ برقرار ہے۔ مادی ترقی انسان نے بیشک بہت کرلی مگر روحانی انحطاط بھی اسی قدر ہے۔ اور اس انحطاط کا اثر یہ ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کی زندگی، آزادی، عزت اور خوشحالی کو تباہ کر ڈالنے میں ذرا تامل نہیں ہوتا۔ یہ ترقی نہیں، انھوں نے اپنے مضمون کو مغربی مفکرین کے اقوال وآراء سے مستحکم کیا ہے۔ اس شمارے میں دلچسپ چیز وہ عتاب نامہ ہے جو ماہر صاحب کے نام ایک ایسے مصنف نے بھیجا ہے جس کی کتاب پر انھوں نے تبصرہ کیا تھا اور تبصرے میں مصنف کی غلطیوں پر ٹوکا تھا۔ ماہر صاحب نے وہ پورا عتاب نامہ درج کردیا ہے اور پھر اس خط پر تفصیلی تبصرہ بھی کیا ہے۔ کتابوں پر تبصرے کا مسئلہ آج کل بڑا ٹیڑھا ہوگیا ہے، کیونکہ تبصرہ اشتہار کا نام نہیں ہے، وہ ایک اجمالی تنقید ہی ہے اور تنقید میں کسی نہ کسی پہلو سے گرفت ہونی لازمی۔

افکار کراچی :-

تازہ شمارے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا مضمون "ادبی مسائل" ادبی تحقیق کے بنیادی اصول کی ایک شرح ہے، وہ کہتے ہیں کہ ادبی تحقیق اگر بذات خود مقصد قرار دیدی جائے تو بیجان ہو جاتی ہے، ڈاکٹر عندلیب شادانی کا ایک مضمون، گلہائے داغ بھی شریک اشاعت ہے۔ جلوۂ داغ نام ہے ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی کی کتاب کا، اور یہ مضمون اسی کتاب پر تبصرہ ہے، یہ تبصرہ ریڈیو پاکستان ڈھاکہ سے نشر ہوا تھا۔ ڈاکٹر شادانی کہتے ہیں کہ جو لوگ نبض شناس فطرت نہیں وہی یہ سمجھتے ہیں کہ اب محض رومانی غزل کے لئے کوئی مستقبل نہیں۔ چاندنی اور مہتمے کے گیت کبھی پرانے نہیں ہوتے۔ ورنہ داغ کی شاعری کب کی مرچکی ہوتی۔ داغ کے بارے میں ان کی ایک رائے یہ بھی ہے کہ داغ کے یہاں بہت کچھ ہے مگر

"واہانہ پن" نہیں ہے۔ ایک مختصر مضمون دیوندر اسّر نے "نیا شعور نیا ادب" لکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ادب سے ہم اس لئے متاثر ہوتے ہیں کہ اس کے مطالعے سے ہم اپنے شعور اور جذبات کی عام سطح سے بلند ہو جاتے ہیں اور بقول اسٹن فورڈ نیا فن، دنیا کا وہ فن ہے جیسا کہ آنکھیں اسے دیکھتی ہیں دل اسے محسوس کرتا ہے ذہن اسے جانتا ہے اور انسان اس کا خواب دیکھتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ بقول رسکن آخری بات سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ خواب انسان کی تشنہ روح میں دریافتوں کے سفر اور پیش گوئی کے روپ میں۔ ادب میں نئے شعور کا یہی تقاضا ہے۔ افسانوں، ڈراموں اور غزلوں کے علاوہ کنھیا لال کپور کا طنزیہ "مفت کے جھگڑے" بھی اس شمارے میں شامل ہیں۔

امام کراچی :-

یہ ایک نیا ماہنامہ ہے۔ دینی تعلیمی اور تبلیغی صحیفہ، مولانا سعید سیفی ندوی اس کے مدیر مسئول ہیں۔ نام کے انتخاب میں انھوں نے دلچسپ ادبی لطافت پیش نظر رکھی ہے اور مسجد کی امامت سے لیکر قوم کی امامت تک کی وسعت سمیٹ لی ہے۔ امام کا پہلا خطبہ یہی بتاتا ہے۔ لکھا ہے کہ امام مستند و معتبر اساسی و اصولی اور مسلمہ و متفق علیہ تعلیمات و روایات اسلامی کا مبلغ و منادی ہوگا۔ فرقہ بندیوں، باہمی معاندات، مجادلات اور جزوی اختلاف مسالک کی ناروا دامن درازیوں سے کبھی کوئی تعلق اسے نہ ہوگا۔ یہ نکتہ سب سے اہم ہے، امام اور امامت کے مفہوم کا اصل تقاضا بھی یہی تھا۔ اس ماہنامے کا خیر مقدم کرنے والوں میں مولانا ظفر احمد عثمانی مولانا احتشام الحق، مولانا بدایونی، مولانا عبد القدوس ہاشمی، مفتی عبد الحفیظ حقانی وغیرہم ہیں اور یہ مختلف مسلک و خیال کے علماء ہیں، اگر یہ خیر مقدم امام کے خطبۂ اولین کے مطالعے کے بعد ہوا ہے تو ہماری رائے میں امام کا پہلا ہی قدم مبارک ہے۔ آج ہمیں جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ یہی تو ہے کہ ہمارے اختلافات و مجادلات کا خاتمہ ہو۔ کیونکہ تفریق ہلاکت کا دوسرا نام ہے اور وحدت زندگی کا پیغام۔ مولانا سیفی اب سے پہلے بھی دہلی سے رسالہ علم و ادب نکال چکے ہیں۔ وہ اس کوچے میں نئے نہیں ہیں۔

نقاد کراچی :-

یہ ایک خاص ڈھب کا ماہنامہ ہے اور کثیر الاشاعت بھی۔ ظفر نیازی کا ترتیب دیا ہوا "ابلیس کا روزنامچہ" اس رسالے کی وہ خصوصی چیز ہے جس میں ملکی سیاسیات لیڈروں کے بیانات، معاشرے کے حالات اور اتفاقات و حادثات، تمام مسائل و امور پر چبھتے ہوئے انداز میں طنز ہوتا ہے، اس رسالے میں کسی نہ کسی لیڈر یا وزیر کے نام ہر ماہ ایک نہ ایک پیغام بھی ضرور درج ہوتا ہے۔ تازہ شمارے میں ۱۹۵۸ء کے نام نمازیوں کے نام، اور ڈاکٹر خان کے نام، پیغامات درج ہیں، ایک بہت ہی دلچسپ سرخی "آہ ساتویں وزارت عظمیٰ" بھی بہت ہی دلدوز طنز ہے، اس رسالے نے اب کارٹون بھی شائع کرنے شروع کئے ہیں، "آسان اردو تحریک" کے عنوان سے رفیق عزیزی نے اردو زبان کے تبدیلیوں کی حمایت عزیزی کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اردو زبان کے حروف تہجی کو مختصر کرنے کی تحریک چل رہی ہے اور کہا جاتا ہے کہ ز، ذ، ض، ظ کے فرق کو ختم کیا جائے، اسی طرح ث، س، ص ہم آواز ہیں صرف "س" سے کام لیا جائے۔ اردو آسان لکھی جائے اور خط نسخ استعمال کیا جائے۔ ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھ کر رفیق عزیزی نے اسی رسم الخط اور اسی قسم کی زبان میں تحریر کے دلچسپ نمونے دکھائے ہیں اور اردو کی بدنصیبی کا ماتم کیا ہے یہ رسالہ قومی نقطۂ نظر سے ایک مقصد کا حامل ہے اور ادب سے مناسبت۔ مضامین، افسانے، نظمیں اور غزلیں وغیرہ اس میں شائع ہوتے ہیں۔ اور ہر ماہ معمہ بھی شائع ہوتا ہے۔

لوح و قلم کراچی :-

طلبہ کا یہ ماہنامہ باقاعدگی سے نکل رہا ہے اور اچھے مضامین لکھنے کی کوشش روز افزوں ہے جنوری کا یہ شمارہ شہید نمبر ہے۔ ۱۹۵۳ء کی ۸ جنوری کو چند طلبہ اپنے مطالبات کے سلسلے میں جلوس نکلنے پر پولیس کی گولیوں کا نشانہ ہوئے تھے۔ انھیں کی یاد میں یہ شمارہ نکالا ہے التزام

یہ ہے کہ اپنے مقصد کی راہ میں جو لوگ شہید ہوئے ہوں صرف انھیں کا تذکرہ اس میں ہو، چنانچہ مسعود جعفری نے بھگت سنگھ سے جمیلہ بوحارڈ تک، اور انور احسن نے بازگشت کے نام سے حریت پسندوں کی تمام تحریکوں کے اشارات اپنے مضامین میں سمیٹ لیے ہیں، خواہ وہ مصر کے ہوں، ایران کے ہوں، برعظیم ہند کے۔ نظمیں بھی سب اسی سلسلے کی ہیں۔ فہیم سرحدی نے آزادی کی جنگ اور حفیظ الرحمٰن حازم نے ہندوستان کا شہید اعظم سید احمد سعید، اچھے مختصر مضامین لکھے ہیں۔

انشاء کراچی :۔

یہ ایک تازہ ترین ماہنامہ کراچی سے نکلا ہے شمارہ اوّلین ہمارے سامنے ہے۔ رئیس امروہوی سرپرست، سید محمد تقی نگراں اور جون ایلیا اس کے مدیر ہیں یہ ماہنامہ علمی ادبی ہے۔ مشہور مغربی ادیب برٹیلے سے ایک ملاقات (از ایل کے ملہوترا) سید محمد تقی کا مضمون یہ فکر دشمن ادیب، ڈاکٹر احسن فاروقی کا مضمون ادب، مذہب اور زندگی، الطاف گوہر کا مضمون زاویے کے علاوہ مصری عالم ڈاکٹر علی سامی لنشار کا مضمون اسلامی فکر اور تخلیقی شعور بھی تلخیص و ترجمہ کی صورت میں جون ایلیا کے قلم سے، شریک اشاعت ہے۔ ڈاکٹر فاروقی نے اپنے مضمون میں بتایا ہے کہ مذہب یا ادب ایک ہیں صرف فرق یہ ہے کہ کوئی فرد، کوئی قوم، کس سطح سے اسے دیکھ رہی ہے اور اس کے کس پہلو کو سامنے رکھ رہی ہے، غزلیں نظمیں اور افسانے بھی شامل ہیں۔

نوائے ادب بمبئی :۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کا یہ سہ ماہی رسالہ علمی حلقے میں خاصہ مشہور ہے۔ ٹائپ پر چھپتا ہے۔ صاف ستھرا اور معلومات کا عمدہ ذخیرہ ہے۔ نویں جلد کا شمارہ اوّل ہمارے سامنے ہے، اس میں مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی کے کتب خانہ کی فہرست پر قاضی عبدالودود کا مضمون اور مرزا احمد مقیم مقیمی سلمی پر اکبر الدین صدیقی کے مقالے کی آخری قسط خالص تحقیقی سرمایۂ علم و ادب ہے اور آخر میں مقالہ نما یک باب ہے جو تین ماہ کے اندر شایع ہونے والے۔ مذہبی، ادبی، تاریخی، نفسیاتی اور دوسرے مقالات ذمضامین کی خبر دیتا ہے اور ان کے خلاصے پیش کرتا ہے۔

صبا حیدرآباد دکن :۔

۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے، جنگ آزادی نمبر نکالنے کی کوشش کی تھی مگر اہل قلم حضرات کی بے توجہی سے عام نمبر کی صورت میں شایع ہوا۔ پھر بھی اس میں گوپی چند نارنگ کا مقالہ ۱۸۵۷ء اور نصیر الدین ہاشمی کا مضمون ۱۸۵۷ء اور حیدرآباد شامل ہے، گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے کہ ہر چند اس کو جنگ آزادی کا نام دینے پر تمام مورخین متفق نہیں ہیں، تاہم انگریزوں کے خلاف ہندو مسلمانوں کا پہلا متحدہ محاذ تو یہی تھا۔ نظموں اور غزلوں کے علاوہ ڈاکٹر محمد عقیل کا مضمون اردو شاعری میں اسکول کی روایت بھی اس میں شامل ہے [illegible] اردو شاعری کو اسکولوں میں تقسیم [illegible] ضیاء الحسن فاروقی کا مقالہ انیسویں صدی کے نصف اوّل کی دہلی کی جھلک معلوماتی مضمون ہے اس دور کے حالات و شخصیات پر [illegible] نالہ نیم [illegible] پر پڑھا گیا تھا۔ شمیم کرمانی کا ایک مختصر مضمون "سفینۂ غزل اور فیض" میں یہ بتایا گیا ہے کہ حافظ شیرازی کے اس شعر کی

> درین زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است صراحی مے ناب و سفینۂ غزل است

فیض سے نکلی ہے وہ مشکوک سی بات ہے۔ اس میں سفینہ کے لفظ سے کشتی کا مفہوم کسی طرح پیدا نہیں ہوتا۔

سویرا لاہور :۔

بے حد سادہ مگر جاذب توجہ ٹائٹل [illegible] مضامین کے ساتھ آیا ہے۔ میر تقی میر۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا [illegible] عنوان بن گئے ہیں۔ اس مرتبہ انھوں نے [illegible]

[illegible] میر نے مجھے رلایا بھی ہے اور آنسو بھی پونچھے ہیں " ضخامیر و اقبال کی مہ الم پسندی " کا فرق اور میر و غالب کے درمیان اظہار یکسی کے جداگانہ [illegible] کی شرح بھی بیان کی ہے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے کہا ہے کہ پاپلِ شدہ بےکس مخلوق کی شاعری میر ہی کے ہاں ملے گی۔ غالب کے ہاں تحمل ملی نہیں، ڈاکٹر جاوید اقبال نے ایک مختصر مضمون " جدید اسلام میں لبرل ازم کی تحریک اور علامہ اقبال " میں خاصے اختصار مگر واضح طور پر سرسید کی سیاسی قدامت پسندی، مولانا شبلی کے ریڈیکل ازم، اور جمال الدین افغانی کے پان اسلام ازم پر روشنی ڈالی ہے اور کہا ہے کہ اقبال کا لبرل ازم انھیں کے مرکب سے تیار ہوا ہے، یہ مضمون اقبال کے بین الاقوامی اسلام، فلسفۂ خودی، آئین پسندی تصورِ اجتہاد، نیشنل ازم، امپیریل ازم، اور سیکولر ازم کی مخالفت، سوشل ازم کی اسلامی تعبیر وغیرہ پر اچھا رواں دواں تبصرہ ہے انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اقبال کے لبرل ازم کو غلط استعمال سے محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے، ہمارے ملک میں علیگڑھ کے مصلحین کے نمونے پر، مصلح، مفکر، فقہ و دینیات کے ماہر شاعر، مصنف اور صحافی اگر پیدا ہوں تو ہماری ملی زندگی کی ہمہ جہتی اصلاح و ارتقا کا ضامن ہوگا۔ حنیف رامے ایک آرٹسٹ ہیں اور ان کا ایک مختصر مضمون " ہم اور فن اور فطرت " دلچسپ مطالعے کی چیز ہے انھوں نے لکھا ہے کہ یورپ کی طرح مادی اور غیر مادی ہمارے لئے دو الگ حقیقتیں نہیں ہیں اسی سلسلے میں انھوں نے ایک دلچسپ بات اور کہی ہے کہ ہم ایک ایسے خدا کے وجود کا اقرار کرتے ہیں جسے نہ محسوس کر سکتے ہیں نہ تصور میں لاسکتے ہیں، اس سے بڑی تجرید کیا ہوگی، اور تجرید پر اس سے بڑا ایمان کیا ہوگا، غزلوں اور نظموں کے علاوہ دو پرانی فرانسیسی کہانیاں، دانشور پیٹر (مترجمہ سلیم الرحمن)، اور نکولیت اور اوکاسن کی کہانی، دوستوں کی کہانی، ایلن کی محبت، محبت کا ارتقا، محبت کی آزادی (مترجمہ سلیم الرحمن و سید قاسم محمود) پڑھنے کی چیزیں ہیں عصمت چغتائی کا افسانہ زہر، نیاز میر کا مضمون دودھ پیتے مجنوں، حسنی بیگم کا افسانہ جلتی سہرتی چھاؤں، اشفاق احمد کا مضمون صنفِ لاغر، ڈی ایچ لارنس کا افسانہ گھر سوداگر کی بیٹی احمد بشیر کا افسانہ اکیلا بھی اس شمارے میں شامل ہے۔

لیل و نہار لاہور:۔

ہفت روزہ لیل و نہار اگرچہ ہفتہ وار ہے لیکن اپنے مضامین نظم و نثر کے لحاظ سے ماہنامہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جنوری ۱۹۵۸ء میں اس کی عمر ایک سال ہوئی اس موقع پر سالگرہ نمبر پیش کیا ہے ۱۰۲ صفحات پر مشتمل ہے اور اس نے بجا طور پر فخر کیا ہے کہ ایک سال کے عرصے میں اس نے ۲۶۳ مصور فیچر، ۵۷ افسانے، ۱۱۰ طنزیہ، ۱۵۶ غزلیں اور دو ہزار سے زیادہ تصاویر پیش کی ہیں، ملک میں کتابت و طباعت کی دشواریاں تو بہت ہیں مگر اس راہ میں لیل و نہار کو خصوصی سہولتیں میسر ہیں اس کی بناء پر یہی اس کی طرف سے انھیں کامرانیوں کی توقع تھی جو ایک سال میں اس کو حاصل ہوئیں۔ تازہ نمبر میں مشہور عرب مورخ ابو الحسن علی بن حسین المسعودی کی ہزار سالہ برسی کی مناسبت سے اس کی زندگی پر ایک مختصر مضمون بروقت بھی ہے اور علمی اعتبار سے مفید بھی، شاہد احمد نے " وہ صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں " کے عنوان سے میرزا مرعلی، نواب سائل، بیخود دہلوی، راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی کو اپنے مخصوص دلچسپ انداز میں یاد کیا ہے، ان کی تصویریں بھی مضمون کے ساتھ ہیں، مرزا رجب علی بیگ سرور کی ایک کہانی " گلزارِ محبت (مصنفہ ۱۸۵۸ء) " پر سید وقار عظیم کا مضمون تعارف و تنقید کا مجموعہ ہے، احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور، انتظار حسین، سید قاسم محمود اور شاہد عزیز کے مختصر افسانے بھی شامل ہیں اس کے علاوہ " لباس میں دیوانے " (دو مجموعے) اور " ایک لڑکی ایک سو آدمی " (دو ناولٹ) اپنی اپنی نوعیت سے توجہ طلب مضامین ہیں۔ ایک لڑکی ایک سو آدمی لاہور کے معاشرے کی ابتری ہی پر نہیں بلکہ ہمارے قومی اخلاق و کردار پر ایک دردناک طنز ہے۔ لیکن اس خاکے کو پڑھ کر ہمیں بے اختیار غالب یاد آگیا جس کا یہ مشہور شعر ہے کہ

> نکالا چاہتا ہے کام طعنوں سے تو اے غالب
> ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

لکس ٹائلٹ صابن
LUX
TOILET SOAP

جان لیس کا نام
ٹیلیفون ۳۴۵۶۰
تار کا پتہ جان لیس کراچی
عمدہ معیاری خوشنما مضبوط
پروڈکشن کی مکمل ضمانت ہے
شائع کردہ
جان لیس اینڈ جنرل ملز۔ میٹھادر کراچی ۲
سندانڈسٹریل ٹریڈنگ اسٹیٹس کراچی۔ تیج گاؤں انڈسٹریل ایریا۔ ڈھاکہ
سفر چین
کمیونسٹ چین کی خوبیوں اور خامیوں کا مرقع
مشہور اہل قلم عبدالقدوس ہاشمی کا سفرنامہ
بیحد دلچسپ۔ بیحد معلومات افزا
خوبصورت لکھائی چھپائی
قیمت مجلد ـــ دو روپے
ملنے کا پتہ
مکتبہ مہر نیم روز۔ ہاؤسنگ یونین ۱۔ب کراچی ۵

LIFEBUOY
SOAP
... اور کھیل کے بعد
لائف بوائے صابن
سے غسل کیجئے

ماہنامہ

مہر نیمروز

مارچ اپریل ۵۸ء

جلد ۳ شمارہ ۳-۴

ترتیب
حسن مثنیٰ ندوی
ابوالخیر کشفی
علی اکبر قاصد

منتظم شاہ محمد حسان
پرنٹر حسن مثنیٰ ندوی
پریس انجمن پریس کراچی
کتابت فیض الکتابت کراچی

قیمت سالانہ: چھ روپے
فی پرچہ: ایک روپیہ

دفتر ہاؤسنگ یونین ایریا کراچی - فون: ۳۱۹۹۹ — ۳۳۴۹

اس شمارے میں

پرنٹر و پبلشر زحمن مشتی نے انجمن پریس لارنس روڈ کراچی میں چھپوا کر ۳۔ ہاؤسنگ یونین ایریا کراچی سے شائع کیا ۔

پہلی کرن

"جاتے ہوئے کہتے ہیں قیامت کو ملیں گے"

پچھلے دنوں پیر غلام مجدد سرہندی نے رحلت کی ــــــ اسلام کا ایک سرفروش مجاہد !
پھر سردار عبدالرب نشتر نے کوچ کیا ــــــ مسلمانوں کا ایک مخلص رہنما !
اور اب صاحب الہلال ابو الکلام آزاد نے رخت سفر باندھا ــــــ اردو کا ایک سحر نگار ادیب خطیب!

کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ڈاکٹر اختر امام - ایک خادم ادب، ضیاء الرشید
اثر لکھنوی، محمد ساجد اختر "مریم" - گوہر جہاں آبادی

یارانِ نکتہ داں

ڈاکٹر اختر امام د بلجیم

کل دفتر بند تھا اور دیارِ فرنگ میں بیٹھا ہوا خط استوائی فضائے بعید سے لطف اندوز ہو رہا تھا، یعنی یہ کہ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے اور ساون بھادوں کی طرح پوری فضا برساتی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ اگر بارش تھمتی تو بہت ممکن تھا کہ شہر کی پیچیدہ گلیوں سے ہوتا ہوا دور بہت دور نکل جاتا مگر جب موسم کے تیور ایسے ہوں تو بہترین مشغلہ کتب بینی ہوا کرتا ہے۔ پہلے عربی ماہنامہ "دل" کو اٹھایا جسے میں چند ہفتے دیکھ چکا تھا۔ اس کے بعد خیال آیا کہ ان تمام رسالوں کو لسانی اعتبار سے تقسیم کر ڈالوں، چنانچہ اس کام میں لگ گیا۔ جرنل خوبرو کے پرانے پرچے بڑی آب و تاب سے جھلک رہے تھے جب ان پر نظر ڈالی تو ایسا محسوس کیا جیسے اقبال کہہ رہے ہوں "ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو"! افسوس کہ اب یہ پرچے بند ہوگئے ورنہ جس سنجیدگی سے آپ لوگوں نے یہ ادبی کام شروع کیا تھا اس کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے تھا۔ سوچا کہ آپ کو چند سطریں لکھ ڈالوں خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ رسالہ کے آخری صفحہ پر آپ کا پتہ بھی درج تھا تو یہ ہے شانِ نزول اس عریضہ کی!

ابھی چند دن ہوئے کہ مولانا آزاد چل بسے۔ شاید آپ بھی متفق ہوں کہ اردو ادب میں مولانا نے ایک نئی طرزِ تحریر کی بنا ڈالی تھی جسے خود انہوں نے "الہلال" کے ذریعہ آسمان تک پہنچا دیا تھا۔ یہ وہی آزاد تھے جن کے بارے میں اردو کے آخری غزل گو حسرت موہانی فرما گئے ہیں ؎

جب سے دیکھی ابو الکلام کی نثر
نظمِ حسرت میں وہ مزا نہ رہا،

عالمانہ عبارت کے ساتھ اسلوب میں فرحت بخش شگفتگی کے مالک تھے، الفاظ کا انتخاب اور روانی ایسی جیسے زلال شاداب وادیوں سے گزرتا چلا جا رہا ہو۔ نیاز فتحپوری اور مولانا عبد الماجد دریا بادی کے علاوہ ہمارے اور اہلِ قلم بھی مولانا کی طرزِ نگارش سے متاثر نظر آتے ہیں — ادبی خدمات کے علاوہ کلامِ پاک کے مقامات کو جس خوبی سے مولانا نے باتوں ہی باتوں میں روشن کیا ہے وہ انہیں زندۂ جاوید رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ ان کی سیاست سے ہم لوگ متفق نہیں تھے۔ مگر ادبی اعتبار سے انہیں اپنے عہد کا امام ماننا ہی پڑے گا —

بہت دنوں کی بات ہے جبکہ ہمارا تعلق جامعہ کلکتہ سے تھا۔ اسی زمانے کا ذکر ہے ایک دن حسبِ معمول بلبلِ بنگالہ وحشت کلکتوی علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حاضرین میں سے کسی نے مولانا آزاد کی ادبی خدمت کے بارے میں چند خوشگوار فقرے کہے اس کے بعد وحشت نے کوئی ایک گھنٹے تک مولانا کی ان خدمات پر تنقید فرمائی جن کی بدولت بنگال کی حیاتِ اجتماعی میں اردو کا چراغ دوبارہ روشن ہوا تھا۔ افسوس کہ نہ وحشت رہے اور نہ آزاد۔

فروغِ شمع جواب ہے رہے گا صبحِ محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

۱۵ اپریل کو یہاں عالمگیر نمائش کی افتتاح ہوگی، ہزاروں شیش محل جگمگائیں گے۔ اور ان کی زنگار رنگ کرنوں میں شبنمیں قہقہے بلند ہوں گے، اس وقت بہار کا آغاز بھی ہوگا۔ اور نشاط انگیز جھونکوں کی ابتدا بھی، اگر آپ یہاں آجائیں تو چاک گریبانی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں، آپ کہیں گے کبھی اب جوانی کہاں تو اس یاس آمیز احساس کے لئے خواجہ حافظ کا شیرازی تریاق بھی موجود ہے ؎

گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم کش
تا سحرگہ ز کنارِ تو جواں برخیزم

---

(۱) جرنل خوبرو بند نہیں ہوا۔ پرچے آپ تک نہیں پہنچے۔ ورنہ خدمت بدستور جاری ہے - (ادارہ)

اگر عمرو بن کلثوم زندہ ہوتا تو کہتا کہ علیم کی دلکش و سحر انگیز ہیں یہاں ساغر مشرقی شرب سے مزا ہو کر رہ گیا ہے ؎

صبنت الکاس عنا ام عمرو
وکان الکاس مجراھا الیمینا

یہاں کی ام عمرو بڑی ادا شناس ہے وہ کسی کو محروم رکھنا جانتی ہی نہیں ہے۔ جب التفات کی یہ ارزانی ہو تو فراق و ہجر کا سلسلہ ختم ہونے کے معنی ہوں گے کہ وہ جاتا ہے۔ کہاں ہیں علی اکبر صاحب قاصد، نہ تو آتے آتے رہ گئے۔ اگر ان کی زیارت نصیب ہوتی تو ہماری مغربی مجلس میں مشرقی رنگ دوڑ جاتا کچھ مقامی ادیب سے روشناس کراتا چند با کمال مصوروں اور شاعروں کو دعوت دیتا اور ان سے کہتا کہ ہمارے ہاں بھی ایسے ادیب کی کمی نہیں ہے جو انتہائی خلوص سے اپنا کام کئے جاتے ہیں مگر اب ان سے صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ

افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

ایک خادم ادب:-

جناب ماجد الباقری صاحب سے کچھ گزارشیں ۔

۱۔ سناؤ، سجاؤ، مناؤ، دکھاؤ وغیرہ قوافی میں ایطائے جلی نہیں، ایطائے خفی ہے اور یہ چنداں معیوب نہیں۔

۲۔ سلانا اور سلوانا دونوں صحیح ہے، ناسخ کا شعر سند ہے محل اعتراض سمجھنا غلط ہے۔ ناسخ مصلح زبان اردو تھے، سلوانے میں ثقالت ہے اور سلانے میں سلاست، سلوانے کی اجرت کو سلائی ہی کہتے ہیں سلوائی نہیں کہتے تو جب سلائی صحیح و فصیح ہے تو سلانا کیوں غلط ہوگا۔ صاحب نور اللغات نے شاد کا شعر بھی پیش کیا ہے ؎

نہیں محتاج رفو سینہ فگاری میری | زخم دل چاک نفس تھا جو سلایا نہ گیا

۳۔ اصل شعر:- تمیز رہبر و رہزن کرو نہ آج کے دن | ہر اک سے ہاتھ ملاؤ کہ جشن کا دن ہے

اصلاح :- تمیز رہبر و رہزن نہ آج ان میں کرو | انھیں گلے سے لگاؤ کہ جشن کا دن ہے

یہ اصلاح ہوئی یا افساد؟ میں اس کو اہل نظر کے انصاف پر چھوڑتا ہوں۔

۴۔ "سُو" بہ معنی سمت طرف، اضافت کی حالت میں بروزن فَعَل کو غلط قرار دیا ہے۔ حالانکہ بروزن فَعَل اور بروزن فعلن دونوں طرح صحیح ہے۔ بروزن فعلن کی مثال تو غالب کے شعر سے خود ماجد صاحب نے لکھدی ہے، بروزن فَعَل کی سند امیر مینائی کا شعر ہے ؎

کب گور میں خنجر کی رگڑ یاد نہ آئی ؛ کب روح سوئے کوچہ جلاد نہ آئی

۵۔ لیجے، کیجے، دیجے بروزن فعلن کو ماجد صاحب غلط کیوں سمجھتے ہیں؟ یہ صحیح ہے کہ لیجئے، کیجئے، دیجئے بروزن فاعلن فصیح ہے، مگر بروزن فعلن بھی غلط نہیں۔ غیر فصیح کو غلط کہنا خود غلط ہے۔

۶۔ عروس آزادی انجمن میں نازسے بن سنور کے آئی

"آزادی" کی یائے مصدری گرتی نہیں ہے نہ "انجمن" کا الف البتہ گر گیا اور الف متحرک جو ابتدائے کلمہ میں ہو وہ اکثر یہ ایثار کرتا ہے کہ اپنے لفظ ما قبل کے حرف آخر ساکن کو اپنی حرکت دے کر خود کھسک جاتا ہے۔ جیسے داغ کا یہ مصرعہ "عجب اپنا حال ہوتا جو وصال یار ہوتا" اس کا الف گر گیا۔ اور بے پے سے لپٹ گئی۔ اس کی مثال تو اساتذہ کے دواوین سے کئی ہزار مل سکتی ہے۔

۷۔ "پر" بہ معنی "لیکن" کو اگر بعض متروک کردیں تو کیا کریں۔ ساری دنیا ان بعض لوگوں کا اتباع کیوں کرے۔ اس طرح کے متروکات سے زبان کا نقصان ہوگا۔ ہوتا ہے اور وسعت باقی نہیں رہتی، امیر مینائی لکھتے ہیں ؎

جان آنکھوں سے دم تن سے نکلتے ہوئے دیکھا ٭ پہ دل سے نکلتے ہوئے ارماں نہیں دیکھا

اور داغ فرماتے ہیں ؎

مشتاق بہت ہیں مرے کہنے کے پر اے داغ ٭ یہ وقت ہی ایسا ہے کہ اس کو نہیں کہتا

نظم ہی میں نہیں، نثر میں بھی اس کا استعمال جاری ہے مثلاً صاحب "نور اللغات" "پانی پڑنا" کی مثال میں ایک فقرہ لکھتے ہیں "تمہاری پوتی نے بھی چھینک لی تھی پر اب ڈھل گئی، کل پانی پڑ جائے گا"۔ عبارت میں کیسی روانی ہے۔ اگر یہاں "پہ" کی جگہ "لیکن" یا "مگر" رکھ دیجئے تو وہ روانی باقی نہیں رہے گی۔ اس طرح کے سہل التلفظ الفاظ کو متروک قرار دینا زبان پر ظلم کرنا ہے۔

۸۔ "ناتوسیان شہر بتاں سے ہے ربط خاص"۔ اس پر ارشاد ہے کہ اردو زبان کے الفاظ کی جمع "ون" سے بنائی جاتی ہے"۔ ماجد صاحب کے نزدیک "ناتوسی" گویا اردو زبان کا لفظ ہے تو پھر "بتاں" کو "بتوں" کیوں نہ بنایا؟ "ناتوسیان شہر بتاں" دوہری ترکیب اضافی بہ ترکیب فارسی بھی نظر آتی ہے۔

۹۔ "میری ایک جاں اور اتنی بلائیں" ——— جان کا نون غنہ نہیں ہے۔ نون بالاعلان ہی لایا گیا ہے مگر وہ نون "اور" کے الف کو گرا کر اس کی حرکت خود لے کر واؤ سے لپٹ گیا ہے۔

ضیاء الرشید:۔

ہوائی ڈاک سے خلافِ توقع "مہر نیمروز" کا فروری کا شمارہ موصول ہوا۔

یہ حقیقت ہے کہ خالص ادبی پرچوں کو مسلسل ہر ماہ شائع کرنا پاکستان میں جان جوکھوں کا کام ہے اس طرح کے ہوائی ڈاک کے مصارف ادبی پرچوں پر بار گراں ہوتے ہیں۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ہمارے عوام میں خریداری کی سکت بہت کم ہے مگر یہ بات ادبی مسائل و کتب پر صادق نہیں آتی۔ دراصل ہمارے عوام میں اچھے اور برے ادب میں تمیز کرنے والے تنقیدی شعور کا فقدان ہے کسی بھی گھٹیا ناول یا افسانوں کے مجموعے کو (جن میں صرف جنسی کشش شرط ہے) اٹھا کر دیکھئے۔ کئی بار چھپ چکا ہوگا۔ فلمی پرچوں کی تو پانچوں گھی میں ہیں۔ لوگ فلمی پرچہ نکال کر سال بھر میں خود فلم پروڈیوسر بن بیٹھتے ہیں اور اگر معہ ساتھ ہو تو چھپتے چھپتے ہی اپنی فلم کا اشتہار شروع کر دیتے ہیں۔

جب تک ہماری حکومت زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کی سرپرستی نہیں کرے گی ——— اس دھاندلی کا سدِ باب نہیں ہو سکتا۔ سرپرستی کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی وزیر ادبی پرچوں اور مکتبوں کی انجمن کا صدر بن جائے۔ یا کسی مرحوم ادیب کے پس ماندگان کو پچاس روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دے۔ مثال کے طور پر حکومت کو اردو ٹائپ کی ترقی و ترویج کیلئے عملی قدم اٹھانا چاہیئے۔ مشینوں کی درآمد کے علاوہ اردو ٹائپ رائٹر تیار کرنے کے لئے بیرونی فرموں کو کہنا چاہیئے۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو کی سستی اور کثیر اشاعت کا انحصار اردو ٹائپ کی مقبولیت پر ہے۔ اس کے علاوہ باقاعدہ شائع ہونے والے ادبی رسائل کو (SUBSIDIZED RATES) پر چکنا اور سادہ کاغذ مہیا کرنا بھی حکومت کا فرض ہے اور اس کے ساتھ ساتھ فحش اور مخرب الاخلاق ادب (جس کے زمرے میں فلمی ادب بھی آتا ہے) کے محاسبے کی ذمہ داری بھی حکومت پر عائد ہوتی ہے۔

ہمارے ناقدوں کو چاہئے کہ وہ اپنے مضامین کے ذریعے عوام کے تنقیدی شعور کو فروغ دیں۔ انہیں عوام کے ذوقِ مطالعہ پر تنقید کرنی چاہیئے۔ گھٹیا ادب کو نظر انداز کر دینا کافی نہیں ہے ایسے ادب کی برائیوں، اسکے ناشروں اور مصنفوں پر تنقیدی مضامین کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ان لوگوں کے حوصلے پست ہو سکتے ہیں اور حکومت کا احتساب بھی ہو کر یا تو وہ سلسلہ بند سے توبہ کر لیں گے یا پھر اپنے رسائل کو عوام کو گمراہ کرنے والی آلائشوں سے پاک کر دیں گے۔

ممکن ہے صرف طربیہ شاعری میں حزنیہ عنصر اور حزنیہ شاعری میں طربیہ عنصر تلاش کرکے اپنا لوہا منوانے والے ناقدوں کو میری رائے سے اختلاف ہو اور وہ اس اونچے خیالی مقام سے (جہاں وہ اپنے آپ کو دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں) نیچے اتر کر ——— اس قسم کے عوامی تنقیدی مضامین لکھنے کسر شان سمجھیں۔

اس قسم کی کوششوں کا اثر ظاہر ہے۔ جب اسٹالوں پر [illegible] فلمی رسائل کے بجائے بہت سے نیرنگِ خیال جیسے پرچے بھی نظر آنے لگیں گے تو پھر وہ قارئین جو محض فلمی خبریں، فلم ایکٹرسوں کے معاشقے، سینما گھروں اور باغوں میں لڑکے لڑکیوں کے متعلق افسانے اور کالج گرل کی جان پہچان کے متعلق قصے پڑھتے ہیں — پہلے پہل مجبوراً نیرنگِ خیال خرید کر پڑھیں گے — اور پھر رفتہ رفتہ وہ صحت مند ادب کے قارئین بن جائیں گے۔

نواب جعفر علیخاں اثر لکھنوی :۔

نیرنگِ خیال کی کامیاب ادارت اور اس کو خوبیوں کا مجموعہ بنانے پر میری مبارکباد قبول کرو۔

تازہ نمبر دیکھ کر چند امور پر خامہ فرسائی کی ہے اگر مناسب سمجھو تو آئندہ کی اشاعت میں شامل کر دو۔ میری مبارکباد میں کشفی سلمۂ بھی شریک ہیں اور اسی طرح میری دعاؤں میں۔

کاش نیرنگِ خیال کی مسلسل خدمت کر سکتا مگر بیماریوں نے مجبور کر دیا ہے۔

محمد خالد اختر :۔

نیرنگِ خیال مجھے پسند آیا، خصوصاً عسکری صاحب پر مختصر تنقیدی مضمون، آپ کے پرچے میں جدّت اور زندگی ہے اور یہ بڑا اچھا ہے کہ آپ نے اردو ادبی ماہناموں کی پرانی روش سے ذرا ہٹ کر پرچہ نکالا ہے، "چہ دلاور است دزدے" کو اس بار نظریں ڈھونڈتی ہی رہیں۔ کیا آپ نے یہ سلسلہ بند کر دیا ہے، اس سے کتنے ادبی چوروں کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ اور ممکن ہے کہ شوخ سر قہ سے مجبوراً توبہ ہی کر لی ہو کہ آخر پکڑے جائیں گے۔

مریم :۔

اکتوبر کے شمارے میں ملک حسین کا "جل تارا" بہت پسند آیا۔ اور اس سے متاثر ہو کر انجیل کے چند اقتباسات پیشِ خدمت ہیں۔ کیا آپ یارانِ نکتہ داں تک پہنچا سکتے ہیں۔ اگر پسند آ جائیں تو! ورنہ صرف شکریہ!

آدم کی کہانی : خدا نے ابتدا میں زمین و آسمان پیدا کیا اور زمین ویران و سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا اور خدا کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی۔ خدا نے کہا کہ روشنی ہو جا اور روشنی ہو گئی۔ خدا نے دیکھا کہ روشنی اچھی ہے تو اس نے روشنی کو تاریکی سے جدا کیا۔ خدا نے روشنی کو تو دن کہا اور تاریکی کو رات اور شام ہوئی اور صبح ہوئی، سو پہلا دن ہوا۔ (انجیل مقدس)

خدا نے کہا کہ آسمان کے نیچے کا پانی ایک جگہ جمع ہو کر خشکی نظر آئے اور ایسا ہی ہوا اور اس نے خشکی کو زمین کہا اور جو پانی جمع ہو گیا تھا اس کو سمندر اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے۔ (انجیل مقدس)

خداوند نے زمین کی مٹی سے انسان کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا تو انسان جیتی جان ہوا۔ (انجیل مقدس)

اور خداوند نے کہا کہ آدم کا اکیلا رہنا اچھا نہیں میں اس کے لئے ایک مددگار اس کی مانند بناؤں گا۔ اور اس نے آدم پر گہری نیند بھیجی اور وہ سو گیا۔ خدا نے اس کی پسلیوں میں سے ایک کو نکال لیا اور اس کی جگہ گوشت بھر دیا اور اس پسلی سے جو اس نے آدم میں سے نکالی تھی۔ ایک عورت بنا کر آدم کے پاس لایا اور آدم نے اپنی بیوی کا نام حوا رکھا۔ اس لئے کہ وہ سب زندوں کی ماں ہے۔ آدم اپنی بیوی حوا کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی اور اس کے قائن پیدا ہوا۔ پھر قائن کا بھائی ہابل پیدا ہوا .... (انجیل مقدس)

اور ایک دن قائن نے ہابل کو قتل کر دیا۔ (انجیل مقدس)

اور تب سے آج تک آدم حوا کے پاس جا رہا ہے اور حوا اس کے بیٹوں ہزاروں لاکھوں قائن اور ہابل پیدا ہو رہے ہیں اور روزانہ قائن بھائی کا خون پی رہا ہے۔

جب انسان زمین پر روئے زمین پر بہت بڑھنے لگے اور خدا نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی تب خداوند زمین پر انسان کو پیدا کرنے سے پچھتایا۔

سلوک میں اور دل میں غم کیا اور کہا کہ میں انسانوں کو جسے میں نے پیدا کیا روئے زمین پر سے مٹا دوں گا۔ زمین خدا کے آگے ناراست ہو گئی ہے اور ظلم سے بھر گئی ہے کیونکہ ہر بشر نے زمین پر اپنا طریقہ بگاڑ لیا ہے۔ (انجیل مقدس)

اور پھر خدا نے ایٹم بموں، ہائیڈروجن بموں اور کوبالٹ بموں کا نسخہ انسان کے ذہن میں اور سینوں میں اتار دیا کہ خاتمہ کا عہد پورا کر دے۔

گویا جہان آبادی:-

[illegible] میں بہ عنوان، غالب کے چند شعر ایک مقالہ جو مجموعہ ہے نقادانِ شعر و ادب کی نکتہ سنجیوں کا، غالب کے چند اشعار پر سب سے پہلا شعر جو دیوانِ غالب کا افتتاحیہ ہے سب سے پہلے محلِ فکر و نظر اس مقالہ میں بنا ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا　٭　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

جن حضرات نے اس شعر کو مہمل قرار دیا ہے اور کوئی وجہ اس کو مہمل کہنے کی نہیں بیان کی ان کے تخیل پر تو کوئی تبصرہ بجز اس خاموشی کے جس میں تھوڑی سی جھلک تبسمِ زیرِ لب کی بھی شامل ہو نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ہنسی تو آتی ہے ان پرستارانِ غالب کی نکتہ آفرینیوں پر جن کی غالب پرستاری نے فکرِ غالب کو مغلوب تخیلات کر لیا ہے۔ فریاد، نقش، شوخیٔ تحریر اور کاغذی پیرہن خاص طور پر یہ نقاط نظر آماجگاہِ بحث و مباحثہ و غور و فکر ہیں۔

بعض فریاد کے معنی ایک قسم کے شکوہ و گلہ کے لیتے ہیں کچھ حرف و حکایت کے اور بشنو از نے چوں حکایت می کند سے، فریاد کو ہم آہنگ سمجھتے ہیں، شوخیٔ تحریر کے معنی بڑی گنجائش کے حامل اور غیر متعین ہیں۔ کاغذی پیرہن سے مراد، ایران سابق میں، دربار کسریٰ کے اندر فریادیوں کا لباس ہے جو علامت فریاد و داد خواہی تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سازِ واحد کا ہر تار اپنا اپنا نیا نغمہ الاپ رہا ہے۔ ایک شعر کے متعدد معنی ہیں ہر نقاد اپنے اپنے ذوق و فکر کے مطابق رد و تاویل ہے۔ ایسی صورت میں یہ جستجو قدرتاً دل میں پیدا ہوتی ہے کہ شاعر کا خود اپنا مافی الضمیر کیا تھا۔ غالب نے کس تصور کی نقاشی اور کس جذبہ کی ترجمانی اس شعر میں کی ہے۔

راہ جستجو میں تصورات کا عالم بھی عجیب ہوتا ہے، ہر قدم پر گمانِ منزل، ہر طرف شکلِ مقصود کا دھوکا دیتا ہے جس کو دل دو دورہ سکتا نہیں۔ غالب کی مثالی صورت سامنے ہے اور دل متجسس غالب سے ان کے شعر کا مفہوم پوچھ رہا ہے۔ غالب کے جواب استفسار میں سب سے پہلے اس معرکہ زبانِ خاموشی سے پہلا ع شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا۔ پھر کچھ معنی آفریں اشاروں میں کہا، جس کا مفہوم دل نے سمجھا، نگاہیں حیران، کان ناآشنا۔

ہمارا کام صرف ان معنی آفریں اشارات کی ترجمانی ہے جو دل نے نگاہوں سے اخذ کئے ہیں۔ وہ ہوا طغرا: کوئی نقش ایسی زبان نہیں رکھتا جس پر ایسی زبانِ فریاد کا اطلاق ہو سکے جو حروف و کلمات یا آہ و نالہ کا مجموعہ ہو۔ شوخیٔ تحریر سے مراد، وہ طرزِ نگارش ہے جو عجیب ہو۔ کاغذی پیرہن، ایسا پیرہن جو ہے بجز نمود کے جس کا کوئی وجود نہ ہو۔

اب شعر کا مفہوم یہ ہے کہ تمام کائنات نقش نقش زبانِ حال سے شاہد و معترف طرزِ تحریرِ عجیب ہے کہ تمام عالمِ نقش و نگار کی حقیقت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ عدم کو صورتاً الگ وجود دیا گیا ہے۔ کاغذی پیرہن، لباسِ نمود ہے جو ہر پیکرِ تصویر یعنی ہر نقشِ نگارشِ کائنات، مرقعِ نیست ہست نما ہے۔ یہ شوخیٔ تحریر نہیں تو اور کیا ہے اس سے زیادہ عجیب طرزِ تحریر اور کیا ہو سکتا ہے کہ عدم کو صورتِ وجود بھی عطا کر دی اور عدم کا عدم بھی رہا۔

غالب کا تصورِ کائنات، نظریۂ ہمہ اوست کے تحت میں یہ ہے کہ عالمِ کثرت کا کوئی ایسا وجود نہیں۔ ایک حقیقتِ واحدہ اپنی عجیب شانِ آفرینش سے عدم کو رنگِ وجود بخش دیا ہے۔ یعنی تمام عالم خیالی ہے، ہمہ اوست میں جس کی حقیقت صرف تجلی یا تصورِ صورت آفریں ہے ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد　٭　عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے　(غالب)

یا　ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی　٭　ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے　(غالب)

سوفسطائی بھی عالم کو خیالی کہتے تھے اور تصوریت جدیدہ میں بھی قریب قریب یہ ہے کہ تمام عالم کو ذہنِ مطلق کی صورت گری یا مجموعۂ تصورات سمجھا جاتا ہے۔ غالب

(باقی صفحہ پر)

کرنل جمال ناصر صدر مملکت مصر
ترجمہ - اسماء رشید ایم اے

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے

"فلسفۂ انقلاب" صدر جمہوریہ مصر جمال عبدالناصر کی ان تقریروں کا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے تاریخ مصر، سیاسیات مصر اور فوجی انقلاب اور احوال شرق اوسط پر اثر انگیز انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے جس کے متعدد ایڈیشن انگریزی اور عربی زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں اور اب اردو میں اس کا ترجمہ اسماء رشید ایم اے نے کیا ہے۔ اس کتاب نے مغربی دنیا میں بڑی ہلچل ڈال رکھی ہے۔ انگریز کہتے ہیں کہ یہ ہٹلر کی "مین کیمف" سے کم نہیں۔ جمال ناصر کہتے ہیں کہ جو کچھ مصر میں ہوا جس طرح فوجی انقلاب نے کروٹ لی اور اہل مصر مرنے مارنے پر تل گئے وہ مغربی استعمار کے ظلم و ستم کا لازمی نتیجہ تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ سارا عالم اسلام استعمار کے پنجوں میں جکڑا ہوا ہے اور اسے کسی نہ کسی طرح استعمار کے چنگل سے نکلنا چاہئے۔ اور استعمار کے چنگل سے نکلنے کے لئے عالم اسلام کا اتحاد ضروری ہے۔ ان کی نظر میں اتحاد کے حصول کی تین منزلیں ہیں، اتحاد ممالک عربیہ، اتحاد افریقہ، پھر اتحاد عالم اسلام ان کو وہ تین دائرے قرار دیتے ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے مصر و شام کی یونین قائم کر لی ہے یہ گویا سلسلہ کا پہلا عملی قدم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو کمزور سمجھتے ہیں یہ غلط ہے۔ قوی ہیں بشرطیکہ قوت کے مفہوم و معنے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ [illegible] "فلسفۂ انقلاب" کا ایک [illegible] [illegible] اردو اکیڈمی سندھ کراچی کی طرف سے شائع ہو کر منظر عام پر آئی ہے [illegible]

میں اپنے تاثرات قلمبند کر رہا ہوں اور میرے سامنے "ڈاکٹر وایزمن" (صدر جمہوریہ اسرائیل مقبل بانی) کی یادداشت رکھی ہے۔ ڈاکٹر وایزمن نے اپنی یہ یادداشت اپنی مشہور کتاب "تجربہ و خطا" (TRIALS AND ERRORS) کے ساتھ شائع کر دی ہے، اس میں بعض حصے خاص طور پر قابل توجہ ہیں، بالخصوص اس بنا پر کہ ایک خاص سراس پر لگی ہوئی ہے۔

مثلاً ڈاکٹر وایزمن کی یہ عبارت پڑھئے :-

"ضروری تھا کہ ہمیں کسی بڑی مملکت کی پشت پناہی حاصل ہو نہ کہ صرف روس ہی بڑی مملکتیں ایسی تھیں جو ہماری مددگار ثابت ہو سکتی تھیں ۔۔۔۔ اور برطانیہ، جرمنی نے کنارہ کشی کو ترجیح دی، مداخلت سے اس کو احتراز تھا۔ البتہ برطانیہ نے ہمیں اپنی ہمدردی اور سرپرستی سے نوازا۔"

پھر ڈاکٹر وایزمن کی یہ عبارت بھی میرے دامن خیال کو کھینچتی ہے :-

"پہلی صیہونی کانفرنس میں، جو ہم نے سوئٹزرلینڈ میں منعقد کی تھی، یہ ہوا کہ ہرتزل نے دنیا بھر کے یہودیوں میں کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دیا کہ دنیا کی تمام حکومتوں میں صرف برطانیہ عظمیٰ نے یہودیوں کو دوسروں سے الگ ایک مستقل وجود رکھنے والی قوم تسلیم کر لیا ہے۔ ہم یہود اس کے اہل ہیں کہ ہمارا ایک وطن ہو اور ہماری الگ حکومت ہو اور ہرتزل نے لارڈ روسن کا ایک خط بھی حکومت برطانیہ کی طرف سے پڑھ کر سنایا جو اس مفہوم کا حامل تھا۔ اس خط میں یوگنڈا کی سرزمین ... قومی وطن کی حیثیت سے پیش کی گئی تھی اور کانفرنس کے اراکین نے اس پیشکش کو قبول کر لینے کا فیصلہ کیا۔

مگر بعد میں جھگڑے ہونے لگے [illegible] تھا۔ سے دفن کر دو برطانیہ نے جنہیں پھر راضی کرنے کی کوشش کی

تو اس پیشکش پر ہم نے علمائے یہود کی ایک بڑی کمیٹی مقرر کی، یہ لوگ منطقۂ سینا کے مطالعے کے لئے مصر گئے۔ اور قاہرہ میں لارڈ کرومر سے ملاقات کی۔
لارڈ کرومر نے قومی وطن کے قیام پر ہم سے گہری ہمدردی کا اظہار کیا۔

لیکن جس مقصد سے ہم قومی وطن کے قیام کے خواہاں تھے، منطقۂ سینا میں وہ مقصد اس کمیٹی کی نظر میں پورا نہ ہوتا تھا۔
اس کے بعد میں نے لارڈ بالفور، وزیر خارجہ برطانیہ، سے ملاقات کی۔ لارڈ بالفور نے حقیقی طور پر مجھ سے پوچھا —— "آپ نے یوگنڈا کو اپنا قومی وطن بنانے کی پیشکش کیوں قبول نہ کی؟" —— میں نے بالفور سے پوچھا —— صیہونیت ایک سیاسی قومی تحریک ہے، یہ تو درست ہے، لیکن اس کا ایک روحانی پہلو بھی ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہم نے اگر روحانی پہلو کو نظر انداز کر دیا تو مجھے پختہ یقین ہے کہ ہمارا سیاسی قومی خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو گا،

پھر میں نے کہا —— اگر آپ سے کوئی یہ کہے کہ لندن کے بدلے پیرس کو قبول کر لیجئے تو آپ کیا کہیں گے: کیا آپ اسے قبول کر لیں گے"؟
پھر مجھے ڈاکٹر وائزمن کی اس عبارت نے بھی روکا۔
۱۹۲۱ء کے موسم خزاں میں پھر میں لندن پہنچا کیوں کہ فلسطین کے لئے برطانوی انتداب کا جو مسودہ تیار ہو رہا تھا اس کی قانونی نگرانی کے لئے مجھ کو طلب کیا گیا تھا۔

سان ریمو کانفرنس میں انتداب کے قیام پر تو اتفاق ہو چکا تھا مگر اس مسودہ کو انجمن اقوام کے سامنے پیش کر کے وہاں سے اس کی باقاعدہ توثیق حاصل کرنی ضروری تھی۔ ان دنوں لارڈ کرزن وزیر خارجہ ہو کر بالفور کی جگہ آچکے تھے۔ اور مسودہ انتداب کی ترتیب انہیں کے سپرد تھی۔ لندن میں مشہور قانون دان بن کوہین "ہمارے ساتھ تھے" وہ بن کوہین جن کو قانونی دستاویزات مرتب کرنے والے ماہرین کی صف میں دنیا بھر میں ممتاز درجہ حاصل تھا، اس کے علاوہ کرزن کے سکرٹری "ایریک فوربس ایڈیم" بھی ہماری اعانت کر رہے تھے۔
ہمارے اور کرزن کے درمیان اختلاف صرف ایک ہی بات پر ہوا۔ پہلا اور آخری ہم لوگوں نے مسودے میں ایک ایسی دفعہ رکھی تھی جس کی رو سے ہم برطانیہ کو وعدۂ بالفور کا پابند کرنا چاہتے تھے تاکہ فلسطین میں اس کی پالیسی وطن یہود کی اساس پر قائم رہے۔ چنانچہ ہم نے عبارت یوں لکھی تھی:-

"........ اور فلسطین پر یہودیوں کے تاریخی حقوق تسلیم کرتے ہوئے ......"
کرزن کی رائے تھی کہ عبارت کچھ ہلکی کر دی جائے تاکہ عربوں میں اسکو پڑھ کر ہیجان نہ برپا ہو، انھوں نے کہا کہ میرے خیال میں یہ عبارت یوں کر دی جائے:-

"........ اور فلسطین سے یہودیوں کے تاریخی تعلقات اور وابستگی کو تسلیم کرتے ہوئے ....."
جی تو یہی چاہتا ہے کہ وائزمن کی اس کتاب "تجربہ و خطا" کے اقتباسات اسی طرح یکے بعد دیگرے پیش کرتا چلا جاؤں، لیکن یہ بات کون نہیں جانتا کہ ماضی کے یہی واقعات، اولین جراثیم تھے ان پیچیدگیوں کے جنھوں نے فلسطین کو پارہ پارہ کر دیا، اس کی ہستی مٹا کے رکھدی۔
یہاں میں پھر وہی بات دہراؤں گا جو پہلے کہہ چکا ہوں کہ اصل میں سب سے بڑی قوت اور بلائے عظیم جس نے اس پورے منطقے کا ایک خطرناک مہلک اور سفاکانہ محاصرہ کر رکھا ہے، وہ صرف استعمار ہے اپنے پیلزم ہے استعمار کا یہ محاصرہ تو اس محاصرے سے بھی سینکڑوں گنا سخت اور ہولناک ہے جس نے ناداری ہماری خندقوں اور ہماری تمام فوجوں کو اور دارالحکومتوں میں ہماری حکومتوں کو اپنے شکنجوں میں کس رکھا تھا۔
جب یہ تمام حقائق مجھ پر واضح ہوگئے تو متحد اور مشترک محاذ کی ضرورت کا شدت سے احساس میرے دل میں پیدا ہوا اور میں نے بار بار اپنے آپ سے کہا کہ:——

"جب یہ خطہ ایک ہے، اس کے حالات ایک ہیں، مسائل ایک ہیں، مستقبل ایک ہے ..... اور پھر دشمن بھی ایک ہی ہے، چاہے وہ کتنے ہی بھیس کیوں نہ بدلے ـــــ تو پھر ہماری جد وجہد میں یہ انتشار و اختلاف کیوں ہے ؟۔

۱۴ جولائی کے انقلاب کے بعد جو تجربات مجھ کو ہوئے تو ان سے میرا ایمان اور پختہ ہو گیا کہ متحدہ محاذ وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے،

جس کے بعد تصویر کے تمام دھندلے نقوش اور مخفی گوشے مجھ پر روشن ہوتے چلے گئے اور جزیات پر جو دھندلکا چھایا ہوا تھا وہ چھٹ گیا۔

ہاں مجھے اعتراف ہے کہ ساتھ ہی مجھے وہ بڑی بڑی چٹانیں اور رکاوٹیں بھی نظر آئیں جو متحدہ محاذ کی راہ میں حائل ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ ان تمام رکاوٹوں کا بھی خاتمہ ہو جائیگا کیوں کہ یہ سب اسی مشترک دشمن کی پیدا کردہ ہیں۔

اس کے بعد ہی میں نے سیاسی رابطوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا میں اس متحدہ محاذ کو بہر قیمت وجود میں لے آنا چاہتا تھا۔ خواہ اس کے وسائل کچھ بھی ہوں چنانچہ میں نے خوب دوڑ دھوپ کی، اور آخر اس نتیجے پر پہونچا کہ ہمارے راستے کی بنیادی رکاوٹ صرف شبہات و شکوک ہیں" ظاہر ہے کہ شبہات و شکوک کے یہ کانٹے بھی ہمارے قلوب میں اسی مشترک دشمن کے بوئے ہوئے ہیں تاکہ ہمارے اندر کبھی کوئی وحدت پیدا نہ ہونے پائے۔

ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے ایک عرب سیاستدان سے میری گفتگو ہوئی، گفتگو کے وقت ان کے ایک رفیق کار بھی موجود تھے میں نے باتیں شروع کیں اور وہ میری باتوں کا جواب دینے لگے ....

مگر عالم یہ تھا کہ وہ جب کوئی بات میرے جواب میں کہتے تو بجائے یہ دیکھنے کے کہ مجھ پر ان کی بات کا کیا اثر ہوا مڑ کر اپنے ساتھی کا منہ تکنے لگتے کہ ان پر کیا اثر پڑا

آخر مجھے کہنا پڑا کہ آپ کے دل میں اگر کچھ شکوک ہوں تو ان پر قابو پانے کی کوشش کیجئے بلکہ جو کچھ آپ کے دل میں ہو وہ صاف صاف مجھ سے کہہ ڈالئے اور باتیں کرتے وقت نظر میری طرف رکھئے میری آنکھوں میں دیکھئے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ان رکاوٹوں کو جو ہمارے درمیان اور متحدہ محاذ کی راہ میں حائل ہیں، حقیر سمجھتا ہوں بعض رکاوٹیں تو واقعتاً بڑی پیچیدہ ہیں اور ان کی جڑیں ہمارے ماحول میں اور قوم کے تاریخی اور جغرافی احوال و کیفیات میں بہت گہری اتر چکی ہیں لیکن اس کے باوجود یقین ہے کہ اگر غفلت اور بے اعتنائی کی بجائے تھوڑی سی اس لچک کو راہ دی جائے جو دور اندیشی پر مبنی ہو تو وہ مرکزی نقطہ وجود میں لایا جا سکتا ہے جس پر سب کے سب بلا پس و پیش متحدہ محاذ کی خاطر آسانی سے جمع ہو سکتے ہیں۔

اور مجھے اس معاملے میں ذرہ برابر شک نہیں کہ ہمارا یہ متحدہ محاذ اگر قائم ہو جاتا تو وہ تمام آرزوئیں اور تمنائیں حاصل ہو سکتی ہیں جو ہمارے قلوب میں اپنی قوموں کیلئے پرورش پاتی رہی ہیں۔

اور یہ تو شاید ہمیشہ ہی کہتا رہوں گا کہ ہم لوگ قوی ہیں لیکن بڑا سانحہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی قوت کا ذرا احساس نہیں۔

ہم قوت کی تعریف میں ہمیشہ غلطی کرتے ہیں قوت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ آپ کتنی اونچی آواز سے چیخ سکتے ہیں، کتنا شور مچا سکتے ہیں، اصلی قوت یہ ہے آپ کوئی قطعی اور ایجابی عمل، اس کے تمام تر تقاضوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر انجام دے سکتے ہیں یا نہیں۔

میں جب اپنی قومی قوت کے عناصر کا تجزیہ کرتا ہوں تو مجھے تین سرچشمے اتنے نمایاں نظر آتے ہیں جن کی طرف اشارہ کئے بغیر تو میں رہ ہی نہیں سکتا۔ قوت کے یہ سرچشمے ہیں جن کو سر فہرست رکھنا چاہئے۔

پہلا سرچشمہ تو یہی ہے کہ ہم پہلو بہ پہلو ایک دوسرے سے ملی ہوئی قوموں کا ایک ایسا مجموعہ اور گروپ ہیں جس کو ہر ممکن مادی اور روحانی رشتوں نے باندھ رکھا ہے۔ ایسی قومیں جن کی اپنی خصوصیات ہیں، اپنے مزاج ہیں اور اپنی تہذیب ہے جس کی آغوش سے تین عظیم مقدس آسمانی دین کا ظہور

دنیا کو ایک پائیدار گہوارۂ امن و عافیت بنانے کی کسی کوشش میں بھی اس کو تو کبھی نظر انداز ہی نہیں کیا جا سکتا۔
دوسرا اہم چشمہ ہمارا خود یہ خطہ ہے، اور اس کا محل وقوع جو نقشۂ عالم میں آپ کو نظر آتا ہے یہ مقام ایک نہایت ہی اہم فوجی ٹکڑا (اسٹریٹجی)
اس کو بجا طور پر دنیا کا چوراہا سمجھا جاتا ہے، یہ تجارت کی شاہراہ اور فوجوں کی گذرگاہ ہے۔
اب رہا تیسرا سرچشمہ، تو وہ پٹرول ہے یعنی تمدن کی وہ شہ رگ جس کے بغیر اس کے تمام کل پرزوں کا وجود بیکار ہے اس کے بغیر نہ تو وہ عظیم الشان کارخانے چل سکتے ہیں جہاں انواع و اقسام کی چیزیں تیار ہوتی ہیں، نہ بری، بحری اور فضائی مواصلات باقی رہ سکتے ہیں، نہ آلات جنگ ہی کسی کام کے رہ سکتے ہیں، چاہے وہ ہوائی جہاز ہوں جو بدلیوں میں ڈوب ڈوب کے پرواز کرتے ہیں، چاہے آبدوز کشتیاں ہوں جو موجوں کے نیچے نیچے ابھرتی ہیں —— پٹرول کے بغیر ان سب کی حیثیت لوہے کے چند ٹکڑوں سے زیادہ کچھ نہیں رہ جاتی۔ چند زنگ آلود ٹکڑے، محروم حرکت اور بے جان۔
پٹرول کا ذکر آ ہی گیا ہے تو جی چاہتا ہے کہ اس سلسلے میں بھی کچھ عرض ہی کرتا چلوں، کیوں کہ اعداد و شمار کی رو سے پٹرول کو جس قسم کی مادی قوت تسلیم کیا گیا ہے اس کی بنا پر غالباً اس کا وجود ہماری ملکی قوت کے سرچشموں کا اور ان کی اہمیت کا ایک اچھا نمونہ ثابت ہوگا۔
حال ہی میں شکاگو یونیورسٹی کا شائع کردہ ایک رسالہ میری نظر سے گذرا ہے جس میں پٹرول کی عالمی صورت حال پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے کاش ہماری قوم کا ایک ایک فرد اس رسالے کو پڑھتا اور اس کے مفہوم و معنے پر غور کرتا اور پھر ان اعداد و شمار کے پس منظر میں جو رموز پنہاں ہیں ان کو سمجھنے اور ان کی اہمیت کو محسوس کرنے کی کوشش کرتا۔
مثلاً اس رسالے میں بتایا گیا ہے کہ ممالک عربیہ میں زمین سے پٹرول نکالنے کے لئے زیادہ سرمائے کی ضرورت نہیں۔
کولمبیا میں تیس کی کمپنیوں نے ۱۹۱۶ء کے شروع سے ساٹھ میلین ڈالر صرف کئے لیکن ۱۹۳۶ء تک تیل کی ایک بوند بھی برآمد نہ ہو سکی۔
وینیز ویلا میں انیس کمپنیوں نے چوالیس میلین ڈالر خرچ کئے مگر پندرہ سال تک ایک قطرہ نہ ملا۔
پھر ولندیزی جزائر ہند میں انیس کمپنیوں نے چوالیس میلین ڈالر صرف کئے اور اب کہیں حال میں تیل برآمد ہوا۔
اور ساری بحث کا آخری نتیجہ اس رسالے نے یہ پیش کیا ہے کہ۔
امریکہ میں ایک پیپا (بیرل) پٹرول برآمد کرنے پر ۸۴ سینٹ خرچ ہوتے ہیں۔
جنوبی امریکہ میں ایک پیپے پر ۴۳ سینٹ لاگت آتی ہے۔
اور ممالک عربیہ میں ایک پیپا تیل صرف دس سینٹ میں برآمد ہوتا ہے۔
چنانچہ پٹرول برآمد کرنے کا مرکز امریکہ سے منتقل ہو کر منطقہ عربیہ میں آ پہونچا کیوں کہ امریکہ کے چشمے خشک ہو رہے ہیں۔ زمینوں کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں، اور مزدوروں کی اجرتیں بڑھ رہی ہیں لیکن ممالک عربیہ کے ذخیرے ابھی تازہ ہیں۔ ان کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگا تھا پھر یہاں کی بڑی بڑی زمینوں کی بھی کوئی قیمت نہیں ہے اور مزدور تو ضرورت سے بھی کم اجرت قبول کر لیتے ہیں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ دنیا کا نصف محفوظ (ریزرو) پٹرول صرف ممالک عربیہ کی زمین میں چھپا ہوا ہے اور باقی نصف امریکہ روس اور منطقہ کریبیہ وغیرہ ممالک عالم میں منقسم ہو کر منتشر ہے
یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ آج ایک چشمے سے روزانہ تیل اوسطاً حسب ذیل مقدار سے نکل رہا ہے۔
امریکہ میں —— گیارہ پیپے
وینیز ویلا میں —— دو سو تیس پیپے
منطقہ عربیہ میں —— چار ہزار پیپے
مجھے امید ہے کہ قوت کے اس اہم عنصر کی حیثیت اب تو بخوبی واضح ہو گئی ہوگی؟ میرا خیال ہے میں ناکام نہیں رہا۔

تو ہم ہم لوگ قوی ہیں، لیکن اس مفہوم میں نہیں کہ چیخ چیخ کر نالہ و فریاد کریں، شور مچائیں داد رسی کی صدا لگاتے پھریں۔ ہماری قوت کا تقاضا یہ ہے کہ بیٹھ کر سنجیدگی سے غور و فکر کریں ان اعداد و شمار کو سامنے رکھ کر اپنی قوت عمل کی وسعت کا اندازہ لگائیں اور قوت کا حقیقی فہم پیدا کریں جو ہم سب کے درمیان محکم رشتہ ارتباط ہے۔ وہ رشتہ ارتباط جس کی بدولت ہماری سرزمین ایک علاقائی وحدت ہے، ایسی وحدت جس کا کوئی جزو اپنے کل سے جدا نہیں کیا جاسکتا اور نہ ان میں سے کوئی جز، بھی کسی جزیرے کی طرح دوسرے اجزا سے الگ تھلگ اور بے تعلق ہو کر محفوظ رہ سکتا ہے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ ہماری سرگرمیوں کے تین دائرے ہیں۔ یہ داستان دائرہ اول کی تھی۔ ہم مجبور ہیں کہ اس دائرے کے اندر ہی رہ کر گردش کریں اور پوری قوت کے ساتھ سرگرم عمل ہو جائیں —— یہ عربی دائرہ ہے۔

اس کے بعد دائرہ ثانی کی طرف آیئے۔ یہ افریقی دائرہ ہے جس کے بارے میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم لوگ اگر چاہیں بھی تو اس ہولناک اور خونی کشمکش سے کسی حالت میں علیحدہ نہیں رہ سکتے۔ جو آج قلب افریقہ میں پانچ ملین گوروں اور دو سو ملین افریقیوں کے درمیان برپا ہے۔ سبب بالکل واضح ہے کہ ہم خود افریقہ میں ہیں اور اہل افریقہ کی نگاہیں برابر ہماری طرف لگی رہیں گی کیوں کہ اس براعظم میں شمالی دروازے کے پاسبان بھی ہمیں ہیں اور بیرونی دنیا کے ساتھ ان کے ربط و ارتباط کا واسطہ بھی ہمیں ہیں۔

ہم تو کسی حالت میں بھی اپنی اس ذمہ داری سے بھی سبکدوش نہیں ٹھہر سکتے جو افریقہ کے دہشت آباد علاقوں اور تاریک جنگلوں تک تہذیب و تمدن کی روشنی پھیلانے میں حتی الامکان مدد پہونچانے کی ہمارے سر عائد ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ دریائے نیل جو ہمارے وطن کے لئے رگ جاں کی حیثیت رکھتا ہے وہ پانی اسی براعظم کے قلب سے حاصل کرتا ہے۔

پھر یہ بھی ایک سبب ہے کہ سوڈان —— جو ہمارا محبوب بھائی ہے۔ اس کی سرحدیں قلب افریقہ تک چلی گئی ہیں اور وسط افریقہ کے تمام حساس و بیدار علاقوں کے ساتھ اس کا ہمسائیگی کا رشتہ قائم ہے ....

اب رہا دائرہ ثالث —— یہ تیسرا دائرہ وہ ہے جس کے دامن میں براعظموں اور سمندروں کی حد بندیاں تک سمٹی ہوئی ہیں۔ یہ دائرہ ہمارے ان تمام دینی بھائیوں کا ہے جو دنیا کے کسی خطے میں بھی ہوں اس سمت کے پیچھے ایک ہی قبلے کی طرف ہمارے ساتھ جھکتے ہیں اور ان کے ہونٹوں پر بھی خشوع و خضوع کی وہی دعائیں اور وہی درود و سلام ہوتے ہیں جو ہمارے ہونٹوں پر ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ میں جب ممالک سعودیہ کے تاجدار کی وفات پر تعزیت کے لئے گیا تھا تو وہاں پہونچ کر اس موثر ایجابی قوت کی تخلیق اور اس کی وسعت و حدود پر میرا ایمان اور بھی مستحکم ہو گیا جو مسلمانان عالم کے باہمی رشتہ اسلامی کی بنیاد پر روبہ عمل آسکتی ہے۔

میں خانہ کعبہ کے سامنے کھڑا تھا اور میرا تصور دنیا کے ان تمام خطوں اور دور دراز گوشوں کا طواف کر رہا تھا جہاں اسلام پہونچا ہے —— میں نے اپنے آپ کو بے اختیار دل ہی دل میں یہ کہتے ہوئے پایا کہ:

حج کے متعلق ہمارے نظرئے میں اب تبدیلی ہونی چاہئے۔ سفر کعبہ کا مطلب یہ تو ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ ایک مدت مدید کے بعد جنت میں داخل ہونے کا پاسپورٹ ہے یا عیش و عشرت کی بھرپور زندگی گذار چکنے کے بعد "خریداری مغفرت" کی ایک بھولی بھالی کوشش۔

ہونا یہ چاہئے کہ حج ایک عظیم الشان سیاسی قوت بن جائے۔ ایسی قوت کہ دنیا کے تمام اخبارات اس اجتماع کی خبریں حاصل کرنے کے لئے دوڑ سکیں —— اس لئے نہیں کہ مناسک و رسوم کی تصویریں اپنے اپنے قارئین کے لئے تفریح کا سامان فراہم کریں بلکہ اس لئے کہ حج ایک ایسا باقاعدہ سیاسی اجتماع ہو جس میں تمام ممالک اسلامیہ کے قائدین، ارباب فکر و نظر، محققین علوم و ماہرین فنون، اہل قلم، ماہرین صنعت و حرفت، ماہرین تجارت اور ان تمام ملکوں کے نوجوان —— سب کے سب اس مقصد سے جمع ہوں کہ وہ اپنی اس عالمی اسلامی پارلیمان میں اپنے ملکوں

کی سیاست اور باہمی امداد و تعاون کی ایک وسیع پالیسی مرتب کریں اور پھر ہر سال اس عظیم الشان اجتماع میں اپنا اپنا جائزہ

یہاں ان سب کا یہ اجتماع حد درجہ شکرانہ اور عاجزانہ ہوگا ...... لیکن یہ اسی قدر قوی بھی ہوں گے حرص و ہوس سے پاک، اور جوشِ عمل ۔

اپنے خدا کے حضور عاجز و ناتواں ...... لیکن اپنی الجھنوں مشکلوں اور دشمنوں کے حق میں حد درجہ سخت کوش و سخت گیر —— حیاتِ سرمدی اور زندگانی

نو کے آرزو مند ...... لیکن ساتھ ہی اس ایمان و ایقان سے بھی معمور کہ اس سورج کے نیچے بھی ان کا ایک مقام ہے اور اس مقام کا حق ان کو اسی دنیا کی

زندگی میں ادا کرنا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے ان جذبات و احساسات کا کچھ اظہار جلالۃ الملک سعود کے سامنے بھی کیا تھا، تو انھوں نے میری باتیں سن کر فرمایا کہ

بلاشبہ یہی حکمت حقیقی تو یہی ہے'۔

اور واقعی اس کے سوا دوسری اور کوئی حکمت میرے تصور میں نہیں آسکتی۔

جب میرا خیال انڈونیشیہ کے آٹھ کروڑ، چین کے پانچ کروڑ، ملایا، سیام اور برما کے کئی کروڑ، پاکستان کے تقریباً دس کروڑ، مشرق اوسط کے دس کروڑ سے

کچھ زیادہ، پھر روس کے چار کروڑ اور ان سب کے علاوہ دنیا کے دور دراز گوشوں میں پھیلے ہوئے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کی طرف جاتا ہے اور جب میں یہ تصور

کرتا ہوں کہ یہ سارے کے سارے ایک ہی ایمان کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں، تو مجھے اس زبردست قوت، صلاحیت اور امکانات کا بڑی شدت سے

احساس ہوتا ہے جن کا روبہ عمل آنا ان تمام مسلمانوں کے باہمی اتحاد و تعاون سے یقیناً ممکن ہے —— ان کا یہ اتحاد و تعاون اگرچہ اپنے اپنے ملکوں

کی قدرتی وفاداری کے حدود سے تجاوز نہ کریگا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے لئے اور ان تمام دینی بھائیوں کے لئے لامحدود قوت کا ضامن ہو سکتا ہے۔

میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ آج ایک کارنامہ، ایک کردار بڑی بے چینی سے اس سورما کی راہ دیکھ رہا ہے جو اسے انجام تک پہونچائے ......

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے!——

تو یہ وہی دور، وہی کارنامہ اور وہی کردار تھا جو ابھی آپ کے سامنے پیش ہوا، میں اسی کے خد و خال تھے جن کا تذکرہ ہوا۔

اور یہ اسی کردار کا اسٹیج ہے جس کی اتنی تفصیل عرض کی گئی ۔ ...

لیکن زمان و مکان اور ماحول کے تقاضے کو پوچھئے تو پھر ہم ہی ہیں جو اس کارنامہ و کردار کو انجام تک پہونچانے کے لئے اٹھ سکتے ہیں آگے بڑھ سکتے ہیں۔

بقیہ از صفحہ ۸

اس مسلک کی تائید اپنے کئی اشعار میں کی ہے فرماتے ہیں کہ قدرت اپنے جمالِ جہاں آرا کا مشاہدہ کر رہی۔ یہ مشاہدہ ہی کائنات ہے ۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

جبکہ مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے اتنا ہی وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

کوئی تجھ بن اگر نہیں موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

مگر آگے چل کر ان کے اس نقطۂ نظر میں ایک لطیف تبدیلی نظر آتی ہے اور ہمہ اوست، ہمہ از اوست معلوم ہوتا ہے ۔

حدِ ادراک سے باہر ہے ہمارا مسجود ٭ لوگ قبلہ کو عبث قبلہ نما کہتے ہیں

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ٭ ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

یہاں مسلک وحدت وجود و وحدت شہود کی تشریح و تفصیل منظور نہیں عرض کرنا یہ تھا کہ فلسفی پیر مغاں جن کی صحبت اور اق نے تراشے ہیں وہ واقعہ

میں غالب کی فکر کو ان کے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں۔

مولانا حامد حسن قادری

گم شدہ اشعار

مہر نیمروز کے پچھلے پرچے میں بے پتہ اشعار کے متعلق ایک مضمون دلچسپ تھا (اس وقت وہ پرچہ اور مضمون سامنے نہیں ہے) بعض اشعار کے حوالے، پتے لکھے تھے۔ اور بعض کے دریافت کئے گئے تھے۔ ان میں سے دو کے پتے مجھے معلوم تھے۔ اور آپ کو لکھنا چاہتا تھا مگر آج سے پہلے نوبت نہ آئی۔

ایک شعر دریافت طلب یہ تھا: ؎

اب تو آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے۔

یہ شعر شاہ عالم بادشاہ آفتاب تخلص کا ہے۔ بادشاہ نے یہ قطعہ کہا تھا:۔

شب دل آرام سے گزرتی ہے　　صبح اٹھ جام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے　　اب تو آرام سے گزرتی ہے

زبانِ خلق نے دوسرا شعر لے لیا اور مصرعوں کی ترتیب درست کر دی یعنی پہلے "اب" پیچھے "عاقبت"۔

دوسرا شعر یہ تھا:۔

خدا کی دین کا موسےٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

اس شعر کا حوالہ "داستان" ہے، بڑی دلچسپ، بہت طویل جس کو شاید اب میرے علاوہ کوئی مشکل سے بتا سکے۔ اس میں بھی زبانِ خلق نے [illegible] کیا ہے۔ یعنی کہنے والے نے یوں کہا تھا:۔

خدا کی دین کا موسےٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری ہو جائے۔

پہلے اس طرح بھی کہتے تھے۔ "اس کی نوکری ہو گئی" "اس کی نوکری ہو جائے" لیکن اب "مل جانے" ہی بول چال میں ہے۔ اسی طرح شعر مشہور ہو گیا۔

میرے پاس ایک قدیم مطبوعہ کتاب ہے جس میں شاعر نے صرف اسی زمین میں اسی قافیہ کے پہلو بدل بدل کر تقریباً ڈیڑھ سو شعر کہے ہیں۔ کتاب کا نام کچھ نہیں۔ بلکہ سرورق پر کتاب کے نام کی جگہ خطِ طغرا میں شاعر کا نام لکھا ہے جس میں کاتب نے طغرائی آرائش کے شوق میں نام کا ایک جزو لکھنے سے وشکیلا ہے بہرحال اتنا صاف پڑھا جاتا ہے:۔

"نواب امین الدولہ سیف الملک سید — علیخان بہادر فیروز جنگ دام اقبالہٗ"

کتاب مطبع محمدی میں چھپی ہے۔ معلوم نہیں یہ مطبع کہاں کا ہے۔ سال طباعت بھی کہیں درج نہیں۔ شاعر، تخلص مہر ہے ۱۲۵۱ھ کے بعد کتاب

کے دوسرے صفحہ پر۔ "سبب طبع ریختۂ کلک ناظم"۔ فارسی میں حسب ذیل لکھا ہے :۔

"طبع این اشعار بے مقدار صرف از اصرار جناب عالی صاحب قبلہ و کعبہ دبیر الدولہ دلاور الملک مرزا محمد علی خاں بہادر فیروز جنگ عرف مرزا حیدر صاحب کہ شفقت و عنایت بندگانہ بر حال آں کمترین فرمایند۔ نہ بعیدنہ ازراہ تعلّی و خود ستائی"

اس کے بعد دو صفحوں پر مخمس غزل جامی ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے :۔

عارض ست این یا قمر یا لالۂ حمراست این
یا شعاع شمس یا آئینۂ دل ہاست این

مخمس بھی فارسی میں لکھا ہے۔ اس کے بعد گیارہ صفحوں پر "پھیری ہو جائے" والی غزل ہے۔ کل ۱۶ صفحے کی خوشخط۔ جلی قلم، رنگین کاغذ کہ شاعر نے قافیہ کی روی (ری) سے پہلے زبر۔ زیر۔ پیش تینوں حرکتوں کے اشعار الگ الگ لکھے ہیں۔ مگر نتیجہ وہی ہے جو پُر گوئی کا ہوتا ہے کہ ڈھیر اشعار میں اگر کوئی شعر ہے تو وہی (خدا کی دین) والا۔ باقی سب قافیہ پیمائی ہے۔ عجیب و غریب کچھ اچھی کچھ بری۔ بہر حال بعض اچھے یا "غنیمت" اشعار یہ ہیں :

(حرف ساکن قبل روی)

جو روشنی تری آنکھوں کی پیش چشم نہ ہو — جہان اخلق کی کاجل کی کوٹھری ہو جائے
جو راستہ چلو اس نور اس شکوہ کے ساتھ — تو کوہ طور ابھی ایک ایک کنکری ہو جائے

(حرف مضموم قبل روی)

جو میرے گھر تک کبھی میل سواری ہو جائے — نکیلی وضع مرے واسطے چھری ہو جائے
بھلا تو اپنے مقدر کی صاف ہم سمجھیں — جو آئینہ سے طبیعت تری بُری ہو جائے
جسے برا لگے آشنہ تمہارے ماتھے کا — وہ اس کی جان کو قرآن کی چھری ہو جائے

(حرف [illegible] قبل روی)

تمہیں وہ بیٹھے فیصلہ کر حسن کے حضور — چمک تمام تماشی کی کرکری ہو جائے
جو مدحتیں قد بالائے یار کی لکھیں — بلند مرتبۂ فن شاعری ہو جائے
گرا کے دیکھ دل خستہ اپنی آنکھ سے تو — عجب نہیں جو یہ بادام کی گری ہو جائے

(حرف مفتوح قبل روی)

جو ذرّوں پر نظر مہر گستری ہو جائے — تو فرش ریگ لداں بستر زری ہو جائے
نظارہ بازوں کے ناز نگہ نہ آئے دوں — نگاہ بیانوں میں پری جو نوکری ہو جائے
پڑے جو عکس ترے گھانس کے دوپٹے کا — تو گھاس میں صفت سبزہ گستری ہو جائے

(باقی ص[illegible] پر)

ڈاکٹر ہوش عظمی

تاریخ مثنوی پر ایک طائرانہ نظر

اصنافِ سخن میں مثنوی بھی ایک جامع اور مکمل صنفِ سخن ہے۔ اس میں اصنافِ سخن کے وہ تمام نمونے موجود ہیں جو شاعری کے دوسرے اقسام میں پائے جاتے ہیں۔ آپ اس میں قصیدے کی تشبیب پائیں گے۔ اس میں غزل کا سوز و گداز موجود ہوگا۔ حسن و عشق کے محاکات و معاملات پر نظر ڈالی گئی ہوگی۔ ساقی نامہ ہوگا۔ اور رندانِ قدح آشام کا نائے و نوش۔ محفل کی سرود آرائیاں اور سرکش کی پیغام رسانیاں آپ کو اس میں ملیں گی۔ جشنِ طرب کے ہنگامے اس میں دکھائی دیں گے۔ غرض یہ کہ نگارستانِ سخن کے دلکش نظارے آپ کی چشمِ بینا کے لئے محیط ملیں گے۔ مثنوی کو وہ امتیازی خصوصیت حاصل ہے جو واقعہ نگاری کی جان کہی جاسکتی ہے۔ اس کا اسلوب دیگر اصنافِ نظم سے بالکل نرالا ہے۔ اس میں جس گوشہ نظر سے نگاہ ڈالی جائے گی وہ جمیع افکارِ سخن پر محیط نظر آئے گا۔

مثنوی کا لفظ اگرچہ عربی زبان کا لفظ ہے لیکن اہلِ عرب نے اس صنف میں کوئی ایسا نمونہ پیش نہیں کیا جسکو فارسی اور اردو کی مثنویوں کا حریف سمجھا جاسکے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ عربی ادب میں مثنوی وجود پذیر ہی نہیں ہوئی لیکن عجم خصوصاً اہلِ ایران نے اس صنف میں خوب زورِ قلم دکھایا ہے۔ غرض قصص و حکایات کے رنگ میں ایسی ایسی نیرنگیاں دکھائیں اور ایسے ایسے حقائق و معارف کے دریا بہائے جن کا ایک ایک قطرہ غواصِ سخن کے لئے گوہرِ بے بہا سے زیادہ قیمتی ہے۔ فلسفۂ اخلاق کو اجاگر کرنے والی کتاب گلستاں و بوستاں کے سوا شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جو شاہنامۂ فردوسی یا مثنوی مولانا روم کے مقابلے میں پیش کی جاسکے۔

مثنوی کی اس وسیع دامنی اور آسانی کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اس کا ہر شعر ایک بیت ہوتا ہے جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہونے کی وجہ سے لفظی و معنوی دونوں حیثیتوں سے ایک خاص توازن رکھتے ہیں۔ اس میں یہ پابندی نہیں کہ پوری نظم ایک ہی قافیہ کے محدود دائرے میں منسلک ہو اس میں اشعار کی بھی کوئی تعداد محدود نہیں۔ اس آزادی نے دوسرے مقبول اصنافِ سخن سے مثنوی کو فوقیت کا مرتبہ بخشی۔ اس کی شرح یہ ہے کہ آپ کو اس کے اندر رزمیہ، عشقیہ مضامین اور تصوف و فلسفہ کے نکات اور واقعہ نگاری کی تصویریں سبھی کچھ مل جائیں گی۔

مولانا شبلی کی تحقیقات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اس کا سب سے پہلا موجد متعین نہیں کیا جاسکتا تاہم اس کی ایجاد کسی سے منسوب کی جاسکتی ہے تو وہ رودکی ہی ہونا چاہیئے کیونکہ فارسی ادب میں رودکی سے پہلے کسی مثنوی کا وجود ثابت نہیں ہوتا۔ رودکی ہی نے کلیلہ و دمنہ کا قصہ لکھا جو نصر بن احمد کی فرمائش کی بنا پر ضبطِ تحریر میں آیا۔ یہیں سے مثنوی کے ایک صنفِ سخن ہونے کی بنیاد پڑتی ہے کیونکہ رودکی کے بعد متعدد ایسی مثنویاں لکھی گئیں جن میں رودکی کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ بابائے مثنوی فردوسی سے پہلے تک فارسی میں مثنویوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ مہیا ہو چکا تھا۔ مثنوی کا سب سے پہلا اور بہترین نمونہ فردوسی نے پیش کیا بلکہ اگر یوں بھی کہا جائے کہ فردوسی کی مثنوی، مثنوی کا آخری نمونہ بھی ہے تو بیجا نہیں۔ اس کے بعد مولانا نظامی گنجوی نے اس صنف کے اندر وہ زورِ قلم دکھایا جس کو اہلِ ادب سکندرنامے کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ فلسفۂ اخلاق و مذہب پر روشنی ڈالنے والی کتاب گلستاں و بوستانِ سعدی سے پہلے اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ مثنوی مولانا روم ہے اور حق تو یہ ہے کہ مولانا روم نے گویا کہ مثنوی کو ایک نیا جنم دیا۔

شاعری کی ایک بڑی خصوصیت الفاظ کا حسنِ ترتیب اور بیانِ معنی کی سلیقہ مندی ہے اور یہ چیز مثنوی کی اولین شرط ہے۔ یہ ساری کی ساری واقعاتِ

...نجام اور غیر مرتب واقعات کا ایک خاکہ کھتا ہے۔ یہی وہ ایک مصالحہ ہے جو شاعر کے ہاتھ آگیا۔ شاعر اسی ہیولائی مواد سے ایک ٹھوس جسم تیار کرتا ہے
...ری کی شکل میں وجود پذیر ہوتا ہے اس میں ایک کامیاب شاعر کو بڑی کاوش سے واقعات پریشاں کو ترتیب دینی پڑتی ہے۔ دیکھنا پڑتا ہے کہ آغاز انجام سے
...رح پیوست ہوا اور سطحی واقعات سے نظر گزراں ہو کر اصل واقعہ تک کس طرح فکر کی رسائی ہو سکتی ہے۔ اور واقعات کی ترتیب کس ڈھنگ سے ہونی چاہیئے۔ تناسب
...ن کا کیا معیار ہو۔ سانحات و حادثات کی کڑیاں آپس میں کہاں فطرتاً ملتی ہیں اور کہاں ٹوٹتی ہیں۔ خیالات کا انعکاس واقعات پر دکھانا چاہیئے۔ اور کن امور کو ابھار
... تاریخ میں دھندلا کہاں ہے اور واقعات کی روشنی کس رخ پر ہے۔ شاعر کو اس تخیل سے کام لینا پڑتا ہے جو واقعات کے موقف پر ٹھیک ٹھیک اپنا محل
...۔ واقعات سے شدنی نتائج پر گہری نظر رکھے۔ اگر اس کاوش میں اخلاقی پہلو نظر انداز ہو گیا تو پھر شاعر کی مثنوی ناکام ہے۔ لیکن یہ ملحوظ خاطر رہے کہ شاعر
شاعری تو ہے۔ فرضی باتیں پیدا کر لینا بھی اس کا ایک خوشگوار فریضہ ہے اس لئے وہ صرف تاریخی واقعات کو پھیلاتا ہے کہ واقعات کی ٹوٹی ہوئی کڑیاں آپس
...سل و متناسب ہو جائیں۔ اس کو قصداً ایسا کرنا پڑتا ہے اس لئے کہ بات میں بات پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ واقعات کے اداکاروں کے جذبات کو موقع بہ موقع نبھانا
...ہے۔ اگر وہ اس سے عہدہ برآ ہو گیا تو سمجھ لیجئے کہ وہ حسن ترتیب میں کامیاب ہو گیا۔

یہ تو مسلم ہے کہ اردو کی ابتداء نثر سے ہوئی لیکن ادب اردو کی ابتدا کا سہرا نظم کے سر ہے۔ اردو کا ادب اتنا مقبول ہوتا ہی نہیں اگر نظم اس
...ے کے بہترین اداکار کی خدمت انجام نہ دیتی۔ یہ بات بلا اختلاف ثابت ہے کہ اردو شاعری میں سب سے پہلی قسم مثنوی کی ملتی ہے۔ جنوبی ہند یعنی دکن
...وہ خطہ ہے جہاں دیگر اقسام نظم و نثر کی طرح مثنوی کی ابتدا بھی ہوئی۔ دکن کی زبان شمالی ہند کی زبان نہ تھی برج بھاشا اور سورسینی کے ملاپ سے
...ں کی پیدائش نہیں ہوئی بلکہ تامل، تلنگو، مرہٹی اور کنڑی زبانوں کے اتحاد کا نتیجہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ انداز بیان شمالی ہند کے لئے عرصے تک اجنبی سا
...لیکن دکن کی زبان کو اس وقت بھی اردو کے سوا دوسرا لقب نہیں دیا جا سکتا تھا۔ قطب شاہی و عادل شاہی حکومتوں کا عروج دکن میں سلطنت بہمنیہ کے
...مد ہوا۔ ملکی زبان خصوصیت کے ساتھ اسی زمانے میں رائج ہوئی۔ اسباب کمال و اہل علم کے پیش نظر گولکنڈہ و بیجاپور کے دربار تھے اور وہ اس سرزمین
...چشمۂ شیریں سمجھ کر مرغ و مور کی طرح جمع ہوتے رہے اور سخن گستری و طبع آزمائی کی داد صدیوں تک دیتے اور لیتے رہے۔ سینکڑوں مثنویاں اہل دکن
...سخن آفرینیوں کی یادگار ہیں "یورپ میں دکنی مخطوطات" کے نام سے نصیر الدین ہاشمی نے جو کتاب لکھی ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صرف قطب شاہی عہد
...میں انیس مثنویاں لکھی گئیں۔ اور عادل شاہیوں کے زمانے میں نو مثنویاں زیر قلم آئیں۔ یہ مثنویاں ہندوستان اور انگلستان کے کتب خانوں میں اب تک
...پائی جاتی ہیں۔ قطب شاہ محمد امین قطب شاہ مولانا نصرتی اور علی عادل شاہ اس دور کے مشہور مثنوی نگار ہیں۔ ان شعراء کے بعد عہد عالمگیری آیا۔ "من لگن"
نامی ایک مثنوی خواجہ محمود بحری نے لکھی اور سراج اورنگ آبادی نے "بستان خیال" لکھ کر اس صنف سخن میں خیال آرائی کا حق ادا کیا۔

اس کے بعد دلی میں اردو شعراء کا پہلا دور شروع ہوتا ہے۔ شاہ مبارک آبرو نے محمد شاہی دور میں کئی مثنویاں لکھیں۔ مثنوی "مواعظ آرائش معشوق" ایک قابل انتخاب مثنوی ہے۔ عالم شاہ کے زمانے میں ساقی نامی ایک شاعر نے شاہنامہ لکھنے کا کام اپنے ذمہ لیا یہ مثنوی ایام خلافت کے واقعات تک پہونچ کر رہ گئی۔ میر و سودا نے بھی چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں جو ان کی کلیات میں شامل نہیں۔ میر درد کے بھائی خواجہ میر اثر نے "خواب و خیال" کے نام سے ایک مثنوی لکھی۔ عوام میں یہ مثنوی بہت پسندیدہ رہی۔

شاعری کا تیسرا دور اگرچہ مثنوی کے لحاظ سے ہمت شکن اور حوصلہ فرسا تھا۔ تاہم انشار کی مثنویاں اور جرأت کی ایک مبسوط مثنوی خواجہ حسن
...نے اس خلا کو بھی پر کر دیا۔ مصحفی نے بھی "بحر المحبت" نام سے ایک مقبول مثنوی لکھی جو میر تقی میر کی مثنوی "دریائے عشق" کا ایک دوسرا قالب ہے۔ اس
دور میں مثنویوں کی بہتات تو نہیں رہی۔ لیکن میر حسن کی مثنوی "بدر منیر" "سحر البیان" نے اس کمی کو پورا کر کے صنف مثنوی میں چار چاند لگا دیا۔

اس کے بعد لکھنؤ کے شعراء کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس تبیع کے امام شیخ ناسخ تھے ۱۰ کی غزلوں کے دو دیوانوں سے قطع نظر ایک مبسوط مثنوی بھی سرمایۂ
ادب ہے جو "حدیث مفضل" کے ترجمے میں "نظم سراج" کے نام سے لکھی گئی یہ اگرچہ غیر معروف ہے۔ لیکن اس کی بندشیں چست ہیں۔ زبان شستہ ہے۔ اور

الفاظ کی صحت جو ناسخ کا طرۂ امتیاز ہے خصوصیت سے نمایاں ہے۔ آتش نے کوئی مثنوی نہیں لکھی لیکن ان کے قابل فخر شاگرد پنڈت دیا شنکر نسیم نے مثنوی "گلزار نسیم" لکھ کر اس صنف سخن میں ایک اچھا اضافہ کیا۔ گلزار نسیم اور سحر البیان یہی دو مثنویاں ایسی ہیں جن کا جادو سر پر چڑھ کر بولتا ہے اور کسی غیر کو اس کی داد سخن دے کر پردہ کھولنے کی ضرورت سے مستغنی کر دیتا ہے۔

اگرچہ دلّی میں بھی اس صنف سخن کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی گئی لیکن مومن کی سات مثنویاں جن میں اکثر آپ بیتی سمجھی جاتی ہیں گو یا مثنوی پر اختتامی مہر ہیں اور آپ بیتی کے لحاظ سے محاکات کی آپ اپنی نظیر ہیں۔ لطف بیان ایسا ہے کہ مضامین شربت کے گھونٹوں کی طرح دل میں اترتے جاتے ہیں۔ اس دور کے بعد تعشق لکھنوی نے "طلسم الفت" مثنوی لکھ کر حق شاعری ادا کیا۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں نواب مرزا شوق نے "زہر عشق" اور "بہار عشق" لکھ کر نجوم مثنوی کو تابندگی بخشی۔

سلطنت مغلیہ نے جب کروٹ بدلی اور زوال کے پہلو پر آرام لیا تو یہ رہی زمانہ تھا جب کہ اردو کو فروغ حاصل ہوا۔ واجد علی شاہ کی عزلت گزینی کے زمانے میں لکھنؤ کی شاعری نے خاص شہرت حاصل کر لی تھی۔ چونکہ بادشاہ کی طرح عوام کے لئے بھی عیش و نشاط کا دور دورہ تھا۔ بے فکری اور غفلت کا نشہ اب تک خمار آفریں نہ تھا۔ ہر گھر بزم سخن تھا اور ہر بزم سخن گھر یلو مسرت تھی۔ شاعری کے بوالہوس کے پاس بھی بساط سخن بچھی ہوئی نظر آتی تھی اور محض موزوں طبع شاعر بھی نغمہ سرائی کرتے نظر آتے تھے۔ ناسخ و آتش کے تلامذہ میں سینکڑوں ایسے ہیں جنھیں صاحب دیوان ہونے کا خطاب دیا جا سکتا ہے۔ خود جان عالم واجد علی شاہ نے بھی کئی مثنویاں لکھیں جن میں مثنوی "حزن اختر" خصوصیت سے قابل ذکر ہے جس میں ذاتی حالات اور خانگی معاملات اس طرح سپرد قلم ہیں کہ کوئی بھی درد مند دل بے چین ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور ٹھنڈے دل سے نہیں پڑھ سکتا۔ صبا و سحر نے بھی چھوٹی بڑی مثنویاں لکھی ہیں لیکن اس میدان میں شہرت زیادہ تعشق اور شوق کو حاصل ہوئی۔

آخری دور شاعری میں اسیر، تسلیم، امیر، داغ اور محسن کاکوروی کا نام فخر کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ امیر کی مثنویاں نعتیہ یا اخلاقی ہیں۔ فریاد داغ، داغ کی آپ بیتی مثنوی ہے۔ عام شہرت سے تو محروم رہی لیکن قابل قدر ہے۔ منیر و تسلیم نے بھی اس میدان کو نہایت پامردی سے طے کیا ہے۔ محسن کاکوروی نے نعتیہ مثنوی میں خوب شہرت حاصل کی اور نعتیہ مثنوی میں بلند پائے کے حقدار ثابت ہوئے۔

فارسی شعراء قدیم نے مثنوی کے لئے کوئی خاص بحر یا کوئی خاص وزن مقرر نہیں کیا لیکن نظامی گنجوی نے پانچ مثنویاں مختلف اوزان و بحور میں لکھی ہیں۔ نظامی کے اس حصر نے آنے والوں کے لئے یہ التزام کر دیا کہ مثنوی انہیں پانچ بحور کے اندر محصور ہو کر رہ گئی۔ نظامی کے اس خمسہ کی تقلید میں اکثر شعراء نے پانچ پانچ مثنویاں لکھی ہیں۔ لیکن سب نظامی کے سمند قلم کے پیچھے ہی رہے۔ البتہ اس میں امیر خسرو اور جامی اور شہسواروں سے بہت آگے ہیں۔ امیر خسرو کی ایجاد پسند طبیعت نے نظامی کے پانچ وزنوں پر اگرچہ تین وزن اور بڑھائے لیکن زیادہ تر نظامی کے پانچ اوزان ہی رواج پذیر رہے۔

چونکہ مثنوی کی کوئی خاص بحر مقرر نہیں اس لئے حفیظ جالندھری کے "شاہنامۂ اسلام" اور کوکب اورنگ آبادی کے "شاہنامہ اخلاق" کو بھی مثنوی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ان اوزان کے علاوہ کسی اور وزن میں مثنوی لکھنا ناجائز ہے۔ البتہ جن وزنوں کو مخصوص کیا گیا ہے۔ ان میں بہ نسبت دیگر اوزان کے دلکشی اور موزونیت و ترنم زیادہ ہے۔ مروجہ اوزان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) بحر سریع مسدس مطوی موقوف ..... مفتعلن مفتعلن فاعلات

دیدہ سمندر سے سوا ہو گیا   دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا   (رشک)

(۲) بحر خفیف مسدس مقطوع ..... فاعلاتن مفاعلن فعلان

صبح کو طائران خوش الحان   پڑھتے ہیں کل من علیہا فان   (شوق)

(۳) بحر ہزج مسدس اخرب محذوف ..... مفعول مفاعلن فعولن

جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے　　جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے　　(گلزار نسیم)

(۴) بحر ہزج مسدس محذوف ..... مفاعیلن مفاعیلن فعولن

جو کہتے ہو نہیں اب تجھ کو الفت　　بہت اچھا بہت بہتر نہیں ہے　　(رند)

(۵) بحر رمل مسدس مقصور یا محذوف ..... فاعلاتن فاعلاتن فاعلات یا فاعلان

پھر سر تنگ لالہ گوں غماز ہے　　رنگ رو پھر مائل پرواز ہے　　(مومن)

(۶) بحر متقارب مثمن مقصور یا محذوف ..... فعولن فعولن فعولن فعَل (یا فعول)

وہ مسند جو تھی مرجع دیا ئے حسن　　وہاں دیکھی اک مسند آرائے حسن　　(میر حسن)

(۷) بحر متقارب مثمن اثرم مقبوض مخبن ..... فاع فعولن فعلن فاع (یا)

فعلن فعلن فعلن فاع

سوئے عدم ہم جاتے ہیں　　آگے سے سرکو رستہ دو　　(اسیر لکھنوی)

بحر متقارب کے بتیس؟ اوزان ہیں جو بحر نمبر ۶ کے ساتھ مل کر آتے ہیں ان کے ارکان میں معمولی فرق ہوتا ہے پھر بھی وہ سب کے سب ایک زمرے میں آتے ہیں۔ ان کا باہمی اختلاف ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ تفصیلات کے لئے عروض کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

(بقیہ از صفحہ ۱۶)

قطعہ

انھیں کو حکم ہو سجدے کا اس کی قدر کرو　　جنھیں غرور بلندی و برتری ہو جائے

ملے زمین کو یہ رتبہ، خاکساری سے　　کہ مشت خاک کو اوج پیمبری ہو جائے

جواب کوئی نہیں، کس سے ہمسری ہو جائے　　بتو کہیں نہ خدا سے برابری ہو جائے

پڑے فلک پہ اگر رنگ جود وعدل ترا　　زحل قمر بنے، مریخ مشتری ہو جائے

مٹے ہوست شاخ امید زاہد خشک　　جو ابر عدل کا چھینٹا ابھی ہری ہو جائے

نہیں ہے حرص کہ زر دنام حاتم وقارون　　یہی دعا ہے کہ دل کو تو انگری ہو جائے

(نعت شریف)

جناب سے جو ہدایت نصیب ہوں گمراہ　　تو خضر غول سے خواہان رہبری ہو جائے

تو وہ نبی ہے۔ ترے عالمان امت کو　　عجب نہیں جو غرور پیمبری ہو جائے

غزل کا آخری شعر

خدا کی دین کا موسے سے پوچھئے احوال　　کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری ہو جائے

مقطع

بس اب وہ مقطع روشن ہو نور کلک بہر　　کہ زیب مطلع دیوان انوری ہو جائے

پروفیسر بیخود جعفری

تنقید نشاط رفتہ

(یہ تنقید ہے ڈاکٹر عندلیب شادانی کے مجموعہ کلام نشاط رفتہ پر اس سے پہلے ایک قسط مہر نیمروز میں شائع ہو چکی ہے)

صفحہ ۳۳ - کیا کروں میں جو درِ سعی طلب باز نہو ۔ ڈر ہے کچھ اور گماں دلشکن ناز نہو

سعی طلب کے لئے راہ کی ضرورت ہے ۔ در کی ضرورت نہیں ۔ اس لئے رہِ سعی طلب لکھنا چاہئے تھا ۔ مگر باز نہو کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے "در" کا لفظ اختیار کیا ہے ۔ لیکن راہ بھی تو بند ہوتی ہے اور کھلتی ہے ۔ اس لئے راہ کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے کہ "باز نہو" ۔ بہرحال "درِ سعی طلب" ضرور غلط ہے ۔

صفحہ ۴۴ کیا محبت کو مری تم نے ہوس سمجھا ہے ؟ کہ ہوئی یاس تو سرگرمی آغاز نہو !

ا۔ "سمجھے" کے فاعل کے ساتھ علامت فاعلی "نے" اب فصحا نہیں لاتے ۔ تم سمجھے ، ہم سمجھے ، میں سمجھا ۔ زبیدہ یہ سمجھی ۔ فصحا کی زبان ہے ۔ اس لئے پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہئے ؎

کیا محبت کو مری آپ ہوس سمجھے ہیں ؟ ۔

۲۔ شعر کا مضمون یہ ہے کیا تم نے میری محبت کو ہوس سمجھ لیا ہے کہ ابتدائے محبت میں جو امید باندھی تھی ۔ جب وہ منقطع ہو گئی اور مایوسی دل پر چھا گئی تو پھر دوبارہ امیدوں کی سلسلہ جنبانی شروع نہ ہو سکے ؟ اس لئے دوسرے مصرعہ میں کم سے کم "پھر" کے لفظ کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے ۔ لہٰذا دوسرا مصرعہ یوں ہونا چاہئے ؏ — کہ ہوئی یاس تو پھر کوشش آغاز نہو ؟ ۔

صفحہ ۴۵ - دل کا خون آنکھ میں کھنچ آئے تو کیا اسکا علاج ؛ نالہ رکنا تھا کہ یہ پردہ درِ راز نہو

آنکھوں میں کھنچ آئے زیادہ بہتر ہے ۔

صفحہ ۴۴ کہیں آگئی ضیمراں الخ "ضیمراں" بالاتفاق مذکر ہے ڈاکٹر صاحب نے بلاوجہ اس کو مونث بنا دیا ۔

صفحہ ۴۵ بنفشہ وسمن کہیں ، گل اور نارون کہیں ؛ بہار و یاسمن کہیں انار و نسترن کہیں ،

سمن اور یاسمن دو چیزیں نہیں ایک ہی چیز ہے چنبیلی ہی کو سمن بھی کہتے ہیں اور یاسمن بھی مگر اس شعر میں اس طرح یہ دونوں لفظ لائے گئے ہیں جیسے یہ دونوں دو پھول باہم متغایر ہوں ۔

صفحہ ۴۸ وہ قمریوں کے ہمہمے الخ ۔ "ہمہمہ" گھوڑے بیل ، ہاتھی یا شیر کی آواز کو کہتے ہیں ۔ مرزا اوج کہتے ہیں ؏ توسن کے ہمہمے نے منادی بپا کی ۔ قمریوں کی آواز کو ہمہمہ کہنا عجیب و غریب بات ہے ۔ اگر قمریوں کے زمزمے کہتے تو مناسب ہوتا مگر ڈاکٹر صاحب زمزمے کا لفظ دوسرے مصرعہ میں لا چکے تھے ۔

اور چہچہا، زمزمہ اور قہقہہ کے سوا جو تھا الفاظ ان کو مل نہیں رہا تھا۔ اس لئے گانے، بیل، گھوڑے، ہاتھی اور شیر کے معنے بھی چھین کر قمریوں کے سپرد کر دیا۔
شعر اگر یوں ہو تو غالباً بے جا نہ ہوگا ؂

وہ قمریوں کے زمزمے ... کے چہچہے ٭ وہ طایروں کے طنطنے وہ بہوشوں کے قہقہے

طنطنہ: اصل ستار وغیرہ کی آواز کو کہتے ہیں مجازاً اور معنی میں بھی مستعمل ہے طایروں کی آواز کو ستار وغیرہ کی آواز سے کس قدر مشابہت ہے اسلئے طنطنہ کا لفظ بیجا نہ ہوگا۔

صفحہ ۵۸ " اتنے میں سنبھلا " اس کو پڑھنے والا یہی سمجھے گا کہ شاعر کہہ رہا ہے کہ " اتنے میں " یعنی اتنے عرصہ میں، اتنے وقفہ میں۔ جو بات اوپر بیان کی جو واقعہ پہلے بیان کیا گیا اس کے اثنا میں یا اس کے فوراً بعد۔ کوئی " سنبھلا " شاعر خود اپنے متعلق کہہ رہا ہے کہ " میں اتنے میں سنبھلا " یا کسی دوسرے کے متعلق۔ مگر یہاں کسی اور کے متعلق گمان نہیں جا سکتا۔ اپنے ہی متعلق شاعر کہہ رہا ہے کہ " اتنے میں میں سنبھلا " مگر یہ موقع اس کا نہیں کہ ضمیر متکلم کہ جو فاعل اور عمدہ کلام ہے محذوف کر دیا جائے۔ اس لئے " میں " محذوف ماننے میں ضرور دشواری محسوس ہوتی ہے۔

لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس پر حاشیہ چڑھایا ہے جس میں تحریر فرماتے ہیں کہ " لکھنؤ میں اس محل پر ' جب تک ' بولتے ہیں ر ــــــ ، تو کیا " اتنے میں " کی جگہ پر " جب تک " بولتے ہیں؟ ہرگز نہیں یقیناً صرف " اتنے " کو بلا ڈاکٹر صاحب نے یہاں " جب تک " کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اور یہ حاشیہ صرف " اتنے " پر ہے۔ اور " میں " یعنی ظرفیت والا حرف نہیں ہے۔ فی یا در کا ترجمہ بلکہ میں ضمیر واحد متکلم ہے ڈاکٹر صاحب نے " سنبھلا " کے فاعل ضمیر واحد متکلم کو حذف نہیں فرمایا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جب تک میں سنبھلا، وہ فیروزی ساری والی ڈاکٹر صاحب کی محبوبہ کترا گئی۔ ڈاکٹر صاحب خود لکھ رہے ہیں کہ اہل لکھنؤ اس محل پر " جب تک " کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو پھر ایک متعارف و مشہور محاورے کو چھوڑ کے ایسا دہقانی غیر معروف محاورہ انہوں نے استعمال کیا تعجب ہے۔ یہ بھی نہیں تحریر فرمایا کہ " اتنے " " جب تک " کے معنی میں کہاں کی بولی ہے۔ کیا دلی والے ایسا بولتے ہیں؟ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دلی والے بھی " جب تک " کی جگہ " اتنے " کبھی نہیں بولتے۔

فصل نالۂ دلنوش ٭ روز راگ رنگ

نالۂ دلنوش کے درمیان واو عطف ہے مگر راگ اور رنگ کے درمیان واو عطف نہیں۔ جس کی وجہ سے دونوں مصرعوں کا توازن قایم نہیں نظر آتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ " راگ " ہندی لفظ ہے اور " رنگ " فارسی اس لئے دونوں کے درمیان ترکیب عطفی بقاعدہ فارسی جائز نہیں اس لئے واو عطف سے احتیاط کی گئی تو پھر ' روز ' کی اضافت بقاعدہ فارسی اس " رنگ " ہندی لفظ کی طرف کس طرح جائز سمجھی گئی؟ جس کے نزدیک ' روز ' کی اضافت ' راگ ' کی طرف بقاعدہ فارسی جائز تھی۔ اس کے نزدیک " راگ " اور " رنگ " کے درمیان واو عطف کا لانا بھی ضرور جائز سمجھا جانا چاہئے۔

نہیں کہا جا سکتا کہ کاتب نے واو عطف چھوڑ دیا کیونکہ میرے سامنے " نشاط رفتہ " کا جو نسخہ ہے وہ ڈاکٹر صاحب کا تصحیح کردہ نسخہ ہے۔ اگر یہاں کاتب سے واو عطف چھوٹ گیا تھا تو ڈاکٹر صاحب ضرور واو عطف بڑھا دیتے۔

" راگ " کے لفظ کو بعض فارسی شعراء نے بھی استعمال کیا ہے۔ اس لئے میں اس پر اعتراض نہیں کرتا مگر " روز " کی اضافت " راگ " کی طرف بقاعدہ فارسی جائز سمجھی گئی تھی تو پھر راگ اور رنگ کے درمیان واو عطف کیوں نہیں لایا گیا کہ دونوں مصرعوں کا توازن قایم رہتا۔

صفحہ ۔۔ شوق تاشکیب ــــ دیدہ بازیاں

نظربازی' کے معنی میں 'دیدہ بازی' محتاج سند ہے

صفحہ ۷۷ میں "نظر" کا قافیہ "مستتر" لایا گیا ہے حالانکہ صحیح لفظ "مستتِر" ہے زیر کے ساتھ۔

صفحہ ۸۱ تیرے ہر انداز میں ایک دیویت کی شان ہے

"دیو" فارسی لفظ ہے۔ "دیوی" ہندی لفظ ہے "ی ت" کسی عربی ہی لفظ کے آخر میں لگا کر مصدر بناتے ہیں جیسے آدمیت، حکومیت، خاصیت وغیرہ فارسی یا ہندی الفاظ کو اس طرح مصدر نہیں بناتے۔ اس سے قطع نظر کرکے یہ اعتراض ہے کہ اس طرح مصدر بنانے میں "ی" کا مشدد ہونا ضروری ہے کیوں کہ فاضل اردو دانوں نے کیفیت" وغیرہ کو تخفیف کے ساتھ بھی استعمال کیا ہے۔

صفحہ ۸۴ یا ہوا نے چادر آبی میں شکنیں ڈال دیں ✤ یا کسی کی چھیڑ پر چین بر جبیں کوئی حسین

دوسرا مصرعہ بلا ناتمام ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ "ہے" کا لفظ محذوف ہے مگر ایسے حذف کی کوئی مثال اساتذہ کے کلام سے پیش نہیں کی جا سکتی۔ حذف و ذکر کے مواقع ہوتے ہیں۔ جو لوگ علم معانی سے باخبر ہیں وہ ذکر و حذف کے اصول کو سمجھتے ہیں اور جملے سے کسی رکن کو حذف کرتے ہیں تو اصول کے مطابق یہاں فعل ناقص "ہے"، "حسین" اس کا اسم ہے اور "چین بر جبیں" اس کی خبر۔ اور "کسی کی چھیڑ پر" اس خبر کا متعلق ہے۔ فعل ناقص کے بے قرینہ حذف سے یہ اسم و خبر اور اس کا متعلق سب بے سری فوج کی طرح منتشر ایک دوسرے کا منہ تک رہے ہیں۔

بہرحال ڈاکٹر صاحب کی یہ طویل نظم "صبح کی سیر جمنا کے کنارے" جو صفحہ ۸۱ سے صفحہ ۱۰۱ تک پھیلی ہوئی ہے ایک اچھی نظم ہے۔ جس سے ڈاکٹر صاحب کی طباعی، زندہ دلی اور مشق سخن کا ضرور پتہ چلتا ہے۔ اس لئے اس نظم کی داد ڈاکٹر صاحب کو نہ دینا سخت بے انصافی ہے۔

صفحہ ۱۰۴ "مخموریاں ہوا میں تبدیل ہو گئی ہیں"

تبدیل کا صلہ اردو میں بھی "سے" کے ساتھ ہے "شبنم ہوا سے تبدیل ہو گئی" محاورہ ہے۔ ایک چیز دوسری چیز سے تبدیل ہوتی ہے نہ کہ دوسری چیز میں۔ "میں" ظرفیت کا مفہوم پیدا کرتا ہے۔ "مخموریاں ہوا میں تبدیل ہو گئی ہیں" سے اتنا ہی معلوم ہوا کہ ہوا ظرف تبدیل ہے اس لئے یہ سوال باقی رہتا ہے کہ کس چیز سے تبدیل ہوئیں؟ یہ بھی واضح رہے کہ یہاں تبدیل معنی مصدری میں نہیں ہے بلکہ مبدّل اسم مفعول کے معنی میں ہے۔ جس طرح تصنیف بہ معنی مصنَّف تصویر بہ معنی مصوَّر مستعمل ہے۔

صفحہ ۱۰۹

شبنم کی روح چھڑکی ✤ پھولوں کی تازگی پر
نغموں کی سرخوشی لی ✤ اور شعریت کے نشتر

"نشتر" کا لفظ کس مناسبت سے لایا گیا ہے۔ اس کا پتہ نہ ملا۔ ہاں

واشگافاں ہے شبنم ✤ کلیوں کے زخم نو پر
نغمے کلیر و فارم ✤ اور شعریت ہے نشتر

اس طرح یہ بند ہوتا تو "نشتر" مناسب محل ہوتا۔ باقی رہی "واشگافاں" کی ترکیب تو ڈاکٹر صاحب کے شعروں میں کھپ سکتی ہے۔ اس لئے جہاں

...صاحب نے بہت سی نئی ترکیبیں ایجاد کی ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے۔ چنانچہ آپ اس کے بعد والے بند کے آخری مصرعہ میں دیکھئے ڈاکٹر صاحب نے "رنگنی" کے معنی میں "آمیز" استعمال فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں۔

حوروں کی مسکراہٹ ؎ آمیز کی مہک میں

"آمیز کرنا" "ملانے" کے معنی میں فصحا کے کلام میں آپ نہیں پائیں گے۔

صفحہ ۱۳۶ "انقلاب روزگار" والی نظم بھی اچھی ہے۔ مگر صفحہ ۱۳۶ میں

ہاتھ اٹھے اور تیری گردن میں حمائل ہو گئے ؎ تو نے سرخم کر دیا یا خود قضا را ہو گیا

اس شعر میں "قضا را" محض قافیہ کی ضرورت سے لایا گیا ہے اور بھدے طریقے سے آیا ہے۔

صفحہ ۱۴۴ اس صفحے پر ایک غزل شروع ہوتی ہے بغیر مطلع کی جو صفحہ ۱۴۹ پر ختم ہوتی ہے۔ سرسری طور پر دو مطلع بے ساختہ ذہن میں آگئے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ مطلع بے مثل ہیں مگر جب ذہن میں آگئے ہیں تو انہیں ڈاکٹر صاحب کی نذر کر دوں یہی بہتر ہے۔

بڑی بے چارگی کی زندگی ہے ؎ یہ میری زندگی بھی زندگی ہے؟

مرا جوان پر اس کی زندگی ہے ؎ ہماری یا تمہاری زندگی ہے؟

بہرحال ڈاکٹر صاحب کے اشعار اچھے ہیں بعض بہت اچھے۔

صفحہ ۱۵۵ سے صفحہ ۱۵۹ تک بغیر مطلع کی ایک غزل ہے۔ غالباً ڈاکٹر صاحب کی طبع وقاد غزل گوئی کے وقت مطلع بہم پہونچانے سے عاجز رہ جاتی ہے۔ بہرحال اس غزل کے قوافی 'صبا' 'جدا' وغیرہ ہیں اور 'جلنے' ردیف 'جانے' محاورے میں کبھی "کیا جانے" کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جیسے رسا رام پوری کا یہ مصرعہ ہے۔ "جانے کیا آئی ہے اس مرد خدا کے دل میں" اس طرح جانے کا استعمال عموماً ابتدائے کلام میں یا حکم ابتدا ہی میں ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد کوئی کلمہ استفہام ضرور آئے گا۔ یعنی کیا۔ کدھر۔ کہاں۔ کس۔ کون وغیرہ میں سے کسی لفظ کا اس "جانے" کے فوراً بعد یا دو ایک لفظ کے بعد آنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کلمہ استفہام کو تو سر مصرعہ پر رکھا اور "جانے" کو پائیں مصرعہ میں ڈال دیا۔ یہ ایک عجیب سی ترکیب ہے فرماتے ہیں۔ "تیرا کیا تبسم میں سحر تھا جانے"۔ لکھنا یوں تھا کہ "جانے کیا تبسم میں سحر تھا"۔ دیکھئے صفحہ ۱۵۵ اور صفحہ ۱۵۶ میں فرماتے ہیں "چاندنی میں بھی کیا بلا جانے" لکھنا یوں چاہئے تھا کہ "جانے چاندنی میں کیا بلا تھی" بلکہ فصاحت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ لکھتے "جانے کونسی بلا چاندنی میں تھی"۔ جب منسوب الیہ مذکور ہو تو "کیا بلا" کہنا فصیح ہے۔ جیسے "گو زلف کیا بلا ہے"۔ "شب غم بھی کیا بلا ہے"۔ مگر جب منسوب الیہ مذکور نہ ہو تو "کیا" کی جگہ "کونسی" کہنا چاہئے جیسے "چاندنی میں کونسی بلا ہے" "فرقت کونسی بلا ہے"۔ جو نہیں آتی وغیرہ البتہ ڈاکٹر صاحب کا یہ شعر ضرور مستحق داد ہے۔

"آہ کی قدر اشک کی قیمت ؎ کوئی غم ناشناس کیا جانے"

بشیر احمد بشیر

فیشن - ایک نفسیاتی مطالعہ

اگر آج بابا آدم، اماں حوا کو ساتھ لئے اچانک کہیں سے اٹھ کر اس دنیا میں دوبارہ نمودار ہو جائیں۔ جہاں اُن کو جرم کی پاداش میں پہلے ـــــ بہت پہلے بھیجا گیا تھا تو وہ اپنی اس پود کو جو مشرق سے مغرب تک کیڑوں مکوڑوں کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ اس عجیب وضع قطع انوکھی چال ڈھال اور نرالے رنگ روپ میں زندگی سے لطف اندوز ہوتے دیکھ کر یقیناً دانتوں انگلی دبالیں گے ـــــ یہ زرق برق پوشاک، منقش در و دیوار سے آراستہ اونچے اونچے مکانات، مچھلی کی طرح اٹھلاتی ہوئی موٹر کار انھیں عجائب عالم معلوم ہوں گی ـــــ

ہمیں ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں کہ حضرت انسان نے کب اپنے برہنہ جسم کو لباس سے ڈھانپنا شروع کیا یا کب وہ تنگ و تاریک غار کو خیر باد کہہ کر اپنے لئے ہوادار مکان تعمیر کرنے لگا اور کس وقت اس کی عقل میں یہ نکتہ آیا کہ غذا کے لئے آگ کی تپش بھی ضروری ہے ـــــ انسان کی ان ارتقائی منازل کے درمیان ایسی کوئی حد فاصل بھی نہیں کھینچ سکتے جس سے یہ معلوم ہو کہ فلاں خاص لمحے میں انسان نے اپنی وضع قطع بود و باش اور معاشرتی آداب میں یہ یہ تبدیلیاں پیدا کیں ـــــ ہمیں تو قدیم انسان کے متعلق سنی سنائی باتوں پر ہی ایمان لانا پڑتا ہے، ہمیں تو بتایا گیا کہ انسان ارتقاء کی اس منزل پر جہاں وہ آج گامزن ہے ہزاروں سال کی کاوش کے بعد پہنچا ہے ـــــ تاریخ بتاتی ہے کہ انسان شروع میں ـــــ بہت شروع میں جب غار اور درخت کی چھال سے نکل کر لباس اور مکان کی دنیا میں داخل ہوا تو ترقی کے میدان میں اس کی رفتار بڑی سست رہی، پھر آہستہ آہستہ اس نے ایک دوسرے سے میل جول بڑھانا شروع کیا۔ انسان کا معاشرتی دائرہ وسیع ہوتا گیا اب انسان ایک دوسرے کو سیکھنے سکھانے لگا لوگ اپنی وضع قطع میں سلیقہ برتنے لگے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا انسان کی ترقی کی رفتار بھی تیز ہوتی گئی۔ انسان سماجی اور اخلاقی قدروں کا پابند رہنے لگا پھر وہ وقت آیا جب دنیا کے دور دراز گوشے ایک دوسرے کے قریب کھسکنے لگے اور انسان نے تہذیب و تمدن کی دنیا میں بڑی تیزی سے قدم بڑھانے شروع کئے اور آج دنیا سکڑتے سکڑتے سمٹ سمٹا کر اتنی قریب آگئی ہے کہ اس کے ہر گوشے پر مرکز کا گمان ہونے لگتا ہے۔ انسان ترقی کی اس منزل پر پہنچ گیا ہے۔ جہاں سے اسے منزل مقصود اب بالکل قریب نظر آرہی ہے۔ اب دنیا کا کوئی گوشہ انسانی نظروں سے اوجھل نہیں رہا ہے۔ دنیا کے ایک سرے کا آدمی دوسرے سرے کے آدمی پر اپنے گہرے اثرات چھوڑتا ہے۔ اس دور میں انسان کا ایک دوسرے سے الگ تھلگ اور ایک دوسرے کے اثرات سے بے نیاز رہنا تقریباً ناممکن سا ہو گیا ہے۔ ایک معاشرے کا دوسرے معاشرے سے رابطہ ناگزیر ہو گیا ہے۔ فیشن بھی انسان کے اسی میل جول کا نتیجہ ہیں اور یہ گاہ بگاہ سماج میں رونما ہو کر متغیر ہوتے رہتے ہیں۔ فیشن کا اب انسانی زندگی میں اتنا دخل ہو گیا ہے کہ انسان زندگی کے ہر شعبے میں مروجہ فیشن سے تطابق کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس قسم کی وضع قطع اور چال ڈھال اختیار کرتا ہے جس سے دوسروں کی نظروں میں اس کا وقار بڑھ جائے۔ وہ پوشاک کے استعمال میں ہر ممکن طور پر نفاست سے کام لیتا ہے تاکہ اس میں کشش پیدا ہو۔ لیکن فیشن صرف لباس کی تراش خراش تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ انسان دوسرے ذرائع سے بھی اس کا اظہار کرتا ہے وہ کھانے پینے کے انداز، نشست و برخاست کے طور طریقوں، بولنے چالنے کے اسالیب میں بھی ایسا طریقہ برتتا ہے جو مروجہ فیشن کے مطابق ہو مکانوں کی ساخت

ن کی آرائش، فنون لطیفہ سے دلچسپی، ان سب پر فیشن کا اطلاق ہوتا ہے۔ اگرچہ فیشن کا اظہار زیادہ تر لباس سے ہی کیا جاتا ہے ـــــ پرانے وقتوں میں فیشن آہستہ آہستہ بڑھتے پھیلتے اور تغیر ہوتے تھے جس کی وجہ معاشرتی ربط کا فقدان اور ذرائع آمد و رفت کی عدم موجودگی تھی ـــــ لیکن آج کی اس ترقی یافتہ دنیا میں جس کی خشکی تری اور فضا میں حضرت انسان نے ذرائع آمد و رفت کا جال بچھا رکھا ہے فیشن آندھی کی طرح دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل جاتے ہیں۔

پیشتر اس کے کہ ہم فیشن کے نفسیاتی محرکات معلوم کرنے کی کوشش کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فیشن کی مختصر تعریف کی جائے تاکہ نفس مضمون کو زیادہ صحیح طور پر سمجھنے میں سہولت رہے۔

یوں تو فیشن سے تہذیبی امتیازی اوصاف کی وہ غیر منطقی مراد لیتا ہے جس سے رواج خود بدلنے کی اجازت دے گا بالفاظ دیگر فیشن وہ طرز معاشرت ہے جس کا ظہور افراد کے انفرادی تقاضوں کی وجہ سے ہوتا ہے اور معاشرہ اس نئے اظہار کی توثیق بھی کر دیتا ہے۔ فیشن ایک تغیر ہے جو معاشرے میں گاہ بگاہ رونما ہوتا رہتا ہے بے ثباتی اس کی بنیادی صفت ہے۔

یہاں یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فیشن کو ان الفاظ سے ممتاز کیا جائے۔ جن کو غلط طور پر فیشن کے مترادف سمجھا جاتا ہے ـــــ کبھی کبھی ہم فیشن کو رسم یا رواج کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں ان دونوں کے مفہوم میں فرق ہے ـــــ رسم یا رواج یا روایت معاشرتی کردار کی ایک مستحکم اور مستقل صورت ہے۔ جبکہ بے ثباتی اور تغیر جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں۔ فیشن کا خاصہ ہے۔ لیکن اس تغیر کے لئے معاشرے کی توثیق ضروری ہے۔ سماجی توثیق فیشن کی منطقی شرط ہے۔ دوسرے الفاظ میں فیشن معاشرے کے مسلمہ رواج سے ایک محتاط انحراف ہوتا ہے۔ ہم نے محتاط اس لئے کہا ہے کہ اس انحراف کے لئے سوشل منظوری ناگزیر ہے۔ فرد ایسا کوئی قدم نہیں اٹھاتا جسے معاشرہ کلیتہً نامنظور کرے۔ مدنی حیوان ہونے کی حیثیت سے اسے اپنا ربط بہرحال معاشرے سے قائم رکھنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فیشن کا اطلاق سماج کی انہیں اقدار پر ہوگا جن میں یہ صلاحیت یا لچک ہوگی کہ وہ نئے نئے روپ میں ڈھل سکیں۔ بالفاظ دیگر انہیں روایات سے انحراف کیا جائے گا جن میں تراش خراش اور کاٹ چھانٹ کی اہلیت ہوگی۔ فیشن اور رواج کے فرق کو یوں بھی ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ فیشن وہ رواج ہے جو ایک مسلمہ رواج سے انحراف کے پردے میں ظاہر ہوتا ہے ـــــ گنبز برگ نے فیشن اور رواج کے امتیاز کو بڑے اچھے الفاظ میں بیان کیا ہے وہ کہتا ہے کہ "معلوم ہوتا ہے کہ رواج کا تعلق معاشرے کے بنیادی لوازمات سے ہے۔ جبکہ فیشن زندگی کے کم اہم اور کم عمومی پہلوؤں کو متاثر کرتا ہے" ـــــ گنبز برگ کا بیان بادی النظر میں ذرا مبہم معلوم ہوتا ہے لیکن ذرا غور کرنے سے بات صاف ہے۔ اس کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ فیشن کی زد میں زندگی کے جو پہلو آتے ہیں۔ ان کا تعلق فرد کی بقا سے نہیں ہوتا۔ وہ فرد کی پسند سے متعلق ہوتے ہیں ـــــ پوشاک ایک سماجی اور حیاتیاتی مطالبہ ہے۔ اور لباس کا انتخاب انفرادی تقاضا ہے۔ اسے ہم دوسرے الفاظ میں یوں کہیں گے۔ کہ لباس ہم اس لئے پہنتے ہیں کہ یہ رواج میں داخل ہے۔ اور ایک خاص قسم کا لباس زیب تن کرنا فیشن کا مطالبہ ہوتا ہے۔ یہ فرد کا ذاتی تقاضا ہے ـــــ رواج ایک دباؤ اور مجبوری کی طرف اشارہ کرتا ہے جبکہ فیشن میں فرد کی ذاتی پسند کو دخل ہے۔ فیشن کی یہ خصوصیت ہے کہ اسے معاشرے کے چند لوگ اختیار کرتے ہیں اور جب پورا معاشرہ نئے فیشن کو اپنانے لگتا ہے تو فیشن فیشن نہیں رہتا ہے بلکہ رواج بن جاتا ہے۔ فیشن کے پھیلاؤ سے اس کی کشش میں کمی آنے لگتی ہے اور اس کا حسن ماند پڑتا جاتا ہے۔ اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کلیت اور وسعت فیشن کی موت ہے۔ دوسرے الفاظ میں جب کسی مروجہ فیشن میں یکسانی آجاتی ہے۔ کہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد وہ خاص وضع قطع اختیار کرنے لگتی ہے تو وہ طبقہ جس نے اس فیشن کو جنم دیا تھا۔ فیشن میں مزید تغیر رونما کر کے اپنی انفرادیت کو قائم رکھتا ہے۔

جس طرح ہم نے فیشن اور رواج کے فرق کو ظاہر کیا ہے۔ اسی طرح فیشن اور اسٹائل میں امتیاز کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اسٹائل یا اسلوب ایک فرد کی انفرادی ترجیح ہوتی ہے یہ اس کے کردار یا اظہار کا ایک خاص انداز ہوتا ہے جو اس فرد میں قائم رہتا ہے مثلاً کسی شخص کے بات کرنے کا کوئی خاص انداز ہوتا ہے۔ تو ہم کہتے ہیں کہ یہ اس کا اپنا اسٹائل ہے۔ بعض لوگوں کے سوچنے کا اسٹائل ہوتا ہے بعضوں کے لکھنے کا ـــــ منٹو کا اردو افسانہ نگاری میں

اپنا اپنا اسٹائل تھا تو اس پر ختم ہو گیا۔ فیض ہماری شاعری میں منفرد اسٹائل رکھتے ہیں۔ جس طرح فیشن پہلے سے رواج میں داخل ہو جاتا ہے اسی طرح اگر کوئی اسٹائل رائج ہو جائے تو وہ فیشن بن جاتا ہے۔

فیشن زیادہ تر آزاد سوسائٹی میں رائج ہوتے ہیں۔ محدود معاشروں میں فیشن کے بہت کم امکانات ہوتے ہیں۔ جہاں سماج کا دائرہ وسیع ہوتا ہے وہاں کہیں سے بھی افراد کو کوئی نئی اور عمدہ چیز نظر آتی ہے وہ اسے اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پابند اور محدود معاشروں میں اس کے برعکس ہوتا ہے —— آزادی فیشن کی شرط ہے —— قرون وسطیٰ میں یورپ میں شاہی افراد کے لباس سے ہی ان کے رتبے کا اظہار ہوتا تھا۔ ملکہ کا نقاب تاج سے آراستہ پیروں تک پھیلا ہوتا تھا، شہزادیاں بغیر تاج کا نقاب کمر تک پہنتی تھیں —— سترھویں صدی میں وہاں کا طول عورت کے سماجی رتبے کا مظہر تھا۔

قدامت پسندی اور فیشن کا اتصال تقریباً ناممکن ہے۔ جہاں قدیم روایات کی سرپرستی ہوگی۔ وہاں فیشن کی تاک جھانک بھی ممنوع ہے اور جہاں فیشن وہاں سے قدامت پسندی کا اخراج ناگزیر ہے۔ سرحد کے قبائلی علاقوں میں جہاں قدامت پسندی شدت کی آخری حدوں کو چھوتی ہے۔ فیشن کا داخلہ ناممکن ہے ابھی حال تک وہاں کے باشندوں کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی اجنبی سفید لباس میں ملبوس نظر آ جاتا تو بغیر کسی قسم کے استفسار کے اس کا لباس گولی کے ایک ہی نشانے رنگین کیا جاتا تھا۔

فیشن کی ایک بنیادی صفت یہ ہے کہ فیشن ایک دائرے کی صورت میں گردش کرتا رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر فیشن میں دوری تغیرات (CYCLIC CHANGES) رونما ہوتے رہتے ہیں۔ فیشن کے اس تغیر کو ہم چار مفروضوں میں سمجھنے کی کوشش کریں گے —— پہلے مفروضے کو لیجئے ایک چیز یا ایک شے جو ماضی میں "موجود" تھا حال میں اس میں "تغیر" رونما ہوتا ہے اور مستقبل میں اس کے "ختم یا فنا" ہونے کا امکان پایا جاتا ہے۔ لیکن ذرا غور کرنے سے یہ مفروضہ غلط ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اس طرح ماضی اور حال کے کلچر کا مستقبل کے کلچر سے کوئی رابطہ نہیں رہتا۔ دوسرے مفروضے کی صورت یہ ہوگی کہ ایک چیز ماضی میں تو موجود ہے لیکن حال میں "غائب" ہو جاتی ہے اور مستقبل میں پھر "موجود" ہوتی ہے۔ منطقی طور پر ہم اسے بھی تسلیم نہیں کر سکتے کیونکہ اس طرح حال کا رشتہ ماضی اور مستقبل سے بالکل ٹوٹ جاتا ہے تیسرے مفروضے کو لیجئے ایک شے ماضی میں تو موجود ہے لیکن حال میں غائب ہو جاتی ہے اور مستقبل میں متغیر صورت میں پھر رونما ہو جاتی ہے منطقوں کے نزدیک یہ بھی ناقابل قبول ہے کیونکہ اس طرح حال کا رشتہ ماضی اور مستقبل سے منقطع ہو جاتا ہے۔ اب چوتھی اور آخری صورت یہی ممکن ہو سکتی ہے کہ ایک چیز جو ماضی میں موجود تھی حال میں اس میں نمایاں تغیر رونما ہوتا ہے اور مستقبل میں یا تو اصلی یا کم و بیش متغیرہ صورت میں وہ چیز پھر ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔

یہ بات خاص طور پر دلچسپ بھی ہے اور قابل غور بھی ہے کہ فیشن میں کوئی نئی چیز جنم نہیں لیتی بلکہ پرانی اشیاء، پرانے رسم و رواج اور پرانی باتیں دوری تغیر کی صورت میں بار بار ظہور میں آتی رہتی ہیں۔ آج کل ہمارے یہاں کی خواتین جو لمبی قمیض اور چوڑے پائنچے کی شلوار پہنتی ہیں اسی کو لیجئے یہ دوری تغیر کا مظہر ہے۔ کچھ عرصہ پیشتر چست اور لمبائی میں چھوٹی قمیض اور تنگ اور مختصر شلوار پہننے کا فیشن رائج رہ چکا ہے اور اس سے پہلے ڈھیلا ڈھالا لباس استعمال کیا جاتا تھا جو دوبارہ قطع برید کے ساتھ فیشن کے روپ میں نمودار ہوا ہے۔ حالانکہ یہ دیہاتی لباس ہی کی ایک تراشیدہ صورت۔ اسی طرح ناخن بڑھانے کا فیشن آج پھر کچھ کم ہوتا جا رہا ہے —— مردوں کی قمیض سنگل کف سے دوہرے کف اور دوہرے کف سے پھر سنگل کف پر جا پہنچی ہے —— آج کل عورتیں جو برقعہ اوڑھتی ہیں اسی کو لیجئے۔ برقعے کی ساخت سے قطع نظر اس کے اوڑھنے کے انداز پر ہی صرف اگر آپ غور کریں تو اس میں آپ کو دائرے کی ایک تغیر پذیر صورت نظر آئے گی —— پہلے برقعہ پوش خواتین نقاب چہرے پر گرا کر چلتی تھیں جس کی مثال آج بھی بعض پرانی وضع کی خواتین میں ملتی ہے۔ پھر نقاب چہرے سے الٹ کر سر پر جا پہنچا اور اب سر سے کھسک کر دوبارہ چہرے پر آ گیا ہے۔ لیکن کچھ اس طرح کہ گال اور ناک تو اس کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ لیکن آنکھیں اپر شین روم کے سرجن یا پالی وڈ کی فلم کے نقاب پوش ڈاکوؤں کی طرح نقاب کی زد سے باہر رہتی ہیں اور شاعروں کی زبان میں بدستور ناوک اندازی اور جگر پاشی کے کام انجام دیتی ہیں۔ [illegible]

ز جنگ کی مثال سامنے رکھئے۔ ایک تو دوپٹہ اوڑھنے کا وہ طریقہ تھا جس میں سر سینہ وغیرہ دوپٹے سے ڈھانپ لیا جاتا ہے جسے بجل کہتے ہیں۔ پھر جب دوپٹہ سر سے ڈھلک کر گردن میں حمائل ہو گیا تو فیشن بن گیا۔ اور اب دوبارہ سر پر رسی نما صورت میں اس طرح جا پہنچا ہے کہ اس کے پلو جھولے کی طرح سینے پر لہراتے رہتے ہیں۔ کھانا کھانے کے طریقے کو لیجئے۔ پہلے کھانا کھانے کے لئے فرش پر دسترخوان لگایا جاتا تھا پھر کرسی میز کا دور آیا اور اب اعلیٰ پائے کی پارٹیوں میں بوفے اسٹائل پر کھانا پینا جاتا ہے۔ جس میں لوگ چلتے پھرتے ہوئے کھاتے پیتے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ تہذیب کے دور سے پہلے لوگ بیٹھ کر کھانا کھانے کی بجائے کھڑے ہو کر کھانا کھاتے رہے ہوں اور اب وہی صورت پھر گھوم پھر کر فیشن کے رنگ میں نمودار ہوتی ہے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ لبوں پر روغن جمانا ہو یا رخساروں پر غازہ لگانا۔ آنکھیں کاجل سے سیاہ کرنی ہوں یا ہاتھ حنا سے رنگنے یہ بالکل نئے فیشن نہیں ہیں بلکہ دوری تغیر کے اصول کے ماتحت آتے اور جاتے رہتے ہیں۔

آیئے دیکھیں کہ فیشن کے اس تغیر میں کونسے نفسیاتی محرکات عمل پیرا ہوتے ہیں ـــــ فیشن در اصل ہمارے غیر عقلی اور جذباتی میلانات اور جبلی خواہشات کی پیداوار ہوتے ہیں ہم فیشن اختیار کرتے وقت انہیں عقل کی کسوٹی پر نہیں کستے۔ بلکہ جذبات کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کا منطقی ربط نہیں ہوتا۔

انسان معاشرے کی یکسانی سے اکتا کر اس کی قدیم روایات سے انحراف کرتا ہے۔ لیکن منحرف ہوتے وقت وہ سماج سے اپنا ربط قائم کرنا نہیں چاہتا بلکہ کوشش کرتا ہے کہ سوسائٹی سے اس کا ربط قائم رہے نہ صرف قائم رہے بلکہ اسے سوسائٹی میں ایک ممتاز مقام بھی حاصل ہو۔ فیشن فرد کا فطری تقاضا ہے لیکن اس تقاضے کی تکمیل کے لئے وہ سماج کی منظوری ناگزیر خیال کرتا ہے بالفاظ دیگر فرد یہ چاہتا ہے کہ اس کی خواہش تسکین بھی پائے اور تسکین پانے کے اس وسیلے کی سماج توثیق بھی کرے۔ جب ہم کوئی نئی تنظیم و ترتیب اور وضع قطع اختیار کرتے ہیں تو یہ ہماری فطرت کا تقاضا ہوتا ہے۔ لیکن یہ وضع قطع اختیار کرتے وقت ہم سماج کی نظروں میں معتوب نہیں ہونا چاہتے۔ سماجی توثیق فیشن کی ایک منطقی شرط ہے۔

سماج سے انحراف اور سماجی توثیق کا بیک وقت ہونا بڑی عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن یہی بات جو بظاہر متناقض معلوم ہوتی ہے فیشن کا باعث ہے۔ فیشن میں Paradox کا ہونا ضروری ہے۔ فیشن میں سماج سے بالکل بغاوت نہیں ہوتی بلکہ افراد معاشرے کے اندر رہ کر اپنی انا کی تسکین کے لئے نئی نئی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم سماجی قوانین کی پابندی کرتے ہوئے ان سے انحراف کرتے ہیں۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ افادیت کو فیشن میں مطلق دخل نہیں ہوتا۔ فیشن کی بنیاد افادیت پر کبھی نہیں رکھی جاتی۔ اگر ہمیں کسی فیشن کے اختیار کرنے میں کوئی معاشی افادہ حاصل ہوتا ہے تو یہ محض ایک اتفاقیہ امر ہوتا ہے ورنہ فیشن جذبات کے غلام ہوتے ہیں۔ ان کی بنیاد انانیت اور لاشعور پر ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے یہاں کی عورتوں میں چست اور ہلکی پھلکی پوشاک کا فیشن چلا تھا۔ چست لباس سے چونکہ جسم کے خطوط واضح طور پر ابھر آتے ہیں۔ اس لئے مذہبی لوگوں کی طرف سے جب اس وضع قطع کو ناشائستہ قرار دیا گیا۔ تو فیشن پرست طبقہ نے جواب میں یہ جواز تلاش کیا کہ چست لباس کی ساخت پر کم کپڑا صرف ہونے کی وجہ سے معاشی طور پر کفایت ہوتی ہے حالانکہ یہ مالی بچت محض اتفاق ہے۔ فیشن کا افادیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ فیشن ایک غیر عقلی اظہار فطرت ہے۔ فیشن کا دارومدار عقل پر نہیں جذبات پر ہوتا ہے۔ فیشن سے خواہش کی تسکین ہوتی ہے۔

فیشن سے معاشی افادہ نہیں۔ ذہنی لذت حاصل ہوتی ہے جب کراچی کا کوئی رئیس اپنی عالیشان رہائش گاہ کی تعمیر کے وقت کنٹریکٹر سے یہ خواہش ظاہر کرتا ہے کہ مکان کا زینہ کچھ اس وضع قطع کا بنایا جائے جس کی نظیر کراچی کے کسی بنگلے میں نہ ہو اگرچہ معاوضہ ادا کرتے وقت وہ پیچ و تاب ہی کیوں نہ کھا جائے لیکن ذہنی لذت کے حصول کی خاطر وہ معاشی افادے کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

بعض اوقات تو فیشن اختیار کرتے وقت ذہنی لذت بھی نہیں ملتی بلکہ ایک طرح کا کرب ہی محسوس ہوتا ہے۔ مردوں کی ٹائی بالخصوص [illegible] کو لیجئے، شدید گرمی کے دنوں میں گلے میں پھندا سا ڈالنا ایک اچھی خاصی مصیبت ہے۔ لیکن پھر بھی ٹائی باندھی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ فیشن میں داخل ہے لہٰذا ہم زیادہ سے زیادہ

نت محض" ہی کہہ سکتے ہیں۔

فیشن صرف لباس تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں موجہ فیشن کا خیال رکھا جاتا ہے۔ نشست و برخاست اور بول چال کے طور طریقوں
ـا اپنے کو فیشن کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بعض دفعہ کچھ مخصوص اور برجستہ کلمات فیشن کا روپ دھار لیتے ہیں اور سماجی اجتماع میں ان
ستعمال باعث افتخار سمجھا جاتا ہے۔ بعض اوقات کچھ ایسے الفاظ جن کے چھپے چھپے مفہوم ہوتے ہیں۔ فیشن کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔

یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جو وضع قطع ہمیں ایک وقت میں زیدہ زیب نظر آتی ہو کسی دوسرے وقت میں بھی پرکشش معلوم ہو۔ جس طرح آج ہمیں ماضی کی اکثر وضع
یانوسی معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح اس کا بھی امکان ہے کہ آج جسے ہم فیشن کہتے ہیں کل مضحکہ خیز معلوم ہو۔ آج کل فرنگی عورتوں کا مروجہ ڈریس جس
سم کا تقریباً نصف حصہ عریاں رہتا ہے رائج ہونے سے پہلے اس کا تصور یقیناً مضحکہ خیز معلوم ہوا ہوگا ——— ہمارے یہاں کی لڑکیوں میں وہ
ـ کے کپڑے کی قمیض حال میں کافی مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ حالانکہ قمیض کی یہ بناوٹ اس پیوند لگی ہوئی قمیض سے مختلف نہیں ہے۔
ـ نادار طبقہ کی خواتین بحالت مجبوری استعمال کرتی ہیں۔ لیکن فیشن میں قدم رکھتے ہی یہ پیوند پرکشش نظر آنے لگا۔ پرانے وقتوں میں موٹی
ـہ، تھل تھل کرتی ہوئی عورتوں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اور آج کل ہلکی پھلکی، دبلی پتلی ساخت معیار حسن ہے ——— پہلے
ـانے پینے میں مہمان کا تکلف فیشن سمجھا جاتا تھا اور اب بے تکلفی نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ آج کل ضیافتوں میں جس بوفے اسٹائل کو باعث
ـر سمجھا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کل کھانے پینے کا یہی طریقہ مضحکہ خیز معلوم ہو۔

قدیم زمانے میں فیشن آہستہ آہستہ مروج اور متغیر ہوتے تھے جبکہ آج کل فیشن ہوا کے جھونکے کی طرح آتے اور گزر جاتے ہیں اس کی وجہ
ـعاشر کی سماجی کشش ہے۔ اس دور میں سماج کا ایک فرد دوسرے فرد کی جانب کھچا جاتا ہے۔ آج اس نے اپنے اندر وہ مقناطیسیت پیدا کرلی
ـہو دوسرے افراد کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

فیشن میں تغیر و تبدل کا انحصار مروجہ کلچر اور سماجی معیاروں پر ہوتا ہے جو اسے جلا بخشتے ہیں۔ کلچر کی متین اور پرسکون سطح پر ہمیشہ
ـبد نفسیاتی لہریں اٹھتی رہتی ہیں۔ ان موجوں سے جہاں اور بہت سے تغیرات ہوتے ہیں وہاں نئے نئے فیشن بھی وضع ہوتے رہتے ہیں۔

فیشن کے نفسیاتی محرکات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تغیر کی خواہش فیشن کا ایک اہم ترین محرک ہے اسی لئے ہم کبھی کبھی یوں بھی
ـتے ہیں کہ فیشن ایک تغیر کا نام ہے۔ تغیر کی خواہش انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ ہم لگاتار کوئی کام کرتے کرتے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اس بیزاری
ـنجات حاصل کرنے کے لئے ہم میں تغیر کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور جب تک تغیر رونما نہیں ہوتا ہم پر ایک بے چینی اور اضطراب کی کیفیت طاری
ـہے۔ تغیر ہماری دلچسپی کو برقرار رکھنے کا ایک اہم نفسیاتی اصول ہے۔ تدریسی اداروں میں ٹائم ٹیبل مرتب کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا
ـہے۔ نئے موسم کے آغاز میں ہم مکانوں کی ٹیپ ٹاپ اور کمروں کی آرائش اسی اصول کے ماتحت کرتے ہیں۔ تغیر پیدا کرنے کے لئے ہم
ـر کو الٹ پلٹ کرتے رہتے ہیں۔ بعض دفعہ ہر چیز کمرے میں اپنی موزوں جگہ پر قرینے سے بنی ہوتی ہے لیکن ہم یکسانی سے اکتا کر چیزوں
ـجگہیں بدل دیتے ہیں ——— مارکیٹ میں نیا ماڈل آتے ہی اپنی پرانی موٹر کار سے جو بالکل اچھی حالت میں ہوتی ہے چھٹکارا پانے کی سوچتے
——— اور تو اور بعض اوقات ہم اپنے جوتے کے لگاتار استعمال سے بیزار ہو کر کہہ دیتے ہیں کہ یہ پھٹنے کا نام نہیں لیتا حالانکہ ہماری گرہ میں
ـنا خریدنے کے لئے دام نہیں ہوتے۔ لیکن ہم تغیر بہرحال چاہتے ہیں۔ تغیر کی یہی خواہش فیشن بن جاتی ہے۔

لباس کا انتخاب بھی انا کی تسکین کا ایک ذریعہ ہے۔ انسان معاشرے میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کرنا چاہتا ہے اس کی یہ خواہش ہوتی
ـاس میں کچھ ایسی نمایاں صفات پائی جائیں جس سے اسے انفرادیت حاصل ہو۔ یہ مقصد کسی قدر نئی وضع قطع اور منفرد تراش خراش کا لباس
ـن کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ انسان اپنی پوشاک میں کچھ ایسا سلیقہ برتتا ہے جس سے وہ جاذب توجہ نظر آئے خود میں کشش پیدا کرنے سے اس

کی انا کو تسکین ہوتی ہے۔

اکثر ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ وہ افراد جن کا ذہنی صلاحیتیں پست ہوتی ہیں فیشن کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں۔ یہ لوگ لباس کی بناوٹ میں معمولی معمولی بات کا خیال رکھتے ہیں شاید وہ اس ظاہری ٹیپ ٹاپ سے نمایاں پن پیدا کر کے اپنی ذہنی کم مائیگی کی تلافی کرتے ہیں۔

فیشن جسم کی ناموزوں ساخت کو چھپانے کا بھی ایک اچھا ذریعہ ہے۔ وہ لوگ جو فطری طور پر بے ڈول اور ناقص ساخت سے پیدا ہوتے ہیں یا وہ جو اپنا فطری حسن کسی وجہ سے کھو بیٹھتے ہیں۔ فیشن کے زیادہ دلدادہ ہوتے ہیں ــــــ ایک قبول صورت خاتون جو فیشن کی کچھ زیادہ شائق نہیں تھیں ایک حادثے میں جسم کی ظاہری رعنائی سے محروم ہو جانے کے بعد فیشن کی طرف غیر معمولی طور پر مائل ہو گئی ہیں۔ اور بناؤ سنگھار پر بڑا وقت صرف کیا کرتی ہیں۔ فیشن کی جانب ان خاتون کا میلان اتنا شدید ہو گیا ہے کہ اگر کوئی ان کے فیشن کی داد نہ دے تو وہ خود اس کا مطالبہ کرتی ہیں۔ وہ پوچھتی ہیں کہ یہ بلاوز مجھے کیسی لگ رہی ہے؟ یہ ساڑھی مجھے بچ رہی ہے نا؟ یہ نگینہ کیسا معلوم ہو رہا ہے؟

فیشن کی ایک قسم کو ہم جسم کی زائد EX TRA نمائش کہہ سکتے ہیں جس میں جسم کا ابھار مقصود ہوتا ہے۔ زیادہ تنومند اور گوشت پوست سے لدے پھندے اشخاص چھاتی کھول کر پہلوانوں کی طرح چلتے ہیں اس کی عمدہ مثال کھلاڑی ہیں جو اپنے جسم کے غیر معمولی اظہار سے غالباً ذہنی کم مائیگی کی تلافی کرتے ہیں۔

لباس سے ہم کسی حد تک فرد کی ذہنی شائستگی اور اس کے مذاق کا بھی پتہ لگا سکتے ہیں ــــ غیر مہذب اشخاص عموماً شوخ اور بھڑکیلا لباس پسند کرتے ہیں جبکہ ذہین اور صاف ستھرا مذاق رکھنے والے افراد ہلکے رنگ کا لباس زیب تن کرتے ہیں۔ سینما گھروں کے گیٹ کیپروں کا موازنہ اسکالرز سے کیجئے تو نمایاں فرق نظر آئے گا۔

ادیبوں، شاعروں اور مصوروں کے پریشان لباس اور الجھے بال ان کی مضطرب طبیعت کی غمازی کرتے ہیں۔

بسا اوقات کسی کی عظمت سے متاثر ہو کر اس جیسی وضع قطع اختیار کی جاتی ہے۔ کسی زمانے میں یورپ کے لوگ بائرن کی عظمت سے متاثر ہو کر بائرن کی طرز کا کالر استعمال کرنے لگے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب شروع شروع میں مسز جارج کی بمبئی میں شہرت ہوئی تو بمبئی میں ان کی تقلید کی جانے لگی۔

بعض وقت کسی کے سماجی رتبے کو محض اس کی منفرد وضع قطع پر محمول کر کے اس کی تقلید کی جاتی ہے اور اگر وہ رتبہ حاصل کرنے میں ناکامی ہو تو عجیب وضع قطع اختیار کی جاتی ہے ــــ ایک محترمہ نے ایک خاتون کی تقلید جو ایک منفرد وضع قطع رکھتی ہیں اس لئے کی انہیں ممتاز سوشل پوزیشن بھی حاصل ہے جب اس میں ناکامی ہوئی تو وہ محترمہ عجیب وضع قطع اختیار کرنے لگیں۔ اور رشک کی منزل سے گزر کر حسد کی سرحدوں پر پہونچ گئیں۔

کسی کی تقلید میں ویسا ہی لباس، وضع قطع، چال ڈھال اختیار کرنے کی وجہ عقیدت بھی ہو سکتی ہے۔ شاگرد استاد سے عقیدت کی بنا پر وہی طور طریقے اختیار کرنا باعث فخر سمجھتا ہے۔ عشق و محبت کی دنیا میں عاشق و محبوب بھی ایک دوسرے کی تقلید کرتے ہیں۔

صنف مخالف کی جانب فرد کا فطری میلان فیشن کے اختیار کرنے کا ایک اہم نفسیاتی محرک ہے۔ فرد مروجہ فیشن اختیار کر کے صنف مخالف کی نظروں میں جاذب ہونا چاہتا ہے۔ صنف مخالف کی کشش کے لئے افراد اپنے جسم کی نمائش کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ مرد کی "مردانگی" اور عورت کی نسوانیت کا مکمل اظہار ہو۔ پوشاک کی بناوٹ اور تراش خراش اس وضع قطع سے کی جاتی ہے۔ جس سے جسم کے نقوش اور خدوخال واضح طور پر ابھر آتے ہیں۔ عورت ایسا لباس زیب تن کرنا چاہتی ہے جو مرد کو پر کشش معلوم ہو۔ دوسری طرف مرد اپنی وضع قطع سے عورت کا دل موہ لینا چاہتا ہے مرد اور عورت کی یہ کشاکش نت نئے فیشنوں میں نمودار ہوتی ہے۔

لیکن عورت، مرد کے مقابلے میں زیادہ فیشن پرست واقع ہوئی ہے۔ ایک تو شاید اس کے بدن کی فطری ساخت اس امر کی متقاضی ہے کہ وہ اپنے حسن کو آراستہ پیراستہ کرے اس کی دوسری وجہ عورت کا کلچرل پس منظر بھی ہے۔ مرد عورت کو اب تک اپنا دست نگر اور غلام رکھتا آیا ہے بشرطیکہ

پہیے کی طرح عورت کے دیے بھی بدلتے رہے ہیں ۔ عورت کو اس کے سوشل رتبے سے محروم کر کے جو عورت اپنے مفادات کے تحت تقاضے پوری
اپنی نہیں کرتا۔ آیا ہے اس کے نتیجے میں عورت ایک قسم کے شدید احساس کمتری میں مبتلا ہوگی ۔ اس کے رد عمل میں وہ ظاہری ٹیپ ٹاپ اور نمود و نمائش
پر دینے لگی تاکہ وہ اپنے احساس کمتری کی تلافی ہو ۔ لباس کے ذریعہ وہ احساس کمتری کو احساس برتری کا روپ دے کر سوسائٹی میں وہ مقام حاصل
کرنا چاہتی ہے جسے مرد نے غصب کر رکھا ہے ۔ عورت کی کمتری کا یہ احساس انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے ۔ اس کے پس منظر میں مرد اور عورت کے تعلقات کی
پوری تاریخ ہے ــــ یہاں یہ نکتہ غور طلب ہے کہ مرد اور عورت کے حقوق میں مساوات ان کے فیشن پر بھی اثر انداز ہوتی ہے ۔ اگر مغربی ممالک کے
فیشن کا موازنہ جہاں قریب قریب عورت کو مرد کے مساوی حقوق حاصل ہیں یہاں کے فیشن سے کیا جائے جہاں عورت کو نسبتاً کم حقوق حاصل ہیں تو نمایاں فرق
نظر آئے گا۔ مغرب کے مساوی حقوق سے ان کے لباس میں بھی مساوات کے آثار نظر آتے ہیں ــــ فرنگی مرد اور عورت کی پوشاک کی مالیت میں کم و بیش توازن
ہوتا ہے ۔ جبکہ ہمارے یہاں سرمایہ دار طبقہ سے قطع نظر ایک متوسط گھرانے کی خاتون تو زیور سے لدی پھندی ہوتی ہے جبکہ اس کے "صاحب" کے پاس
لی سی پوشاک ہو گی ۔

مشرق اور مغرب کا موازنہ کرنے سے ایک اور بات بھی نظر آتی ہے ــــ یہاں کے مرد اپنی وضع قطع طور طریقوں اور لباس کے استعمال میں
مغرب کی پوری نقالی کرتے ہیں جبکہ ہمارے یہاں کی خواتین سوائے شدید مغرب پرست طبقہ کے مغرب کے اثرات قبول کرتے ہوئے بھی ان کی ہو بہو نقالی
نہیں کرتی ہیں ۔ یہاں کی عورت اگرچہ نئے نئے فیشن اختیار کرنے میں مرد سے بہت آگے ہوتی ہے لیکن اس میں مشرقی تہذیب کی جھلک بہر حال باقی رہتی ہے ۔ مثلاً
ہمارے یہاں کے مرد مغرب کی نقالی میں قمیض پتلون یا سوٹ پہنتے ہیں اور انگریزی وضع کے بال بنواتے ہیں جبکہ یہاں کی خواتین سوائے بہت اونچی سوسائٹی کے
عورتوں کی وضع کا ڈریس جس میں ٹانگیں برہنہ رہتی ہیں استعمال نہیں کرتیں اور پھر اردو شاعری کی روایت کو زندہ رکھتے ہوئے "زلف دراز" کو بدستور
کا اہم ترین جزو سمجھا جاتا ہے ۔ اس کی ایک وجہ تو شاید یہاں کا مذاق ہے ۔ اس لئے عورت قدیم روایات کو برقرار رکھتی ہے ۔ دوسری وجہ شاید یہ بھی ہے
عورت کو مشرقی وضع قطع میں دیکھنا چاہتا ہے اور عورت خود میں مرد کے خلاف بغاوت کرنے کی سکت نہیں پاتی ۔

مشاہدے سے ایک اور بات معلوم ہوتی ہے ۔ عورت اپنی ظاہری سج دھج اور بناؤ سنگار سے مرد کے سماجی اور معاشی رتبے کا تعین کرتی ہے ایسے
گھرانے بھی پائے جاتے ہیں جن کے افراد وافر دولت کے باوجود معمولی لباس میں نظر آتے ہیں ۔ وہ شاید لباس کو اس لئے اہمیت نہیں دیتے کہ ان کا
مقام پہلے ہی سے متعین ہوتا ہے اور لباس کی اہمیت غیر ضروری ہو جاتی ہے ــــ ہاں ان کی عورتیں اس امر کا احساس رکھتے ہوئے مردوں کی اس کمی
کرتی ہیں ۔ وہ ظاہری نمود و نمائش اور غیر معمولی وضع قطع اختیار کر کے اپنے شوہروں کے سماجی اور معاشی رتبے کا اعلان کرتی ہیں ۔ اکثر اوقات عورت مرد کو
سوسائٹی میں متعارف کرانے کا ذریعہ ہوتی ہے ۔

نئے نئے فیشن رائج کرنے میں جاگیردار طبقہ اہم پارٹ ادا کرتا ہے ۔ دولت کی فراوانی اور وقت کی کثرت اس طبقہ کی نمایاں خصوصیات
ہیں ۔ اس بے شمار دولت اور بے شمار وقت کو مصرف میں لانے کے لئے یہ طبقہ نئے نئے فیشن وضع کرتا رہتا ہے اور یہ فیشن آہستہ آہستہ ذیلی طبقوں تک پہنچ جاتے ہیں۔
بالائی طبقہ جب یہ دیکھتا ہے کہ اس کا موجبہ فیشن رواج کی صورت اختیار کرنے اور اپنی انفرادیت کھونے لگا ہے تو وہ اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے
فیشن میں مزید تغیر پیدا کر دیتا ہے ۔ اس طرح فیشن دوری تغیر کے اصول پر چلتا ہے ۔

بورژوا کلاس گاہ بگاہ مزدور طبقہ سے بعض چیزیں مستعار لے کر نئے نئے فیشن کے قالب میں ڈھالتا رہتا ہے ۔ اور اس طرح دیہاتوں کے رسم و رواج
ہو کر شہر کے فیشن کا روپ دھار لیتے ہیں ــــ ہمیں تو یہ پکنک جو اپنی بیزاری دور کرنے کے لئے ہم کبھی کبھار شہر سے دور کھلی فضا میں مناتے ہیں ۔
طبقہ سے مستعار لی ہوئی معلوم ہوتی ہے ۔ دیہات کے مرد اور عورتیں کام کاج سے فارغ ہو کر کھیتی باڑی میں ہی کھا پی اور ہنس کھیل لیتے ہیں ــ
دیہات کی اس تفریح سے بنیادی طور پر زیادہ مختلف نہیں ہے ۔

[illegible] انقلاب اور سیاسی جمہوریت نے بھی فیشن کی تراش خراش میں اہم حصہ لیا ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں جہاں اور بہت سی ایجادات ہوتی رہتی ہیں۔ وہاں نئے نئے فیشن بھی وضع ہوتے رہتے ہیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک طبقے سے دوسرے طبقے میں پھیل جاتے ہیں۔ دراصل فیشن کا یہ انتشار اس خلا کو پُر کرتا ہے جو مختلف طبقات کے درمیان پایا جاتا ہے۔ بالائی طبقے کے فیشنات نقل کی صورت میں نچلے طبقے تک پہونچتے ہیں لیکن دولت عدم موجودگی کے باعث نچلا طبقہ مواد تو مہیا نہیں کر سکتا صرف ظاہری ٹیپ ٹاپ پر ہی اکتفا کرتا ہے۔

فیشن کے پھیلانے میں ڈیزائن میگزین بھی بہت کچھ کر رہے ہیں۔ یہ فیشن بکس تجار فطرت انسانی کو پیش نظر رکھتے ہوئے مرتب کرتے ہیں آپ کو ہر اسٹیج کے ڈرائنگ روم میں ڈیزائن بک نظر آئے گی۔

فلم غالباً آج کل فیشن کی ترویج کا سب سے اہم ذریعہ ثابت ہو رہی ہے۔ فیشن زدہ لڑکے اور لڑکیوں کی نگاہیں فلم دیکھتے وقت فیشن کی باریکیوں پر جمی رہتی ہیں۔ اور ویسی ہی وضع قطع اختیار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جیسی وضع ان کے محبوب اداکار اور اداکارائیں اختیار کرتی ہیں۔ شعوری طور پر فلم کی تقلید کرنے کے علاوہ شائد اس میں شعور کو بھی دخل ہوتا ہے۔ جس میں فلم بیں غیر شعوری طور پر اپنے اداکار یا اداکارہ کی تقلید کرتا ہے۔ اسے نفسیاتی اصطلاح میں IDENTIFICATION کہتے ہیں ـــــ آج کل فلم کی پسند کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اگر کسی نوجوان لڑکے یا لڑکی کو کسی اداکار یا اداکارہ کے مماثل کیا جائے تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی ـــــ بعض خواتین کوئی فلم دیکھتے وقت کسی "صبیحہ" یا کسی "نرگس" کے بلاؤز سے اس قدر متاثر ہوتی ہیں کہ درزی سے اپنے لئے اسی تراش خراش کے بلاؤز کی خواہش کا اظہار کرتی ہیں۔ (درزی بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر بڑی معصومیت سے یہ کہہ دیتا ہے کہ میں نے یہ فلم نہیں دیکھی ہے اور کم از کم تین مرتبہ دیکھنے کے بعد سلائی کی یہ باریکیاں سمجھ میں آئیں گی اور یہ کہ میں سب سے اونچی کلاس ہی میں فلم دیکھنے کا عادی ہوں ـــــ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ فیشن میں فائدے کو دخل نہیں ہوتا لہٰذا وہ خاتون دس کا نوٹ درزی کے ہاتھ میں تھما دیتی ہیں جو وہ فلم بھی دیکھ چکا ہوتا ہے اور اسی وضع کا بلاؤز بھی بنا چکا ہوتا ہے۔)

ـــــ فلم کی نقالی میں سب طبقے یکساں طور پر حصہ لیتے ہیں۔ سماجی یا معاشی رتبہ اس میں حائل نہیں ہوتا ـــــ اگر دیسی فلمیں دیکھنے والی لڑکیاں دلیپ کمار اور راجکپور کو پسند کرتی ہیں تو مغرب زدہ خواتین مارلن برانڈو اور جمی ڈین کی نہ صرف فلموں بلکہ ان میگزینز پر بھی ٹوٹ پڑتی ہیں جن میں ان کی تصویریں ہوتی ہیں ـــــ راجکپور کی ٹخنوں تک اونچی پتلون اور دلیپ کمار کی پتلون سے باہر پھیلی ہوئی قمیض کی نقالی ابھی حال تک اکثر منچلے نوجوان کرتے رہے ہیں ـــــ فلم کی اس کورانہ تقلید پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر کوئی فلمی اداکار یا اداکارہ آج ننگے پاؤں چلنا شروع کر دے تو کل کراچی کی "الفی" پر "شریف لوگوں" کی ایسی تعداد یقیناً نظر آئے گی جن کے پیر جوتوں سے بے نیاز ہوں گے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ آج کی اس سیماب وش دنیا میں جہاں ہر واقعہ بیک وقت اور غیر متوقع ہوتا ہے۔ جہاں ہر لمحہ نئے نئے حالات اور واقعات کی ایک دھندلے سے پوش ہو جاتا ہے جہاں فطرت انسانی اتنی دلچسپ اور پیچیدہ ہے کہ ہم کسی کے کردار سے بمشکل اس کے اندر جھانک سکتے ہیں ـــــ جہاں ہم فیشن کے متعلق بھی کوئی پیشین گوئی نہیں کر سکتے۔ کیا تعجب ہے کہ مستقبل بعید میں ابن آدم اور بنت حوا ارتقائی منازل طے کرتے کرتے اس منزل پر پہونچ جائیں جہاں سے آغاز ہوا تھا اور اس طرح قدیم انسان کا "فیشن" پھر ظہور میں آ جائے۔

خواجہ افضل امام پھلواروی

زیب النساء اور دیوانِ مخفی

ادبی دنیا کے لئے یہ مسئلہ لاینحل ہو گیا ہے کہ کیا واقعی زیب النساء بنت اورنگ زیب شاعرہ تھی اور موجودہ دیوان مخفی اسی کا ہے۔ اب تک جتنے محققوں نے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے ان کا دائرہ تحقیق تذکروں اور سوانح تک محدود ہے۔ زیر نظر مقالہ میں اس معمہ کو دیوان مذکور سے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

زیب النساء کی پیدائش [illegible] میں ہوئی۔ بچپن میں کلام مجید حفظ کیا جس کے انعام میں باپ نے تیس ہزار اشرفیاں دیں۔ علوم عربی اور فارسی سے بہرۂ تمام رکھتی تھی۔ خوشنویس تھی اور اقسام خطوط نستعلیق و شکستہ میں ماہر۔ وہ علم کی قدر شناس تھی۔ کتابوں کی تلاش اور تصنیف و تالیف اس کا مشغلہ تھا۔ ارباب فضل و کمال کی ترفیہ حال میں توجہ کرتی۔ شاہی کتب خانہ کی جتنی کتابیں اس نے پڑھی تھیں اتنی کسی اور نے نہیں پڑھی تھیں علماء و فضلاء اس کے انعام سے مستفیض ہوتے رہتے تھے۔ ملا صفی الدین اردبیلی کشمیر میں رہتا تھا اس نے بیگم کے حکم سے تفسیر کبیر کا ترجمہ کیا جس کا نام زیب التفاسیر رکھا گیا۔ لباس عموماً سادہ اور سفید پہنتی تھی اور سکی اتار میان باقی [illegible] بیان ہے کہ اس نے تمام عمر سرمہ اور مسی استعمال نہیں کی سلیمان شکوہ ابن داراشکوہ سے منسوب ہوئی تھی مگر اس کے قتل کے بعد ساری عمر تجرد میں گزار دی۔ اس کا انتقال [illegible] جلوس یعنی [illegible] میں ہوا۔

علامہ شبلی اس کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں "فارسی زبان دانی میں کمال رکھتی تھی نستعلیق، نسخ اور شکستہ خط نہایت عمدہ لکھتی تھی خود صاحب تصنیف گزری ہے لیکن اس کی تصنیفات سے آج کوئی چیز موجود نہیں۔ مجمع الغرائب میں ملا سعید اشرف مازندرانی نے لکھا ہے کہ زیب النساء کی ایک بیاض ایک خواص کے ہاتھ جس کا نام ارادت فہم تھا حوض میں گر پڑی اس پر ملا سعید اشرف نے ایک قطعہ لکھ کر شاہزادی کی خدمت میں پیش کیا اس قطعہ کا وہ شعر جس میں ارادت فہم کا نام آیا ہے یہ ہے۔

دوش از دست ارادت فہم خاکم در دہن چوں بیاض سینۂ ماہی در آب افتاد

اس کے علاوہ تذکروں میں شاہزادی کی ایک اور تصنیف زیب المنشآت کا ذکر ملتا ہے۔ تذکرۃ الغرائب کے مصنف نے لکھا ہے کہ میں نے اس کو دیکھا ہے۔ زیب المنشآت شاہزادی کے خطوط اور رقعات کا مجموعہ ہے "......" اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ شاعرہ تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کلام ضائع ہو گیا"۔

علامہ شبلی اسے شاعرہ تو تسلیم کرتے ہیں مگر موجودہ دیوان کو اس کی طرف منسوب نہیں کرتے۔ دور مغلیہ میں شعر گوئی کو شرافت و نجابت تعلیم و تمدن کے ارکان میں شمار کیا جاتا تھا۔ ویسے بھی اشعار کہہ لینا اس زمانے میں کوئی بڑی بات نہ تھی چہ جائیکہ زیب النساء جس کی تعلیمی حیثیت ہر طور مسلم ہے۔ کوئی بعید نہیں کہ اس نے بھی اشعار کہے ہوں مگر یہاں بحث اس کی استعداد سے نہیں۔ بلکہ موجودہ دیوان سے ہے۔

احمد علی سندیلوی مؤلف تذکرہ مخزن الغرائب لکھتے ہیں کہ "اکثر اشعار جائے بنظر نیامدہ مگر در تذکرۂ انتخابش بہ نظر آمد لیکن اعتبار نشاید سبب آنکہ اکثر شعر اساتذہ صاحب آں تذکرہ بنام آں بیگم نوشتہ بود" مولانا علی آزاد مؤلف ید بیضا شاہزادی کے تذکرہ میں

چند نمونے :-

اردو کی بولی ہے یہ سچ کہہ لیجئے قسم — اس بات پہ اب آپ ہی مصحف اٹھا لیجئے
جھٹ لکھئے پورب والے گلشن اگر ایک خط — سبحان کی مہر سے سند اس کی منگائیے
اپنی گلک کے واسطے جو بھرت پھند ہیں — رنجیت سنگھ جاٹ کو ہمراہ لیجئے
یا گرد و پیش کے تعباتی جو لوگ ہیں — اک بلوہ باندھئے انھیں جلدی بلائیے
سرکار کو یہاں نہیں گلک کی کال کچھ — روٹی جو کھانی ہووے تو پنجاب جائیے

خدا جانے کس کو کہتے ہیں۔ امر یہ ہے کہ جب گو نکلے تو بھرت پھند کس گنتی میں؟ اور گرد و پیش کے تعباتی لوگ بھی جب اردو نہیں جانتے تو پورب والے کس شمار میں!

حضرت صاحبقران ثانی کو ناز تھا کہ "پورب شیراز ملک ماست" پورب سے مراد صوبۂ اودھ، صوبۂ الہ آباد، صوبۂ عظیم آباد۔۔۔ مگر نا انصافی نے ان تینوں کو بھی ملک عرب سے نکال کر ملک عجم میں داخل کر دیا۔ اللہ اللہ یہ صحرائیان پورب کیا جانتے ہیں اس کو؟ سیدھے سادے صحرائی ہیں، جنگلی ہیں، وحشی ہیں۔ یہ بولنا کیا جانیں۔ بادشاہ جہاں نے اگر کہا ہوگا کہ "پورب شیراز ملک ماست" تو قرینہ یہی ہے کہ اس وقت آدھی رات ہوگی۔ وہ لال پانی پی رہا ہوگا۔ بہکی بہکی باتیں کر رہا ہوگا۔

روٹی جو کھانی ہووے تو پنجاب جائیے

پنجاب نے کہا افغانستان جائیے، افغانستان نے کہا ایران جائیے۔ ایران میں سماکو کی مٹی کا ایک چراغ دیکھا۔ پوچھا تو کون ہے؟ چراغ نے کہا داغی۔ پوچھا داغی کیا؟ چراغ نے کہا داغ کا چراغ! پوچھا یہاں کیسے آیا؟ چراغ نے کہا، جلنے کے لئے! پوچھا داغ کے گھر کیوں نہ جلا؟ چراغ نے کہا دلی کو دل جلانا آتا ہے، چراغ جلانا نہیں آتا۔ پوچھا پھر لکھنؤ میں کیوں نہ جلا؟ چراغ نے کہا، وہاں ہوا بہت تیز تھی! پوچھا تیرا نام؟ چراغ نے کہا، اقبال! اس واقعے کو ایک شاہد عادل[۱] اس طرح بیان کرتا ہے:-

> اسی کشمکش میں غریب اقبال مبتلا ہے، جب تک اردو میں اس نے اظہار خیال کیا دہلی اور لکھنؤ کی لسانیات جاننے والوں نے ٹوکا، اور جب کہ فارسی ملبوس اختیار کیا تو زبان داں حضرات اس میں جھول بتلاتے ہیں حالانکہ جو کچھ وہ کہتا ہے نہ اس سے قبل لکھنؤ کا روزمرہ اسے پیش کر سکا اور نہ ایرانی زباندانی میں اس کی مثال نظر آتی ہے لیکن چونکہ نظریں صرف سطح تک پہنچ کر رہ جاتی ہیں یا جن کے نزدیک صرف ظاہری آب و رنگ ہی اصل چیز ہے وہ بطون و حقیقت کے سمجھنے سے عاجز ہیں معاملہ ... قابل عفو!

لیجئے اقبال بھی اردو سے روٹھ گیا، ادبار اس کو کہتے ہیں، دلی لکھنؤ کا یعنی عرب کا یہ درجہ دیکھ کر ملک عجم بہت افسردہ ہے کہتا ہے کہ دیکھئے اس کا انجام کیا ہو؟ عجم میں بلبل بھی چہکتا ہے تو عرب منہ پھیر کر بھی کہتا ہے کہ طوطا ٹائیں ٹائیں کر رہا ہے!

---

[۱] نسخہ ... میر غلام علی آزاد بلگرامی ص ۱۸ ... طبع نولکشور (ترجمہ اردو) حیات جلیل بلگرامی ...
... ص ... مستفاد ... سے ماخوذ ...

گئی! ؎
اف اگر میری زباں تک پہنچی / ظلم کی حد بھی کہاں تک پہنچی

یہ شور سن کر چیونٹیوں کی ملکہ نے کہا خاموش! خاموش! حضرت جہاں پناہ رنگون میں اور حضرت جانِ عالم مٹیا برج میں آرام فرما رہے ہیں! خاموش خبردار جو دلی لکھنؤ کو کسی نے کچھ کہا! ع بخش دو گر خطا کرے کوئی

دلی خطا وار ہے تو میر تقی اور مرزا غالب کے صدقے میں اس کو بخش دو۔ لکھنؤ خطا وار ہے تو میر انیس اور مرزا دبیر کے صدقے میں اس کو بخش دو، اور ملک عرب خطا وار ہے تو ظفر اور اختر، حضرت جہاں پناہ اور حضرت جانِ عالم کے صدقے میں اس کو بخش دو۔ دلی لکھنؤ کو خدا جانے کس کی نظر کھا گئی۔ دونوں؟ دنیا اندھیر ہو رہی ہے۔ دن کو سورج گہن۔ رات کو چاند گہن۔ سورج کہاں ہے؟ رنگون سے پوچھو۔ چاند کہاں ہے؟ مٹیا برج سے پوچھو! یہ دونوں تم کو نہ بتلائیں تو ماہپوری سے پوچھو، ماہپوری بھی دلی لکھنؤ کے سوگواروں میں ہے۔

صاحبو! جس نے ماہپوری کی صورت دیکھی ہو اور دل نہ دیکھا ہو، وہ طنزیات ماہپوری دیکھ لے بقول میر حسن۔ "اقبال واہ واہ، اور نہاں آہ آہ"۔ مطلب یہ کہ ماہپوری کے ہنسنے پر مت جائیو! دل اس کا روتا ہے، کیوں روتا ہے؟ اس لئے کہ مغرب نے مشرق کا چراغ بجھا دیا!

ماہپوری کا دل کیوں روتا ہے؟ ظلمت نور پر ہنس رہی ہے، مشرق کا دعویٰ تھا کہ انا مدینۃ العلم، جس کو علم کا سودا کرنا ہو وہ اس بازار میں آئے۔ مغرب کہتا ہے کہ سودائیوں کو مدینہ کی خاک چھاننے دو، ہوشیار گاہک لندن، پیرس، نیویارک جاتا ہے ـــــ جاتا ہے اور جائے گا۔

ماہپوری کا دل کیوں روتا ہے؟ ـ زمین آسمان پر ہنس رہی ہے۔ مشرق نے پوچھا تھا ؎

از کارِ زمیں را نکو ساختی / کہ با آسماں نیز پرداختی؟

مغرب کہتا ہے کہ ہاں ہم زمین کا کام تمام کر چکے اور ہمارے دامن پر اب خون کا دھبہ بھی نہیں! باقی رہا آسمان، تو اس کا کام بھی تمام ہی سمجھو۔ ہمالیہ کا سر ہمارے پاؤں کے نیچے آ ہی چکا۔ بساطِ سلیمانی پر ہمارا قبضہ ہو ہی چکا، اب صرف مریخ سے دو دو باتیں کرنے کی دیر ہے۔

ماہپوری کا دل کیوں روتا ہے؟ ـ عریانی ستر پوشی پر ہنس رہی ہے۔

مشرق کی ایک دوشیزہ نے رستم سے کہا تھا ؎

منیژہ منم دخت افراسیاب / برہنہ ندیدہ تنم آفتاب

اے رستم! تو جانے گیا یہ منیژہ کون ہے؟ افراسیاب کی بیٹی آفتاب تک کو نامحرم سمجھتی ہے! آج اسی مشرق کا یہ حال ہے کہ مغرب کی قینچی اطمینان سے اس کی حجامت کر رہی ہے۔ چوٹی کٹ رہی ہے ناک اونچی ہو رہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ماہپوری پھر ہنستا کیوں ہے؟ جواب یہ ہے کہ ماہپوری شاگرد ہے شیرازی کا۔ جس کا قول ہے کہ اندوہ کی محفل میں رونی صورت بنانے سے کام نہیں چلتا۔ شیرازی کون؟ وہی جن شناس اور جہاندیدہ سعدی جو گلستاں کے آخر میں لکھ گیا ہے ؎

غالب گفتار سعدی طرب انگیز است و طیبت آمیز ... کوتہ نظران را بدین علت زبان طعن دراز گردد کہ مغز دماغ بیہودہ بردن و دود چراغ بیفائدہ

خوردن کار خردمندان نیست، ولیکن چاشنے صاحبدلان کرد، و شے مستحسن
در ایشان است کہ شیوہ نماذکر در جوشت بانے صافی و دریک عبارت
کشیدہ است و داروئے تلخ نصیحت بہ شہد ظرافت بر آمیختہ تا طبع ملول
ایشان از دولت قبول محروم نماند۔

؎ دوا کڑوی ہے تو تھوڑا سا شہد ملا دو، پھر مریض ہونٹ نہ چاٹنے لگے تو سعدی نام نہیں! دوا سے مراد نصیحت ہے
——— شہد سے مراد ظرافت، اور مریض سے مراد مشرب پرست۔ چنانچہ طنزیات مانپوری میں، مانپوری نے
بھی یہی ہوشیاری کی ہے۔ داروئے تلخ نصیحت بہ شہد ظرافت بر آمیختہ تا طبع ملول ایشاں از دولت قبول محروم نماند!

صاحبو! اس کو طنزیات مانپوری نہ کہو، اس کو جادو کی پٹاری کہو، اس پٹاری میں بارہ تحریریں تھیں:۔

میر کلّو کی گواہی	ماما کی مصیبت	اور میری اسیسری	تین
ہاں میں ہاں	بیرا روزہ	اور سکنڈ ہینڈ موٹر	تین
پاگل خانے کی سیر	نیک آخر	اور ایڈیٹیفل وائف	تین
میونسپل الکشن	باستی	اور کرائے کی ٹم ٹم	تین

مانپوری نے بارہ تحریریں پٹاری میں ہمارے سامنے بند کیں، اب ہم پٹاری کھولتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ بارہ میں تو غائب

صرف تین باقی ہیں اور تینوں کا نام بدلا ہوا:۔ پہلی تحریر — گلستان مانپوری
دوسری تحریر — فرہنگ مانپوری
تیسری تحریر — چیتھو چھری

گلستان مانپوری کے ہوتے ہوئے اب کون کہہ سکتا ہے کہ مانپوری نے مکتب میں گلستان سعدی نہیں پڑھی تھی؟

گلستان مانپوری — باب اوّل — در سیرت پادشاہان

(۱) سرکار ہے بڑی عقل مند! اس نے دیکھا کہ ہندوستان اب کچھ پڑھ لکھ کر، اپنے حقوق و اختیارات کے واسطے سرکار ہی سے لڑائی جھگڑا کرنا چاہتا ہے تو جھٹ الکشن کی ہڈی بیچ میں ایسی پھینک دی کہ آپس ہی میں لگے سب [illegible] سے الجھنے! — سرکار اطمینان سے الگ کھڑی تماشہ دیکھتی ہے! ص ۲۴۹

(۲) ڈپٹی مجسٹریٹی اور منصفی سے لیکر ہائیکورٹ کی ججی تک ہیں گورنمنٹ کے برابر کچھ ایسے لوگوں کو جگہ دے رہی ہے جو اجلاس میں ہمیشہ اونگھا کرتے ہیں۔ اگر اُن کی جگہ ہماری افیونی جماعت کے لوگوں کی تقرری عمل میں لائی جائے تو اونگھنے کا کام ان سے کہیں بہتر انجام پا سکتا ہے۔ ص ۱۸۴

(۳) جو نا سمجھ سرکار کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں وہ یہ سمجھتے بوجھتے نہیں کہ اگر خدانخواستہ سرکار نہیں رہے تو پھر ہندوستانیوں کو سوراج کون دے گا۔ ص ۲۲۵

(۴) ہندوستانیوں کو پہلے سرکاری افسروں اور حکام کی جوتیوں کی بدولت اعزازی [illegible] ملتے تھے۔ اب جو ہندوستانی [illegible] ان سرکاری اعزاز [illegible] سے زیادہ گے لیڈری کو عزت کی چیز سمجھے۔ اور حکام کی خوشا[مد] [illegible]

نزدیک ذلت کی بات ہوگی۔

سرکار نے کہا۔ اچھا! جی حضوری بننے سے [illegible] ہو؟ الیکشن میں پھنسا کر جلد دھوئیں، وہ سادہ، ہنگے دروازے پہ ناک شد گرد والی تو صرف نام نہیں! یہی ہے الیکشن کا مطلب؟ ص [illegible]

(۵) ملک و قوم کی بھلائی کا کام کونسل اور اسمبلی میں آدمی اتنا نہیں کر سکتا جتنا کلب یا کمیٹی میں) پبلک کی خدمت از قسم نالیوں اور پاخانوں کی صفائی وغیرہ کا کام انجام دے سکتے ہیں کیونکہ دیکھا وہی کی دوسری قسط دینے کے لئے جو گول میز کانفرنس بیٹھی تو خدا جانے کیا گول مال ہوا کہ کانفرنس تو بیٹھی ہندوستانیوں کو حقوق و اختیارات دلانے کے لئے، اور مل گئے زیادہ اختیارات لاٹ صاحب کو! حالانکہ جہاں تک میں نے سنا ہے انھوں نے نہ کوئی مطالبہ کیا، نہ سائمن صاحب کے یہاں کوئی درخواست پیش کی، یوں چپکے سے کان میں کچھ کہہ دیا ہو تو یہ اور بات ہے۔ بے مانگے مل جانا، یہ لاٹ صاحب کا اقبال نہیں تو اور کیا ہے؟ ص ۲۱۹

(۶) گورنمنٹ برطانیہ اگر ہندوستان میں واقعی امن و امان قائم رکھنا چاہتی ہے تو ہر شہر ہر قصبہ میں کالج اور اسکول کی طرح اپنے خرچ سے نیک آشرم قائم کر کے انہیں کی طرف لوگوں کو مائل کرے۔ تھوڑے ہی دنوں میں چسکا پڑ جانے پر خود لوگ پر امن و با امن بننے کی کوشش میں مصروف ہو جائیں گے

تھک گیا ہوں "پنک" میں کیا کیا کچھ ہو کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی ص ۱۸۳/۱۸۴

(۷) مانپوری:۔ کہئے پنڈت جی! آپ کی کیا صلاح ہے؟ (خون کے مقدمے میں) ملزم قصوروار ہے یا نہیں؟ اور اگر قصوروار ہے تو آپ کیا سزا تجویز کرتے ہیں؟

پنڈت جی:۔ بھائی صاحب! بات اصل یہ ہے کہ جیو ہتھیا کرنا مہاپاپ ہے۔ اگر کوئی ایک آدمی کے پران کے پاپ کر چکا تو اوس کو پھانسی دلوا کے ہم سب جیو ہتھیا کے پاپ کا ہے بٹوریں؟ اس واسطے ہمارا مت ہے کہ ایک دم چھوڑ ڈالا جائے۔ پندان میں جیو بچانا مہاپن ہے۔

مانپوری:۔ لیکن قانون کی پستک میں ایسے پاپی کو پھانسی لکھا ہے۔

پنڈت جی:۔ قانون وانون کون دیکھے ہے؟ یہی کون قانون ہے کہ ہم سب کے جبردستی پکڑوا کے اسیسری کے کٹہرے میں دن بھر اپنے سامنے (جج صاحب) بٹھولے ہے؟ اگر کوئی زمیندار اپنے اسامی پر بیگار دینے واسطے جور جلم کرے تو اطلاع کرے پر اوکرا پر مقدمہ چلا دل جائے اور ہم سب بھلے مانسوں بیچے گھر کے سب کام دھندا چھوڑ دا کے اسیسری کی بیگاری میں پھنسوے رہنا کون انصاف ہے؟ سو خلاصہ ہمارا کہے کے مطلب یہ ہے کہ مدعا علیہ کے ایک دم چھوڑ ڈالا جائے۔ ص [illegible]

باب دوم درا خلاق درویشاں

(۱) پہلا نمونہ:۔ [illegible] اہل موذی نے کہ جن نے دھوکے سے [illegible] شہباز مرحوم [illegible] کو شہید کر ڈالا۔

دوسرا نمونہ:۔ [illegible]

میر تحو:۔ قبلۂ عالم! افیون خاص ہندوستان کی چیز نہیں تو کیا ولایت کی پیداوار ہے؟ افیون کی دکان پر والنٹیرز کا پہرہ بٹھا دیا گیا؟

گھسیٹا:۔ کیوں جناب میر صاحب! سب کام چھوڑ کر گاندھی جی اب افیون کے پیچھے کیا پڑ گئے ہیں؟

میر تحو:۔ بھئی اصل بات یہ ہے کہ سرکار سے مقابلہ کرنے سے رہے۔ انگریزوں میں بھی اب دال گلتی نظر نہیں آتی۔ اور مہاتما جی میں سے بیٹھنے والے آدمی تو ہیں نہیں۔

بجتو:۔ بھئی کیا ہوا ہے؟ آج افیون کی پکٹنگ ہے، کل بالائی پر بندش ہوگی۔ پرسوں گتے پر پابندیاں عائد ہوں گی۔ اس کے بعد چلنے کی دکانوں پر پہرہ بٹھایا جائے گا۔

ولّو:۔ جی ہاں! افیون چھڑانے سے گویا سوراج ہی مل جائے گا!

ماسٹر زینو:۔ کہیں طعنہ ہوا! جیلی بھائیوں کو افیون ترک کرنے کا یہ پھل ملا کہ اپنا ملک بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ اور مہاتما جی افیون چھڑوا کر چلے ہیں سوراج لینے!!

ڈسٹرکٹ شاکو:۔ اور کمال تو یہ ہے کہ لوگوں کو نان وائلنس کی تعلیم دیتے ہیں، اور نان وائلنس کی اصل اسپرٹ جس سے پیدا ہوتی ہے اسی کے خلاف زہر اگلتے ہیں!

ولّو:۔ یہ سب کچھ سہی، مگر جیل میں افیون کا کیا انتظام ہوگا؟

محرّر:۔ بعض قیدیوں کے لئے جب بکری کا دودھ ایک سیر دن بھیجا گیا ہے تو بکری کی مینگنی برابر افیون کا بہم پہنچانا سرکار کے لئے کیا مشکل ہے؟

ص $\frac{167}{168}$

(۲) ناپوری:۔ کہئے جناب بابو صاحب! آپ تو پہلے بھی اسیسری کر چکے ہوں گے؟

بابو صاحب:۔ ایسے ایسے مقدمے ہم فیصل کر چکے ہیں: آپ لوگ نئے نئے آتے ہیں اور قانون نہیں جاننے کی وجہ سے یہ (خون کا) مقدمہ آپ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا۔ ہم سے سنیئے:۔

(۱) مدعا علیہ نے پہلے جھگڑا کیا۔	اس لئے ایک ہفتہ کی سزا
(۲) جھگڑنے کے بعد مارپیٹ کی	اس قصور میں دو مہینے کی میعاد۔
(۳) مدعی کو ضرب شدید پہنچائی	اس کے بدلے میں ایک برس قید سخت
(۴) مدعی کو جان سے مار ڈالا؛	اس کی سزا پھانسی۔
(۵) اجلاس پر آکر حاکموں کے سامنے جرم سے انکار کیا۔	اس لئے دروغ حلفی کی سزا جرمانہ!

چونکہ پہلے چار جرموں میں سخت سزائیں دی جا چکی ہیں اس لئے پانچواں قصور دروغ حلفی کی سزا میں جو جرمانہ میں نے تجویز کیا ہے اس میں آپ لوگوں کو اختیار ہے کہ جتنی چاہیں رعایت کر دیں۔

ناپوری:۔ اور اگر جج صاحب کی رائے چھوڑ دینے کی ہو جب؟

بابو صاحب:۔ تو یہ اور بات ہے؛ ان کی بات ہم لوگ کیسے اٹھا سکتے ہیں؟

ص $\frac{46}{47}$

باب سوم در فضیلت قناعت

(۱) گارڈ صاحب بجائے کسی طرح اس گاڑی میں بٹھا دیجئے اور نہیں تو کہئے کم از کم اسی والے ڈبے میں اس کمتری کو رکھ دیجئے گیا میں مجھے تول کر جو واجب محصول ہو گئے لیجئے گا۔ ص ۱۳، ۱۴

(۲) خان صاحب کا شکستہ موٹر اگرچہ میاں فہیم کے اصطبل میں اسی طرح موجود ہے مگر خان صاحب اس سے ایسے متنفر اور بیزار ہیں کہ جہاں کسی نے عمداً یا سہواً سکنڈ ہینڈ موٹر کا نام لیا گئے اس کو بے نقط سنانے۔ سکنڈ ہینڈ موٹر تو خیر ان کے خیال میں یہ منحوس لفظ سکنڈ ہی تکلیف دہ ہے، اسی بنا پر وہ سکنڈ ہیرو (معقد ثانی) کے بھی ایک دم خلاف ہیں۔ ص $\frac{107}{108}$

(۳) اب آپ ہی بتلائیے کہ اس ہاتھی سے کس طرح پیچھا چھڑایا جائے؟ تقریبوں میں شرکت اس لئے چھوڑ دی کہ ہاتھی سے سابقہ نہ پڑے۔ سرکس دیکھنا ترک کر دیا کہ ہاتھی پر نظر نہ پڑے۔ شطرنج کھیلنے سے توبہ کی کہ ہاتھی کی چال نہ چلنی پڑے۔ سگریٹ چھوڑ کر بیڑی پینا شروع کر دیا کہ کہیں ہاتھی مارکہ سگریٹ نہ پینا پڑے۔ ص $\frac{293}{294}$

باب چہارم در فوائد خاموشی

(۱) سائیکالوجی کے بعض مشکل مسئلے کے حل کرنے کے لئے رانچی کا مشہور پاگل خانہ (رانچی کا مشہور پاگل خانہ) دیکھنے کا شوق زمانے سے تھا لیکن مہمان بن کر نہیں بلکہ تماشائی کی حیثیت سے۔

گزشتہ اگست کا واقعہ ہے جس زمانہ میں لیجسلیٹو کونسل کا اجلاس رانچی میں ہو رہا تھا۔ . . . ٹھیک بارہ بجے ہم اور رضی کانکے جانے کے لئے موٹر پر روانہ ہوئے۔ چلتے وقت رضی نے کہا کہ دو ایک ضروری کام بھی ختم کرتے ہوئے چلیں، پندرہ بیس منٹ سے زیادہ وقت صرف نہیں ہوگا۔

ایک انگریزی دکان کے سامنے رضی نے موٹر رکوایا۔ کچھ چیزوں کا آرڈر دیا۔ دیگر دہاں سے لیک اور آفس ہوتے ہوئے کچھ دور جا کر ایک دو منزلہ عمارت کے دکھن جانب موٹر رکا۔ رضی اتر کر دس منٹ کے اندر داخلہ کے دو کارڈ لے کر آئے اور ہمیں ساتھ لئے ہوئے اس عمارت کی دوسری منزل پر ایک آہنی سیڑھی کو طے کرتے ہوئے پہنچے۔ دیکھا کہ مختلف شکل و صورت اور مختلف ہیئت کذائی کے سینکڑوں انسان طرح طرح کے وضع و لباس میں۔ کسی کے سر پر پیٹ کوئی پگڑی لپیٹے، کوئی ٹوپی پہنے، کوئی ننگے سر۔ عجیب و غریب انداز سے کرسیوں پر بیٹھے ہیں، ان میں کوئی اونگھ رہا ہے کوئی متوحش صورت بنائے ادھر ادھر تاک رہا ہے، کوئی ہنس رہا ہے، کوئی گردن جھکائے کچھ سوچ رہا ہے۔ کوئی کسی سے کانا پھوسی کر رہا ہے، ایک صاحب بیچ میں دیوار سے لگے اونچی جگہ پر دانت میں انگلی دبائے بیٹھے ہیں، کپڑے کی ایک سفید دھجی غالباً امتیازی نشان کے لئے گردن میں بندھی ہے، ایک طرف ایک شخص کھڑا چلا چلا کر کچھ بول رہا ہے اور رفتہ رفتہ اس بولنے کا ایسا زور بندھا کہ گردن کی رگیں پھولنے لگیں، منہ سے کف جاری ہے اور چلانے کا سلسلہ بند ہی نہیں ہوتا۔

ہمیں تو ان کی قابل رحم دماغی کیفیت پر بڑا ترس آیا۔ مگر ان کے ساتھیوں کی یہ حالت کہ بجائے ہمدردی کے تالیاں بجا بجا کر قہقہہ لگا رہے تھے۔ چلاتے چلاتے تھک کر جب ان کا جوش ٹھنڈا پڑا تو ایک دوسرے کے دماغ نے زور پکڑا ان حضرت کا انداز ہی نرالا تھا، گھوم گھوم کر سر اور ہاتھوں کی حرکت سے ایکٹ کرنے اور اول اللہ

کی طرح ان پر ترس تو نہیں آیا مگر افسوس ضرور ہوا کہ صورت شکل وضع کے اعتبار سے بھلے مانس آدمی معلوم ہوتے ہیں مگر دماغی ساخت کے باعث ان سے عجیب وغریب حرکت سرزد ہو رہی ہے۔

ہم نے رضی کا ہاتھ ٹیپ کر آہستہ سے کہا واقعی کانکے بھی عجیب وغریب جگہ ہے۔ رضی نے فوراً ہمارے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ خدا کے لئے چپ بھی رہو۔ تمھارے دماغ میں کانکے ایسا گھسا ہوا ہے کہ اب کانسل ہاؤس کو بھی تم پاگل خانہ سمجھ رہے ہو۔

ہم:- ایں؟ یہ کونسل؟

رضی:- جی ہاں، کونسل!

ہم:- اور یہ سب ایم۔ ایل۔ سی؟

رضی:- جی ہاں! ممبر آف دی لیجسلیٹو کونسل، بہار اینڈ اڑیسہ"

ہم:- تو ہمیں کیا معلوم کہ آپ نے کانکے نے جانے کے بدلے کونسل ہاؤس میں لاکھڑا کر دیا۔ بھئی تم بگڑو یا خفا ہو ہمیں تو وہی دیا (پاگل خانے) کا سماں . . . . . .

رضی:- چپ رہو، بولنے کی بات نہیں۔

باب پنجم — درعشق وجوانی

(۱) میرے بے تکلف دوستوں میں ایک مختار صاحب ہیں، ان کی ماماکی "قانون سے ناواقف شخص"... کے ساتھ بھاگ گئی۔ اور مختار صاحب کو داغ مفارقت دے گئی۔ معلوم ہوا کہ اسی روز سے ان کے ہمسایہ وکیل صاحب کا خدمت گار بھی غائب ہے۔ مختار صاحب، وکیل صاحب پر الزام دے رہے ہیں کہ ان کا خدمت گار ان کی ماما کو بھگا لے گیا۔ اور وکیل صاحب مختار صاحب پر خفا ہیں کہ ان کی ماما ان کے خدمتگار کو بھگا لے گئی۔ اس کا فیصلہ کہ کون کس کو بھگائے گیا یا لے گئی۔ ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ ص $\frac{15}{16}$

(۲) رانچی کے پاگل خانے میں ہم نے دیکھا کہ، ایک مخبوط الحواس چند قدم کے فاصلے پر درخت کا سہارا لگائے آنکھیں بند کئے کچھ زیر لب آپ ہی آپ باتیں کر رہا ہے۔ اس کی طرف اشارہ کرکے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ یہ ــــ حضرت ایک قتالۂ عالم طوائف پر عاشق ہیں، صرف نقدِ دل ہی نہیں بلکہ اپنی کل جائداد انھوں نے عشق فتنہ کے چڑھاوے میں دیدی۔ اور جب اظہار عشق کا ساماں نہیں رہا تو . . . . رقیبوں نے نقص امن کا احتمال بتاکر پاگل خانے بھجوا ہی دیا۔ ہم نے دل میں کہا کہ ہاں بیشک یہ حضرت مجنوں ملنے کے لائق معلوم ہوتے ہیں، پاس جاکر جو ہم نے ذرا بلند آواز سے تسلیمات عرض کی تو خدا جانے کس عالم تصور میں وہ محو تھے کہ بے تحاشا ہمارے گلے میں بانہیں ڈال کر لگے ہمیں پیار کرنے! ہم نے کہا، اجی حضرت! ہم ہیں ہم!! مگر وہ اور چمٹا کر فرمانے لگے کہ "ظالم! تو نے بہت ستایا"۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ پیار اور محبت میں ہماری ڈاڑھی ان کے ہاتھ میں آگئی، چونک کر آنکھیں کھولدیں اور فوراً علٰحدہ ہوکر لگے ہمیں غور سے دیکھنے، ان کے تصور معشوق کی ساری محویت اس وقت کچھ اس طرح ہماری ڈاڑھی میں الجھ کر رہ گئی کہ ان کا سلسلۂ خیال ہی درہم برہم ہوگیا۔ ہم نے مسکرا کر ندا تاً یہ کہا کہ ــ "اچھا اب جاتی ہوں" ص $\frac{131}{132}$

حیرت تو مجھے اپنے یہاں کے لیڈروں پر ہے کہ سب کاموں کو چھوڑ کر صرف سوراج کے پیچھے کچھ ایسا کھدر باندھ کر پڑ گئے ہیں کہ دوسرے ضروری مسائل پر دھیان نہیں دیتے۔ کہتے ہیں کہ سوراج مل جانے کے بعد ساری مصیبتیں خود رفع ہو جائیں گی، میں نے مانا کہ خدا نخواستہ سوراج مل بھی گیا، ملک میں خوشحالی بھی ہو گئی، پیٹ کا پیٹ بھر غلہ بھی بکنے لگا۔ اور نمک بھی مفت تقسیم ہونے لگا، — لیکن اگر ماما نہیں ملی تو پکائے گا کون؟ — اب صرف چاول چبائیے اور نمک کے ساتھ سوراج لیکر چاٹا کیجئے!!

(۴) (فتو خاں نے ایک اصیل مرغ پالا تھا، نام شہباز، اس کو بلّی نے شہید کر ڈالا، یاران ہم پیالہ فتو خاں کے گھر تعزیت کے لئے حاضر ہوتے ہیں)

فتوں خاں: — آخرش مرحوم چند ننھے ننھے معصوم بچے اور ایک بیوہ چھوڑ کر جنت کو سدھارے۔ اب وہ لاوارث ستم رسیدہ اپنے غم میں جو نہ کر گزرے تھوڑا ہے، آج ہی صبح اُس جنت نصیب کے مزار پر فاتحہ پڑھنے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اپنی چونچ اور پنجے سے مرحوم کی قبر کی مٹی کرید کرید کر ادھر ادھر پھینک رہی ہے، میں سمجھ گیا کہ غایت محبت میں قبر کی مٹی ہٹا کر اپنے شوہر کے ساتھ خود کو دفن کر دینا چاہتی ہے۔ افسوس مرحوم جنت میں اس کے لئے پھڑک رہے ہوں گے اور یہ کمبخت ان کے پاس پہنچنے کے لئے یہاں تڑپ رہی ہے۔

مانپوری: — ان معصوم یتیموں کی تو آپ فکر نہ کریں، ان کی سرپرستی میں اپنے ذمے لینے کو تیار ہوں۔ میرے یہاں ان کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ باقی رہی غریب کمباری مرغی۔ تو آپ اگر مناسب سمجھیں تو اسے بھی میرے یہاں بھجوا دیں۔ میرا مرغ بھی ماشاء اللہ نہایت خوش رو اور طبیعت دار ہے، ممکن ہے اس کے ساتھ رہنے سے اس کا غم غلط ہو جائے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ عدت پوری ہو جانے کے بعد باضابطہ ان دونوں کو پیوند کر دیا جائے۔ ایک جوان بیوہ کو کب تک اپنے گھر میں اس طرح بٹھلائے رکھئے گا، زمانہ نازک ہے، ایسا نہ ہو کہ غیر کفو کے اختلاط سے اس کی نسل خراب ہو جائے۔ ص $\frac{175}{177}$

(۵) "نہ معلوم پردہ کے پیچھے آپ کیوں جان دے رہی ہیں؟"
"پھر آپ نے وہی بحث چھیڑ دی! یہ پردہ آپ کا بگاڑ کیا رہا ہے؟"
"کاش آپ آزاد خیال ہوتیں!"
"صرف خیالات میں آزاد؟ یا افعال و حرکات میں بھی؟"
ایسی بیوی کو جو ذہانت میں لارڈ ولنگڈن، اور قدامت پسندی اور ضد میں گاندھی ٹائپ کی ہو۔ راہ پر لانا آسان نہیں۔ ص $\frac{193}{194}$

(۶)
کامیابی کا رہا آج ترے سر سہرا ٭ ہو مبارک تجھے اے وارڈ کمشنر سہرا
مور چھل کے عوض جھاڑو نے ڈم ڈم ہا ٭ بھنگیں گائیں ادھر ڈھول بجا کر سہرا
ناک اور منہ پہ رومال رکھے کیوں نہ شاہا ٭ بھنگنوں نے تو نہیں گوندھا ہے کہ سہرا
مانپوری کی ہے تقریب الکشن کی خوشی
ہو کے خوش گائیں نہ کیوں کہتر و مہتر سہرا

ص ۲۷۱

(۷) واقعی یورپین تہذیب کی لیڈیاں کس قدر اقبال مند ہوتی ہیں۔ یہ خود تو خود، جس پر ان کا سایہ بھی پڑ جائے، مرکز توجہ بن جاتا ہے۔ مس اینی کو میرے ساتھ یا مجھ کو مس اینی کے ساتھ لوگوں نے جہاں دیکھا اور مجھے (میری خوش قسمتی پر) داد دینے کے لئے جمع ہونا شروع ہو گئے۔ گفتگو کی ابتدا تو میری مزاج پرسی سے ہوتی۔ مگر چند ہی جملوں کے بعد میں "جملۂ معترضہ" بن کر غیر متعلق ہو جاتا۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ گفتگو میں مجھے اس کا پتہ ہی نہ لگا کہ اصل مخاطب کون ہے۔ کیونکہ الفاظ کا تخاطب تو میری طرف ہوتا اور نگاہیں مس اینی کی جانب۔

ص ۲۰۴

(۸) وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے کبھی ہم انھیں کبھی گھر میں کو اپنے دیکھتے ہیں　ص ۲۰۶

(۹) ماما کی دستیابی اور وہ بھی ان شرائط سے کہ چالیس سے کم نہ ہو۔ شوخ وضعدار نہ ہو، پھر شوہر والی بھی ہو، یہ میرے بس کی بات ہوتی تو بیگم کے حکم کے مطابق چالیس کیا ساٹھ ستر سے اوپر ہی والی ماما کو لا کر حاضر کر دیتا۔ خوش وضع نہ ہونے کی قید بھی یوں ہی سی ہے ملے تو بدوضع سے بدوضع ماما رکھ لینے میں بھی عذر نہیں اور شوہر والی ہونے کی شرط تو اور بھی فضول ہے۔ اگر دستیاب ہوں تو ایک کیا دو دو چار چار شوہر والیوں کو بھی لے آؤں۔ مگر کہیں کوئی ماما ملے بھی تو؟　ص ۱۱

(۱۰) میرا تو خیال ہے کہ ہندوستانیوں کے عام ازدواجی تعلقات کو انکوائری کے لئے اگر کوئی سائمن کمیشن مقرر کی جائے تو مشکل ہی سے کوئی بدنصیب ایسا ملے گا جو ایڈیشنل وائف کی خدمات سے محروم ہو۔　ص ۱۱۹

باب ششم
در ضعف پیری

(۱) یوں تو کوئی وقت ایسا نہیں ہوتا کہ رمضانی کی دکان میں دو ایک افیون رسیدہ بزرگ، سامنے چائے کی پیالی رکھے، منہ سے نیچہ لگائے، عالم استغراق میں مائل بہ سجود نظر نہ آتے ہوں۔ لیکن دکان کی اصلی رونق کا وقت چھ بجے شام سے گیارہ بجے شب تک ہوتا جبکہ دل دادگان افیون کا پورا جتھا اکٹھا ہو کر آپس کے تبادلۂ خیالات کے موقع پر اپنے اپنے نرم و شیریں لہجے میں لحن غنہ کی آمیزش سے موسیقیت پیدا کرتا۔
ادھر شام کے پانچ بجے ادھر یاران نجد کی آمد کا تانتا بندھا، ایک مجنوں صفت بزرگ مع اپنی تمام ہڈیوں اور پسلیوں کے خراماں خراماں تشریف لائے۔ دوسرے صاحب سر نیاز خم کئے آتے دکھائی دیئے۔ ابھی دکان کے چبوترے پر پہنچ کر انھوں نے دم بھی نہیں لیا تھا کہ ایک تیسرے حضرت عالم رکوع میں، زمین کی جانب کمر پہ معلق ہاتھ باندھے قدم رنجہ فرماتے نظر آئے۔ سامنے پہنچ کر انھوں نے اپنی کمر سیدھی نہیں کی تھی کہ ایک چوتھے چرم ملفوف بزرگ نے السلام علیکم! بھائی رمضانی! کا نعرۂ دلکش سنایا۔　ص ۱۶۵/۱۶۶

(۲) ایک پنڈت جی، مرزئی پہنے، سر پہ پیچ دار پگڑی رکھے، ہاتھ میں دوا کی ایک شیشی لئے۔ کوتوالی کے کٹہرے کے پاس زور سے دہائی دینے لگے کہ سرکار! ہم اسیسری سے رہائی کر دی جائے۔ ہم پیٹ میں بہت درد ہے ابھی ڈاکٹر اوجید کن سے دوائی لے آئے ہیں!! مگر جج صاحب کو خدا جانے کیا ضد ہو گئی ہے کہ جس نے زیادہ ضد کیا وہی دھر لیا۔ پنڈت جی دوا کی شیشی دکھلاتے ہی رہے اور وہاں اسی روز اسیسری میں ان کا نام [illegible]

(۱) رمضان جو اور مہینوں سے غالباً زیادہ شریف ہیں ان کی تشریف آوری سے پہلے ہی میں ان سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔ سوائے اس کے اور کیا صورت ہو سکتی تھی کہ روزہ سے بچنے کے لئے کوئی حیلۂ شرعی پیدا کروں اور حکیم صاحب کے یہاں قارورہ کی شیشی لو اکر پہنچ جاؤں اور روزہ سے اگزمٹ (مستثنیٰ) ہونے کے لئے حکیم صاحب سے نسخہ بطور بیماری کی سرٹیفکیٹ کے، بیگم صاحبہ کی خدمت میں پیش کردوں ،۔

بیگم صاحبہ نے ازراہ ہمدردی فرمایا کہ جب حکیم صاحب نے معدے کی بیماری تشخیص کی ہے، اور ثقیل مرغن غذاؤں سے پرہیز تبلایا ہے تو یہ بھی دریافت کر لینا تھا کہ کون سی ہلکی غذا آپ کے لئے مفید ہوگی، میں سمجھتی ہوں ڈبہ والا بسکٹ افطار میں سابودانہ، اور شب کو بارلی اور سحری میں مسلینس فوڈ، کافی ہوگا۔ ص $\frac{43}{44}$

(۴) میر نجو نے کہا کہ یہ انجمن سوائے ریزولیوشن پاس کرنے کے اور کوئی عملی قدم نہیں بڑھائے گی۔ ممبران انجمن کے طبعی میلان کا لحاظ کرتے ہوئے انجمن کی مستقل پالیسی صلح کا۔ مرنجاں مرنج ہوگی یعنی سرکار کو سنخ ہونے کا موقع ہی نہیں دیا جائے گا اس کا نام انجمن نیازمندان رکھا گیا۔

اس کے بعد باضابطہ انجمن کے جلسے کی کارروائی شروع ہوئی، جلسے کے صدر سب سے پرانے افیون رسیدہ بزرگ منی جھکوڑی صاحب بنائے گئے۔ سائبان کی چوکی پر پریسیڈنٹ کے لئے جو کرسی رکھی گئی تھی اس پر لوگوں نے لاکر صدر صاحب کو بٹھا دیا۔ میر نجو نے خطبۂ صدارت صدر کی طرف سے پڑھنا شروع کیا۔

تھوڑی دیر تو میر صاحب خطبۂ صدارت ناک سے پڑھا کئے اور لوگ کان سے سنتے رہے لیکن ابھی نصف بھی ختم نہیں کرنے پائے تھے کہ صدر صاحب کرسی پر بیٹھے خدا جانے کس مسئلہ کے غور میں مراقب ہو گئے۔ سامعین اور اسپیکر صاحبوں کی گردنیں بھی رفتہ رفتہ مائل بہ نشیب ہونے لگیں، یہاں تک کہ میر صاحب جس خطبہ کو دونوں ہاتھوں سے تھامے آنکھوں کے قریب رکھے پڑھ رہے تھے ان کا سرا اس سے جا لگا۔ غرض کہ جلسے کا ہر ممبر اس طرح ساکت و خاموش ہو گیا۔ گویا کسی میں جان ہی نہیں!

یہ عالم لاہوتی خدا جانے کب تک قائم رہتا اگر پریسیڈنٹ صاحب کرسیٔ صدارت سے ایک دھماکے کی آواز کے ساتھ سجدہ میں آکر لوگوں کو چونکا نہ دیتے! پریسیڈنٹ کا چوکی پر دھم سے آرہنا حاضرین کو کارروائی جلسہ کی طرف متوجہ کرنے کے لئے کافی ہوا۔ ان میں سے ایک صاحب نے چونک کر پوچھا۔

ااں کیا وائلنس کا کوئی ریزولیوشن پاس ہو رہا ہے؟ ص $\frac{181}{182}$

(۵) یہ ایک بزم پنک ہے، اونگھنے ہیں یاں بے محرومی گرو بڑھا کر جو اٹھا لے ہاتھ سے جسکی آسی کی ہے ص ۱۸۰

باب ہفتم درتاثیر تربیت

(۱) ایک عام غلط فہمی خدا جانے یہ کیونکر پھیل گئی ہے کہ جس طرح آجکل بغیر بوٹ اور ہیٹ کے کوئی جنٹلمین نہیں کہلا سکتا اسی طرح لیڈر کے لئے جیل جانا لازمی ہے بلکہ بعض لوگ تو لیڈر کے لئے لاٹھیاں کھانا بھی ضروری سمجھتے ہیں، یعنی ان کے خیال میں لیڈری خوشی سے کوئی قبول نہیں کرتا۔ بلکہ پولیس ڈنڈے مار مار کر زبردستی لیڈر بنا دیتی ہے۔

ص ۱۴۰

(پاگل خانہ میں) ایک صاحب جن کے کرتے کی آستینیں غائب پاجامہ گھٹنے سے نیچے نوچ کر علیحدہ کیا ہوا۔ گردن میں رسی کا ایک ٹکڑا بندھا ہوا، داڑھی مونچھ سر اور ابرو کے بال ایک دم صاف، پائجامہ میں جیب سے کیا واسطہ اس لئے دونوں ہاتھ پائجامے کے اندر دیئے ہوئے منہ سے سیٹی بجاتے ہوئے۔ انگریزی انداز میں چہل قدمی فرما رہے تھے، ہم لوگوں کے نزدیک پہنچے پہ ڈپٹ کر کہا:۔ "ہم کالا آدمی کو نہیں مانگتا۔"

ڈاکٹر صاحب نے اطمینان دلایا کہ یہ پاگل صاحب تو نہیں لیکن صاحب بننے کا ان کو خبط ہے البتہ ہمیں اس وقت ہماری سمجھ میں یہ بات آئی کہ غالباً "صاحبیت" ہی کا تقاضہ تھا جس نے پائجامہ کو پھاڑتے پھاڑتے ہاف پینٹ اور کرتے کی آستینوں کو علیحدہ کر کے ہاف شرٹ بنانے پر مجبور کر دیا۔ اور گردن میں رسی کے بندھے ہوئے ٹکڑے نے ٹائی کی جگہ لی۔ چاروں ابرو کا صفایا غالباً کرزن فیشن کے خبط کا نتیجہ ہے جس نے داڑھی اور مونچھ کے حدود سے نکل کر سر کے بال اور ابرو پر بھی دھاوا بول دیا۔

ہم نے کہا ڈاکٹر صاحب! ایسے فیشن ایبل پاگلوں کی تعداد خدا کے فضل سے ہمارے یہاں بھی کافی ہے۔ باقی رہا کرزن فیشن کا خبط۔ تو یہ وبا بھی بڑھتے بڑھتے اب کالجوں اور اسکولوں میں بھی پہنچ گئی ہے، اس کے جراثیم نے طلبہ کی مونچھوں کے دونوں کناروں کو عام طور سے چاٹنا شروع کر دیا ہے، جو آئندہ چل کر یقینی اس قدرتی کاشت کو چٹیل میدان بنا کے چھوڑیگا۔

ص ۱۲۹/۱۳۰

میر کلو کی گواہی

جدال سعدی

میر صاحب:۔ دروغ حلفی کے جرم میں ایک بار سزا پا چکے ہیں۔ اس لئے پہلا سوال ان سے یہی کیا گیا۔

وکیل:۔ میر کلو صاحب! آپ کبھی جیل کی بھی سیر کر آئے ہیں؟

میر صاحب:۔ آج کل کون ملک کا خادم ایسا ہے جو جیل سے نہ ہو آیا ہو؟

وکیل:۔ آپ کو ملک کی کس خدمت کے صلے میں یہ فخر حاصل کرنے کا موقع ملا؟

میر صاحب:۔ وہی قانون شکنی!

وکیل:۔ کس قانون کے توڑنے کی خدمت آپ نے اپنے ذمے لی تھی؟

میر صاحب:۔ گاندھی جی نے نمک کے قانون توڑنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اور بعض لیڈروں نے جنگلات کے قانون کی خلاف ورزی کو اپنے ذمے لیا۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ ضرورت "قانونِ شہادت کی اصلاح" کی ہے اس لئے قانون شکنی کے لئے میں نے اسی کو منتخب کیا!

وکیل:۔ کیوں میر صاحب! احسان علی مرحوم کو آپ جانتے ہیں؟

میر صاحب:۔ اے حضور جاننے کی ایک کہی، ہم دونوں ایک جان دو قالب تھے۔

وکیل:۔ ان کی عمر کیا تھی؟

میر صاحب:۔ یہی تیس اور ساٹھ کے درمیان تھی!

وکیل:۔ یہ تیس اور ساٹھ کے درمیان کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ صاف کہیئے وہ بوڑھے تھے یا جوان؟

میر صاحب:۔ عمر کے لحاظ سے تو بہت زیادہ بوڑھے نہیں تھے مگر اکثر بیمار رہنے کی وجہ سے بوڑھے معلوم ہوتے تھے۔

وکیل :۔ بال سفید تھے یا سیاہ؟
میر صاحب :۔ نزلہ کی وجہ سے بال سفید ہو گئے تھے لیکن جب خضاب لگاتے تھے تو جوان معلوم ہوتے تھے۔
وکیل :۔ رنگ گورا تھا یا کالا؟
میر صاحب :۔ نہایت ہی گورے چٹے آدمی تھے لیکن وہمی بیماری کی وجہ سے رنگ کچھ سانولا سا ہو گیا تھا۔
وکیل :۔ لانبے تھے یا ٹھگنے؟
میر صاحب :۔ قد تو لانبا تھا لیکن کمر جھک جانے کی وجہ سے ٹھگنے معلوم ہوتے تھے،
وکیل :۔ داڑھی بھی رکھتے تھے یا نہیں؟
میر صاحب :۔ وہ عجب آزاد وضع اور رندانہ مشرب کے آدمی تھے جبھی جی میں آیا تو چاروں ابرو کا صفایا بول دیا اور کبھی داڑھی کبھی تو خواجہ خضر کو بھی مات دے دی۔
وکیل :۔ وہ برابر رہتے کہاں تھے؟
میر صاحب :۔ اپنے مکان میں!
وکیل :۔ شہر میں رہتے تھے یا دیہات میں؟
میر صاحب :۔ دونوں جگہ! کبھی شہر میں! کبھی دیہات میں!
وکیل :۔ دیہات میں ان کا مکان کس رخ کا تھا؟
میر صاحب :۔ شہر میں رہنے والوں کا دیہات میں اکثر تیر بہک جاتا ہے، وہاں جب گیا، سمت کا مجھے صحیح پتہ ہی نہ لگا۔
وکیل :۔ یہ روپے کس کام کے لئے انھوں نے لئے تھے؟
میر صاحب :۔ اپنی ضرورت کے لئے۔
وکیل :۔ کب روپے انھوں نے لئے؟
میر صاحب :۔ جب ضرورت پڑی!
وکیل :۔ ان کا حرف تو آپ ضرور پہچانتے ہوں گے؟
میر صاحب :۔ یہی تو اک کمال مرحوم میں تھا۔ وہ ہفت قلم تھے۔ ہمیشہ مختلف نشانات سے لکھا کرتے تھے۔ قلم پر تنا اختیار رکھتا کہ انکا ایک خط کبھی دوسرے سے ملا ہی نہیں۔
وکیل :۔ مرحوم مرے کس بیماری سے؟
میر صاحب :۔ ہائے رونا تو اسی کا ہے، کسی کو اصل مرض کا پتہ ہی نہ لگا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان کو موت کی بیماری تھی۔

ص ۱/۸

باب ہشتم در آداب صحبت

(۱) نوید کے رقعے کے آخر میں کسی کا یہ شعر چھاپ دیا گیا تھا ؂

گر قدم رنجہ کنی جانب کاشانۂ ما ، گردد رشک فردوس شود از قدمت خانۂ ما

چنانچہ میرا کاشانہ جگہ کی قلت اور مہمانوں کے قدوم میمنت لزوم کی کثرت سے رشک فردوس ہوتے ہوتے آخر میں غیرت جہنم

بن گیا، اپنے یہاں کی اس تقریب سے پہلے مجھے تعجب ہوتا تھا کہ رنج و غم کے مواقع سے زیادہ شادی کی تقریبوں میں لوگ کثرت سے کیوں شریک ہوتے ہیں اس کی وجہ اب سمجھا کہ دنیا بھر کے مصیبت زدوں سے شادی کے موقع پر صاحب تقریب کی مالی اور دماغی حالت زیادہ قابلِ رحم ہو جاتی ہے۔ اس لئے اظہار ہمدردی کے لئے لوگ ایسے ہوشربا وقت میں نہ آئیں تو کب آئیں۔

ص ۱۴۸

(۲) ایک گھنٹے کے بعد اردلی نے آکر کہا کہ صاحب۔ سلام بولتے ہیں، میں نے کہا وعلیکم السلام! . . . . اردلی نے کلکٹر صاحب کے کمرے کی طرف جانے کے لئے ہاتھ سے اشارہ کیا (کمرے میں داخل ہو کر) میں اس سوچ میں تھا کہ صاحب کچھ ارشاد فرمائیں تو میں ہاں میں ہاں ملاؤں۔ لیکن کوئی ایسی بات ہی نہیں ہوئی جو جی حضور! بجا ارشاد! کہنے کا مجھے موقع ملتا۔ پانچ منٹ بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ صاحب نے کھڑے ہو کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور یہ بھی فرمایا کہ "آپ اب جا سکتے ہیں"۔ اور ساتھ ہی اردلی کو بلا کر کہا کہ دوسرے بابو کو سلام بولو۔

میرے دل میں صاحب لوگوں کی قدر اور بھی بڑھ گئی کہ واقعی یہ لوگ کس قدر خلیق ہیں کہ کوٹھی سے نکلوانے کے وقت گردن میں ہاتھ دینے کی بجائے اخلاقاً ہاتھ میں ہاتھ دیدیتے ہیں۔ ص ۶۳/۶۴

(۳) لیڈر اگر سمجھدار ہے اور بہروپ کا فن جانتا ہے تو بیسیوں روپ بدل کر قومی اسٹیج پر لیڈری کا ایکٹ اس خوبی سے کر سکتا ہے کہ شمیم قسیم کی صدا نعرۂ تحسین سے بدل جاتی ہے، اور شہپھڑی بجانے والے جیرتو دینے لگتے ہیں۔ ص ۱۴۰

(۴) ڈرائیور نے انجن اور سلنڈر کو دیکھنے کے بعد کہا کہ کئی پرزے ٹوٹ گئے ہیں، اب اس کی فکر ہوئی کہ موٹر کو گھر تک کس طرح سے جایا جائے۔ ایک بیل گاڑی خالی آتی دکھائی دی، گاڑی بان کو موٹر میں بیل جوت کر لے جانے پر راضی کر لیا۔ دیر ہو جانے کی وجہ سے موٹر کے گھمانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ اس کے پیچھے والے حصے میں رسہ لگا کر دونوں بیلوں کے گلے میں باندھ دیا گیا۔ گاڑی بان نے کہا کہ ہم اپنی گاڑی یہاں کس پر چھوڑ کر جائیں؟ اس لئے یہ رائے ٹھہری کہ اسی موٹر میں گاڑی بھی باندھ لی جائے۔ غرض موٹر اس شان سے چلا کہ — آگے آگے دونوں بیل

اس کے بعد الٹا رخ موٹر

اس کے پیچھے بیل گاڑی بندھی ہوئی۔

یہ بیل گاڑی اور موٹر کا ملاپ گاندھی جی اور وزیرِ اعظم انگلینڈ صاحب کے ٹیک ہینڈ سے کم نہیں تھا۔

ص ۱۰۲/۱۰۳

(۵) نمونہ ہے اتحاد و اتفاق کا۔ قوموں اور جماعتوں میں میل ملاپ ہوا نہیں لیکن خادمِ قوم نے ایک خاندان کی دو بہنوں، عرفی اور شرعی میں ایسا میل کرا دیا کہ سب اختلافات خود بخود اٹھ گئے اور دونوں اس طرح آپس میں گھل مل گئیں کہ سوائے طبلہ اور ڈھولک یا ستار اور سارنگی کے کوئی فرق رہا نہیں۔ اس کی (عرفی) محفل میں اگر رنڈیاں سہرا گاتی ہیں تو یہاں (شرعی شادی میں) قوال مبارکباد لاتے ہیں۔

اسی خیال سے کہ کہیں خاکسار خادمِ قوم پر لوگ عرفی شادی کا الزام نہ لگائیں۔ شرعی شادی کے ثبوت کے لئے قوال سے شادی کی بھری محفل میں تصوف کی غزلیں گوا دیں۔

ایک کرم فرما نے میری تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ نے تو وہ شرعی شادی کی عرفی کی بھی ناک کاٹ ڈالی

ص ۱۵۱/۱۵۶

سکے نیچ ہیں اس سے کم نازک پوزیشن میرا اس وقت نہیں تھا۔ اپنے اپنے خیال میں دونوں اپنا ہی خواہ اور ہمدرد سمجھے ہوئے تھے اور یہی سبھی ہاں میں ہاں ملا کر دونوں کا دوست بنا ہوا تھا۔ مہاسبھائی نے تو کسی طرح اپنی اپنی قابلیت کی وجہ سے تاویل اور توجیہہ کر کے مہاسبھا اور مسلمانوں سے پیچھا چھڑا لیا، لیکن مجھ سے کوئی بات بنائے نہ بنی، صرف آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گیا۔

زیادہ حیرت انگیز اور افسوسناک بات تو یہ ہوئی کہ رشید اور کفیل دونوں بگڑ کر یہ کہتے ہوئے میرے پاس سے چلے گئے کہ ـــــ "یہی دونوں کو لڑواتا ہے !!"

ص ۶۱

فرہنگ مانپوری :-

نمبر	لفظ	صفحہ	معنی
(۱)	خارہ ماں	۱۴	مدر انڈیا کی بہن مس میو
(۲)	اُم السیاسیات	۲۵۰	الکشن جس کے پیٹ سے حشرات الارض پیدا ہوتے ہیں
(۳)	دُم چھلا	۱۵۳	شادی کے بعد ولیمہ ع اور جہیز کا دیا جلا دینے جاتے جاتے
(۴)	صغیرو کبیرو	۲۱۵	صغیرہ دوٹر بننا، کبیرہ دوٹ مانگنا
(۵)	والنٹیرہ	۱۳۱	عاشق بے حیا ع جب گھر بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
(۶)	دعوتِ ولیمہ	۲۷۰	جشرہ وصال دامادو عروس یعنی مانپوری میونسپل کمشنری۔
(۷)	اکبر امرود آبادی	۵۶	عطر مجموعہ اکبر۔ امرود۔ الہ آباد
(۸)	میعادی بخار	۲۵۶	وہ بخار جو الکشن کی شام کو آپ ہی آپ اتر جاتا ہے۔
(۹)	ہرم منسٹر	۱۴۳	لیڈی مانپوری و ماما مانپوری
(۱۰)	صبحِ قیامت	۲۶۴	صبح الکشن! بقول میر حسن ع قیامت کرے جس کو جھک کر سلام
(۱۱)	مجلس سماع	۱۵۱	عرفی بطرز شرعی، محفل رقص میں قوالی
(۱۲)	قومی گھن چکر	۱۲۸	حیوان ناطق از قسم بھانتما
(۱۳)	انڈر ٹرائل وف	۲۰۵	لیلیٰ اور قاعدہ بغدادی، مجنوں اور سپارہ ۔۔۔ سے نکلنے کی کیا خبر تھی، یہ کون جانتا تھا مجنوں کے ساتھ پڑھ کر لیلیٰ خراب ہوگی
(۱۴)	ڈریڈ ناٹ	۲۸۰	ہاتھی جو پانی سے نہیں ڈرتا، ڈرید بمعنی خوف، ناٹ بمعنی نہیں
(۱۵)	قتل کی رات	۲۵۹	شب الکشن، دھر پکڑ، لڑائی جھگڑا، دنگا فساد، بحوں۔ میدان کارزار میں مانپوری کی بوکھلاہٹ دوٹروں کی گھبراہٹ، ورکروں کی ہڑبڑاہٹ، گھوڑوں کی کھڑ کھڑاہٹ اور موٹروں کی گھڑ گھڑاہٹ!
(۱۶)	مشکور	۹۲	شکار شدہ، وہ بگلا جس پر توفیق نے بندوق چلائی تھی
(۱۷)	ٹمٹمستان	۲۹۷	ٹم ٹم ستان، گاڑیوں کا اڈا
(۱۸)	اعمالنامہ	۲۶۶	بیلاٹ پیپر، ووٹ کا ٹکٹ ع من نیز حاضری شوم تصویر جاناں در بغل
(۱۹)	سودائی	۱۴۲	وہ بدنصیب جس کی دونوں آنکھیں پھوٹ گئی ہوں یعنی لیڈروں پر اعتراض کرنیوالا۔
(۲۰)	عرفہ کا روزہ	۲۵۹	جس روز حاجی بابا اور علی بابا قسم کے لوگ دوڑ کے برچھا پھینک مارنے کے لئے عرفات میں پانی ریس، ٹم ٹم ریس، سائیکل ریس، موٹر ریس اور نیز ڈنکی ریس (DONKEY RACE) کہتے ہیں
(۲۱)	عالمگیر مصیبت	۱۷	اب چراغ لیکر ڈھونڈنے سے بھی ماما ہیں نہیں ملتی
(۲۲)	میدانِ قیامت	۲۶۵	الکشن وارڈ، یعنی الکشن کی صبح کو۔
(۲۳)	طوائف الملوکی	۱۳۱	محبت آشرم میں رقیبوں کی
(۲۴)	الکشن ورک	۲۵۷	جال پھانس، دغا فریب، بہکانا پھسلانا، دباؤ، خوشامد۔
(۲۵)	شیفتنی التوحید	۹۰	ـــــ ایک تین اور تین ایک ہے مثلاً شیخ میر نتو خاں اشفاق سعید بطنا شیخ، مرزا، پٹھان۔
(۲۶)	آل انڈیا شانتی سبھا	۱۸۰	شانتی بمعنی فنائی الانیون، مثل فنائی الشیخ

پچپن چھُری:-

(۱) اس محلہ کی مسجد کے لئے جو زیادہ رقم دے گا۔ اسی کو کل مسلمان ووٹ دیں گے ۲۵۲
(۲) ابی حضرت! اب جلسہ ختم بھی کیجئے، جو ریزولیوشن کرنا ہوگا گھر پر اطمینان سے کر لیجئے گا۔ ۱۸۲
(۳) الکشن میں شرم و حیا کے جتنے میونسپل کمشنری سے ہاتھ دھو رکھنے کے ہیں۔ ۲۱۰
(۴) ایک اللہ میاں کو خوش کرنے کے لئے سارے جہان کو ناراض کرنا کوئی آسان کام ہے! ۵۶
(۵) انگلش میڈ ہندوستانیوں پر کوئی خاص ڈیوٹی ایسی لگا دینی چاہیئے کہ ان کی ارزانی جاتی رہے ۱۸۵
(۶) انھیں زبان دی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں، مجھے صرف ووٹ دیدیجئے۔ ۲۴۳
(۷) "آپ ہاتھی سے کیوں گرے؟ کیونکر گرے؟ کس طرح گرے؟" — میں نے کہا آئندہ پھر کبھی گر کر بتاؤنگا! ۲۹۱
(۸) الکشن میں وہ وہ خوبیاں ہیں جنھیں کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ بالفعل مجھے اس کا علم نہیں! ۲۵۰
(۹) ایک ووٹ کے بدلے خدا آخرت میں ستر ووٹ کا ثواب دیگا۔ ۲۲۳
(۱۰) آج کل کہاں رہتے ہو یار چماری؟ واقعی الکشن بھی کیا چیز ہے۔ ۲۵۳
(۱۱) بعض شریف پردہ نشیں مامائیں بڑی ذات شریف ہوتی ہیں، ۱۹
(۱۲) بھائیو گاندھی جی کا حکم ہے کہ شانتی کے ساتھ بلا کرو۔ ۲۲۴
(۱۳) بغیر ملک الموت کی مدد کے شکاری تنہا کچھ نہیں کر سکتا۔ ۹۳
(۱۴) بھیو کے رہنے پر تو گاندھی جی یہ ادھم مچائے ہوئے ہیں اگر پیٹ بھر کھانا ملے تو؟ ۲۵۵
(۱۵) بھائیو الیکشن کا زمانہ ہے، جو کچھ کام لینا ہو ووٹ کے قبل لے لو۔ ۲۴۴
(۱۶) بقول مہاتما گاندھی ڈوم چمار مہتر سب بھائی ہیں۔ خالہ زاد، پھوپھی زاد، مادر زاد نہیں، سیاسی بھائی۔! ۲۵۳
(۱۷) بہ ہاتف شرطے ستمہائے نازنیناں ہیں ٭ درازدستیٔ ایں کوتہ آستیناں ہیں ۲۱۷
(۱۸) "پیشاب میں شکر تو نہیں آتی" — مجھے بھی کوئی شوگر فیکٹری سمجھ رکھا ہے! ۷۹
(۱۹) پردہ کی تعریف تو یہی ہے کہ گھر سے باہر آواز نہ جائے، بلله آہستہ آہستہ غور کیجئے۔ ۲۰۹
(۲۰) تاش شطرنج میں دن اس طرح گزار دیتا ہوں کہ روزہ کی تکلیف کیا شام تک کا خیال نہیں رہتا ۸۸
(۲۱) ٹھہرو! ٹھہرو! ہاتھی اُلار ہوا جا رہا ہے، ایسا نہ ہو بیلنس نہ رہنے کی وجہ سے الٹ جائے۔ ۲۸۳
(۲۲) خدا نہ کرے کہ کسی گھر میں بی بی ہو اور ماما نہ ہو، ماما ہو اور بی بی نہ ہو تو چنداں تردد کی بات نہیں۔ ۱۰
(۲۳) خیریت ہوئی کہ آنکھ بچ گئی، واہ بھئی! خوب سنبھل کر گرے!! ۳۰۵
(۲۴) خدا آپ کو گھوڑے کے ڈاکٹر سے ترقی دیکر ہاتھی کا سول سرجن بنا دے، ۳۰۹
(۲۵) رمضان کی پہلی تاریخ ہوئی اور باورچی خانہ میں دن کو اُلّو بولنے لگا، ۷۴
(۲۶) زمانہ ہے آجکل لڑکے کے ساتھ گھُن پسنے کا۔ اور بعض لوگوں کا میرے بارے میں خیال ہے کہ ملک کے حق میں یہ گھن ہے! ۱۴۷
(۲۷) سالنے چہرہ پر پوڈر ملا معلوم ہوتا ہے کہ لوہے کے برتن پر قلعی کی گئی ہے بلکہ باورچی خانہ کی دیوار پر چونے کی قلعی! ۲۱۰

(۲۸)	سولی پر لٹکنا ہاتھی پر ٹنگے رہنے سے کہیں اچھا ہے	۲۷۵
(۲۹)	سچ کہا ہے کسی نے کہ مصیبت تنہا نہیں آتی، یعنی مہمانوں کو بھی ساتھ لاتی ہے،	۱۴۷
(۳۰)	سیاسی قیدیوں میں جتنا جو بے ضرر ہوگا اسی قدر اس کی خاطر مدارات ہوگی۔	۱۷۱
(۳۱)	سائیکالوجی کو دیسی زبان میں علم کھوپڑیالوجی کہتے ہیں۔	۱۲۲
(۳۲)	سیفٹی ریزر سے جھاڑو پھر گئی رخسار پر!	۳۱۶
(۳۳)	شکار کی موت ہی نہیں تو غریب شکاری کیا کرے؟	۹۱
(۳۴)	شادی کے بعد ولیمہ نہ کرنا، ہاتھی نکل جانے کے بعد اس کی دُم اٹکائے رہنا	۱۵۴
(۳۵)	شکار کے لئے ہاتھی پر جائیے تو جنگلوں میں ایک مستقل مچان معلوم ہو!	۲۷۳
(۳۶)	صاحبین کے لئے چند کرسیاں، ایک میز، ایک ٹب، ایک گروڈ، اور تھوڑا سا کاغذ کافی ہے!	۱۸۶
(۳۷)	عجیب شے ہے لنگوٹی سیاسی سادھو کی!	۳۱۵
(۳۸)	فیل بان کے اشارہ پر تعمیل حکم کر رہا ہے! دیکھا ہاتھی کی انسانیت کو؟	۲۷۴
(۳۹)	"کیا آپ چھوٹ گئے؟" — "میں نہیں بلکہ ٹرین چھوٹ گئی"	۳۱۳
(۴۰)	کورٹ شپ اگر ضروری ہے تو شادی کے بعد بھی اطمینان سے ہوتا رہے گا۔	۲۰۳
(۴۱)	کیا پدی کیا پدی کا شوربہ؟ شوربہ ہی نہیں بلکہ قلیہ اور قورمہ؟	۲۸۴
(۴۲)	ع گر کا ارنہ ہے سینہ سپر کیا ہے۔	
(۴۳)	کسی کے ذاتی معاملات میں، خواہ بیوی ہی کیوں نہ ہو، دخل دینا سخت بدتہذیبی ہے	۱۸۸
(۴۴)	گواہوں کو سچے ہونے سے زیادہ ذہین اور حاضر جواب ہونے کی ضرورت ہے	۹
(۴۵)	گھبراتے کیوں ہو! میونسپلٹی میں تمہاری کرسی رکھی ہوئی ہے — میں نے کہا تمہارے منہ میں گھی شکر۔	۲۹۴
(۴۶)	ع گو غلام ہے مگر مذہب سے تو آزاد ہیں!	۳۱۷
(۴۷)	لیڈر شرم و غیرت کی سطح سے کئی فٹ اونچا ہوتا ہے۔	۱۳۹
(۴۸)	لیڈی ڈاکٹر کو مردوں کے علاج سے کیا تعلق؟	۲۰۵
(۴۹)	مہاتما جی کا حکم آیا ہے کہ اچھوت بھائیوں کو اونچی اونچی جگہ دلواؤ۔ بھگوان مہاتما جی کو سوراج ملنے تک زندہ رکھے۔	۲۵۴
(۵۰)	مولوی [illegible] بیٹھنا تہذیب کے خلاف ہے	۲۸۹
(۵۱)	میں میکے جاؤں گی! — اور میں؟	۱۹۶
(۵۲)	میں تو آنکھ بند کئے پلنگ پر دراز تھا، اور دماغ اپنے دانت کے درد میں مصروف!	۲۴۳
(۵۳)	"میرے سر کی قسم!" — آپ صرف سر کی قسم کھاتے ہیں — میں تو پورے دھڑ کی قسم کھانے کو تیار ہوں۔	۱۹۷
(۵۴)	ووٹروں کی مہربانی تو عذابِ جان ہو گئی، جتنے منہ، بلکہ منہ میں جتنے دانت اتنی فرمائشیں،	۲۶۲
(۵۵)	ہیں تو داروغہ مگر آدمی ہیں نہایت خلیق! سوائے سخت سست کہنے کے اور کوئی بات نہیں۔	۹۹
(۵۶)	یہ خاص میرا ذاتی واقعہ ہے جو ممکن ہے کہ آئندہ کبھی پیش آجائے۔	۲۱۴

رئیس فروغ

امیدیں

فضائے تیرۂ شب میں یہ جگنوؤں کی قطار
تری جوان امیدوں کو کیا ہوا اے دل
نفس نفس میں نہیں کیفِ آرزو شامل
نہ یادِ عشرتِ ماضی نہ خوابِ مستقبل

یہ طاقچہ میں لرزتی ہوئی چراغ کی لَو
یہ لَو! یہ تیرہ شبی کی طرف اک اور قدم
اداس، زرد، تنک تاب، ملگجی، مدھم
چراغ ہے کہ کسی فاقہ کش غریب کا دم

اُبل پڑے ہیں کدھر سے یہ شبزدانِ مہیب
فضائے تیرہ میں عفریتِ پرفشاں تو نہیں
کسی گناہ کے جذباتِ رائیگاں تو نہیں
یہ بے نقاب کرم ہائے دوستاں تو نہیں

شراب، چارۂ بے چارگاں پیالہ میں ہے
پیالہ کانپتے ہاتھوں کے اختیار میں ہے
مگر وہ کب کسی گنتی کسی شمار میں ہے
جو زیست معرکۂ زیست سے فرار میں ہے

تری جوان امیدوں کو کیا ہوا اے دل
فضائے تیرۂ شب میں یہ جگنوؤں کی قطار
کہ جیسے دشتِ بلا میں شمیم گیسوئے یار
کہ جیسے سوئے چمن موجِ اولینِ بہار

عشرتِ امروز

جون ایلیا

اس سے پہلے کہ گزر جائیں یہ لمحاتِ بہار
اس سے پہلے کہ یہ کلیاں بھی فسردہ ہو جائیں
اس سے پہلے کہ بدل جائے مزاجِ فطرت
اس سے پہلے کہ یہ حالات بھی مردہ ہو جائیں
اس سے پہلے کہ بہاروں کو نظر لگ جائے
اس سے پہلے کہ نظاروں کو نظر لگ جائے
اس سے پہلے کہ لباسِ شبِ خاموش ہو چاک
اس سے پہلے کہ ستاروں کو نظر لگ جائے

لبِ خاموش کو گفتار پر آمادہ کرو
جذبۂ شوق کو اظہار پر آمادہ کرو

اور اگر تم کو محبت ہی نہیں ہے مجھ سے
رشتۂ نغمہ و نکہت ہی نہیں ہے مجھ سے
ربطِ غمیازۂ خلوت ہی نہیں ہے مجھ سے
ناز کو اب کوئی نسبت ہی نہیں ہے مجھ سے
تو مرے بتکدۂ وہم کو ویراں کر دو
منتظر ہوں مجھے انگشت بدنداں کر دو
غلط انداز اداؤں کو نہ دو اذنِ ظہور
غلط اندیش وفاؤں کو پشیماں کر دو
حسن کا عشق نگہباں — مگر اے جانِ جہاں
شیوۂ وقت بھی خود وقت کا دل بھی لرزاں
کون جانے کہ سرِ شام جلیں کیسے چراغ
کس کو معلوم دمِ صبح جوانی ہو کہاں!!
"شوق" کچھ اور مشاغل سے بھی وابستہ ہے
"فکر" کچھ اور مسائل سے بھی وابستہ ہے
"آرزو" اور منازل سے بھی وابستہ ہے
"جستجو" اور مراحل سے بھی وابستہ ہے
چاند۔ یہ رات کے سینے کا سلگتا ہوا داغ
رنگِ حالات دکھا دے گا اگر تم دیکھو
چاند۔ یہ کتنے ہی مایوس اندھیروں کا چراغ
سارا افسانہ سنا دے گا جو سننا چاہو
اس نے "بابل" کے سمن پوش چمن زار رنگیں
رنگِ تاریخ نکھرتے ہوئے دیکھا ہو گا
"اپابید" و "اجنتا" کے سیہ خانوں پر
ان کی شب ہائے فروزاں میں بھی چمکا ہو گا

چاند۔ یہ رات کے سینے کا سلگتا ہوا داغ
چاند۔ یہ کتنے ہی مایوس اندھیروں کا چراغ

اس نے "اہرام" کی تہذیب کو مرتے دیکھا
بے نیازانہ زمانوں کو گزرتے دیکھا
سرد مہری بھی زمانے کی ہے اس کو معلوم
اس نے تاریخ کے ہر زخم کو بھرتے دیکھا
آؤ اٹھو آؤ کہ یہ رات گزر جائے گی
وقت اک بات ہے اور بات گزر جائیگی
حسن اور عشق کے پابند نہیں ہیں لمحات
فرصتِ شوق و عنایات، گزر جائیگی
سازِ ہستی ہمہ تن سوز ہے اور کچھ بھی نہیں
ہر سحر شامِ غم اندوز ہے اور کچھ بھی نہیں
صنعت و فلسفہ و فکر و تخیل کا مآل
غالباً عشرتِ امروز ہے اور کچھ بھی نہیں

اس سے پہلے کہ یہ کلیاں بھی فسردہ ہو جائیں

قمر شیروانی

ادوار

اے دوست تجھ سے پہلے

ویران زندگی تھی — بے جان زندگی تھی
بے کیف تھیں ہوائیں — بے فیض تھیں گھٹائیں
دل میں تپش نہیں تھی — کوئی خلش نہیں تھی
بے نور تھے سویرے — مسرور تھے اندھیرے
تاروں سے دور تھا میں — یاروں سے دور تھا میں
امید اجنبی تھی — ہر سمت تیرگی تھی
مغرور ہر خوشی تھی — [illegible] ہر خوشی تھی
گو پھول سب حسیں تھے — میرے لئے نہیں تھے
تنہائیوں کے دن تھے — رسوائیوں کے دن تھے
بے حال جی رہا تھا — پامال جی رہا تھا
اے دوست تجھ سے پہلے

اے دوست تجھ سے مل کر

گلفام ہو گیا دل — اک جام ہو گیا دل
دنیا بدل گئی ہے — مشعل سی جل گئی ہے
تارے چمک چلے ہیں — سائے بکھر چلے ہیں
کلیاں چٹکتی ہیں — خوشیاں مہکتی ہیں
[illegible] سا ہے — فطرت کتنی حسیں ہے
امید کتنی جواں ہے — ہر چیز کہکشاں ہے
حالات ہنس پڑے ہیں — دن رات ہنس پڑے ہیں
غم دور ہو گئے ہیں — مستور ہو گئے ہیں
بیداریوں کے دن ہیں — ضو باریوں کے دن ہیں
خوش کام جی رہا ہوں — ہر گام جی رہا ہوں
اے دوست تجھ سے مل کر

قمر الدین اپل

"تکون"

سورج ڈھل چکا تھا۔ خنکی بڑھ چکی تھی۔ سردی کا احساس اب بری طرح ہونے لگا تھا۔

قصبہ کے باہر کچی کے پاور ہاؤس سے ملحقہ باغ میں دو جوان خوش گپیوں میں محو تھے۔ ان کے چہروں پر خوشی تھی اور وہ قہقہے لگا رہے تھے باغ کی باڑھ سے پرے سرسبز شاداب کھیت تھے۔ پتلی پتلی پگڈنڈیاں دور تک چلی گئی تھیں۔ شمال کی جانب ایک سفید بنگلہ نظر آرہا تھا جس کے گرد بیش سنگتروں کا باغ پھیلا ہوا تھا۔

دونوں کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اب ان کے چہروں پر سے مسکراہٹ ناپید ہو چکی تھی اور اس کی بجائے تعجب اور حیرانی کی ملی جلی کیفیت جھلکنے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں اٹھے اور سفید بنگلے کے رخ چل دئے۔ دونوں خاموش تھے اور ان کی نگاہیں بنگلے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

"اسے یہاں رہتے تقریباً دس سال ہو چکے ہیں" ایک نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "کہتے ہیں یورپ کی سیر و سیاحت کے بعد یہاں آیا اور پھر دوبارہ اس قصبہ سے باہر نہیں گیا۔ اس کی عمر چالیس سال سے کم نہ ہوگی مگر اس کی صحت بالکل ویسی ہی ہے جیسی کہ دس سال پہلے تھی۔ بڑا ہی صحت مند۔ وہ ہر صبح سیر کو نکلتا ہے۔ بہترین سوٹ پہنے اس کے ہاتھ میں خوبصورت چھڑی ہوتی ہے۔ اونچا۔ لمبا۔ اور تیکھے نقش۔ آنکھوں میں ہمیشہ ایک مسکراہٹ۔ مگر اس مسکراہٹ میں ایک بجھی ہوئی سنجیدگی ہوتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کی دماغی حالت متوازن نہیں ہے ـــ شک مجھے بھی ہے مگر"

"یہ تم کیسے کہتے ہو ۔۔۔ وہ تو ایک عظیم آدمی ہے۔ سارا ملک اسے جانتا ہے" دوسرے نوجوان نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"بات یوں ہے کہ مجھے کچھ ذاتی تجربہ ہے جس کی بنا پر میں یہ کہہ رہا ہوں ـــ سنو میں تمہیں بتاتا ہوں۔ وہ بڑا مہذب ہے۔ ہر ایک سے بڑے تپاک سے ملتا ہے ۔۔۔۔ مگر ایک بات ۔۔۔۔ پر ٹھہرو۔ بہتر ہوگا کہ پہلے اس کی شخصیت کے بارے میں تمہیں کچھ بتا دوں۔ وہ سگریٹ بہت زیادہ پیتا ہے۔ اس کے لباس سے، اس کے عمدہ ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ کتنی شہرت کا مالک ہے۔ میں نے خود اس کے چند فلسفیانہ مضمون پڑھے ہیں۔ اس کی تحریروں سے اس کی شخصیت اس طرح ابھرتی ہے کہ پڑھنے والے کی بات پر چھا جاتی ہے اور نئے نئے اور اچھوتے نظریات قاری کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں ـــ وہ زندگی کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے سوچتا ہے۔ اور شاید یہی اس کی شہرت کا راز ہے۔

یہاں اس قصبہ میں۔ میں نے بڑے بڑے ادب دوست لوگوں اور فلسفہ سے دلچسپی لینے والوں کو آتے جاتے دیکھا ہے۔ وہ اسے ملتے ہیں مگر یہ بڑی ہی عجیب بات ہے کہ اس سے ملنے کے بعد وہ اپنی پہلی رائے کو بدل دیتے ہیں۔ مجھے چند ایک سے ملنے کا اتفاق ہوا ایک نے اس کے متعلق بتایا کہ وہ صرف ایک "شو پراپرٹی" ہے۔ دوسرے نے کہا کہ وہ پاگل ہے۔ تیسرے نے کہا کہ تحریروں میں اس کی

یں ہو سکتیں ۔ وہ تو بس ایک پتھر ہے ۔ اسے ادب سے ذرا بھی لگاؤ نہیں ۔ وہ بزدل ہے ۔ فراری ہے اور رومان پسند ہے

تو یہ سب باتیں ان لوگوں کی ہیں جو اس سے ملے ہیں ۔ مگر میں نے ان ہی لوگوں کو پھر آتے دیکھا ہے وہ واپس آتے ہیں ۔ اس سے ملنا پسند کرتے ہیں اور اس کی معیت میں ایک ان جانی خوشی محسوس کرتے ہیں ۔ ان میں سے کچھ نے مجھ سے اس بات کا اعتراف بھی کیا ۔ میں نے کالج کے طالب علموں کو یہاں آتے دیکھا ہے ۔ شکاری اس کے بنگلے پر قیام کرتے ہیں ۔ تفریحی پارٹیاں اس کے ہاں آکر ٹھہرتی ہیں ۔ اور اس کے دن اسی طرح گزر رہے ہیں ۔

اس کے پاس بظاہر ایک ملازم بھی ہے جو درحقیقت ملازم نہیں ہے جب کبھی ملاقاتی عورتیں اور لڑکیاں آتی ہیں تو وہ فوراً جا کر سے آتا ہے مگر عام ملاقاتیوں میں قطعاً دلچسپی نہیں لیتا ۔ بس اس کی یہی کائنات ہے ۔ نہ اس کی کوئی بیوی ہے نہ ہی کوئی بچہ ۔ میں نے یہاں بہت سی باذوق خواتین کو آتے جاتے دیکھا ہے ۔ میری ان سے باتیں ہوئیں ۔ ایک نے کہا "وہ جتنا خوبصورت ہے اتنی ہی خوبصورت اس کی تحریر ہوتی ہے ۔ مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ باتیں کرتے کرتے وہ بنگلے کے دروازے کو کیوں گھورنے لگتا ہے ۔" دوسری کہنے لگی "نہ جانے اس نے اس بوڑھے ملازم کو کیوں رکھ چھوڑا ہے ۔ اسے تو اچھی طرح چائے بنانا بھی نہیں آتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ افسوس ایسا آدمی اور تنہائی"

لوگ تو شاید اس کے متعلق یہی کچھ جانتے ہیں مگر مجھے کچھ زیادہ ہی علم ہے ۔ ایک رات میں بنگلے کے قریب سے گزر رہا تھا ۔ رات آدھی سے زیادہ جا چکی تھی ۔ مجھے بوڑھے کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی ۔ "تم بزدل ہو ۔ تم پاگل ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ نہیں آئے گی" ۔ جواب میں تیز آواز سنائی دی ۔ "خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ضرور آئے گی" ۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی ۔ مجھے یوں محسوس ہوا ۔ جیسے کوئی ہچکیاں لینے لگا ہو ۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے سارے بدن میں دوڑ گئی ۔ پہلا موقع تھا ، دوبارہ میں ادھر سے نہیں گزرا ۔

بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے اس بات پر زیادہ توجہ دی ہو کہ وہ ہر روز ریلوے سٹیشن جاتا ہے ۔ سردی گرمی ۔ بارش طوفان ۔ اسے کسی چیز کی بھی پرواہ نہیں ہوتی ۔ تم اسے ہر روز شام کے وقت سٹیشن کے پلیٹ فارم پر دیکھ سکتے ہو ۔ وہ گاڑی آنے سے پہلے پلیٹ فارم پر پہنچ جاتا ہے اور پھر گاڑی آنے پر ہر ڈبے کو دیکھتا ہے ۔ جیسے وہ کوئی کی آمد کا منتظر ہو ۔ جب گاڑی چل پڑتی ہے تو چھڑی کو بغل میں دبائے بنگلے کا رخ کرتا ہے ۔ یہ اس کے کیریکٹر کی اچھوتی چیز ہے ۔ مجھے پتہ ہے وہ اسٹیشن پر کیوں جاتا ہے ؟

مجھے دس سال ہو چکے ہیں اور میں نے ہمیشہ اسے سٹیشن کی طرف جاتے دیکھا ہے ۔ ہر شام کو ، گرمی میں ، سردی میں اور بارش میں ۔ شام ہو رہی ہے ۔ چلو چلیں ۔ واپس چلیں ، کیوں کہ اب اس کے سٹیشن جانے کا وقت قریب آ رہا ہے ۔ کل صبح مل لیں گے ۔ میں تمہیں اس کی اور اپنی پہلی اور آخری ملاقات کے بارے میں کچھ بتاؤں گا ۔ وہ ایک عظیم فنکار ہے ۔ مگر اس رات وہ بچوں کی طرح رو پڑا تھا"

۲

دونوں جوان پاور ہاؤس سے ملحقہ ریسٹ ہاؤس میں بیٹھے ہوئے تھے ۔ دونوں کے ہاتھوں میں چائے کی پیالیاں تھیں کھڑکیوں سے باہر دور تک کھیت نظر آ رہے تھے ۔ شام ہو رہی تھی اور سورج کی بے جان کرنیں کھڑکیوں کے شیشوں سے گزرتی ہوئی کمرے میں زردی مائل روشنی پھیلا رہی تھیں ۔

"اسی پگڈنڈی سے ۔ یہ جو بائیں طرف ہے" پہلے جوان نے اشارہ کرتے ہوئے کہا اور جلتی ہوئی انگیٹھی کو قریب کر لیا ۔

"وہ ہمیشہ گزرتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ دیکھو ۔ درختوں کے پیچھے وہی ہے ۔ دیکھو اس کا اوور کوٹ ۔ پتلون ۔ ۔ ۔ ۔ ٹائی ۔

"اور اس کی چھڑی کتنی خوبصورت ہے !" دوسرے جوان نے اشتیاق سے دیکھتے ہوئے کہا ۔

اس شام بھی وہ اسی پگڈنڈی سے گزرا تھا ۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور آسمان پر بادلوں کا ہجوم تھا ۔ وہ بھیگتا ہوا گزر گیا اس

وقت مجھے احساس ہوا جیسے — جیسے وہ واقعی کسی کے خیر مقدم کے لئے جا رہا ہے، کسی کو لینے جا رہا ہے . . . . کوئی آ رہا ہے آج وہ اکیلا واپس نہیں لوٹیگا۔ میں یہ سوچتے سوچتے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اور پگڈنڈی کو گھورتا رہا۔ بارش کی ہلکی ہلکی پھوار میرے بالوں کو بھگوتی میرے کوٹ میں جذب ہوتی رہی۔ ہوا جیسے جسم کو چیر رہی تھی اور درختوں کے پتے شور مچا رہے تھے۔ دور اسٹیشن کی دھندلی عمارت نظر آ رہی تھی وہ تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ میں کھڑا اس کی پشت کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ آخر درختوں اور کھیتوں میں گم ہو گیا۔ میری نظروں سے چھپ گیا۔

مجھے یہاں آئے دو سال گزر چکے تھے۔ وہ ہر شام میری آنکھوں کے سامنے سے گزرتا رہا تھا۔ پھر اکیلا ہی واپس پلٹتا رہا تھا اور مجھے کبھی اتنا شدید احساس نہیں ہوا تھا جتنا اس ابر آلود شام اور سرد موسم میں ہوا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ آج رات جب واپس لوٹیگا تو اس کے ساتھ وہ اجنبی ہوگا جسکا اسے عرصے سے انتظار ہے۔ ہاں میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ بارش تیز ہونے لگی۔ میں چونکا اور ادھر ادھر دیکھا میرے قریب ہی دو تین گز کے فاصلے پر ایک کاغذ پھڑپھڑا رہا تھا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اٹھا لیا۔ کیچڑ صاف کیا۔ وہ ایک لفافہ تھا۔ تار کا لفافہ۔ اسی کھڑکی کے قریب بیٹھ کر میں نے لفافہ کو دیکھا۔ اسکا نام لکھا ہوا تھا۔ تو میں ٹھیک سوچ رہا تھا کہ آج رات وہ اکیلا ہی نہیں لوٹیگا۔ مگر نہیں اچانک میری نظر تاریخ پر نظر گئی۔ دو سال پرانی تاریخ۔ تو یہ بہت پرانا تار تھا۔ طبیعت نے چاہا کھول کر پڑھ لوں مگر ایسا نہ کر سکا مجھے محسوس ہوا جیسے وہ میرے بالکل قریب کھڑا مجھے گھور رہا ہے۔ میں انتظار کرنے لگا کہ وہ آئے اسے دے دوں۔

چوتھائی رات جا چکی تھی جب وہ لوٹا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ وہ سر سے لیکر پاؤں تک بھیگا ہوا تھا۔ وہ رکتا۔ پھر چلتا۔ لفافے کی تلاش میں وہ پگڈنڈیوں میں ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ سردی کی ایک تیز لہر میری پشت میں اتر گئی۔ میں بھاگا۔

"صاحب . . . . . ادھر آجایئے۔ خدا کے لئے اندر آجایئے۔ سردی سخت ہے۔" میں نے پکارا۔

وہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد ہماری کبھی بات چیت نہیں ہوئی، مگر اس رات کی واردات کا ہر حصہ میری آنکھوں میں نقش ہو گیا ہے اور ایک ایک لفظ مجھے یاد ہے . . . . . تو وہ رک گیا۔

"آیئے . . . . . آجایئے۔ آپ کی گم شدہ چیز میرے پاس ہے۔ آیئے کمرے میں چلیں . . . . . آج سردی بہت ہے۔ آپ سر سے پاؤں تک بھیگے ہوئے ہیں . . . . . اوہ . . . آپ کو سردی محسوس نہیں ہوتی۔" میں نے اس کی چھتری کو پکڑتے ہوئے کہا۔ اس نے چھتری چھوڑ دی اور مجھے تکتا ہوا خاموش میرے ساتھ اندر آگیا۔

"چائے بناؤں آپ کے لئے؟ سردی ہے نا۔ اور یہ لیجئے کپڑے۔ آپ کے کپڑے بھیگے ہوئے ہیں۔"

اسنے مجھے کوئی جواب نہ دیا۔

"یہ ہے آپ کی گمشدہ چیز" میں نے لفافہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے لفافہ لے لیا۔ پھر کھول کر پڑھا۔ پڑھ چکنے کے بعد کوٹ کی جیب میں ڈال لیا جس سے پانی ٹپک رہا تھا میرے دیکھتے دیکھتے اس نے ایک دو دفعہ سانس کو روکنے کی کوشش کی اور پھر یکدم وہ ہچکیاں لینے لگا۔ آنسو . . . . . . اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ رہا تھا۔

"کیوں صاحب کیا بات ہے — خدا کے لئے بتایئے کہ میں آپ کی مدد کر سکوں۔"

وہ خاموش تھا لیکن بہت مضطرب۔ کبھی وہ ہاتھوں کو مسلتا کبھی وہ اوور کوٹ کو مڑوڑتا اور بھیگے کوٹ سے پانی کے قطرے فرش پر گرتے۔ اسوقت وہ فلسفے، ادب اور نظریاتی دنیا سے نکل آیا تھا "دو سال پرانی تاریخ" شاید یہ وقت مناسب ہے۔ میں نے سوچا "صاحب آپ اتنے پریشان کیوں ہیں . . . . . شاید آپ کا مہمان نہیں آیا۔ آجائے گا۔ آج نہیں تو کل۔ خدا کے لئے آپ۔

مجھے پتہ نہیں"

"دو سال ہو چکے ہیں . . . . دو سال"۔ اس نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں اور چہرہ زرد تھا۔ "وہ نہیں آئی —
وہ نہیں آئے گی . . . . مگر شاید وہ کل آجائے"۔ وہ کپکپاتے ہوئے بولا۔

"ہاں صاحب۔ امید پر دنیا قائم ہے"۔ یہ کہتے ہوئے مجھے وہ رات یاد آگئی جب میں بنگلے کے قریب سے گزر رہا تھا — تو وہ کوئی عورت تھی جس کا اسے انتظار تھا۔

"امید ایک جہنم ہے — جہنم۔ دہکتا ہوا جہنم۔ اس نے مجھے لکھا تھا کہ وہ شام کی گاڑی سے پہنچے گی . . . . مگر شام تو کل آئے گی اسوقت تو رات ہے — اوہ اسوقت تو رات ہے . . . . رات"

وہ کسی پاگل کی طرح رونے لگا۔ چھڑی اس کے ہاتھ میں لرز رہی تھی۔

وہ پھر بولنے لگا "اس نے مجھے لکھا تھا کہ اسکا جہاز جلد ہی پہنچ جائے گا۔ ایک دن گاڑی میں اور شام کو۔ تیرہ کی شام کو وہ پہنچ جائے گی۔ اس نے مجھے تار بھیجا تھا۔ مگر وہ نہیں آئی — شاید کل شام — دور — دور سمندر پار — اس کے باغیچے میں سنگترے کے درخت تھے۔ جب بارش کی ننھی ننھی بوندیں سنگتروں پر پڑا کرتی تھیں تو ساز بجنے لگتا تھا — تم نے کبھی یہ ساز سنا ہے۔ ہم ان درختوں کے نیچے پہروں بیٹھے ہنستے تھے۔ دنیا خاموش ہوتی تھی۔ اس سکوت میں اس کے مترنم قہقہے ایک نئی دنیا کی تخلیق کا باعث ہوا کرتے تھے آہ . . . . وہ دنیا جواب بھی میرے بنگلے کے باغیچے میں سسک رہی ہے — وہ نہیں آئی — اس نے مجھے لکھا تھا۔ وہ تیرہ کی شام کو پہنچ جائے گی . . . . مگر تیرہ چودہ۔ پندرہ۔ وہ نہیں آئی۔ بہت سے ہیولے میرے باغیچے میں تیرتے رہتے ہیں۔ ہاں ان میں سے کوئی بھی تو — کوئی بھی تو میری انفرادیت نہیں چھینتا۔ کوئی بھی تو میرے چہرے پر طمانچہ نہیں مارتا۔ میری آواز اٹھتی ہے تو سب میرا ساتھ دیتے ہیں — میرا ساتھ دیتے ہیں۔ کوئی بھی تو باغی نہیں۔ میری شعوری پختگی کی بنیادوں کو کوئی بھی تو نہیں ہلاتا . . . . سب "ہاں" کہتے ہیں۔ کسی کا سر انکاری جنبش کا اظہار نہیں کرتا۔ اور وہ . . . . . وہ مجھے رلایا کرتی تھی۔ میرے گالوں پر طمانچے مارا کرتی تھی اور پھر موسیقی کی مدہوش کن تانیں — ایسی ہی بارش میں — نئی دنیا کی نئی بہاروں کا پیغام دیا کرتی تھیں — نہیں سمجھے میرے دوست وہ نہیں آئی۔ وہ سکوت کو طوفانوں میں بدل دیا کرتی تھی۔ وہ میرے ٹھوس نظریات کو دھوئیں میں تبدیل کر دیا کرتی تھی . . . . مگر دھند میں۔ اور پھر جب سورج کی گرم شعاعیں سنگتروں کے باغ کو آگ لگا دیا کرتی تھیں تو میں شبنم سے نہاتے ہوئے پھول کی مانند دمکنے لگتا تھا — وہ دن . . . . . وہ دن چلے گئے — مگر نہیں وہ دن نہیں گئے۔ میرے باغیچے میں وہ ساز بجتا رہتا ہے — وہ آتی ہے، وہ ہر روز آتی ہے۔ وہ ہر رات آتی ہے مگر یہ بہت سے ہیولے۔ یہ بہت سے سائے کیا تلاش کرتے رہتے ہیں۔ یہ کیوں میرے کمروں میں چھپتے ہیں — میرے قلموں کو صاف کرتے ہیں — میرے بستر کی چادریں بدلتے ہیں — میری کتابوں کو جھاڑتے پونچھتے ہیں۔ کیوں — آخر کیوں۔ مجھے اسکا انتظار ہے جو میری کتابوں کے ورق فضا میں بکھیر دے گی — جو میرے قلموں کو ٹکڑوں میں تبدیل کر دے گی۔ جو قہقہوں میں اچھال دے گی اور . . . . اور پھر اپنی بانہوں کو پھیلا دے گی۔ وہ ضرور آئے گی۔ تیرہ کی شام کو۔ چودہ کی شام کو۔ پندرہ کی شام کو۔ مگر اسے اکیلے آنا ہوگا۔ بالکل اکیلے . . . . . ہاں وہ اکیلے ہی آتی ہے وہ اپنے سفید کتے کو۔ نہیں سمجھے! سفید کتے کو۔ جس کے گلے سے نکلتی ہو . . . . . مزاح اور آوازنے سے میری روح پر خراشیں پڑی ہوئی ہیں — میں نے اس کتے کو دیکھا ہوا ہے — وہ اسے پیچھے چھوڑ آئے گی۔ ہاں بہت پیچھے — وہ اکیلے ہی آئے گی اور پھر . . . . . .

میرے دوست۔ تم کتنے معصوم ہو . . . . . تمہاری آنکھوں سے شعور کا بدنما داغ نہیں جھلکتا۔ ہاں گناہوں کا احساس یہ

لمحوں کا احساس . . . . تم کتنے بھولے ہو . . . . آنا کبھی - میں تمہیں اس راز سے آشنا کروں گا اور پھر تم بھول جانا . . . . سمجھ لینا وہ صرف ایک خواب تھا ۔ آنا کبھی - میں تمہیں سجے ہوئے کمرے دکھاؤں گا . . . . . مگر وہ نہیں آئی ۔ اسے پھولوں سے والہانہ پیار تھا ۔ رمیرے باغیچے میں پھولوں کے تختے ہیں - میرے دوست ۔ میری طرف اس طرح نہ دیکھو . . . . . . شعور نے مجھے مجرم بنا دیا ہے ۔

سمندر کی چھاتی سے کتنی جہاز ابھرے ۔ مگر وہ نہیں آئی - وہ جھوٹ نہیں بولا کرتی تھی ۔ مشرق اور مغرب کے ملنے کا وقت آ گیا ا۔ مگر وہ سیاہ اور سفید دھاگا ابھی تک بدستور قائم ہے - اپنی اپنی جگہ ۔ خلوص اور فریب ابھی تک آمنے سامنے کھڑے ہیں - میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے —— اپنی آنکھوں سے میرے دوست — سفیدی فریب پر مائل ہو جاتی ہے اور سیاہی سما کر رہ جاتی ہے ۔ ہاں یہ سب کچھ ۔ میرا مطلب سیاہی اور سفیدی سے ہے — یہی کچھ — جو کچھ بھی نہیں — جو صرف دھواں رغبار ہے . . . . محبت کی بنیادوں کو کھا گیا ۔

"سمندر کے کنارے میں نے طویل انتظار کیا . . . . طویل انتظار" ۔

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا ۔ سگریٹ سلگا کر دھوئیں کے بادل اڑاتے ہوئے کمرے میں ٹہلنے لگا ۔ میں خاموش تھا ۔

"میں نے ایک سال سمندر کے کنارے گزارا" - یہ کہہ کر اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹا سا تکونا پتھر نکال کر سے تکنے لگا ۔ میں حیرانی سے اس پتھر کو دیکھ رہا تھا ۔ تھوڑی دیر وہ کھڑا رہا اور پھر انگیٹھی کے پاس کرسی پر آ بیٹھا ۔

"ایک دن سمندر کے کنارے . . . . ریت کی تہوں میں سے . . . . . . یہ . . . . یہ جو تم دیکھ رہے ہو ۔ اس نے مجھے روک لیا ہے کانچ کا ٹکڑا ہے کسی تھالی کا یا کسی برتن کا . . . . . واقعی کانچ کا ٹکڑا ہے - دیکھتے ہو اس پر رنگین بیل ۔ مگر اس تکون کے نوکیلے نارے کہاں چلے گئے - تیز اور نوکیلے کنارے ! . . . . ہچکولے . . . . زندگی ہچکولے کی طرح ہے - یہ اتھاہ سمندر ہچکولوں کا ہے - اس بدقسمت کانچ کے نوکیلے کنارے اسی سمندر نے کھا لئے ہیں . . . . دیکھتے ہو اس کے تینوں کونے کیسے صاف اور گول گئے ہیں . . . . . یہ میں ہوں . . . . میں جو تمہارے سامنے کھڑا ہوں" ۔

یہ کہتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا ۔

"مگر ابھی میرے کونوں میں چبھن ہے - یہ گول نہیں ہوئے — میرے دوست یہ بیل ابھی رنگین ہے ۔ ابھی اس کی . . . . میں تمہیں کیسے سمجھاؤں - تھپیڑوں ، —— بوچھاڑوں اور کرب ناک چیخوں کے بعد . . . . کیونکہ میں نے سوچا ہے ۔ میں نے ت سوچا ہے - زندگی کی آسائشوں کے چھن جانے اور کم مائیگی سے یا محرومیٔ روزگار سے کبھی . . . . کبھی بھی چیخ بلند نہیں ہوتی میرے دوست - وہ چھننے کا احساس ہے جو ہمارے تیز اور نوکیلے کناروں کو کھا جاتا ہے اور پھر ہم آہ بھرتے ہیں ۔ میں ایک تکون لڑھک رہی - تیز کونوں والی تکون - ہزاروں تھپیڑے سہنے پڑیں ۔ لاکھوں ہچکولے آئیں ۔ یہ موجیں مجھے نڈھال نہ کر سکیں گی ۔ کیونکہ ننگا ہوں . . . . . بالکل ننگا ۔ مجھ سے میری ہر چیز چھن جائے . . . . . ہاں ہر چیز ۔ مگر میری انفرادیت ۔ میری نظریاتی زندگی کبھی اس سمندر میں ضائع نہیں ہوگی ۔ میں چیخ نہیں بلند کروں گا اور وہ احساس خود پر طاری نہیں ہونے دوں گا ۔ میں ہر شام اسٹیشن پر ؤں گا . . . . ہر شام —— کون مجھے روک سکتا ہے ؟ بولو . . . . بولو"

وہ ایک دم چیخنے لگا ۔ میں بت کی مانند کھڑا تھا ۔

"صاحب ۔ آپ کو بھلا کون روک سکتا ہے ؟" میں نے پریشان ہوتے ہوئے جواب دیا ۔

"تو پھر وہ ضرور آ جائے گی ۔ ایک شام وہ ضرور آ جائے گی - وہ بوڑھے کی جگہ لے لیگی . . . . مگر نہیں ۔ وہ میرا پیرا نا ساتھی

۔ اس نے مجھے گود میں پالا ہے۔ اس وقت جب میں تنہائیوں میں رویا کرتا تھا تو اس کی انگلیاں میرے آنسو پونچھا کرتی تھی۔ میں نے اپنی ماں نہیں دیکھا اور میں نے اپنے باپ کو بھی نہیں دیکھا۔ قحط کے دنوں میں مجھے سڑک کے کنارے چھوڑ کر چل دئے تھے وہاں وہ یہی کچھ کہتا ہے۔ میرا ذکر نہیں۔ ... کاش وہ مجھے یہ زندگی نہ بخشتا ... اب وہ مجھ سے جھگڑتا ہے۔ مجھے پاگل کہتا ہے ... وہ چاہتا ہے کہ میں اسٹیشن نہ جاؤں گا مگر وہ مجھے روک نہیں سکتا ... میں ضرور جاؤں گا۔ ایک رات وہ آجائے گی ... وہ مجھے رلائے گی اور پھر ہنسائے گی۔

میرے دوست کبھی تم نے ہنستے ہوئے آنسو نہیں بہائے۔ وہ اندوہ کتنا لذت انگیز ہوتا ہے جو خوشی سے مخلوط ہو ... وعدہ کرو، تم اسٹیشن پر نہیں جاؤ گے ... وعدہ کرو ... مجھے جانے دو۔ مجھے جانے دو۔ بارش ہو رہی ہے"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکلا اور پگڈنڈیوں پر لڑھکتے مجھے محسوس ہوا جیسے کانچ کی ایک تکون لڑھک رہی ہے"

یہ کہہ کر پہلا جوان خاموش ہو گیا

"لوگ کہتے ہیں وہ پاگل ہے شک مجھے بھی ہے" پہلا جوان پھر بولا۔ "مگر شاید وہ پاگل نہیں ہے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ... مگر میں تمہیں اپنا فیصلہ نہیں سناتا۔ کل تم خود ہی دیکھ لینا"۔

دوسرا جوان خاموش بیٹھا کھڑکی سے باہر تک رہا تھا۔ اس نے گردن کو موڑا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

"میرے خیال میں یہ بہت کافی ہے۔ ملاقات کی شاید اب ضرورت نہیں رہی ... مجھے بھی اپنی انفرادیت عزیز ہے ... سردی بڑھ رہی ہے ... کیا خیال ہے انگیٹھی میں کوئلے نہ ڈال دیں؟"

پہلا جوان انگیٹھی میں کوئلے ڈالتے ہوئے کہنے لگا "طبیعت میری بھی نہیں چاہتی کہ اس سے ملوں ... بہتر ہو گا کہ کل پچھلی کا شکار ہو"۔

دوسرے نے تپائی اور الماری کھول کر مچھلی کے کانٹے اور دوسرا سامان نکالنے لگا۔ "کیسے فرصت ہے" "کیسے فرصت ہے" وہ آہستہ آہستہ بڑبڑا رہا تھا اور باہر ہوا ندردوں پر تھی۔ درخت شور مچا رہے تھے۔

محمود علی

گراؤنڈ فلور سے پانچویں منزل تک

سیڑھیاں چڑھتے وقت تو عبد العزیز کے حوصلے بہت بلند تھے۔ انھیں اپنی کامیابی کی توی امید تھی ۔ دو تین گھنٹوں تک دل ہی دل میں وہ اپنی روداد سنانے کی مشق کرتے رہے تھے ۔ کام تو آج کیا ہی نہیں تھا اب تو انھیں یہی دھن تھی کہ جب ملک جی پوچھیں گے ! شیخ جی آپ نے نوکری کیوں چھوڑی ؟ آپ تو اتنے پرانے ملازم تھے ہماری فرم کے ..... ؟ تو وہ بس پھٹ پڑیں گے ۔ اپنا دل کھول کے رکھ دیں گے ملک جی کے سامنے !

پہلی سیڑھی پر قدم دھرتے وقت ان کے ذہن میں اس ڈرامہ کا ایک جامع تصور تھا ۔ ایک واضح نقشہ ...... وہ پہلے آگے بڑھ کر ملک جی کو سلام علیکم کہیں گے ...... ملک جی (جو ان کے پاس سے بیگانوں کی طرح گزر جاتے ہیں) کم از کم اس وقت تو انھیں وہاں دیکھ کر کرسی سے اچھل پڑیں گے ... شاید آگے بڑھ کر ہاتھ بھی ملائیں ...... پھر ملک جی کہیں گے : شیخ جی ! ——— اور پھر .... اور پھر ——

ساتویں آٹھویں سیڑھی پر ہی ان کا دم پھول گیا ۔

اتنی مشق بھی تو نہیں ان سیڑھیوں پر چڑھنے کی ۔ شیخ صاحب سوچنے لگے ..... ان ستائیس سالوں میں ، میں بھلا کتنی مرتبہ چڑھا ہوں گا ۔ ان سیڑھیوں پر ! ارے ! میری بھی عقل سٹھیا گئی ہے ۔ بھلا یہ عمارت ستائیس سال پرانی ہے ۔ !

وہ واقعی بھول رہے تھے ۔ ستائیس سال پرانی تو ان کی ملازمت تھی نہ کہ عمارت ! ۔

اسے بنے ہوئے تو دس ایک سال ہوئے ہوں گے ۔ انھوں نے اپنی غلطی درست کر لی ۔ ہاں ۔ یاد آیا ۔ ابھی پاکستان نہیں بنا تھا ..... ملک جی کو ایک عرصے سے جو خواہش تھی وہ پوری ہوئی تھی ۔ پانچ سال لگ گئے تھے تیاریوں میں پورے پانچ سال ۔ فرم کے ایک ایک شخص نے جی جان لگا کر کام کیا تھا ۔ تب کہیں جا کر کلام مجید کا نیا ایڈیشن چھپا تھا ۔ یہ منقش ، رنگین ، بیل بوٹے دار حاشیوں والا ایڈیشن ، جو نستعلیق اردو کے ترجمہ و تفسیر کے ساتھ چھپا تھا ۔ کتنا مقبول ہوا تھا ! تب تو دلی ۔ بمبئی مدراس اور کلکتے تک مال جاتا تھا ۔ باہر کے ملکوں سے بھی اس نئے اڈیشن کے لئے بے شمار آرڈر آئے تھے ۔ کیا چھاپے خانے والے ، کیا دفتر والے ۔ کیا ہیڈ آفس والے ... ۔ سب کو دن رات ایک کرنا پڑتا تھا تب بھی گاہکوں کی مانگ پوری نہ ہوتی تھی ۔ خود ان کا کیا حال ہوا کرتا تھا ان دنوں ! صبح سے شام تک کلام مجید کی جلدیں پیٹیوں میں پیک کرانا ، پھر انھیں ادھر ادھر مختلف سمتوں میں بھجوانا ۔ یہ کام ہوتا ہے احتیاط کا ۔ کہیں بھول چوک نہ ہو جائے ۔ کہیں اللہ کے پاک کلام کی بے ادبی نہ ہو جائے ..... رات کے آٹھ آٹھ بج جاتے تھے ۔ کمر جھک کر دوہری ہو جاتی تھی ۔ مگر چھٹی نہیں ملتی تھی پھر جب گھر پہنچتے تو اللہ بخشے جمیلہ کی ماں وہی روز کے قصے لے بیٹھتی تھی ۔ ایک بچے کو بخار ہے ۔ دوسرے کی آنکھیں دکھ رہی ہیں ۔ جمیلہ کی شادی کی فکر کرو ۔ حمید کو اسکول سے دو آنے جرمانہ ہوا ہے ... یہاں کہاں دماغ ہوتا تھا یہ باتیں سننے کے لئے ۔ بس بان کی چارپائی پکڑی اور آنگن میں ڈال کر پڑ رہے ۔

ہاں تو یہ عمارت انھیں دنوں بنی تھی ۔ شیخ صاحب نے جمیلہ کی ماں اور جمیلہ وغیرہ کے خیال سے جلدی پیچھا چھڑا لیا ۔ اس سال کاروبار میں اتنی برکت ہوئی تھی کہ ملک جی نے چھپائی کی نئی مشینیں اور ڈھیروں دوسرا سامان ولایت سے منگوایا تھا ۔ انھوں نے اسکیم بنائی تھی کہ چھاپہ خانہ ۔ دفتر ۔ سیلز ڈپو اور ہیڈ آفس ——— اور خود ملک جی کا اپنا دفتر سب ایک ہی جگہ ہونے چاہئیں ۔ دیکھتے ہی دیکھتے عمارت کے نقشے بن گئے اور آخر ایک دن اللہ کا نام لے کر ملک جی نے عمارت [illegible] منزل کی

برکھدی. . . . . . . کاروبار میں کچھ تو پہلے ہی برکت تھی . . . . پھر یہ عرفان منزل ایسی بھاگوان بنی۔

شیخ صاحب کا ذہن شاید دس سال لمبی اس شاہراہ پر چل پڑا تھا۔ ملک جی کی زندگی میں دن بدن لہر بہر ہی ہوتی گئی۔ اور اب کوئی ایک عمارت تھوڑے ہی ہے! ماشاءاللہ دو تین کوٹھیاں ہیں۔ دکانیں ہیں۔ اپنے رہنے کے لئے عالیشان بنگلہ ہے۔ موٹر کار ہے۔

اس سے آگے شیخ صاحب کچھ نہ سوچ سکے۔ پھولے ہوئے سانسوں اور لاغر جسم کے ساتھ وہ آدھے سے زیادہ سیڑھیاں چڑھ گئے تھے۔ منزل نزدیک تھی۔ پھر جب مستقبل دو چار قدم ہی رہ گیا ہو تو ذہن کو ماضی کی گپھاؤں میں ڈالنے سے کیا فائدہ؟ ورنہ سوچتے سوچتے شاید انھیں یہ بھی یاد آجاتا کہ ملک جی کی زندگی میں یہ لہر بہر دس سال سے ہی نہیں بلکہ اسی دن سے در آئی تھی جب ان کا چچا مرا تھا۔ جب شیخ صاحب اور ملک جی ایک ہی چھاپے خانے میں ملازم تھے۔

ملک جی کا چچا لاولد ہی مر گیا تھا۔ نہ اس نے اپنے پیچھے بیوی چھوڑی نہ بچے۔ نہ بہن نہ بھائی۔ لے دے کے اپنے ماں باپ کے اکلوتے فرزند ملک جی ہی تھے جنھیں دس ہزار کی (ان دنوں میں گرانقدر) رقم بلا شرکت غیرے ہاتھ آگئی تھی۔

"تیری زندگی میں لہر بہر ہو جائے گی بچے۔" کسی بزرگ نے ملک جی کو بشارت دے دی تھی . . . . . . "کسی نیک کام میں ہاتھ ڈالیو"

ملک جی ہاتھ کی مشین لے کر بیٹھے تھے۔ شروع شروع میں لیبل، اشتہار، پرچیاں اور ایسا ہی چھوٹا موٹا کام ملتا رہا۔ پھر جب کام بڑھا اور چار پیسے بھی جمع ہو گئے تو انھیں کسی دوسرے کی مدد کی ضرورت پڑی۔

وہ زمانہ . . . . شیخ صاحب کی یادوں کے انبار تلے یہ بات بھی کہیں نہ کہیں دبی ہوگی . . . . . . کیسا بے تکلفی کا زمانہ تھا وہ۔ ایک ساتھ مل کر کام کرنے کا دور! ان دنوں تو اب تب اور تو تڑاق بھی ہو جاتی تھی۔ اس انبار کو شیخ صاحب نے سیڑھیوں پر چڑھنے سے پہلے اُلٹ پلٹ لیا تھا۔ اور کچھ چیزیں۔ بیتے دنوں ضروری پتے بھی باندھ لیں تھیں کہ شاید اوپر پہنچ کر کام آ جائیں۔

مگر یہ تو پلک جھپکنے کی سی بات تھی۔ بے تکلفی تو تھوڑے ہی دن رہی . . . . . . جب ملک جی کو بڑے بڑے کام ملنے لگے جس کے لئے انھیں چھپائی کی مشین اور دیگر ساز و سامان بڑھانا پڑا تو ضروری بات تھی کہ ملازموں کی تعداد بھی بڑھتی۔ پھر تجارت، کاروبار کی دیکھ بھال اور لین دین . . . . یہ سب کچھ ہنسی ٹھٹھا تو ہے نہیں! کیا تعجب تھا کہ اب ملک جی کو شیخ صاحب سے ہنسنے بولنے کی اتنی مہلت نہیں ملتی تھی۔ یوں بھی تنخواہ پانے اور تنخواہ دینے میں فرق ہوتا ہے۔ جو کسی صورت نہیں مٹتا۔ شیخ صاحب اکیلے تھے تو بات دوسری تھی۔ مگر اب تو کئی تھے تنخواہ پانے والے۔ فطری بات تھی کہ ان کئیوں کے زمرے میں شیخ صاحب کو اپنے آپ کو بھی شمار کرنا پڑا۔ دو نقطے سرکنے لگے۔ پہلے "تو" بند ہو کر "تم" ہوئی اور بہت جلد "آپ" میں بدل گئی۔ اب تپے کی جگہ جی جناب نے لے لی۔ رفتہ رفتہ یہ مراسم بھی گھٹے تو معاملہ یہاں تک پہونچا کہ دنوں میں، ہفتوں میں، اور پھر مہینوں میں مڈھ بھیڑ ہو جاتی تو ملک جی ایک شان استغنا سے پوچھتے۔

"کہو شیخ صاحب کیسے ہو؟"

"اللہ کا فضل ہے سرکار . . . . . کٹ رہی ہے . . . . ." شیخ صاحب خاکسارانہ جواب دے دیتے اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے۔

ملک جی کے حق میں بزرگ کا کہا سچ ثابت ہو رہا تھا۔ ہاتھ کی مشینوں کا دور تو کب کا ختم ہو چکا تھا۔ اب تو بجلی کی تیز رفتار مشینیں ان کے کارخانے میں دن رات گھڑگھڑاتی تھیں۔ ملک جی کا اپنا "اشاعتی ادارہ" بھی قائم ہو چکا تھا۔ باہر کے کام کے علاوہ سینکڑوں کی تعداد میں بچوں کی کہانیاں، دنیا کے عظیم انسانوں کی سوانح عمریاں، قاعدے، سپارے چھاپے خانے سے نکلتے اور اسکولوں، مکتبوں، کتب خانوں میں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے۔

ان کتابچوں، قاعدوں اور سیپاروں کے پارسل بنواتے۔ انھیں قلیوں کے سروں پر اٹھواتے اور پھر ٹھیلوں، ریڑھوں، تانگوں میں لدواتے ہوئے — شیخ صاحب کو یہ احساس شدید ہونے لگتا کہ ان کے اور ملک جی کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے — کہاں "رفعت منزل" میں ملک جی کا دفتر اور کہاں احاطہ خیراتی رام میں عرفان پرنٹنگ پریس! ایک طرف چک کے دروازے پر خس کی ٹٹیوں سے ڈھکی ہوئی

کھڑکیاں ـــ ... بجلی کے پنکھے کی مدد سے ٹھنڈا کیا ہوا کمرہ۔ فرش پہ بچھی ہوئی خوشنما دری۔ ٹیلیفون اور ان سب کے درمیان ایک لمبی چوڑی میز کے پیچھے اونچی، گدے دار اور گھومنے والی کرسی پہ رونق افروز ملک جی ـــ دوسری طرف مئی جون کی تپتی دوپہروں میں پسینے سے بھیگے۔ میلی چکٹ بنیان اور دورنگی تہبند بدن پہ ڈالے۔ پاؤں میں کینوس کے جوتے۔ (چھنگلیا پر سے جن کا کینوس اکثر اکھڑا ہوتا) پہنے قلیوں سے ادھر، رہڑے، ٹھیلے اور تانگے والوں سے سرکھپاتے ہوئے شیخ صاحب! دونوں نقطے بہت دور ہٹ گئے تھے ... مگر ایک دوسرے سے اوجھل تو نہیں ہوئے تھے ....

شیخ صاحب ملک جی کے ساتھ چپکے رہے۔ جن کا کاروبار دن بدن ترقی کر رہا تھا۔ چھاپے خانے میں باہر کا کام بالکل بند ہو گیا .... گھر کا کام جو اتنا زیادہ ہو گیا تھا کہ مشینیں (سوائے امر مجبوری کے) ایک پل بھی بند نہ ہوتیں۔ اب تو پنجسورے، دعائیں، نمازیں، قرآن پاک سب ہی کچھ چھپنے لگا تھا۔ (ملک جی، بزرگ کی نصیحت سے ایک انچ بھی ادھر ادھر نہ ہوئے تھے۔ دینی اخلاقی اور پاکیزہ کتب کے علاوہ انھوں نے کسی دوسری چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔) اس سلسلے کی آخری کڑی تھی کلام مجید کا نیا ایڈیشن!

شیخ صاحب اب بھی تندہی سے کام کرتے تھے۔ انھوں نے ملک جی کا ساتھ نہ چھوڑا تھا۔ گو دو نقطوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ پھر جب عرفان منزل بن کر تیار ہوئی تو شیخ صاحب اس کے نچلے فرش پہ رہ گئے اور ملک جی اس کی سب سے اونچی منزل پہ براجمان تھے۔ یہ نچلا فرش دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک حصہ میں چھاپہ خانہ تھا۔ دوسرے میں جلد سازی، بندھوائی، چڑھوائی وغیرہ کا شعبہ تھا جس کے پچاسیوں ملازموں میں سے شیخ صاحب بھی ایک تھے "گراؤنڈ فلور" سے "پانچویں منزل تک .... درمیان میں جو کچھ تھا وہ دفتر والوں، ہیڈ آفس والوں اور حساب کتاب کے محکمہ نے گھیر رکھا تھا .... منیجر، سکریٹری، اکاؤنٹنٹ، کلرک .... کاش وہ بھی پڑھے لکھے ہوتے! شیخ صاحب کو کبھی کبھی خیال آتا۔ تو یہ فاصلہ شاید اتنا زیادہ نہ ہوتا، کم از کم وہ ابھی تک گراؤنڈ فلور پہ تو نہ ہوتے۔ اب تو یہ

کتنے حجاب درمیان میں پڑتے تھے .... پڑھے لکھے تو اتنے زیادہ ملک جی بھی نہیں تھے ..... شیخ صاحب اپنے تئیں یہ کھڑ بھی کبھی کبھی بک لیتے۔ انھیں شاید معلوم نہیں تھا کہ پیسہ بہت کچھ سکھا پڑھا دیتا ہے۔ جس شخص کو دن رات مختلف لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا نصیب ہو۔ طرح طرح کے تجربوں سے واسطہ پڑتا ہو ..... اسے بہت کچھ علم حاصل ہو جاتا ہے ..... ادھر یہ عالم تھا کہ اتنے عرصے سے کتابیں بندھوا رہے تھے مگر ٹوٹی پھوٹی عبارت سے آگے نہیں پڑھ پائے تھے .... ہاں بچوں کو (خصوصاً لڑکوں کو) پڑھانا چاہا تو ان کی فیسوں اور جرمانوں نے ہی کمر توڑ دی۔

ہانپتے کانپتے وہ جیسے آج سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے ایسے ہی ستائیس سال تک ملازمت کی گاڑی کھینچتے رہے تھے۔ مگر کب تک۔ صحت جواب دے گئی تھی۔ حافظہ بگڑ گیا تھا۔ کام لگاتار ہوتا نہیں تھا۔ اس پہ بڑے لڑکے حمید نے جتنی جان ضیق میں ڈال رکھی تھی وہ الگ۔ صاحبزادے فرماتے تھے "ابا نوکری میں کرنے کا نہیں .... چھوٹی موٹی دکان کھلوا دو .... نہیں تو میں جانوں اور میرا کام" ..... اور کام کیا تھا ان کا بیکاری غرض حالات ایسے ہو گئے تھے کہ نہ تو ملازمت کی گاڑی دھکیلی جاتی تھی نہ بن ماں کے بچوں کی دیکھ بھال ہو سکتی تھی۔ کہنے والے تو کہہ دیتے تھے ..... لونڈے کو کسی کام میں لگا دو .... مگر کیسے لگا دو۔ یہ کوئی نہ بتاتا تھا۔

آخر شیخ صاحب کے اپنے ہی ذہن نے یاوری کی تھی۔ وہ آج پانچویں منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔

وہ پانچویں منزل پر پہنچ گئے۔ پسینے سے ان کی پیشانی تر ہو رہی تھی، کنپٹی کے بال بھی بھیگے ہوئے تھے۔ جھریوں والے چہرے پر سیاہی سی پھر گئی تھی۔ سانس تیزی سے چل رہا تھا۔ وہ ملک جی کے کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔ اندر سے بات چیت کی آواز آ رہی تھی۔ وہ ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ چلو اچھا ہوا ذرا سانس درست ہو جائے گی۔

ملک جی کسی بلڈنگ کنٹرکٹر سے نئی کوٹھی کا تخمینہ لگوا رہے تھے۔ کچھ دیر شیخ صاحب کو ٹھہرنا پڑا پھر جوتوں کی چاپ سنائی دی

پتلون کوٹ والے بلڈنگ کنٹریکٹر صاحب چک اٹھا کر باہر نکل آئے اور چلتے چلتے ذرا رک کر کہتے گئے۔

"اللہ مبارک کرے ملک جی"

"شکریہ" اندر سے آواز آئی۔

اب شیخ صاحب کی باری تھی۔ انھوں نے حواس مجتمع کئے۔ ذرا سر کا سارا انتظار ان کی نظروں کے سامنے پھر گیا۔ اب وہ اندر داخل ہوں گے ...... اب سلام علیکم کہیں گے ...... اب ملک جی کرسی سے اچھل پڑیں گے۔

وہ اندر چلے گئے ....! مگر نہ کرسی ہلی۔ نہ ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا! بس ان کے سوکھے سے سلام علیکم کا جواب ایک غیر ارادی طور پر علیکم السلام سے ضرور ملا ......

ملک جی کی بلو پرنٹ پر جھکی ہوئی نظریں دوبارہ اوپر اٹھیں۔

"کہئے"؟

شیخ صاحب کی زبان گنگ ہو گئی ... ان کے لب سل گئے دل بہت زور سے دھڑکا۔ مگر آواز زبان تک نہ آئی۔

"کہئے"؟ سوال دوبارہ دہرایا گیا۔

"جی ... جی ..." شیخ صاحب کی آواز لڑکھڑانے لگی ......

"کچھ نہیں ...... سرکار ...... آپ کو سلام کرنے چلا آیا تھا .... ذرا ...... میں نے کام چھوڑ دیا ہے نا!"

"اوہ! ...... تو ہاں ...... نیچے دفتر سے حساب کر والینا اپنا .... اچھا خدا حافظ" کرے میں پھر سے سناٹا چھا گیا۔ نظریں پھر بلو پرنٹ پر جھک گئیں۔

شیخ صاحب کا ذہن بزدل دوستوں کی طرح ساتھ چھوڑ گیا۔ زبان نے بیوفائی کی ٹھان لی ...... دل زور زور سے دھڑکا ... مگر ہنگامہ کوئی نہ ہوا! اور جب بلو پرنٹ پر جھکی ہوئی نظریں ایک بار پھر اوپر اٹھیں ...... تو شیخ صاحب باہر جا چکے تھے ... وہ سرکتے ہوئے نکلے ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو چکے تھے۔

سیڑھیوں سے اترتے وقت شیخ صاحب خود پر برس رہے تھے ... کیا ہو گیا تھا تجھے شیخ عبدالعزیز! تیرے منہ پر کس نے تالا ڈال دیا تھا؟ تیری زبان کیوں گنگ ہو گئی تھی! .... ملک جی ہی تو تھے وہ .... کوئی کھا تو نہ لیتے تجھے۔

اب کیا ہوگا .... کیا ہوگا اب .... شیخ صاحب بڑبڑاتے ہوئے نیچے اتر رہے تھے .... لے دے کے ایک حیدری مکان ہی تو ہے .... مرکھا دو لال جس کے ستائیس سو روپے دلوا رہا تھا .... اور جب شیخ صاحب سات دن کی تنخواہ جیب میں ڈالے گراؤنڈ فلور پر پہونچے تو ان کے چہرے بشرے سے ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے اوپر چڑھتے وقت انھیں اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی جتنی نیچے اترتے وقت ہوئی تھی .... اور ابھی تو انھیں رکھا دو لال کی بیٹھک تک پیدل چل کر جانا تھا جو وہاں سے کافی دور تھی! ۔

ٹالسٹائی

ترجمہ

تسنیم یاور

ایک پاگل کی ڈائری

آج جب مجھکو اطباء کی ایک مجلس میں معائنے کے لئے لیجایا گیا۔ تو وہ میرے متعلق کسی نتیجہ پر پہونچنے سے قاصر رہے کافی بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے ہوا کہ میں پاگل نہیں ہوں لیکن اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں نے خود کو بولنے سے باز رکھا اور پاگل خانہ کے تصور ہی نے مجھ کو ہوش بجا برقرار رکھنے پر مجبور کر دیا۔ جیسا کہ ظاہر ہے وہ پاگل ثابت ہو جانے پر مجھ کو آزاد نہ چھوڑ دیتے۔ اس بات پر ان کا اتفاق تھا کہ "مجھ کو دورے وغیرہ کی شکایت ہے۔ تاہم یہ دورے جنون یا پاگل پن کی حد تک نہیں پہونچے ہیں۔" یہ تھا ان کا فیصلہ۔ مگر میں خوب جانتا ہوں کہ میں پاگل ہوں۔ ڈاکٹر نے میرے لئے کچھ دوائیں تجویز کرتے ہوئے مجھ کو یقین دلایا کہ اگر میں نے سختی سے اس کی ہدایات پر عمل کیا تو پاگل پن کی موجودہ علامات بھی جلد دور ہو جائیں گی۔ لیکن اگر ایسا ہوا تو میں برداشت نہ کر سکونگا۔ اب میں آپ کو شروع سے بتاتا ہوں کہ کس طرح خلل دماغ کا شکار ہو کر مجلس میں پیش ہونے کے لئے مجبور کیا گیا۔

پینتیس سال کی عمر تک میں ایک عام آدمی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ اور کوئی خاص بات اس مدت تک مجھ میں پیدا نہ ہوئی۔ ہاں بچپن کے زمانے میں ضرور تقریباً دس سال کی عمر میں موجودہ حالت عارضی شکل میں کبھی کبھی باعث تکلیف ہوئی۔ تاہم وہ مستقل صورت نہ تھی جس کا شکار آج ہوں، وہ حالت کچھ عجیب طریقہ سے نمودار ہوئی جیسا کہ سطور ذیل سے معلوم ہو جائے گا۔

مجھے خوب یاد ہے ایک شام سونے کے وقت جب کہ میں تقریباً پانچ چھ سال کا تھا۔ میری دایہ یو پراسکیا مجھ کو سلانے کے ارادہ سے آئی اور میرے کپڑے اتار کر کھٹولے پر لٹانا چاہتی تھی۔ وہ بہت لمبی اور دبلی تھی اس نے کتھئی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اور سر پر ٹوپی لگائے ہوئی تھی اور مجھے یاد ہے کہ اس کی بالوں والی ٹھوڑی کی کھال پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔

"مجھے چھوڑ دو۔" "مجھے چھوڑ دو۔" کہتے ہوئے میں کھٹولے پر مچلنے لگا۔

"ننھے نکا، اب لوٹ جاؤ ۔۔۔ دیکھو میتیا کتنا اچھا لڑکا ہے وہ پہلے ہی سونے کے لئے لیٹ گیا۔" اس نے میرے بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے میں ایک دم بستر پر دراز ہو گیا۔ "اب مجھ کو سونا چاہیئے۔" میں نے اپنے پیروں کو کمبل میں ڈالتے ہوئے کمبل اوڑھ لیا اور مجھ کو قدرے سکون کا احساس ہوا۔

میں چپ چاپ پڑا رہا اور سوچنا شروع کیا۔ میں نینی کو پیار کرتا ہوں نینی مجھ کو اور تارس کو چاہتی ہے میں تارس کو چاہتا ہوں اور تارس مجھ کو اور نینی کو پیار کرتا ہے اور نینی میتا کو پیار کرتی ہے۔ اور میں میتا کو پیار کرتا ہوں اور تارس، اس سے پیار کرتا ہے، اور میتا تارس مجھ سے نینی سے محبت کرتا ہے اور ماما مجھ کو اور نینی کو پیار کرتی ہیں اور نینی ماما، مجھ کو اور پاپا کو پیار کرتی ہیں۔ اور نینی ماما سے پیار کرتی ہے اور مجھ پیار کرتی ہے اور پاپا سے پیار ــــــــــ اور سب ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ اور یہ ہر ایک کے لئے کتنا اچھا ہے۔

اتنے میں خادمہ کے تیزی سے چلنے اور غصے سے شکر دان لے جانے کی آواز آئی اور نینی نے اسی قدر غصے سے جواب دیا کہ اس نے نہیں دیکھا مجھ کو ڈر لگنے لگا۔ اور بے کلی محسوس کرتے ہوئے میں نے اپنے سر کو کمبل سے ڈھانپ لیا۔ لیکن مجھ کو آرام نہیں ملا۔ ایک اور مرتبہ مجھے یاد ہے کہ میں

س بیدردی سے ایک لڑکے کو پیٹتے اور روتے و بکا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور یہ بھی کہ لڑکا کا چہرہ کس قدر بھیانک دکھائی دیتا تھا۔ جب کہ وہ اس کو مارتے ے برابر چیخ رہا تھا۔ "بتا اب تو ایسا کرے گا؟ بتا اب تو ایسا کرے گا؟" وہ چیختا رہا اور اس کو مارتا رہا۔ لڑکے نے کہا "نہیں نہیں اب نہیں کروں گا۔" ین [illegible] رہا: "بتا اب تو ایسا کرے گا۔" اور برابر پیٹتا رہا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے سسکیاں لینی شروع کر دیں۔ اور بہت دیر تک میں بے چین رہا — وہ سسکیاں اور مایوسی میرے موجودہ پاگل پن کی ابتدائی علامات تھیں۔ مجھے ایک اور واقعہ یاد ہے۔ جب ہماری چچی نے ہم کو مسیح کی کہانی سنائی ر انہوں نے وہاں سے اٹھنا شروع کیا تو ہم سب نے کہا۔

"ہم کو مسیح کے متعلق کچھ اور باتیں سناؤ۔"

"نہیں۔ اب میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

"نہیں نہیں کچھ اور بتاؤ۔" میں نے خاص طور پر گزارش کی . . . . . . ہماری چچی نے پھر اسی کہانی کو دہرانا شروع کر دیا۔ اور یہ بتایا کہ کس بیدردی سے ان کو سولی پر چڑھایا گیا۔ کوڑے مارے گئے اور طرح طرح سے اذیت پہونچائی گئی۔ اس پر بھی وہ ہر وقت ان کے لئے دعا مانگتے رہے۔

"چچی لوگوں نے انہیں کیوں تکلیفیں دیں؟"

"وہ بدکار لوگ تھے۔"

"لیکن کیا درحقیقت وہ صالح تھے؟"

"ہاں ہاں۔ بس کرو۔ آٹھ بج چکے۔ سنتے ہو!"

"ان کو کس لئے اذیت پہونچائی گئی۔؟ لوگوں کو ہر بار انہوں نے معاف کر دیا۔ تو پھر ہر بار اور زیادہ کیوں ستایا گیا؟ کیا اس سے ان کو تکلیف پہونچی؟ چچی کیا اس سے ان کو تکلیف پہنچی؟"

"ہاں ہاں بہت ہو چکا۔ میں چائے پینے جا رہی ہوں۔"

"لیکن شاید یہ صحیح نہیں ہے۔ لوگوں نے ان کو کس لئے اذیت پہونچائی؟"

"بس بہت ہو چکا۔"

"نہیں نہیں ابھی مت جاؤ۔"

پھر یکایک مجھ کو یہ خیال ستانے لگا۔ اور میں نے سسکیاں لینی شروع کر دیں۔ اور اپنے سر کو دیوار سے ٹکرانا شروع کر دیا۔

یہ سب باتیں میرے بچپن میں واقع ہوئیں۔ لیکن چودہ سال کی عمر ہونے پر جب مجھ میں جنس بیدار ہوئی اور میں نے بدکاری کی جانب مائل ہونا شروع کر دیا۔ تو یہ کیفیت جاتی رہی۔ اور میں عام لڑکوں کی طرح رہنے سہنے لگا۔ مجھ کو ناز و نعم سے پالا گیا۔ اور عمدہ غذائیں بکثرت ہونے کے ساتھ کوئی جسمانی کام مجھ سے نہیں لیا گیا۔ اور وہ سب سامان جو جذبات کو مشتعل کرنے میں مددگار ہو سکتے ہیں مہیا ہوئے اور اس پر اپنی ہی طرح کے لڑکوں کا ساتھ — میرے ہم عمر لڑکوں نے مجھ پر "حسین" بدکاری پر آمادہ کیا اور میں نے خود کو ان کے سپرد کر دیا۔ ہر بدکاری نے ایک نئی بدکاری کو جنم دیا۔ اب میں صنف نازک تک پہنچ گیا — پینتیس سال اسی طرح بیت گئے۔ میں پوری طرح تندرست و توانا تھا۔ اور پاگل پن کی کوئی علامت مجھ میں نہیں تھی۔

مجھ کو اپنی اس بیس سالہ زندگی کے متعلق بہت کم یاد ہے۔ اور بڑی مشکل سے خود کو ماضی کے سپرد کرتے ہوئے کچھ یاد کر پاتا ہوں۔ اپنے ہم جنس لڑکوں کے ساتھ ایک صحبت مند و مارچ کے ساتھ پہلے گرامر اسکول اور پھر یونیورسٹی میں داخل ہوا اور قانون کی ڈگری حاصل کی۔ میری پریکٹس کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ میرے تعلقات ایک لڑکی سے پیدا ہو گئے جو بعد کو میری شریک حیات بن گئی۔ میں شادی کے بعد دیہات میں رہنے لگا اور زیادہ وقت بچوں کی نگہداشت اور جائیداد کی دیکھ بھال میں بسر ہوتا اور ساتھ ہی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے فرائض پوری ذمہ داری کے ساتھ انجام

دیتا رہا۔

بچپن کے بعد پہلا دورہ اس وقت پڑا جب کہ میں ازدواجی زندگی کے نو سال خوش و خرم بسر کر چکا تھا۔

ہم نے کچھ رقم جس میں میری بیوی کا ورثہ اور میری بائوکی شکل میں پس انداز ہونے والی رقم شامل تھی، بچا رکھی تھی۔ ہم نے جائداد خریدنے کا فیصلہ کیا۔ میں فطری طور پر اپنی جائداد میں اضافہ کرنے کا شائق تھا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اس کام کی تکمیل کے لئے ہر وہ طریقہ اختیار کیا جو ممکن ہو سکتا تھا۔ اور جس کو کوئی دوسرا شخص بمشکل ہی کر پاتا۔ میں نے ان تمام علاقوں سے معلومات فراہم کرنا شروع کر دی۔ جہاں زمین فروخت ہونے کے امکانات اور اخبارات میں شائع کئے جانے والے اعلانات پڑھتا رہا۔ مجھ کو دراصل ایسی جائداد کی تلاش تھی جس سے حاصل ہونے والا منافع یا حاصل شدہ عمارتی لکڑی اصل قیمت چکا سکے۔ اور ساری جائداد مجھ کو مفت میں پڑ جائے۔ یا پھر یوں کہیئے مجھ کو ایک احمق کی تلاش تھی۔ جو جاہل مطلق اور اپنے خیال کے مطابق مجھ کو ایک مل بھی گیا۔ صوبہ مینرا میں ایک بڑی جائداد جس میں بہت بڑا جنگل شامل تھا برائے فروخت تھی۔ اور تمام ذرائع اس بات کی تصدیق کرتے تھے کہ بیچنے والا نہایت بے وقوف ہے۔ اور جنگل سے حاصل شدہ عمارتی لکڑی ہی قیمت خرید کا بدل ثابت ہوگی اس لئے میں فوراً تیار ہو کر روانہ ہوا۔ سفر کا ابتدائی حصہ ہم نے بذریعہ ریل گاڑی طے کیا۔ میں ایک ملازم کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ اور پھر ہم ٹرین پر سوار ہوئے۔ سفر میرے لئے نہایت خوشگوار تھا۔ میرا ملازم جو نوعمر اور زندہ دل آدمی تھا بہت خوش دکھائی دیتا تھا۔ نئی نئی جگہیں نئے لوگ ہم سفر کرتے اور لطف اندوز ہوتے رہے۔ سفر قریب قریب دو سو دو منٹ کا تھا۔ ہم بغیر رکے ہوئے گھوڑے بدلتے رہے اور سفر کو جاری رکھا رات آئی مگر ہم چلتے رہے میں نے اونگھنا شروع کر دیا۔ اور سو ہی گیا ہوتا مگر فوراً ہی خوف کے احساس سے جاگ گیا۔ جیسا کہ عموماً ہوتا ہے طویل بیداری سے مجھ کو دہشت ہونے لگی۔ اور نہ جانے کیوں یہ خیال ستانے لگا کہ اب میں سو ہی نہیں سکوں گا۔ میں کیوں سفر کر رہا ہوں؟ کہاں جا رہا ہوں؟

یکایک میں نے سوچنا شروع کیا۔ یہ بات نہیں کہ میں سستی جائداد خریدنے کے خیال سے خوش نہیں تھا۔ مجھ کو یہ محسوس ہونے لگا کہ اتنی طویل مسافت طے کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اور مجھ کو چاہئے کہ اس اجنبی مقام پر مر جاؤں۔ مجھ پر دہشت طاری ہو گئی۔ میرا ملازم سر گئی بیدار ہو گیا تھا۔ اور میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گفتگو کرنا شروع کی۔ میں نے ملک کے اس حصہ سے متعلق بات چیت شروع کر دی۔ جہاں پر ہم تھے۔ اس نے بڑی شگفتگی سے جواب دیا۔ خود مگر مجھ کو نہ جانے کیوں رحم آنے لگا۔ تب میں نے گھر والوں اور خرید کی جانے والی جائداد کے متعلق بات چیت کی وہ برابر خوش مذاقی سے جواب دیتا رہا۔ اس کو ہر چیز خوشگوار اور روشن دکھائی دے رہی تھی۔ جب کہ مجھ کو ہر چیز اس کے بالکل برخلاف نظر آتی تھی۔ پھر بھی میں نے قدرے سکون محسوس کیا۔ تاہم وحشت اور رحم نے احساسات نے مجھ کو ستانا نہ چھوڑا۔ میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ہر چیز اپنے مقام پر رک جائے۔ مجھ کو نہ معلوم کیوں یہ احساس ستانے لگا کہ اگر میں گھر جا کر بیوی بچوں سے مل سکا اور چائے پی سکا اور خاص طور پر اگر سونے میں کامیاب ہو گیا تو میرے لئے مفید ہوگا۔ اب ہم شہر ارزامس کے قریب پہنچ رہے تھے۔

'کیا ہم کو یہاں کچھ دیر ٹھہر کر آرام کرنا چاہئے؟'

'ضرور'

'یہ مقام شہر سے کتنے فاصلے پر ہے؟'

'قریب قریب سات، درسٹ'

کوچوان نہایت سنجیدہ اور ایک حد تک ترش رو آدمی تھا۔ وہ گاڑی کو آہستہ آہستہ بے پروائی سے ہانکتا رہا۔

ہم مسافت طے کرتے رہے۔ اور میں نے گفتگو کرنا ختم کر دی۔ کچھ دماغی سکون میسر آیا۔ میں سکون کی تلاش میں یہ سوچتے ہوئے کہ سب ٹھیک ہی ہوگا۔ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ہم تاریکی میں بڑھتے رہے۔ راستہ بے انتہا لمبا معلوم ہوتا تھا۔ ہم ایک مکان پر جا کر رکے

ایک سویا ہوا تھا۔ تاریکی میں چھوٹے چھوٹے کچھ مکانات دکھائی پڑتے تھے۔ گھوڑوں کے کھروں سے پیدا ہونے والی آواز اور گاڑی کے چلنے کی کھڑکھڑاہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی بڑا مکان نظر آتا۔ ان تمام چیزوں نے مجھکو غمگین بنا دیا اور میرے دل میں ٹھہرنے کی خواہش پیدا ہوگئی۔

بالآخر ہم ایک چھوٹے سے مکان پر پہونچے جس کے باہر ایک کھمبا نصب تھا۔ وہ سفید تھا مگر نہ جانے کیوں مجھکو خوفناک معلوم ہوا۔ میں ڈرتے ڈرتے گاڑی سے باہر اتر آیا۔

سرگی نے جلدی جلدی تمام ضروری اشیاء گاڑی سے باہر نکالیں۔ اور دھڑدھڑاتا ہوا زینہ پر چڑھ گیا۔ اس کے چڑھنے کی آواز سے احساس تکلیف پھر عود کر آیا۔ میں اندر داخل ہوا۔ وہاں ایک برآمدہ تھا اور ایک نوکر جس کے رخسار پر پیدائشی نشان تھے۔ سویا ہوا تھا۔ اس نے ہم کو ویٹنگ دکھایا۔ اس کے رخسار کا نشان غیر معمولی طور سے بھیانک دکھائی دیتا تھا۔ یہ کمرہ تاریک تھا اور داخل ہوتے ہی مجھے دہشت ہونے لگی۔

'تمہارے یہاں ایسا کمرہ نہیں جہاں میں آرام کر سکوں؟'

'ہاں ہاں یہ دیکھئے ایک ہے۔'

مجھے یاد ہے کہ وہ کمرہ صاف ستھرا۔ اور سفیدی کیا ہوا تھا اور بالکل چوکور تھا۔ اور اس کی یہ یکسانی ہی میرے خوف کا سبب بنی۔ اس میں ایک کھڑکی تھی جس میں چھوٹا سا سرخ کپڑا لٹکا ہوا تھا ایک کاریلین لکڑی کی بنی ہوئی میز تھی اور ایک صوفہ تھا جس کے کنارے مڑے ہوئے تھے۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ سرگی نے سماور رکھا اور چائے بنائی۔ میں بستر پر دراز ہو گیا مگر نیند نہیں آئی اور سرگی کو چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے مجھ کو آواز دی مگر اس خیال سے کہ کہیں نیند سے قطعی محروم نہ ہو جاؤں اٹھنے سے باز رہا۔ میں نے بجائے اٹھنے کے اونگنا شروع کر دیا۔ اور یقیناً میں اونگ ہی رہا ہونگا کیوں کہ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اور کمرہ تاریک تھا۔ مجھ کو اسی طویل بیداری کا بار بار خیال آرہا تھا۔ جس کا شکار ٹرین میں ہو چکا تھا۔ اب مجھ کو یہ پوری طرح محسوس ہونے لگا کہ سونا ممکن نہیں۔ 'میں کیوں یہاں آیا؟' میں کہاں جا رہا ہوں؟ مجھکو کس چیز کی تلاش ہے اور کیوں؟' میں نے ان بے معنی سوالات سے دور بھاگنے کی بے فائدہ کوشش کی۔ میرا ہوش و حواس میں رہنا ہی عذاب جان تھا۔ میرا وجود جس میں صوبہ پینزا کی جاگیر شامل نہیں ہو سکتی تھی۔ اور نہ اس کا خیال مجھ کو اس سے دور لیجا سکتا اور جس سے میں پوری طرح باخبر تھا اور جو میرے لئے عذاب تھا۔ میں سونا چاہتا تھا۔ میں سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا مگر نجات کہاں؟

میں برآمدہ میں گیا سرگی چھوٹی سی بنچ پر سویا ہوا تھا۔ اس کے بازو نیچے لٹک رہے تھے۔ اور وہ پورے سکون سے مصروف خواب تھا۔ اور وہ نوکر بھی جس کے رخسار پر نشان تھا سو چکا تھا۔ میں اس خیال سے برآمدے میں آیا تھا کہ جو چیز مجھ کو اذیت پہنچاتی رہی ہے اس سے نجات پا سکوں گا۔ مگر یہ اذیت برابر میرا تعاقب کرتی رہی اور بالآخر کائنات کی ہر چیز پر طاری ہو گئی۔ 'یہ کیا واہیات ہے؟' میں نے سوال کیا 'مجھ کو کس بات کا ڈر ہے؟'

'میں' موت نے آہستہ سے کہا 'میں یہاں ہوں' میرے جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ ہاں موت! اس کو تو ایک دن آنا ہے۔ وہ ضرور آئیگی مگر یہاں کہاں؟ کاش میرے سامنے موت آجاتی اور میں یقیناً اس احساس سے بچ جاتا جس کا میں شکار ہوا مجھ پر دہشت طاری ہو جاتی۔ لیکن مجھ پر اب دہشت طاری نہ ہوئی۔ میں نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ موت آرہی ہے۔ یکایک یہ خیال آیا وہ نہیں آئے گی۔ میں نے خود میں زندگی کی ہوس کو بیدار پایا۔ زندہ رہنے کے حق کا احساس جاگ اٹھا۔ اسی وقت موت نے تیز قدمی سے بڑھنا شروع کر دیا۔ اور میں عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے اس کے خوف سے دور بھاگنے کی کوشش کی۔ مجھ کو پیتل کا شمعدان دکھائی دیا جس میں موم بتی لگی ہوئی تھی اور موم بتی جلادی۔ موم بتی کی روشن لو، نے جو موم بتی سے چھوٹی تھی۔ یہی سب کہا زندگی میں کچھ نہیں ہے —— موت —— جو ہونی چاہئے۔ میں نے اندر چیزوں کے متعلق سوچنے کی کوشش کی مثلاً جاگیر خریدنے کا خیال کیا۔ بیوی کے تصور کو سامنے لایا لیکن نہ صرف یہ کہ یہ تمام چیزیں مجھکو

فراہم کرنے میں ناکام رہیں بلکہ محض بیکار اور عذاب جان معلوم ہونے لگیں۔ مگر اس خوف نے کہ زندگی تباہ ہو جائے گی مجھ کو مزید سوچنے سے باز رکھا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ مجھ کو سونا چاہیئے میں لیٹ گیا۔ لیکن جونہی میں لیٹا دوبارہ مجھ پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔ میں نے سخت ذہنی الجھن کا احساس کیا۔ اور ایک ایسی روحانی تکلیف کا احساس ہوا جو قے کرنے سے پہلے محسوس ہوتی ہے۔ یہ ذہنی الجھن سے کہیں زیادہ تکلیف دہ اور دہشت ناک تھی۔ شاید یہ موت کا خوف تھا۔ لیکن جونہی زندگی کا خیال آیا معلوم ہوا یہ زندگی دہشت تھی اور تباہی کا پیش خیمہ۔ بہرحال زندگی اور موت ایک دوسرے میں کھو چکی تھی۔ کوئی چیز میری روح کو جسم سے جدا کرنے کے لئے کوشاں تھی مگر ناکام رہی۔ میں نے پھر دونوں سوتے ہوئے آدمیوں پر نگاہ ڈالی۔ اور خیال کو اس الجھن سے نکالنے کی کوشش کی مگر متواتر وہی خوف میرے خیالات کا تعاقب کرتا رہا۔ سرخ۔ سفید چوہا۔ ایسا معلوم ہوا کوئی چیز اس سب کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر تلی ہوئی ہے تاہم وہ اس کے لئے تیار نہیں۔ زندگی میں خوف اور دہشت کے علاوہ کچھ نظر نہیں آیا۔ اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی اور محض یہ خیال کہ مجھ کو کس چیز کا بنایا گیا ہے؟ مجھ پر طاری ہو گیا۔

خدا نے کس مقصد کے پیشِ نظر مجھ کو جنم دیا؟ خدا ہی جانتا ہے ......'مجھ کو۔ خدا کو یاد کرنا چاہیئے،' اور ہاں میں بہت عرصہ سے اس کو بھلا بیٹھا تھا۔ بیس سال سے میں خدا سے بیگانہ تھا۔ مجھ کو اس کا خیال تک نہیں آیا تھا حالانکہ دکھاوے کے خیال سے ہر سال مقدس ہفتہ میں اس کے وجود کا اعتراف کرتا اور رسوم مذہبی کو ادا کرتا تھا۔ میں نے دعاء مانگنی شروع کی' اے رحیم! ہمارے بزرگ باپ امریمؑ پر رحمتیں نازل فرما، میں نے اور دعائیں ترتیب دیں۔ مقدس صلیب کا نشان بنایا اور زمین پر جھکنا شروع کیا۔ اور اس خوف سے کہ کوئی دیکھ نہ رہا ہو ہر طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اس دیکھے جانے کے خوف سے اسقدر بدحواس ہو گیا کہ فوراً لیٹ گیا۔ لیکن جونہی میں نے اپنی آنکھیں بند کیں خوف و ہراس شدت سے طاری ہونے لگا۔ مجھ کو اٹھنا پڑا۔ میں مزید اس کیفیت کو برداشت نہ کر سکا۔ میں نے سرگی اور تلی کو جگایا اور سرگی کو سامان باندھنے کا حکم دیا اور ہم روانہ ہو گئے۔ فضا اور وقت سے ایسا لگتا تھا جو کچھ ہوگا بہتر ہوگا۔ پھر بھی کوئی نئی چیز میرے دماغ میں سما گئی اور اس نے میری گذشتہ زندگی کے چین اور سکون کو غارت کر دیا۔

شام کے قریب ہم منزل مقصود پر پہونچے میرا تمام دن اس نئی چیز سے لڑتے ہوئے گزرا اور اب اس پر کسی قدر قابو پا چکا تھا۔ لیکن یہ خوفناک خیال کہ کوئی عذاب نازل ہونے والا ہے میرے دماغ پر مسلط رہا۔ گو عارضی طور پر اس کو بھلانے کی کوشش میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ہم رات کے قریب پہونچے ایک بوڑھے آدمی نے جو جاگیر کا کارندہ تھا۔ میرا استقبال کیا حالانکہ اس میں اس نے کوئی خاص سرگرمی نہیں دکھائی۔ ظاہر ہے وہ جاگیر کے فروخت کیئے جانے سے خوش نہیں تھا۔ صاف ستھرا کمرہ۔ عمدہ اسباب۔ فرنیچر۔ ایک نیا چمکتا ہوا سماور ایک لمبی چائے کی چینی کی میز اور خوبصورت چائے دان یہ سب بہت بھلا لگتا تھا۔ میں نے اس سے جاگیر کے متعلق معلومات کرنا شروع کی جس کا جواب وہ بے دلی سے اسی طرح دیتا رہا جس طرح کوئی بچہ اپنا بھولا ہوا سبق دہراتا ہے۔ اس کی گفتگو نہایت سنجیدہ اور بہت غم آلود تھی۔ بہرحال اس رات میں آرام سے سویا جس کا سبب میرے خیال میں وہ دعا تھی جو میں نے خلوص سے کی تھی۔

میں نے پہلے کی طرح رہنا شروع کیا۔ مگر اس نئے عذاب نے میرے چین و سکون تباہ کر دیا میرے رہنے سہنے کا ڈھنگ وہی تھا۔ اور ہر ممکن کوشش زندگی کو واپس لانے کی کرتا رہا۔ اور برابر اس کوشش میں رہا کہ اس دوبارہ عذاب میں گرفتار نہ ہوں جس کا شکار پہلے پہل ارزامس میں ہوا تھا۔

میں بخیریت گھر واپس پہنچ گیا میں نے جاگیر نہیں خریدی دراصل میں اس کو خرید ہی نہ سکا۔ اور پہلے کی طرح رہنے لگا۔ لیکن ایک بہت بڑی تبدیلی کے ساتھ —— میں نے پابندی سے عبادت کرنا اور گرجا گھر جانا شروع کر دیا۔ میری یہ کوشش کہ گذشتہ زندگی کی خوشگواری واپس آجائے اور مزید سوچنا ترک کر دوں ناکام رہی مجھ کو زندگی سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ ہر چیز سے نفرت اور بیزاری پیدا ہو گئی۔ اور میں بالکل مذہبی آدمی

بن گیا۔ میری بیوی اس تمام تبدیلی کو دیکھتی رہی اور بالآخر مجھ کو جھڑکنا اور تنگ کرنا شروع کر دیا۔ لیکن گھر پر رہتے ہوئے میں اس عذاب سے محفوظ رہا۔

اس دن یکایک مجھکو ماسکو جانے کا پروانہ ملا دن بھر سامان سفر بندھوانے میں مشغول رہا اور شام کو روانہ ہوگیا۔ میں خوشی خوشی ماسکو پہونچا دوران سفر میں صوبہ خارکوٹ کے ایک جاگیردار سے زراعت اور بیکنگ پر گفتگو ہوئی اور ہم دونوں نے پہونچنے پر ماگن تسگی اسٹریٹ کی سرائے میں قیام کرنے اور فاوسٹ جانے کا فیصلہ کیا۔

ہم ایک ساتھ ہوٹل پہونچے اور میں ایک چھوٹے سے کمرہ میں داخل ہوا۔ میں نے اپنے نتھنوں میں دیواروں کی نمی کو محسوس کیا۔ قلی نے میرا سامان لاکر رکھ دیا اور خادمہ نے موم بتی روشن کردی۔ شعلہ تیزی سے بھڑکا اور حسب معلوم دھیما پڑگیا۔ کمرے کے برابر سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی یہ کسی بوڑھے آدمی کی معلوم ہوتی تھی۔ اتنے میں خادمہ باہر چلی گئی۔ اور قلی نے پوچھا کہ آیا وہ میرا اسباب کھول دے۔ موم بتی کی لو، ایک مرتبہ پھر بھڑکی اور دیوار پر لٹکا ہوا نیلا کاغذ جس پر زرد دھاریاں پڑی ہوئی تھیں دکھائی دیا۔ کمرے میں پارٹیشن تھا۔ ایک پرانی سی میز ایک چھوٹا صوفہ ایک آئینہ ایک کٹہرہ اور کمرے کی تنگی یکایک مجھ پر ارزامس کا خوف طاری ہوگیا۔ میرے خدا میں کس طرح رات گزاروں گا؟ بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

میں نے نرمی اور رغبت سے قلی سے سامان کھولنے کو کہا اور ساتھ ہی اس کو کمرہ ۵ میں اس آدمی کے پاس جو میرے ساتھ آیا تھا یہ کہلا کر بھیجا کہ تھیٹر چلنے کے لئے تیار رہیں، میں ایک منٹ میں آتا ہوں۔ قلی چلا گیا اور میں نے اس خیال سے کہ دیواروں سے ڈرنا کیا واہیات ہے خود کو برا بھلا کہا۔ مجھ کو کس چیز کا خوف ہے؟ میں بچوں سے بھی زیادہ ڈرپوک ہوں۔ مجھ کو بھوتوں سے ڈر نہیں لگتا۔ بھوت؟ (اس) بے معنی خوف سے تو بھوت سے ڈرنا بہتر ہے۔ پھر کیا کیا جا سکتا ہے۔ ؟ کچھ نہیں یہ سب واہیات ہے۔ بہرحال میں نے قمیض پہنی اور آستین کے بٹن لگائے۔ کوٹ پہنا اور نئے جوتے پہنے اور ہم سفر جاگیردار کے کمرہ پر پہنچا وہ تیار تھا۔ ہم فاوسٹ کے لئے روانہ ہوئے راستے میں میرے ساتھی نے کنگی کرنے کی اجازت چاہی اور میں فرانسیسی باربر کی دکان پر بال بنوانے کے لئے چلا گیا۔ اس سے خوب باتیں کیں۔ اب ہر چیز اپنی اصلی حالت میں دکھائی دیتی تھی۔ میں کمرہ اور پارٹیشن بھول گیا۔

تھیٹر میں کافی لطف رہا۔ اس کے بعد میرے ساتھی نے کھانے کی تجویز پیش کی حالانکہ مجھ کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر پارٹیشن کا خیال آتے ہی راضی ہوگیا۔

ہم رات کو ایک بجے واپس ہوئے ہم نے شراب کے دو گلاس پی رکھے تھے اور خلاف توقع نہایت اچھے موڈ میں تھا۔ مگر یونہی ہم دھیمی روشنی سے چلتے ہوئے لیمپ کی روشنی میں ہوٹل کے برآمدہ میں داخل ہوئے اور ہوٹل کی بو میری ناک میں پہنچی میں خوف سے لرز گیا بہرحال میں کیا کر سکتا تھا میں نے ہم سفر سے مصافحہ کیا اور اپنے کمرہ میں چلا گیا۔

وہ رات میں نے ارزامس سے زیادہ خوف و ہراس میں گذاری۔ صرف صبح کے وقت جب برابر کے کمرے میں بوڑھے مسافر نے کھانسنا شروع کیا میں تھوڑی دیر سو پایا اور وہ بھی اپنے آرام دہ بستر پر نہیں جس پر سونے کی کئی بار ناکام کوشش کر چکا تھا بلکہ صوفہ پر۔ ساری رات نہایت بے چینی میں بسر ہوئی۔ اس رات میری روح میرے جسم سے پرواز کر رہی تھی۔ مجھ کو زندہ رہنا چاہئے۔ میں یقیناً زندہ رہوں گا اور یکایک . . . . . موت ہر چیز؟ فنا! پھر زندگی اور موت۔ کیوں نہ میں خود کو ایک دم ختم کردوں؟ مجھ پر خوف طاری ہے۔ مجھ کو ہمیشہ موت کا منتظر رہنا چاہئے۔ مجھ پر یک بارگی زبردست خوف و یاس طاری ہوگیا؟ کوئی کیوں زندہ رہے؟ محض مرنے کے لئے؟ میں خود کو اس چکر سے نکال سکا۔ میں نے ایک کتاب اٹھائی اور پڑھنا شروع کیا۔ ایک لمحہ کے لئے سب کچھ بھول گیا۔ پھر وہی سوالات اور خوف۔ میں بستر پر ہوگیا۔ اور اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اور یہ تکلیف بڑھتی گئی۔

یہ سب خدا کا کیا ہوا ہے۔ کیوں؟ سوال نہ کرو۔ بلکہ التجا کرو۔ بہت اچھا میں نے مناجات کرنا شروع کی۔ جیسی کہ میں ازراملی میں
ہ چکا تھا۔ لیکن وہ مناجات ایک معصوم بچہ کی طرح کی گئی تھی۔ اب وہ معنی رکھتی تھی، اگر تیرا کوئی وجود ہے تو مجھے بتا میں کیا ہوں اور کیوں ہوں؟
ں زمین بوس ہو گیا اور وہ ساری مناجات جو مجھ کو یاد تھی یا میں نے خود ترتیب دی تھی کرنے کے بعد میں جواب پانے کے لئے خاموش رہا کوئی
اب نہیں آیا۔ جیسے کوئی تھا ہی نہیں جو جواب دیتا۔ اور زیادہ زندہ رہنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اور یہ غیر متعین عذاب کس لئے؟ میں موت کے بعد
زندگی پر ایمان نہیں لا سکتا۔ اس سے پہلے کہ میں نے یہ سوالات کئے میں پوری طرح دوسری زندگی کا پوری طرح یقین رکھتا تھا۔ لیکن اب نہیں
ہ سکتا۔ اب میرے بس کی بات نہ تھی۔ اگر تیرا کوئی وجود ہوتا تو ضرور میرے سوالات کا جواب دیا ہوتا مگر ہے ہی کیا، یہ سب دھوکا فریب ہے۔
ہاں نا امیدی کے سوا کچھ نہیں اور اس کو کبھی پسند نہیں کرتا میں معذور ہو گیا۔ میں نے ایک بار پھر اس سے حقیقت ظاہر کرنے کی استدعا کی خود
ظاہر کرنے کی۔ تب مجھے یاد آیا۔ طلب کرو — دیا جائے گا، میں نے طلب کیا اور مجھے سکون میسر نہ ہوا۔ شاید میری طلب حقیقی نہیں —
ں سے ایک پرخ دور بھاگو گے وہ ایک میل دور ہو جائے گا۔ میں اس کو نہیں تسلیم کر سکتا۔ لیکن میں طلب کر چکا تھا۔ اور اس پر محروم رکھا گیا۔
لانکہ حقیقت میں، میں نے اس سے سودا کیا مگر اس کو ہی الزام دیتا ہوں اور اس کا یقین —— مجھ کو بالکل نہیں۔

اگلے دن میں نے سب کام ایک ہی روز میں ختم کرنے کی حتی الامکان کوشش کی تاکہ اس کمرہ کی دوسری رات سے نجات پا سکوں۔ گو میں کام
ا نہ کر سکا مگر اسی رات گھر واپس ہوا۔ اب ساری تکلیف کا احساس مٹ چکا تھا زندگی جو ارزامل کے سفر سے تبدیل ہونا شروع ہوئی تھی،
سکو کی اس رات سے یکسر بدل گئی۔ میں انتہائی لاپرواہی سے زندگی بسر کرنا لگا اور بہت سے کاموں کو ترک کر دیا۔ میری صحت خراب
گئی۔ میری بیوی نے اصرار کیا کہ میں طبی مشورہ حاصل کروں۔ اور اس بدعقیدگی سے جو اس کے نزدیک بیماری کی وجہ سے ہے نجات حاصل کروں
لیکن میں جانتا ہوں میری کمزوری اور بیماری میرے دل و دماغ میں مچی ہوئی ہلچل کا نتیجہ تھی۔ جس کو گذشتہ آرام و سکون کی زندگی بسر
نے کی طرح آئندہ زندہ رہنے کی کوشش کے باوجود ختم نہ کر سکا۔ میں اتوار اور روزہ کے دنوں میں گرجا جانے لگا۔ صوبہ پینزا کے سفر کے بعد
میں پابندی سے روزہ رکھنے لگا۔ اور معمول سے زیادہ عبادت و دعا میں مشغول رہتا تھا۔ گو مجھ کو ان سب باتوں سے کوئی توقع نہ تھی۔
کل اسی طرح جس طرح کوئی یہ جانتے ہوئے کہ رقم وصول نہیں ہوگی بیع نامہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بجائے احتیاط سے رکھے۔ میں نے خود کو جاگیر کے انتظام سے
ست بردار کر لیا۔ میری طاقت ختم ہو گئی تھی میں رسالے اخبار اور ناول پڑھ کر وقت گزارتا اور معمولی بازی لگا کر تاش کھیلتا۔ میری تمام تر طاقت
استعمال شکار کو جانے کی قدیم عادت کے لوٹنے سرے سے ہو گیا۔ میں ہمیشہ سے شکاری رہا ہوں۔ ایک مرتبہ میرا پڑوسی بھیڑیے کے شکار کو جا رہا تھا
ں اس کے ساتھ ہو لیا۔ برف پر چلنے کے بعد ہم اس جگہ پہنچے جہاں شکار کرنا تھا۔ اس شکار میں ناکامی ہوئی بھیڑیوں نے تحفظات سے راہ فرار اختیار
۔ مجھ کو ان کے بھاگنے کی آواز دور سے سنائی دی۔ اور میں خرگوشوں کے نشانات کا پیچھا کرتے ہوئے جنگل میں گھس گیا۔ نشانات نے میری رہنمائی جنگل
کھلے ہوئے میدان میں کی جہاں مجھ کو خرگوش مل گیا۔ لیکن اس قدر تیزی سے کھسک گیا کہ میں بمشکل اس کو دیکھ پایا۔ اس وسیع جنگل میں میں
اپنے قدموں کے نشانات تلاش کرنے شروع کئے۔ برف بہت زیادہ تھی۔ اس لئے زیادہ چل بھی نہ سکا۔ برف بڑھتی گئی۔ میں نے ایک دم سوچا میں
اں ہوں؟ برف نے ہر چیز کو بدل دیا تھا۔

یکایک مجھ کو یہ احساس ہوا کہ میں راہ بھول گیا ہوں۔ گھر اور شکاری دونوں بہت دور تھے —— دور تک کوئی آواز نہ تھی۔ مجھ کو پسینہ آیا۔
ں نے تکان محسوس کی۔ مگر رکنے کا مطلب یہ تھا کہ برف میں دھنس جاؤں گا۔ اگر چلتا رہا تو باقی قوت بھی ختم ہو جائے گی۔ میں نے چلانا شروع
ا کوئی آواز نہ آئی۔ کسی نے جواب نہیں دیا۔ میں پیچھے کی طرف واپس ہوا۔ لیکن کوئی راستہ نہ پا سکا میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا — جنگل۔ مشرق
و مغرب میں امتیاز کرنا ناممکن تھا۔ ایک بار پھر میں نے اپنے پاؤں کے نشانات کھوجنے کی ناکام کوشش کی۔ میں نے خوف سے لرزنا شروع کر دیا اور

یک سانحہ ارتحال اور ماسکو کی راتوں کی دہشت طاری ہوگئی۔ جو کہیں زیادہ اور خوفناک تھی۔ میرا دل بہت زور سے دھڑکنے لگا۔ موت؟ میں
نہیں چاہتا۔ موت کیا ہے میں نے پہلے کی طرح خدا سے طلب کرنا اور برا بھلا کہنا شروع کردیا۔ اور ایک دم یہ احساس طاری ہوا کہ خدا سے
سخت شرمناک ہے۔ وہ پہلے ہی تمام ہدایات دے چکا ہے میں ہی ملزم ہوں اس سے معافی کی التجا کی اور خود سے نفرت ہوگئی۔

پھر دیر میں کھڑا رہا اور تھوڑی دیر بعد چند قدم چلنے ہی پر راستہ مل گیا۔ اور جلد ہی سڑک پر پہونچ گیا۔ گو میرا خوف دور ہوچکا تھا
مگر میری ٹانگیں اب تک کانپ رہی تھیں اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ لیکن میں خوش تھا۔ اور شکاری پڑ بھی کے ساتھ گھر واپس ہوا۔ سے
میں خوش تھا اور اس خوشی کا پورا پورا احساس تھا اور تنہائی میں لطف اندوز ہونے کے لئے بیقرار تھا۔ میں اب زیادہ تر مطالعہ میں مصروف رہنے
لگا۔ اور اپنے گناہوں کو یاد کرکے معافی کی استدعا کرتا۔ بہت سے گناہ بھول چکا تھا مگر جو یاد آتے میں ذہن میں دوہراتا اور نفرت کرتا۔

اب میں نے مذہبی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔ گو پرانی روایات میرے لئے ناقابلِ فہم تھیں۔ پھر بھی عیسیٰ مسیح کی تعلیمات نے گہرا اثر
کیا۔ میرا مطالعہ بزرگ و مقدس ہستیوں کی سوانح حیات تک محدود ہوگیا۔ ان میں میرے لئے زیادہ کشش اور پیروی کرنے کے لئے نمونے آسانیاں
تھیں۔ میں سماجی زندگی سے دور ہوتا گیا۔ اور تمام ذمہ داریوں سے رفتہ رفتہ سبکدوش ہوتا گیا۔ مجھ کو جس نامعلوم چیز کی تلاش تھی وہ
ان میں ناپید تھی جس کی مجھ کو تلاش تھی اس کے پانے کا احساس مجھ کو جاگیر کے فروخت کرنے پر ہوا۔

قریب ہی ایک بڑی اچھی زمین فروخت کی جارہی تھی۔ میں اس کو دیکھنے گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں وہ نفع بخش سودا تھا۔ خاص طور
کسان صرف اس شرط پر کہ ان کے جانوروں کے لئے چراگاہ قائم رکھی جائے مفت کام کرنے کو تیار تھے اس کے خریدنے کے خیال ہی سے مجھے بے انتہا خوشی
ہوئی۔ لیکن جب میں گھر کی جانب روانہ ہوا تو مجھ کو راستہ میں ایک بوڑھی عورت ملی جس نے راستہ پوچھا اور مختصر الفاظ میں اپنی مفلسی کا اظہار کیا۔
گھر پہونچ کر اس نفع بخش جاگیر کے متعلق بتاتے ہوئے مجھے شرم آنے لگی کہ میں محض اس لئے اس کو نہیں خرید سکتا کہ دوسروں کی غربت اور مفلسی میں
اضافہ ہوگا۔ یہ کہنے کے بعد سچائی مجھ پر واضح ہوگئی اور اب یہ بات بھی پوشیدہ نہ تھی کہ غریب کسان بھی ہماری طرح زندگی کے خواہشمند ہیں۔ اور وہ
ہمارے بھائی ہیں کیونکہ ہم سب ایک خدا کے بیٹے ہیں جیسا کہ مذہب نے تعلیم دی ہے۔ یکایک مجھ کو معلوم ہوا جو چیز عذاب کی شکل میں مجھ پر سوار تھی
دور ہوگئی اور میں نوزائیدہ بچے کی طرح معصوم اور بے گناہ ہوں۔ میری بیوی نے اس حماقت پر برا بھلا کہا مگر میں خوش تھا۔

یہ تھی میرے جنون کی ابتدا۔ لیکن پوری حالت تقریباً ایک ماہ بعد طاری ہوئی جب میں گرجا میں صبح کی مناجات کر رہا اور سن بھی رہا۔ اور
بے انتہا متاثر تھا۔ اسی دوران میں مقدس روٹی کا ٹکڑا لایا گیا اور مقدس صلیب کو بوسہ دیا گیا اسی وقت گرجا کے دروازے کچھ بھکاری
آئے اور مجھ پر ساری حقیقت کھل گئی۔ اسی پیچ اٹھا 'یہ سب بیکار ہے' 'اور موت اور زندگی کا خوف فریب ہے'۔ اب کشمکش مجھ میں نہ تھی اور
میں کسی چیز سے خائف نہ تھا۔

تب مجھ پر ایک کیفیت طاری ہوئی اور میری موجودہ کیفیت مستقل ہوگئی اگر خوف اور موت کا کوئی وجود نہیں تو مجھ کو ان سے ہرگز خائف نہ ہونا
چاہئے اسی وقت جو کچھ بٹوے پر کوٹ میں تھا میں نے سب خیرات کردیا۔ پنسل کا ٹکڑا بھکاریوں کو ـــ اور لوگوں سے گفتگو کرتا ہوا گھر کی جانب
روانہ ہوگیا۔

عمیم رضوی

اَسیرِ زُلفِ حیات

کردار

ابن آدم :——— دنیا سے بیزار ایک نوجوان
حیات :——— ابن آدم کی محبوبہ
موت :——— حیات کی دشمن۔ ابن آدم کی شیدائی
ضمیر }
دل }——— ابن آدم کے دوست
امید :——— حیات کی سہیلی
منظر :——— گہری اندھیری رات۔ آبادی سے دور ویرانے کی ایک پگڈنڈی
زمانہ :——— آج کل

[پردہ اٹھتا ہے تو کہیں قریب ہی برساتی ندی کے تیز رو دھارے کا شور طوفانی ہواؤں کے جھکڑ چلنے اور الوکے بولنے کی آواز سنائی دیتی ہے جھاڑیوں سے گھری ہوئی پگڈنڈی پر ابن آدم ننگے پاؤں ننگے سر پھٹے ہوئے کپڑوں اور پاگلوں جیسی حالت میں ایک طرف کو تیز قدموں سے جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ اچانک جھاڑیوں میں سے کھڑکھڑ کی آواز آتی ہے۔ ابن آدم کے قدم رک جاتے ہیں اور وہ مڑکر دیکھتا ہے۔ ضمیر تیز قدموں سے چلتا ہوا ابن آدم کے قریب آتا ہے۔]

ابن آدم۔ کون ہو تم؟
ضمیر۔ مجھے نہیں پہچانتے؟
ابن آدم — نہیں! میں کسی کو نہیں پہچانتا۔
ضمیر — میں تمہارا ضمیر ہوں۔
ابن آدم — میرا کوئی ضمیر نہیں۔ خیر تم کیا چاہتے ہو؟
ضمیر — میں تمہارا بھلا چاہتا ہوں۔
ابن آدم — مطلب کی بات کرو۔
ضمیر — تم کہاں جا رہے ہو؟
ابن آدم — خودکشی کرنے۔
ضمیر — (فلک شگاف نعرہ لگاکر) خودکشی کرنے! کیوں؟

ابن آدم ۔ مجھے ایسی دنیا نہیں چاہئے ۔

ضمیر — تم اپنی پسند کی دنیا بنا سکتے ہو ۔

ابن آدم — لیکن میں تھک گیا ۔ اب آرام کرنا چاہتا ہوں ۔ اور آرام موت کے آغوش میں ہی مل سکتا ہے ۔

ضمیر — خودکشی گناہِ کبیرہ ہے ۔

ابن آدم — (اچانک ڈانٹ کر) بھاگ جاؤ میرے پاس سے ۔ تمہاری نگاہ میں آرام و سکون حاصل کرنے کا ہر عمل گناہ کبیرہ ہے ۔

ضمیر — (سکون کے ساتھ) ناراض نہ ہو ۔ میں تمہارا مخلص ساتھی ہوں ۔ میں نے ہمیشہ سچ کہا ہے ۔

ابن آدم — (تلخی سے) تمہاری سچائی پر ہزار بار لعنت ہے اب میں تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گا ۔ کاش میں پہلے ہی تمہاری بات نہ سنتا !

[ابن آدم یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے ۔ ضمیر اسے پکارتا ہوا کچھ دور تک ساتھ جاتا ہے ۔ لیکن ابن آدم کو متوجہ نہ دیکھ کر اپنا راستہ بدل کر کسی اور طرف نکل جاتا ہے ۔ ابن آدم پہلے کی رفتار سے تیز تیز چلنے لگتا ہے ۔ اچانک ایک طرف سے دل نمودار ہوتا ہے ۔ ابن آدم ٹھٹھک جاتا ہے ۔]

دل — اے بھائی سنو بھی ۔ ایسی کیا جلد بازی ہے ۔

ابن آدم ۔ کون ہو تم ؟

دل — مجھے بھی بھول گئے ۔ میں تمہارا قریب ترین دوست دل ہوں ۔

ابن آدم ۔ (درشتی کے ساتھ) اس دنیا میں کوئی کسی کا دوست نہیں ۔

دل — لیکن میں ضرور تمہارا دوست ہوں ۔

ابن آدم — تم کیا چاہتے ہو ؟

دل — اپنے ارادے سے باز آجاؤ ۔

ابن آدم — یہ کبھی نہیں ہو سکتا ۔

دل — (سمجھانے کے انداز میں) میری بات مان لو ۔

ابن آدم — میں ہمیشہ بات مانتا رہا ۔ اور ہمیشہ نقصان اٹھاتا رہا ۔ لیکن آج میرے ارادے کو کوئی طاقت نہیں بدل سکتی ۔

دل — لیکن سنو تو ۔

ابن آدم — جاؤ میرا وقت برباد نہ کرو ۔ میری منزل کب سے میرا انتظار کر رہی ہے ۔

[ابن آدم پھر آگے بڑھ جاتا ہے اور دل مایوس ہو کر ایک سمت کو روانہ ہو جاتا ہے ۔ ابن آدم نے ابھی چند ہی قدم کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ کہیں دور سے پائل کی مدہوش کن آواز آتی ہے ۔ ابن آدم کی رفتار میں پھر فرق آ جاتا ہے ۔ کچھ ہی پل بعد امید اپنی من موہنی صورت لئے ابن آدم کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے اور اپنی خوبصورت آنکھیں ابن آدم کے وحشت زدہ چہرے پر گاڑ کر نہایت ہی مترنم آواز میں کہتی ہے ۔]

امید — کہاں جا رہے ہو ؟

ابن آدم — (کرختگی سے) مرنے ۔

امید ۔ (ابن آدم کے منہ پر ہاتھ رکھکر) چھی! بری باتیں منہ سے نہیں نکالتے۔

ابن آدم ۔ (امید کا ہاتھ جھٹک کر) میرا راستہ چھوڑ دو۔

امید ۔ (دلربایانہ انداز میں) مجھ سے مایوس ہوگئے۔

ابن آدم ۔ تم نے مجھے ہمیشہ دھوکا دیا ہے۔ دنیا میں تم سے زیادہ دھوکہ باز اور فریبی کوئی نہیں ہے۔

امید ۔ تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی۔ میں نے ہمیشہ تمہارے سامنے روشن امکانات پیش کئے۔ نت نئی راہیں تلاش کیں۔

ابن آدم ۔ (بات کاٹ کر) اور وہ راہیں ہمیشہ کچھ دور جاکر اندھیرے میں گم ہوگئیں۔

امید ۔ لیکن . . . . .

ابن آدم ۔ (امید کو ایک طرف دھکیل کر) ہٹو بھی! اب تمہارا جادو مجھ پر نہیں چل سکتا۔

[امید منہ کے بل گر کر سسکیاں لینے لگتی ہے لیکن ابن آدم پلٹ کر دیکھے بغیر آگے بڑھ جاتا ہے۔ کچھ ہی دور جانے کے بعد بہتے ہوئے پانی کا شور سنائی دیتا ہے۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے۔ وہ اور تیز ہو جاتا ہے۔ اب وہ ایک طوفانی ندی کے کنارے ایک اونچی چٹان پر ہوتا ہے ایک نظر چاروں طرف ڈال کر جب وہ نیچے دیکھتا ہے تو حیات اس کے قدموں سے لپٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ ابن آدم دو قدم پیچھے ہٹتا ہے تو حیات بھی اس کے ساتھ گھسٹتی ہے لیکن اس کے قدم نہیں چھوڑتی۔]

ابن آدم ۔ (ہاتھوں سے الگ کرتے ہوئے) چھوڑ دو مجھے۔ میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں۔

حیات ۔ نہیں، میں نہیں چھوڑونگی۔ تم مجھ سے اس طرح بے وفائی نہیں کر سکتے۔

ابن آدم ۔ وفا کا نام نہ لو۔ تمہارے منہ سے وفا کا پاکیزہ لفظ اچھا نہیں لگتا۔ جاؤ ۔ دنیا کے ہنگامے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔

حیات ۔ تمہارے بغیر میری دنیا کا کوئی وجود نہیں۔

ابن آدم ۔ (تلخی سے) ہے کیوں نہیں، موٹریں ہیں۔ فلیٹ ہے۔ تجوریاں اور بینک ہیں۔ اتنی بڑی دنیا کی سجی سجائی سیج ہے۔

حیات ۔ لیکن کیا تم یہ سب کچھ نہیں چاہتے۔ تم بھی تو . . . . .

ابن آدم ۔ (جھلاکر) میں صرف موت کی گداز باہیں چاہتا ہوں۔ اس کی سرد اور پر سکون آغوش ۔ اور بس

[اتنا کہہ کر ابن آدم پانی کی تیز روانی میں چھلانگ لگانے کے لیے دیکھتا ہے تو ایک انتہائی ڈراؤنی شکل نظر آتی ہے۔]

ابن آدم ۔ (خوف زدہ آواز میں) کون ہو تم ؟

موت ۔ (ایک بھیانک قہقہہ کی آواز) میں ۔ تمہاری ازلی شیدائی۔ تمہاری تمام مصیبتوں کی نجات دہندہ۔ ہا ہا ہا . . . میں تمہاری جنم جنم کی ساتھی، موت ہوں۔

ابن آدم ۔ موت!! تم موت ہو۔ تم اتنی مکروہ ہو!

موت ۔ (ایک قہقہہ لگا کر) میری صورت پہ نہ جاؤ پیارے۔ میری محبت کو دیکھو۔ آؤ، آؤ، ڈرو نہیں ۔ میری گود میں آؤ۔ دیکھو کب سے میری آغوش تمہاری پیاسی ہے۔

[موت چپا جانے والے انداز سے دیکھ کر اپنے خوفناک پنجے اس کی طرف بڑھاتی ہے]

ابن آدم ـــ (انتہائی طور پر سراسیمہ ہو کر پیچھے ہٹتے ہوئے) نہیں! نہیں!! میں تو تمہاری طرف دیکھ بھی نہیں سکتا ـــــ . . . .
تم مجھے چھوڑ دو ـ مجھے معاف کر دو ـ مجھے بخش دو ـ

[ایک دل دوز چیخ بلند ہوتی ہے ـ ابن آدم کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موت نے اپنے پنجے اس کی گردن میں چبھو دیئے ـ]

ابن آدم ـــ (اکھڑی ہوئی آواز میں) بچاؤ . . . . بچاؤ . . . . .

(ابن آدم وہیں چٹان پر ڈھیر ہو جاتا ہے ـ)

[جب آنکھ کھلتی ہے تو اس کے سرہانے حیات سولہ سنگھار کئے بیٹھی ہے اور اس کے بالوں میں ہولے ہولے شانہ کر رہی ہے ـ]

ابن آدم ـــ (حیرت سے) تم!

(جواب میں حیات صرف مسکراہٹ کے پھول بکھیر دیتی ہے)

ابن آدم ـــ تم پھر جیت گئیں ـ

حیات ـــ میری محبت جیت گئی ـ

ابن آدم ـــ (حیات کو غور سے دیکھ کر) آج تم کتنی حسین لگ رہی ہو ـ

حیات ـــ (پیار سے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر) میں سدا ایسی ہی رہتی ہوں ـ تمہاری نظر بدل جاتی ہے تم ایک ذرا جرأت پیدا کرو تو میں تمہیں ایسی ہی نظر آؤں ہمیشہ ـ

[ابن آدم سر جھکا کر کچھ سوچنے لگتا ہے ـ]

حیات ـــ سوچتے کیا ہو ـ آؤ چلیں ـ دیکھو دنیا کو ہماری کتنی ضرورت ہے ـ

[اچانک ایک گوشے سے دل اور ضمیر نمودار ہوتے ہیں دوسرے گوشے سے امید پائل کی جھنکار اور موسیقی کے زیر و بم پر رقص کرتی ہوئی ابن آدم کی طرف بڑھتی ہے ـ یہ تینوں قریب آ کر ابن آدم اور حیات کو اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں اور بیک زبان ابن آدم سے مخاطب ہوتے ہیں ـ]

دل
ضمیر } جلد چلو یہاں سے ـ اٹھو جلدی سے!
امید

[ابن آدم حیات کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر مسکراتا ہوا کھڑا ہو جاتا ہے اور حیات اسے کھینچتی ہوئی آبادی کی طرف بڑھنے لگتی ہے ـ دل اور ضمیر پہلو بہ پہلو ہوتے ہیں ـ اور امید آگے ہوتی ہے ـ پس منظر میں زندگی کے بے ہنگم شور، طوفان کے جھکڑ اور الو کے بولنے کی آواز کے بجائے آب رواں کا ترنم باد صبا کی اٹھکیلیاں اور طائر خوش نوا کے بہار آفریں نغمے سنائی دیتے ہیں ـ]

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

ہادی مچھلی شہری

اب یہ اپنا مزاج ہستی ہے زندگی موت کو ترستی ہے

کس طرف جایئے سکوں کے لئے ہر طرف آگ ہی برستی ہے

شادکامی کا کیجئے کیا ذکر غم سے بھی اب فراغ دستی ہے

ارزشِ زندگی کسے معلوم موت کے داموں بھی یہ سستی ہے

چند سانسیں بقیدِ نالہ و آہ یہی اپنی متاعِ ہستی ہے

آج کل عقل کی ہر اک پرواز مائلِ انحطاط و پستی ہے

ہوگیا ہو جو بارِ دوشِ حیات اس کی ہستی بھی کوئی ہستی ہے

فطرتِ بادہ بھی ہے بدلی ہوئی اب نہ وہ کیف ہے نہ مستی ہے

زندگی بے پئے بھی ہے سرشار میری ہستی عجیب ہستی ہے

لب ہنسی کے لئے ترستے ہیں غم کی کچھ ایسی چیرہ دستی ہے

بیخودی ہے مرا مقامِ حیات میری دنیا سرور و مستی ہے

نیستی جس کا پیشِ خیمہ ہو ایسی ہستی بھی کوئی ہستی ہے

جلوۂ مہر و ماہ و انجم میں اپنے ذوقِ نظر کی پستی ہے

نہ ترنم نہ لذّتِ آہنگ کیا یہی میرا سازِ ہستی ہے

جلوہ جو تھا کبھی متاعِ نگاہ اب اسے چشمِ دل ترستی ہے

زندگی اور اس قدر محدود زندگی ماورائے ہستی ہے

زندگی جس کا نام ہے ہادی
وہ فقط ایک خوابِ ہستی ہے

لیث قریشی

گردشِ دوراں مشقِ ستم کی شوق سے کر تکمیل
شکوہ کر کے میں نہ کروں گا خود اپنی تذلیل

رفتہ رفتہ ساغرِ ہستی کی صہبا بھی تلخ ہوئی
اپنے عمل سے شہد میں آخر زہر ہوا تحلیل

اکثر یوں محسوس ہوا ہے یاد میں تیری پلکوں پر
جیسے میں نے روشن کی ہو اشکوں کی قندیل

آج تک ابنِ آدم انساں بن نہ سکا افسوس
صدیوں سے گو وردِ زباں ہیں توراۃ و انجیل

تھوڑی دیر تو موجوں سے تم کھیل کے بختہ کار بنو
پار اترنے والو آخر کیوں اتنی تعجیل

میرے دل پر خاک اثر ہو غم کی شدت کا جب ہے
ذہن فسردہ۔ فکر معطل۔ یخ بستہ تخئیل

ہنسنے والے۔ رونے والے کی قسمت کیا بدلیں گے
کیسے کریں گے؟ فطرتِ شبنم، شعلۂ گل تبدیل

وقت کے پتھر سے ٹکرا کر نازک شیشہ غیرت کا
ٹوٹ گیا اکبار تو پھر دشوار ہوئی تشکیل

لیثؔ کسی نے سمجھا بھی ہے! مفہومِ تکوین!
یہ ہے وہ اجمال کہ جس کی کوئی نہیں تفصیل

صبا اکبرآبادی

○

رفعتِ سجدہ لامکاں تک ہے | آپ کا آستاں کہاں تک ہے
نیند اُن کی شریر آنکھوں میں | صرف میری ہی داستاں تک ہے
فصلِ گُل کا ہے سلسلہ دل تک | نہ قفس تک نہ آشیاں تک ہے
حدِ منزل تعیّنِ منزل | پاشکستہ سے کارواں تک ہے
جاگ اے زندگی کی مدہوشی | زندگی صبح کی اذاں تک ہے
سب سمجھتا ہے درد کا مالک | ہم کہاں تک ہیں دل کہاں تک ہے
موت کی حد سے ہم نکل آئے | نامرادی کی حد کہاں تک ہے
میرا ویرانہ ہے وہیں سے شروع | آپ کی انجمن جہاں تک ہے
کچھ نہ ہوگا جو آشیاں نہ رہا | زینتِ باغ آشیاں تک ہے
دلِ خود بیں کو ضبط کا پندار | اُن کے اندازِ امتحاں تک ہے

ہے گلے سے اُتر کے روح صبا
تلخیٔ مے لب و دہاں تک ہے

تندرست لوگ باقاعدہ
لائف بوائے صابن سے نہاتے ہیں
LIFEBUOY SOAP
LIFEBUOY
SOAP
LIFEBUOY SOAP
یہ آپ کے دن کی گندگی اور اس کے جراثیم دھو ڈالتا ہے !
آپ کے دن ہمیں گندگی سے واسطہ پڑتا ہے جس میں جراثیم ہوتے ہیں
اور جن سے ہمیں بیماریوں کا خطرہ رہتا ہے۔ اسی لئے تو بے شمار
لوگ اپنی صحت کی حفاظت لائف بوائے صابن کے باقاعدہ غسل سے
کرتے ہیں جو گندگی اور اس کے جراثیم بھی دھو ڈالتا ہے۔
یہ تازگی اور شگفتگی کا صحت مندانہ احساس دلاتا ہے
L.12—191

مہر نیمروز کراچی

اسے اس لڑکی سے محبت ہے اور میں اسے اپنی ملکہ بناؤں گا۔"

جب بادشاہ کی سمجھ میں آیا کہ شہزادے کے دل میں یہ محبت تو خدا کی ودیعت ہے تو بادشاہ نے جواب دیا: "اچھی بات ہے میں اس لڑکی کے لئے تمہارا پیغام بھجوا دوں گا"۔

بادشاہ نے ایک مشاطہ کو بلایا اور اس سے کہا کہ تم چرواہے کی بیٹی سے کہنا کہ شہزادہ اس سے محبت کرتا ہے۔ اور اسے اپنی ملکہ بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ مشاطہ چرواہے کی بیٹی کے پاس گئی اور بولی: "شہزادہ تمہاری محبت میں گرفتار ہے اور تمہیں اپنی ملکہ بنانے کا آرزومند ہے"۔

لڑکی نے پوچھا: "شہزادہ کیا کام کرتا ہے۔؟"

مشاطہ کو اس سوال پر بڑا تعجب ہوا اور اس نے لڑکی کو بتایا کہ شہزادہ تو بادشاہ کا بیٹا ہے۔ وہ کوئی کام نہیں کرتا اسے کام کرنے کی کیا ضرورت ہے"۔

لڑکی نے کہا: "یہ تو بری بات ہے۔ اسے کچھ نہ کچھ کرنا ضرور چاہیئے۔ اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ محنت کسے کہتے ہیں جفاکشی کیا ہوتی ہے"۔

پھر یہ ہوا کہ بادشاہ نے شہزادے کو بلایا اور اس سے کہا کہ "چرواہے کی بیٹی چاہتی ہے کہ تم کوئی ہنر سیکھو اب بتاؤ کیا اب بھی تم اسے اپنی ملکہ بنانا پسند کرو گے"؟

شہزادے نے جواب دیا: "میں بوریا بننا سیکھوں گا۔ خوبصورت رنگین نقش و نگار والے بوریئے بناؤں گا"۔ اور اس کے تین دن بعد وہ نہایت ہی عمدہ بوریئے بنانے لگا۔ اب مشاطہ چرواہے کی بیٹی کے پاس پھر گئی اور بولی "یہ بوریئے شہزادے کے بنائے ہوئے ہیں"۔

اور لڑکی مشاطہ کے ساتھ بادشاہ کے محل میں گئی اور شہزادے کی دلہن بن گئی۔

"ایک دن"۔ میری دادی اماں بولیں "شہزادہ شہزادی گلیوں میں گھوم پھر رہا تھا۔ وہ ایک طعام خانے میں جا پہنچا۔ طعام خانہ صاف ستھرا نہیں تھا۔ وہاں بھیڑ بھی زیادہ تھی۔ شہزادہ ایک میز پر جا بیٹھا"۔

"یہ جگہ" میری دادی اماں بولیں "چوروں اور ڈاکوؤں کا اڈہ تھی ان لوگوں نے شہزادے کو پکڑ لیا اور اسے ایک بہت بڑے تہہ خانے میں بند کر دیا۔ اس تہہ خانے میں شہر کے اور بہت بڑے بڑے آدمی قید تھے۔ ڈاکو قیدیوں میں سے موٹے تازے آدمی کو قتل کر دیتے اور دبلے پتلے آدمیوں کو کھلا دیتے۔ یہ ان قاتلوں اور ڈاکوؤں کا کھیل تھا۔ شہزادہ تمام قیدیوں سے دبلا پتلا تھا اور ان لوگوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ یہ شہزادہ ایران کے بادشاہ کا بیٹا ہے۔ اس طرح شہزادہ

لگ گئی اور شہزادے کے دل میں یہ جواب اس طرح اتر گیا جس طرح پورس کا جواب سکندر اعظم کے دل میں اتر گیا تھا اس وقت اسکندر اعظم اور شہزادے کے من پر چھلکتے ہوئے جام میں ایک ہی رنگ کی شراب تھی اسکندر نے پورس کا جواب سن کر اسے اس کی سلطنت واپس کر دی تھی اور شہزادے نے جواب سن کر اپنی سلطنت یعنی اپنے آپکو اس کے حوالے کر دیا۔

جواب سن کر شہزادے کے لب تو چپ رہے البتہ دل میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔

شہزادے کا جی چاہنے لگا یہ عورت اس کی ہو جائے۔

وہ عورت کو اپنانے اپنانے اس جگہ آ گیا جہاں وہ اسے اپنا کر لانا چاہتا تھا۔ محل پہنچ کر اسے دوسری شہزادیاں یاد نہ آئیں۔

ایک دن شہزادے نے بادشاہ سلامت کو اپنے دل کی خواہش بتا دی۔

بادشاہ سلامت نے سن کر کہا۔

"تم شہزادے ہو میں تمہاری شادی ایسی بے وقعت عورت کے ساتھ نہیں کروں گا"۔

مگر کچھ دن بیت جانے کے بعد بادشاہ سلامت نے بڑے پھیکے دل سے شہزادے کو اجازت دے دی اس کے بعد ایک شاہی مشاطہ کو اس عورت کے پاس بھیجا گیا۔

مشاطہ نے عورت سے مل کر کہا۔

"شہزادہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے"۔

عورت نے پوچھا۔

"کیوں"

مشاطہ نے جواب دیا۔

"اس لئے کہ وہ تمہیں بہت پسند کرتا ہے"۔

عورت نے سوچا اور پھر کہا۔

"اچھا . . . شہزادہ کام کیا کرتا ہے"

مشاطہ نے منہ اور ہونٹ لٹکا کر کہا۔

"کام کیا . . وہ تو شہزادہ ہے"۔

عورت نے جواب دیا۔

"تو کیا شہزادے کام کاج نہیں کرتے یا شہزادے کو کوئی کام نہیں آتا؟"

نے جانے سے بچ گیا۔ اس نے چوروں اور قاتلوں سے کہا: "میں بوریئے بنانے کا کام کرتا ہوں اور میرے بنائے ہوئے بوریئے بہت مہنگے داموں بکتے ہیں۔"

ڈاکوؤں نے اسے بوریئے بنانے کا سامان لا دیا اور بوریئے بنانے کو کہا۔

دنوں کے اندر شہزادے نے تین بوریئے بنالئے اور بولا: "یہ تینوں بوریئے لے کر ان کے بادشاہ کے محل میں جاؤ۔ بادشاہ ہر بوریہ سو اشرفیوں میں خرید لے گا۔ اس طرح تمہیں تین سو اشرفیاں مل جائیں گی۔"

چنانچہ وہ بوریئے لے کر بادشاہ کے محل پہونچے۔ بادشاہ نے بوریئے دیکھے اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ بوریئے میرے شہزادے کے بنائے ہوئے ہیں چنانچہ بادشاہ نے وہ بوریئے چرواہے کی بیٹی کو دکھائے اور بولا: "یہ بوریئے ہمارے محل میں لائے گئے ہیں اور یہ میرے کھوئے ہوئے بیٹے کے ہاتھ کے ہیں۔"

چرواہے کی بیٹی نے اب ہر بوریئے کے ہر نقش و نگار کو خوب اچھی طرح دیکھا بوریئے کے نقش و نگار میں فارسی زبان میں شہزادے نے اپنی بیوی کے نام ایک پیغام بھیجا تھا۔ چرواہے کی بیٹی نے وہ پیغام بادشاہ کو پڑھ کر سنا دیا۔

میری دادی اماں بولیں: "اور بادشاہ نے چوروں اور ڈاکوؤں کے اڈے پر حملہ کرنے اور شہزادے کو دوسرے قیدیوں کو چھڑانے کے لئے بہت سارے سپاہی بھیج دیئے۔

سارے ڈاکو مارے گئے اور تمام قیدی آزاد ہو گئے۔ اور شہزادہ بھی سلامتی کے ساتھ بادشاہ کے محل میں اپنی بیوی اور اپنے باپ کے پاس پہونچ گیا۔ شہزادہ جب محل میں دوبارہ داخل ہوا اور جب اپنی بیوی سے ملا تو وہ اپنی بیوی کے آگے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا اور چرواہے کی بیٹی نے اس کے قدموں میں سر جھکا دیا۔

شہزادے نے کہا "میری پیاری صرف تمہاری بدولت آج زندہ ہوں۔"

بادشاہ بھی چرواہے کی بیٹی سے بہت خوش ہوا۔

"تو" دادی اماں بولیں: "سمجھ گئے تم ہر آدمی کو کس طرح ہنر سیکھنا چاہیے؟"

میں نے کہا: "جی ہاں بالکل۔ جیسے ہی میرے پاس اتنے پیسے ہو جائیں گے کہ بڑھئی کا بسولہ خرید سکوں اور کوئی جگہ مل جائے گی تو میں بھی ایک کرسی یا کتابوں کے لئے ایک شلف بناؤں گا۔"

اس سے جا کر کہو جب تک وہ کوئی کام نہیں کریگا میں اس سے شادی نہیں کر سکتی۔"

اس کے بعد مشاطہ اسکے پاس دوبارہ آئی اور کہنے لگی "شہزادہ پوچھتا ہے بتاؤ میں کیا کام کروں۔"

عورت نے جواب دیا۔

"اچھا تو شہزادے سے کہو جوتے بنانے کا کام سیکھے۔ میں تمام دن جنگل سے پھول چنتی ہوں۔ کانٹوں اور کنکروں سے پاؤں زخمی ہو جاتے ہیں اس طرح مجھے بھی آرام ہو جائے گا۔ اور شہزادے کو بھی کام آجائے گا۔"

مشاطہ نے واپس آ کر شہزادے کو یہ بات بڑی بد دلی سے سنائی اور شہزادے نے بڑی خوش دلی سے سنی۔

شہزادے نے جوتے سازی کا آغاز کیا۔ اس کو کام سکھانے کے لئے بڑے بڑے ماہر کاریگر بلوائے گئے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ چمڑا خریدا گیا۔ عمدہ سے عمدہ ہتھیار منگوائے گئے اور شہزادے نے دل و جان سے کام سیکھنا شروع کیا۔

سلطنت کی صنعت جوتا سازی میں انقلاب آگیا۔ چمڑے کی کھپت زیادہ ہوئی مویشیوں کی مانگ بڑھ گئی۔ مویشیوں کو پالنے کے لئے ویران میدانوں پر چراگاہیں بنیں اور نہریں نکالی مویشیوں دیکھ بھال اور بیماری کی روک تھام کے لئے ڈاکٹروں کی ضرورت محسوس ہوئی تو پھر ہسپتال بنے اور کالج کھلے۔ چمڑے کی افراط کے ساتھ دودھ دہی مکھن اور گھی میں بھی افراط ہوئی۔ چیزوں کے نرخ کم ہوئے اور استعمال عام ہوا۔ چمڑا رنگنے کے فن کو فروغ ہوا۔ درخت لگائے گئے جن کے طفیل شہروں کو پہلے سے زیادہ صاف ہوا ملنے لگی چمڑے کی مصنوعات میں تنوع پیدا ہوا۔ جوتوں اور مصنوعات کے تنوع اور اعلیٰ سے اعلیٰ ڈیزائن نے برآمد درآمد پر اثر ڈالا۔ فاقے کم ہونے لگے ہزارہا لوگوں کو کام ملا ہزارہا لوگوں نے کام کیا۔ ہزارہا لوگوں کے دلوں میں شہزادے کی محبت پیدا ہوئی۔ اس محبت نے عام لوگوں کو سلطنت کا خیر خواہ بنا دیا۔ حتیٰ کہ وہ دن بھی آگیا کہ شہزادہ اپنے فن میں کامل ہو گیا۔ ان دنوں بادشاہ سلامت شہزادے سے بہت ناراض تھا اور وہ عورت انتہائی خوش۔ بادشاہ نے شہزادے سے ملنا جلنا تک بند کر دیا تھا اور عورت نے شہزادے سے میل جول بڑھا دیا تھا۔

پھر ایک دن شہزادے نے اپنی ہونے والی بیوی کے لئے اس کی اور اپنی پسند کا جوتا بنایا اور ہونے والی شہزادی کو پیش کرنے کے لئے چل کھڑا ہوا۔ پھر ایسا ہوا کہ راستے میں شہزادے کو کیا پاکر ڈاکوؤں کے ایک گروہ

نے اسے پکڑ لیا اور لے جا کر ایک تہہ خانے میں بند کر دیا۔ وہاں شہزادے نے دیکھا۔ بے شمار رئیس زادے قید ہیں۔ ان کی حالت نہایت خراب ہے ڈاکوؤں کا سلوک بے رحمانہ ہے۔ شہزادے کو ان سے نفرت بھی ہوئی اور ہمدردی بھی۔ شہزادے کے ساتھ بھی ڈاکوؤں نے بے رحمانہ سلوک کیا اور اس بدسلوکی نے شہزادے کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ وہ خود کسی کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرے گا۔

ڈاکو کمائی کے لئے امیر گھرانوں کے لڑکوں کو پکڑ لاتے اور ان کے لواحقین سے رقم وصول کر کے انہیں آزاد کر دیتے۔ جب ڈاکوؤں نے شہزادے سے پوچھ گچھ کی تو اس نے کہا۔

"میں تو عام آدمی ہوں صرف میرے کپڑوں نے تمہیں حیرت میں ڈال دیا ہے۔ مجھے جوتے بنانے کا کام آتا ہے۔ مجھے مطلوبہ اشیاء لا دو میں تمہارے لئے جوتے بنا دیا کروں گا۔ یہ بیکاری مجھ پر شاق گذر رہی ہے۔" ڈاکوؤں نے یہ کام تو کر دیا مگر راز افشانی کے خوف سے رہا کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

اس وقت شہزادے کو اس عورت کے بارے میں سوچ کر بڑی کوفت ہوئی جس کے عشق نے اسے یہاں پہونچایا تھا۔ البتہ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے اس عورت کے تصدق ایک ہنر سیکھ لیا ہے اور ایسی خطرناک جگہ پر بھی اس کی زندگی خطرے میں نہیں۔

بعض اوقات شہزادے کو خیال آتا کہ بادشاہ کیلئے جوتے بنا کر بھیجے تاکہ اس پر شہزادے کی گرفتاری کا راز آشکار ہو جائے اور وہ اس کی مدد کو پہونچے مگر اس نے بادشاہ سے فریاد کرنا مناسب نہ سمجھا۔

دارالسلطنت میں شہزادے کی تلاش جاری تھی تاہم گمشدگی کی خبر کو مشتہر نہیں کیا گیا تھا مبادا اس سے شہزادے کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔

ایک دن شہزادے نے ایک بوڑھے ڈاکو سے پوچھا

"کیا بات ہے تم بڑے عتاب زدہ دکھائی دیتے ہو؟"

ڈاکو نے شہزادے کو ہمدرد پا کر کہا

"میں کیا بتاؤں اس ملک کے شہزادے نے میرے بیٹے کی زندگی سدھار دی ہے۔ اور میری زندگی خراب کر دی ہے"

"وہ کس طرح" شہزادے نے پوچھا۔

ڈاکو نے کہا "شہزادے کی جوتا سازی سے اس کا بیٹا ایسا متاثر ہوا کہ یہاں سے بھاگ کر چلا گیا ہے کہیں شہد کی مکھیاں پال کر اپنا گذارہ کرے گا مجھے

بچوں کی چکاری پسند نہیں۔

"وہ پولیس کو آگاہ کیوں نہیں کرتا" شہزادے نے پوچھا۔

ڈاکو نے کہا۔

"میں اس کا باپ اس کی بیوی اور دو بچے یہاں قید ہیں۔ اگر وہ پولیس کو آگاہ کر دے تو ڈاکو ہمیں مار ڈالیں گے"

شہزادہ یہ سن کر سوچ میں ڈوب گیا۔ اس نے ڈاکو سے کہا۔

"تم یہ جوتا فلاں عورت کے پاس لے جاؤ اگر اسے پسند آ گیا تو وہ تمہیں بہت سا انعام دے گی یہ انعام تم لے لینا"

چند دن کے بعد ڈاکو شہزادے کے پاس آیا اور بولا۔

"ہاں میں اس پھول چننے والی عورت سے ملا تھا اسے جوتا بہت پسند آیا مگر تنگ نکلا اس نے کہا ہے کہ اسے ڈھیلا کروا کے لا دو"

شہزادے نے جوتا ٹھیک کر دیا اور ڈاکو اسے لے کر عورت کی کٹیا میں بڑے اطمینان سے داخل ہوا۔ اور وہیں پولیس نے بڑے اطمینان کے ساتھ اسے گرفتار کر لیا۔ اس ڈاکو کے بعد تمام ڈاکو گرفتار ہو گئے۔ اور تمام قیدی رہا ہوئے۔

بادشاہ جو اپنے شہزادے کے غم میں نیم جان ہو رہا تھا پھر سے ہرے بھرے درخت کی طرح شگفتہ ہو گیا۔ اس نے بیٹے کو گلے لگایا۔

جب شہزادے کی شادی ہوئی تو اس نے پھول چننے والی شہزادی سے کہا۔

"اگر تم مجھے جوتا سازی سیکھنے کو نہ کہتیں تو میں دوبارہ شہزادہ کبھی نہ بنتا"

اس کے بعد اس دارالسلطنت میں یہ بات عام ہوئی کہ شہزادے نے جوتوں کے طفیل ڈاکے ختم کر دیئے۔

خورشید احمد
بیخود جعفری

کتابیں

ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں

مصنف :- علامہ سید سلیمان ندوی ناشر :- ادارہ تصنیف و تالیف آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

صفحات - ۱۴۴ - قیمت - دو روپے

ہندو پاکستان کی سرزمین جن چند نفوس قدسیہ کے علمی کارناموں پر ہمیشہ فخر کرے گی ان میں علامہ سید سلیمان ندوی کا نام سرفہرست آتا ہے۔ آپ نے نصف صدی تک علم و تحقیق کی شمعیں فروزاں کیں اور اپنے پیچھے نہ بھلایا جانے والا علمی و فکری سرمایہ چھوڑا۔ زیر تبصرہ کتاب اسی سرمایہ کا ایک جوہر ہے۔

"مسلمانوں نے ہندوستان کو کیا دیا؟" علمی حلقوں میں یہ مسئلہ ایک عرصہ سے زیر بحث رہا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے ۱۹۱۸ میں آل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں اس مسئلہ کے ایک پہلو پر ایک فاضلانہ مقالہ پیش کیا تھا۔ یہ مقالہ اب پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے شایع کیا ہے۔ لیکن؛ گذر جانے کے باوجود مقالہ میں وہی تازگی اور شگفتگی ہے جو ایک نئی تحریر میں ہوتی ہے۔

علامہ مرحوم نے زیر تبصرہ کتاب میں عرب اور ہند کے تعلقات کے مختصر تعارف کے بعد اس چیز سے بحث کی ہے کہ ہندوستان میں علوم کی ترویج ہوئی اور اس میں مسلمانوں کا حصہ کیا ہے؛ نیز یہ کہ ہندوؤں کے اپنے لٹریچر کی ترقی کے لئے مسلمانوں نے کیا مواقع فراہم کئے۔ آخر میں تفصیل کے ساتھ ہر علم کی تاریخ اور مراحل کی نشان دہی کی گئی ہے اور معتبر تاریخی اسناد سے دکھایا ہے کہ علمی طور پر ہندوستان کا دور زریں مسلمانوں کا عہد تھا۔ اور اسمیں مسلمانوں نے کسی تعصب کے ہندوؤں کے لئے نہ صرف ترقی کی ہر راہ کھولی بلکہ ان کی بے مثال حوصلہ افزائی کی ہر شعبۂ علم کے ہندو ماہرین کا تعارف بھی کرایا گیا ہے۔

مولانا موصوف نے یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کے آنے سے قبل ہندوستان میں علمی ترقی چند شعبوں تک محدود تھی اور صرف مخصوص طبقات ہی بحر علم بھا سکتے تھے لیکن یہ مسلمانوں ہی کا اثر تھا کہ (ا) طبقاتی تعصب ختم ہوا اور ہر شخص کیلئے حصول علم کے امکانات پیدا ہوگئے (ب)۔ نئے علوم کی ترویج ہوئی (ج) رواداری اور وسیع الخیالی پیدا ہوئی اور (د) علوم کی تحریر کا انتظام ہوا۔ سید صاحب نے ناقابل انکار شواہد کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ علم تحریر اہل ہند نے عربوں سے سیکھا ہے۔

"ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں" ایک نہایت بلند پایہ علمی تحقیقی مقالہ ہے اور اس کا مطالعہ طلبا تاریخ کے علاوہ عام لوگوں کے لئے بڑا مفید

خورشید

"گلہائے داغ" پر ایک نظر

"یہ کلام داغ کا ایک پر بہار انتخاب ہے اور اس پر ہلکا پھلکا جی لگنے والا تبصرہ۔ مصنف علیگڑھ کے ... پی۔ ایچ ڈی ہیں اور ڈھاکا یونیورسٹی میں اردو کے استاد لیکن اس کے باوجود ان کا دماغ مشرقی ہے اور قلم مشرقی اور اردو کا ہنارہ بھول نہیں گئے ہیں۔ کہ لکھنے تو ہوں اپنی مادری زبان لیکر ہوتا ہو کہ ترجمہ کسی غیر زبان سے کر رہے ہیں اور تنقید ہو تو اپنی زبان کے شاعروں پر مگر تمام تر ان اصول و فروع کے ماتحت جو فرنگیوں کے دلیس میں بیٹھ کر ...

ہفتہ وار صدق جدید لکھنؤ ۱۸ مئی ۵۷ء

وسلے رکھ کر وضع ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر آفتاب احمد کا ذہن ترقی پسندی کے سارے جراثیم سے پاک ہے"

عبدالماجد دریابادی کے منفرد اور حقیقت نگار قلم کے مذکورہ بالا جملے "گلہائے داغ" کے مطالعہ کے محرک ہوئے۔ اولین فرصت میں کتاب حاصل کی اور اسے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ اس مطالعہ میں جس چیز سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوا وہ مؤلف کتاب کا خلوص ہے جو پڑھنے والے کو بھی اپنی جانب کھینچے بغیر نہیں چھوڑتا۔ دوسری چیز جو کم اہم نہیں مصنف کی خود اعتمادی اور جرأت اظہار ہے۔ ایک بدنام شاعر پر عام خیال کی مخالفت میں بیباکی سے قلم اٹھانا ہمارے نزدیک بڑی ہمت و جرأت کا کام ہے جس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔

گلہائے داغ جس کے مرتب ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی رودولوی علیگ ہیں ایک سو تیس صفحے کی چھوٹی سی خوبصورت کتاب ہے جس میں داغ کی شاعری پر تبصرہ اور ان کے کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ انتخاب میں ندرت ہے اور تبصرے میں بانکپن۔ ندرت اس لئے کہ اس میں طرز عام کی پیروی نہیں کی گئی اور ردیف وار ترتیب کے بجائے مختلف عنوانات مثلاً "جذبات و تاثرات" "تاملات و تجربات" "طنزیات و ظریفات" وغیرہ وغیرہ قائم کر کے ان عنوانات کو داغ کے متفرق مگر منتخب اشعار سے سجایا ہے جس سے مؤلف کی محنت، کاوش اور تلاش کے ساتھ ساتھ ذوق صحیح کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ پورے انتخاب میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ملتا جو بے روح ہو اور جسے بھرتی کا شعر کہا جا سکے۔ اور بانکپن اس اعتبار سے کہ تبصرے بھر میں ہمیں وہی کیفیت ملتی ہے جو شاعری کی امتیازی شان ہے اور جسے دوست دشمن سبھی بانکپن کے نام سے یاد کرتے چلے آئے ہیں جس طرح بجنوری نے غالب کے رنگ میں غالب کے کلام پر اظہار خیال کیا ہے ٹھیک اسی طرح ڈاکٹر آفتاب نے داغ کی شگفتہ بیانی اور بانکپن کو اپنا کر ان کی شاعری کے اس رخ کو پیش کیا ہے جو خود ان ہی کا مختص تھا۔

ڈاکٹر آفتاب نے جہاں داغ کی شاعری کے روشن پہلو کو بڑی آب و تاب کے ساتھ پیش کیا ہے وہاں ان کی خامیوں سے بھی چشم پوشی نہیں کی ہے لکھتے ہیں :-

"داغ کے محبوب کو بازاری اور ہرجائی کہنے کے بعد ان کی شاعری میں محبت کے بلند مقامات کی جستجو لاحاصل ہے"

اس جملہ میں اعتراف و ہمدردی کے عناصر فنکارانہ انداز سے شیر و شکر کئے گئے ہیں جو خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ شروع سے آخر تک تبصرہ کا رنگ یہی ہے۔

"دیباچہ آفتاب" کے عنوان سے فوق صاحب لکھتے ہیں "میرے خیال میں اگر مذہب عشق کا کوئی سب سے بڑا منکر پیدا ہوا ہے تو وہ داغ ہے۔ میرے نقطۂ نظر سے ان کی شاعری باوجود زبان و بیان کی سلاست اور صفائی کے بنیادی طور پر زبانی چونچلوں اور مجلسی چرچوں پر مبنی ہے لیکن آفتاب صاحب نے جب اپنا مقالہ مجھے سنایا تو میں نے انہیں مشورہ دیا کہ اسے اسی طور پر شائع ہونا چاہئے کیوں کہ مجھے یہاں تنقید اور شاعری کے دائرے ایک دوسرے سے ملتے نظر آتے ہیں اور نقاد اور شاعر کے درمیان وہ مشترک زمین ملی جس کی جھلک ہماری تنقید میں شاذ ہی نظر آتی ہے"

چوں کہ فوق صاحب شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی میں ڈاکٹر آفتاب کے رفیق کار ہیں ان جملوں میں حق رفاقت کی بو محسوس ہوئی لیکن جب کتاب ختم کی تو نہ صرف یہ کہ ان سے میری بدگمانی دور ہو گئی بلکہ ان کا ہم خیال و ہم زبان بنا اور اب ہم قلم ہونے کا متمنی ہو رہا ہوں۔

ڈاکٹر آفتاب کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ داغ کے دامن داغ دار کے دھبوں کو دھو دیں جو ناقدین داغ کے قلم نے بے جا طور پر ان پر لگائے ہیں۔ اس کوشش میں وہ ناکامیاب نہیں رہے۔ تنقید اور ناقد کے بارے میں آفتاب صاحب کا نقطۂ نظر ان کے ان جملوں سے پورے طور پر واضح ہو جاتا ہے۔

"ناقد عام طور پر گھٹیا قسم کا جانور ہوتا ہے اس لئے کہ وہ دوسروں کو خواہ مخواہ گھٹیا سمجھنے کے لئے تلاش کرتا رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی نگاہیں توہمات میں الجھ کر رہ جاتی ہیں تجلیات تک نہیں پہنچ پاتیں۔ ادب کے لئے وہ کتنا مبارک دن ہو گا جب ناقد اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اور اس طرح دوسروں کی خوبیاں خود بخود واضح ہو جائیں گی"

گلہائے داغ صفحہ ۹ و [illegible]

کتاب کی خوبیاں گنوائی جا چکیں اب تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ ہو۔

آفتاب صاحب نے داغ کے عریاں اشعار اور رکیک خیالات پر ولی، میر، غالب، مومن، آتش اور امیر کے کم و بیش اسی قسم کے اشعار و خیالات کی یاد دلا کر اس میں شک نہیں کہ بڑی خوبصورتی سے پردہ ڈالا ہے پھر بھی بات مدعی سست اور گواہ چست سے آگے نہیں بڑھتی۔ بری چیز کہیں بھی ہو کسی کی بھی ہو بری ہی رہے گی پرکاری تو دیکھئے

"اردو شاعری کا بابا آدم ولی امرت لال سے چہلیں کرتا ہے گوبند لال سے معاشقہ بھی کرتا ہے کوئی کچھ تعجب نہیں کرتا۔ سرتاج الشعرا میر عطار کے لونڈے سے درد دل کی دوا لیتا ہے مطرب پسر کے گن گاتا ہے کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ مفکر شاعر غالب ڈھول دھپے پر اتر آتا ہے بیلی دستی کر بیٹھتا ہے دامن خوب حریفانہ کھینچنے کی دھمکی دیتا ہے کوئی چوں نہیں کرتا رئیس المتغزلین مومن پردہ نشین سے الجھ پڑتا ہے لوگ دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں کر پاتے۔ ....

.... لیکن داغ کے نام اور اس کے کلام میں جانے کیا بات ہے کہ سنتے ہی لوگوں کا تقدس جاگ اٹھتا ہے اور ہر طرح سے نکتہ چینی شروع ہو جاتی ہے۔" گلہائے داغ صفحہ ۲۸)

زور بیان کی آندھی سے مطلع کو گرد آلود بنا کر لوگوں کو داغ کے جنسی تلذذ تک نہ پہونچنے دینا داغ کے محبوبان بازاری کی فہرست کو چھپا ڈالنے کے لئے اس انداز سے پیش کرنا کہ داغ کی طرف سے ہمارا جذبہ نفرت سرد پڑ جائے اور ہم گلہ لگانے پر مجبور ہو جائیں آنکھوں میں دھول جھونکنا نہیں تو کیا ہے۔ ملاحظہ ہو

"اگر منی بائی حجاب حجاب ہی میں رہتی اگر حمیدن بائی نقاب بے نقاب نہ بھی ہوتی اگر اختر جان، الٰہی جان، صاحب جان، عمدہ جان پردے ہی میں رہتیں تب بھی صورت حال میں کوئی فرق نہ پڑتا سچ پوچھئے تو داغ نے اپنی سوانح حیات خود لکھ ڈالی ہے .... داغ نے جس بیدردی سے اپنی کمزوریاں اور کوتاہیاں گنائی ہیں اور جس طرح اپنے فریب نفس کا پردہ چاک کیا ہے اس سے کم سے کم یہ بات تو واضح اور متعین ہو ہی جاتی ہے کہ وہ بڑے دل گردے کا آدمی تھا۔ بڑا آدمی تھا۔" (گلہائے داغ صفحہ ۱۸)

ملاحظہ فرمایا آپ نے داغ کی شاہد بازی کا مکروہ ذکر اور اس انداز سے کہ اس کی کراہت ہوا ہو جائے میرے نزدیک ایک بڑی شعبدہ بازی ہے دوسری چیز جو بڑی تعجب خیز ہے یہ ہے کہ کتاب میں فہرست مضامین جیسی کوئی چیز نظر نہیں آتی اس سے اس کا مطالعہ آسان نہیں رہ جاتا۔ ناشر کی یہ غفلت تعجب خیز

ادارہ

رسالوں میں

آب و گل، ڈھاکہ ——— مشرقی پاکستان سے اردو کا نیا ماہنامہ نکلا ہے۔ سردر یارہ بنگوی اس کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اپنے مضمون "فسانۂ عجائب اور باغ و بہار کی درمیانی کڑی گلشن نوبہار" ——— میں بتایا ہے کہ اردو ادب کی تاریخیں رووسر کا سب سے پہلا افسانہ رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب کو قرار دیتی ہیں لیکن اولیت کا فخر سرور کا نہیں بہو رکا ہے جنہوں نے فسانۂ عجائب سے پورے بیس برس پہلے اور میر امن کی باغ و بہار سے صرف تین سال بعد ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۶ء) میں گلشن نوبہار لکھی۔ حکیم شجاع محمد بخش مہجور ولد حکیم خیر اللہ متوطن فتح پور ہسوہ، ان کا مولد و مسکن لکھنو ہے۔ شاگرد قلندر بخش جرأت قیاس کیا جاسکتا ہے کہ گلشن بہار سرور کی نظر سے گذری ہوگی لیکن صراحتاً تو کیا کنایتہً بھی انھوں نے گلشن نوبہار کا ذکر نہیں کیا۔ تقابلی مطالعہ سے اس خیال کو تقویت پہونچتی ہے کہ سرور نے اس سے استفادہ بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر شادانی لکھتے ہیں کہ فسانۂ عجائب کے مقدمہ نگار محمود اکبر آبادی نے لکھا ہے کہ لکھنو کے رسم و رواج اور معاشرت کی جو تصویریں فسانۂ عجائب میں ملتی ہیں دوسری جگہ دستیاب نہیں ہوتیں، لیکن گلشن نوبہار ان کی نظر سے گذری ہوتی تو یقیناً یہ باتیں فسانۂ عجائب کی بجائے گلشن نوبہار کے متعلق لکھتے۔ کلیم اللہ فہمی نے مشرقی بنگال کے ایک ممتاز افسانہ نگار محبوب العالم پر مضمون لکھا ہے اور افسانہ نگار کی تحریروں کے آئینے میں اس کی صورت دکھائی ہے ——— محبوب العالم پہلی جنگ عظیم میں فوج میں رہ چکے ہیں۔ ۴۹ ویں بنگال ریجمنٹ میں، اسی ریجمنٹ میں قاضی نذر الاسلام بھی تھے۔ محبوب العالم نے اپنے مرحوم چھوٹے بھائی بدر العالم کی سوانح حیات بھی لکھی ہے۔ چاٹگام کی تاریخ بھی لکھی ہے اور افسانے بھی اور مضامین کا مجموعہ بھی شایع کیا ہے جیسے مشرقی پاکستان کے آرٹ مصوری موسیقی اور نقاشی پر تبصرے ہیں۔ انھوں نے خطوط کا ایک مجموعہ بھی شایع کیا ہے۔

فاران کراچی۔

اس ماہ کے شمارے میں "ہمارے نام ایک خط" کی سرخی سے محمود مرزا صاحب کا مکتوب درج ہوا ہے جس میں مولانا عبد الباری ندوی کے مضمون "مغفرت اہل کبائر" (مطبوعہ صدق جدید لکھنو) پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ شیخ سعدی اور شیخ اکبر ابن عربی سے متاثر ہوکر علامہ سید سلیمان ندوی نے جب کافروں کے "خلود فی النار" کا وہ مفہوم بیان کیا تھا جس میں کفار بھی سزاوار مغفرت قرار پاتے ہیں تو سیرت النبی جلد چہارم پر تقریظ حوالۂ قلم کرتے وقت مولانا عبد الماجد دریابادی نے سید صاحب کی اس بحث کو "پائے طاؤس" اور ناقابل اشاعت بتایا مگر اب ایک عرصہ کے بعد خلود فی النار کی وہی بحث اپنے پرچے میں بڑے اہتمام سے شایع کیا ہے، صرف اس لئے کہ مولانا عبد الباری ندوی کی کاوشوں سے تھانوی پر دا بھی حاصل ہوگیا ہے۔ "این چہ بوالعجبی است" ——— اس خط پر مدیر فاران مولانا ماہر القادری نے تبصرہ بھی کیا ہے۔ عزیز زبیدی کا مضمون "مسئلۂ نسواں یا خاتون اسلام" آیات قرآنی اور احادیث کی ترتیب پر مشتمل ہے اور معاشرے میں عورت کی حیثیت واضح کی گئی ہے۔ مصر کے مشہور شاعر شوقی کے حالات و کلام پر لقمان اعظمی ندوی کا لکھا ہوا مضمون بھی اس شمارے میں درج ہے۔ منشی عبد الرحمن نے "کثیر الازدواجی" کے عنوان سے اپنے مضمون میں بتایا ہے کہ کثرت ازدواج اسلام کو یہودیوں اور عیسائیوں سے ورثہ میں ملی ہے یہ مضمون تعداد ازدواج کی حمایت میں ہے اور مصنف کی کتاب "عورت انسانیت کے آئینے میں" کا ایک باب ہے، ایک مضمون لطف اللہ صاحب کے قلم سے ہے کہ "کیا نبی کریم ﷺ عبوری دور کے نبی ہیں"۔ یہ ایک مختصر سا مضمون پرویز صاحب کے اس مقالہ پر تبصرہ ہے جو اسلامی مذاکرہ میں انھوں نے پڑھا تھا۔ لطف اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ پرویز صاحب نے اسلام کی

یتیمات خیرات وصیت وغیرہ کو عبوری دور کے قوانین قرار دیا ہے، لہٰذا یہ ختم نبوت پر حملہ ہے۔ اخیر میں طاہر صاحب نے اپنا سفرنامۂ عراق درج کیا ہے، یہ سفر انھوں نے ۱۹۵۶ء میں کیا تھا۔ اس مضمون کی سرخی ہے "بابل کے کھنڈر بولتے ہیں"۔

ماہنامہ تذکرہ کراچی

اس شمارہ میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے پروفیسر اکبر الدین صدیقی نے "ولی دکنی اور غواصی دکنی" کے عنوان سے ایک مختصر مضمون لکھا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ ولی نے غواصی کا کلام دیکھا ہی نہیں بلکہ پسند بھی کیا اور اس کی غزلوں پر غزلیں لکھیں ہیں، دونوں میں ملاقات بھی ہوئی کہ نہیں اس کا ابھی تک پتہ نہیں چلا۔ غواصی کی آخری کتاب طوطی نامہ ہے جس کی تکمیل ۱۶۳۹ء میں ہوئی تھی۔ پروفیسر حامد حسین ترمذی نے انگریزی غزل کا ایک دور پیش کیا ہے۔ اس مضمون کی نوعیت بقول مضمون نگار زیادہ تر اطلاعی ہے۔ صادقہ انصاری نصرت نے طالبات میں یونیفارم کی اہمیت بتایا ہے کہ لباس کی ہم رنگی سے اچھے تاثرات مرتب ہوتے ہیں۔ خواجہ شفیع کا مضمون بلاک شاہ کی تیرہویں قسط بھی درج ہے اس عنوان سے خواجہ صاحب پاکستان کے مسائل پر تیز و تند تنقید کرتے ہیں۔ محمد احمد عباسی صاحب کا مضمون "الحسین پر تبصرہ" بھی درج ہے اور یہ اس کی بارہویں قسط ہے۔

نقاد کراچی۔

ابتدا میں آٹھ فکر انگیز کارٹون شامل ہیں، مثلاً ایک سرخی ہے "ہم میں پانچواں کالم بھی موجود ہے"۔ یہ جملہ چند ریگر کا تھا۔ نقاد نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر پاکستان کا نقشہ رکھا دکھایا ہے، انگلیاں ستونوں کی طرح کھڑی ہیں، ہر انگلی پر ملک کی ایک سیاسی انجمن کا نام ہے۔ آزاد پارٹی، جماعت اسلامی، نظام اسلام، کرشک سرامک، مسلم لیگ، عوامی لیگ، ری پبلکن، نیشنل عوامی، نیشنل کانگریس، ملت پارٹی ــــــ اور نیچے ایک قطعے میں سوال ہے کہ "پانچواں کالم ہے آخر کون پاکستان میں"۔ حسب معمول سیاسی و معاشرتی مسائل پر چبھتے ہوئے نوٹ بھی درج ہیں اور ابلیس کا روزنامچہ بھی۔ مضامین میں یہودی بربریت کی سرخی سے رحمت اللہ طارق نے اصحاب الاخدود پر تاریخی روشنی ڈالی ہے۔ اور اس روشنی میں فلسطین کی موجودہ تباہی پر تبصرہ کیا ہے۔ رفیق عزیزی نے "کچھ نہ سوچو کچھ نہ سمجھو" کی طنز بھری سرخی سے ایک بہت دلچسپ مضمون لکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک دن میں نے اپنے اندر والے رفیق عزیزی کو پکارا کہ "ذرا تنہائی میں باتیں ہوں" مگر صاحب! جان کے لالے پڑ گئے انھوں نے چھوٹتے ہی پوچھا آپ کو پاکستان کی سیاسی جماعتوں میں کس جماعت سے خاص لگاؤ ہے؟" ــــــ اور یہ بحث چھڑ گئی جس میں ہر جماعت کی چند ری گنا ــــــ ایک مضمون "کیا سائنس کا ارتقا، ادب کا زوال ہے؟" محمد فضل نے لکھا ہے۔ اس مختصر مضمون میں بتایا گیا ہے کہ ادب کو سائنس سے کوئی خطرہ نہیں۔ رفیق عزیزی کا ایک اور مضمون "نیا سال مبارک" ایک زخمی کی تڑپ ہے۔ وہ لکھتے ہیں "یکم نومبر ۱۹۵۸ء کو ڈھیر سارے بچوں نے نئے سال کا پیغام مانگا تو میں سوچتا رہا کہ ان مسلمان بچوں کو ہو کیا گیا ہے۔ یکم جنوری کو نیا سال ہمارا کہاں شروع ہوتا ہے، کیا یہ بچے اپنے آپ بھی بھول بیٹھے؟" ــــــ

ساقی کراچی

اس ماہ ڈاکٹر محمد حسن فاروقی نے "ادب کا حال" لکھا ہے وہ کہتے ہیں جدید زندگی ادب کیلئے قید نہیں اور زیادہ وسیع میدان سامنے لا رہی ہے! اور ادب کو کوئی نیا کام نہیں کرنا ہے کام اس کا پرانا ہے۔ انسان کا شوق اس کی تمنا اس کی امید اور اس کا عزم وہ ابھی زندہ ہے۔ انسان ایک جنت سے آیا ہے اور اسے اسی جنت میں واپس جانا ہے۔ ادب کا کام ایک انقلابی ذہنیت پر قائم رکھنے میں مدد دینا ہے۔ انسان کا مدار دائمی قدروں پر رہا ہے اور رہے گا۔ تمام تبدیلیوں کے باوجود آفاقی قدریں قائم ہیں لہٰذا ادب اگر مر جائے گا تو انسان بھی مر جائیگا دیگر علوم انسان کو عقل دیتے ہیں مگر جوش اور جذبہ جس کے بغیر عقل کے تمام کام ناتمام رہ جاتے ہیں ادب ہی سے آتا ہے ــــــ نصیر الدین ہاشمی کا مضمون "بلگرامی" شبلی بھی اس شمارے میں شامل ہے، اس مضمون میں سرسید، شبلی، حالی، آزاد اور ذکاء اللہ کے حیدرآباد کے ساتھ تعلق اور ان بزرگوں پر حیدرآباد کے خواتین اہل قلم کے مقالات زیر بحث آئے ہیں اور شبلی کی ادبی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ اسد الحق شیدائی کا ایک مختصر مضمون "نظریہ ادب" بھی شامل اشاعت ہے۔

کون ہی جو اپنے
حسن کو
برقرار
رکھنا نہیں چاہتا
TOILET
SOAP
خوب صورتی کا پہلا معیار ہی صاف ستھری جلد ہے
اور جلد کی صفائی کے لیے اعلیٰ ترین صابن کا
استعمال لازمی ہی
پام روز صابن کی ملائم جھاگ جلد کو زیادہ سے زیادہ
ملائم بناکر آپ کے حسن کو نکھارتا ہے۔
پام روز ٹائلٹ سوپ
مشرق کا مقبول ترین صابن ہے۔
سو فیصدی
کریسنٹ پاک سوپ اینڈ آئل ملز
چٹاگانگ
کراچی
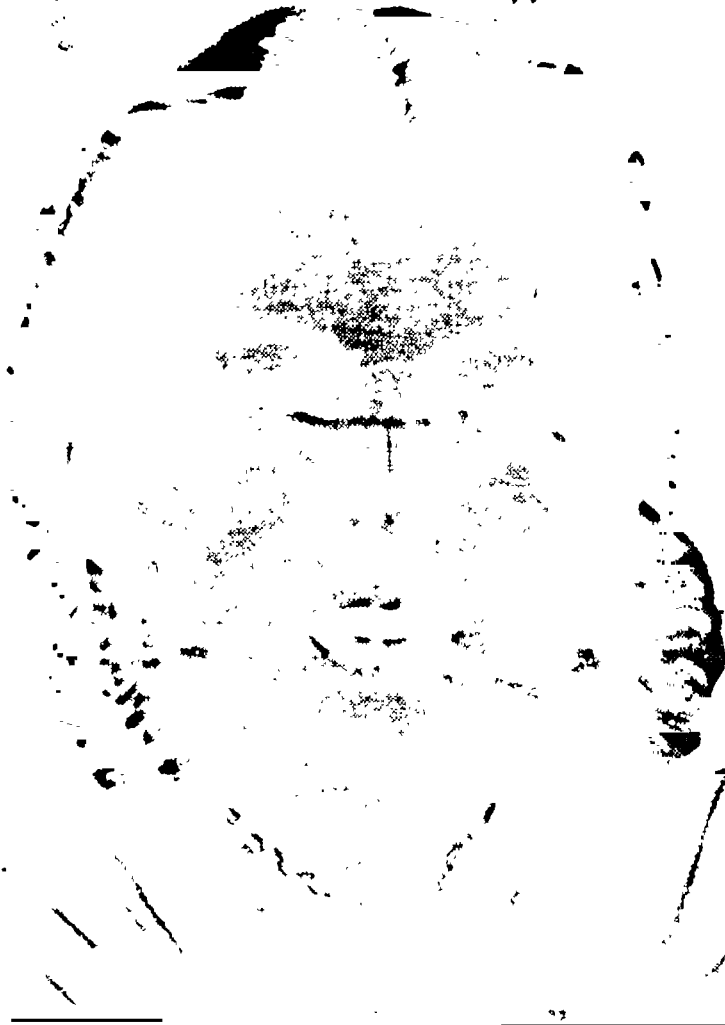
بچت بڑھانے کی سہل تدبیریں

آپ کو فائدے سے روپیہ لگانے کے لئے بڑے سرمائے کی ضرورت نہیں۔ صرف دُور اندیشی سے کام لینے اور بچت کا عہد کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ کی بچت کتنی ہی تھوڑی سہی آپ اس کو اس طرح جمع کر سکتے ہیں کہ آپ کو بھی پورا پورا فائدہ ہو اور آپ کے ملک کو بھی۔ ذیل میں جو تدابیر بیان کی گئی ہیں ان سے بہتر ذریعہ اپنے مستقبل کو محفوظ کرنے کا کوئی نہیں ہو سکتا۔ سب سمجھدار اور روشن خیال لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ہر درجے کی آمدنی رکھنے والے لوگوں کے لئے روپیہ لگانے کی بہترین مد ہے۔
۵ روپے سے لیکر ۲۵ ہزار تک چاہے جتنی رقم لگائیے (مشترک طور پر ۵۰ ہزار تک)۔
منافع ۴ء۴ فیصدی۔ انکم ٹیکس معاف۔ دس برس میں دس روپے کے ۱۴ روپے ۴ ر بن جاتے ہیں۔ ایک سال بعد بھنائے جا سکتے ہیں۔

ڈاک خانے کا سیونگز بینک

کم عرصے کے لئے بچت کا بہترین ذریعہ۔ طریقہ کار سہل۔ بچت محفوظ۔ چاہے ایک وقت میں ایک ہی روپیہ جمع کریں۔ ۲½ سے ۳ فیصدی تک منافع۔ انکم ٹیکس سے بری۔ مشترک حساب، تنہا یا مشترک میعادی حساب نیز کئی قسم کے دیگر حسابات کھولے جا سکتے ہیں۔ پاکستان کے طول و عرض میں ۵۰۰۰ سے زائد شاخیں۔

ڈاک خانے کی بیمہ پالیسی

طویل عرصے کی بچت کا عمدہ ذریعہ۔ حکومت ضامن ہے۔ سرکاری و نیم سرکاری اداروں (مع بحری، بری و فضائی فوج) کے ملازمین فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ زندگی کا بیمہ، شادی اور تعلیم کے لئے خاص بیمے۔ قلیل اقساط، کثیر منافع، مستقبل کی حفاظت کا بہترین ذریعہ۔

بچت کے ٹکٹ

بچت کے ٹکٹ خریدنا بچوں کے لئے عمدہ تفریحی مشغلہ بھی ہے اور ان میں بچت کی عادت ڈالنے اور ان کے مستقبل کے لئے روپیہ بچانے کا بہترین ذریعہ بھی۔ ۴ آنے، ۸ آنے یا ایک روپے کے سیونگ اسٹامپ ڈاک خانے سے خریدے جا سکتے ہیں۔ ان کو جمع کر کے ۵ روپے یا ۱۰ روپے والے سیونگ سرٹیفکیٹوں میں تبدیل کرایا جا سکتا ہے۔ ٹکٹ چپکانے کے لئے کارڈ مفت ملتے ہیں۔

اپنی بچت بڑھائیے۔ اپنے اور اہل و عیال کے مستقبل کی طرف سے اطمینان حاصل کیجئے اور قومی تعمیر و ترقی میں مدد دینے کے لئے روپیہ بچانے کی ان سہل صورتوں سے فائدہ اٹھائیے

بچائیے، نفع کمائیے، بیمہ کرائیے اور خوش رہیے

لو پھر بہار آئی!

موسم کی مضرتوں سے بچیے اور برکتوں سے فائدہ اٹھایئے

ماہنامہ

مہر نیمروز

مئی - جون - جولائی - اگست ۵۸ء

جلد ۳ شمارہ ۵، ۶، ۷

ترتیب

حسن مثنیٰ ندوی

ابوالخیر کشفی

علی اکبر قاصد

منتظم شاہ محمد حسان

پبلشر حسن مثنیٰ ندوی

پریس مشہور آفسٹ لیتھو پریس کراچی

کتابت فیض الکتابت کراچی

قیمت سالانہ چھ روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

دفتر

ہاؤسنگ یونین ایریا کراچی

...گرن

...اران نکتہ داں

...زاویے

وسعتیں اور ... میں

کچھ غمِ دوراں کچھ غمِ جاناں

ایک حقیقت سو افسانے

شہر نگار

جائزے

پہلی کرن

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی...

پچھلے دنوں مختلف علمی ادبی حلقوں کے بڑے بڑے لوگ اٹھ گئے۔ خیال تھا کہ ان جانے والوں کے احوالِ زندگی پر خصوصی انداز سے روشنی ڈالی جائے گی۔ اسی لئے کوئی سرسری مضمون تک نہ لکھا۔ مگر مرنے والوں نے جیسے یہ طے کر لیا ہو کہ وہ ہمیں دم لینے کی بھی مہلت نہ دیں گے۔ یہ سلسلہ شروع ہوا تو ایسی ایسی ہستیاں اس بزمِ امکاں سے اٹھیں اور اٹھتی چلی گئیں جو بذاتِ خود انجمن کی حیثیت رکھتی تھیں، مولانا حسین احمد، ابوالکلام آزاد، رام بابو سکسینہ، ہری چند اختر، احسن پھپھوندوی، سردار عبدالرب نشتر، پیر غلام مجدد سرہندی وغیرہ سب اٹھتے چلے گئے، ضروری نہیں کہ ان میں ہر ایک کی شخصی رائے، نظریات و خیالات اور راہِ عمل سے ہم آپ متفق ہی ہوں مگر اتنا تو بہرحال واضح ہے کہ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ اپنی اپنی جولانگاہ میں یہ لوگ حد درجہ متحرک اور پُرشور تھے،

———— ٥ ————

اب خبر آئی ہے کہ افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق سابق پرنسپل محمڈن کالج مدراس نے رحلت کی، پھر خبر آئی کہ داغ کے شاگردوں میں یادگار شخصیت کے مالک ڈاکٹر مبارک حسین مبارک عظیم آبادی نے کوچ کیا اور پھر وہ سنگین حادثۂ قتل پاکستان میں رونما ہوا کہ ڈاکٹر خان صاحب رخصت ہو گئے ــــ یہ شخصیتیں بھی اپنی اپنی جگہ ممتاز متحرک اور پُرشور تھیں، ان میں سے ہر ایک کی زندگی اہم واقعات و سوانح کا مجموعہ ہے۔

افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق، صحیح معنوں میں افضل العلماء تھے، قدیم و جدید علوم کے ماہر، تاریخ اسلام اور ادب عربی ان کا خاص فن تھا۔ اور تعلیمات ان کی خاص جولانگہِ عمل، عربی فارسی اردو اور انگریزی زبانوں پر انہیں یکساں قدرت حاصل تھی، فرنچ بھی جانتے تھے، یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کی سیاحت بھی کی تھی سیاسیات کا میدان انہوں نے اوروں کیلئے چھوڑ دیا تھا۔ لیکن رفتارِ سیاست سے وہ کسی آن غافل بھی نہ رہتے تھے۔ بیحد نیک سادہ مزاج اور جلیس مکر، بڑے سے بڑے مسئلے پر جچی تلی رائے دیتے تھے۔ اور مختصر اور یہ اختصارِ کلام ان کے عالی ہونے کی علامت تھی۔ کیونکہ فعّال انسان بولتا کم ہے اور کرتا زیادہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق الفاظ و بیانِ مضامین و مقالات کی صورت میں کہیں کہیں، مگر تعلیمات کے مختلف شعبوں کا نتیجہ کالجوں اور مدارس کی صورت میں زیادہ اداروں کی شکل میں زیادہ نظر آتے ہیں، جنوبی ہند میں تقسیم پر جبکہ ہر طرف انتشار پھیلا ہوا تھا انہوں نے متعدد زنانہ اور مردانہ کالج اسکول [illegible] کام کئے ان کو جیسا چاہئے سراہا نہیں گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی مساعی جمیلہ [illegible]

[illegible] علی گڑھ کے پرو وائس چانسلر مقرر ہوئے، وہ سارے ہندوستان میں طرح طرح سے مسلمانوں کی تنظیم و تعلیم کے بہانے ڈھونڈتے پھرتے تھے اخیر اخیر میں تو ان کی زندگی پیمانے کی طرح گردش مدام میں ہو کر رہ گئی تھی، ہندوستان ہو یا پاکستان ایسے اہل علم کہاں ہیں جو سراپا عمل ہوں اور جن کا نصب العین صرف خدمت ہو اور وہ نام و نمود کی طلب سے یکسر بے نیاز ہوں، یہ صفت ڈاکٹر عبدالحق میں تھی اور بڑی انمول صفت تھی اس عہد میں ڈاکٹر عبدالحق مقبول ترین اور محبوب ترین شخصیتوں میں سے ایک تھے۔

اصلاً وہ کرنول کے رہنے والے تھے، کرنول ان چار اضلاع میں سے ایک ہے جو مملکت حیدرآباد سے انگریزوں نے بطور اضلاع مفوضہ لیا تھا۔ انگریزوں کے زمانے میں ان اضلاع کا شمار مدراس کے علاقے میں ہوتا تھا۔ اب آندھرا میں شامل ہے ڈاکٹر صاحب کے والد ماجد حضرت مولانا محمد عمر صاحب نقشبندی جنوبی ہند کے ممتاز علماء میں تھے۔ مولانا محمد عمر ہم درس و ہم دستار تھے، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مفتی عبدالرزاق کانپوری اور حافظ محمد شفیع مہاجر مکی جانشین حضرت حاجی امداد اللہؒ کے ـــ ان حضرات کی دستار بندی علماء کے اس منتخب اور عظیم الشان اجتماع میں ہوئی تھی جو مدرسہ فیض عام کانپور میں ہوا تھا۔ اور جسکو مجلس ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس کہتے ہیں۔ یہ وہی اجتماع تھا جس میں حضرت مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کا سورہ والنور پر انقلاب انگیز وعظ ہوا تھا اور برعظیم نے نئی روشنی دیکھی تھی، اور جس میں حضرت مولانا شاہ محمد علی مونگیری نے مجلس ندوۃ العلماء کا پہلے سے مرتب شدہ نقشہ پیش کیا تھا۔ یہ وہی اجتماع تھا جہاں سے مسلمانوں کی تعمیر و ترقی اور خدمت و اصلاح کا وہ جذبہ عام ہوا جسے تحریک ندوۃ العلماء کہا جاتا ہے ـــ مولانا محمد عمر اس اجتماع کی روح سے معمور ہو کر اپنے وطن لوٹے اور کرنول میں مدرسہ اسلامیہ قائم کیا جو آجتک جاری ہے۔ اور وہی روح تھی جو مولانا محمد عمر سے ڈاکٹر عبدالحق کو ملی تھی، چنانچہ ڈاکٹر عبدالحق کی وسعت نظر وسعتِ قلب اور ظرف و اخلاق فرقہ بندی و گروہ سازی کی پرستی سے بلند تھا اس عہد میں ان سے زیادہ ٹھوس اور خاموش خدمت کسی اور نے نہیں کی۔ مدیر مہر نیمروز کو نہ صرف یہ کہ ان سے نیاز حاصل تھا بلکہ ڈیڑھ ماہ تک بنگلور میں ان کے ساتھ بسر کرنے کا موقع ملا ہے جبکہ حضرت مولانا محمد عمر بھی زندہ تھے اور وہیں موجود تھے، یہ [illegible] کی بات ہے، ڈاکٹر صاحب سے مدیر مہر نیمروز کے مراسم محبت خاص تھے اور ڈاکٹر صاحب کی جدائی کا یہ غم مدیر نیمروز کا اپنا غم بھی ہے۔ آخری ملاقات [illegible] میں ہوئی تھی اور اب تو ۱۸ مارچ ۱۹۶۹ء نے آئندہ کی ملاقات کے تمام امکانات کو قیامت پر اٹھا دیا ـــ

ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی داغ کے شاگرد تھے، انہوں نے ۱۲ اپریل کو رختِ سفر باندھا وہ داغ کے ارشد تلامذہ میں تھے حمیدالدین بیخود دہلوی کے ہم عمر و ہم قدم تھے، بیخود ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے تھے اور مبارک ۱۸۶۹ء میں بجز داغ کی محفل شعر و سخن میں دونوں ۱۸۹۲ء میں پہنچے تھے۔ غالباً مہینوں کا فصل رہا ہوگا محفل دنیا سے اٹھنے میں دونوں کے درمیان کم و بیش دو سال کا فصل رہا مگر دونوں آگے پیچھے روانہ ہوئے عمر بھی ایک ہی سی پائی۔

مبارک بڑے باغ و بہار آدمی تھے، طبیعت بڑی شوخ پائی تھی، اور آخر دم تک باغ و بہار رہے، داغ کی زبان و ادا، اور شوخی و شگفتگی کی زندہ تصویر تھے۔ اگرچہ عظیم آباد کے خصوصی ماحول [illegible] میں ابھار پڑا تھا، جس نے ایک مخصوص سوز و گداز ان کے کلام میں پیدا کر دیا ہے، افسوس ہے کہ ایک [illegible]

خاموش ہو گیا ۔

داغ کے مشہور شاگردوں میں مولانا حسن رضا خاں بریلوی، نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس، سید وحید الدین بیخود دہلوی، سید نصیر الدین حسین نصیر عظیم آبادی، ڈاکٹر مبارک حسین مبارک عظیم آبادی، مولانا عبدالحی بیخود، آغا شاعر قزلباش، نسیم بھرت پوری، بے باک شاہجہاں پوری، وجاہت حسین جھنجھانوی، نواب سراج الدین سائل دہلوی، رسا رام پوری، جناب بارق، فیروز شاہ خاں رامپوری، جناب ضیا، نواب عزیز یار جنگ، نواب نثار یار جنگ مزاج، نواب سعادت علی خاں دربھنگوی، سید نذیر احسن نسیم دہلوی، سید محمد اختر نگینوی، منشی سید ابو علی بھوپال، صاحبزادہ مشرف یار خاں جاورہ، خواجہ بیدار بخت بیدار ڈھاکہ، ظہیر الدین ظہیر، مہاراجہ رام چند عیش، مولانا احسن مارہروی، سیماب اکبرآبادی، نوح ناروی وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ ان میں سے اب غالباً صرف حضرت نوح کی کشتی سلامت ہے۔ ورنہ باقی سب سیلاب وحدت میں ڈوب چکے۔ ان کا سفر حیات تمام ہوا۔

ــــ ٥ ــــ

قتل کسی شخص کا بھی ہو، دنیا کے ہر قانون اور مذہب نے اس کی شدید مذمت کی ہے اور اسے نظام اجتماعی کیلئے مہلک قرار دیا ہے۔ قرآن میں اسکی سزا قصاص ہے۔ اور قصاص کو معاشرہ انسانی کی "حیات" کا نام دیا گیا ہے۔ پاکستان میں آئے دن واقعات قتل ہوتے رہتے ہیں، اور مختلف اسباب و وجوہ سے ایک دوسرے کی جان لے لینا کچھ زیادہ تعجب خیز بات نہیں رہی ــــ لیکن حکومت کے بڑے عہدیدار اور پارٹی کے رہنما کے قتل کئے جانے کا واقعہ نواب زادہ لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد یہ دوسرا ہے۔ قاتل کی نیت اقدام قتل کے اسباب کچھ ہی کیوں نہ ہوں یہ واقعہ اپنی جگہ سنگین ہی نہیں سنگین تر ہے اور معاشرے کی پستی و ابتری کی حد درجہ خطرناک علامت۔

ڈاکٹر خان اور خان عبدالغفار خاں برعظیم کی سیاسی جدوجہد میں سرحد کے پرانے سپاہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی خدمات نے کانگریس کو کانگریس بنایا۔ اور گاندھی جی کی سیاست کو برعظیم میں غیر معمولی تقویت پہنچائی۔ خان برادران کا نام محتاج تعارف نہیں ہے نظری طور پر آل انڈیا مسلم لیگ کو ان سے اور ان جیسے دوسرے سیاسی رہنماؤں سے سخت اختلاف تھا۔ اور اخیر اخیر میں تو یہ شکوہ بھی تھا کہ آخر یہ لوگ کیسے سیاسی بصیر ہیں کہ حالات کی رفتار اور اس کے لازمی نتائج کو بھی بھانپ نہیں سکتے۔ اب ملک کی تقسیم یقینی ہے۔ اور پاکستان وجود میں آکے رہیگا اب بھی اگر یہ لوگ ساتھ نہیں دیتے تو کم از کم خاموش ہی ہو جائیں، اور اپنے ذہن و فکر اور قوت عمل کو مخالفت کی بجائے تعمیری اقدام کیلئے تیار کریں ــــ مگر ایسا نہیں ہوا، اجتماعی عصبیت نے ان کی مخالفت کے انداز میں کوئی فرق پیدا نہ ہونے دیا ــــ البتہ قیام پاکستان کے ساتھ انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ لیکن ایک خاص مدت گذر جانے کے بعد ڈاکٹر خان نے غالباً اس حقیقت کو محسوس کیا کہ وہ اگر آزادی کے واقعی سپاہی ہیں۔ تو ان کا ملک پاکستان ان پر اور ان کی قوت عمل پر پورا پورا حق رکھتا ہے۔ اور شاید اسی لئے وہ بعد میں عملی طور پر سیاست میں آگئے، چنانچہ اب وہ ری پبلکن پارٹی کے سربراہ تھے۔ ری پبلکن پارٹی کے نظریات و اعمال سے ہمیں اتفاق ہو یا نہ ہو [illegible] نہیں کہ ہر پارٹی کے نظریات [illegible] کو اختلاف یا اتفاق ہی ہو۔ مگر یہ بات ضرور خوشی کی تھی کہ وہ تنگ [illegible] خیالات کا انداز ختم

کر کے مینا نہیں سکے تھے۔ اس سے یہ توقع تھی کہ ان کی قوت و صلاحیت پاکستان کی تعمیر میں مخلصانہ صرف ہوگی،
کسی ایسے ملک میں جس کی بنیاد جمہوری نظام پر ہو مختلف سیاسی پارٹیوں کی جد و جہد اور مختلف گروہوں کی باہمی
کشمکش ہی سے قومی فلاح و بہبودی کی صورت نکھرتی ہے۔ اور راستہ ہموار ہوتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ وہ اس
ناپاک حادثے سے دوچار ہوئے اور زخموں سے جانبر بھی نہ ہو سکے، ان کی ذات کی وجہ سے سیاست میں اور انتخابات
عام میں موافقانہ یا مخالفانہ گرماگرمی کے جو امکانات پیدا ہوئے تھے وہ ختم ہو گئے ہم ان کی سیاسی سوجھ بوجھ کے تو
کبھی قائل نہیں تھے مگر کانگریسی دور میں نہ لیگی دور میں نہ اب۔ لیکن وہ کارکن بڑے مستعد اور سرگرم قسم کے تھے
تازہ خبر ہے کہ عہد خلافت اور تحریک پاکستان کے مشہور رہنما نواب محمد اسمٰعیل خاں نے بھی رخت سفر باندھا"

کچھ اپنے متعلق

مہر نیمروز فروری ۵۶ء سے نکلا اور اگست ۵۸ء تک اتنی باقاعدگی اور پابندی کے ساتھ نکلتا رہا کہ لوگوں کو حیرت
تھی، حیرت اس لئے کہ لوگوں کو علمی ادبی رسالوں کی دشواریوں کا علم تھا۔ مگر اگست کے بعد سے مطلع ابر آلود سا رہا۔ غالباً فروری ۵۸ء
کے شمارے میں اشارۃً عرض کیا گیا تھا کہ ایک صاحب یورپ چلے گئے، دوسرے کو ایبٹ آباد نے کھینچ لیا، تیسرے کائنات
کی سیر کو نکلے اور خلاصۂ کائنات کو پا کر گھر بیٹھ رہے، اور یوں پورا ادارہ دفتر سے مہینوں غائب رہا۔ پہلے صاحب علی اکبر قاصد
ہیں، دوسرے حسن مثنیٰ ندوی، اور تیسرے ابوالخیر کشفی۔ ڈاکٹر طاہر فاروقی نے خلاصہ کائنات والا فقرہ پڑھ کر خط لکھا کہ اس
کا مطلب یہ تو نہیں کہ کشفی نے شادی کر لی؟ ظاہر ہے کہ فاروقی صاحب نے خوب ہی سمجھا۔ کشفی نے شادی کر لی اور گم
ہو گئے۔ کم از کم چھ مہینوں تک تو وہ منہ لگانے کو بھی میسر نہیں ——— اور اب تو وہ صاحب کشف و کرامات (اور یہ جعفر
طاہر کا عطا کردہ لقب ہے) چند دن ہوئے کہ بچے کا باپ بھی بن گیا۔ پہلے صاحب اور دوسرے صاحب سفر سے لوٹے
بھی تو مبتلائے آلام رہے۔ ڈور کا چھوٹا ہوا سرا کھینچنے کی کوشش کی مگر وہ جو کہتے ہیں کہ "یک لحظہ غافل گشتم و صد
سالہ راہم دور شد" سو وہی ہوا۔ مشترک شمارہ سامنے آیا، اور پھر مشترک شمارہ، ——— نوبت قریب آ پہنچی تھی کہ میونسپل
الیکشن کے طوفان نے کاتبوں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ فہرست رائے دہندگان کی کتابت کیلئے درجنوں کاتب اس طرح سمیٹ
کر بٹھائے گئے جیسے مکتب میں بچے بٹھائے جاتے ہیں ——— (اور پھر بھی فہرست رائے دہندگان صحیح تیار نہ ہوئی، ہر طرف
سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہے) بیماریاں اور گھریلو پریشانیاں تو پھر بھی قابل عبور تھیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ کاتب اور
پریس قابو میں نہ ہوں نتیجہ یہ ہوا کہ پھر مشترک شمارہ ——— ہمیں اس کا بڑا دکھ ہے کہ ہماری پابندی اوقات اور وضع داری
کو جراحت پہنچی، تازہ شمارہ ہم جون میں قارئین کے ہاتھوں میں پہنچا دیتے لیکن صرف اس خیال سے کہ ستمبر سے ہر ماہ کی پابندی پھر
باقاعدہ ہو جائے، ہم اسے اگست تک سمیٹ کر شائع کر رہے ہیں اور اس طرح گویا وقت پر قابو پانے کی کوشش میں ہیں۔
تاکہ ....گردش روزگار میں جو فرق آ گیا ہے وہ درست ہو جائے یعنی وہ "تیری

نوبت ... جس نے ہم سب کو بے مزہ کر رکھا ہے۔

شاہ ولی الرحمٰن، پٹنہ

ماتم آزاد

تاب سخن کہاں خبر غم اثر کے بعد ⁂ سب دم بخود ہیں حکم قضا و قدر کے بعد

آزاد جسم ہو گئی روح ابوالکلام، ⁂ ہے چور آبگینۂ دل اس خبر کے بعد

مرگ ابوالکلام سے ہے مرگ حریت ⁂ محفل اداس ہو گئی شمع سحر کے بعد

ہیہات ماہتاب سیاست کہاں گیا ⁂ اندھیر ہو گیا ہے غروب قمر کے بعد

جب میر کارواں نہیں، ابتر ہے کارواں ⁂ ویران ہے گھر تباہی دیوار و در کے بعد

رہبر جو اٹھ گیا، تو ہے ملت شکستہ حال ⁂ خطرے میں جسم و جاں ہیں شکست سپر کے بعد

قائد کے غم میں خاک بسر ہے دیار ہند ⁂ آئینہ پر غبار ہے آئینہ گر کے بعد

مرکز نہیں تو ذرے ہیں انتشار سے ⁂ ہر عضو مضمحل ہے شکست کمر کے بعد

شیرازہ ٹوٹنے سے ہیں اوراق منتشر ⁂ ابتر ہے صف امام فرشتہ سیر کے بعد

نہرو کا دل ہے چور غم بوالکلام میں ⁂ پژمردہ گل ہے بلبل شوریدہ سر کے بعد

ہفتاد سالہ عمر میں جنت ملی انھیں ⁂ منزل پہ وہ پہنچ گئے ختم سفر کے بعد

ہے لامکاں کی سمت مکاں سے عروج روح ⁂ اب خلعت ملک ہے لباس بشر کے بعد

ذات ابوالکلام عدیم المثال تھی، ⁂ گو ہر خزف ہے ریزش آب گہر کے بعد

اوراق الہلال ہیں شاید کہ ہند میں ⁂ ہے کون اس ادیب وسیع النظر کے بعد

شرح کلام پاک کی تکمیل کر سکے ⁂ ہے کون اس مفسر پالغ نظر کے بعد

عقدے جو راز ہائے سیاست کے کھول دے ⁂ ہے کون اس مدبر محکم نظر کے بعد

زندہ کرے جو قوم کو اور رہبری کرے ⁂ کوئی نہیں اب ایسے مسیح و خضر کے بعد

ماتم نشیں ہیں علم و ادب اس کے سوگ میں ⁂ اک انتشار سا ہے غم پر اثر کے بعد

آمیزہ عقل و عشق کا تھی اس کی زندگی ⁂ یہ اعتدال کس میں ہے اس ولی بشر کے بعد

ایسا کہاں ہے ہند میں اب زہد پارسا ⁂ جام عمل پیے جو نماز سحر کے بعد

آوارگان شوق کہاں جا کے سر جھکائیں ⁂ اب کوئی سنگ در نہیں اس سنگ در کے بعد

کس کو دماغ شعر و سخن اے ولی خموش

محشر بپا ہے حادثۂ غم اثر کے بعد

⁂

رباعیاں

یہ مولانا آزاد کی تحریر ہے، اور اس سے مترشح ہے کہ رباعیاں بھی انھیں کی ہیں، میرے پاس دو ورق ایک پرانی کاپی کے پڑے تھے۔ یہ کاپی تقریر سیرت سے متعلق تھی۔ ان اوراق میں تقریر سیرت کی تمہیدی سطریں درج ہیں، ٹائیٹل پر ۹ محرم ۱۳۳۲ھ روز جمعہ مبارک درج ہے، ٹائیٹل اپنے قلم سے ہے۔ ان اوراق پر انھیں کے قلم سے یہ رباعیاں لکھی ہیں اور سرنامہ پر یہ عبارت ہے "رباعی از خاکسار خادم الطلباء ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی مقیم کلکتہ" بہت ممکن ہے کہ سنہ مذکور کے بعد مگر کسی قریب ہی زمانہ میں یہ رباعیاں لکھی گئی ہوں، —— یہ کاپی مولانا شاہ حسن میاں مرحوم (ابن حضرت قبلہ مولانا شاہ سلیمان پھلواری رحمۃ اللہ علیہ) کی تھی، جس میں انھیں کی تقریر یا تقریر کے نوٹ ان کے قلم سے درج تھے، ہو سکتا ہے کہ ان کی تقریر سیرت ۱۳۳۲ھ کی ۹ محرم کو کلکتہ میں ہوئی ہو، اور یہ بھی ممکن ہے اس تقریر کے کچھ عرصہ بعد کلکتہ میں مولانا آزاد اور مولانا شاہ حسن میاں کی ملاقات ہوئی ہو۔ یہ دونوں ہم عمر تھے، اور تقریباً ہم عمری، اور اپنی نوعمری کے باوجود علمی حلقہ میں دونوں امتیازی طور پر متعارف تھے۔ ندوۃ العلماء کے مشہور سالانہ اجلاس پٹنہ میں (جو غالباً ۱۹۱۰ء یا ۱۳۲۸ھ میں ہوا تھا) مولانا شاہ حسن میاں نے جو تقریر کی تھی وہ اس دور میں خاص مشہور رہی تھی۔

رباعی از خاکسار خادم الطلباء ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی مقیم کلکتہ

سنتے ہیں رقیب سے ملاقاتیں ہیں | صحبت دن رات ہے مداراتیں ہیں
ہم کو نہیں اعتبار جو چاہو کہو | عاشق سے وہ منہ لگائے یہ باتیں ہیں

ایضاً

نقاش چو نقش ساز انداز تو بود | دل دادۂ صورتگری ناز تو بود
یک شب ہمہ صرف زلف مشکین تو کرد | یک روز تمام چہرہ پرداز تو بود

ایضاً

ساقی! ساقی! بدہ بدہ جام بجام | عمر تو دراز باد و وقت تو بکام
این تشنہ لبی من! و این شور عطش!! | پُر کن، پُر کن کہ کار من تمام ہست تمام

ایضاً

گر عیش طلب کنی زمستاں آموز | و از غم خواہی ز تنگ دستاں آموز
مردن خوش حق تست لیکن ناہدا! | خوش طلی ز مستی ز بادہ پرستاں آموز

ایضاً

ساقی! تو نگاہ کن بریں ابر و بہار | یک ساغر مے بدہ ببیں لطف خمار
وقتیست کہ ما رہ طے با نالہ و داد | یک زیر نظر باشد و یک زیر کنار

ایضاً

آفت ہے قصہ جوانی میرا | ظاہر ہے ملال نوحہ خوانی میرا
کس طرح چھپاؤں کس طرح میں آزاد | دل کا دشمن ہے یار جانی میرا

یارانِ نکتہ داں

حضرت شکیل قدوائی :۔

نیم روز عرصہ سے برابر آ رہا ہے۔ میری بدتوفیقی کہ اس سے قبل کچھ نہ بھیج سکا۔ بات یہ ہے کہ تمہارے پرچے کے شایانِ شان کچھ نہ ہو سکا۔ اب ایک غزل بھیجتا ہوں مگر معیار پر پوری اترنے تو شائع کر دینا میں اب مطمئن نہیں ہوتا، ہر چیز بڑے فخر سے لکھتا ہوں، چھپ کر آتی ہے تو نظر سے گر جاتی ہے۔ اور یہ تو معمولی سی غزل ہے۔

جہاں میں نے تمہارے پرچے کی تعریف کی ہے وہاں یہ ضرور کہوں گا کہ اس بار پرچے کی طباعت خراب رہی۔ کتابت بہتر نہیں ہو سکی تو چھپائی کی طرف سے عدم توجہی نہیں ہونی چاہئے۔ شاید مطابع کراچی کے میونسپل الیکشن کے کام میں زیادہ مصروف ہیں اسلئے رسالوں کی طباعت سے غفلت برت رہے ہیں۔

اس بار "یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے" چھوٹی سی چیز شائع ہوئی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں اس مضمون کا محدود تعداد میں صرف ایک رسالے میں شائع ہونا کافی نہیں۔ ضرورت ہے کہ یہ مستقل پمفلٹوں کی شکل میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو اور ملک کے بچے بچے کے ہاتھ میں پہونچ جائے، اس کا مضمون لوگوں کے دلوں پر نقش کا لحجر ہو جائے۔ مگر ترجمہ پر بڑی احتیاط سے نظرِ ثانی کی ضرورت ہے، کتابی صورت میں یہ مضمون شائع ہو تو نظرِ ثانی کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

اور یہ کیا؟ "چہ دلاور است دزدے، کہ باب قائم کر کے خود اپنے ہاں چوری کے مضامین شائع کرنے لگے؟" تعجب ہے کہ ادبی سراغرساں کی ساری قابلیت یہ معلوم کر سکی کہ "زیب النساء اور دیوانِ مخفی" والا مضمون اس شکل میں یا اس کا نفسِ مضمون بہ قدرِ غالب پینتیس یا چالیس سال قبل رسالہ "زمانہ" کانپور میں شائع ہو چکا ہے۔ میری اسکول کی طالب علمی کا زمانہ تھا۔ غالباً ۱۹۳۰ء۔ ۱۹۳۲ء میں قریب قریب سارا مضمون انھیں دلائل اور تاریخی نیز اندرونی شہادتوں اور شعری حوالوں کے ساتھ چھپ چکا ہے۔ صاحبِ مضمون کا نام یاد نہیں، نہ میرے پاس اس رسالہ زمانہ کی فائلیں ہیں، مگر یقین ہے جستجو کی جائے تو میرا قول صحیح ثابت ہوگا۔

پروفیسر محمد جعفری :۔

۱۔ میں نے اپنے مضمون میں "واو کا اشباع" کا لفظ نہیں لکھا ہے۔ یہ لفظ جناب ولی الرحمٰن صاحب نے استعمال کیا ہے اس سے پہلے سوال کے جواب تو وہ خود ہی دے دیں۔

البتہ یہ سوال ضرور میری طرف سے ہو سکتا ہے کہ "درد دل" بروزنِ "فاعلن" بھی لا سکتے ہیں۔ اور کسرۂ اضافت کو کھینچ کر مفعولن کے وزن پر بھی تو عبد الحق صاحب کے نزدیک یہ کھینچنا تو اشباع ہے۔ مگر یادو یا اس "کو فاعلاتن کے وزن پر لانے کے عوض اگر مفعولاتن کے وزن پر واو عطف کو کھینچ کر لائیں تو اس کھینچنے کو اگر اشباع نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے؟

۲۔ یاسمن یا اس "بلا اشباع" دیہی یا کھینچ "کی بحث، اور انصاری صاحب نے میر کے شعر کی سند پیش کر کے میرے اعتراض کو غلط نہیں ثابت کیا۔ کیونکہ میں نے یاسمن یا اس کی ترکیب کو [illegible] غلط نہیں کہا تھا صرف غیر فصیح کہا تھا اور غیر فصیح ہونے کی دلیل میں کسرہ کا لفظی پیش کر دیا تھا یعنی اس ترکیب یا کھینچ میں کراہت فی السمع ہے جس کو صاحبِ ذوقِ سلیم ہی محسوس کر سکتا ہے۔ میر صاحب کے کلام میں بہت سے غیر فصیح الفاظ اور متروک یا غیر فصیح ترکیبیں موجود ہیں [illegible] سند پیش [illegible]

[illegible]

[illegible]

۱۲ "باد و باراں" کی ترکیب پر مجھے کرنے کی ضرورت ہے "باراں" کے ساتھ جب "باد" کا لفظ آئے گا تو ذہن میں طوفان ہی کا مفہوم آئے گا۔ البتہ "ابر و باد" سے دو چیزیں الگ الگ مقصود ہو سکتی ہیں۔ جیسے سعدی نے فرمایا ہے ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند۔ باراں کے لفظ سے یا تو بارش مراد ہو سکتی ہے۔ جیسے آتش ع ــــ
تیر باراں ہو گیا ہے یار باراں باغ ہیں۔ یا اسم فاعل حالیہ کے معنی میں ایک صیغہ صفت کی حیثیت سے آتا ہے جیسے "ابر باراں" یعنی برستا ہوا یا برسنے والا ابر۔ آتش ع
ابر باراں کی طرح رونے کیا دل خالی۔ اسم مفعول کے معنی میں یعنی آب باریدہ (مینہ) کے معنی میں آتا ہے۔ جیسے سعدی ؎

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست ✤ در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

تو باد و باراں، میں آب باریدہ مراد نہیں ہو سکتا ہے صرف بارش ہی مراد ہوگی۔ بارش کے وقت تو ہوا کی قدر رہتی ہے وہ محض ہوا ہی نہیں ہو سکتی۔
ضرور تیز و تند ہی ہوا مراد ہوگی جو تکلیف دہ ہے۔ سونے والوں کو بھی نیند سے اٹھا دے گی اور رونے والوں کا رونا بھی روک دے گی۔ دونوں ہی بیکار رہیں گے اس وقت
تو وہ سونے والے چین سے سوتے رہیں گے نہ رونے والے روتے رہیں گے الا ماشاءاللہ

۱۳ میں نے یہ کب لکھا ہے کہ واو عاطفہ بالاشباع بالکل ناجائز یا ہر جگہ غیر فصیح ہے۔ اور پھر میں نے "اہل فارس کے نزدیک" لکھا ہے اور آپ سند دے رہے ہیں۔
اساتذہ اردو کی مگر اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ اساتذہ فارسی نے واو عطف کو کبھی کھینچا ہی نہیں ہے جس طرح بعض غیر فصیح مگر صحیح ترکیبیں بضرورت شعراء استعمال کر لیتے ہیں اسی
طرح بضرورت کبھی واو عطف کو کھینچنے پر بھی مجبور ہو گئے ہیں مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کو فصیح سمجھ لیا جائے۔ دیکھی جائے گی کثرت استعمال اور قلت استعمال۔ خود ڈاکٹر شادانی
صاحب اپنے مجموعہ کلام میں جہاں تک ہو سکا واو عطف کھینچنے سے بچے ہیں وہاں بھی "بالکل" اسی طرح جس پر طبع سلیم خود بتا دیتی ہے کہ واو عطف کھینچنے کی چیز نہیں ہے۔ شاعر کھینچنے پر مجبور ہو جائے یہ اور بات ہے

۱۴ رات سونے ہی کے لئے بنائی گئی ہے اس کے لئے موسم اور ابر و باد یا ابر و باراں کی کوئی خصوصیت نہیں۔ کیسا ہی موسم ہو ابر و باد ہو یا نہ ہو بارش ہو یا ہو یا
حبس ہو، سونے والے سوتے ہی ہیں اور رونے والے رات کی تنہائی میں اپنا دکھ یاد کر کے روتے ہی ہیں اس لئے موسم اور باد و باراں کی یکسانی کے اظہار کی کوئی ضرورت نہ تھی۔
اسی لئے علامہ تمنا عمادی کے شعر میں صرف رات ہی کا ذکر ہے اور کس خوبی کے ساتھ ہے کہ ؎

رات ہے جیسے سب کی رات ایک نہیں ہر آنکھ کی بات ✤ رونے والی روتی ہے سونے والی سوتی ہے

۱۵ یہ باد و باراں والا شعر گیارھواں ہے اس سے پہلے دس شعروں پر میں نے جو کچھ معروضات پیش کئے تھے جناب عبدالحق صاحب کو غالباً میری ان معروضات سے
بالکل اتفاق تھا اس لئے ان کے متعلق کچھ ارشاد نہیں فرمایا صرف بالاشباع ہی پر توجہ کی جس طرح جناب سحر انصاری صاحب نے صرف "باد و باراں" کے متعلق میرے صاحب کا
ایک شعر پیش کر کے باقی سب معروضات سے اتفاق فرمایا تھا۔

۱۶ مختصر یہ ہے کہ اگر ان پہلے دس شعروں کے متعلق میرے معروضات سے جناب سحر انصاری کی طرح عبدالحق صاحب کو بھی اتفاق ہے تو میں ان کی خاطر اس گیارھویں شعر
کے متعلق اپنی گذارش واپس لے لینے کے لئے تیار ہوں ؎

وہ کچھ تو مان لیں میری گذارشیں بیخود ✤ ابھی میں لیتا ہوں واپس رقیب کے شکوے

انیس الرحمٰن۔

"مہر نیمروز" کا شمارہ بابت ماہ فروری ۱۹۶۸ء پڑھا اور بہت پسند آیا اس شمارہ میں زرِ داغِ دل کے عنوان سے غضنفر صاحب نے عبدالعزیز خالد صاحب کے
تازہ ترین مجموعہ کلام زرِ داغِ دل پر جو تبصرہ فرمایا ہے۔ اس سے مجھے بیشتر اتفاق ہے موصوف نے زیر بحث کتاب کے نام "زرِ داغِ دل" کی ترکیب پر جناب خالد صاحب کو
خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ حسین ترکیب بھی خود ان کی نہیں ہے بلکہ میر کے مشہور شعر ؎

کم ہیں شناسائے زرِ داغِ دل
اس کے پرکھنے کو نظر چاہیئے

سے مستعار لی گئی ہے زرِ داغِ دل جو بہ آفتاب و بہ ماہتاب اور بہت سی لا یعنیات کا مجموعہ ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے موصوف نے یہ کس طرح خراج کا

بچّے ہنستے کھیلتے
ہی
اچھّے لگتے ہیں
گھر کی رونق اور مسرت بچوں کے دم سے ہی قائم
ہے۔ وہ ایک پل بھی نچلا نہیں بیٹھ سکتے۔ ان کا ننھا منھا
ذہن ہر لمحہ نئی نئی اور میٹھی میٹھی شرارتوں کی آماجگاہ بنا
رہتا ہے۔ اور اسطرح گھربار کا دل موہ لیتا ہے۔ جب
وہ خاموش اور پژمردہ ہوں تو اسکا مطلب یہ ہے کہ
وہ تندرست نہیں۔ دودھ اور اشیاء خوراک میں غذائیت کی
کمی سے ان کے نازک اور بڑھتے ہوتے قویٰ زیادہ حرکت کے
متحمل نہیں ہو سکتے۔ انکو نونہال بے بی ٹانک سے مضبوط بنائیے
نونہال
بے بی ٹانک
ہمدرد

سید عبد القدوس ہاشمی
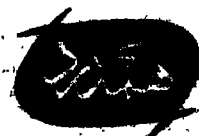
پاکستان میں اسلامی قوانین کا نفاذ

بیشتر بار سننے میں آیا ہے کہ زمانہ بدل گیا، حالات بدل گئے، نظامِ تمدن بدل گیا، اس لئے اب اسلامی بنیادوں پر نہ تو قوانین بنائے جا سکتے ہیں، اور نہ ایسے قوانین کا نفاذ ممکن ہے، یہ قوانین تمدن کے ابتدائی دور تک ہی چل سکتے تھے۔

اتفاق سے پچھلے دو ایک سال کے عرصہ میں یہ آواز ناواقف اور نادان لوگوں کے علاوہ بعض اچھے خاصے قانون دانوں سے بھی سننے میں آئی۔ بعض مقالات میں یہ کہا گیا، اور بعض خطبات میں بھی، اس اعلان کے پیچھے کیا "نفسی کیفیت" کام کر رہی ہے خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ تحلیل نفسی ضروری ہے اور نہ اس کی صحت کی ذمہ داری لی جا سکتی ہے، پھر کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ دوسروں کی نیتوں پر بحث کرے، اس لئے اس بحث کو جانے دیجئے کہ جو لوگ یہ اعلان کر رہے ہیں ان کا اس اعلان سے کیا مقصد ہے۔

البتہ اس اعلان کی منطقی تحلیل کر کے اس کی صحت یا عدم صحت پر بحث کی جا سکتی ہے، اور اس کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔ آیئے اس صحت پر مندرجہ بالا دعویٰ کی تحلیل و تنقیح کر کے دیکھیں کہ اس میں کس حد تک صداقت ہے۔ اگر اس طرح ہم کسی صحیح فیصلہ تک پہونچ جائیں تو اوروں کی نہیں خود اپنی ذہنی الجھن کو شاید دفع کر لیں۔

مندرجہ بالا بیان کی تحقیق کے لئے حسب ذیل تنقیحات قائم کی جا سکتی ہیں۔

(۱) کیا ساتویں صدی عیسوی یعنی نزول قرآن مجید کا زمانہ، تہذیب و تمدن کی پیدائش سے پہلے کا زمانہ تھا؟

(۲) کیا ساتویں صدی سے اب تک معاشرۂ انسانی میں ایسے تغیرات ہو گئے ہیں جو قانون سازی کی بنیادوں کو قائم نہیں رہنے دے سکتے؟

(۳) کیا قدیم کلیات پر قانون سازی نہیں ہو سکتی؟

ان تنقیحات پر غور کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ قانون اور عقیدۂ قانون کو آپ اپنے ذہن میں اچھی طرح مستحضر کر لیں، کیوں کہ ان اعلانات میں کافی [illegible] کے متعلق کیا جاتا ہے، اور بہتر ہے کہ قوانین کا تعلق عقیدہ و یقین سے جس قدر ہے اسے بھی نظر میں رکھیں تاکہ اس حقیقت کو سمجھنے میں کوئی غلط فہمی نہ ہو کہ پاکستان میں جہاں کی تقریباً ۹۸ فیصد آبادی [illegible] ہیں تو کم از کم جذباتی طور پر اور ایک حد تک عقاید و یقین میں بھی اپنے آپکو وابستہ [illegible] سمجھتی ہو، کیوں اسلامی قوانین کے نفاذ پر اصرار کر رہی ہے۔ اور اچھے خاصے تعلیم یافتہ حضرات کی طرف سے اس قسم کے اعلانات کی مسلسل بارش کوئی معمولی بات نہیں بلکہ آبادی کے ایک بڑے حصہ میں ذہنی الجھن پیدا کرنے کا سبب ہو جاتی ہے۔

قانون — قانون ایسے کلی احکام اور اصولی کلیات کو کہتے ہیں جن کے ذریعہ معاشرۂ انسانی میں انفرادی و اجتماعی حقوق کا احساس اور حقوق کی شناخت پیدا ہوتی ہے، اس سے افراد اور جماعتوں کے باہمی تعلقات میں ہم آہنگی اور باہمی تعاون کی کیفیت [illegible] ہوتی ہے۔

مقصد

قانون کا مقصد افراد اور معاشرے میں خوش گوار اور آسان تر زندگی بسر کرنے کے جذبات کو ترقی دینا اور باہمی تعاون مدارات کے ذریعہ ہر جگہ تحفظ و مامونیت کا عام احساس پیدا کرنا ہے۔ تاکہ لوگ زیادہ خوش گوار زندگی بسر کر سکیں۔

بالاہرسہ تنقیحات پر غور فرمائیے :-

۱) کیا نزول قرآن مجید کا زمانہ تمدن کی پیدائش سے پہلے کا یا تمدن کی پیدائش کے بعد کا مگر بالکل ابتدائی زمانہ تھا؟
اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب سے انسان اس کرۂ ارض پر آیا ہے۔ اپنی مساعی اور اپنے تجربات و مشاہدات کے ذریعہ فطرت فیاض کی ودیعت کردہ اشیاء اور قوتوں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کی راہیں پیدا کر رہا ہے" اور زمین کی عمر تمام ہو کر اس کے پاش پاش ہو جانے کے وقت تک یہی کرتا رہے گا اس اعتبار سے زمانہ ہر منٹ بدل رہا ہے۔ چودہ سو سال کی مدت تو بہت بڑی مدت ہے ذرا خود اپنے زمانہ طفلی سے آج کا مقابلہ کر کے دیکھئے آج سے پچاس سال پہلے ۱۹۰۰ء میں اگر کوئی یہ دعویٰ کرتا کہ صبح ۸ بجے ڈھاکہ سے ناشتہ کر کے روانہ ہوا اور دوپہر کا کھانا لاہور یا کراچی میں کھایا تو آپ اسے پاگل قرار دیتے یا اسے کرامت علی الارض سمجھتے لیکن آج یہ ہر روز کا مشاہدہ ہو چکا ہے۔ اسی طرح اور دوسرے اقسام کے طبیعاتی' کیمیاوی' نباتیاتی' و نباتاتی تجربات اور ان کے ذریعے حاصل شدہ قوتیں ہیں جو بنی نوع انسان کے حیطۂ اقتدار میں آ چکی ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ اس واقعیت کو نظر انداز نہ فرمائیے کہ ان تبدیلیوں کا اثر قانون سازی' قانون کے مقاصد اور قانون کے دائرۂ عمل پر ذرہ برابر نہیں پڑتا ہے۔ قانونی کلیات بالکل اپنی جگہ پر قائم رہتی ہیں۔ اسی مضمون کے آئندہ حصہ میں ہم اس پر بحث کریں گے' اس جگہ تو صرف یہ دیکھئے کہ نزول قرآن مجید کا زمانہ خاصا روشن اور متمدن زمانہ تھا' دور حجری یا تانبے اور لوہے کا زمانہ نہ تھا' اور نہ تمدن انسانی کا ابتدائی دور تھا' نزول قرآن مجید انسانی تمدن کی پختگی اور بلوغ کا زمانہ ہے' اس لئے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ اس زمانہ کی معینہ کلیات قانون آج کارآمد نہیں ہو سکتیں۔

کسی ایسے دعوے کے لئے جو منطقی تحلیل پر صحیح اترے' کافی معلومات حاصل کرنے کے علاوہ یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ آپ اپنی معلومات کو صحیح طور پر مرتب کر کے نتیجہ حاصل کریں' اور نتیجہ کے مختلف قضیہ عکسیہ پر پوری طرح غور کر کے اس کا اطمینان کر لیں کہ جو نتیجہ آپ نے حاصل کیا ہے وہ صحیح ہے' ورنہ دعویٰ غلط اور گفتگو مہمل ہو جائے گی۔ آپ کا بڑے سے بڑا عہدہ اور آپ کے نام کے ساتھ ڈگریوں کے حروف کا لشکر قوت فکریہ کے عجز کو نہیں چھپا سکتا۔

مدارج تاریخ

اس وقت تک دنیا کی جو تاریخ ہمیں کسی نہ کسی طرح معلوم ہو سکی ہے' اس کی مدت سات ہزار سال تک بمشکل تمام پہنچ سکتی ہے' ان کے چار مدارج ہیں :-

(۱) تاریخ آثاری (۲) تاریخ افسانوی (۳) تاریخ قیاسی (۴) تاریخ منضبط'

آپ کا دل چاہے تو اس سات ہزار سال سے پہلے کی طبعی تاریخ کو بھی شامل کر کے اسے "خیالی تاریخ" یا اور کوئی نام دے دیجئے۔ تاریخ کے ان تمام ادوار پر بحث کرنے کا یہ مقام نہیں۔ کہنا صرف اس قدر ہے کہ ساتویں صدی عیسوی سے لیکر آج تک کا زمانہ تاریخ منضبط کا زمانہ ہے اور اس میں وہم و قیاس کی گنجائش اگر بالکلیہ مفقود نہیں ہوئی تو بہت ہی کم ایسی گنجائش پائی جاتی ہے۔ اسلامی احکام اور قوانین نے تعبیر اور اطلاق کے اعتبار سے اگرچہ اساسی دور میں مربوط فقہ کی صورت اختیار کی ہے مگر یہ تمام قانونی کلیات نازل ہو چکی تھیں جو ۱۰ ہجری سے ۱۳۲ ہجری تک اسلامی معاشرے میں جاری کیے گئے تھے اسلئے تاریخ تمدن کے لئے ہم اسی زمانہ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔

دھوکا

موجودہ دور کے بعض ارباب علم کو عموماً اور یورپین مستشرقین کو خصوصیت کے ساتھ دو چیزوں نے بڑا دھوکا دیا ہے ایک تو تاریخ اسلامی کی اصطلاح " الجاهلية " نے' اور دوسرے صحابہ کرام کی سادہ اور بے تکلف زندگی کے واقعات نے۔

الجاهلية کی اصطلاح قرآن مجید سے ماخوذ ہے' زمانہ قبل اسلام کے لئے قرآن مجید نے یہ لفظ سورۂ نور میں استعمال کیا ہے جس زمانہ کو حق و صداقت سے جہل کی بنا پر زمانۂ جاہلیت کہا جاتا ہے اس سے جاہلیت مطلقہ مراد نہیں ہے اور نہ یہ واقعہ ہے کہ عرب کے لوگ دنیا کی جاہل

افریقی کانگو کی طرح جاہل اور غیر متمدن تھے۔

اسی طرح صحابہ کرام کی سادہ اور فقیرانہ زندگی ان کی عدم واقفیت اور تمدن سے لاعلمی کی بنا پر نہ تھی بلکہ ایک عظیم الشان تحریک کے ابتدائی علم بردار ہونے کی وجہ سے معاشی استحکام کی عدم موجودگی میں انھوں نے ارادی طور پر خود اپنی زندگیوں کو اس سانچہ میں ڈھال لیا تھا اور دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ ہر عظیم تحریک کے ابتدائی علم بردار اسی قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ چین کے شہر کنٹون میں موجودہ چین کے اولین رہنماؤں کی زندگیاں کس جفاکشی اور سادگی کے ساتھ گزر رہی تھیں اس کا نمونہ اس یادگار خانقاہ میں کاتب سطور نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے علاوہ دنیا کے اور اقسام لباس سے واقف بھی تھے اور چاہتے تو استعمال بھی کر سکتے تھے۔ لینن اور اس کے ساتھی موٹے بھدے اونی کوٹوں کی بجائے نفیس ریشمی پہن سکتے تھے۔

صحابہ کرام کی سادہ زندگیوں سے یہ قیاس کر لینا کہ وہ تمدن سے واقف نہ تھے، کوئی صحیح قیاس نہ ہوگا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ۶۳۸ء یا ۶۴۰ء میں جب کہ قیصر و کسریٰ کے خزانوں کا دروازہ ٹوٹ چکا تھا۔ اور صدیوں کی جمع شدہ دولت کے دھارے مدینہ کی طرف بہہ رہے تھے، اس وقت خلیفۂ وقت حضرت فاروق اعظمؓ ایک نہایت موٹے سے بھدے سے کمبل کا کرتا پہن کر شام کا سفر کرنے کو اس لیے چلے تھے کہ انھیں تمدن کے ارتقا کی خبر نہ تھی اور اچھے لباس انھیں میسر نہ آسکتے تھے؟

تہذیب و تمدن

حقیقت اور واقعہ یہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کی دنیا تہذیب و تمدن کی دنیا تھی، اور نہ صرف دیگر ممالک بلکہ خود عرب میں بھی جہاں کچھ بادیہ نشین قبائل موجود تھے (اور اس وقت کیا؟ آج بھی دنیا کے ہر ملک میں ایسے قبائل موجود ہیں) خاصا ترقی یافتہ تمدن موجود تھا۔

عرب اس سے بہت پہلے معین، سبا اور حمیر کی عظیم الشان حکومتیں قائم کر چکے تھے، ان کی بہت سی باقاعدہ اور منظم ریاستیں غسان اور حیرہ کی طرح اس وقت بھی موجود تھیں ان کے مختلف شہروں میں اور خصوصیت کے ساتھ مکہ، طائف، اور مدینہ کے شہروں میں بہت ہی باقاعدہ شہری مملکتیں قائم تھیں ان کی مجالس شوریٰ قائم تھیں، ان میں قبائل اور بطون کی نمائندگی کے قاعدے اور ضابطے موجود تھے۔ ان کے معاشرے میں انفرادی اور عائلی زندگی کے قواعد و ضوابط موجود تھے، وراثت اور حسب کے قوانین رائج تھے۔

عربوں کے بڑے بڑے شہر ان میں کئی کئی منزلہ عمارتیں، شاندار باغ، ہوادار بنگلے، سیر گاہیں اور شکار گاہیں موجود تھیں ان میں سڑکیں بھی تھیں اور نالے بھی۔ خاص مدینہ منورہ میں انصار کے بعض مکانات دو منزلہ اور سہ منزلہ تھے، میزبان رسولؐ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا مکان دو منزلہ تھا، حضرت عبداللہ بن سلامؓ کا مکان دو منزلہ تھا اور دیواروں پر نقش و نگار بھی بنے ہوئے تھے۔ مشہور یہودی ساہوکار ابوالحقیق کے محل کا کھنڈر آج بھی آپ مدینہ منورہ میں دیکھ سکتے ہیں کیا شاندار محل رہا ہوگا اس کا اندازہ کچھ دیکھ کر ہی لگایا جا سکتا ہے، نلکی پائپ کے ذریعہ آب رسانی کا نظم بتاتا ہے کہ محل کے غسل خانوں میں پائپ کے ذریعہ پانی پہونچانے کا رواج ان میں موجود تھا۔

عربوں میں اونی سوتی ریشمی تینوں طرح کے کپڑوں کا رواج تھا۔ بردیمانی تو اس قدر مشہور ہے کہ انکار ممکن نہیں، عرب میں اچھے اور باریک سوتی اور ریشمی کپڑے بنے جاتے تھے، خمار لیس اور حیرہ کا تذکرہ جس جس نفاست کے ساتھ عرب کی جاہلی شاعری میں ملتا ہے وہ صنعت پارچہ بافی کی کیفیت کا پتہ دیتا ہے۔ کپڑوں پر چھپائی کا کام بھی ہوتا تھا، طرح طرح کے چھینٹ کا پتہ ملتا ہے خود حضرت بی بی عائشہؓ کے حجرہ کا پردہ اور حضرت بی بی عائشہؓ کا بستر چھپے ہوئے چھینٹ کا تھا۔ یہ چھپائی چوبی ٹھپوں اور پیتل کے روبانوں سے ہوتی تھی۔ کپڑوں پر کارچوبی کا کام بھی ہوتا تھا اور خود مدینہ میں بہت اچھا کام اور عمدہ چیزوں پر بنایا جاتا تھا۔ سوزن کاری اور گوکھرو ٹھپہ کے کاموں کا بھی طائف، خیبر اور دیگر بلاد میں سراغ ملتا ہے۔ عورتیں گوٹ مغربی، پیک اور چٹکیاں بھی اپنے کپڑوں میں لگاتی تھیں۔ چمڑے کی دباغت کا کام بھی ہوتا تھا چمڑے کو خوبصورت رنگ کر

ہوتے تھے اور سلیپر بنائی جاتی تھیں۔

زیورات نہ صرف عورتیں استعمال کرتی تھیں بلکہ گھوڑے اور اونٹوں کو بھی پہنائے جاتے تھے سنگھار کے سامانوں میں سرمہ، مسی، اشنان اور کاجل کے علاوہ مہندی اور ناخن رنگنے کا سامان بھی عام طور پر عرب عورتوں میں رائج تھا۔ عورتیں کرزیب اور کرو حیناں کی پہنتی تھیں۔ بالیاں، چھلے، ہار اور گلوبند بھی تھے۔ فرش و قالین، پردے، گدیلے اور طرح طرح کے تکلفات ان میں موجود تھے۔ امرئ القیس اور طرفہ کے قصائد اس کے شاہد ہیں کہ وہ اپنے فرش پر خوشبو کا سامان بھی استعمال کرتے تھے چوکی، کرسی، خوان، چارپائی اور مسہریاں سب چیزیں موجود تھیں۔

ہتھیاروں میں آتشیں ہتھیاروں کے سوا باقی سب ہتھیار موجود تھے۔ فولادسازی کا کام بنی ہوازن اور بنی ثقیف میں بڑے پیمانہ پر ہوتا تھا۔

عرب کا ایک عدالتی نظام ہر شہر میں موجود تھا اس کے کچھ مقررہ قوانین اور ضوابط بھی تھے۔

عربوں کی تجارت اندرونی اور بیرونی دونوں اعتبار سے کافی ترقی یافتہ تھی ان کے بین الاقوامی تعلقات پر ہاشم کے معاہدات راہداری جن کا سورۂ ایلاف میں ذکر ہے دلیل ناطق کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی سفارتیں دوسری حکومتوں میں ہوا کرتی تھیں تاریخ کے صفحات ان کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں۔ ان کی نوآبادیاں بحر احمر اور بحر ابیض کے کناروں پر معتد بہ پھیلی ہوئی تھیں۔

عربوں کا ذوق شعر و ادب مشہور و معروف ہے ان میں فلسفیانہ خیالات رکھنے والے "متفکرین" کا بھی فقدان نہ تھا۔ اس وقت کے سب سے بڑے علمی مرکز اسکندریہ میں عربوں کا آنا جانا معمولی باتیں تھیں، دمشق (الشام) اور مدائن (العراق) میں وہ اکثر جاتے تھے اور ان میں سے بعض تو سالہا سال ان مراکز علم و ادب اور بلاد تمدن و حضارت میں قیام پذیر رہ چکے تھے۔

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ عربوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج کسی قدر کم تھا، لیکن یہ بات نہ تھی کہ بالکل نہ تھا۔ بعثت نبوی سے کئی صدی پہلے سے ان کے یہاں نبطی حروف سے عربی حروف بنائے جا چکے تھے اور عرب مرد و عورت لکھنا پڑھنا سیکھتے تھے ان کے تجارتی لین دین اور معاہدات لکھے جاتے تھے وہ حساب کتاب بھی رکھتے تھے۔ روزنامچہ بھی لکھتے تھے، کھاتے بھی رکھتے تھے، بیجک بھی بنائے جاتے تھے اور تختہ وصول باقی بھی مرتب ہوتا تھا مردوں میں تو بہت سے پڑھے لکھے تھے ہی عورتوں میں بھی لکھنے پڑھنے کا رواج کچھ مفقود نہ تھا حضرت بی بی عائشہؓ حضرت اسماؓ، حضرت فاطمہ بنت جحشؓ حضرت حفصہؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت ام درداؓ یہ سب صحابیات لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔

عرب تجارتی قافلوں کے ذریعے باہر کی دنیا کے افکار، خیالات اور تمدنی ارتقاء سے پوری طرح واقف تھے ان پر بحث و مباحثے کرتے تھے اور خود ان کے اپنے دیار میں جبال الشر کے دامن میں یہودی نوآبادیاں، یمن کے شہر اور جدہ کی بندرگاہ علمی مرکز کی حیثیت رکھتے تھے۔

کیا ان تاریخی حقائق کی موجودگی میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ عرب زمانۂ جاہلیت میں گونڈوں، بھیلوں اور چوہڑے چماروں کی طرح غیر متمدن زندگی بسر کرتے تھے؟

یہ مختصر سا حال تو خاص ملک عرب بلکہ بڑی حد تک صرف علاقہ حجاز و تہامہ کا بیان کیا گیا جہاں ابتداءً اسلامی معاشرہ قائم ہوا تھا۔ اگر ساری دنیا پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے اور یہ اندازہ لگایا جائے کہ ارتقائے تمدن میں دنیا اس وقت کس درجہ پر تھی تو معلوم ہوگا کہ اس وقت انسانی تمدن خاصا ترقی کر چکا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ بھاپ، برق، ایٹم اور پٹرول وغیرہ پیدا آوری قوت کے ذرائع اس وقت تک انسان کے قبضہ میں نہیں آئے تھے۔ مشین سازی اتنے بڑے پیمانہ پر نہیں ہو سکی تھی۔ لیکن ان کے علاوہ تقریباً وہ تمام چیزیں جو آج ہمارے کام آتی ہیں اس وقت تک دنیا کو معلوم ہو چکی تھیں اور وہ تمام افکار و خیالات جو آج پائے جاتے ہیں اس وقت بھی موجود تھے۔

عرب اسی کرۂ ارض کا ایک حصہ ہے اس لئے اس کی تاریخ کو کرۂ ارض پر اس کی تاریخ سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

اس خاکی کرہ پر انسان کی عمر اتنی طویل ہے کہ اس طویل عرصہ میں تیرہ چودہ سو سال کی مدت بہت بڑی نہیں کہی جا سکتی، بالکل اسی طرح جیسے کسی طویل العمر آدمی کی بھی عمر قلعوں اور گرجوں کی عمر کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ آج ہم تمدن و تہذیب کے جو مظاہر اپنے گرد و پیش پاتے ہیں یہ سب کے سب پچھلے ہزار دو ہزار سال میں نہیں پیدا ہوئے ہیں، بلکہ ان میں سے اکثر آج سے ڈیڑھ دو ہزار سال پہلے بھی موجود تھے۔

کیا یہ واقعہ نہیں

زمانہ زیر نظر یعنی ساتویں صدی تک دنیا افلاطون کی جمہوریت، ارسطو کی اشتراکیت، اسپارٹا کی اشتراکیت، مزدک کی اباحیت سے اچھی طرح واقف ہو چکی تھی، منوجی کا شاستر، سولن کا قانون، کرپلی کی توقیعات، مہاتما بدھ کے اصول عشرہ، کنفوشیس کے فلسفیانہ خیالات، ویدانت کا فلسفہ، ساسانیوں کے اصول، دمنوتری و ردھاس کے تجربات، حکیم اقلیدس کی مباحث، ارسطو کی منطق، فیثاغورث کا نظام شمسی، بطلیموس کا نظام قمری، سقراط کی عقلی موشگافیاں دنیا کے سامنے آچکی تھیں، فارس، مصر، ہندوستان، چین اور روما میں شاہی و شہنشاہی کے کئی دور آچکے تھے، بابل و نینوا کے پرشکوہ دور دنیا دیکھ چکی تھی، طاق کسریٰ تعمیر ہو چکا تھا، بابل کا باغ معلق اپنی بہار دکھلا چکا تھا۔ عدن کے فردوس ارضی کو ایک مدت گذر چکی تھی، ایلورہ کی سنگ تراشی اور اجنتا کی رنگ آمیزی کو ایک ہزار سال کے قریب ہو چکا تھا۔

حمورابی کے قصوں کو جانے دیجیے، ان کے علاوہ اور بھی تو بہت سے مجموعہ ہائے قوانین موجود تھے، تصنیف تالیف کا دور اگر عربی زبان میں نہ بھی آیا ہو تو کون کہہ سکتا ہے کہ کہیں نہیں آیا تھا،

غرض یہ کہ جب ساتویں صدی میں قرآن مجید نے انسانی معاشرہ کو اسلامی قوانین عطا کیے اس وقت انسانی معاشرہ مختلف عقلی اور اصلاحی دوروں سے گذر کر ایک واضح اور متعین شکل اختیار کر چکا تھا۔ عائلی زندگی کا ایک نظام پیدا ہو گیا تھا، نسلی اور وطنی قومیتیں ہزاروں سال تک بنیادی حکم رہ کر ناکام ہو چکی تھیں، وراثت اور تقسیم دولت کے مختلف طریقے آزمائے جا چکے تھے، اس لیے یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں کہ جب قرآن مجید نازل ہوا تھا اس وقت انسانی معاشرہ اپنی ابتدائی اور ناپختہ دور سے گزر رہا تھا۔

(۲) کیا ساتویں صدی سے آج تک انسانی معاشرے میں ایسے تغیرات آگئے ہیں جن کی بنا پر اس وقت کے قانونی کلیات آج فرسودہ قرار پا جائیں گے۔

قانون کس مقصد سے بنائے جاتے ہیں، اور کہاں پیدا ہوتے ہیں، یعنی اس کا دائرہ عمل کیا ہے، اسکو نظر میں رکھتے ہوئے اگر آپ اس سوال پر غور کریں تو آپ یقیناً صرف ایک ہی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ایسا کوئی تغیر نہیں ہوا جس کی بنا پر اسلامی قوانین کے نفاذ کو ناممکن یا غیر مفید قرار دیا جا سکے، یہ صحیح ہے کہ تغیرات ہوئے ہیں اور ہر روز ہوتے رہتے ہیں لیکن ان تغیرات کا کوئی اثر قانون کے دائرہ عمل پر نہیں پڑتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایک مختصر سے مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ سارے قوانین کی تنقیح کر کے اس مسئلہ کو واضح کیا جائے لیکن دو چار مثالوں سے بھی اس کو سمجھا جا سکتا۔ مثلاً:-

—— اسلامی قانون شہادت بتاتا ہے کہ شاہد کا عادل ہونا (یعنی ایسا شخص ہونا جو کاذب ہونے کی شہرت نہ رکھتا ہو یا کسی عدالت مجاز نے اس کو دروغ حلفی کی سزا نہ دی ہو) ضروری ہے، کیا دنیا کے کسی حصہ میں ایسا معاشرہ پیدا ہو گیا ہے جہاں کوئی شخص جھوٹ نہ بولتا ہو، یا جس جگہ شہادت عادل اور شہادت کاذب کو ایک ہی درجہ دیا جا سکے؟

—— اسلامی قانون جنایات یہ بتاتا ہے کہ جب کسی شخص کے فعل سے دوسرے شخص کو مالی یا معنوی نقصان پہنچے تو قاضی شخص اول کو مجبور کرے کہ بقدر نقصان اس کی تلافی کرے۔

کیا کوئی معاشرہ موجود ہے جہاں اس قانون کی ضرورت نہ ہو [illegible]

لا محنت سے جی چرانے کے عادی ہو گئے ہیں۔ سرکاری ملازمین اپنے آپ کو ٹیکس ادا کرنے والوں کا خادم سمجھنے کی بجائے ملک کا حاکم سمجھنے لگے ہیں پولس قانون کی محافظ ہونے کی بجائے مجرموں کی پشت پناہ نظر آتی ہے۔

فرا غور سے دیکھیے تو واضح ہو جاتا ہے کہ ان ساری برائیوں کا اصلی سبب قانون کا ناقص ہونا ہے۔ سابق صوبہ سندھ کے دیہاتوں میں چلے جائیے۔ آپ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ دیہات کے کسانوں نے اپنے لیے سایہ دار درخت بھی گاؤں میں نہیں لگائے ہیں، اپنے گھروں کے سامنے دو گز زمین پر مرچ اور ٹماٹو کے دو پودے بھی وہ نہیں لگاتے ہیں، آپ ان سے گفتگو کر کے اس غفلت اور بے توجہی کا اصلی سبب معلوم کرنے کی کوشش کیجیے تو پتہ چلے گا کہ ہمارے قانون مالگزاری نے ان کے اندر بے اطمینانی کی ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے جو انھیں ذاتی مفید اور کم محنت سے انجام پانے والے کاموں سے بھی غافل رکھتی ہے، اور انھیں اس کا یقین ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اپنی محنت کے نتائج سے وہ خود مستفید ہو سکیں گے۔ اسی طرح آپ کسی کارخانہ میں جا کر مزدوروں کی باہمی گفتگو سنیں آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ قانون کے نقص نے ان میں کیسی ذہنی کیفیت پیدا کر رکھی ہے۔ کراچی میں عام طور پر لیبر لیڈر کے نام سے "تعلیم یافتہ" "دون ہمت" نوجوانوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو مزدوروں پر تھوڑا بہت اثر قائم کر کے کارخانہ داروں سے اپنی گزر بسر کے لیے رقمیں حاصل کرتا رہتا ہے، اب ذرا کارخانہ داروں کی کسی مجلس میں شریک ہو جائیے تو آپ دیکھیں گے کہ قانون کے نقص نے ان میں کس قدر بے اطمینانی کی کیفیت پیدا کر دی ہے، اور اس کے نتیجہ کے طور پر یہ گروہ کتنا حریص اور نفع عاجل کا کیسا سخت پرستار بن گیا ہے۔

غرض یہ کہ ہمارے ملک میں جو قوانین رائج ہیں ان کا کوئی حصہ کارآمد نہیں، انھیں جس قدر جلد بدلا جا سکے بدل دیا جانا چاہیے۔ یورپ اور امریکہ میں جو قوانین رائج ہیں وہ خود اپنے ممالک میں ناکام ثابت ہو چکے ہیں۔ روس اور دیگر پرولتاری ممالک میں جو قوانین رائج ہیں (جنھیں قوانین کہنا بھی اس لفظ کا صریحاً غلط استعمال ہوگا) وہ اکتالیس سال کی طویل مدت میں اپنی ناکامی کا اعلان کر چکے ہیں انسانی فطرت ان قوانین کو بغیر شدید قسم کے جبر کے قبول نہیں کر سکتی۔ اس لیے دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے ملک میں اسلامی قوانین کا نفاذ کریں یہ ہمارے ذہن و یقین سے ہم آہنگ بھی ہیں اور ہمارے معاشرہ کی ترقی کے لیے کارآمد بھی ہو سکتے ہیں۔

فرمان فتحپوری

ادب اور احتساب

ادب انسانی ذہن کی انفرادی کوششوں سے وجود میں آتا ہے۔ بلند پایہ ادیب یا فنکار صرف زندگی کی نقالی یا خارجی اشیاء کے اخراجات و نشانات پر ہی غور کرتا ہے اور قوت تخیل کی مدد سے ان میں ایک نیا آہنگ اور ایک نیا تناسب پیدا کرتا ہے۔ یہ نیا تناسب جو فنکار کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے اور جسے بالعموم تخلیق کا نام دیا جاتا ہے۔ صرف سرور آفریں نظر گیر اور دلکش ہی نہیں ہوتا بلکہ تخلیقی عمل زندگی کو متوازن شکل دینے اور آگے بڑھانے میں مدد دیتا ہے۔ بعض اوقات انفرادی ذہن کے ان اکتسابی کمالات کی نزاکت لطافت اور روح خیزی اس بلندی کو پہنچ جاتی ہے کہ عام انسانی ذہن اس کے اقتضاء تک پہونچنے سے قاصر رہتا ہے اور فن پارے کو الہامی یا کوئی چیز سمجھ کر اپنی نارسائی ذہن کا اس طور پر اعتراف کر لیتا ہے ؎

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضان محبت عام تو ہے عرفان محبت عام نہیں — جگر

یا ؎

این سعادت بزور بازو نیست — تا نہ بخشد خدائے بخشندہ — سعدی

شخصیت بلاشبہ ادب کا اہم جزو ہے۔ مجرد حقیقت نگاری یا خارج کی عکاسی کو ادب نہیں کہتے۔ غالب نے جسے حسن کی شمع قرار دیا ہے یقیناً دل گداختہ ہی کی مدد سے فروغ پاتی ہے۔ خام مواد اور خارجی اثرات خواہ کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں وہ فنکار کے خون جگر کی لالہ کاری کے بغیر خام ہی ٹھہریں گے۔ اور معجزہ فن کی صورت اختیار نہیں کر سکتے۔ بقول اقبال ؎

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر — نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر
رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت — معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود!

اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک اچھا فنکار غیر معمولی قوت ادراک و قوت تخیل کا مالک ہوتا ہے وہ فطرت کی جانب سے ودیعت لے کر آتا ہے اور قطرے کی تنگی میں دجلہ کی وسعت کا نظارہ کر لیتا ہے لیکن فن پارے میں صرف الفاظ اور الفاظ کے معنی نہیں ہوتے۔ اس میں فن کار کی شخصیت، شخصیت کی دلکشی مشاہدہ کی تیزی قلب کی دھڑکن، خون جگر کی لالی، نبض حیات کی گرمی، خیال حسن اور حسن خیال بھی کچھ شامل ہوتا ہے اگر فن میں یہ محاسن نہ ہوں تو پھر اسے غالب کے لفظوں میں لڑکوں کا کھیل اعجاز کا قصہ سمجھنا چاہیے۔

شاید فن کی اسی عظمت کا احساس تھا جس نے میر سے یہ بات کہلوائی تھی کہ ؎

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے — درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

بہت سے فنکار میں زندگی کا حوصلہ بھی دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے وہ تمام معاملات میں اپنی اپنے انداز فکر کو اپنانا پسند کرتا ہے اور خون جگر کی حکایات کے رقم کرنے سے باز نہیں رہتا۔

——— عالی شخصیتوں کو بے لاگ رائے زنی کا اپنی محسوس کرنے کا تمام آزادی ہے۔ خود سماج اور ادب و فرد کے تعلق کی اس وضاحت کے بعد ادب کو شخصی ملکیت قرار دینا اور اسے احتساب سے یکسر بالاتر سمجھنا ہمارے نزدیک مناسب نہیں ہے۔ کسی ملک کی خام پیداوار صرف اس بنا پر صنعتوں اور کاریگروں کی ملکیت قرار نہیں دی جا سکتی کہ وہ اس مواد سے نئی چیزیں تیار کرتے ہیں اور سماجی زندگی کو سنوارنے اور آسان بنانے میں مدد دیتے ہیں خام پیداوار ملک کا اصل سرمایہ ہے اور اس کے ناجائز استعمال پر حکومت کو احتساب کرنے کا پورا حق حاصل ہے یہی حال ادب کا ہے اسے صرف اتنی آزادی دی جانی چاہیے جتنی خود اس کے اور اس کے مبداء اور کلیتی سماجی زندگی کے لئے مفید و مددگار ہو۔

جو لوگ ادب میں کسی قسم کے احتساب کے قائل نہیں ہیں وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ ایک بلند پایہ ادیب طبعاً ایک بلند پایہ محتسب اور نقاد بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ کوئی دوسرا اس کی تخلیق پر حرف گیری کرے یہ بات بڑی حد تک درست ہے بغیر احتسابی اور تنقیدی قوتوں کے کوئی ادبی تخلیق وجود میں نہیں آسکتی یقیناً کوئی ادیب محض شاعر یا فنکار صرف زندگی کا ناقل یا ترجمان نہیں ہوتا وہ زندگی پر تبصرہ بھی کرتا ہے۔ تنقیدی مقالوں ڈالتا ہے اور رہنمائی بھی کرتا ہے۔ وہ ماضی سے کارآمد مواد حاصل کرکے حال کی تعمیر میں لگاتا ہے اور حال کی چمک دمک سے تابناک مستقبل کی امید دلاتا ہے۔ اس طرح وہ انسانی ذہن کی تاریخ میں ایک آہنگ اور تسلسل قائم رکھتا ہے۔ اور زندگی کو قانون پر قائم ہونے سے بچاتا ہے یہ بھی صحیح ہے کہ فن کار اپنی تخلیق میں حرکت۔ نمو۔ نشاط انگیزی اور توانائی کے آثار اپنی محنت دیانت داری۔ ذہنی کاوش اخلاص اور جگر کاوی کی مدد سے پیدا کر لیتا ہے۔ وہ خیالات و الفاظ کے باہمی تناسب پر بار بار غور و خوض کرتا ہے۔ کاٹتا چھانٹتا ہے جب جا کر ایک نظر گیر دلکش اور حیات خیز ادب پارہ تیار ہوتا ہے۔ اور اسی بنا پر یہ کہنا بظاہر درست ہے کہ ادب پھر بیرونی احتساب و تنقید کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن اگر ادب کو زندگی کیلئے زیادہ بہتر اور افادی بنانا ہے ادب میں ایک عالمگیر نظام حیات کی پیغامبری کے آثار پیدا کرنے ہیں تو پھر فن کاری کے احتسابی اور تنقیدی عمل پر بھروسہ کرکے رکھ جانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اگر شخصی اور انفرادی فیصلوں پر کلیتاً بھروسہ کر لیا گیا تو پھر ادب میں تنوع اور ہمہ گیری کا خیال ترک کر دینا چاہئے۔ اس سے انکار نہیں کہ ادیب اپنے گوناگوں تجربات ذہنی وسعت کی مدد سے اپنی تخلیق کو زیادہ متنوع اور آفاقی بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن انفرادی تجربات حیات انسانی کے مجموعی تجربات کا احاطہ نہیں کر سکتے انسان کے اجتماعی زندگی کے تجربات و مظاہرے اتنے کثیر و وسیع اور رنگا رنگ ہیں کہ وہ سارے کے سارے سمٹ کر بھی کسی ایک شخصیت میں نہیں سما سکتے۔ اس لئے ادب کو صرف ادیب کے احتساب پر چھوڑ دینا اسے کشادگی وسعت اور رنگارنگی سے محروم کر دینے کے مترادف ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات اور ذہن میں رکھنی چاہیے۔ انسان کو اپنی ذات و صفات دونوں سے فطری انس و محبت ہے اس لئے وہ اپنی کوششوں کے باوجود بھی اپنے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ کوئی شخص خواہ اپنے معاملے میں کتنا ہی غیر جانبدار رہنے کی کوشش کرے۔ لیکن حقیقتاً وہ غیر جانبدار نہیں ہو سکتا۔ انسانی فطرت کا یہ ایک عجیب خاصہ ہے کہ وہ دوسروں کی آنکھ کا تنکا تو دیکھ لیتا ہے لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر اسے نظر نہیں آتا اس سے انکار نہیں کہ اکثر بڑے فن کار اپنی کمزوریوں سے بھی آشنا ہوتے ہیں اور انہی کمزوریوں کا احساس ان کی تخلیق میں تازگی توانائی اور معنویت پیدا کرتا ہے۔ ادب اور زندگی دونوں کے حق میں یہی بات مفید ہے کہ فرد اپنے شعور ہی کو سب کچھ نہ سمجھے بلکہ اپنے لاشعور کو زیادہ سے زیادہ شعوری بنانے رکھنے کی کوشش کرے۔ اچھی ادیب کا یہی کرتا ہے اور اسے یہی کرنا چاہیے لیکن ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے عام طور پر ادیب یا شاعر اپنی ساری دانشوری کا معترف نہیں ہوتا۔ اس کی ضرورت ہر وقت باقی رہتی ہے کہ دوسرے اس کی توجہ اس جانب مبذول کراتے رہیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا اور شخصی پسند اور ناپسند کو ہی سب کچھ سمجھ لیا گیا تو اقبال جیسے خودی یا موت [illegible] کی ترتیب و انتقال کی کوئی صورت باقی نہ رہ [illegible]

[illegible] کی شکل میں [illegible] آمریت پسندی سے ہمارے سارے [illegible] اور ادبی [illegible] میں رہ جائے گی۔ یہ بات کہی جاتی ہے کہ اپنی ذات سے محبت ہوتا اصل حقیقت سے متصادم ہو جاتا ہے [illegible]

مبنی ذات۔ صفات یا لاشعور سے پوری طرح آگاہ ہو۔ اقبال نے صحیح کہا ہے کہ

بر مقام خود رسیدن زندگی است ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

لیکن عملاً تو یہی ذات کا انکشاف کائنات کے انکشافات سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ اور اگر ایسا ہو بھی تو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر ایسا ممکن نہیں ہے اس لئے ادیب کو نہ سماج سے الگ کیا جاسکتا ہے اور نہ ادب کو شخصی فیصلوں کے سہاروں پہ آزاد چھوڑا جا سکتا ہے۔ ادب کو احتساب سے بری رکھنے کی حمایت میں ایک بات اور بھی جا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ادیب کو مکمل ذہنی آزادی نہ دی گئی تو پھر فرد کی دبی ہوئی خواہشوں کے اظہار کا کوئی ذریعہ نہ رہے گا اور رفتہ رفتہ فرد و سماج دونوں مہلک اعصابی اور ذہنی بیماریوں کا شکار ہو جائیں گے۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ ادب کا ارتقاء رک جائے گا بلکہ اس کا انجام بڑا خطرناک ہوگا۔ یہ بات نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے نظر انداز کر دینے کے لائق نہیں ہے۔ زندگی کی جدلیاتی حقیقت اور اس کی نوعیت بھی اکثر اسی قسم کا تقاضا کرتی ہے کہ انسانی جذبات و احساسات کو آزادانہ رونما ہونے کا موقع دیا جائے ورنہ ادب و زندگی دونوں اپنی صحت مندی کھو بیٹھیں گے۔ اگر زندگی کے متضاد مظاہر کا باہمی تصادم ہی زندگی کے رموز کو منکشف کرنے اور اس کے امکانات کو وسیع کرنے میں مدد دیتا ہے تو پھر کثیف و لطیف کے فرق کو مٹا کر ادیب کو ہر قسم کے اچھے برے جذبات کے اظہار کی کلی آزادی دینی چاہئے۔ اگر واقعی زندگی کا ارتقاء خیر و شر کے مسلسل ٹکراؤ ہی میں مضمر ہے تو پھر ان دونوں قوتوں کو آزادانہ ابھر کر آنے کا موقع ملنا ضروری ہے۔ اس جگہ دو باتیں ذہن میں رکھنی چاہئیں۔ اول تو یہ کہ ادیب سارے جذبات و محسوسات کے فن کارانہ اظہار پر قادر نہیں تا تو ان سب کو خواہ مخواہ ادب میں داخل کرنا اس کے فرائض میں ہے۔ بشری قوتیں بھی اپنے اظہار کے لئے صرف ادب کی محتاج نہیں ہیں ان کے انعکاس کے اور بھی راستے ہیں۔ وہ روز اول سے آج تک زندگی کی یزدانی قوتوں سے برسر پیکار ہیں اور اس جنگ میں ادیب کا کام یہ ہے کہ وہ یزدانی قوتوں کا ساتھ دے اور شرار بولہبی کے مقابلے میں چراغ مصطفوی کو روشن رکھے۔ یہی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ ایسی قوتیں بذات خود قائم و دائم ہیں اور نہ وہ زندگی کے سنوارنے میں براہ راست مدد کرتی ہیں۔ ان کا وجود محض اضافی ہے جو نیکی کی عظمت و اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے فرض کر لی گئی ہیں۔ اچھے فن کار یا ادیب کا کام یہ ہے کہ وہ بدی کی اس اضافی کیفیت کو اضافی رہنے دے اور بالذات زندگی کا مقصود نہ سمجھے۔ ایک بات اور قابل لحاظ ہے۔ ادیب کوئی نامہ نگار یا مورخ نہیں ہوتا کہ زندگی کے تمام چھوٹے بڑے، ادنیٰ اعلیٰ اور اہم و غیر اہم واقعات و تجربات کو ادب کا موضوع بنانا اس کا منصبی فرض ہو۔ فن کار صرف زندگی کے اہم عناصر و آفاقی و غیر معمولی تجربات کو ہاتھ لگاتا ہے اور یہی عناصر اس کے ادب کو اہم اور آفاقی بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ ٹالسٹائی کے نزدیک کوئی ادبی تخلیق ادب کے وسیع اور عالمگیر تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی۔ جب تک وہ ایسے موضوعات و مواد سے مالا مال نہ ہو جو سارے انسانوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہوں۔ اس لئے یہ بات ضروری نہیں ہے کہ ادیب انسانی جذبات کے تمام کثیف و لطیف پہلوؤں کو ادب میں مساویانہ طور پر داخل کرنا اپنا فرض سمجھے۔

لیکن اگر کوئی ایسا بلند پایہ فن کار ہے جو مبتذل سے مبتذل اور کثیف سے کثیف محسوسات کو بھی لطیف بنا کر ادب کا جزو بنا سکتا ہے اور ہر قسم کے اپنی داخلی جذبات کے ادیبانہ اظہار پر یکساں قدرت رکھتا ہے تو پھر ادب کو احتساب کا پابند رکھنے کی کوئی عقلی وجہ نہیں ہو سکتی۔ نظری طور پر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسانی زندگی کا کوئی تجربہ یا کوئی احساس ایسا نہیں ہے جسے ادب العالیہ میں نہ سمویا جاسکے لیکن عملی طور پر اس بڑی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا بہت مشکل ہے۔ وکٹر ہیوگو کی یہ بات صحیح ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ادب بننے کو بیتاب ہے مگر ضرورت صرف ایک ایسے شخص کی ہے جو انہیں ادب کا موضوع بنا سکے۔ لیکن جب تک ایسا شخص پیدا نہ ہو جائے ادب سے احتساب کو نہیں اٹھایا جا سکتا۔ ایک آدمی کے تجربات و محسوسات خواہ کتنے ہی وسیع کیوں نہ ہوں لیکن مخصوص اور متعین ماحول کی پیداوار ہونے کی وجہ سے انسانی زندگی کے مجموعی تجربات کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے ایسے آدمی کا پیدا ہونا اگر ناممکن نہیں تو کم از کم مشکل ضرور ہے۔ اور جب تک کوئی شخص زندگی کے سارے مظاہر و مواد کو ہضم کر کے خون صالح نہ بنا سکے اور اسے ..... حیات کی رگ رگ میں دوڑا نہ سکے یا ثبت نہ کر سکے اس وقت تک ہمیں گورکی کے لفظوں میں اسے سڑک پر تھوکنے کی اجازت نہ دینی چاہئے۔

جب یہ بات مسلم ہو گئی کہ ادب محض شخصی نہیں ہو سکتا، فن کار اپنی تخلیقات کا پوری طرح احتساب بھی نہیں کر سکتا تو پھر ادب اور ادیب

گھر والے۔ یہ یوں بچ گئے کہ اس کے تقدس کا اعلان کر دیا گیا ہے

مثنوی مولوی معنوی   ہست قرآں در زبان پہلوی

اردو کے میر صاحب کہاں اس کو معاف کرتے۔ اس تہی دست و پا نے جو کسی دیوار کے سائے تلے عادت کو چپکے چپکے روتا تھا کلیجہ کو تھام تھام لیتا تھا۔ تا عمر و لا زیست کہتا تھا اس ناتواں نے بھی چھ ضخیم دیوان ایک فارسی دیوان، متعدد مثنویاں اس دنیائے فانی میں یادگار چھوڑی ہیں اور مزید برآں فرما گئے ہیں

سرسری تم جہان سے گذرے   ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

ان تمام چپے در پے حملوں کا دفاع قارئین نے یوں کیا کہ ۷۲ نشتر لگا کر تمام مواد خارج کر دیا یعنی شادی کمنواتی گئی کہ بھائیو اور بہنو! میر کے کلام فصاحت التیام میں صرف ۷۲ شعر ایسے ہیں جو منتخب ہیں نتیجہ یہ کہ آج تک کسی کو فرصت نہ ہوئی کہ وہ تہتروں نشتر نکال لیتا۔ ۷۲ ہی سے دنیا نیم جان ہے ایک کا کیا اضافہ کرتا۔

مصحفی نے ۸ دیوان آرسی مصحف کیلئے چھوڑے ہیں انشا نے جو عجیب الطرفین تھے ۹۸ ہزار اشعار کو ایک کلیات میں بند کیا ہے ان کے ہم نشیں حضرت رنگین کا دعویٰ یا دلیل ہے کہ چالیس ہزار انھوں نے پس ماندگان میں چھوڑا ہے۔ خدا اردو خوانوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ میر انیس نے دشت کی سیاحی میں عمر صرف کی اور تقریباً ایک لاکھ اشعار کا "توشۂ آخرت" جمع کیا یہ توشہ اچھی خاصی مال گاڑی ہے۔ امیر مینائی جو تلاش یار میں اڑتا ہوا پھرتے تھے بہت سا کلام ان کا غدر میں جل گیا مگر حضرت داغ ایسے ۸۰ ہزار بھرتے تو معلوم نہیں کیا حشر ہوتا مگر یہ داغ بھی آفتاب کبھی ماہتاب کبھی گلزار بنا اور آخر جلا کر رکھ دیا تو یادگار داغ بن گیا۔ دور یہ تھا کہ نتیجہ بند غسال سے لیکر نواب تک سب شعر فرماتے تھے امت ساری روایات میں کھو گئی حالی نے پڑھا دیا ہے

وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر   عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر

زمیں جس سے زلزلے میں برابر   ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر

ہوا علم دیں جس سے تاراج سارا

وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا

مگر جناب پانی پت والے کی آواز کون سنتا۔ اتفاق سے غدر ہو گیا بہت سے کلیات و دواوین تلف ہو گئے۔ کہنے والے بھی غائب ہو گئے جہاں امن ہوا پھر وہی دھن، حالی نے اب کے باقاعدہ فرد جرم عائد کی اور تمام "لکھاڑ" شعرا کا چالان کر کے قرار واقعی سزا دلوائی فیصلۂ عدالت العالیہ ناقابل اپیل ملاحظہ ہو

برا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے   عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے

تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے   مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے

گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے

جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں چشم عبرت بیں کیلئے یار لوگوں نے انتخابات چھاپنے شروع کر دئے تاکہ [illegible] عذاب آخرت سے [illegible] منتخب [illegible] ہو۔ اردو ادب کی دہائی دی گئی پھر کھلم کھلا دھمکیاں دی جانے لگیں لیکن لوگ [illegible] سے [illegible] تو [illegible]

سلیم اللہ فہمی

بیگم صوفیہ کمال

(مشرقی پاکستان کے بنگالی شعرا کا سلسلہ)

مشہور ہے کہ نواب شائستہ خاں کے زمانے میں چاول یہاں آٹھ آنے من بکتا تھا۔ مغلوں کے زمانے میں یہ نواب ناظم بہار، بنگال، اڑلیسہ تھے۔ یہیں باقرگنج بریسال ضلع کے ایک گاؤں میں بس گئے۔ جس کا نام "شائستہ آباد" پڑ گیا۔ نواب سید معظم حسین چودھری اسی خانوادے کے روشن چراغ تھے۔ انھیں کے گھر میں صوفیہ ان کی نواسی ۲۰ رجون ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوئی، صوفیہ کے والد سید عبدالباری برہمن بڑیا ضلع ٹپرا کے مشہور اور کامیاب وکیل تھے۔ لیکن آخر کو صوفی ہو گئے۔ اور گھر بار چھوڑ کر لاپتہ ہو گئے، نانا کے گھر صوفیہ بیگم پروان چڑھیں، قدیم گھرانہ پرانے خیالات، سخت پردہ کے اندر صوفیہ نے جو کچھ تعلیم حاصل کرنا ممکن تھا، کی۔ صوفیہ کے لئے بنگلہ میں اتنی دسترس حاصل کرنا بڑی حیرت کی بات ہے۔ کیونکہ ان کے گھرانے میں فارسی، عربی اور اردو ہی کی تعلیم کا رواج تھا۔

ابھی گیارہ برس کی تھیں کہ شادی ہو گئی ـــ سید نہال حسین ان کے شوہر وکالت کی تعلیم پوری نہ کر پائے تھے کہ ۱۹۳۲ء یعنی شادی کے دس سال بعد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

شوہر کا انتقال صوفیہ کے لئے بڑی بڑی مصیبتیں لایا۔ انھیں کلکتہ کارپوریشن میں ایک اسکول میں نوکری کرنا پڑی۔ ایک چھوٹی سی بچی تھی، اور بیوہ ماں، ان کے خورد و نوش کے لئے ہاتھ پیر ہلانا ضروری ہو گیا۔ دوسری شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سید نہال حسین سے صوفیہ کو بے پناہ محبت تھی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اس داغ مفارقت نے ہی صوفیہ کے جوہرِ شاعری کو چمکایا، اس کا ثبوت ان کا مجموعہ ـــ "سانجھر مایا" ہے۔ یہ کلکتہ میں ۱۹۳۸ء میں چھپا۔ مرحوم شوہر کے نام معنون ہے۔ اس میں ۲۸ نظمیں ہیں۔ ان میں مختلف موسموں کے بیان ہیں۔ تاریک راتوں کی داستانیں ہیں۔ فراق اور درد فرقت کی روئدادیں ہیں، ایک نظم "تنے کوتھائے" کا ترجمہ سن لیجئے۔ دیکھئے کتنا سوز و گداز اور کس قدر درد و الم ہے۔

"وہ کہاں ہے"

"سینے کے پاس سے کہا کیا تم بتا سکتے ہو اس دھنک کے رنگین آسمان پر جب حسین سانے گھنے چھائے ہوتے ہیں، وہ کہاں ہوتے ہیں، کہاں رہتے ہیں، غریب بتا نہ سکا اور اسی شرم سے جھکا کر زمین پر آ گیا۔ میں نے چنچل بادلوں سے کہا آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر پوچھا۔ تمہاری آنکھیں تو اس کنارے تک دیکھ رہی ہیں۔ بتلاؤ تم نے اسے بھی دیکھا ہے، وہ کہاں ہے؟ کس گوشے میں ہے؟ کوئی جواب نہ ملا۔ بادل کے آنچل میں [illegible] چھپا لیں۔ اور پھر مجھے کچھ بھی نظر نہ آ سکا۔

[illegible] رات کی شبنم سے [illegible] کی آڑ پر [illegible] نے کان ہی کان میں دھیرے سے پوچھا۔ تم کو معلوم ہو کہ تم ہی [illegible] ان کی جدائی کے صدمے کب تک سہوں۔ آخر وہ کہاں ہے؟ کہاں گیا؟ ـــ بیچاری کچھ بول نہ سکی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں [illegible]

کے اپنے معتقدات پا اصول کو چھوڑ دیں بلکہ نے صرف یہ کہ جمہوریت کی کوششوں کو سراسر گمراہی قرار دیتے ہیں جو ان آمریت کی ذات کو ضیع منزل مقصود قرار دیتے ہیں بلکہ اپنے نقص کی ترغیب دینے والوں اور اس کے دشمنوں کو متعصب اسٹیج میں اور ظاہر پرست سمجھتے ہیں۔

مذکورہ بالا مسائل کی تائید میں ہمارے پاس واضح ثبوت حقیقتاً اتنے اور ناقابلِ تردید دلائل موجود ہیں جن کی بنا پر تعصب جاہلانہ اور تعصب معنوی میں خط امتیاز کھینچا جاسکتا ہے۔ لیکن ایسے مسائل کی مخالفت یا طرفداری پر حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ جن کی صحت اور سقم ہر ایک پر آشکارا ہو جیسا کہ ادب میں اگر کوئی شخص قدامت پسند ہے تو اسے اس کے مخالفین کے مقابلے میں جو جدیدیا ترقی پسند ہیں شہ نہیں دی جاسکتی اور نہ ہی اسے متعصب اور متشدد قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح جب بعض اشخاص جدید آداب و رسوم کو پسند نہیں کرتے۔ مثلاً نیا لباس، نئے تکلفات و تفاخر فاتی نئی عادات، غیر اغیار کی تقلید اور دیگر تغیرات و تحولات کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور طریق مروج کے تحفظ کیلئے موجودہ اصولوں اور گذشتہ قوانین پر مصر رہتے ہیں تو ہم بلا تامل ان کو متعصب لوگوں کی فہرست میں شامل نہیں کرسکتے۔ اور نہ ہی ان ترقی پسندوں کو محنتی اور اہلِ عزیمت کا مقام دے سکتے ہیں جو ہر نئی چیز کے التزام کو ثابت کرنے کے لئے اس کے فوائد اور برکتیں گنوانا شروع کر دیتے ہیں۔

اس تضاد اور تناقض کا مطالعہ اگر ہم ایک واحد شخص کی صورت میں کریں تو زیادہ بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔ مثال کے طور پر ایک ایسے شخص کو لیتے ہیں۔ جس نے اپنے کسی خاص اصول کی خاطر برسوں مستقل مزاجی سے تکالیف اور مصائب کا سامنا کیا ہو۔ جس نے مطالبۂ آزادی بے پروائی کی حمایت اور جمہوریت کی ہواخواہی میں کئی دفعہ جیل کاٹی ہو اور پھر کبھی مایوسی اور پست ہمتی کو پاس نہ پھٹکنے دیا ہو۔ عموماً ہم ایسے آدمی کو صاحبِ ایمان اور راسخ العقیدہ سمجھیں گے۔ دوسری طرف اسی ہٹ دھرمی اور تعصب کا اظہار اگر وہ کسی اور امر میں کر رہا ہوں اور پھر اس کی صحت پر اعتقاد رکھتے ہوئے بڑے جوش و خروش سے مدافعانہ بحث و مناظرہ کر رہا ہو تو کچھ بعید نہیں کہ ہم اس پر تنگ نظری اور بے لچک فکری عصبیت کے الزامات عائد کر دیں۔ بالکل یہی شکل دینی معتقدات میں پیش آتی ہے یہ لوگ قدیم خیالات کو مشتعل راہ تصور کرتے ہیں، اور تمام عمر بغیر کسی مخالفانہ جذبے کو جگہ دیئے، ان احکام کے تحفظ و بقاء کیلئے کوشاں رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ فروعات تک کی حفاظت میں اعلیٰ ثابت قدمی کا ثبوت دیتے ہیں۔ ایک لحاظ سے اس قسم کے لوگ حقیقی غیرت کے حامل ہوتے ہیں اور قومی روایات اور اصولوں کے بچاؤ کیلئے سینہ سپر ہو جاتے ہیں اور اس سلسلہ میں جس قسم کے ثبات و قرار کا وہ مظاہرہ کرتے ہیں قابلِ احترام ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کا فکری جمود، کوتاہ نظری، عقائد نو سے خوف، یہ تمام چیزیں ان کو کوتاہ فکر، تنگ ظرف، جامد، متصلب اور سطحی ثابت کرتی ہیں۔

ان تمہیدی امور کی بناء پر ہو سکتا ہے کہ بادی النظر میں تعصب کی حقیقت اور ماہیت کے بارے میں تذبذب اور اشکال پیدا ہو جائے لیکن مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم تعصب کے لئے اصول و حدود متعین کر سکتے ہیں یا دوسرے الفاظ میں اچھے اور برے تعصب میں فرق کر سکتے ہیں مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مفید تعصب وہ ہے جس کا محرک عقل کے ساتھ ساتھ ایمان اور انصاف سے بھی متصف ہو، اور کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ایمان اور انصاف کو اساس بناتے ہوئے اگر کوئی شخص تعصب کو بر سرِ کار لائے تو وہ اپنے ہر عمل میں حق کو مطمع نظر رکھے گا۔

اگر تعصب از روئے عقل اور ہوش ہو تو جزئی اختلافات کی بنا پر سر اٹھانے والی تو تکار اور بے معنی دشمنیوں کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا اور کام کے نتائج نیز معاملات پر گہری نظر رکھنی شروع کر دے گا اور وقتی تفاوت کا قلع قمع ہو جائے گا۔ بنی نوع انسان کی نصف سے زیادہ تکلیف کی وجہ تعصب جاہلانہ ہے۔ کیونکہ عوام کے عامیانہ احساسات و جذبات نے عقل و خرد کی روشنی میں اندھیرے گھول دیئے ہیں۔ اور اسی ظلمت نے انسان کی بصیرت و دور اندیشی، تدبر و فکر کو گہنا دیا ہے۔ اسی لئے اکثر مفروضہ مقصود کے وفاع کی آڑ میں کئی خوفناک غلطیوں کا ارتکاب ہو

ملا امام حسین کے قتل میں شریک تھا۔

کا ارتکاب کرتا ہے۔ جس وقت اسلام کی صدا بلند ہوئی تو اسی قسم کا تعصب تھوڑا کوتاہ بینی عرب میں پیدا ہوا کیونکہ یہ لوگ اپنی اپنی بنا پر
چیشم ہنگامی فوائد پر نظر رکھتے تھے۔ ان کی دور رسی اور عاقبت اندیشی ابھی اس قابل نہیں ہوئی تھی۔ کہ اپنی وقتی کمزوری اور ضعف کے پس پردہ آنیوالی
عظیم الشان عرب سلطنت کو دیکھ سکتے۔ یا محمد پیغمبر کی ثانی کے ماڑی و باطنیہ کا ادراک کرتے ہوئے ان کی عظمت سے آگاہ ہو جاتے۔ بلکہ وہ تو چمگادڑ کی
طرح سورج سے بیزار رہے تھے۔

جب ترکوں نے بیزنطینیوں کی سب سے بڑی پناہ گاہ قسطنطنیہ کے گرد کے ستونوں پر حملہ بول دیا اور سلطان محمد فاتح نے اس شہر کا محاصرہ کر لیا
تھا۔ ان دنوں کوتاہ نظر عیسائی فرقہ وارانہ اختلافات مذہبی پر آپس میں ہاتھا پائی کر رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کر رہے تھے
ایک پادری اٹھا اور اس نے اپنے مخالفین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ہمارے لیے تمہاری کلاہ دیکھنے سے ترکوں کا عمامہ دیکھ لینا کہیں بہتر ہے" اور
اسی نادانی و نا بینی نے میدان کو بالکل صاف کر دیا۔ تھوڑی ہی مدت میں سلطان محمد قسطنطنیہ کے تخت قیصر پر براجمان ہو گیا۔ وہ اکثر عبرت کے طور پر یہ شعر
پڑھا کرتا تھا ؎

بوم نوبت می زند بر طارم افراسیاب
پردہ داری می کند در قصر قیصر عنکبوت

فتح قسطنطنیہ سے دو کسال پہلے انہی دراز ریش اور کوتاہ نظر پادریوں نے منگولوں کی طرف دست تعاون بڑھایا تھا۔ صرف اس لیے کہ مسلمانوں
کے خلاف ان کے عداوت و تعصب اور بغض و عناد نے ان کی صحت فکر و نظر پر ایک قفل لگا دیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان خونخواروں کی مدد سے مسلمانوں کو تباہ
و برباد کر دیا جائے۔ یہ لوگ مسیح کے پیرو تھے جنہوں نے عشق و محبت کی تعلیم دی تھی۔ اور آج یہ انہی کے نام لیوا انسانی خون کے پیاسوں کے
ہمدم بننا چاہتے تھے۔ حالانکہ اگر ان کا تعصب دینی عقل و ہوش سے بھی مشورہ کر لیتا تو شاید یہ لوگ انسانیت کے مشترک اور ہمہ گیر فائدے کو کبھی نظر انداز
نہ کرتے اور اس بات کو ذہن میں رکھتے کہ منگولوں کا غلبہ ساری دنیا کے لئے باعث ہلاکت ہو گا۔ معمولی فوائد کے پیش نظر تباہ کن نقصانات کی خواہش
کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔

اگر سلطان سلیم عثمانی عالم اسلام کے منافع کو نظر میں رکھتا اور اس کا فکر دخل تعصبات کی گھاٹیوں میں نہ بھٹکتا پھرتا تو وہ ایران کے مسئلے سیاسی
طور پر پر امن طریقہ اختیار کرتا۔ اور اپنے ملک کی حفاظت و حراست پر خرچ کی جانے والی قوتوں کو کبھی ضائع نہ کرتا۔ اگر اسے شاہ اسمٰعیل صفوی کے ساتھ
جنگ میں کوئی فائدہ نظر آتا تھا۔ تو کم از کم اسے اس بے رحم قتل عام کو عمل میں نہیں لانا چاہیے تھا۔ دو قوموں کے دلوں میں کینہ کے بیج نہ بوتا اور ہر
حیثیت سے عالم اسلام کے ضعف و انحطاط کا سامان فراہم نہ کرتا۔ حیرانی تو یہ ہے کہ سلیم عثمانی اپنے آپ کو فارسی اشعار میں کچھ اس طرح صفا و صداقت
و اتحاد ظاہر کرتا ہے ؎

این پریشانی و این بے سرو سامانی ما
بہر جمعیت دل ہاست پریشانی ما

عیسائی دنیا میں اس قسم کی خونریزیوں اور جنگوں نے سر اٹھایا اور اس کی ایک مثال کیتھولک متعصبین نے پیرس میں اپنے ہم مذہب پروٹسٹنٹوں
کے قتل عام کا ہے کیا ایک شخص نے دین کے خون کی قیمت مقرر کرنے کے بعد یہاں تک کہہ دیا کہ "مینڈکوں کے ہزار سر انجیل کے ایک سر سے زیادہ
قیمتی نہیں" اور وقت آئندہ میں فرانس کے بیس ہزار پروٹسٹنٹوں کا صفایا کر دیا گیا۔

[illegible]

اقتباس ہے۔ اور ہم استاذ اجل حضرت سعدی علیہ الرحمہ کے علو مقام سے بھی آگاہ ہوں۔ لیکن اس کے باوجود بعد احترام میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ شیخ سعدی نے اپنی گراں قدر تصانیف گلستان اور بوستان میں دنیا کے ہر موضوع اور علم کے ہر شعبے میں کچھ اس طرح خیال آرائی کی ہے۔ کہ خود موصوف کا مسلک اور نقطۂ نظر ادجھل ہو کر رہ جاتا ہے ؛ اور یا یہ کہ دنیے کہ شیخ سعدی کے تاریخی فرمودات کو بعض اوقات حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا . . . . . . علیٰ ہذا القیاس ؎۔ تو یہی وہ موقع ہے جہاں شہرت طلب اور ہوس گیر لوگوں کے ڈھول کا پول کھلتا ہے۔ یہ لوگ بلند و شنیع کے فارسی کنایات سے لیس ہو کر اس بچارے پر پل پڑیں گے ۔" سعدی" کو طراز عنوان کریں گے اور "حفظ عظمت ملی" کا جواز پیدا کر کے درشت اور فحش کلمات کو صفحات قرطاس پر بکھیر دیں گے ۔ اس غیر متعلق تفصیل و اطناب کے بعد یہ سعدی کی طرف رجوع نہیں کریں گے اور نہ ہی اصل موضوع پر کوئی فقرہ کہیں گے ۔ صرف اسی ایک چیز پر زور دیئے جائیں گے کہ " یہ شخص باب استقبال سے بالکل آگاہ نہیں ہے" یا " یہ لافنتین[1] (La Fontaine) کے افسانوں کو سمجھنے کا شعور نہیں رکھتا " یا یہ کہ " اس کا دماغ پراگندہ ہے "۔ ایسے نقاد حضرات اپنی منزلو مہ "خامہ فرسائی" پر پھولے نہیں سماتے ۔ ان لاطائلات کو بچارے سعدی کے حساب میں درج کرتے ہیں اور اپنی لغویات کو دفاع شرافت ملی اور افتخار تاریخ ایران کا نام دے کر خوش ہوتے ہیں ۔

ان بے بنیاد اور کاذب تعصبوں، جعلی اور ظاہری وطن پرستیوں اور فضول قسم کی سطحی حقیقت جوئیوں کا وجود مسائل علمی پر دور تعطل طاری رہے گا ۔ اور کسی دل میں اپنے نظریات کے اظہار اور ان پر بحث و تحقیق کی خواہش پیدا نہ ہوگی ۔ یہ باطل تعصبات بعض دوسرے قسم کے مقامات پر شاید قابل قبول اور لائق تحسین ہوں ۔ لیکن کم از کم علمی دنیا میں ان کو در آنے کی اجازت ہرگز نہیں دی جا سکتی ۔ تحمل و بردباری اور امعان و مطالعہ کی فضا میں آزادیٔ عقیدہ، آزادی بیان اور آزادی تحقیق ارزانی ہونی چاہیئے ۔ اور ان مباحث میں شرکت کرنے والوں کے دلوں میں وسعت، لچک اور تحمل ۔ ان کی نظروں میں فراخی، گہرائی اور پختگی ہونی چاہیئے ۔

علمی دنیا میں حسن نیت اور اعتماد کو اس قدر محکم ہونا چاہیئے کہ ہر محقق مطالعہ کے دوران میں ہمارے کسی مصدقہ حق کو بھی دوسروں کے سپرد کر سکے ۔ مثلاً وہ کہہ سکتا ہے کہ اہل ایران صنعت و حرفت میں کسی جدت طرازی یا اختراع دماغی کے مالک نہیں ہیں ۔ بلکہ محض دوسروں کے نقش قدم پر چلتے رہے ہیں، یا یہ کہ سنگ تراشی اور مجسمہ سازی اور تصویر کشی کے میدان میں ایران نے کسی جوہر کا مظاہرہ نہیں کیا ۔ یا اسی قسم کے دوسرے نظریات کا اظہار کر سکتا ہے ۔ ان دونوں کو " عاشقان شاہ[2] " کی طرح اس پر ٹوٹ ہی نہیں پڑنا چاہیئے ۔ اور نہ ہی اسے مردان حکم[3] اور مرو عاصی کی طرح اپنی نفرتوں کا مرکز بنا لینا جائز ہے ۔ بلکہ بہتر یہی ہوگا کہ اس کی باتوں کے صحیح مطالب تک پہونچنے کی کوشش کی جائے اور بات کو موضوع بحث بنانے کی بجائے اس مقولے کو یاد رکھنا چاہیئے کہ " انظر الی ما قال " (اس کے کہے پر توجہ کرو) ۔ اس قسم کے موقع پر اگر کچھ معقول اور ٹھوس باتیں پاس موجود ہوں ۔ تو وہ مدلل طور پر بیان کر دی جانی چاہیئیں اور اگر حوصلہ ہو تو حزب مخالف کے احترام میں کسی بھی نہیں اٹھا رکھنی چاہیئے ۔ تاکہ کہیں آئندہ تحقیق و اجتہاد کے راستے مسدود ہو کر نہ رہ جائیں ۔

آخر میں بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تعصب برا بھی ہے اور اچھا بھی ۔ برا تعصب وہ ہے کہ جس کی بنیاد تنگ نظری، پست نفاد اور فاسد عقائد پر اٹھائی گئی ہو یا جو جہالت، بے علمی، جذبات اور ذاتی تعلقات تک ہی محدود ہو ۔ اچھا تعصب وہ ہے جس کی بنیاد عقل، ایمان

---

[1] فرانسیسی شاعر اور مصنف (۱۶۲۱ء تا ۱۶۹۵ء) یہاں اس کے منظوم افسانوں (Fables) کا حوالہ ہے ۔

[2] اصل گروہ کا ترکی میں نام " شاہ سون " تھا شاہ عباس بزرگ نے (۹۹۶ تا ۱۰۳۸ھ) اس لشکر کی [illegible]

[3] ایرانی معتقد تھا ان کو دشمنان دین میں شمار کرتے ہیں ۔

انصاف پر اٹھائی گئی ہو۔ یعنی متعصب شخص اپنے مقصود کی محبت میں ایمانداری کو مقدم جانے۔ ریا و فریب سے احتراز کرے۔ بعد ازاں اپنے احساس جذبہ کو علمی معیاروں پر پرکھے۔ اپنے احساسات کی تصحیح و آزمائش میں، غیر جانبدار منطق کسوٹیوں کو عمل میں لائے۔ ان تمام مراحل سے گذر جانے کے بعد اپنے عقائد کے اظہار میں جواں مردی سے کام لے۔ دوسروں کے حقوق، محنت و کاوش اور تحقیق و تجسس کی داد دے۔ ہر مستحق شخص کے استحقاق کی حفاظت کے لئے کمربستہ رہے۔ اور حق پر لبیک کہنے سے کبھی نہ شرمائے۔ لیکن انکساری اور حلم و عاجزی ہر جگہ مطلوب ہے۔ اپنی بلندئ افکار پر مغرور نہیں ہونا چاہیئے۔

اوپر کی تصریحات سے یہ بات اب بالکل صاف ہو گئی ہے۔ کہ تمام تعصبات اور معتقدات یکساں نہیں ہیں۔ بلکہ ان کو مختلف درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے کہ ہر تعصب کے درجہ کا تعلق، اپنے موضوع کے حقیقی درجہ سے ہے۔ اور زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھیئے کہ تمدنِ اقوام کی نسبت براہِ راست ان پاکیزہ اور بلند مقاصد سے ہے۔ جن کی محافظت میں وہ تعصب بروئے کار لایا جاتا ہے۔ ❊

عبدالقوی دسنوی

اقبال کی تین نظمیں

۱۔ فلسفۂ غم

وکیل امرتسر۔ ۱۴/ اگست ۱۹۱۱ء	بانگ درا

(پہلا اور دوسرا بند دونوں میں یکساں ہے۔ تیسرے بند کا دوسرا اور چوتھا شعر بانگ درا میں ترمیم شدہ ہے)۔

	(تیسرا بند)	(تیسرا بند)
شعر ۲	آئینہ جس کا شکست غم سے ہو نا آشنا	جس کا جام دل شکست غم سے ہے نا آشنا
	جس کا دل سرمست جام عیش و عشرت ہی رہا	جو سدا مست شراب عیش و عشرت ہی رہا
شعر ۴	گو بظاہر تلخی دوراں سے آرامیدہ ہے	کلفت غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور ہے
	زندگی کا راز اس کی آنکھ سے پوشیدہ ہے	زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے

(بانگ درا کا چوتھا بند "وکیل" میں نہیں ہے اور اس کے پانچویں بند کا چوتھا شعر بھی "وکیل" میں موجود نہیں۔
اسی بند کا — پانچواں شعر اصلاح شدہ ہے)

ہجراں قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے	- - - - - - - - - - - -
پھر وہی جوئے رواں مانند تار سیم ہے	دو قدم پر پھر وہی جو، مثل تار سیم ہے

۲۔ فاطمہ بنت عبداللہ

وکیل امرتسر۔ ۷/ جون ۱۹۱۳ء	بانگ درا

(اس نظم کے چند ایسے شعر "وکیل" میں ہیں جو بانگ درا میں نہیں ملتے۔ بعض شعر بانگ درا میں اصلاح کے بعد چھپے ہیں اور بعض دونوں میں مشترک ہیں —)

فاطمہ تو آبروئے ملت مظلوم ہے	فاطمہ! تو آبروئے امت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے	- - - - - - - - - - - -
کس قدر عزت تجھے اے حور صحرائی ملی	یہ سعادت حور صحرائی! تری قسمت میں تھی
غازیان ملت بیضا کی سقائی ملی	غازیان دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
ہے جسارت آفریں شوق شہادت کس قدر	یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر

وکیل	بانگِ درا
موت کے اندیشۂ جانکاہ سے بیگانہ تھا	× × × × × ×
موجۂ خوں کی ہم آغوشی سے بھی ڈرتا نہ تھا	× × × × ×
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی	. . . .
ایسی چنگاری بھی یا رب اپنے خاکستر میں تھی	. . . .
سینۂ ملت میں ایسا جلوۂ نادیدہ تھا	× × × × × ×
ذرہ کہ برگِ نازکِ گل سے بھی تھا پاکیزہ تر	ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر
جس کے نظارہ کو ایک عالم سراپا دیدہ تھا	× × × × × ×
اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں	. . . . . .
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں	. . . .
فاطمہ گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے	. . . .
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے	. . . .
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے	. . . .
ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے	. . . .
ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں	ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
	پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں
	بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعتِ مقصد سے میں
آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد میں میں	آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد سے میں
یعنی نوزائیدہ تاروں کا فضا میں ظہور	تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور
دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نور	. . . .
جو ابھی ابھرے ہیں ظلمت خانۂ ایام سے	. . . .
جن کی ضو ناآشنا ہے قیدِ صبح و شام سے	. . . .
ہے ابھی جن کے لئے رفتار کی لذت لئے	× × × × × × × × × ×
آسماں کا نجم لئے سعت لئے عظمت لئے	× × × × × × × × × ×
جن کی تابانی میں انداز کہن بھی نو بھی ہے	. . . .
اور خوئی بنت عبداللہ کا پرتو بھی ہے	اور تیرے کوکب تقدیر کا پرتو بھی ہے

(تیسری نظم کا عنوان ہے۔ "اسلامی رواداری" مجوزہ وکیل مرجون ۱۲ء کے شمارے میں ہے لیکن بانگِ درا میں یہی نظم "محاصرۂ ادرنہ" کے زیرِ عنوان ملتی ہے۔ فاطمہ بنت عبداللہ کی طرح اس نظم میں بھی اشعار مختلف الترتیب ہیں ـــــ)

وکیل	بانگِ درا
یورپ میں جس گھڑی حق و باطل کی چھڑ گئی	. . . .

حق خنجر آزمائی پہ مجبور ہو گیا

گرد صلیب گردش قمر حلقہ زن ہوئی
شاہی حصار درنہ میں محصور ہو گیا

مسلم سپاہیوں کے ذخیرے ہوئے تمام
روئے امید آنکھ سے مستور ہو گیا

آخر امیر فوج حجازی کے حکم سے	آخر امیر عسکر ترکی کے حکم سے
"آئین جنگ" شہر کا دستور ہو گیا	. . . .
ہر شے ہوئی ذخیرہ لشکر میں منتقل	. . . .
شاہیں گدائے دانہ عصفور ہو گیا	. . . .
تھا امتیاز کچھ نہ ہلال و صلیب میں	× × × × × × × ×
مقصود فوج خانہ معمور ہو گیا	× × × × × × × ×
لیکن فقیہہ شہر نے جس دم سنی یہ بات	- - - - - - - - - - - - - -
گرما کے مثل صاعقہ طور ہو گیا	. . . . - - - - - - - - - -
"ذمی کا مال لشکر مسلم پہ ہے حرام"	. . . .
فتوی تمام شہر میں مشہور ہو گیا	. . . .
چھوتی نہ تھی یہود و نصاری کا مال فوج	. . - - - - - - - - - - - -
مسلم خدا کے حکم سے مجبور ہو گیا	. . . .
اقبال اس پیمبر امی کے میں فدا	× × × × × × ×
ایثار جس کی قوم کا دستور ہو گیا	× × × × × × ×
دنیا میں جس کی مشعل خلق عظیم سے	× × × × × × ×
ہر ذرہ شرح سورۃ والنور ہو گیا	× × × × × × ×
امت کا جس نبی کی حروف جلی میں نام	× × × × × × ×
قرطاس روزگار پہ مستور ہو گیا	× × × × × × ×
مرہون تاب و تاب و وامت ہوا ہو گیا	× × × × × × ×
کیا غم جو اس کا دل شب دیجور ہو گیا	× × × × × × ×
دنیا میں تیج و تاب ہے شہ خضر کہ تاک	× × × × × × ×
کھا کھا کے پیچ صاحب انگور ہو گیا	× × × × × × ×
	× × × × × × ×

نوٹ:- (××××) یہ نشان اس چیز کو ظاہر کرتا ہے کہ شعر موجود نہیں اور (- - - : .) یہ نقطے اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ دونوں جگہ یہ شعر اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔

جعفر طاہر

الیٰ دین الجاہلیہ

یہ عنوان ہے جعفر طاہر کی نظم کا۔ عنوان دیکھ کر ہی آپ بہت چونکیں گے مگر ان کا مقصد بھی یہی ہے کہ آپ چونکیں، وہ آپ کو چونکانا چاہتے ہیں اس لئے کہ جب تک آپ چونکیں گے نہیں۔ ان کی بات وہاں تک پہنچے گی نہیں جہاں تک وہ پہنچانا چاہتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ آپ وہ نظم پڑھیں وہ خط ملاحظہ کیجئے جو اس نظم کے ساتھ منسلک تھا۔ اور نظم کی روح سے وابستہ۔ یہ خط بھی اپنی نوعیت کی ایک خاص چیز ہے ـــــ اسے نظم کی تمہید و تقریظ کہنا چاہئے جس کا انداز ادب بے تحاشا ہے۔ لکھتے ہیں:-

سیدنا   تا تھک تا   سبز قبا   تا تھک تا

حسن شئے   تا تھک تا   اعلیٰ اللہ   تا تھک تا

دیکھا آپ کا پورا نام طبلے کی تال میں ڈھل گیا، اور اسی پر کیا موقوف اگر مجھے کافر ہونے کا ڈر نہ ہوتا تو میں صحائف آسمانی کو تالوں میں لکھ کر ایک نئے مذہب کی طرح ڈال دیتا۔ یوں اگلے دن پہل کاف کہیں نہ کہیں تال میں پڑھ بیٹھا، چچا جان، چچی جان، بیگم صاحبہ اور ہمشیرہ صاحبہ تک ناراض ہیں بچے بھی مجھے شیطان لعین کہتے ہیں۔ اور امی سے پوچھتے ہیں کہ اماں جان شیطان کی شکل اسی طرح ہے نا جیسے بھائی جان کی (یعنی میری) ادھر میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں، در اصل میں اہل خاندان اور اہل اسلام کے خوف سے مسلمان ہوں، ورنہ میری فطرت، میری روح اور میرا طرز حیات سب کچھ PAGAN ہے۔ اب یہی الیٰ دین الجاہلیہ دیکھ لیجئے کام کرتے کرتے جان نکل جاتی ہے لیکن فرصت کے لموں میں ایران توران اور مصر و یونان کی سوجھتی ہے۔ اب کے یونان کی سیاحت سے جو پلٹا ہوں تو یک نظر عرب کو دیکھ کر رو دیا۔ یہ نوحہ آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں، کیونکہ آپ لوگ بھی سیدان ذوی الاحترام ہیں اور پھر آپ کی رگوں میں بھی عرب خون ہے۔ آپ کو امرء القیس (جس کی ایک کنیت ذوالقروح بھی ہے) طرفہ، عنترہ، علقمۃ الفحل، تغلب الیشکری وغیرہ سے جو ہمدردی ہو سکتی ہے، وہ کسی اور کو تو نہیں ہو سکتی، آخر یہ لوگ ہمارے ہموطن اور ہمارے عزیز و اقارب میں سے تھے۔ لبید کو جانے دیجئے وہ تو مسلمان ہو گیا اور پھر اس نے مسلمان ہونے کے بعد سلامتی ذوق کا یہ ثبوت دیا کہ شعر کہنا ہی چھوڑ دیا۔ کسی نے پوچھا بھی کہ حضرت اب شعر کیوں نہیں کہتے تو آہ سرد بھر کر فرمایا۔ کفلنا الشیب والاسلام، خیر یہ نوحہ نظم جو عرب کے نام میرا "سلام عقیدت" ہے۔ حاضر خدمت ہے بہت سے اشعار تشریح طلب ہیں، مگر جہاں آپ ایسے جانی جہان (جانی۔ مصدر جانتا بمعنے جانتے والا۔ جانی جہان دنیا بھر کا علم جاننے والا) اور باب مدینۃ العلم کے تربیت یافتہ موجود ہوں۔ وہاں میں کیا لکھتا اور کیا تشریح کرتا۔ آخری قطعہ اس مشہور واقعہ سے متعلق ہے۔ جب امرء القیس قیصر روم کے زہر آلود خلعت مرگ کی بدولت پھوڑوں کی تکلیف سے مر رہا ہے اتفاق سے اسی بستی میں ایک شہزادی جو عرب کی سیاحت سے اپنے وطن روم واپس جا رہی تھی بیمار ہو گئی۔ اس بانو نے روم کا

قبر امرؤ القیس کے عین مقابل لگا دیا گیا، وہیں پر یکسوال کی گود میں دو محبت کرنے والے دل ہمیشہ کیلئے سو گئے، سنتا ہوں کہ صحرا کی بے نور چاندنی ان شہیدانِ محبت کی گمشدہ قبروں پر آج تک نوحہ کناں ہے، اسی مقام پر امرؤ القیس نے بادشاہ روم کی تیمارداریوں اور عنایات شاہانہ کو اپنے اس غیر فانی قول میں سمو کر جاوداں کر دیا کہ :-

ان الغریب للغریب نسیب ،

باقی جو کچھ ہے وہ آپ کے سامنے ہے لہٰذا حد ادب ، ——— :

شرمسار ہوں کہ مہر نیم روز کیلئے اب تک کچھ نہ بھیج سکا لیکن اب ضرور حاضر ہوتا رہوں گا۔ بڑے بڑے ناموں سے تو خیر مرعوب ہونے کی آپ کو عادت نہیں دراصل سید کی ایک شناختی علامت یہ بھی ہے کہ وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اور پھر سنگو سریا پولٹن مارکیٹ تک پڑھے ہوئے علما، اور شعراء ہمیں کیا مرعوب کر سکیں گے۔ اس صاحب کشف و کرامات کو میرا سلام دیجئے جس کے آئینہ دلفریب میں باہر عکس دلفریب تو موجود رہتا ہے لیکن کوئی نقش غریب نہیں رہ سکتا۔ اس سے پہنچے ہوئے سید زادے سے یہ کچھ بعید تو نہ تھا کہ وہ خود آ نکلتا یا مجھے بلا لیتا مگر یہ بات نصیب کی ہے اور رغ الجھ رہے ہیں ہمارے نصیب کیا کہئے !

یہ تھا خط جعفر طاہر کا ——— جی تو چاہتا تھا اس خط کی تلمیحات و اندازہ و اشارات کی روشنی میں جعفر طاہر کا جانی جہان، اپنے قلم کو واقعی آزاد کر دیتا، لیکن موقع نہیں ہے تاہم دیکھو تو لکھنا ہی پڑے گا جس کا تقاضا یہ خط علی الاعلان کر رہا ہے اور مدینۃ العلم کی نسبت یاد دلا دلا کر آواز دے رہا ہے۔ کہ کچھ تو کہو کچھ تو بولو ——— ! تو صاحب عرض یہ ہے کہ یہ نوحۂ غم ہے" زہر ہلاہل ہے، طنز شدید ہے، ہمارے پ کے اس عہد حاضر پر ——— وہ کہتے ہیں کہ ہم اس دور کو "عہد جاہلیت" کہتے رہے۔ لیکن عہد جاہلیت میں بھی جیسی جیسی خوبیاں اور اصول پسندیاں تھیں وہ تک موجودہ دور کے "عہد قابلیت" میں ناپید ہوتی جاتی ہیں ——— وہ روتے ہیں کہ عہد جاہلیت تک میں الفتیں بے داغ تھیں ، وفاداریوں کی روایات تھیں، نظر نظر عیار ضمیر و ذوق تھی۔ ان کی عنایات یوں عام نہ تھیں، خنجر نکل پڑے جو کیا عرض اختلاط، ہنگام وصل بھی لحاظ اور اپنی شرافت کا احترام پیش نظر، حسن، غیور تھا، ملاقاتوں کی بھی حدود تھیں، سرنوشی کے وقت بھی احساس آبرو رہتا تھا۔ وہ سراپا حریت خیام و حجابات تھیں، ان کی زلفوں کا تار تار گویا طوق وفا تھا۔ وہ شعر پرست تھیں، سخن شناس تھیں، ان کی ایک ایک ت قول فیصل کا حکم رکھتی تھی، وہ شمع بزم حسن و کمالات تھیں، اور چونکہ وہ ایسی تھیں اسلئے مرد بھی مردانہ خوبیوں کے حامل تھے، ان میں حمیت ی، غیرت تھی، ان کی شرافت ان کی غیرت، ان کی عزت نفس اور خودداری کو ان کے قصائد میں دیکھو، ان کی زندگی خالص اور بے نقاب ی، مگر عہد حاضر کی زندگی ؟ ——— وہ تو قطعی "نخالص" اور سراسر نقاب پوش ہے ——— وہ کہتے ہیں کہ تم تو عہد جاہلیت میں بھی نے برے نہ تھے۔ خط کا آغاز خود ہی بول رہا ہے۔ دیکھئے شاعر اپنے ماحول سے، رجحانات سے، اپنے پن سے، کس قدر بیزار ہے، اس کے ایک جملے سے اس کی تلملاہٹ چھلکی پڑتی ہے۔ وہ دوسروں کو کچھ نہیں کہہ سکتا، لہٰذا سب کچھ اپنے آپ کو کہہ لیتا ہے، زیادہ سے زیادہ وہ یہ حق رکھتا تھا۔ سو اس نے تسلیمان فدوی احترام" کہہ کر ہمیں مخاطب کر لیا۔ اور پھر جو نیشنلزم اور ریشیلزم کے پیمانے میں خاصی مہارت سے یں تولا دیا ہے تو ہماری تو روح جھنجھنا اٹھی کہ سچ کہا جعفر طاہر تو نے سچ کہا، جعفر طیار نے اصول حق کی خاطر رشتوں کی ساری زنجیریں توڑ ی تھیں، نسل کی، رنگ کی، جغرافئے کی، زبان کی، حسب کی، جملہ لقرالطیوں کی، اور اصول ہی کی خاطر حبشہ کو مکے پر ترجیح دی تھی، مگر آج یہ ساری یریں ہم نے از سر نو جوڑ جوڑ کر پہن لی ہیں ——— تو پھر اے جعفر طاہر، تیرا یہ جملہ بجا برمحل ہے کہ آپ کو امرء القیس، طرفہ، عنترہ، علقمہ فل وغیرہ سے جو ہمدردی ہو سکتی ہے، وہ کسی اور کو تو نہیں ہو سکتی، آخر یہ لوگ ہمارے ہم وطن اور ہمارے عزیز و اقارب میں سے تھے ——— اور

خیمان دار جلجل[۱۲] و توضّل[۱۳] کہاں گئے — سقط اللّوی[۱۴]، وہ تیری عنیزہ[۱۵] کیا ہوئیں

خیموں پہ جس کے مات کو دہاں تھا ہتاب — اے جوف عیر[۱۶] تیری عقیلات کیا ہوئیں

آہو پرستگاں نے سنا تھا نہ جن کا نام — اے واقفِ ذی حسم[۱۷] وہ غزالات کیا ہوئیں

یارب وہ ساحرات وہ خوش خلق سامرات[۱۸] — روشنگرانِ سینۂ ظلمات کیا ہوئیں

ہیں کس لئے خموش بجوش[۱۹] و صفا کے لوگ — وہ کشتگانِ غم کی انیسات کیا ہوئیں

ڈابر عکاظ[۲۰] ہے نہ غزالان ذوالمجاز

ہائے وہ زندگی وہ مجالت کیا ہوئیں

وہ قیصر روم سے امداد طلب کرنے گیا تھا۔ لیکن قیصر روم کی طرف سے تاثیر و ملک کوئی آیا راستے میں اسے چیچک نکل آئی اور وہ اسی مرض میں مبتلا رہ کر ۵۴۰ء میں مرگیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چیچک نہ تھی۔ بلکہ زہر آلود خلعت اسے پہنایا گیا تھا جس کی وجہ سے اس کا سارا جسم زخمی ہوگیا تھا اور اسی تصور کے ماتحت اسے ذوالقروح کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ اسکی قبر انقرہ میں ہے۔ وہ کوہ عسیب کے دامن میں ایک شہزادی کے پہلو میں دفن ہے۔ وہی شہزادی جسکی چارہ گری و رفاقت کا اشارہ اس قطعے میں ہے عـ۱۳ مقامات کے نام عـ۱۴ جارہ کی جمع پڑوسی عورتیں عـ۲۰ جزیرۃ العرب عـ۲۱ باکرہ کی جمع کنواریاں ربیعہ کی جمع بہار مجسم، سرسبز و شاداب عـ۲۲ ایک تالاب کا نام جہاں امرا القیس نے اپنی محفل نشاط سجائی تھی اور رنگینیاں بنا رہا تھا اپنی گوپیوں کی جھرمٹ میں عـ۲۳ ایک مقام کا نام عـ۲۴ ایک مقام کا نام، یہ دونوں نام اس کے قصیدے میں آئے ہیں عـ۲۵ عنیزہ نام ہے امرا القیس کی معشوقہ کا یہاں بہ صیغۂ جمع، وہ تمام عورتیں مراد ہیں جن سے امرا القیس نے معاشقہ کیا تھا عـ۲۶ و عـ۲۷ مقامات کے نام عـ۲۸ سامرہ کی جمع راتوں کو سرگوشیاں کرنے والیاں کہانیاں سنانے والیاں عـ۲۹ مقامات کے نام عـ۳۰ انیسہ کی جمع غمگسار عورتیں عـ۳۱ وہ بازار جہاں ایام جاہلیت کے شعرا میلے میں جمع ہوتے تھے اور اپنے اپنے قصائد سناتے تھے عـ۳۲ وہ مقام جہاں مجالس ادب منعقد ہوتی تھیں۔

دکھ لوں ـ؟ بقیہ صـ۴۸

یہ سن کر بڑھیا کے پھیکے ہونٹوں پر اچانک مسکراہٹ آگئی "بیٹیا اس سے بڑھ کر اور کیا خوش نصیبی ہوگی ـــ"

میں اس کے ساتھ ہولیا تائی ماں تیزی سے جوتیاں چٹخاتی میرے آگے آگے چل رہی تھی' جیسے اسے بڑی عجلت ہو پیچ در پیچ گلیوں سے گزرنے کے بعد اس کا مکان آگیا۔ تائی ماں ایک کمرے والے مکان میں اکیلی اپنی بیٹی کے ساتھ رہتی تھی ـ اس مکان کی مکمل تعمیر ابھی تک نہیں ہوسکی تھی۔ اور مجھے الف لیلیٰ کی داستان کی طرح ایک چھوٹا سا کمرہ نظر آرہا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر البتہ ذرا وسعت کا اندازہ ہوتا تھا۔

انگنائی میں بڑے سلیقے سے پھولوں کے گملے رکھے تھے۔ میں سامنے پڑی ہوئی ایک شکستہ حال کرسی پر بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ تائی ماں نے روک دیا۔ ذرا ٹھہرو بھیا۔ میں اسے صاف کردوں' میں نے دیکھا میرے سامنے کوئی نوجوان لڑکی ایک کھاٹ پر چادر ڈالے پڑی تھی' اس کا پورا چہرہ چادر سے ڈھکا ہوا تھا لیکن اس کی چھوٹی پتلی چادر سے باہر آگئی تھی کرسی صاف کرکے تائی ماں نے مجھے اس طرح بٹھا دیا جیسے اس کے گھر کوئی شہنشاہ آگیا ہو جھاڑ کر چلے جانے لگی۔ خوشی سے اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے ہم نے فوراً ان کے قریب ہی کرسی کھسکائی اور چپکے سے پوچھا: اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" اور وہ ایک دم سے چونک پڑی ـ اس نے اپنے منہ سے چادر پھینک دی اور بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی ــ ــ ہائے اللہ آپ ـــ؟ اس نے سرہانے پڑے ہوئے دوپٹہ کو سر پہ ڈالتے ہوئے کہا۔ اور اسے دیکھتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس چھوٹے سے کمرے میں اچانک ایک بھونچال آگیا ہو ایک لمحے کیلئے پوری کائنات میری نگاہوں میں گھوم گئی میرا دماغ چکرا سا گیا وہی [illegible] سی

[illegible]

قاضی سلیم

بال روم

یہ بال ڈانس جنوں خیز حجاز کا آہنگ
ہر ایک تال پہ اس طرح اٹھ رہے ہیں قدم
کہ جیسے تیرتے پھرتے ہیں بیخودی میں نہنگ
حصار تنگ ہوئے تیز تر ہوئے سرگم
وہ لڑکھڑائے پرستار ڈگمگائے صنم
ہر ایک منتظرِ لمحۂ پذیرائی!
کھلے گا کون سی گردش میں میکشی کا بھرم
غم رقیب ہے باقی نہ خوف رسوائی
قدم قدم پہ طلسمات رنگ و زیبائی

سلگتے جسم، پگھلتی نظر، جھلستے دماغ
دہکتے شعلوں میں کب تک یہ سرد آغوشی
ہے آدھی رات کا ہنگام کب بجھیں گے چراغ
ملے گا کس کی نگاہوں میں اذن روپوشی
برس رہا ہے فضاؤں میں رنگ مدہوشی
خمار شب کے اترنے کا کچھ بہانہ تو ہو
کہیں تو پائیں بہر طور خود فراموشی!
اٹھاؤ بادۂ گلفام رقص تیز کرو!
بھلا کے ہر غمِ پنہاں کو دو گھڑی ہنس لو!

نگاہ و دل کے اشارات کامیاب ہوئے
ابھی تو ہال ضیا پوش ہے، مگر کب تک
وفا و عہد سبھی غرقِ جامِ ناب ہوئے
چرا سکیں گے بھری بزم میں نظر کب تک
رہے گا خوف مکافات خیر و شر کب تک
چرا لو چھین لو خوشیاں کہ رات اپنی ہے
ضمیر و قلب کو اندیشۂ سحر کب تک
مآل کچھ ہو ابھی تو حیات اپنی ہے!
ذرا سی دیر سہی کائنات اپنی ہے!

مظہر امام

ہمسفر

(پرویز شاہدی کے نام)

(جن کی شادی کے موقع پر یہ نظم لکھی گئی تھی اور مدیر [illegible] کے عزیز سلمان وشیما کی شادی کے موقع پر درج ہو رہی ہے (جو اسی شمارہ کو ہو رہی)
حسن اتفاق یہ ہے کہ پرویز بھی مدیر [illegible] کے عزیز ہیں — شاید انکو خبر ہو —)

زندگی کرکے عروسانہ سِنگار آئی ہے
چھیڑتی عشرتِ فردا کا ستار آئی ہے
دل کی خوابیدہ امنگوں پہ بہار آئی ہے
ہائے کیا شان ہے، کیا رنگ دل آرائی ہے!

جیسے دوشیزۂ تخئیل کا آنچل ڈھلکے
جس طرح ساقیٔ جذبات کا ساغر چھلکے

پیکرِ حسن برافگندہ نقاب آیا ہے
اپنی زلفوں میں لئے بوئے گلاب آیا ہے
اپنے ہونٹوں میں لئے روحِ شباب آیا ہے
اپنی آنکھوں میں لئے بادۂ ناب آیا ہے

آج ہر گام پہ جنّت کا گماں ہوتا ہے
غم بھی دنیا میں ہے، احساس کہاں ہوتا ہے!

زندگی حُسنِ فراواں کا پتہ دیتی ہے
سُرخیٔ رنگِ بہاراں کا پتہ دیتی ہے
مستیٔ رقصِ غزالاں کا پتہ دیتی ہے
سرفرازیٔ گلستاں کا پتہ دیتی ہے

صبحِ مستقبلِ رنگیں کے کنول کھلتے ہیں
وقت وہ ہے کہ مہ و مہر گلے ملتے ہیں

قابلِ فہم ہوئی آج نگاہوں کی زباں
نشۂ شوق میں ہے چورنگارِ امکاں
ہو رہا ہے مرے اشعار کی سرخی سے عیاں
خون بن کر رگِ ہر لفظ میں صہبا ہے رواں

نغمہ گر وقت کی رفتار ہوئی جاتی ہے
روحِ پازیب کی جھنکار ہوئی جاتی ہے

عارضِ دوش پہ ہے غازۂ رنگینیٔ حال
حُسنِ امروز میں پوشیدہ ہے فردا کا جلال
میری نظموں کی جوانی، مری غزلوں کا جمال
تجھ پہ قربان مرے "شاعرِ شادابِ خیال"!

خسروی مُلکِ محبت کی مبارک پرویز!
بات ہے یہ بھی فضیلت کی، مبارک پرویز!

حُسن نے باندھا ہے پیمانِ رفاقت تجھ سے
دادِ کچھ چاہتا ہے جذبۂ وحشت تجھ سے
آرزو تجھ سے ہے، اُمیدِ مسرّت تجھ سے
ہے طلبگار محبت کی، محبت تجھ سے

وہ محبت جو غمِ دہر پہ چھا جاتی ہے
چشمِ فطرت کے اشاروں کو بھی پا جاتی ہے

زُلفِ گیتی میں ابھی تک ہے شکن، یاد رہے
ہے وہی اب بھی زمانے کا چلن، یاد رہے
خون روتے ہیں ابھی سرو و سمن یاد رہے
ہے ابھی خاک بسر روحِ وطن، یاد رہے

شمعیں محراب محبت میں فروزاں کرنا
ساتھ ہی فکرِ علاجِ غمِ دوراں کرنا

زندگی خواب بھی ہے، عالم بیدار بھی ہے
قد و گیسو بھی ہے یہ اور رسن و دار بھی ہے
نغمۂ ناز بھی ہے، روح کی للکار بھی ہے
بزم میں ساز بھی ہے، رزم میں تلوار بھی ہے

روپ بھی ہے یہی دنیا، یہی بہروپ بھی ہے
یہ گھنا سایہ بھی ہے اور کڑی دھوپ بھی ہے

اپنے افکار کی قندیل جلانا ہے تجھے
یورشِ تیرگیٔ شب کو دبانا ہے تجھے
نارِ دوزخ سے ہی فردوس بنانا ہے تجھے
دور منزل سہی، لیکن وہیں جانا ہے تجھے

ہم سفر بھی ہے، شعورِ رہِ منزل بھی ہے
عقل تنہا نہیں، اب ساتھ ترے دل بھی ہے

ہو مبارک مرے شاعر! تجھے یہ ذوقِ سفر
تیری راہوں میں بچھیں انجم و خورشید و قمر
ہو فزوں تر ترے بیباک ارادوں کا اثر
قسمتِ دہر پلٹ دے تری اک تیز نظر

حسن کی بات مسیحا کی زباں ہوتی ہے
زندگی جس سے جواں، اور جواں ہوتی ہے

نجم فضلی

موم کی گڑیا

"میں تو بالکل بھاڑ دی ہوں" فریدہ نے خنک سے مبتسم لہجے میں کہا۔ اور یکایک مسعود یزمی کو تین سال پہلے کا واقعہ یاد آگیا۔

رات دیر تک جگا تھا اس لیے صبح کو اس کی آنکھیں جل سی رہی تھیں اس لیے کہ وہ کالج جانے کے خیال سے جلدی اٹھ گیا تھا۔ کپڑے بدل کر جب وہ باہر نکلا دھوپ چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ صبح پوری طرح روشن تھی لیکن وہ مضمحل تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے بس سٹاپ کی طرف چل دیا۔ بس میں خلافِ معمول کافی بھیڑ تھی۔ بڑی مشکل سے جگہ ملی اور وہ ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اور اس کی کسل میں اور اضافہ ہو گیا ـــــ لیکن جب وہ بھیڑ کو چیرتا ہوا اور لوگوں کے دھکے کھاتا ہوا بس سے نیچے اترا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ دیکھتے دیکھتے موسم نے اپنا چولا بدل لیا تھا۔ جیسے کوئی روٹھی حسینہ خواہ مخواہ من جائے اور ایک حسین مسکراہٹ سے کائنات کو مبتسم بنا دے۔ اودے بھورے اور کالے رنگ کے بادل گھر گھر کر جمع ہو رہے تھے۔ ہواؤں میں خوشگوار سی خنکی آگئی تھی۔ پودے جھوم رہے تھے اور لوگ مسرور نظر آ رہے تھے۔ مسعود بہت خوش ہوا وہ قطعی بھول گیا کہ تھوڑی دیر پہلے وہ کراچی کے موسم سے کس قدر بیزار ہو رہا تھا۔ اور بس میں دھکے کھا کر اسے زندگی سے نفرت ہو چلی تھی۔ اس نے ایک جھرجھری لی۔ پھر ایک دبی سی انگڑائی لی اور پھر سامنے کے پارک پر ایک گہری نظر ڈال کر اور سگریٹ کا ایک طویل۔ دلکش اور پرسکون کش لے کر کالج کی طرف بڑھ گیا۔

کالج میں ہمیشہ سے زیادہ لڑکے تھے۔ خاصی چہل پہل تھی، اور جب بادل گھرے ہوں، ہوائیں مترنم ہوں اور موسم شدید ہو تو خواہ مخواہ ہی ہر چیز اچھی لگتی ہے۔ کالج کے احاطے میں داخل ہوتے ہی اسے بہت سے نئے چہرے نظر آئے۔ ابھی کالج کھلے چند ہی دن تو ہوئے تھے۔ اور لکچرز تو صرف کل سے ہی شروع ہوئے تھے۔ ہر شخص اجنبی تھا، اور ایک دوسرے کی طرف عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لکچر شروع ہو چکا تھا مگر کافی تعداد میں لڑکے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ ایک تو ماحول اجنبی تھا۔ دوسرے سینیئر طلباء فرسٹ ایئر کی کلاس میں گھس کر جانوروں اور پرندوں کی بولیوں سے نئے طلباء کو پریشان کر رہے تھے۔ تیسرے یہ کہ موسم اس قدر جان لیوا ہو رہا تھا کہ کسی دل والے کا کلاس میں بیٹھنے کو دل ہی نہ چاہتا تھا۔ حالاں کہ کلاس میں تسکینِ دل و نظر کا سہارا بھی تھا لیکن کچھ تو شدید اجنبیت اور کچھ کالی پیلی صورتوں نے طبیعتوں کو مکدر کر دیا تھا، لڑکیاں تو لڑکیاں لڑکے تک ایک دوسرے سے بیگانے تھے۔ ایسے میں کوئی کیا دلچسپی محسوس کرتا ؟۔

اکنامکس کا پیریڈ تھا۔ مگر لکچرر کے کلاس میں داخل ہوتے ہی وہ وہ آوازیں بلند ہوئیں کہ یقین ہونے لگا کہ یہ کالج نہیں بلکہ افریقہ کے جنگلوں کا کوئی انتہائی خوفناک حصہ ہے۔ آخر کار لکچرر نے کلاس کو آزاد کر دینے میں ہی مصلحت سمجھی۔ لڑکیاں نکلنے لگیں تو لڑکے اگلی لائن کی میزوں پر قطار اندر قطار کھڑے ہو گئے۔ آخری لڑکی ابھی نکل ہی رہی تھی کہ یکایک میز کرسیوں کی کھڑکھڑاہٹ کے درمیان چٹاخ پٹاخ کی دو شاندار آوازیں بلند ہوئیں اور پھر سب حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ اور کالج میں ایک عجیب طرح کی سنسنی پھیل گئی۔

بات کچھ بھی نہ تھی۔ کسی سینیئر لڑکے کو کسی نے دھکا دے دیا تھا۔ اور اتفاق سے وہ گزرنے والی آخری لڑکی پر جا پڑا تھا جس کا لازمی نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔

لڑکیاں یوں بھی "ہم سے نہ بولو ورنہ سمجھ لینا ہاں!" کا بورڈ بنی ہوئی کلاس میں آتیں یا ادھر ادھر بیٹھتیں۔ لڑکے البتہ رفتہ رفتہ آپس میں کھلتے گئے۔ اور پھر وہ والی لڑکی باقاعدگی سے موضوع گفتگو بن گئی۔

"یار حد ہو گئی ڈوب مرنے کی بات ہے"۔ ایک لڑکے نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"ہاں بیکار کی باتیں نہ کرو۔ میں ہوتا تو وہ جوابی عنایت کرتا کہ مزہ آجاتا محترمہ کو"۔ دوسرے نے کسی قدر غصے سے کہا

"نہیں یار اس بدتمیزی کا یہی جواب تھا"۔

دوسری طرف کچھ اس طرح کی گفتگو ہو رہی تھی۔

"یار دیکھنے میں کس قدر مسکین اور بے ضرر معلوم ہوتی ہے لیکن ہے بہت خطرناک"۔

"ایسی ظالم لڑکی میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی"۔ دوسری آواز تھی

"دیکھو نہ بیٹھی کس رعونت سے ہے۔ صورت شکل ہوتی تو نہ جانے کیا کرتی"۔

"بھئی سچ کہتا ہوں مجھے تو اس کی صورت سے ڈر لگتا ہے"۔

چند لڑکے اس طرح کی گفتگو کر رہے تھے۔

"کس قدر بد مزاج لڑکی ہے غصہ تو جیسے اس کی ناک پر دھرا رہتا ہے"؟

"احساس کمتری کا شکار ہے اور کوئی خاص بات نہیں"۔

"بیکار باتیں کرتے ہو، احساس کمتری کا کیا سوال وہ صورت ہی ایسی تھی جس کا جواب تھپڑ کے علاوہ کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا"۔

"مجھے تو بے انتہا شریف لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ حیرت ہے اس کا ہاتھ کیوں کر اٹھ گیا"۔ ایک لڑکے نے خاصی عقیدت کے سے انداز میں کہا۔

غرض طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ جدھر سے وہ نکلتی لڑکے سامنے سے سرک جاتے۔ حد تو یہ ہے کہ اگر آپس میں ہنسی مذاق کر رہے ہوتے اور وہ آتی نظر آجاتی تو چپکے ہو جاتے۔

اس دن بھی جب مسعود برنی گیلری میں کھڑا تھا وہ ادھر سے گذری اور سارے لڑکے دبک سے گئے۔ پھر ذرا دیر بعد گھنٹہ بجتے ہی لڑکے کلاس میں داخل ہونے لگے۔ وہ اتفاق سے اس دروازے پر کھڑا تھا جدھر سے عموماً لڑکیاں کلاس میں داخل ہوتی تھیں۔

"آپ کو زحمت ہوگی"۔ میٹھی سی آواز سے وہ چونک اٹھا۔

"معاف کیجئے گا"۔ کہہ کر وہ سامنے سے ہٹ گیا اور جب وہ کلاس میں داخل ہو گیا تو وہ بھی سامنے کی خالی سیٹ پر بیٹھ گیا

مسعود برنی کے بالکل سامنے کی سیٹ پر وہ لڑکی پتھر کے بت کی طرح رکھی ہوئی تھی۔ تیور کچھ چڑھے چڑھے تھے، نگاہیں نیچی اور چہرہ ویران وہ لڑکی اس کے بارے میں کچھ سوچنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ برابر کی سیٹ سے آواز آئی۔

"لڑکی تو یہ کسی طرف سے لگتی ہی نہیں۔ پتھر کا بت ہے"۔

"لڑکی ہوتی تو کبھی اس قدر دہشت پھیلا ہی نہیں سکتی تھی۔ لڑکی تو پیار اور نزاکت کا مجسمہ ہوتی ہے اور یہ لعنت غصہ اور کرختگی کا دیو"۔

"دہشت کیسی"؟ برنی نے ساتھ والے لڑکے سے پوچھا

"کمال ہے صاحب! آپ کو اس بات کی خبر ہی نہیں ارے جناب اسی لڑکی نے تو اس دن سیکنڈ ایئر کے لڑکے کو تھپڑ مار دیا تھا" ساتھ بیٹھے ہوئے

لڑکے نے جیسے اس کی لاعلمی کا ماتم کرتے ہوئے کہا۔

"تو یہ ہیں وہ ذات شریف!" اس نے دل میں سوچا

پھر اس نے اسے غور سے دیکھا۔

سانولے رنگ اور چھریرے جسم کی وہ عام سی لڑکی تھی۔ خوبصورت نہیں تھی تو بدصورت بھی نہیں کہا جاسکتا تھا اس لئے کہ وہ لڑکی تھی۔ اور لڑکی کبھی بدصورت نہیں ہوتی۔ بہت معمولی سی لڑکی تھی۔ اس میں سوائے اس کے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی کہ اس نے ٹیڑھی مانگ نکال رکھی تھی اور دوپٹہ قوس قزح کی طرح ہلکے گہرے ایک دوسرے سے ملتے ہوئے رنگوں کا اوڑھ رکھا تھا۔ اور مسعود کی دلچسپی کے لئے یہ کافی تھا۔

وہ تمام کلاس میں بڑی باقاعدگی سے حاضر رہتی۔ تمام لیکچرز کے درمیان ایک بار بھی نظر اٹھا کر نہ دیکھتی۔ کلاس میں کسی بات پر قہقہوں کا طوفان امنڈ پڑے اس پر کچھ اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ جیسے وہ واقعی پتھر کا بت ہو جس پر کسی انسانی جذبے کا اثر نہیں ہوتا لڑکے تو اس سے ڈرتے ہی تھے لڑکیاں تک اس سے کتراتی تھیں۔

مسعود بہت دنوں تک اسے غور سے دیکھتے رہنے کے بعد اس نتیجے پر پہونچا کہ فریدہ احمد درحقیقت وہ نہیں ہے جو وہ نظر آتی ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ فریدہ نے اپنی شخصیت کے گرد ایک سخت سا خول چڑھا رکھا ہے جس سے ٹکرا کر ہر نظر مجروح ہوتی ہے۔ مگر اس نازک حقیقت تک نہیں پہونچ پاتی۔

وہ ہمیشہ سادے اور اوسط درجے کے لباس میں رہتی مگر کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہوتی کہ وہ دوسروں سے مختلف نظر آئے۔ اس کے لباس کے رنگوں کا امتزاج اسے تمام دوسری لڑکیوں سے مختلف بنا دیتا تھا۔ بال وہ بڑی سادگی سے سنوارتی تھی مگر مانگ ہمیشہ بائیں طرف سے نکالی تھی۔ وہ شاید پھر اس لئے بنی رہتی تھی کہ وہ دوسرے سے مختلف معلوم ہو۔ اپنی انفرادیت کو اجاگر کرنے کا اس کا یہ اپنا انداز تھا۔ سستے فیشن اور بے تکی حرکتوں سے نفرت ہی اس کی اپنی شخصیت کا معیار تھا۔

سکنڈ ایر میں جب بزمی کالج کی لٹریری سوسائٹی کا سکریٹری منتخب ہوا تو اسے بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں سے ملنے کا موقع ملا۔ ہر ہفتے کی میٹنگ کیلئے اسے اکثر پروگرام سٹ کرنے کیلئے لڑکوں لڑکیوں سے کہنا پڑتا۔ کوئی افسانہ پڑھنا چاہتا کوئی غزل، کوئی مقالہ سنانے پر مصر۔ غرض اسے سبکو ہی خوش کرنا تھا، اور یہ بھی خیال رکھنا تھا کہ پروگرام دلچسپ اور مفید ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ لڑکے اس میں دلچسپی لے سکیں۔

افتتاحی تقریب کیلئے مسعود کو چند چیزوں کی ضرورت تھی۔ غزل نظم اور ایک مقالہ اس نے منتخب کر لیا۔ لیکن افسانہ اس کے پاس کوئی اتنا عمدہ نہیں تھا جسے وہ بڑے بڑے ادیبوں پر مشتمل اتنے بڑے جلسے میں پڑھوا سکے۔ وہ چند لڑکیوں سے بات کر رہا تھا۔

"بھئی کوئی عمدہ سا افسانہ دلاؤ" اس نے رضیہ سے کہا۔

"میں نے تو کامن روم میں سب سے کہدیا تھا۔ کوئی جواب ہی نہیں دیتا۔ آپ خود ہی بات کر لیجئے نہ ——" رضیہ نے جواب دیا۔

"یہی پتہ ہوتا کہ کون کون محترمہ اردو ادب پر احسان فرمانے کا ارادہ رکھتی ہیں تو بات ہی کیا تھی۔ میں نے تو اس لئے تم سے کہا تھا کہ تم سب کو جانتی ہو۔"

"دیکھئے وہ فریدہ احمد آرہی ہے اس سے کہئے میرے خیال میں وہ اچھا کچھ لکھتی ہے!"

"نا بابا یہ میرے بس کا کام نہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے" اس نے تفریح کے لہجے میں کہا۔

"نہیں بزمی صاحب وہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ لوگوں نے خواہ مخواہ اس کے متعلق غلط نظریہ قائم کر رکھا ہے۔ وہ بے چاری تو بے انتہا شریف اور خوش اخلاق لڑکی ہے۔"

فریدہ اس تک پہونچ گئی۔

"میں تو ہی تو آ رہی تھی" اس نے کسی قدر گھبراتے ہوئے کہا۔
وہ ٹھہر گئی۔ ایک نظر اسے دیکھا پھر دیوار سے ٹیک کر نظریں زمین پر جما لیں۔
"جی فرمائیے۔۔۔" مسعود نے دوسری بار اس کی آواز سنی۔ وہی پرخلوص بے جھجک اور پیاری سی آواز۔۔۔
وہ اس طرح سمٹ کر کھڑی ہوئی تھی کہ مسعود برقی کو بالکل گڑیا سی لگی۔ اسے اس ادا پر بڑا پیار آیا۔ پھر کچھ ترس سا آنے لگا۔ بیچاری۔
"معاف کیجئے گا۔ بات یہ ہے کہ مجھے لٹریری سوسائٹی کے افتتاحی جلسے کے لئے ایک عمدہ سے افسانے کی ضرورت ہے۔ رضیہ نے ابھی بتایا کہ شاید آپ بھی کچھ لکھتی ہیں، اگر آپ اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکیں تو۔۔۔"
"کس نے کہا کہ میں لکھتی ہوں؟" اس نے چونک کر پوچھا اس کی نظریں اسی طرح زمین پر مرکوز تھیں۔ اور وہ سمٹتے سمٹتے بالکل ہی بچی بن گئی تھی برقی کا دل چاہا کہ وہ اسے گود میں اٹھا کر پیار کرے بالکل اسی طرح جس طرح وہ گلی میں کھیلتی ہوئی کسی بھی اجنبی بچی کو اس کی کسی معصوم سی شرارت پر پیار کر لیتا تھا۔
"قطع نظر اس کے کہ کس نے کہا تھا اگر آپ لکھتی ہیں تو مجھے کوئی افسانہ دیجئے۔ میں چاہتا ہوں کہ جلسے میں بہت ہی عمدہ افسانہ پڑھا جائے تاکہ باہر کے مہمان ادیب کالج کے فنکاروں کے متعلق اچھا اثر لے کر جائیں۔"
"میں تو ویسے ہی لکھ لیتی ہوں۔ لیکن میں جلسے وغیرہ میں پڑھ نہ سکوں گی۔" آخری جملہ اس نے کچھ خشکی سے کہا تھا کہ مسعود برقی نے اور اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا وہ خاموشی سے گرلس کامن روم میں چلی گئی۔
"عجیب سی لڑکی ہے۔۔۔" برقی اس سے زیادہ نہ سوچ سکا۔ مگر فریدہ کی ذات سے اس کی دلچسپی بڑھ گئی۔
تمام سال برقی فریدہ کو پوری دلچسپی اور توجہ سے دیکھتا رہا۔ اور جیسے جیسے وہ فریدہ کے متعلق سوچتا اس کے دل میں فریدہ کی عزت احترام اور وقعت بڑھتی جاتی۔
پھر ایک دن بالکل اتفاقی طور پر وہ فریدہ کے گھر پہونچ گیا، بات یہ ہوئی کہ مسعود کے دوست صدیقی نے بتایا کہ فریدہ احمد اس کے آفس میں ملازم ہے۔ صدیقی نے اس کا پتہ بھی بتایا تھا۔ ایک دن جب مسعود انعام احمد سے ملنے گیا تو اسے خیال آیا کہ اس مکان کا پتہ دیا ہے جو صدیقی نے فریدہ احمد کا بتایا تھا۔ اس نے انعام احمد کو آواز دی تو ایک لڑکا نکلا جس نے بتایا کہ احمد بھائی یہاں رہتے تو نہیں ہاں کبھی کبھی آتے ضرور ہیں اس لئے کہ وہ اس کے چچا زاد یا ماموں زاد بھائی ہیں۔ ویسے وہ اس وقت دکان پر ابا کے پاس بیٹھے ہیں۔"
یہ لڑکا جس کا نام عزیز تھا۔ فریدہ کا بھائی تھا۔ جو چھٹی جماعت میں تعلیم بھی پا رہا تھا اور فرصت کے اوقات میں احمد صاحب کا ہاتھ بھی بٹاتا تھا سامنے احمد صاحب کی دوکان تھی۔۔۔ بہت تھوڑے سے سامان کے ساتھ ایک بہت ہی معمولی سی دکان تھی۔ یہ دکان کسی طرح بھی سات نفوس کے خاندان کا بوجھ برداشت کر سکتی تھی۔
وہ احمد سے مل کر چلا آیا مگر بہت دیر تک اس کا ذہن فریدہ کے مکان، دکان اور گھر کے افراد کے گرد چکر لگاتا رہا۔
اس نے محسوس کیا فریدہ ایک ستون ہے۔ جس کے سہارے ایک خاندان کی عمارت کھڑی ہے۔ اگر اس ستون کو نکال دیا جائے تو شاید یہ عمارت زمین پر آ رہے۔ اس کم عمری میں اس نے اپنے ناتواں کاندھوں پر اتنا بڑا بوجھ سنبھال رکھا ہے: ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ مشکل ہی سے بیس۔ پچیس برس کی ہوگی۔ اور جسم کی کمزور ساخت نے اسے اور بھی بچہ بنا دیا ہے کس قدر بلند حوصلہ ہے وہ۔ اپنے ماحول اور حالات سے کتنی بہادری سے وہ برسرِ پیکار ہے چھوٹے بھائی بہنوں کو پڑھا رہی ہے۔ وہ بے قدری بے مروتی اور اجنبیت کے اس ریگستان میں اپنی انتھک کوششوں سے خلوص پیار اور زندگی کی قدروں کے پھول کھلانا چاہتی ہے۔ کس قدر معصوم ہے وہ۔۔۔

اور جب اس سال نرجی دوبارہ سکریٹری منتخب ہوا تو اسے پھر کچھ لوگوں سے خاص کر ملنا پڑا۔ لڑکیاں یوں بھی کیکی ذیبز میں کم ہی حصہ لیتی ہیں۔ اور خاص کر ادب میں دلچسپی ـــــ جس میں دلچسپی کم اور محنت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن نرجی نے گذشتہ سال کچھ ماحول بنا لیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ ادبی ذوق منظم تحریک کی صورت اختیار کرلے۔ اسے زندگی کی قدروں سے دلچسپی تھی۔ ہر شخص ادیب یا شاعر نہیں بن سکتا۔ لیکن با ذوق ضرور بن سکتا ہے۔ ادب اسے زندگی کے نشیب و فراز اور ٹھوس حقائق سے فرد روشناس کرسکتا ہے۔ ادب اس کے خیال میں انسان کی روح ہے روح جسکے بغیر جسم بیکار رہے ادب زندہ رہنا سکھاتا ہے اور دوسروں کو زندہ رکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔

اسے ایک جوائنٹ سکریٹری کی ضرورت تھی جو لڑکیوں میں کام کرسکے۔ ان کی جھجک دور کرسکے۔ اور لڑکیوں میں یہ کام ایک لڑکی ہی بہتر طریقہ پر انجام دے سکتی تھی۔

لیکایک اسے کتابیں سینے سے لگائے فریدہ چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی ہوئی نظر آئی۔ اور اسے خیال آیا کہ یہ لڑکی اس کام کیلئے بہت موزوں ہے۔

"محترمہ ـــ آپ مجھے چند منٹ وقت دیں گی۔؟" نرجی نے آگے بڑھ کر کہا۔

"جی" وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ کو معلوم ہے ہمارے کالج میں ایک لٹریری سوسائٹی بھی ہے پچھلے سال اس نے کچھ بہتر سی فضا پیدا کرلی تھی اس بار اور زیادہ کام کرنا ہے اور گرلس کامن روم کا کام کوئی لڑکی ہی اچھی طرح کرسکتی ہے۔ جس کے لئے جوائنٹ سکریٹری کی ایک جگہ مخصوص ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں۔ اور اگر آپ کا تعاون مجھے حاصل ہو گیا تو شاید میں اس بار اپنی ذمہ داریوں سے بہتر طریقے پر عہدہ برآ ہوسکوں۔"

"مجھے یوں بھی فرصت کم ملتی ہے اس کے علاوہ اور بہت سی لڑکیاں ہیں جو کامن روم میں زیادہ مقبول ہیں، وہ یہ کام بہتر طریقے پر کرسکتی ہیں۔ میں تو یوں بھی بہت کم لڑکیوں کو جانتی ہوں۔" اس نے بڑی ہی سادگی سے جواب دیا۔

"فریدہ صاحبہ میں نے کچھ سوچ کر ہی آپ سے یہ بات کہی تھی۔ لٹریری سوسائٹی میں صرف وہی لڑکیاں دلچسپی لے سکتی ہیں جو سنجیدہ اور مخلص ہوں۔ مجھے زیادہ آدمیوں کی نہیں بلکہ چند مخلص اور باشعور لوگوں کی ضرورت ہے۔ میں آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھتا ہوں اس لئے میں نے آپ سے یہ بات کہی ہے۔ اور پھر یہ کام آپ کو اکیلے تو نہیں کرنا ہے۔"

"دیکھئے نا ممکن ہے کوئی دوسری لڑکی اس کام کیلئے مجھ سے زیادہ موزوں ہو۔ میں نہیں چاہتی کہ میں اپنے سے بہتر کسی لڑکی کا حق لے لوں۔"

"اب آپ جان چھڑانے کی باتیں کر رہی ہیں۔ ورنہ میں نے پہلے ہی اس موضوع پر سوچ لیا ہے مجھے یقین ہے کہ میرا انتخاب غلط نہیں ہوسکتا۔"

اس بات پر وہ ہلکے سے مسکرائی ـــ بہت ہی محتاط اور پیارا تبسم، نرجی نے پہلی بار اس کا تبسم دیکھا تھا۔ اور اسے یہ معلوم کرکے بےحد مسرت ہوئی کہ وہ مسکرانا بھی جانتی ہے۔ اور اس کے تبسم میں خلوص کے ساتھ احتیاط بھی ہو جیسے وہ اس کی قیمت سے واقف ہو۔ جیسے وہ اسے عام نہ کرنا چاہتی ہو ـــ

نرجی نے پھر کہا۔

سوسائٹی کو زیادہ سوشل اور الٹرا ماڈرن لڑکیوں کی ضرورت نہیں بلکہ ایسی لڑکیوں اور لڑکوں کی ضرورت ہے جن میں لکھنے کی صلاحیت ہو اور اچھے ادب کو سمجھنے کی قابلیت بھی۔ میں نے یہ اندازہ کیا ہے کہ آپ کچھ نہ کچھ لکھتی ضرور ہیں۔ اور مجھے یقین سا ہے کہ آپ جو کچھ بھی لکھتی ہوں گی وہ یقیناً بہتوں سے بہتر ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کی عظمت پسند طبیعت نے کبھی اسے ابھرنے نہ دیا۔

بہرحال یہ آپ کا خلوص ہے کہ آپ اس طرح سوچتے ہیں۔ میں لکھتی ضرور ہوں مگر کبھی کسی کو دکھاتے نہیں بڑھتے یا چھپنے کو

[illegible]

"بڑی خوشی سے آپ کا ہاتھ بٹاؤں گی خاص کر اس صورت میں جبکہ آج پہلی بار میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ یہ [illegible] برا بھی نہیں
جتنا سمجھا جاتا ہے"۔ اس نے جھجکتے ہوئے مترنم لہجہ میں کہا ـــــ

چند روز بعد فریدہ نے برجی کو اپنے افسانوں اور مضامین کی کاپی دی۔
"انہیں دیکھ لیجیے گا ـــ لیکن اس کا خیال رکھیے گا کہ یہ ایک نومشق کے لکھے ہوئے ہیں ـــ اور یہ کاپی کسی اور کو نہ دکھائیے گا"۔ اس نے
بہت ہی عام سے خشک لہجے میں کہا۔

"آپ مطمئن رہیں۔ آپ ہمیشہ مجھے ایک مخلص اور معتبر آدمی پائیں گی"۔
برجی نے تمام کاپی پڑھ ڈالی۔ ان پر پڑی ہوئی تاریخوں کے مطابق وہ دو سال پہلے کے لکھے ہوئے افسانے اور مضامین تھے۔ لیکن پھر بھی وہ
اچھے خاصے تھے۔

اس کاپی پر ایک جگہ انعام احمد کا ریمارک تھا جو بہت ہی ہمت شکن تھا اور شاید اسی سبب سے فریدہ نے اس دو سال میں کچھ نہ لکھا تھا۔
برجی نے ایک دن اس سے کہا۔
"فریدہ میں نے آپ کی کاپی دیکھی۔ اور آپ یقین کیجیے کہ مجھے حیرت ہوئی کہ آپ اس قدر اچھا لکھتی ہیں پھر بھی آپ اب تک خاموش کیسے
رہیں!۔ اور آپ نے گذشتہ دو سال کچھ نہ لکھ کر خود پر ظلم کیا ہے۔؟"
"آپ نے انعام بھائی کا ریمارک تو دیکھا ہی ہوگا۔ اس کے بعد میں کچھ لکھنے کی جرأت نہ کر سکی"۔
اس نے کچھ بے تکلفی کے سے انداز سے کہا۔
"ان کا ریمارک چھوڑیے ان کا ریمارک ایک معصومانہ ظلم کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر لکھتی رہیں تو بہت جلد اپنا ایک مقام بنالیں گی"۔
فریدہ کے ہونٹوں پر ایک شیریں سا تبسم کھیل گیا۔ اس نے شاید پہلی مرتبہ برجی کو غور سے دیکھا۔ اور غیر ارادی طور پر اس کی گہری آنکھوں میں
ڈوب گئی۔ جیسے اس کی آنکھوں کی گہرائی میں اس کی گفتگو کا خلوص ڈھونڈ رہی ہو پھر فوراً ہی اس کے چہرے سے تبسم کا نور غائب ہوگیا اور
اس کی جگہ زبردستی کی سنجیدگی نے لے لی جو اسے پتھر کا بت بنا دیتی تھی۔
"اتفاق سے ایک بات یاد آگئی"۔ آپ کے افسانوں میں ایک خامی بہت اہم ہے وہ یہ کہ آپ کے افسانوں کے تمام کردار آپ ہی کی طرح اپنی حقیقت
چھپاتے ہیں۔ تمام کردار اپنے حقیقی روپ میں اس طرح آنے چاہئیں کہ وہ اپنے اردگرد کے کردار معلوم ہوں ـــ" مسعود نے فریدہ کے چہرے کو غور سے
دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی سنجیدگی کچھ گہری ہوگئی۔ اسی وقت اوپر سے اسے کنکریاں آ کر لگیں۔ اس نے ادھر ادھر ناگواری کے انداز میں دیکھا۔
"اوپر سے آپ کی سہیلیاں کرم فرما رہی ہیں"۔ مسعود نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کے انداز میں کہا۔
"یہ کیا بدتمیزی ہے؟!"
"یہ بدتمیزی بالکل فطری ہے اس لیے کہ وہ آپ کی سہیلیاں ہیں اور آپ سے بے تکلف ہیں۔ لیکن اگر یہی حرکت کوئی [illegible] کرتا تو آپ
[illegible] مجھے [illegible] سمجھتیں"۔

"میں تو ہاتھ جھاڑ دیتی [illegible]"۔ اس نے بڑی [illegible] سے کہا۔
[illegible]

[illegible]

[illegible]

"بہر حال مجھے پاگل کتے نے تو کاٹا نہیں ہے کہ بلا وجہ سب کو جھاڑتی پھروں" اس نے اپنی صفائی پیش کرنے کے سے انداز میں کہا۔
"خیر آپ مجھے نہ سمجھائیں۔ میں نے دو سال آپ کا مطالعہ کیا ہے اور یہ نظریہ میں نے بہت پہلے قائم کر لیا تھا کہ وہ نہیں ہیں جو بظاہر نظر آتی ہیں۔ آپ مجھے معترف ہے کہ جو نظریہ دو سال پہلے قائم کیا تھا۔ اور جو آپ کے متعلق دوسرے تمام لوگوں کے نظریات سے مختلف تھا۔ وہ صحیح ثابت ہوا"

"دوسروں کا کیا نظریہ تھا" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔
"یہی کہ تم بے حد مغرور، خود سر اور بدتمیز لڑکی ہو" مسعود نے پوری سنجیدگی سے کہا۔ اس جملہ پر وہ باقاعدگی سے جھینپ گئی۔
"ایک دن بزمی نے اس سے پوچھا۔ کہ وہ بی اے کر کے کیا کرے گی تو اس نے بتایا کہ گھر والوں کی منشاء ہے کہ بی اے پاس کر کے ٹیچنگ لائن اختیار کروں۔ مگر میں خود ایم اے بلکہ پی ایچ ڈی کرنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں جس قدر بھی علم حاصل کر سکوں کر لوں۔ بزمی کو یہ سن کر بے حد مسرت ہوئی اس لئے کہ وہ بھی بالکل اسی طرح سوچتا تھا اس کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آئی کہ کسی ایک مضمون میں ایم اے کر کے کوئی شخص اپنے علم کی پیاس کیوں کر بجھا سکتا ہے۔ اور خود کو پڑھا لکھا آدمی کیسے کہہ سکتا ہے۔
"بہر حال علم کی تو کوئی حد ہی نہیں ایک شخص کی زندگی کیا ایک پوری نسل بھی ختم ہو جائے مگر علم کے بے کراں سمندر کا کنارا نہیں ملیگا۔ مگر اس قطع نظر ہم کو اس دنیا میں زندہ بھی رہنا ہے اور زندہ رہنے کیلئے علم کی تجارت بھی کرنی پڑتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ بی اے کر کے سپیریر سروسز Superior Services کے امتحانات میں بیٹھ جائیں۔ کامیاب ہو جانے پر کم از کم آپ کا مستقبل بالکل محفوظ ہو جائیگا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ بی اے کر کے خوش گوار اور مثالی زندگی گذاریں"
"اچھا آپ نے یہ کب سے سوچنا شروع کر دیا" فریدہ نے خشک مگر ہلکے سے شرارت بھرے لہجے میں پوچھا۔
بزمی گھبرا سا گیا یہ بالکل غیر متوقع سوال تھا۔ اور پھر فریدہ سے وہ بہت اچھی طرح واقف تھا۔ وہ کسی قیمت پر بھی اس کی ناراضگی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سنبھل کر جواب دیا۔
"اگر آپ مجھے پہلے ملی ہوتیں تو یہی بات میں پہلے بھی کہتا۔ میں کم سے کم اپنے دوستوں کو ایک اچھی اور آزاد زندگی کا مالک دیکھنا چاہتا ہوں، میں نے یہ بات اپنے دل کی گہرائیوں سے کہی ہے آپ اس کا کوئی غلط مفہوم اخذ کرنے یا ناراض ہونے کی کوشش نہ کریں"
"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ لوگوں نے تو واقعی جیسے ہوّا سمجھ رکھا ہے" نہ اس کے شکایت کے لہجے میں کہا۔
"خیر میں نے آپ کو ہوّا تو نہیں مگر ہوّا کی بیٹی ضرور سمجھ رکھا ہے۔ ویسے جو آپکو ہوّا سمجھتے ہیں وہ قطعی غلط سمجھتے ہیں" وہ مسکرائی جیسے اسے سکون ملا ہو۔
پھر [illegible] مسعود نے فریدہ کو بتایا کہ وہ جلدی ہی سدھم جا رہا ہے۔ اسے ایک کلمہ موقع مل گیا تھا اور وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔
فریدہ نے اس کا کوئی خاص جواب نہ دیا۔ وہ بالکل خاموش رہی جیسے یہ بات اس سے کہی ہی نہ گئی ہو۔ بزمی کو بڑی الجھن ہوئی۔ فریدہ نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔ یہ صرف غیر فطری تھا بلکہ بزمی کے لئے تکلیف دہ بھی تھا۔ وہ فریدہ سے اس جملے میں بہر حال کچھ نہ کچھ سننا چاہتا تھا۔ اس سے قطع نظر کہ فریدہ اس سے خاصی بے تکلف ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اس سے اس طرح خلوص اور احترام [illegible] کسی [illegible] میں جتلا ہو جانا ضروری تھا۔ لیکن فریدہ نے کبھی کوئی ایسی بات نہ کہی جو اس کے اپنے جذبات کی وضاحت کر سکے۔ [illegible]

"ہاں فریدہ میں کسٹم چیکنگ کے لئے جا رہا تھا۔ اور اس کے بعد کسی سے نہ مل سکتا۔ مجھے اس کا بے حد افسوس ہوتا کہ چلتے وقت تم سے ملاقات نہ ہو سکی۔"

پھر وہ دونوں ٹہلتے ہوئے ایک کنارے چلے گئے۔

فریدہ کے چہرے پر اداسی بکھری ہوئی تھی۔ وہ کچھ مضمحل سی تھی۔ جیسے اس کی طبیعت ٹھیک نہ ہو۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" برجی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"مجھے کچھ نہیں ہوا میں بالکل اچھی ہوں۔" اس نے اس طرح گھبرا کر کہا۔ جیسے وہ چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو اور اپنی صفائی پیش کر رہی ہو۔

"فریدہ۔۔۔ بہت سی باتیں انسان کہنا چاہتے ہوئے بھی نہیں کہہ پاتا۔ اور شاید ان کا کہنے سے زیادہ سمجھنے سے تعلق ہوتا ہے۔ مگر ایک بات ضرور ہے کہ باوجود یکہ میں روم جا رہا ہوں۔۔۔ اور آج کل کسی بھی نوجوان کی سب سے بڑی خواہش کوئی بیرونی ملک گھوم لینا ہوتی ہے۔ میرا دل اداس ہے جیسے میرا دل کراچی چھوڑنے کو نہ چاہ رہا ہو۔ اس کراچی کو جس نے مجھے ہمیشہ غم و اندوہ کے کانٹے ہی دیئے ہیں کبھی اچھا خوشی کا کوئی پھول۔۔۔"

"برجی صاحب سفر کے وقت سنجیدہ نہیں ہوا کرتے۔ آپ دل چھوٹا نہ کیجئے۔ خدا نے چاہا تو آپ اپنے مقصد میں کامیاب لوٹیں گے۔ پھر یہی کراچی آپ کو مسرتوں اور شادمانیوں کے پھول بھی دے گی۔ جس نے اب تک آپ کو کانٹے دیئے ہیں۔۔۔" اس نے مسعود کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"فریدہ وقت بہت کم ہے جہاز اڑنے کو تیار ہے۔ اور میرا دل تم سے بہت ہی باتیں کرنا چاہتا ہے بہرحال اس کا خیال رکھنا کہ مجھے روم میں بھی تمہاری یاد آئے گی تمہاری کمی محسوس ہو گی۔۔۔ اور تمہارے چند الفاظ میرے لئے بہت قیمتی ہوں گے۔ کتنے دنوں بعد ایک مخلص ساتھی ملا تھا۔ لیکن افسوس۔۔۔"

یکایک کسٹم آفیسر کی پکار نے اس کی گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

"اچھا فریدہ خدا حافظ۔ کبھی کبھی یاد کر لینا۔" اس نے حسرت بھری بھرپور نظر سے اسے دیکھا۔ اور بھاگ کر کسٹم آفس میں گھس گیا۔

چیکنگ کے بعد جب وہ ایئرپورٹ پر جہاز کے پاس پہونچا تو یہ دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی کہ فریدہ جہاز کی سیڑھیوں سے ٹیک لگائے اس کا انتظار کر رہی ہے۔

"ارے تم یہاں کیسے آ گئیں۔۔۔ یہاں تو پبلک کو آنے کی اجازت نہیں۔"

برجی نے پرمسرت لہجے میں پوچھا۔

"یہاں کسٹم میں ایک جاننے والے مل گئے تھے۔"

یکایک ہوسٹس نے مسعود کو بتایا کہ پلین کے فلائی کرنے کا وقت ہو گیا ہے۔

"اچھا فریدہ اب اجازت دو۔ دیکھو بھول نہ جانا کبھی کبھی یاد کر لینا۔"

"آپ روم کی رنگا رنگیوں میں کراچی کو فراموش نہ کر دیں مجھے تو اس کا خطرہ ہے۔" فریدہ نے اداس سے لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھیں نم ہو چلی تھیں جیسے وہ اب رو دے گی۔

"نہیں فریدہ تم ہمیشہ مجھے ایسا ہی پاؤ گی جیسا میں اب ہوں۔"

"خط لکھتے رہئے گا۔ مجھے انتظار رہے گا۔"

برجی نے اسے حیرت سے دیکھا اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

پلین پرواز کے لئے جونہی تیار تھا مسعود نے اپنی دوربین سے دیکھا فریدہ ایئر ڈروم کے مضبوط فرش پر پسینے میں شرابور کھڑی ہیں۔ [illegible] اور ادھر سے مسعود کو یوں لگا کہ وہ بالکل موم کی گڑیا کی طرح جون کی سخت دھوپ سے پگھل رہی تھی۔ ✦

[illegible]

[illegible] حسین ناز

اوپری منزل

[illegible] "ایورگرین" ہوٹل میں گھس گیا - رات کے نو بج رہے تھے اس لئے ہوٹل میں ابھی خاصی گہما گہمی تھی - یہ شہر بھر میں صرف ایک ہی [illegible] جہاں ہر طبقہ کے لوگ اُترتے تھے کیونکہ یہاں ہر طبقہ کی تفریح کا معقول انتظام تھا - ہوٹل تین منزلوں پر مشتمل تھا - اوپری منزل ان لوگوں کے لئے مخصوص تھی جن کے لئے زندگی چھلکتا ہوا ساغر تھی یا رقص کرتی ہوئی مدہوش حسینہ - دوسری منزل اس سب سے زیادہ قابل رحم طبقے کا سہارا تھی جسے [illegible] متوسط طبقہ کہتے ہیں جو اعلیٰ اور ادنیٰ نام کی چکی کے دو طبقاتی پاٹ میں ہمیشہ پستا رہتا ہے - نچلی منزل اس طبقہ کے لئے مخصوص تھی جس کی عیاشی کی [illegible] پیسہ والی سگریٹ کی چائے سے شروع ہو کر دیسی شراب کے ایک آدھ ادھے پر ختم ہو جاتی تھی۔

[illegible] داخل ہوتے ہی اس نے گھبرائی ہوئی نظریں چاروں طرف دوڑائیں - بوڑھے، جوان، نحیف، طاقتور ہر قسم کے لوگوں سے ہال بھرا [illegible] ایک کرسی خالی مل ہی گئی - وہ تیز تیز چلتا ہوا آیا - کرسی کھینچی اور زور سے بیٹھ گیا - پتلون کی جیب سے اس نے رومال نکال کر پسینہ اور بارش کے ان قطروں کو صاف کیا جنھوں نے اس کا چہرہ بالکل تر کر دیا تھا - اس نے میز سے اخبار اٹھایا اور یونہی بے مقصد پڑھنے میں مشغول ہو گیا - - - - -
اس کی نظریں اخبار پر تھیں لیکن دماغ کہیں اور - - - - - -

"چائے لاؤں بابو جی - - - - - - - یا - - - - - " بیرے کی آواز سن کر وہ چونک سا پڑا اس سے پہلے کہ بیرا اپنا جملہ پورا کرے وہ [illegible] بول اٹھا۔

"ارے بھائی آتے ہی کیا سر پہ سوار ہو جاتے ہو - خدا لگتی دو گھڑی سستانے تو دیا کرو۔"

"لیکن بابو جی ایک آپ ہی تو نہیں ہیں" یہ بیرے کی آواز تھی۔

"چائے لے آؤ" آخر اس نے زچ ہو کر کہہ ہی دیا -

وہ پھر اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گیا - اس وقت وہ واقعی پڑھ رہا تھا - اس کی نظریں ایک اشتہار پر جم کر رہ گئیں۔

"میٹرک پاس نوجوانوں کی ضرورت ہے - کام صرف لکھائی پڑھائی سے متعلق ہے - انگریزی بولنے والوں کو ترجیح دی جائیگی - معلومات نمبر ۲۲۰۱ سے کی جائے۔"

اس کا دماغ پھر خیالی دنیا میں پرواز کرنے لگا - وہ سوچ رہا تھا - کتنی آرزوؤں کتنی امیدوں کے ساتھ وہ وہاں گیا تھا - کتنی محنت کی تھی اس نے [illegible] امتحان کے لئے - نتیجہ کیا نکلا - صفر -

"چائے بابو جی -" بیرے کی آواز نے اس کے خیالات کا تسلسل توڑ ڈالا اس نے چائے کی پیالی کی طرف کھینچی - جیب سے پانچ پانچ کے دو آخری نوٹ نکالے - ان کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا - تھوڑی دیر تک دیکھتا رہا - پھر جیب میں رکھ لئے - چائے ٹھنڈی ہو رہی تھی - وہ اس کی [illegible] تقریباً بھول ہی چکا تھا - کیونکہ در حقیقت اس کا مقصد چائے پینا نہیں، بلکہ وقت گزارنا تھا۔

بارش اب بھی ہو رہی تھی - بلکہ پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی تھی - وہ وہاں اس وقت تک رکنا چاہتا تھا جب تک کہ بارش ختم نہ ہو جائے [illegible] اسے [illegible] کے خراب ہونے کا خوف تھا جو وہ آج ہی اپنے ایک دوست سے لے کر امتحان دینے گیا تھا - اگر اس کے پاس صرف ایک سوٹ ہی ہوتا

تو آج کسی کا احسان تو نہیں اٹھانا پڑتا۔ احسان بھی اٹھاؤ اور یہ ڈر بھی کہ کہیں خراب نہ ہو جائے عجیب مصیبت ہے۔ اسے ایسے ہی نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ چائے پینے کا ہے کہ برتن لے جاؤں۔ بیرے کو اپنے قریب کھڑا دیکھ کر اس نے چائے کی پیالی اٹھائی اور ایک ہی سانس میں ٹھنڈی چائے کی پوری پیالی ختم کر گیا۔ کچھ پیسے دینے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا باہر جانے لگا۔ لیکن بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ وہ ہوٹل کے برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔ ٹھنڈی ہوا۔ بارش اور پھر رات کا وقت۔ کچھ عجیب سا موسم ہو رہا تھا۔ وہ برآمدے میں کھڑا ہوا اپنے ماضی حال اور مستقبل کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس کے دماغ میں خیالات کا جھکڑ سا چلنے لگا۔ پے در پے ناکامیوں کا احساس اسے بری طرح پریشان کر رہا تھا۔

میٹرک پاس کرتے ہی اسے نوکری کی فکر ہوئی کیونکہ بوڑھی ماں، چھوٹی بہن سب ہی خوش تھے۔ اس لئے کہ اس کے نوکر ہونے پر ہی ان کی تمام چھوٹی بڑی معصوم تمناؤں کی تکمیل کا انحصار تھا۔ اور جب وہ میٹرک پاس کر چکا تو صرف نوکری کی ہی وجہ سے اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ کیونکہ تعلیم کے لئے پیسہ کی ضرورت تھی اور پیسہ کے لئے نوکری کی۔ چھ سال کی مسلسل کوشش کے باوجود اس کو نوکری نہ مل سکی۔ کراچی کی بڑی بڑی سڑکیں اس نے چھان ناپ ڈالیں۔ ہر آفس میں جہاں ملازمت ملنے کی امید ہو سکتی تھی درخواستیں دیں۔ بے ناغہ اخبار پڑھتا۔ صرف ملازمت کے خیال سے۔ اور جب سرکاری دفاتر کی ملازمت کی طرف سے نا امید ہو گیا تو اس نے پرائیویٹ فرمز اور فیکٹریز میں کوشش شروع کر دی۔ ملازمت سے متعلق ہر اشتہار کو دیکھنا۔ کپڑے نہ ہونے کی وجہ سے دوسروں کا احسان لیتا اور انٹرویو کے لئے جاتا۔ لیکن ہمیشہ ناکام آتا۔

وہ برآمدے میں کھڑا اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس کے خیالات کی رو طویل سے طویل تر ہوتی گئی۔ اس نے ماضی کی طرف دیکھا وہاں تاریکی تھی۔ لیکن اس تاریکی میں اس کو ایک ہلکی سی روشنی نظر آئی شاید یہ حال کے بہتر ہونے کی نشانی تھی۔ لیکن کہاں گئی وہ روشنی۔ حال تو ماضی سے بھی زیادہ تاریک نظر آتا ہے۔ اور اگر یہی حالت رہی تو مستقبل بہت ہی بھیانک ہوگا۔ بھیانک۔ اف۔ کس قدر بھیانک ہے یہ لفظ۔ اور پھر اس کے خیالات نے ایک کروٹ لی۔ اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر پیشانی کی طرف اٹھ گیا۔ اتنی ٹھنڈی ہوا کے باوجود اس کی پیشانی پر پسینے کے بے شمار ننھے ننھے قطرے موجود تھے اس نے پسینہ صاف کیا۔ اور سڑک پر بھاگتے ہوئے کو اس وقت تک دیکھتا رہا۔ جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا اس نے اپنے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈالے پانچ پانچ کے دو نوٹوں کے لمس سے اس کی انگلیاں جیب ہی میں تھرتھرا کر رہ گئیں۔ اس نے ایک ہاتھ نکال کر پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو درست کیا۔ اور پھر اس کے خیالات ان جانی راہوں پر بھٹکنے لگے۔ آج کیسے گھر جاؤں گا۔ کس منہ سے ماں سے کہوں گا کہ میں امتحان میں فیل کر دیا گیا۔ اس لئے کہ میرے پاس پچاس روپے ان کی جیب گرم کرنے کو نہیں تھے۔ میرا ایسا لگا ہوا سوٹ اتنا شاندار نہیں تھا جتنا کہ ہونا چاہئے تھا۔

وہ نو بجے ہوٹل میں آیا تھا۔ اس وقت ساڑھے دس بج رہے تھے۔ اس ڈیڑھ گھنٹہ میں اس نے نہ جانے کیا کچھ سوچ ڈالا۔ ماضی، حال، مستقبل اسے تو وقت کی ان تینوں منزلوں میں اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔

ایک کار تیزی سے آئی۔ اور ہوٹل کے سامنے پہنچ کر اتنی زور سے بریک لگایا گیا کہ اس کے خیالات کا شیشہ چکنا چور ہو گیا۔ ایک حسین اور نازک سی لڑکی [illegible] کار سے اتری۔ اس نے کچھ بیزاری سے ایک کتابی ہوئی انگڑائی لی۔ پھر یکایک اس کی نظر اس پر پڑی۔ اس نے ایک بار اس کو اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھا پھر ہلکے سے مسکرائی۔ دوسری منزل کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے وہ ایک بار پھر مڑ کر اسی طرح مسکرائی اور پھر ادب سے [illegible] کو جھٹکے سے پھینک کر سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔

بارش آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے خیالات کی رو بھی سست ہوتی جا رہی تھی [illegible] اس کی نگاہیں خلاؤں میں بھٹک رہی تھیں۔ لیکن اس کا ذہن اس کے دل کی طرح ویران ہو چکا تھا۔ یکایک ایک [illegible] وہ چونک گیا۔ [illegible] کے قدم بے اختیار دوسری منزل کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

غلام جیلانی

اونچی دیواریں

اوپر آسمان میں تارے آنکھیں جھپکا رہے تھے اور نیچے پانی کی سطح پر ہوائیں انگڑائیاں لے رہی تھیں۔

"اور پھر" ؟ چٹان پر ایک جانب جھکتے ہوئے ہیرا نے پوچھا۔

"اور پھر وہ مسلسل دو گھنٹے تک گھومتی رہی ..... میری رکشا میں۔" کریم تاروں سے آنکھیں ملائے چپ چاپ لیٹا تھا۔

"اچھا — !"

"ہاں۔ اور اس نے مجھ سے بہت سی باتیں بھی پوچھیں۔"

"اچھا — !"

"ہاں۔ میں کہاں رہتا ہوں۔ روزانہ کتنا کما لیتا ہوں۔ مجھے ....."

"یہی سب پوچھا اس نے ؟" ہیرا اپنے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔

"اور یہ بھی کہ میں رکشا کیوں چلاتا ہوں ؟"

"یعنی — ؟"

"یعنی میں کوئی اور کام کیوں نہیں کرتا ؟"

"کیوں ؟"

"کیوں کہ اس طرح آدمی کے پھیپھڑے خراب ہو جاتے ہیں۔ میں کوئی اور کام کروں تو ....."

"یہ سب کہا اس نے !"

"اسے کہہ تو دیا ایک مرتبہ کہ ہاں ....." اور کریم مڑ کر ننھی ننھی موجوں پر چمکنے والی چاندنی کرنوں کو دیکھنے لگا۔ ہیرا نے اس کی طرف ایک سگریٹ بڑھا دیا۔ دیا سلائی کی روشنی میں کریم کا چہرہ دمک اٹھا اور ہیرا کو محسوس ہوا جیسے کریم کے سارے جسم میں کپکپی سی دوڑ رہی ہو۔ غصہ یا نفرت کے علاوہ آدمی جوش مسرت سے بھی تو کانپنے لگتا ہے ..... اور کریم اس بات پر بہت خوش تھا۔

سامنے تالاب کے کنارے کہیں دور کسی گھر میں ریڈیو بج رہا تھا۔ موسیقی کی لہریں پانی کی لہروں کے ساتھ بدمست کھیل رہی تھیں۔ [illegible] ریلوے اسٹیشن کی روشنیوں کے عکس پانی کی بے چین موجوں میں ناچ رہے تھے۔ چاند کو بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔ ایک چھوٹا سا [illegible] بادل بھی بن گیا تھا۔ جیسے بجلی کے بلب کو رنگین دوپٹے سے ڈھک دیا گیا ہو۔ ہیرا دیر سے چٹان [illegible] سا لیٹا تھا۔ ہیرا یکبارگی جھٹک کر اٹھ بیٹھا اور کریم پر ایک نظر ڈالی [illegible] ..... سودا ٹھیک ہے۔" ہیرا نے کہا اور کریم اپنے خیالات کے [illegible]

[illegible] اپنی ناک کو انگلیوں سے رگڑ ڈالا۔ اور ساتھ ہی پھر ایک مرتبہ اس کے دماغ میں مختلف قسم کے کھانوں کی خوشبوئیں پھیل گئیں۔ جو وہ اور ہیرا نے تھوڑی دیر پہلے ایرانی ہوٹل میں کھائے تھے۔ اور جس کے بعد ایک ایک معطر پان اور ایک پیکٹ چاپ سگریٹ کی ڈبیہ بھی منگالی گئی تھی۔ اور جن سب کا بل ساڑھے تین روپے کریم نے ادا کیا تھا۔۔۔۔۔ کیوں کہ وہ آج بہت خوش تھا۔ اور کھانے کے بعد وہ ہیرا کو اپنی رکشا میں بٹھا کر یہاں جھیل کے کنارے کھینچ لایا تھا۔ رکشا پاس ہی چھوڑ کر دونوں پانی کو چھوتی ہوئی ایک چٹان پر آ بیٹھے اور پھر کریم نے بہت سی باتیں اپنی اس "نیلی ساڑھی" والی کے بارے میں سنائیں جس کو وہ اپنی رکشا میں لئے دو گھنٹے تک گھومتا رہا تھا۔ جس کو وہ روز صبح گھر سے کالج اور شام کو کالج سے گھر لے جاتا تھا۔ جس کے رسیلے ہونٹوں کے خم یوں لرزا کرتے تھے جیسے تالاب کی ننھی ننھی موجوں کی گود میں چاند کی کرنیں اور جس کی دراز نوکیلی پلکیں آنکھوں کے شفاف جھیلوں پر یوں جھک جایا کرتی تھیں۔ جیسے تیز ہوا میں تالاب کے کنارے نرسل اور کنول کے پودے اور جس کی آواز یوں لگتی جیسے تاروں کی چھاؤں میں تالاب کے دوسرے کنارے کہیں دور کسی گھر میں ریڈیو بج رہا ہو۔۔۔۔۔۔

اس دن وہ کچھ اداس اور پریشان سی تھی۔ کالج سے گھر آکر جلد ہی خلاف معمول وہ پھر کریم کی رکشا میں باہر نکل گئی۔ کریم یوں بھی جذباتی واقع ہوا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ حالانکہ ہر روز بیسیوں حسین لڑکیاں اس کی "خوش رفتار" میں بیٹھتی تھیں۔ لیکن ان میں سے کسی کے لئے اس کا دل ایسے نہ دھڑکتا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر اس کی طرف یوں دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ "کہاں چلنا ہے؟"۔۔۔ اور اس نے ایک سڑک کی طرف اشارہ کر دیا۔ اور رکشا چلتی رہی۔۔۔۔ چلتی رہی۔ حتیٰ کہ بارونق سڑکیں اور اونچے اونچے مکان ختم ہو گئے ان کی جگہ دھان کے سبز مخملی کھیت آ گئے۔ جن کے درمیان سے ندی بہہ رہی تھی۔ وہاں وہ ذرا سی دیر کے لئے اتر پڑی۔ وہیں اس نے کریم سے ادھر ادھر کی باتیں بھی کیں۔ اور یہی باتیں جو کریم کی زندگی کا قیمتی اور مقدس سرمایہ بن کر اس کے احساسات پر چھا گئی تھیں۔۔۔ اور جب رکشا واپس شہر کی طرف مڑنے لگا تو شفق بادلوں کے آخری کناروں سے رخصت ہو رہی تھی۔ اور دور آسمان کی اونچائیوں میں مرغابیوں کا ایک غول ڈوب گیا تھا — اس دن کریم نے اسے جی بھر کر دیکھا تھا۔ اس سے باتیں بھی کی تھیں۔ اور اسی لئے وہ اس قدر خوش تھا۔

۔۔۔۔۔ اور جب سردی کافی بڑھ گئی تو دونوں دوست واپس ہو گئے۔ ہیرا ایک نیوز پیپر ایجنسی میں اخبار تقسیم کرنے پر ملازم تھا۔ اور کریم رکشا چلاتا تھا۔ دونوں گلاب خان کی گلی میں ایک ہی کوٹھری میں رہتے تھے۔ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ان کی دوستی کب اور کیسے شروع ہوئی۔ مگر سب جانتے تھے کہ ان کی دوستی خلوص اور محبت کی ان سرحدوں میں داخل ہو چکی تھی۔ جہاں ایک کا غم دوسرے کا غم اور ایک کی خوشی دوسرے کی خوشی ہوتی ہے۔ ہیرا سنجیدہ مزاج اور سوجھ بوجھ کا آدمی تھا لیکن کریم بہت ہی جذباتی اور حساس طبیعت کا مالک تھا۔ ہر چیز میں نفاست اور حسن کا قائل! اپنی رکشا "خوش رفتار" کو اس نے دلہن بنا رکھا تھا۔ اور پھر "نیلی ساڑھی" والی لڑکی تو اسے اتنی بھائی کہ اس نے رکشا کا رنگ بھی نیلا ہی رنگوا دیا۔

اور یوں رفتہ رفتہ اس کے دل و دماغ پر قابض ہو گئی۔ دن بھر میں وہ بس تھوڑی سی دیر اسے دیکھ سکتا تھا۔ مگر پھر بھی اس کے خدوخال کی ایک ایک تفصیل اسے معلوم تھی۔ وہ اس کا گھر کا رکشا والا بن گیا تھا۔ روز صبح وہ کالج جانے کے لئے اس کی رکشا میں بیٹھتی تو کریم کو محسوس ہوتا جیسے اس کی رکشا لکڑی کی نہیں، سونے چاندی کی بنی ہے! سارے راستے ایسے احتیاط سے سنبھل کر لیجاتا جیسے ایک ذرا سا دھچکا اسے ناراض کر دے گا۔ اور جب وہ کالج میں اتر جاتی تو اس وقت سے شام کے چار بجے کا انتظار کرتا رہتا۔۔۔ کریم کی زندگی میں یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ ایک نیا احساس، ایک نیا لطف! وہ اپنے آپ کو دوسرے رکشا والوں سے [illegible] کی سواری کی خاطر کالج کو ذرا بھی برداشت نہ کرتا تھا۔ اور پھر کسی کی سواری کرنے سے پہلے اسے اپنی [illegible]

وہ اس قابل ہے بھی یا نہیں! . . . . . . اس کے اندر ایک سنئے کریم نے کروٹ لی تھی۔ اس لڑکی کا خیال اسے ہر وقت لگا رہتا۔ اب دن بھر رکشا کھینچتے رہنے کے باوجود وہ پہلی سی تھکن محسوس نہ کرنے پاتا!

(۲)

اس پر جگہ جگہ لوگ بیٹھے یا لیٹے تھے۔ اور جہاں لوگ نہیں تھے۔ وہاں گھانس کے اندر پانی چمک رہا تھا جو غروب آفتاب کی سرخی پا کر شفق آلود ہو گیا تھا۔ اور جہاں پانی نہیں تھا وہاں اب دہی بڑے، کباب اور آلو کی چاٹ میں نتھڑے کاغذ کے ٹکڑے پڑے تھے۔ بیچ میں حوض کے کنارے بہت سی لڑکیاں اور بچے جمع تھے ایک کونے سے سرکاری ریڈیو کا بڑا سا لاؤڈ اسپیکر کسی گیت کی تانیں ہوا میں بکھیر رہا تھا۔ اور لان کے ایک کونے میں بیٹھے کریم اور ہیرا چینہ کھا رہے تھے۔ کریم کسی سوچ میں تھا۔

"میری مانے تو تو یہ رکشا وکشا چھوڑ اور شاعری شروع کر دے . . . . شاعر بن جا" ہیرا بولا۔

"کیوں ـــ؟" اور کریم ہنس پڑا . . . . "مگر پیٹ کیسے بھرے؟"

"تجھے پیٹ کی فکر کب ہے؟ . . . . . تیرے ڈھنگ کمانے کے تھوڑی ہیں؟"

"سچ ہیرا . . . . . اب تجھے کیسے سمجھاؤں! آج جب وہ نیلی ساڑھی پہنے میری "نیلی خوش رفتار" میں بیٹھی کالج جا رہی تھی تو سڑک پر ہر شخص ادھر ہی کو دیکھ رہا تھا۔"

"ضرور دیکھ رہا ہوگا۔" ہیرا کے لہجے کا طنز بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

"راستے میں اس نے پوچھا بھی!" کریم اپنی دھن میں تھا۔

"ہوں! . . . . . . کیا؟"

"اسے نیلا کیوں رنگوا دیا؟"

"ہیرا نے پوچھا۔

"رنگ ہے . . . . . اور کیوں کہ اسے . . . . . . اسے میں بہت پسند کرتا ہوں . . ."

اتھا" اور سنا ہیرا؟ ـــ اس کا نام کرن ہے"

"کنارے بیٹھی ہوئی لڑکیوں کے

[illegible] میری بات مانی بھی پڑے گی۔" ہیرا کہنے لگا مگر کی بجائے اب اس کی آواز میں خفگی تھی — "وہ بھی ابھی بچی ہے۔ اس کا نام کرن ہے۔ اس کے بال سیاہ، آنکھیں نیلگوں اور گال گلابی ہیں۔ وہ ہنستی ہے تو گالوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ بات کرتی ہے تو ہونٹ ہلکے ہلکے کانپتے ہیں۔ چلتی ہے تو جیسے ناچ رہی ہو ...... اس کا دو منزلہ بنگلہ نئی سڑک کے کنارے ہی ہے۔ اور کل اخبار دیتے وقت جب میری انگلیاں اس کی انگلیوں سے چھو گئی تھیں تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا ...... اور پھر اس نے میری طرف بھرپور نظروں سے دیکھا تو میں اس کے بے پناہ حسن کو تکتا رہ گیا اور جیسے اس نے میرے گال پر ایک تھپڑ مار دیا تو میں آسمانوں سے زمین پر گر پڑا تھا۔ میرے ہاتھ سے اخباروں کا بنڈل نیچے گر گیا تھا اور ...... سامنے کا دو منزلہ بنگلہ کھڑا مسکرا رہا تھا! ...... نہیں کریم میری بات ماننی ہی پڑے گی۔ اپنی رکشا کا رنگ بدل دے۔ اور کبھی کبھی میرے ساتھ یہاں آ جایا کر۔ تفریح ہو جائے گی، یہاں بہت سی نیلی ساڑھیوں والی، نیلگوں آنکھوں اور سیاہ بالوں والی آتی ہیں ..."

ہیرا چپ ہو گیا۔ بہت دیر تک کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ کریم چپ چاپ درختوں کی پھننگوں کے پرے دیکھ رہا تھا، بالآخر آہستہ سے بولا—

"میں سب سمجھ گیا ہیرا۔ مگر تیرے اندیشے بیکار ہیں۔ میں یہ کبھی نہیں بھولا کہ اس کا نوکر ہوں۔ وہ جس دن چاہے الگ کر سکتی ہے۔ میرے دل میں کبھی کوئی امید، ایک ذرا سی خواہش بھی پیدا نہیں ہوئی۔ میں اس سے خواہش بھی کیا کر سکتا ہوں؟ ..... یہ کہ روز میری رکشا میں بیٹھا کرے۔ اور بس! اس طرح میرے دن کس آسانی سے گزر جاتے ہیں! میں اپنی ہستی کی تراوٹوں کو بھول جاتا ہوں۔ میں بھول جاتا ہوں کہ میں ایک رکشہ والا ہوں ..... "کریم کہے جا رہا تھا۔ اور ہیرا خاموش بیٹھا ہاتھ سے گھاس کی پتیاں نوچ رہا تھا۔ "وہ میری زندگی میں کتنا بڑا انقلاب لے آئی ہے! میں اس کا احسان مند ہوں۔ اس نے میری زندگی کے ویرانوں میں خوبصورت پھول کھلا دئے ہیں ... ہیرا میں جانتا ہوں کہ یہ پھول جلد ہی مرجھا جائیں گے۔ پھر بھی میں خوش ہوں۔ وقت کے اس قیمتی حصے کو زندگی کا حاصل سمجھ کر سمیٹ لینا چاہتا ہوں ..... !" کریم چپ ہو گیا۔

شام کا اندھیرا گہرا ہو چلا تھا۔ درختوں پر چڑیوں کا شور لان پر کھیلنے والے بچوں کے شور کی طرح غائب ہو چکا تھا۔

(۳)

کالج میں سرما کی چھٹیاں تھیں۔ کرن اپنے خاندان کے ساتھ کہیں باہر چلی گئی تھی، کسی دور مقام پر تفریح کی غرض سے۔ اور اس کی غیر موجودگی میں پہلی بار کریم کو محسوس ہوا کہ وہ اسے کس شدت سے چاہنے لگا تھا! دن بھر شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں اپنی رکشا لئے گھومتا پھرتا، بیکار، بے مقصد، اور اپنی خالی رکشا دیکھ کر اسے اور زیادہ وحشت ہوتی وہ ان راستوں کی سواریاں نہ لیتا جو کرن کے گھر کی طرف جاتیں۔ اس کی رکشا کی حالت بھی خراب ہو گئی تھی۔ وہ اب زیادہ تر خلیفہ اور [illegible] بھی رہنے لگی تھی ... چوبیس گھنٹے وہ کرن کے بارے میں سوچا کرتا۔ وہ کہاں ہو گی؟ اس نے کیسے کپڑے پہنے ہوں گے؟ ..... دن بھر کیا کرتی رہتی ہو گی! شام کو باہر تفریح کو بھی جاتی ہو گی! ...... کیا اس شہر میں رکشا والے ہوں گے! ...... کاش وہ وہاں پہنچ سکتا! ....

اور یہ ساری باتیں سنکر ہیرا اس سے کہتا۔ "بیوقوف یہ کیوں نہیں سوچتا وہ روز اپنے لئی چاہنے والے کی موٹر میں گھومتی ہو گی؟" — اور کریم چپ ہو جاتا۔ وہ خود بھی کئی مرتبہ اپنے دل کو اسی بات کا یقین دلانے کی کوشش کر چکا تھا۔ مگر ہر بار ایسا کرنے پر اس کا دل ایک نامعلوم درد سے تڑپ اٹھا تھا۔ ایک عجیب خوف کے احساس سے وہ کانپ گیا تھا۔

اور ابھی دنوں اس نے ایک دن بڑی سنجیدگی سے اپنی اس حالت پر غور کیا۔ اس درد اور خوف کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اور اس معمہ کو واقعی وہ سمجھ گیا اور چونک پڑا! یہ خیال کہ اسے کرن سے محبت، شدید محبت ہو گئی ہے، ایک ہولناک حقیقت کی طرح اس کے ذہن کے گوشے گوشے میں سما گیا۔ محبت! ...... اور وہ بھی کرن جیسی لڑکی سے! وہ لرز رہا تھا۔ ہیرا کی کہی ہوئی تمام باتیں یاد آنے لگیں۔ اسے

[illegible] ۔ ۔ ۔ ایک دن وہ تنگ [illegible] کتنی
دور نکل آیا ہے! ...... اس کا انجام کیا ہوگا! ...... وہ کانپ اٹھا۔ یہ اس کی برداشت سے باہر ہو جائے گا! ...... یہ
سب اس کا پاگل پن ہے، بھول ہے۔ وہ سوچنے لگا اب وہ آگے نہیں بڑھے گا۔ جس پھول کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا، اس کا [illegible]
فائدہ! ...... نہیں نہیں۔ اب وہ کرن کی سوچ نہیں سوچے گا ...... وقت آہستہ آہستہ سب ٹھیک کر دیتا ہے، اس نے سو
جب کرن واپس آ جائے گی تو ایک دن خود اس سے کہہ دیگا وہ کوئی اور انتظام کر لے ...... اور پھر اس کے ذہن میں کچھ چاچا کی
[illegible] آنکھیں آتیں جو روز صبح، جب وہ رکشہ لے کر گھر سے نکلتا، تو ساتھ والے دروازے میں سے ٹاٹ کے پردے
کے پیچھے سے اسے گھورا کرتی۔

اور پھر وہ چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ کالج کھلنے کے دو دن پہلے سے کریم نے اپنی رکشا کو خوب رگڑ رگڑ کر دھویا، صاف کیا۔ اس کی
پہلے کی طرح بنا سنوار کر چمکا دیا۔ اس کی سوئی ہوئی خوشیاں پھر جاگ اٹھی تھیں ...... اس نے سوچا کہ پہلے ہی دن کرن کو اپنا فیصلہ نہیں
سنائے گا۔ کم از کم ایک دن اور وہ اس کو ہمیشہ کی طرح کالج لے جائے گا، اسے جی بھر کر دیکھے گا۔ اور پھر دوسرے دن سے نہیں جائیگا!
وہ بے چینی سے اس صبح کا انتظار کرنے لگا جب وہ پھر اس کی "خوش رفتار" میں بیٹھ کر کالج جائے گی۔ اور جب وہ صبح آئی تو اس
کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، ایک نیا نامعلوم سا احساس اس پر چھا گیا۔ جیسے وہ ڈر رہا ہو، جھجک رہا ہو۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہ
آ رہا ہو کہ اسے خوش ہونا چاہئے یا افسردہ ——— اور کالج کا وقت قریب آگیا تو وہ ان دھڑکنوں سے الجھتا کرن کے گھر کی طرف روانہ
ہو گیا ......

اور جب وہ اس کے بنگلے کا پھاٹک کھول کر اندر داخل ہونے لگا تو اس کے قدم ٹھٹک کر وہیں رک گئے۔ وہاں ایک خوبصورت
نئی موٹر کھڑی تھی ...... نیلے رنگ کی، سامنے سے کرن کے گھر کا نوکر آ رہا تھا۔ کریم کو دیکھ کر قریب آ گیا ...... اب تمہاری ضرورت
نہیں رہی۔ اب تمہاری ضرورت نہیں رہی۔ صاحب بمبئی سے نئی موٹر لائے ہیں ...... اب کرن بی بی موٹر میں جایا کریں گی۔ اور کریم نے
دیکھا کہ موٹر کا ڈرائیور اس کی طرف دیکھ کر ہنس رہا ہے۔

وہ واپس مڑنے لگا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے دل میں خیال آیا کہ اس نوکر سے کہے کہ کسی طرح ایک منٹ کرن سے بات کرنے کا موقع
دلا دے۔ وہ کرن سے کہیگا۔ مجھے الگ نہ کیجئے! آپ میری رکشا نہیں چھوڑ سکتیں۔ آپ چاہے، دس موٹریں رکھ لیں مگر کالج میری رکشا
میں ہی جایا کیجئے۔ کیونکہ مجھے موٹر چلانا نہیں آتا۔ میں آپ کی موٹر کا ڈرائیور نہیں بن سکتا! ... ۔ اور اسے یوں لگا جیسے یہ سب سن
وہ انکار نہ کر سکے گی۔ کرن اس کی بات مان لے گی۔ مگر یہ خیال اس کے ذہن میں بس ایک ذرا دیر کے لئے ہی آیا، اور چلا گیا۔ وہ کچھ
نہ کر سکا۔ اس وقت اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اس نے کچھ فیصلہ کیا تھا ...... اس کی ساری ہمت سارا حوصلہ جواب دے گیا تھا
اس کے قدم آپ ہی آپ باہر کی طرف اٹھنے لگے۔ وہ واپس چلا آیا۔

یکایک اسے محسوس ہوا جیسے اس کے جسم سے سارا خون نکل کر بہہ گیا ہو۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں مگر کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا
اس کے کانوں میں سڑک کی بیسیوں آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر وہ کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے ...... جیسے
بلندی پر سے اسے دھکیل دیا گیا ہو اور وہ نیچے ہی نیچے گرے جا رہا ہو ...... گرا کبھار یا ہوا فضاؤں میں۔ [illegible] ...!
[illegible] تھا۔ کانوں میں کھٹک جیسے [illegible]۔ مگر دوسرے ہی لمحے یہ الفاظ اس کے کانوں پر ہتھوڑے کی طرح [illegible]
"اب تمہاری ضرورت نہیں!" جیسے کسی نے [illegible] دی ہو۔ اس کی [illegible] ہو گئی ہو ...... اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے

میں خوشی
جسم میں تازگی
محافظِ صحت لائف بوائے صابن کی بدولت
لائف بوائے کے جراثیم سے محفوظ رکھنے والے فرحت بخش جھاگ جلد پر مسامات
جراثیم آلود میل اور گرد کو الگ کر دیتے ہیں جس سے جسم صاف اور ستھرا ہو جاتا ہے
اور آپ دن بھر ایک لطیف تازگی محسوس کرتے ہیں۔ یہ اطمینان کر لیجئے کہ آپ
کے گھر میں سب کی صحت مفرح لائف بوائے صابن
سے محفوظ رہے۔
LIFEBUOY
لائف بوائے صحتمند زندگی کا ضامن ہے
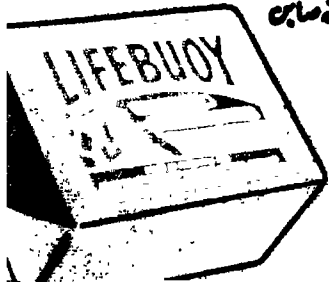
[illegible] رمزی

تائی ماں

گالوں گیسٹ روم میں ٹھہرے ہوئے مجھے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ اور حسبِ معمول تائی ماں صبح سویرے میرے سر پر سوار تھی۔ "اٹھو بیٹا کب تک سوتے رہو گے۔" اور تائی ماں کی شکل دیکھتے ہی میرا اچھا خاصا موڈ خراب ہو گیا۔ گنگنانا میری عادت سی تھی لیکن تائی ماں کے سامنے ترنم ریزی حماقت تھی۔ اس لئے خاموش رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میری منگیتر شان کی تصویر آج بھی میرے بیگ میں پڑی رہ گئی جب سے ہر صبح میں INSPIRATION حاصل کیا کرتا تھا۔ شان کی مسکراتی ہوئی تصویر بکس کے اندر خانے میں دبی رہ گئی۔ اس کی مسکراہٹ کی قندیل میرے ذہن میں جلی اور جل کر بجھ گئی۔ اس کے حسین خوش وضع کمان کی طرح لچک کر لوٹ گئے۔ اور میرے سامنے فی الحال تائی ماں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ہونٹوں پر پان کی سیاہی ان کی مسکراہٹ کا منظر تھی کہ مسکراہٹ کی لکیریں ننھی ننھی سپنولیوں کی طرح سانس لے رہی تھی۔ مجھے تائی ماں کی مسکراہٹ سے بڑی اکتاہٹ محسوس ہوتی تھی۔ تائی ماں کا سانولا چہرہ ایک ایسا سپاٹ چبوترہ ہے جس پر پہاڑی ٹیلوں کی طرح بقیہ اوندھے سیدھے نقش نظر آتے تھے لمبی سی ناک آخری سرے پر طوطے کی چونچ معلوم ہوتی تھی۔ آنکھوں کے نیچے اس قدر سیاہ حلقہ تھا کہ آنکھوں کی سپیدی کو دیکھنے کے بعد شام و سحر کا نظارہ یاد آنے لگتا تھا۔ پیشانی غیر معمولی طور پر تنگ اور ابھری ہوئی تھی۔ سپید بالوں میں کہیں کہیں سیاہ بال سپید ریشمی کپڑے پر سیاہ ٹانکے معلوم ہوتے تھے مگر کمر جھکی سی گئی تھی اور بڑے بڑے کھردرے ہاتھ جو زندگی بھر کی محنت و مشقت کی آئینہ داری کرتے تھے۔ آنکھوں میں سرمہ کا استعمال کثرت سے کرتی تھیں۔
۔ تائی ماں کے چہرے کو نظر انداز کرکے میں شیو بنانے لگا۔

"گرم پانی لے لیا ہوتا۔ کیا صبح صبح چہرہ کھرچنے لگے۔" تائی ماں نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

"مجھے ایک انٹرویو میں جانا ہے تائی ماں۔" میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"یہ انٹرویو کیا ہوتا ہے بیٹے۔۔؟"

"ملازمت کے سلسلے میں بڑا صاحب سے ملنے کو انٹرویو کہتے ہیں سمجھیں تائی ماں۔۔!"

"تو یوں کہو کہ بڑا صاحب سے ملنے جا رہے ہو؟ خدا جنت نصیب کرے نور تن کے ابا کو۔ کیا نورانی داڑھی تھی ان کی زندگی میں کتنی بار دلی تو دلی گورا صاحبوں سے ملے لیکن کبھی چہرہ کھرچنے کی نوبت نہ آئی۔ اور تمہاری تو مرچ و سپید رنگت پر سیاہ داڑھی ایسی سجتی ہے کہ کیا بتاؤں۔۔ کہ تم کلموہی بدل گئی ہے۔ جس لونڈے کو دیکھو چہرہ پر ہل چلا رہا ہے۔"

"تائی ماں۔۔ یہ ہل نہیں ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے اسے سیفٹی ریزر دکھا کر کہا،

"نہیں تو اور کیا ہے۔ بھلا تمہارے چہرے پر اتنا سا ہل نہیں تو کیا کھیتوں والا ہل چلے گا۔"

"ملنا تائی ماں۔۔ بس مان گیا۔" اور آئینے میں اپنی شکل دیکھنے لگا جیسے جیسے خوب گھنی داڑھی اگ آئی دوسرے ہی لمحہ میری ہیئت کذائی بدل گئی۔ اور میں مسٹر سے مولوی نظر آنے لگا۔

[illegible] سے چائے نکال [illegible] تائی کی خفگی [illegible] سگریٹ [illegible]
[illegible] ہوتی تھی۔ اس لئے یہ جالا دینا شروع کر دیا تھا کرہ میں [illegible]
[illegible] اور ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے ذہن کی شاہراہ پر [illegible] ہو۔ یہ جالا کس قدر غیر معانی [illegible] ہے
[illegible] سگریٹیں پھونکتے ہو۔ توبہ! تائی ماں تپائی کے قریب پہنچ گئی تھی جہاں میں شیو بنا رہا تھا۔ میں جھنجلا کر [illegible] آیا۔
تیاہ سگریٹ پیا کرو بیٹے کلیجہ سوکھ جائے گا۔ تائی ماں نے ہمدردی جتائی۔ اور پھر میں نفرت [illegible]۔
"نوٹ کر لیا۔"
"کیا نوٹ کر لیا؟"
"یہی کہ سگریٹ اتنی نہیں پینی چاہئے"
"ہاں واقعی بہت پیا کرو۔ ابھی اس کچی عمر میں اتنی سگریٹ پیو گے تو آگے چل کر کلیجہ خشک ہو جائے گا۔"
"اچھا اچھا تائی ماں" میرا کتنی ہی بار جی چاہتا کہ تائی ماں کو بکواس سے روک دوں۔ اسے اس کی اوقات یاد دلا دوں۔ مگر ہمیشہ اس کی
اتنی [illegible] آڑے آگئی اور میں خاموش ہو گیا مجھے اس کی باتیں زہر کی طرح تلخ معلوم ہوتی تھیں،
[illegible] اور بکواس کرتے رہنا اس کی عادت سی تھی۔
میں شیو بنا چکا تھا اور اب غسل خانہ کی طرف جانا چاہتا تھا کہ تائی ماں نے روک دیا۔
"ٹھہرو پہلے تمہاری [illegible] بھر دوں۔ ساری صراحی خالی کر دی۔"
"پانی پر بھی کنٹرول تو نہیں" میں چڑھ سا گیا۔
"میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا لڑکے" وہ مسکرائی اور صراحی اٹھا کر جانے لگی، اور میرا جی چاہا کہ صراحی اٹھا کر اس کے سر پر پھوڑ دوں۔
"بڑی آئی دنیا کی ہمدرد ——— سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"..... اور غصہ میں بڑبڑاتا ہوا کرسی پر ڈھے گیا۔ کالونی گیسٹ
[illegible]م کے اکثر نوجوان کالج یا دفتر کے لئے روانہ ہو چکے تھے۔
ایک میں ہی بیکار تھا۔ جسے آٹھ بجے سو کر اٹھنے کی عادت تھی اور اس کے بعد سڑکوں کی پیمائش کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہ تھا جو لوں
دنیا بہت پیچھے چھوٹ گئی تھی۔ وہ شانگریلا کہیں نہیں ملا جس کی تلاش میں تین عدد ڈگریاں یونیورسٹی سے لیکر نکلا تھا، اور سمجھتا تھا کہ ایک دن
ملازمت مل جائے گی۔ لیکن یہ صرف خیال تھا۔ دفاتر میں ملازمتیں تھیں اور نہیں بھی تھیں میرے لئے اس لئے نہیں تھیں کہ میرے پاس
[illegible] نہیں تھیں، اور اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ڈگری کی تصدیق اس وقت ہوتی ہے جبکہ سفارش کی [illegible] ہو۔ اور میں ان فلاں
[illegible] کی تلاش میں سرگرداں تھا۔
"یہ لو صراحی ——— کہو ناشتہ کیا لا دوں۔؟"
"ناشتہ میں باہر کر لوں گا" میں نے سوچا جس قدر جلد تائی ماں سے فرصت مل جائے اچھا ہے۔
"جیسی تمہاری مرضی۔"
وہ کالونی گیسٹ روم کے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اور میں غسلخانہ کی طرف کمرہ بھیڑ کر چلا گیا۔
جب دن بھر کا تھکا ہارا اپنے کمرہ میں پہنچا تو تائی ماں سائے کی طرح پھر آ دھمکی۔ سب سے پہلے بجلی کا کھٹکا دبایا اور پھر میری
[illegible] لی۔ "معلوم ہوتا ہے آج کافی پریشان پھرتے ہو۔"

[illegible] بھائی ہے؟ میں نے مختصر سا جواب دیا۔ مجھے اس کے باوجود ایک آہٹ محسوس ہو رہی تھی جیسے [illegible]
[illegible] اتارو۔ کپڑے بدل ڈالو۔ یہ کیا اس طرح آ کر پڑ رہے۔
[illegible] یہ سب کچھ کرلوں گا ۔۔۔ پہلے ذرا تو ......

"بڑا ملنے کی کیا بات ہے۔ سوچتی ہوں پردیسی ہو۔ یکمی بڑے گھر کے چراغ ہو گئے اور اب اس نئی جگہ میں کیسا لگتا ہوگا تمہیں۔"
"مجھے سب کچھ اچھا لگتا ہے تائی ماں ۔۔۔ اور نہ لگے بھی تو چارہ کیا ہے۔"

"خیر بیٹے لو۔ یہ دیکھو ذرا سی فیرنی لے آئی ہوں تمہارے لئے۔ نورن نے پکائی تھی۔ یہ نورن بڑی خبطی لڑکی ہے۔ جب بھی سر میں کچھ آئی بات [illegible] شفاعت نصیب کرے اس کے ابا مرحوم کو ۔۔۔ ان کی بھی کچھ یہی حالت تھی۔

"تم بیکار تکلیف کرتی ہو تائی ماں۔ میں تو ہوٹل سے کھانا کھا کر یہاں آتا ہوں۔"

"ہوٹل کا کھانا تایاب رے" ۔۔۔ تائی ماں نے دیدے گھما کر حیرت سے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "ہوٹل کا کھانا تو زہر سمجھو۔"

"پھر کروں کیا ۔۔۔؟"

یہاں کے میس میں کھا لیا کرو۔ بڈھا گل محمد اچھا کھانا پکاتا ہے اس کے ہاتھ کے کھانے میں تو عورتوں کے ہاتھ کے پکائے ہوئے کھانوں کا سا مزہ ہوتا ہے۔" مجھے ایک دن محض دال کھلائی تھی سچ مانو بھیا انگلیاں چاٹتی رہ گئی۔"

"پھر کل سے میرا کھانا یہیں ٹھیک کرو ۔۔۔"

"ہاں ضرور کہدوں گی۔" وہ میرے بستر کی پائتی پر بیٹھ گئی اور بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ کئی دلہنوں ساسوں نندوں اور بھاوجوں کے قصے بیان کرتی رہی۔ اور میں چپ چاپ سنتا رہا۔ میں نے درمیان میں کوئی سوال نہیں کیا اس لئے کہ میں جانتا تھا کہ ایک ذرا بڑا تو پھر سلسلہ جانے کب تک جاری رہیگا۔ اور جب بولتے بولتے اکتا گئی تو خود ہی پائتی سے اٹھ کر جانے لگی۔

"بس چلیں تائی ماں ۔۔۔"

ہاں بیٹے اب چلی۔ نورن غریب انتظار کرتی ہوگی۔ یقین مانو میرے بغیر تو وہ کھانا تک نہیں کھاتی۔ پھر سویرے اٹھنا ہے۔" ۔۔۔۔
چلتے چلتے تائی ماں نے ایک سرد آہ بھری اور سلیپر چٹخاتی ہوئی چل دی۔ فیرنی کی طشتری ایک طرف پڑی تھی میں نے سوچا اٹھا کر باہر پھینک دوں۔ پھر خیال آیا ذرا چکھ کر دیکھوں۔ اور جب دیکھنے پر آیا تو ذائقہ پاکر پوری طشتری کھا گیا۔ اور اس کے بعد یہ سوچنے لگا کہ یہ فیرنی تائی ماں لائی تھی جس سے مجھ کو ازلی نفرت ہے۔

تائی ماں کے جانے کے بعد میں نے اپنے کمرے کے دریچے کھول دیئے۔ مٹیالی سڑک پر چاندنی ہانپ رہی تھی، خوشگوار ہوا کا ایک لطیف سا جھونکا آیا اور گذر گیا۔ سامنے والی بالکونی خالی تھی۔ آج مجھے شانی وہاں نظر نہ آئی۔ شانی جسکا میں روزانہ انتظار کیا کرتا تھا۔ مدھم سی ریشمی چاندنی میں وہاں کوئی تا حد نگاہ نہیں تھا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ گذر گیا مگر کوئی آہٹ محسوس نہ ہوئی۔ بالکونی سے متصل [illegible] [illegible] بند تھا ۔۔۔ معلوم ہوتا ہے وہ بیمار ہوگئی ہے ۔۔۔ مجھے ہلکا سا شبہ ہوا۔

[illegible] شانی سامنے والے مکان میں رہتی تھی اور ہم اس کے بڑے بھائی [illegible] لاہور سے کراچی آیا تھا۔ مجھے [illegible] [illegible] [illegible] ابھی تک یہ موجود تھے۔ [illegible] نہیں جانتا تھا۔ [illegible]
[illegible] اس کی بڑی بڑی کنول جیسی نیم وا آنکھیں اب بھی میرے ذہن میں [illegible]
[illegible] جب دروازہ کھلا تو وہ مجھے دیکھ کر ایک دم بھاگ گئی تھی [illegible]

لیکن شانی جا چکی تھی۔ اس کے سیاہ گھنگریالے بال مرمریں شانوں پر لہرا رہے تھے۔

میں اپنا سامان کمرے میں ایک طرف ڈال کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک سناٹا رہا۔ اس قدر گہرا سناٹا کہ مجھے احساس ہونے لگا کہ شاید اس گھر میں کوئی ذی نفس موجود نہیں۔ بہت دیر تک کوئی آواز سنائی نہ دی۔ اور پھر جو آواز آئی تو میں ایکدم سے چونک پڑا۔ "چائے کی ٹرے لیجئے" کسی نے بڑی آہستگی سے کہا۔ پراسرار سرگوشی کے لہجے میں۔ اور میں نے شانی خانے کی طرف کھلنے والے دروازے سے ٹرے لے لی۔ شاید اس بار بھی شانی ہی تھی۔ اس کی کیوٹکس سے رنگی ہوئی انگلیاں میرے دل میں نشتر کی طرح اتر گئیں۔ میرا دل دیر تک دھڑکتا رہا۔ چائے کی ٹرے سامنے والی میز پر رکھ کر میں نے ایک کپ بنایا، پھر دوسری کپ اور نہ جانے کتنی ہی سگریٹیں پھونک ڈالیں پھر وہی سناٹا، وہی گہرا سکوت۔ میرا دل اُبنے لگا۔ پھر کوئی ایک گھنٹے بعد دروازہ پر چوڑیوں کی جھنکار سنائی دی۔ پھر وہی یکساں سرگوشی کے انداز میں کسی نے کہا۔ "ٹرے دے دیجئے" اس بار دروازہ کی آڑ سے میں نے دو سرخ مسکراتے ہوئے لبوں کو دیکھا۔ جیسے گلاب کی پتیوں میں دھڑکن سما گئی ہو۔ یہ مسکراہٹ کتنی جاذب، جاں بخش اور رجائیاں تھی۔ بس جیسے

"Two red roses across the moon"

کوئی ایک بجے راحت صاحب اپنے دفتر سے لنچ کھانے آ گئے۔ اور آتے ہی مجھ سے لپٹ گئے، میرے لئے ایک کمرہ خالی کرا دیا۔ ہم دونوں نے اکٹھے کھانا کھایا اور دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ دو گھنٹہ بعد وہ پھر دفتر چلے گئے اور میں سفر کی تکان دور کرنے کے لئے اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ جانے کب میری آنکھیں لگ گئیں۔

شاید شام کے پانچ بجے ہوں گے میری نیند اچٹ گئی تھی لیکن اس کے باوجود آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ کہ دبے پاؤں کسی کے چلنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ وہ یقیناً شانی ہی تھی گداز جسم، متوسط قد، ستواں ناک اور گلابی ہونٹوں پر ہمہ وقت کھیلتی ہوئی مسکراہٹ، شانی مجھے بڑی حسین لڑکی نظر آ رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں میری میز تک آئی اور چائے کی ٹرے رکھ کر مسکراتی ہوئی واپس چلی گئی۔ اور اس کے بعد دروازہ پر دستک ہوئی میں سمجھ گیا یہ چائے پینے کی گھنٹی ہے میں فوراً مسکراتا ہوا اٹھ بیٹھا اور واش بیسن میں منہ ہاتھ دھو کر چائے پینے بیٹھ گیا۔ مجھے اس مرتبہ دروازہ پر وہ لڑکیوں کی سرگوشی سنائی دے رہی تھی۔ ان کی آواز میں حجاب آگیں مسکراہٹ تھی۔ جیسے چوری چھپے وہ مجھے دیکھ رہی ہوں۔ ایک بار اور مجھے وہ کنول سی نیم وا آنکھیں دکھائی دیں اچانک ہی لمحہ ایک سانولی لڑکی کا سایہ لہرایا جو سر پہ .. .. دوپٹہ سنبھالتی ہوئی بھاگ نکلی تھی۔ البتہ وہ دوسری لڑکی اپنے ہونٹوں کی مسکراہٹ کی قندیل جلائے اب تک کھڑی تھی۔

اس دن کے بعد سے وہ لڑکی مجھے روزانہ کسی نہ کسی طرح نظر آ جاتی۔ اور ایک دن تو بڑی جسارت سے جب میں سویا ہوا تھا وہ اپنی تصویر میرے تکیہ کے نیچے ڈال کر چلی گئی۔

تصویر میں بھی وہ یکساں اور پرخوبصورت نظر آ رہی تھی۔ وہی بڑی بڑی سی کنول سی نیم وا آنکھیں ہونٹوں پر مسکراہٹ کی قندیل جلائے نہ جانے کس سحر کی تاریکی میں اجالا پھیلانے کی سعی کر رہی تھی جیسے پیشانی اور متناسب اعضاء۔ تصویر بڑی پیاری تھی اور میں ہر صبح اسے دیکھ کر اطمینان حاصل کیا کرتا تھا۔

لیکن ساتویں دن میں نے اپنی رہائش کا انتظام کالونی گسٹ روم میں کر لیا۔ اس لئے کہ راحت صاحب کے یہاں ٹھہرنا میں بالکل مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ چلتے وقت والدہ نے خاص طور پر ہدایت کر دی تھی کہ ان کے یہاں نہ ٹھہرنا وہاں تمہاری منسوب ہونے والی ہے لوگ کیا کیا باتیں بنائیں گے اور جب میں نے دیکھا واقعی کہانی بننے لگی ہے۔ تو یکدم سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ راحت صاحب پہلے تو بے حد حیرت زدہ ہوئے لیکن میرے اصرار پر راضی ہو گئے اور پھر اس لئے بھی کہ کالونی گسٹ روم کی عمارت خود ان کی تھی اور اس طرح کہ وہ میری نگہداشت بھی کر سکتے تھے۔

نیا سماج

آج کی صبح دوسری صبحوں سے کس قدر مختلف تھی۔ سچ تو یہ ہے اعتبار سے۔ لیکن کہیں دھوکا تو نہیں۔۔؟
مگر کچھ بھی ہو۔ آج ہر شے کچھ بدلی بدلی سی نظر آرہی ہے۔:

کہیں میں ایسے چھ ماہ جاگنے اور چھ ماہ سونے والے اصف لیلوی فقیر کے مانند کسی طویل نیند سے تو بیدار نہیں ہوا ہوں۔۔؟ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے ابھی گذشتہ شب ہی تو میں نے گہری دلچسپی کے ساتھ سامنے روشندان میں چڑیا کے گھونسلے کو دیکھا تھا۔ ہاں گہرے تیقن کے ساتھ کہہ رہا ہوں صاحب، جب میری نظریں یکلخت روشندان کی طرف اٹھتی ہیں تو اس گھونسلے کو اسی جگہ پاتا ہوں۔ تب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ چھ ماہ کی طویل نیند سے چونکنے کے بعد بھی وہ گھونسلا وہیں ہو۔ چڑیاں تو جلد جلد اپنا گھونسلا تبدیل کرتی ہیں۔۔!
ارے۔ وہ سامنے سے ننھا منا سعید کلکاریاں مارتا ہوا آرہا ہے اس کی عمر میں بھی کوئی خاص فرق نہیں محسوس ہوتا۔ تب پھر۔؟ کوئی خواب تو نہیں۔۔؟ ناممکن۔۔!

اچھا ایک صورت سے تصدیق ہو سکتی ہے۔ میں ریاض کو آواز دیتا ہوں اور وہ جی پاپا" کہتا ہوا آتا ہے۔
"بھلا ریاض اب کونسی جماعت میں ہو۔۔؟" وہ میرا منہ حیرت سے تکنے لگتا ہے اس غیر متوقع سوال کا مقصد بھلا کیا ہو سکتا ہے
"آٹھویں میں۔۔" وہ مختصر سا جواب دیکر سہم جاتا ہے، اسکے چہرے پر گہرے استعجاب کے تاثرات ہیں ٹھیک ہی تو ہے۔ نہ کوئی غفلت کی طویل نیند ہے! نہ خواب!! نہ تصورات مجھے بھی یاد پڑتا ہے۔ یاد نہیں بلکہ کامل وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کل بھی ریاض آٹھویں ہی میں تھا۔ مگر دل میں ایک شبہ جنم لیتا ہے۔ ممکن ہے ریاض فیل ہو گیا ہو۔ اور ایک سال پھر آٹھویں میں ہی رہنا پڑا ہو۔ مگر میرے بچے اس قدر کند ذہن اور نالائق تو نہیں۔ بلکہ باشعور ذہین اور قابل ہیں، ہمیشہ کلاس میں امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس ہوتے ہیں۔۔ پھر۔؟ دل کا شک دور نہیں ہوتا۔ مگر ڈرتا ہوں کہیں پھر کوئی بے تکا سوال کرنے پر ریاض کہیں مجھے پاگل ہی نہ سمجھ بیٹھے!

"اچھا ریاض۔۔ آج کونسی تاریخ ہے۔؟" میں پوچھتا ہوں
"دس دسمبر۔۔" ارے ٹھیک ہی تو ہے۔ کل تو تاریخ ہی کو میں اپنا ایک لفافہ ایک مقامی رسالے میں دیکر آیا ہوں۔ حضرت کہیں ایک سال پہلے تو نہیں۔۔!" پھر حضرت دل میں ایک شک گذرتا ہے۔ میری نظریں غیر ارادی طور پر اٹھ جاتی ہیں۔ وہاں بھی دس دسمبر ہی موجود ہے۔ میں اپنے اس نئے شک کو رفع کرنے کیلئے ریاض سے پوچھتا ہوں:
"کونسا سن۔۔ اور سن کونسا ہے۔؟" پوچھکر وہ گھبرا جاتا ہے۔ شاید وہ سوچ رہا ہے کہ آج ابا کو کیا ہو گیا [illegible] کیسی بہکی بہکی باتیں کئے جا رہے ہیں، اسکے چہرے پر گہرے تاسف کے اثرات ہیں [illegible] [illegible] کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے مگر اسکی ہونٹ آواز کا نپ کر رہ جاتی ہے جسے وہ [illegible] کر لیتا ہے!

"ڈیڈی یہ تو سنہ [illegible] ہے!" وہ دھیرے سے جواب دیتا ہے اور میرے منہ سے بے ارادی طور پر نکل جاتا ہے "کیا تمیز [illegible] ہے؟" پھر اپنی بیوقوفی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی سوال ہے۔ بھلا غلط سنہ [illegible] کا کوئی ذاتی مفاد مضمر ہے بغیر جواب دئے۔ ریاض کمرے سے نکل جاتا ہے اور میں کیلنڈر کی طرف دیکھتا ہوں اور وہاں بھی سنہ [illegible] ہو ستاون!"

ممکن ہے پچھلے سال کا ہو۔!" ذہن کے تاریک گوشوں سے یہ شک نکل کر سامنے آجاتا ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے! میری بیوی تو بیحد نفاست پسند، وفا شعار، سلیقہ مند اور سگھڑ ہے۔ ہر سال پرانا کیلنڈر سالِ نو کی یکم سے پہلے ہی اتار کر اسکے بجائے سالِ نو کا آویزاں کر دیتی ہے۔ بظاہر میں اپنے کو تسلی دینے کی کوشش کرتا ہوں مگر پھر وہی حضرت دل گھپلا کر دیتے ہیں۔

"آخر انسان ہی تو ہے۔ اس کا بدلنا بھول گئی ہوگی۔!"

[illegible] اف کہیں مفر نہیں۔ ہر بار گرہ پڑ جاتی ہے۔ بھلا اب یہ نیا شک کیوں پیدا ہوگیا۔ ریاض سامنے سے اپنی ممی کو لیکر آرہا ہے [illegible] میں پوچھتا ہوں ــــ "کیوں فرزانہ ــ تم نے ابھی تک کیلنڈر نہیں تبدیل کیا۔؟" میرے سوال پر وہ مسکراتی ہے اور ریاض خوفزدہ ہو کر فرزانہ کی طرف عجیب نظروں سے گھورتا ہے جیسے کہہ رہا ہو "ممی دیکھو۔! آج ڈیڈی کسقدر الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہیں!" مگر فرزانہ جواب دیتی ہے!

"میں بھولی تو نہیں۔ آپ دیوانے تو نہیں ہوگئے۔ آج دس ہے اور سالِ نو کے آغاز میں مکمل اکیس دن باقی ہیں ابھی سے کیلنڈر تبدیل کر دوں!"

"اوہ ٹھیک ہے بھول گیا تھا۔ بھئی میرا مقصد ہے کہ سالِ نو کیلئے کوئی خوبصورت کیلنڈر نہیں لیا تم نے؟" میں بگڑی بناتا ہوں اور وہ ایک حکم صادر کرتی ہے "دیکھئے۔ سالِ نو کا کوئی خوبصورت کیلنڈر آفس سے واپسی پر ضرور لیتے آئیے گا۔"

"بہت بہتر حضور۔!" میں جواب دیتا ہوں "مگر کس سنہ کا۔؟" پھر شدت سے غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ اور میں بات بدلتے کہتا ہوں۔ "ہاں بھئی۔ میرا مطلب ہے سنہ اٹھاون کا نا۔!"

"تو کیا سنہ [illegible] کا ارادہ ہے!" وہ عجیب نظروں سے گھورتی ہے! میں جلدی سے کہتا ہوں

"[illegible] کیوں رہی ہو۔ بس آجائے گا کہہ دیا۔!"

"[illegible] شروع ہو رہا ہے۔ منہ دھو کر جلد آئیے۔!" فرزانہ شگفتگی سے پیار بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی کہتی جلدی سے اٹھ کر غسلخانے کا رخ کرتا ہوں جیسے ہی ٹھنڈے پانی میں ہاتھ پڑتا ہے جسم میں جھرجھری آتی ہے اور یکلخت احساس ہوتا ہے کہ کل بھی پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ یقیناً رات کوئی اوٹ پٹانگ خواب دیکھا تھا جسکے اثرات ابتک دماغ پر موجود ہیں! مگر نہیں کچھ بھی ہو ــ آج ہر شے بدلی بدلی نظر آرہی ہے!

میں جلدی سے ہاتھوں میں دبیز فائلوں کا پلندہ تھامے آفس کیلئے نکلتا ہوں! بس اسٹاپ پر پہنچتے ہی [illegible] [illegible] ہیں۔ یہ صاف ستھری سڑکیں۔ اور ابھی آج یہ سب آدمی شریف صورت بنے بڑے صبر و استقلال [illegible] ایک ہی بس کے منتظر ہیں۔! انہیں تو امیر غریب سب پیارے ہیں۔ ... ارے کل تک تو [illegible] [illegible] کیا۔ ہر شخص سادگی اور اطمینان سے آتا ہے اور بلا [illegible] کے [illegible]

ہو کر اپنی باری کا انتظار کرتا ہے۔ بسیں [illegible] آ جا رہی ہیں۔ یہ سارا نظام ایک رات میں کیسے پلٹ گیا۔ نہیں۔ نہیں۔ یقیناً ایک خاصہ طویل خواب سے جاگا ہوں اور میری بیوی بچے صرف دلجوئی کے خاطر جھوٹ بول رہے ہیں ..... پھر وہی حضرت بلا تک اڑاتے ہیں۔!

میری باری آئی ہے۔ بڑی آسانی سے سیٹ مل جاتی ہے۔ نرم نرم گدے دار سیٹ۔ ارے یہ بدل کیسے گئی۔ حالانکہ کل تک تو ہر بس کی سیٹ نہایت سخت اور کڑی ہوا کرتی تھی۔ آج کنڈیکٹر بڑے سکون سے ٹکٹ بانٹ رہا ہے۔ ہر ایک کو گن کر پورے پیسے دے رہا ہے۔ بس میں بے ہنگم آوازوں کا کوئی شور نہیں۔ ... آخر یہ کنڈیکٹر آج جھگڑتا کیوں نہیں۔ لوگ بھی مقررہ تعداد سے زیادہ بیٹھنے کی کوشش نہیں کر رہے۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ یہ میرا دل بیٹھنے لگتا ہے۔! باہر دکانیں بھی بڑی صاف ستھری نظر آ رہی ہیں۔ بالخصوص مٹھائی کی دکانوں پر جالیاں لگی ہیں۔ کوڑے کرکٹ کا نام نہیں سڑک پر جگہ جگہ ضروری کاغذات کی ٹوکریاں اور یہ پیکدان۔ اور لوگ بھی انکے مصرف سے واقف کالر۔! لوگ اجلے کپڑے پہنے ہوئے ہیں! میرے حیرت کی انتہا نہیں۔!

ایک ضعیف آدمی بس میں قدم رکھتا ہے۔ کنڈیکٹر منع نہیں کرتا۔ آخر آج یہ حسب سابق جھلاہٹ کا مظاہرہ کیوں نہیں کرتا۔ ارے۔ اوہ۔ میرے سامنے کی نشست پر بیٹھا ہوا جوان جو قیمتی شارک اسکن کا سوٹ اور کریپ کی ٹائی لگائے ہوئے ہے۔ کھڑا ہو کر ضعیف آدمی کو اپنی سیٹ کی پیشکش کر رہا ہے۔ اوہ۔! یہ جذبۂ ترحم۔ کل تک یہی لوگ بوڑھوں کا مذاق اڑاتے تھے۔!

آج حسب سابق بس میں گڑبڑ نہیں۔ لوگ بڑی تمیز سے بیٹھے ہیں کچھ کتابیں رسائل اور دیگر اخبار پڑھ رہے ہیں۔ کل تک تو یہی لوگ، سیاست گھریلو معاملات اور دیگر عامیانہ باتوں پر خوب خوب بحث کرتے تھے۔ کیا میں ابھی تک محو خواب ہوں۔ نہیں۔ نہیں میں سو رہا ہوں۔ خود ہی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ حقیقت معلوم کرنے کیلئے اپنی انگلی کاٹتا ہوں۔ اف۔ یا اللہ توبہ۔! درد سے بلبلا اٹھتا ہوں۔ یقیناً جاگ رہا ہوں۔ یہ سب حقیقت ہے! اُف۔ شدید درد۔ خون بہہ رہا ہے انگلی سے۔ اوہ۔ وہ سامنے والا مسافر اپنا رومال پیش کر رہا ہے۔ بس کے سب لوگ میری طرف متوجہ ہیں۔ انکے چہروں سے صاف عیاں ہے۔ یہ تکلیف میری اپنی نہیں۔ اسکی سوزش، درد، خلش اور کسک سب کو محسوس ہو رہی ہے! میرا درد صرف میرا نہیں میری تکلیف صرف میری نہیں۔ گویا یہ [illegible] قوامی ہے۔ یعنی دردِ سل ہے۔ اس درد کی کسک زمین کے چپے چپے پر بسنے والے انسان کے دل میں بھی وہی کرب پیدا کر رہی ہے جس سے میں دوچار ہوں۔! ارے یہ بے لوث جذبۂ اخوت۔ بھائی چارگی۔ خلوص۔ یہ سب ایک شب میں کیسے آ گیا۔؟

بس سے اتر کر پان والے کی دکان پر جاتا ہوں۔ ایک پان دو سگریٹ خریدتا ہوں۔ پانچ کا نوٹ دیکر جانے لگتا ہوں کہ پان فروش خود ہی مخاطب ہوتا ہے: "بھائی صاحب! باقی پیسے تو لیتے جائیے۔!" ہیں ہیں یہ کیا۔ کل تک تو ایک پیسہ بھی "مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے" والا معاملہ تھا۔ مگر آج۔ یہ حرام و حلال کی تمیز۔ اوہ۔ یہ صبح تو ہے یقیناً۔!

آگے بڑھتا ہوں اور سامنے آفس ہے۔ ارے وہ آفس کے دروازے کے نزدیک بیٹھنے والا فقیر کہاں گیا۔؟ تب ناگاہ میری نظر اٹھتی ہے۔ کہیں بھی کوئی فقیر نہیں۔ حالانکہ آج جمعرات ہے! باپ رے باپ کیا مصیبت ہے۔ کیا شہر میں کوئی بھی محتاج۔ اور غریب باقی نہیں رہ گیا۔؟

ہیں - ! آج یہ آفس والے اسقدر شرافت اور خوش خلقی کا مظاہرہ کیوں کر رہے ہیں - ؟ وہ سامنے والا ہیڈ کلرک بلا کر مجھے کچھ فائلیں دیتا ہے ..... اسکی بوڑھی آنکھیں جنہوں نے جانے زمانے کے کتنے ہی عروج وزوال اور نشیب و فراز دیکھے ہیں - آج کچھ مطمئن اور پرسکون دکھائی دے رہی ہیں، حالانکہ کل تک یہ بوڑھا ہیڈ کلرک بڑے چڑچڑے پن کا مظاہرہ کیا کرتا تھا ..... !

اتنے میں منیجر اپنے کمرے میں طلب کرتا ہے، اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے ..... حالانکہ پچھلے دس سال کی طویل نوکری میں اس نے مجھے تو کجا کسی اور کو بھی بیٹھنے کو نہیں کہا ..... آخر آج کیوں - ؟ پھر مجھے سگریٹ پیش کرتا ہے .. چند ضروری باتیں کرتا ہے ..... پچھلی فائلیں طلب کرتا ہے .... مگر اسکا انداز حاکم و محکوم والا ہرگز نہیں -

---

ساڑھے تین بج رہے ہیں - میں آفس کینٹین (canteen) میں جاتا ہوں ..... وہاں سامنے ہی محمود بیٹھا ہے ..... مجھے دیکھتے ہی بڑی گرمجوشی سے چائے کی دعوت دیتا ہے .... حالانکہ ہمیشہ مجھے ہی اسکو چائے پلانی پڑتی تھی اور اسکے متعلق میرا نظریہ تھا کہ دنیا بدل سکتی ہے مگر محمود نہیں بدل سکتا - کنجوس، مہا کنجوس محمود ہرگز ہرگز نہیں بدل سکتا مگر آج اسکا بدلا ہوا انداز مجھے حیرت میں ڈال دیتا ہے .... ارے وہ خدمت گار بھی کل کی مانند میلے کچیلے کپڑے نہیں پہنے ہوئے ہیں - خدایا - اُف یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے - ؟ سامنے ابلتے، کھولتے پانی میں پیالیاں ڈالی جا رہی ہیں پھر انکو صاف پانی سے دھویا جا رہا ہے - کل تک تو یہ صرف ایک بار ٹھنڈے پانی سے کھنگالی جاتی تھیں اور بعض اوقات انکی تہہ میں شکر تک جمی رہتی تھی - !

میں آفس جاتا ہوں - اتنے میں آفس کے سارے عملہ کو منیجر ایک جگہ مجتمع کر کے خود ہی ایک نوٹس پڑھتا ہے - کل تک تو یہی منیجر ناک بھوں چڑھا کر بات کرتا تھا، مگر آج ہنس ہنس کر یوں باتیں کر رہا ہے گویا ہم میں سے ایک ہے ..... مگر اب وہ افضلیت اور برتری کا احساس کہاں گیا - ؟ آج یہ بھی وقت پڑ آیا تھا .... اور حقیقت کچھ یوں تھی کہ پہلے کبھی شاید ہی ساڑھے دس سے پہلے آیا ہو ..... یکایک میرا ذہن نوٹس کی طرف منبذول ہوتا ہے !

"آج سے ورکنگ آورز صبح نو بجے سے ساڑھے تین بجے تک ہوا کرینگے !" یہ سب کیا ہوا .... گورنمنٹ کو آج اسٹاف کی صحت کا اسقدر خیال کیوں محسوس ہو رہا ہے ....

"کسی شخص کو بھی حکام بالا کے حسب الحکم اوور ٹائم (Overtime) کام کرنے کی اجازت نہیں .... " منیجر نوٹس پڑھنے لگا ... "کام زیادہ ہو تو عارضی کلرک (Temporary) رکھ لئے جائیں !" ارے - حیرت سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا

"تنخواہوں میں مزید تیس تیس روپے کا اضافہ کیا جا رہا ہے .... ہفتہ اور جمعہ کے آدھے دن کی چھٹی حسب سابق بدستور رہے گی !" یا پ رے باپ ! کل تک تو یہی گورنمنٹ کام کرا کرا کر دیوالہ نکال دیتی تھی .... اور تنخواہ اسقدر کم ... آج یہ سب کیا ہو رہا ہے

میں آفس سے گھر کیلئے نکلتا ہوں .... یاد آتا ہے فرزانہ نے کلینڈر لانے کیلئے کہا تھا، ایک دکان میں جاتا ہوں - ایک قیمتی اور بیحد دلکش کا انتخاب کرتا ہوں - مگر دل خوف زدہ ہے کہ سیلس مین کہیں کوئی گراں قیمت نہ بتا دے - پھر میں پوچھتا ہوں اور جواب میں وہ بڑی شائستگی سے کہتا ہے "جناب صرف ڈھائی روپیہ ..... " اور سچ تو یہ ہے کہ میں نے خود اسکی قیمت پانچ روپیہ دل میں مقرر کی تھی .... پھر شک گذرا شاید سیلس مین سے سہواً کہہ گیا ہو یا میری سماعت نے ساتھ نہ دیا ہو مزید تصدیق کیلئے پوچھتا ہوں .. "جی - کیا کہا آپ نے --- ؟"

"ہاں ..... !" وہ بڑے تپاک سے بولا "ڈھائی روپیہ - !" اس نے اپنا جملہ دہرا دیا ..... یہ کیا ..... پچھلے سال اس سے کمنیا بھی ساڑھے چار کا لیا تھا ....

تیزی سے بس کے اڈے کی طرف جانے لگتا ہوں - کہیں بس میں رش نہ ہو ..... مگر سبھی والی کیفیت سے دوچار ہو کر حیرت اور بڑھ جاتی ہے - ! جلدی جلدی گھر پہنچتا ہوں - کیلنڈر فرزانہ کو تھماتے ہوئے منہ دھونے چلا جاتا ہوں - ذہن بیحد مضمحل اور تھکا ہوا ہے صرف اس حیرت انگیز تبدیلی پر اور اسکی وجہ نہ سمجھنے پر - !

"کاش - !" میں سوچتا ہوں "کاش ! اگر آئندہ بھی یونہی ہو - یہی نظام اگر رائج رہے تو کیا ہرج ہے - آج تو مجھے خوش ہونا چاہیے ..... آج تو مجھے اپنے برسوں پہلے کے خواب ' ایک نئی البیلی رنگین سحر اور ایک نئے سماج کے خواب کی تعبیر مل رہی ہے ..... آج تو مجھے بیحد مسرور و شاداں ہونا چاہیئے ..... آج تو میرے دل کی آوازیں شرمندۂ تکمیل ہو رہی ہیں .... !"

میں یہی سب سوچ رہا ہوں -

"ارے ..... ارے بھئی اٹھئے بھی اب - کتنا دن نکل آیا - کیا آج آفس نہیں جائیے گا - ؟" میرے کانوں میں فرزانہ کی مترنم آواز گونجتی ہے - وہ مجھے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کر رہی ہے - میں اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتا ہوں

"میری جان - !" وہ شرما جاتی ہے ....

"ارے - اُف - سخت حماقت - یہ سچ ہرگز نہیں نہیں - تو وہ خواب تھا ---- ؟ یقینا - !"

عوض سعید

شمع بجھتی ہے تو

"آہنگ" کے دفتر کی اونچی سہ منزلہ عمارت کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے اسے آج تھکن کا احساس کچھ زیادہ ہی ہوا۔ یوں بھی وہ روزانہ دیر سے گھر جانے کا عادی تھا۔

لیکن آج ترجمہ کی دردسری کے بعد جب وہ بوجھل قدموں سے سیڑھیاں اترتا ہوا باہر آیا تو سرد ہوا کی بے شمار ننھی ننھی لہریں اس کے کمزور جسم سے الجھ گئیں۔ اس نے سردی سے محفوظ رہنے کیلئے کانوں پر دستی باندھ لی لیکن وہ اپنی پتلی سی اونچی ناک کو بچا نہ سکا جو سردی کے باعث سکڑ کر کچھ نکل آئی تھی۔ سرد ہوا کی نرم و سبک لہریں جب اس کے کمزور جسم سے مس ہوتیں تو اسے محسوس ہوتا جیسے وہ گھر پہنچنے سے پہلے ہی برف کے تودے کی طرح گھل کر پانی ہو جائے گا۔

وہ ایک سائے کی طرح سڑک پر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ لیکن اس طرح چلنے میں اس نے کچھ زیادہ ہی سردی محسوس کی۔ اس لئے اب اس نے اپنے لانبے ڈگ بھرنا شروع کر دیئے تھے۔

رات کافی جا چکی تھی۔ لیکن برقی قمقموں کا عکس عابد روڈ کے خوبصورت گالوں پر اب بھی رینگ رہا تھا۔ عابد روڈ کی دوکانیں سو چکی تھیں۔ ایک رکشہ والا تیز تیز پیڈل مارتا ہوا سڑک سے گزر رہا تھا۔ جب وہ بشیر باغ پار کر کے "جان کمپنی" کے پاس آیا تو یکایک گلی میں سے ایک نوجوان لڑکھڑاتا ہوا اس کے سامنے آگیا۔

"شیخ حمید کیا بندوبست کر لیا ہے"

اور وہ جو شیخ حمید نہیں تھا۔ کچھ کہے سنے بغیر آگے کھسک گیا۔ وہ پھر آگے بڑھا۔

"شیخ حمید کل رات تم ذرا سی بات پر روٹھ کر چلے گئے۔ یہ لو دو سو روپے۔ اب تو خوش ہو گئے۔ میں جانتا ہوں ایک چچا کے نزدیک اس کی نا بھتیجی کی قیمت دو سو روپے بہت کم ہے لیکن تم گھبراتے کیوں ہو۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ سن رہے ہو شیخ حمید۔ میں کیا کہہ رہا ہوں!"

وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی نشیلی آنکھوں میں شراب کے سارے پیگ کھنچ آئے تھے۔ اس لئے وہ اسے پہچاننے میں دھوکہ کھا رہا تھا۔

"معاف کیجئے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا نام شیخ حمید نہیں ہے۔"

وہ لڑکھڑاتا ہوا اس کے قریب آیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یوں گھور کر دیکھا۔ جیسے وہ شیخ حمید کو پہچان رہا ہے۔

"تم شیخ حمید نہیں ہو!" اس نے تعجب سے الفاظ کو چباتے ہوئے کہا۔

"پھر شیخ حمید کہاں ہے، اس کی خوبصورت بھتیجی کہاں ہے؟"

اس نے اپنی لڑکھڑاتی زبان سے پے در پے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ اور وہ آگے بڑھ گیا۔ اس وقت وہ چاہتا تھا کہ آسمان

دو سو روپے مفت میں حاصل کر لیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا کیوں کہ وہ اپنی فطرت کے خلاف کام کرنے کا سخت مخالف تھا۔

گھر پہونچنے پر اس نے اس واقعہ کا ذکر اپنی بیوی سے کیا اور وہ بڑی دلچسپی اور حیرت سے اسکی باتیں سنتی رہی۔

اس نے اپنی بیوی کے سامنے کانن ڈائل کے کسی جاسوسی کردار کی طرح کچھ رک رک کر سر کو آہستہ سے جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

"میں نے شرابی کے ہاتھ سے روپے نہیں لئے سمجھیں کہ میں شیخ حمید نہیں تھا۔"

وہ تڑپ کر جھنجھلا گئی۔

"وہ انسان ہی کیا جو وقت سے فائدہ نہ اٹھائے۔ اچھا بھلا ایک موقع ہاتھ آگیا تھا۔ اسے بھی آج اپنی بیوقوفی سے کھو دیا۔ ذرا سی ہوشیاری ہوتی تو آج گھر کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا اور وہ منی کو دیکھو رو رو کر آنکھیں بجائے سرشام ہی سے سو گئی ہے۔ اسے آج استانی نے ابھی تک نئی کتابیں نہ خریدنے کے سبب بید سے خوب پیٹا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ شوقین بچیاں کسی طرح بھی اپنے پڑھنے کیلئے کتابیں خرید ہی لیتی ہیں۔

اب تم ہی بتاؤ کیا کریں ـــ منی کی تو آج لڑکیوں کے سامنے سبکی ہو چکی اور کل وہ بغیر کتابوں کے دہلیز سے باہر قدم بھی نہ رکھے گی۔

چراغ کی دھیمی روشنی میں منی کا سانولا سلونا چہرہ ابر کے ملگجے ٹکڑے میں چھپے ہوئے چاند کی طرح مدھم دکھائی دے رہا تھا۔

اس کا سر تکیہ سے ہٹ کر نیچے آگیا تھا۔ اس نے منہ کے قریب جا کر اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ اور نہایت ہی آہستگی سے اس کے سر کو اٹھا کر تکیہ پر رکھ دیا۔

منی ہم تم کو اگلی تنخواہ پر نئی کتابیں ضرور خرید دیں گے۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے۔

میری ننھی سی گڑیا ـــ کہیں یہ سنگ مزاجی تمہارے چہرے کی معصومیت کو چرا نہ لیجائے۔ یہ کیا کچھ کم ہے کہ تمہارا سر پھرا باپ تمہیں کم تنخواہ میں بھی اسکول بھیج رہا ہوں۔ وہ منی کے چہرے کے قریب کھڑا یوں کہہ رہا تھا۔ جیسے وہ جاگ رہی تھی۔

وہ منی کے بستر سے پلٹ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ اس کی بیوی بان کے پلنگ پر بیٹھی چہرے کو اداس بنائے کچھ سوچ رہی تھی۔ اس نے دیکھا اس کی آنکھوں کی جھیل میں اداسی تیر رہی تھی۔ شائد وہ ابھی تک اس بات کا ماتم کر رہی تھی کہ اس کے شوہر نے آئی لچھمی سے کیوں منہ موڑ لیا انسان بھی عجیب مخلوق ہے۔ اب یہی دیکھئے نا اس کی بیوی خواہ مخواہ اس سے ناراض ہوئی جا رہی تھی۔ جیسے اس کے شوہر نے سر بازار اس کی ہتک کر دی ہو۔

اس کی بیوی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بان کے پلنگ پر پاؤں پھیلا کے سو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر کھادی کی پھٹی ہوئی چادر تھی جس پر جا بجا میل کی دھاریاں تھیں۔ دھبے تھے۔ اس کا سانس رک رک کر چل رہا تھا۔ کیوں کہ وہ مدت سے بیمار تھی۔ اس کی خالی خولی چھاتی میں کا ایک مرض تھا۔ جو رس رس کر اس کے منہ کی راہ سے گزشتہ کئی مہینوں سے نکل رہا تھا۔ اور اس کی صحت کا نازک پودا مرجھاتا جا رہا تھا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے چھ سال پہلے کی زندگی گھوم گئی۔ جب حجلۂ عروسی میں کلیوں کی سیج پر ایک نازک بدن خوبصورت دوشیزہ جھکائے بیٹھی تھی اس وقت اس نے اسکی مرمریں باہوں میں رنگ کی خوبصورت پچکاریاں سی چھوڑی تھیں۔

محبت کی ایک حسین قوس و قزح اس کی آنکھوں کے سامنے مچلنے لگی اور پھر یکایک آسمان کی نیلاہٹوں میں ڈوب گئی۔

اس وقت وہ مقامی بینک میں اکاؤنٹینٹ تھا۔ جانے وہ کونسی منحوس گھڑی تھی جس نے اس سے حسابات میں غلطی کروائی اور اسکا بھول ایک بڑے خسارے کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

"ایکسپلینیشن کال کرنے پر اس نے نوکری چھوڑ دی۔ اس تاریخ کے بعد سے اس کی زندگی بے کیفی کے اس بے پایاں سمندر میں جا گری جہاں سے اس کے قدم آج بھی پوری طرح نکلنے نہ پائے تھے۔

آج یادوں کے حسین قمقمے اس کے چہرے پر جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ جیسے خوبصورت جگمگاتے ہوئے قمقموں کے ساتھ اس کی روح خوشی سے مہک رہی ہے۔

اس کے جسم پر بلانکٹ کا ایک ٹکڑا چڑھا ہوا تھا جسے اس نے سردی سے بچنے کیلئے اوڑھ رکھا تھا۔ بلانکٹ کے ایک سوراخ میں سردی دبے پاؤں اپنا گھس آئی تھی جیسے چپ چاپ اس کی آغوش میں اس کی اپنی بیوی آگئی ہو۔

جب یادوں کے ننھے منے قمقمے ایک ایک کرکے بجھ گئے اور اس کے ساتھ ہی مٹی کے تیل کا دیا بھی محراب میں اونگھنے لگا تو اسے رات کے کالی ہو جانے کا احساس ہوا لیکن آج ضیغم کی خوبصورت اپسرا اس کے پہلو میں آ لیٹی جیسے شرما رہی تھی اور اب اس کی نگاہیں طاق میں رکھے ہوئے دیئے کو دیکھ رہی تھیں جو تیل ختم ہو جانے کے باعث دھیما ہوتا ہوا دم توڑ رہا تھا۔

بازو کے پلنگ پر اس کی بیوی دھونکنی کی طرح کھانس رہی تھی۔ اور وہ سوچ رہا تھا۔ ایک آوارہ اوباش شرابی ہے جو شراب کے نشہ [illegible] ہر راستہ چلنے والے کو دلال سمجھ کر روپے دکھا رہا ہے۔ ایک بے حس شیخ حیدر ہے جو اپنی بھتیجی کی پکی پکائی جوانی کا سربازار نیلام کر رہا ہے۔ اور ایک وہ ستر روپے پانے والا مترجم جس کی بیوی کی جوانی پر خزاں آچکی ہے۔ جسے ڈاکٹروں نے ٹھنڈے اور اونچے مقام پر لے جانے کا مشورہ دیا ہے لیکن وہ اسے ستر روپے جیسی قلیل آمدنی میں کسی اونچے مقام پر پہنچانے سے مجبور ہے۔ وہ آدرش کے اس اونچے مینار پر پہنچ جانا چاہتا تھا جہاں پیٹ کی کوکھ سے جنم لینے والا [illegible] سائیلنسر ہو۔ اسکی بیوی کی کھانسی کے دردناک سر جیسے اسکے کانوں میں زہر کا ایک ایک قطرہ ٹپکا رہے تھے۔

اس کے ذہن سے رنج کا ایک دبا دبا سا احساس جھانک رہا تھا۔ اسے اپنے دماغ کی پہلی سیڑھی پر شرابی آہستہ آہستہ چڑھتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں دس دس کے نوٹ تھے۔ اور وہ شیطانوں کی سی ہنسی ہنستا ہوا کہہ رہا تھا۔

"بے وقوف تم نے وقت سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔ تم زندگی بھر اسی ڈربے میں سڑتے رہو گے اور ایک دن کتے کی موت مر جاؤ گے تمہارا پوچھنے والا کوئی نہ ہوگا۔ تمہاری بیوی کھوں کھوں کرتی ہوئی ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں میچ لے گی۔" اس کے منہ سے ایک بلند چیخ جیسی آواز نکل گئی۔

"ذلیل شرابی کے بچے دور ہو جا میری نگاہوں کے سامنے سے۔"

اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا اور وہ خواب کے تانے بانے میں کھو گیا تھا۔

صبح منی کے اٹھنے سے پہلے ہی وہ زہر مار کرکے باہر نکل آیا۔ جب وہ عابد روڈ سے گذرا تو شوکیس میں رکھے ہوئے "ٹویڈ" شارکاسکن ملک کے خوبصورت "کٹ پیس" اسے گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ اور اسے احساس ہوا کہ اس نے مدت سے اچھے اور قیمتی کپڑے نہیں سلوائے ہیں کے قدم تیز ہوگئے۔

کپڑوں کی دوکانوں کا لامتناہی سلسلہ اب بھی اس کے قدموں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ جب کپڑوں کی دوکانیں غائب ہوگئیں تو ایک اطمینان سا ہوا۔ وہ اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا۔

اچانک [illegible] کے قریب ہی کسی نے آکر اس کے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ناگیش بابو کھڑا ہنس رہا تھا۔

کالج کے دور کا سب سے زیادہ قریبی دوست۔

وہ ہلکے نیلے رنگ کے [illegible] سوٹ میں بڑا خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ ناگیش کے قیمتی سوٹ کو دیکھ کر اسے اپنے [illegible] بہت ہی حقیر لگے اور اسے احساس ہوا جیسے وہ اسے بہت برے وقت ملا ہے۔

وہ لمبی سانس میں پچھلی یادوں کو دھونے لگا۔

کالج کی رنگین فضا پر دفیسر مہتہ کی چڑچڑاہٹ، ہاسٹل کا کیف طلعیہ کی سنجیدگی، ورشا کی خوشخیال ــــ سب ہی کچھ۔

اس کے کوٹ کی جیب میں ایک روپے کا آخری نوٹ جو اس نے کل سے سنبھال کر رکھا تھا کھلنے میں پڑا سسک رہا تھا۔ ایک طویل مدت کے بعد ملنے والے ساتھی کی کم از کم کافی سے ہی تواضع کرنا وہ اپنا دلین فرض سمجھ رہا تھا۔ اس نے اپنے اس فرض سے سبکدوش ہونے کیلئے وہ اپنے ساتھی کے ساتھ "کلام" ہوٹل میں داخل ہوا اور فوراً ہی بیرے کو دو کپ کافی لانے کو کہا۔

تھوڑی دیر بعد ناگیش آہستہ آہستہ کافی کا ایک ایک گھونٹ پیتا ہوا مزے لے لے کر باتیں کئے جا رہا تھا۔

کس طرح اس نے گریجویٹ ہونے کے بعد ورشا پر ڈورے ڈالے تھے۔ اور اسے شادی کے بندھن میں جکڑا تھا۔ پھر انجینیرنگ کی اعلیٰ ڈگری حاصل کر کے جاب لینے کا ذکر غرض کہ اس نے اپنی زندگی سے متعلق کوئی بات نہیں چھوڑی۔

جب وہ کافی کہہ چکا تو شاید اسے احساس ہوا کہ وہ اب تک اپنی ذات کے متعلق ہی ڈینگیں مار رہا ہے۔ کچھ اپنے دوست کے بارے میں بھی کچھ پوچھنا چاہئے۔

"تو آجکل کیا کر رہے ہو۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ کہیں جیل بندی میں تو نہیں پڑے ہو۔ یار ایسی بھی کفایت کیا۔ کچھ ٹھاٹ سے زندگی گذارو۔ دیکھو ہم نے بھی کیا لونڈیا پھانسی ہے زندگی سالی شاندار بن گئی ہے۔ آٹھ سو روپے تنخواہ اور اوپری آمدنی کا نہ حساب نہ کتاب۔ خسر کا لونیا رکھا ہے بڑے مزے سے زندگی گذر رہی ہے۔ ایک دن کیلئے آفس کے کام سے یہاں آیا تھا۔ کل صبح یا شام کی ٹرین سے بمبئی چلا جاؤں گا ــــ" وہ چلا۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ ۱۲ بج چکے تھے۔ سرما کی ہلکی دھوپ آرام ہوٹل کے فرش پر بکھر گئی تھی۔ بوائے دوڑ دوڑ کر گاہکوں کو چائے اور کافی سپلائی کر رہے تھے۔ سامنے کے کھلے حصے میں دو کرسیوں پر ایم کی دو دبلی پتلی کرسچین لڑکیاں بات بات پر قہقہہ مار کر ہنس رہی تھیں جو ایک ادھیڑ عمر کا پارسی بیٹھا مٹن چاپ کھا رہا تھا۔ بیچ کے برآمدے میں بید کی کرسیوں پر چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ جن میں سے ایک زور زور سے باتیں کر رہا تھا۔ لیمن سے مہکتی سگرٹوں کی ہلکی ہلکی سی خوشبو دھوئیں کے غبار کے ساتھ پھیل رہی تھی۔

اور ناگیش اب بھی اپنی امارت کے متعلق اس پر رعب جما رہا تھا۔ پھر جب وہ کافی ڈینگیں مار چکا تو کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور لڑکے کو آواز دی بوائے نے کاونٹر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دونوں کاونٹر کی طرف چلے۔

ناگیش نے تیزی سے آگے بڑھ کر کاونٹر پر پانچ کا نوٹ رکھ دیا۔ جواباً اس نے بھی تیزی دکھائی اور منیجر کے سامنے ایک روپے کا نوٹ رکھ دیا۔ منیجر نے ایک لمحے کیلئے اسے گھور کر دیکھا، پھر سلوٹیں پڑے ہوئے نوٹ کو۔

دوسرے لمحہ ہی میں وہ بل کے مطابق حساب کر کے ناگیش کو چینج دے رہا تھا۔

اسے محسوس ہوا جیسے منیجر نے اس کی ہیئت کذائی کو دیکھ کر اس سے نوٹ لینا مناسب نہیں سمجھا ہے۔

بہر حال اس کا یہ خیال صد فیصد درست بھی تھا تو بھی منیجر نے اس کی ذات کو تھوڑا بہت فائدہ پہونچایا ہی تھا۔

پھر ناگیش اسے رخصت کرتا ہوا بازار کے ہنگاموں میں کہیں کھو گیا۔

اخبار کے دفتر پہونچ کر اس نے آج کی تازہ خبریں پڑھیں اور ترجمہ کرنے لگا۔ اس کے ایک ساتھی نے ترجمہ کرتے کرتے آنکھیں اٹھا کر اسے یوں دیکھا جیسے وہ اس کی آنکھوں میں اس سے دیر سے آنے کا سبب پوچھ رہا ہو۔ پھر وہ کاغذوں پر جھک گیا۔

اوپر کی منزل کے بائیں جانب جس سے ملحق مدیر کا کمرہ تھا۔ آج دن ڈھلے ایک شخص چیخ چیخ کر باتیں کر رہا تھا۔ اور مدیر جو اس اخبار کا مدیر تھا آہستہ آہستہ اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

جب وہ واپس ہوا تو اس نے دیکھا وہ ناگرش تھا۔!

وہ اسے بھی پھٹی حیرت بھری آنکھوں سے زینے کی آخری سیڑھیاں اترنے تک دیکھتا رہا۔

اس کے چلے جانے کے بعد وجے نے اسے بتایا کہ وہ ہری داس کا داماد ہے اور خسر سے لڑکر یہاں آیا ہے۔ اور اب یہ بلڈنگ جہاں جہاں اس کی بیوی کی ملکیت ہے۔ بڑا چار سو بیس معلوم ہوتا ہے ——"

اس نے وجے کی ساری باتیں سنیں۔ اور اس پر یہ ظاہر ہونے نہیں دیا کہ وہ اس کا قریبی دوست ہے۔

رات کے ۱۲ بجے جب وہ حسب معمول اپنے گھر آیا تو اس نے دیکھا اس کے دروازہ کا ایک پٹ کھلا سا ہے۔ اس نے سوچا شاید اس کی بیوی کو زنجیر لگانے کا خیال نہ رہا ہو۔ اس نے اندر جاکر چٹخنی لگائی اور بستر پر دراز ہوگیا۔

اس کی بیوی اس کی آہٹ سے جاگ پڑی۔

اس نے ڈاکٹروں کی طرح اس کی نبض پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک تو ہے۔؟"

"ہوں —— اس نے چہرے پر صحت مندی کا نکھار پیدا کرتے ہوئے کہا۔

لیکن ایک لمحہ بعد ہی اس کے سینے کی خشک کھانسی نے فوراً اس کے جواب کی تردید کردی۔

اس نے ناگرش سے اپنی ملاقات کا ذکر کچھ اس لئے بھی نہیں کیا کہ کہیں بیوی اس پہ یہ الزام نہ دے کہ اس نے اپنے حالات کو دیکھتے ہوئے بھی اپنے ایک سرمایہ دار دوست سے مدد نہیں لی

دن تیزی سے مہینوں میں تبدیل ہونے لگے لیکن اس کے گھر پہ مفلسی کا منحوس سایہ برگد کے درخت کی طرح پھیلتا ہی چلا گیا۔ اور اس کا منہ پریشانیوں سے کملا کا کملا رہ گیا۔

آج آفس میں جب وجے نے اس سے بلڈنگ کی ان ونٹری طلب کی تو وہ سٹپٹا کر رہ گیا۔ اسے مطلق خیال نہیں رہا تھا کہ وجے نے کبھی اسے عمارت کی ان ونٹری رکھنے کو بھی دی تھی۔

وہ ان ونٹری لینے کے خیال سے گھر آیا تو اس نے دیکھا تو منی مزے سے لے کر رس گلے کھا رہی ہے۔ اسے حیرت ہوئی کہ یہ منی رس گلے کہاں سے کھا رہی ہے۔؟ جاتے وقت اس کی بیوی کے ہاں کچھ پیسے بھی تو نہ تھے۔

اس نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ لیکن جواب نہ پاکر اسے سخت تشویش ہوئی۔ پھر منی نے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے ایک بوڑھی عورت یہاں آئی تھی، اس نے امی کے کان میں آہستہ سے کہا اور پھر مجھے رس گلے دیکر کہا۔ "تمہاری امی سے تھوڑا کام ہے بیٹا ابھی یہ واپس چلی آئے گی۔ جب تک تم یہ رس گلے کھاؤ۔

جب میں نے امی سے کہا کہ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی تو انھوں نے پہلے مجھے پیار سے سمجھایا پھر میرے ضد کرنے پر مجھے مارا بھی —— اور مجھے اکیلی چھوڑ کر چلی گئیں۔ یہ کہہ کر منی رونے لگی ——

اس کا چہرہ غصہ سے تمتمانے لگا۔ "آخر ایسا کیا ضروری کام تھا جس نے اسے منی کو اکیلے گھر میں تنہا چھوڑ جانے پر مجبور کیا تھا۔ اس سے پہلے تو اس نے کبھی باہر قدم نہیں رکھا تھا —— اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات ابھر رہے تھے۔ اور وہ رہ رہ کر اسے اپنی بیوی پہ غصہ آرہا تھا۔ چونکہ فوری آفس پہونچ کر اسے وجے کو ان ونٹری (Inventory) دینی تھی اس لئے اس نے منی کو بہلا پھسلا کر اس سے تھوڑی دیر کی اجازت لے لی اور اس کے ہاتھ میں پیار بھرے انداز سے ایک تھپکی دی اور وہ واپس آفس کی طرف آیا۔

وہ اپنے کمرے میں بیٹھا کل کیلئے آرٹیکل لکھ رہا تھا جب وہ اس کی میز کے قریب گیا تو وجے نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور اشارہ سے اُن دونوں کو بیٹھنے کو کہا۔ پھر وہ تیز تیز قدم ڈالتا ہوا آفس کی سیڑھیوں کو پھلانگ کر باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی جب وہ چنگھاڑتے ہوئے شیر کی طرح اپنے گھر میں داخل ہوا تو اس نے اپنی بیوی کو دیکھا جو منی کو اپنی آغوش میں بھینچے پیار کئے جا رہی تھی "منی کو اکیلے گھر میں تنہا چھوڑ کر کہاں گئی تھیں۔ ؟ بولو۔۔۔ !"

اس کے منہ سے غصے کے شعلے نکل رہے تھے۔

"کچھ سنو گے بھی یا محض غصہ ہی کرتے جاؤ گے۔ اورنگ آباد سے چچی یہاں علاج کیلئے آئی ہوئی تھیں۔ آج کا مائن کے ذریعہ مجھے بلوایا تھا۔ منی کو میں نے گھر پر چھوڑ جانا اس لئے مناسب سمجھا کہ کہیں وہ انہیں بستر پر پڑا دیکھ کر ڈر نہ جائے۔ بس اتنی سی بات پر خفا ہو گئے۔"

اس نے پیار سے اپنے ہاتھ اس کی گردن میں حمائل کر دیئے۔

اسے محسوس ہوا جیسے اس نے اپنی بیوی کے ساتھ واقعی زیادتی کی ہے۔ وہ دل ہی دل میں نادم ہوتا ہوا آفس چلا گیا۔

اس نے جب ترجمہ کرنے کیلئے کاغذ اٹھایا تو اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا ہے وہ آج ایک سطر بھی اخبار کیلئے ترجمہ نہ کر سکا۔

اس کے سر میں آج ہلکا ہلکا سا درد ہو رہا تھا۔ وہ اناسین کی گولیاں خریدنے کے ارادے سے بازار کی طرف چل پڑا۔

پھر اچانک ہی بازار کے نکڑ پر ناگیش سے اس کی ملاقات ہو گئی

"ارے تم اس طرف کدھر نکلے۔؟" ۔۔۔ اس نے ناگیش کے شانوں پر ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں جانتا ہوں"۔۔۔ ناگیش نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہی کہ دلال یہاں زیادہ گھوما پھرا کرتے ہیں۔ پیارے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے تم جیسے ادھر آنکلے ہو۔ میں بھی دل بہلانے کی خاطر آگیا اسے شیخ حیدر کو جانتے ہو؟ بڑا گھاگ ہے سالا

ادھر اس نے کئی خوبصورت عورتوں کو پھانس رکھا ہے۔ کیا بتاؤں یار شریف گھرانوں تک کی لڑکیوں کو چٹکیوں میں پھانس لاتا ہے کل ہی کی بات ہے سالا ایک بھلے گھرانے کی عورت پھانس لایا تھا لیکن تھی سالی دق کی مریضہ۔

میں جب کمرے میں داخل ہوا تو اس پر کھانسی کے دورے شروع ہو گئے اور وہ سینے کو دباتے میرے کمرے سے باہر چلی گئی۔

میں نے اس کے چلے جانے کے بعد شیخ حیدر کو ڈانٹ کر پوچھا۔

"کس سینیٹوریم سے تم اس دق کی مریضہ کو اٹھا لائے تھے" اس وقت ہنس کر اپنے مخصوص کاروباری لہجہ میں اس نے جواب دیا تھا:

"شریف گھرانے کی عورت تھی صاحب۔ اپنی چھوٹی سی بچی کو تنہا چھوڑ کر عجلت میں آپکی خدمت کیلئے آ گئی تھی"

کم بخت شیخ حیدر کتنا حرامی اور بدمعاش ہے" ناگیش بولا

اس کا سر چکرانے لگا۔ اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے ہزاروں فٹ بلندی سے نیچے پھینک دیا ہے۔ جیسے اچانک کئی آدمیوں نے مل کر تلوار سے اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ منی بید کی ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھی چاکلیٹ کھا رہی تھی۔

اور اس کی بیوی آج پھر اپنی چچی کے ہاں مزاج پرسی کے لئے چلی گئی تھی۔ !! ✦

شہاب سرمدی

ساز امید چھیڑ کر تار و نکی تھرتھری نہ دیکھ — راز شکستگی سمجھ رنگ شکستگی نہ دیکھ
خندۂ بے ضرر کہاں غنچہ و گل سے درس لے — فطرت زندگی پہ جا عشرت زندگی نہ دیکھ
ہو گی فضائے آشیاں سوز چمن سے سازگار — برق گداز بن کے جی برق کی برہمی نہ دیکھ
سود و زیاں کے مرحلے بچ اگر ان سے بچ سکے — اپنے سے کچھ کمی نہ کر، اور کوئی کمی نہ دیکھ
چاند ہے تیرا ہمسفر کوئی نہیں ہے راہبر — آگے قدم بڑھا کے رکھ دُور کی روشنی نہ دیکھ
تو ہی اگر سبک نہ ہو تیرے سوا ہے ماسوا — اپنی فروتنی بناہ، غیر کی برتری نہ دیکھ
کچھ بھی نہیں یہ اونچ نیچ دامن اعتبار کھینچ — عزت آدمی کو تول، قیمت آدمی نہ دیکھ
اپنے مقام پر سنبھل، چل تو یگانہ وار چل — دولت دوستی سمیٹ، جانب دشمنی نہ دیکھ
عقل کی منزلت کے ساتھ عقل کی منزلیں بھی ہیں — علم کی عصمتیں بچا، جہل کی ابتری نہ دیکھ
اپنے نظام سے اُلجھ صبح سے شام سے اُلجھ — آفت بے زری کو جان، لعنت بے زری نہ دیکھ

تو نے اگر شہاب کے شعر سُنے بھی ہوں کبھی
عظمت شاعری کو لے، شہرت شاعری نہ دیکھ

جلیل قدوائی

○

کیوں وہ دلدار نہ ہو جان سے پیارا مجھ کو — جس نے سو ناز سے اپنا کے ہو مارا مجھ کو

اُس طرف حسن کی قدرت نے نکھارا اُس کو — اس طرف عشق کی فطرت نے سنوارا مجھ کو

شوق سے روح لگی تن میں تواجد کرنے — اُس نے جس وقت محبت سے پکارا مجھ کو

غم دوراں نے ذرا بھی جو گرانا چاہا — غم جاناں نے دیا بڑھ کے سہارا مجھ کو

دل کے تسکین کو الفاظ کی حاجت کیا ہے — نگہ ناز سے کافی ہے اشارا مجھ کو

کوئی دیکھے تو یہ پاکیزہ بیانی اُس کی — فلک عشق کا کہتا ہے وہ تارا مجھ کو

پھنس کے گرداب حوادث سے نہ نکلا میں جلیل
دیکھتا رہ گیا حسرت سے کنارا مجھ کو

شاعر لکھنوی

○

اک دھواں سا ہے ماہ و انجم تک　　کیا نگاہیں پہنچ گئیں تم تک

کوششِ ضبطِ عشق کیا کہیے　　آج لو دے اٹھا تبسم تک

اُن کی کشتی ہے ان کا ساحل ہو　　بڑھ کے جو آ گئے تلاطم تک

یہ بہاریں یہ چاندنی یہ شباب　　تیرے ہونٹوں کے اک تبسم تک

ایک ذرّے کا حُسن کیا کہنا　　ڈوب جاتے ہیں ماہ و انجم تک

زندگی آج بھی ہے گرم سفر　　دو قدم کا تھا فاصلہ تم تک

عشق نے دو جہاں کئے تخلیق　　ایک آنسو سے اک تبسم تک

دعوئ عرضِ شوق تھا شاعرؔ
نہ ہوئی جرأتِ تکلم تک

نشور واحدی

○

بہار چھپ نہیں سکی گل و سمن پکار اُٹھے
جو حسن جلوہ ریز ہو تو پیرہن پکار اُٹھے

یہ میکدوں میں ان دنوں کمی ہو لعل ناب کی
نئی ادا کے بادہ کش مئے کہن پکار اُٹھے

خیال انکا رنگ لے تو دل دھڑک دھڑک اٹھیں
وہ انجمن فروز ہوں تو انجمن پکار اُٹھے

کہا یہ کس نے حسن سے کہ پھر سبک خرام ہو
بایں ادائے سادگی کہ بانکپن پکار اُٹھے

یہ بجلیوں کا تھا کرم گل و بہار و باغ پر
کہ آشیاں پرست بھی چمن چمن پکار اُٹھے

الم کوئی گنہ نہیں کہ مدتوں رہے چھپا
جبینِ غم پہ بل پڑے تو ہر شکن پکار اُٹھے

کچھ اس طرح کی گرد اٹھی کہ راہ عمر کھو گئی
لٹا کچھ ایسا کارواں کہ راہزن پکار اُٹھے

وجود چھن گیا مگر حیات چپ نہیں رہی
گزر کے بھی شہیدِ غم پسِ کفن پکار اُٹھے

طلوعِ انقلاب کے لئے جو مضطرب تھے دل
جو رات بھی چمک اٹھی کرن کرن پکار اُٹھے

فضائے نظم تازہ ہے نشور ان دنوں مگر
چھڑا جو دامنِ غزل تو اہلِ فن پکار اٹھے

ارشد کاکوی

○

دو چار دنوں سے شیخ برابر آتے ہیں میخانے میں
کیا خوب مزا پایا ہے انہوں نے رندوں کو سمجھانے میں

کیوں مے کو کہیئے ہوش ربا کب ہوش گنوایا رندوں نے
سر پھوڑ کے مر بھی سکتے تھے دیواریں تھیں میخانے میں

کیوں ایک اسی کے پُر کرنے میں ہاتھوں کو ہے لرزش سی
ہم خون جھلکتا دیکھ رہے ہیں ساقی! اس پیمانے میں

گلچیں کی نظر ہے پھولوں پر صیاد ہے درپے بلبل کے
القصہ تباہی دونوں ہیں ہی چاہنے چاہے جانے میں

چارہ گرو اب تم ہی بتاؤ ایسے میں کیا کرتے ہیں
بستی میں دم گھٹتا ہو اور جی نہ لگے ویرانے میں

بیٹھے بیٹھے رو دینا اور سوتے سوتے چونک اٹھنا
بات یہ پائی آپ نے ارشد اور کسی دیوانے میں؟

صبا اکبرآبادی

○

روان ہے قافلۂ منزل حیات ابھی ہماری راہ سے ہٹ جائے کائنات ابھی
نہیں بیان کے قابل غمِ حیات ابھی نہ پوچھئے دلِ بے مدعا کی بات ابھی
مژہ پہ ہے ابھی خونِ دل و جگر باقی ہزار رنگ سے نکھرے گی کائنات ابھی
ذرا قفس کی ستائش سے خوش تو ہے صیاد کہیں زباں پہ نہ آئے چمن کی بات ابھی
سحر ہوئی ہے تو کیا ذہنِ ہجر پیکر پر اجل کی طرح سے منڈلا رہی ہے رات ابھی
خموش رہ گئے مزہ آ رہا تھا جینے کا کہ جیسے دل سے کوئی کر رہا تھا بات ابھی
غلط امید دلا کر تباہ کر دے گی بھروسہ کیا ترا اے چشم التفات ابھی
ابھی حضور کے دل پر کوئی خراش نہیں سمجھ میں آئیں گے کیا دل کے حادثات ابھی

اجل سے تلخ سہی زندگی صبا لیکن
ہمارے دل میں ہے کچھ خواہشِ حیات ابھی

اِس عید پر
آپ کے بچے کیلئے
بہترین تحفہ
نیشنل ڈیولپمینٹ سیونگز سرٹیفکیٹ
خرید کر اپنے بچے کی آئندہ خوشحالی کو یقینی بنائیے

قاضی عبدالودود

چہ دلاور است

ایک انگریز مشرق کا سرقہ

ادبی سراغرساں کیلئے یہ امر انتہائی مسرت و خوشی کا باعث ہے کہ بعض اہل قلم نے اسکی کوششوں کی قدر کی اور خود اس کا اظہار کرنا شروع کر دیا ہے کہ انہوں نے اپنی بعض تصنیفوں کی بنیاد کس کس مصنف کی کتاب پر رکھی تھی یا کس طرح دوسری زبان سے اپنی زبان میں انہیں منتقل کیا تھا۔ یہ اظہار بجائے خود ایک بڑا عمل ہے۔ اور اسکی قدر و منزلت جتنی بھی کی جائے کم ہے۔ مثال کے طور پر مشہور و معروف مصنف ابن صفی نے اپنی جاسوسی کتاب دلیر مجرم کا تذکرہ ابھی حال میں اپنی تازہ تصنیف ڈائمنڈ جوبلی نمبر کے دیباچے میں کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ وہ میری ابتدائی کتاب تھی۔ اور انگریزی سے ماخوذ تھی۔ ادبی سراغرساں کے پاس دلیر مجرم کے سلسلے میں خطوط آئے تھے۔ اور مظہر انصاری کی شیلی سوئی بھی موصول ہوئی تھی۔ کہ دونوں ایک ہیں اور انگریزی سے اردو میں منتقل ہوئی ہیں۔ مظہر انصاری نے شیلی سوئی پر لکھا بھی دیا ہے کہ یہ ترجمہ ہے — لیکن اب ادبی سراغرساں اپنے اس مضمون کو کالعدم قرار دیتا ہے۔ اسی طرح بیگم سعیدہ مظہر نے ادبی سراغرساں کو مطلع کیا ہے کہ ان کی کئی کتابیں مثلاً "پل صراط"، "نئی صبح"، "تشیریں"، "رخشاں"، "وحشتِ دل" اور "غالیہ" اور "درندہ" بھی ادبی سراغرساں کی زد میں آتی ہیں۔ کیونکہ یہ سب علی الترتیب ماہم کی "The Razor's Edge" لارنس کی "The Rainbow" جین آسٹن کی "Pride and Prejudice" "Wuthering Heights" سیتوں کی "Dragonwyck" جین آسٹن کی "Emma" اسٹوکر کی "Dracula" پر مبنی ہیں اور پبلشر نے ان پر ترجمہ لکھنا پسند نہیں کیا —۔ ظاہر ہے کہ بیگم سعیدہ مظہر کی یہ جرأت اظہار و اعتراف بھی انتہائی قابل قدر ہے۔ امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں ان کا پبلشر ان کتابوں پر اصل ماخذ کا حوالہ ضرور درج کر دے گا۔ اس سے کتاب کی اہمیت ہی نہیں بڑھتی بلکہ وہ پڑھنے والوں کیلئے مختلف پہلوؤں سے مفید تر ثابت ہوتی ہے اور یہ وہ نکتہ ہے جسے کسی پبلشر کی نگاہ سے اوجھل نہ ہونا چاہیئے۔

اب تک جتنے مضامین، خواہ وہ ادبی سراغرساں کے قلم سے نکلے ہوں یا دوسرے مضمون نگاروں کے قلم سے سب اردو زبان کے ملکی اہل قلم کے بارے میں تھے۔ لیکن اس مرتبہ جو مضمون آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے وہ غیر ملکی اہل قلم کے بارے میں ہے جس کا شمار مستشرقین کی فہرست میں ہوتا ہے — یہ مضمون مشہور محقق قاضی عبدالودود کے قلم سے معاصر پٹنہ میں نکلا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے کہ میر حسن کی مثنوی کا سرقہ کس خوبصورتی سے اس مستشرق نے کیا ہے — یہی نہیں اب تو اس مضمون سے ایک اور زیادہ دلچسپ سامنے کھلتا نظر آتا ہے اور واقعی کیا خبر مستشرق نے کہاں کہاں سے اور کیسی کیسی چھدیاں کی ہوں — (ادبی سراغرساں)

ایڈورڈ ہنری پامر گذشتہ صدی کے مشہور مستشرقین میں تھے۔ اردو، فارسی، عربی زبانوں میں ان کی نظم و نثر موجود ہے۔ ان کا ایک اردو قصیدہ اور چند غزلوں کے چند شعر ابھی حال میں معارف نے شائع کیے ہیں، پامر ہندوستان نہیں آئے تھے۔ لیکن ہندوستانیوں سے ان کے تعلقات تھے۔ اور اردو اخباروں میں ان کے مضامین چھپا کرتے تھے۔ چنانچہ ۳ اپریل ۱۸۷۴ء کے اودھ اخبار میں ان کا ایک طویل مضمون ہے جس میں ڈیوک آف اڈنبرا اور دختر زار روس کی شادی کا مفصل حال قلمبند کیا ہے۔ اس مضمون میں جابجا اشعار بھی ہیں جن کے متعلق انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ کس کے ہیں۔ لیکن ایک جگہ جو اشعار ہیں ان میں پامر کا نام آیا ہے۔ پڑھنے والے اگر اس سے یہ نتیجہ نکالیں کہ پامر نے انہیں اپنے زائیدۂ طبع فکر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ تو بالکل حق بجانب ہوں گے۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔ کہ ان اشعار میں ایک کے سوا کوئی پامر کا نہیں۔ باقی ماندہ اشعار میر حسن کی ایک مثنوی سے لیے گئے ہیں۔ جو ان کی قلمی کلیات میں موجود ہیں۔ ذیل میں یہ مثنوی بجنسہٖ درج کی جاتی ہے۔ وہ اشعار جن کے مقابل x بنا ہوا ہے پامر کے یہاں نہیں۔ پامر نے بعض اشعار میں تصرف بھی کیا ہے اس کا پتہ حواشی سے چلے گا۔

شام کو میں فکر میں بیٹھا تھا کل — یعنی تھی میرے تئیں فکر غزل
یک بیک ہاتف نے دی آواز یوں — آج کے دن فکر میں بیٹھا ہے کیوں
گھر سے باہر ٹک نکل اے بے خبر — چل ذرا قدرت خدا کی سیر کر
فکر و غم ہے آج تو سب سے بعید — شام میں ظاہر ہے یاں صبح امید
سن کے یہ مژدہ اٹھا میں یک بیک — سیر کرتا ہوں گیا بازار تک!
دیکھا رستوں میں اک انبوہ ہجوم — تب کہا میں نے کہ یہ کیسی ہے دھوم
اک لگا کہنے چلا چل بے خبر — چل ہمارے ساتھ تو بھی سیر کر
ساتھ ساتھ اس کے گیا میں بھی وہاں — جس جگہ تھا عیش و عشرت کا مکاں
دیکھتا کیا ہوں کہ بے حد و قیاس — روشنی کا ٹھاٹھ ہے دریا کے پاس
لے زمیں سے آسماں تک ہے بلند — مہ سے روشن ہے چراغ اس کا دوچند
اس روش روشن تھا واں ہر اک چراغ — عرش پر جس کا لگتا تھا دماغ
تھا شعاع روشنی کا بس وفور! — شام سے لے صبح تک تھا وقف نور
اپنے اوپر ہنستے تھے جوں جوں چراغ — تھا عدو کو داغ پر بالائے داغ
دود اس کا ہوتا تھا جوں جوں بلند — آتش حسرت پہ تھا دشمن سپند
کیا بیاں اس کا کروں میں سر بسر — طوطی تقدیر کے جلتے ہیں پر
روشنی اس طور سے ہوتی ہے کہ — اک سرا جس کا ازل اور اک ابد
روشنی کچھ اک نہ تھی اس جا عیاں — اس میں آتشبازی کا بھی تھا سماں

عـ۱ م۔ مخطوطہ کلیات کتب خانہ مشرقیہ، مع۔ مخطوطہ کلیات جس پر میاں داد ۱۲۳۶ھ کا شائع کردہ متن مبنی۔ پ۔ متن شائع کردہ پامر۔ عـ۲ ٹک پ، تک م مع عـ۳ اک م مع، بھی پ عـ۴ طور سے م، طول سے پ، طرح کی مع

اک چراغاں کا نہ تھا تنہا ظہور　　موجزن ریتی میں تھا دریائے نور
کاسۂ مہتاب تھا اس کا حباب　　نور سے لبریز مثل آفتاب!
حلقۂ دود چراغاں تھا بھنور　　لہر گوٹے کی سی اس میں سر بسر
پلٹنیں دونوں طرح مثل کنار　　زیب بخش موج دریا وار پار
روشنی کے جھاڑ جو تھے اس میں یوں　　نخل مرجاں نکلے ہے دریا سے جوں
دیکھ روشن اس میں کاغذ کے کنول　　جل گئے غیرت سے پانی میں کنول
جنبش ہر شعلۂ شمع و چراغ　　موج دریا کے تئیں کرتی تھی داغ
بیچ میں جب اس کے چھٹتے تھے انار　　نور کی سی لہر تھی فوارہ وار
ہاتھی آتشبازیوں کے چھٹتے جب　　نور کوہ طور تھا نظروں میں تب
مور اس کے اس میں چھوٹے اس نمط　　چھوٹتی ہیں جس طرح دریا میں بط
جس کو گھنچکر کہیں ہیں وہ نہ تھا　　وجد میں آتش کا دل تھا بر ملا
بس کہ چھٹتے تھے ستارے بے شمار　　آسماں کی سی زمیں پر تھی بہار
پھلجھڑی، ہتھ پھول، گلریز و انار　　کرتے جلتے تھے طبق گل کے نثار
یہ بھی گل اس واسطے درکار تھے　　اس میں بھی دوش ہوا پر نار تھے
تھیں نہ روشن مورتوں کی ٹٹیاں　　مردم ناری تھے یہ جلوہ کناں
متصل چھٹتی تھی از بس پھلجھڑی　　نور کی بارش کی گویا تھی جھڑی
نے زمیں تھی اور نہ تھا وہ آسماں　　اور بھی روشن ہوا تھا اک جہاں!
ایسی آتشبازی چھٹتی ہے کہیں　　آسماں ہو جس کے آگے گل زمیں
آتشیں گل دیکھ یہ اور یہ چراغ　　آسماں کا دل ہوا تھا باغ باغ
جس جگہ جاتی تھی واں مد نگاہ　　جوش گلکاری سے پاتی تھی نہ راہ
دیکھ کر اس وقت یہ سوجھی سبیل　　ایسی ہی ہوئے گی گلزار خلیل
سینکڑوں لاکھوں تماشائی ہزار　　روشنی کے گرد تھے پروانہ وار
بس کہ تھی سیر ہوائی کی ہوا!　　شوق میں دیدہ ہوائی سب کا تھا
تونے دریا کو یوں ثابت کیا　　اور سن لے اس کا مجھ سے ماجرا!
تھے شناور اس کے تو اس میں عیاں　　بجرے تھے چنڈول و بیچ بادباں
مور پنکھی پالکی اور اسپ ناؤ!　　فیل زریں پوش کا تھا یوں بناؤ!

[illegible]، [illegible]، آتشبازی کے چھٹتے تھے جب [illegible]
[illegible]، [illegible] (۹)

تو کہے دریا میں تھا کوہ طلا! × یا کہ بادل تھا سنہری شام کا
فیلوں پہ تھیں نہ تھیں عماریاں × ابر میں تھے نور کے قصے عیاں!
یا مگر اس روشنی ہی کے سبب × سیر کو آئے تھے مل کر روز و شب
برق کے مانند سب زریں لباس × ہنستے پھرتے تھے خوشی سے آس پاس
پھرتے تھے سب بادلا اور چپنہ تاش × کیا سپاہی کیا غنی کیا خواجہ تاش
بادلے میں غرق سب اسباب تھا × پانی اس دریا کا جوں سیماب تھا
کھانچیاں ساچق کی جب آئیں نظر × یوں نہیں ٹھہری دل پہ اپنے سر بسر
نور کے دریا سے بھر بھر کے گھڑے × سر او پہ لیے فرشتے ہیں کھڑے
دیکھنا ان مٹکیوں کی آب و تاب × کوہ میں دریا ہوا تھا آب آب!
کشتیاں یوں تھیں جواہر کی رواں × جس طرح دریا میں تیریں کشتیاں
سبز فانوسوں کی اس میں یوں جھلک × جس طرح پانی پہ سبزے کی لہک
رنگ کے شیشے نہ تھے آتش میں دھرے × دل سبھوں کے تھے عشرت سے بھرے
برستے تھا نیسان بخشش ہر طرف! × لعل و گوہر تھے پڑے جائے خزف
دیکھ آرائش کے تختے مردماں! × کہتے تھے یہ دیکھو لو باغِ رواں!
باغ اس خوبی کو پہنچے ہے کہیں! × یہ تماشا ہم نے دیکھا بس یہیں
کیتکی، جوہی، چنبیلی، موگرا × سیوتی، شبو، گلاب و موتیا!
جعفری صد برگ، عباسی تمام × اشرفی، گل لالہ نرگس ہوں مدام
چشم گیتی نے نہ دیکھا زینہار × موسم ہر گل کی ہوئے اک بہار
گر جھڑتے وہ دید میں کاغذ کے گل × پر مفصل مجھ سے سن اس ہجر کا کل
رنگ کو کب گل کے ہوئے بے قرار × یہ وہ گل ہیں جن کی دائم ہو بہار
تھی رواں تختوں پہ اسباب نشاط! × عیش کی ہر طرف بچھی تھی بساط!
دیکھ کر وہ ناچ ان کا راگ و رنگ × مشتری تھی وجد میں اور زہرہ دنگ
نوبت و نقار خانہ کی صدا × چھا گئی تھی ارض سے لے تا سما
جتنے تھے نغمہ سرا استاد تھے × سب ہنر لوگ زباں پر یاد تھے
اس قدر شبہاتی وابلے خوش نوا × جس کو کہئے لحن داؤدی ادا

عث قیاس، کونہ میں م، کوہ زمیں، مع عث کذام مع عث یہ شعر صرف م میں علے سے مع، سوم عث م مع دیکھ کر وہ کرہ فراد مپ عث م مع نوبت اور نقار خانے پ ۔ عث مطابق مع (۹) م میں ہزار بھ صرف ملاحظہ

مشعلوں کے ہر طرف روشن تھے جھاڑ × تو کہے وہ تھے تجلی کے پہاڑ
اس میں نوشہ کا کروں میں کیا بیاں × نور حق تھا اس تجلی میں عیاں
دیکھ کر یہ دھوم[1] اور یہ عز و شان · میں نے پوچھا ایک سے کیا ہے یہاں[2]
کس کی شادی ہے اور کس کی ہے فوج · جوش مارے کس پہ دریا[3] کی ہے موج
جب کہا اک شخص نے تو اس قدر · حال ہے ہے کیا جہاں کے بے خبر!
ہے[4] وہ نواب اک شجاع الدولہ نام · دھاک سے لرزے ہے جسکی روم و شام
قدرت و قوت میں لاثانی ہے وہ! · عدل اور انصاف کا بانی ہے وہ!
صاحب شمشیر اور باعث[5] کرم! · ہے خزف سے جس کے آگے لعل کم
مغز فطرت اور دماغ عقل و ہوش · چشم ہمت اور چراغ ہوش و گوش
مہر گستر عدل، افزا ظلم کاہ × بندگان عالی و نور اللہ!
نکتہ سنج و نکتہ پرور نکتہ داں · ماہ خوبی رونق افزائے جہاں
تیغ میدان شجاعت روز رزم · ماہ رخشان و جاہت روز بزم!
دشمنوں کے واسطے برق غضب · دوستوں کو مایۂ عیش و طرب
عادل ایسا عہد میں جس کے سدا · شمع سے بچکر چلے باد صبا!
دست و بازو میں یہ قوت ہے اگر · تیغ مارے کوہ پردہ کھینچ کر!
دو کرے اس کوہ کو یوں اسکی دھار · تیر چلائے جس طرح صابن میں تار
اور سخاوت میں تو ہے وہ یکہ تاز · جس کو چاہے دم میں کر دے بے نیاز
کیا کروں میں اس کا وصف بادپا · بند ہوتی کب قلم سے ہے ہوا!
ہے سلیماں جاہ اور دارا حشم · جس کا ہے افلاک اک ادنے خیم
شان و شوکت کا کروں میں کیا بیاں · قیصر و خاقاں سے ہوں خادم جہاں
قائم اس کا حق رکھے جاہ و جلال · اس کے دشمن کو رکھے نت پائمال
اس کے ہے فرزند اک عالی جناب × آصف الدولہ بہادر ہے خطاب!
اسکی شادی ہے یہ اور اس کی برات · نیک طینت اور پاکیزہ صفات!
عیش و عشرت کا ہر اک جا ذکر ہے · آج فکر و غم کو اپنی فکر ہے!
سن[6] کے بولا یوں دعائیہ حسن × نت رہے روشن وہ شمع انجمن!

ع[1] م مع : دھوم دھام اور عز و شان پ ع[2] مع پ میاں م ع[3] م مع ' ہے یہ کس دریا کی موج ع[4] ... آت ... جس کا نام ... پ ع[5] م پ ... اور اسباب کرم اور ع[6] ... م پ میں نہیں ... ع ... م مع ... پ ... کے بولا یہ دعا کر ... اس شمع سے پر نور گھر۔

حق رہے روشن چراغ اس کا سدا — جس نے اک عالم کو روشن کر دیا
شعر کا بھی عرض ظرف ہے یہ فن ! — تا ابد جس کا رہے روشن سخن
زر کی کچھ اس سے نہیں مجھ کو طرف × گر قبول افتد زہے عز و شرف

عـ۱ـم ہج ہے عرض ظرف یہ فن، پ

LEADER!
THERE IS ALWAYS
A LEADER IN A FLOCK
HM FABRICS LEAD
IN * QUALITY * COLOUR & * DESIGN
MAKERS OF QUALITY FABRICS
HM SILK MILLS LTD.,
KARACHI.